

میراث

شیخ محمد اکرم

ادارہ ثقافت اسلامیہ

سفرِ کثر

اسلامی ہند اور پاکستان کی مذہبی اور علمی تاریخ
عہدِ مغلیہ



ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
۲۔ کلب روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ISBN 969-469-041-2

نام کتاب: رود کوثر

مصنف: ایس ایم اکرام

اشاعت: 2013ء

تعداد: 700

مطبع: الکریم پریس، لاہور

ناشر: قاضی جاوید

ناظم، ادارہ ثقافت اسلامیہ

قیمت: 800/- روپے

یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان اور حکومت پنجاب کے محکمہ اطلاعات و ثقافت کی مالی معاونت سے شائع کی گئی ہے۔

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
	تمہید (۱۹۵۷)	۷	۱۰	پیر روشن میاں بایزید انصاریؒ	۴۳
	استدراک (۱۹۶۷)	۱۲	۱۱	پیر روشن کے متعلق اختلافات	۴۸
	۱۔ اکبر سے پہلے		۱۲	مخزن الاسلام کا اندراج	۵۲
	۱۔ عہدِ مغلیہ	۱۷	۱۳	دلستانِ مذاہب کا اندراج	۵۷
	۲۔ مغلیہ حکومت کی ابتدا	۲۰	۱۴	پیر روشن کی تاریخی اہمیت	۵۹
	۳۔ شیرشاہ اور خاندانِ سور	۲۴		قادر یہ سلسلہ	
	۴۔ ہمدوی تحریک	۲۴	۱۵	مخدوم محمد گیلانی حلبیؒ	۶۳
	۵۔ شاہانِ سور اور ہمدویت	۳۰	۱۶	مخدوم عبدالقادر ثانیؒ	۶۴
	۶۔ ایرانی اور شیعہ اثرات	۳۲	۱۷	شیخ داؤد کرمانی شیرگزہؒ	۶۶
	۷۔ شطاری سلسلہ	۳۵		چشتیہ سلسلہ	
	۸۔ شیخ محمد غوث گویاری	۳۷	۱۸	شیخ عبدالعزیز چشتی دہلویؒ	۷۰
	۹۔ سلسلہ مداریہ	۴۱	۱۹	شیخ سلیم چشتیؒ	۷۱
	روشنیہ فرقہ			صابریہ سلسلہ	
			۲۰	شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ	۷۳

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۵	شادی خانہ آبادی	۲۳۶	۲۳۲	۲۲ - وحدت الشہود	۳۰۸
۶	حاجی سلطان تھانیسری	۲۳۷	۲۳۳	۲۳ - حضرت مجدد اور شیخ	۳۱۵
۷	رسالہ رد و وافض	۲۳۸	۲۳۴	۲۴ - ابن العربی	۳۱۵
۸	رسالہ تہلیلہ	۲۳۹	۲۳۵	۲۵ - جارجانہ ہندو اجماعیت اور	۳۱۸
۹	حضرت خواجہ باقی اللہ سے بیعت	۲۴۰	۲۳۶	۲۶ - اختلافات کا حل	۳۲۲
۱۰	لاہور پچو قطب الارشاد است	۲۴۱	۲۳۷	۲۷ - مکتوبات امام ربانی	۳۲۵
۱۱	خالقہ باقریہ اور حضرت مجدد	۲۴۲	۲۳۸	۲۸ - مخدوم زادگان کی والدہ محترمہ	۳۳۱
۱۲	رسالہ معارف لدنیہ رسالہ	۲۴۳	۲۳۹	۲۹ - خواجہ محمد سعید	۳۳۳
۱۳	مبارک و معاد وغیرہ	۲۴۴	۲۴۰	۳۰ - شیخ محمد معصوم	۳۳۶
۱۴	ارشاد و ہدایت	۲۴۵	۲۴۱	۳۱ - شیخ آدم بنوری	۳۳۹
۱۵	خانگی صدقات اور حضرت مجدد	۲۴۶	۲۴۲	۳۲ - شیخ عبدالحق محدث دہلوی	
۱۶	کی عالی سوسلگی	۲۴۷	۲۴۳	۱ - علوم دینی کا نیا دور	۳۴۳
۱۷	شیخ بدیع الدین	۲۴۸	۲۴۴	۲ - شیخ سیف الدین	۳۴۵
۱۸	مکتوب یازدہم کی مخالفت	۲۴۹	۲۴۵	۳ - ابتدائی تعلیم	۳۴۷
۱۹	حضرت مجدد دربار جہانگیری میں	۲۵۰	۲۴۶	۴ - دربار اکبری	۳۴۸
۲۰	سنت یوسفی	۲۵۱	۲۴۷	۵ - شیخ موسیٰ پاک شہید ملتان	۳۵۰
۲۱	کیا حضرت مجدد (اور "تن تنہا")	۲۵۲	۲۴۸	۶ - سفر حرمین	۳۵۱
۲۲	حضرت مجدد نے اکبری الحاد	۲۵۳	۲۴۹	۷ - شیخ عبد الوہاب متقی	۳۵۲
۲۳	کا قلع فتح کیا؟	۲۵۴	۲۵۰	۸ - شیخ علی متقی	۳۵۳
۲۴	حضرت مجدد کی مذہبی خدمات	۲۵۵	۲۵۱	۹ - شیخ محدث اور بدایونی	۳۵۵
۲۵	صوفیانہ احوال اور نظریہ قیامت	۲۵۶	۲۵۲		
۲۶	روضۃ العتیومیہ	۲۵۷	۲۵۳		

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۵۲۲	۵۔ سفرِ حرمین		۸۔ بنگال میں اسلام		
۵۲۸	۶۔ خلافت باطنی		۱۔ چینیہ کی ویشنو تحریک	۴۹۳	
۵۵۱	۷۔ قرآن		۲۔ بنگال میں ویشنو تحریک کے اثرات	۴۹۶ {	
۵۵۴	۸۔ حدیث		۳۔ بنگالی مسلمانوں کا ردِ عمل	۴۹۸	
۵۵۸	۹۔ اصول فقہ		۴۔ سید سلطان	۴۹۹	
۵۶۰	۱۰۔ اجتہاد و تقلید		۵۔ بہرام ستا بردوانی	۵۰۲	
۵۶۳	۱۱۔ تصوف		۶۔ مولانا حمید الدین شمس الدین	۵۰۷	
۵۶۷	۱۲۔ حجۃ اللہ البالغہ		۷۔ بزرگانِ ڈھاکہ	۵۱۰	
۵۷۰	۱۳۔ دیگر تصانیف		۸۔ مدرسہ باگھا۔ ضلع راجشاہی	۵۱۲	
۵۷۱	۱۴۔ اصلاحِ معاشرہ		۹۔ شاہ نعمت اللہ قادری	۵۱۳	
۵۷۳	۱۵۔ اشعار اور مکاتیب		۱۰۔ عہدِ آخر کے مشائخِ قادریہ	۵۱۴	
	حکیم الامت کون ہے؟		۱۱۔ غیر شرعی طریقے	۵۱۶	
۵۷۵	۱۶۔ شیعہ سنی خیالات کی تطبیق		۱۲۔ مرتضیٰ شاہی فقیر	۵۱۸	
۵۷۹	۱۷۔ شریعت اور طریقت		۱۳۔ بنگال میں اسلام	۵۲۰	
۵۸۱	۱۸۔ اختلاف بین المذہب		۹۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ		
۵۸۳	۱۹۔ جدید علم الکلام کی ابتدا		۱۔ ۱۷۰۳ء	۵۲۸	
۵۸۴	۲۰۔ حکیم الامت کے علمی کارنامے		۲۔ خاندانی حالات	۵۳۲	
	۲۱۔ قومی زندگی میں شاہ ولی اللہ		۳۔ شاہ عبدالحمید	۵۳۵	
۵۸۵	کامرتبہ		۴۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیم و تربیت	۵۴۱	
	حکیم الامت کے فرزندانِ ارجمند				
۵۸۷	۲۲۔ شاہ عبدالعزیز				
۵۹۱	۲۳۔ تحفہ آنا عشریہ				

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۲۴	شاہ رفیع الدین	۵۹۶	۴	مُرشد آباد	۶۲۴
۲۵	شاہ عبدالقادر	۵۹۶	۵	عظیم آباد	۶۲۸
۲۶	شاہ عبدالغنی	۵۹۷		لکھنؤ کے اکابر شیعہ علماء	
۱۔ علمائے متاخرین			۶	مجتہد العصر مولانا دلدار علی	۶۳۳
۱۔ زوالِ حکومت		۵۹۸	۷	سلطان العلماء سید محمد	۶۳۴
۲۔ زوالِ حکومت کے اسباب		۶۰۱		مجتہد العصر	
علوم اسلامی کا فروغ			۸	لکھنؤی شیعیت کی خصوصیات	۶۳۶
۳۔ فرنگی محل		۶۰۳		دوسرے علمائے شیعہ	
۴۔ درسِ نظامی		۶۰۵	۹	علامہ تفضل حسین کاشمیری	۶۳۹
۵۔ علامہ بحر العلوم		۶۱۰	۱۰۔ اسماعیلی فرقے		۶۴۰
۶۔ آزاد بلگرامی		۶۱۱	۱۲۔ اٹھارہویں صدی کے مشائخ		
۷۔ سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی		۶۱۲	۱۔ چشتیہ سلسلہ کا احیا		۶۴۱
۸۔ شیخ محمد حیات سندھی		۶۱۵	۲۔ نقشبندیہ سلسلہ		۶۴۲
۹۔ مولوی سلام اللہ محدث		۶۱۵	۳۔ شاہ گلشن دہلوی		۶۴۳
۱۰۔ خیر آبادی خاندان		۶۱۶	۴۔ مرزا مظہر جانجاناں		۶۴۵
۱۱۔ شیعہ فرقہ کا فروغ			۵۔ خاتم الاولیاء شاہ غلام علی قدس		۶۴۹
۱۔ اٹھارہویں صدی میں			۶۔ سلسلہ مجددیہ کا دورِ جدید		۶۵۸
شیعیت کا فروغ		۶۱۶	۷۔ شاہ احمد سعید دہلوی ثم مدنی		۶۶۰
۲۔ حاجی محمد محسن		۶۲۰	۸۔ مخزنِ پاکستان میں مجاہدی سلسلہ		۶۶۴
۳۔ دکن کے شیعہ علماء		۶۲۳	۹۔ اردو زبان کی ارتقا		۶۶۵
			اہم تاریخی نکتے		۶۶۶
			منتخب فہرست کتب		۶۶۸

تہذیب

(۱۹۵۷ء)

دُرُودِ کَوِثَرِ اسلامی ہند اور پاکستان کی مذہبی تاریخ کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں عہدِ مغلیہ کی شخصیتوں اور تحریکوں کا بیان ہے۔

ہر ایک دور کی تاریخ نویسی خاص مسائل اور مخصوص مشکلات سے دوچار ہوتی ہے۔ ابتدائی ایام کے متعلق بڑی دشواری کمی معلومات کی تھی۔ عہدِ مغلیہ کے متعلق معلومات اور روایات کی افراط ہے۔ یہاں اصل مشکل بے خبری نہیں بلکہ افواہوں، غیر مصدقہ قصوں اور غلط تاثرات کا وہ رنگ و روغن ہے جس نے حقیقت کے خدخال چھپا دیے ہیں۔

اس صورتِ حال میں غالباً سب سے زیادہ دخل مولانا ابوالکلام آزاد کے تذکرہ کو ہے۔ مولانا کی قابلیت اور علم و فضل مسلمہ ہے۔ بلاشبہ تذکرہ ایک عہد آفریں کتاب ہے۔ انشا پر دازی کا شاہکار بھی اور علم و فضل کی ضیافتِ خوش ذائقہ بھی۔ لیکن مولانا کو مورخ ہونے کا دعویٰ نہیں۔ ہماری قومی تاریخ کے جن واقعات کو انھوں نے بیان کیا ان کے ذکر سے ان کا مقصد مورخانہ نہ تھا۔ پھر ان کے متعلق مولانا نے جو کچھ لکھا تھا اس سے وہ بہت آگے نکل گئے، لیکن مولانا کی کمال انشا پر دازی نے ان نیم صحیح بیانات کو اردو ادب میں دوامی جگہ دے دی ہے۔ اور انشا پر داز کا ایک فقرہ ہزاروں علمی اور تاریخی اوراق پر بھاری ہوتا ہے۔ (رہمدی گورکھپوری)۔ اب حالت یہ ہے کہ ان مضامین پر جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ بیشتر تذکرہ ہی کی صدا سے بازگشت ہے! مولانا کی سحر نگاری سے کئی مشتبہ امور نے مسلمات کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

لہٰذا مثلاً بدایونی کے متعلق تذکرہ اور بھپیں برس بعد کی تصنیف عبارتِ خاطر میں جو تفاوتِ فکر ہے۔ وہ غور کی مستحق ہے۔

مثلاً یہ کہ اکبری الحاد کا قلع قمع "تن تنہا" حضرت مجدد الف ثانیؒ نے کیا۔ یا یہ کہ اکبری شیخ الاسلام (مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری) اور صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہیؒ میں برائیاں ہی برائیاں تھیں اور اکبری مذہبی پالیسی معین کرنے کا باعث فقط ان علما کی خرابیاں تھیں۔ اکبری اپنی سیاسی اغراض نہ تھیں یا یہ کہ جب شیخ عبدالحق محدث نے حضرت مجددؒ کے بعض بیانات کے متعلق ایک رسالہ لکھا تو ان سے ایک "سخت لغزش" سرزد ہوئی جس کی "آخر عمر کے اعتراف و رجوع نے تلافی کر دی"۔ مولانا کے نقطہ نظر کا کرشمہ تھا کہ حکام کی شاہ ولی اللہؒ کی خزیروں سے کما حقہ "باخبر ہوتے ہوئے بھی وہ اس مردِ عصر آفریں کو جس کے فیض سے شاہ اسماعیل شہیدؒ جیسے کئی علما اور مجاہد برسرِ کار ہوئے" اپنے نواسے سے نچلا درجہ دیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد تو خیر اصلاً سیاسی رہنما اور اخبار نویس تھے، کسی علمی ادارے سے وابستہ نہ تھے۔ چند سال ہوئے ایک نوجوان فاضل نے شیخ مجددؒ کے نظریہ "توحید پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا۔ جس پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی تھی۔ جہاں تک فلسفیانہ حصے کا تعلق ہے، مقالہ دلچسپ۔ واضح اور متوازن ہے۔ لیکن سوانحی حصہ اس طرح رطب و یابس سے بھرا ہوا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس حصہ کی اصلاح کیسے بغیر اس مقالہ کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کا مستحق کیسے قرار دیا گیا اور فاضل محقق اور ان کے فاضل نگران نے زبدۃ المقالات جیسی معاصرانہ تصانیف چھوڑ کر ڈیڑھ سو سال بعد کی داستانوں (روضۃ القیومیہ) پر کیوں اعتماد کیا اور حضرت مجددؒ کی تائید میں مہابت خاں کی بغاوت اور اس طرح کے دوسرے حصوں کو درج کتاب کرتے وقت معاصرانہ کتب تاریخ کو کیوں نظر انداز کر دیا؟

جب ان کتابوں کی جو یونیورسٹیوں کی ہر تصدیق کے ساتھ شائع ہوں، یہ حالت ہے تو عامۃ الناس کی معلومات کا کیا حال ہوگا؟ آئندہ سطور میں ہم نے ان

لے مولانا نے بغیر کسی استدلال کے حضرت مجددؒ کے "علمائے سوء" والے فقرے کا اطلاق ان بزرگوں پر کر دیا، جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔

مباحث سے تفصیلی بحث کی ہے اور عام غلط فہمیوں کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ بزرگانِ روحانی کا ذکر کرتے ہوئے سب سے نازک مرحلہ ان کے کاموں کا تجزیہ اور ان پر تبصرہ آئی ہے۔ بلاشبہ اس میں ادب و احتیاط لازم ہے۔ اور غیر ضروری بحثیں اور نکتہ چینی مناسب نہیں، لیکن جب ان ہستیوں کا ذکر ہو، جنہوں نے ہماری قومی زندگی کا دھارا بدل دیا ہے۔ تو ان کے کاموں کا تجزیہ کیسے کرنا ایک مورخ اپنے فرائض سے کس طرح عہدہ بردار ہو سکتا ہے؟ اس کے علاوہ وہ واقعہ نگاری ہی کیا ہوئی، جس میں آپ اصحابِ تذکرہ کے خط و خال نہ پہچان سکیں اور ان کا امتیازی رنگِ طبیعت نہ سمجھ سکیں۔

ہم نے اپنی تصانیف میں مختلف بزرگانِ دین کے کاموں کا تجزیہ کرنے کی جسارت کی ہے۔ ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ کہیں ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور تمام وہ آداب ملحوظ رہیں جو ان بزرگوں کے ذکر و بیان سے وابستہ ہیں، بلکہ ان کے کام کو عقیدت مندانہ حُسنِ ظن سے دیکھا جائے، لیکن قومی ہی خواہی بھی نظر سے اوجھل نہ ہو اور تبصرہ و تجزیہ کو نظر انداز کر کے مورخانہ فرائض سے پہلو تہی نہ کی جائے۔

ہمارا اصول کار وہی ہے، جسے غالب بار بار اپنے خطوط میں درج کرتا تھا۔ یعنی ”راستی بالائے طاعت است“ ہماری مسلسل کوشش ہے کہ حقیقت سے پردہ اٹھائیں۔ واقعات اور شخصیتوں کو ان کی صحیح شکل و صورت میں دیکھیں، خواہ اس سے قومی خوبسندی کی تسکین ہو یا نہ۔ ہمارے ہاں شبلی کے ”منہا میں عالمگیر“ کے وقت سے جو اسلوبِ تاریخ نویسی رائج ہے، وہ اس اصول کے خلاف ہے۔ اور فی الحقیقت اسلامی ہندوستان کی تاریخ اور مذہب اسلام کے متعلق غلط بیانیوں اور غلط پراپیگنڈا کا جو طوفان مخرنی علمی اداروں سے چلا آرہا ہے۔ اسے دیکھ کر ایک خاص قسم کا اندافغانہ یا خود پسندانہ نقطہ نظر پیدا ہو جانا قدرتی امر ہے، لیکن کیا یہ قومی فلاح کا راستا ہے؟ کیا اسے اختیار کر کے اور واقعات کو

ایک رنگین کُہر میں دیکھنے سے ہم تاریخ سے وہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جن کے لیے یہ علم کار آمد ہوتا ہے؛ راقم الحروف کو یقین ہے کہ یہ طریق کار نہ مورخانہ ہے۔ نہ قومی ہی خواہی کا۔ اگر قومی خودداری کی تسکین ہی منتہا ہے آرزو ہے تو اس کے لیے ایم اسلم اور نسیم مجازی کے تاریخی رومان ہی کیوں نہ پڑھ لیے جائیں۔ تاریخ نگاری اور تاریخ خوانی سے فائدہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے اگر اس کے اصول و آئین پیش نظر رہیں اور ان میں راستی بالاسے طاعت است کا اصول سبک مقدم ہے۔

ڈوڈ کوثر کا یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ لیکن کتاب کو زیادہ مفید اور مکمل بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ حجم میں کوئی ڈھائی سو صفحے کا اضافہ ہے۔ بعض ابواب (مثلاً عہد اکبری کی مذہبی تاریخ اور شیخ عبدالحق محدث کے سوانح اور مذہبی کارناموں کا بیان) دوبارہ لکھے گئے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ اس سلسلے میں تمام نئی معلومات کو سمیٹ لیا جائے۔ بعض اہم مباحث (مثلاً اسلامی جنگال کی مذہبی تاریخ۔ روشنیہ فرقہ اور حضرت انوند درویش پشاور کے حالات۔ اٹھارہویں صدی میں شیعہ فرقے کے فروغ کی تاریخ اور مشاہیر شیعہ کا تفصیلی تذکرہ بالکل نئے ہیں اور کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتے ہیں۔ شروع سے ہم نے ان ہستیوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے پر خاص توجہ کی ہے جن کے کام اہم تھے لیکن جن کے متعلق صحیح واقفیت نہ تھی۔ مثلاً نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید کی اسلامی خدمات کو پہلی مرتبہ ڈوڈ کوثر میں بیان کیا گیا اور حضرت خواجہ باقی باللہ کی اہمیت بھی تفصیلی طور پر پہلے پہل اسی کتاب میں نمایاں کی گئی۔ موجودہ ایڈیشن میں بھی ایسے کئی بزرگوں کے حالات اضافہ ہوئے ہیں۔ مثلاً شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری اور شیخ صیحت اللہ کا بیان جن کے علمی اور روحانی کارناموں کی یاد ابھی تک جاوا اور سماڑا میں باقی ہے۔ یا افغان بزرگ شیخ محمد سون کا ذکر جنہوں نے عہد جہانگیری میں سب سے پہلے سجدہ دربار ادا کرنے سے انکار کیا اور اپنی محبت اسلامی

کی بنا پر قید و بند کی سختیاں برداشت کریں۔ اُمید ہے ان اصنافوں کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

قوم کی مذہبی، علمی، فکری تاریخ کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے جو مواقع میسر آئے ہیں ان کے لیے عنایتِ ایزدی کا جتنا بھی شکرا ادا کیا جائے کم ہے۔ لیکن جس قدر طلب کا میدان وسیع ہے، اُسی قدر بھوکریں کھانے اور بے سارہوی کا سامان بھی زیادہ ہے۔

رُودِ کوثر کی کتابت، تصحیح اور طباعت مصنف سے بہت دُور لاہور میں ہو رہی ہے۔ اس میں سینکڑوں بزرگوں کا ذکر ہے۔ ہزاروں کتابوں کے نام آتے ہیں۔ مہتممینِ مطبع کی پوری احتیاط کے باوجود کئی غلطیاں رہ جائیں گی۔ بعض میں میری کوتاہیوں کو دخل ہوگا۔ کاش وہ اہلِ دل، اہلِ علم جن کی رسائی علی گڑھ، ندوہ، دیوبند، دارُالمصنفین وغیرہ کے کتب خانوں تک ہے۔ کتاب پر تنقیدی نگاہ ڈالیں۔ اور مصنف کو اُس کی غلطیوں سے آگاہ اور اپنے مشوروں سے مستفید کریں۔

آکرام

استدراک

(۱۹۶۷ء)

رُودِ کوثر کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت کتاب غیر معمولی تعداد میں طبع کر لی گئی۔ چوتھے ایڈیشن کی نوبت قریباً نو سال کے بعد آرہی ہے۔ اس تحویق کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ چونکہ دھاکہ میں قیام کے باعث راقم السطور کتابت شدہ کاپیوں اور پردفوں کی تصحیح نہ کر سکا۔ اور کتابت کی بہت سی غلطیاں رہ گئیں، ان کی اصلاح میں بڑی تاخیر ہوئی۔

اس وقفہ میں مزید مواد کی فراہمی جاری رہی، جس کے لیے خوش قسمتی ہے غیر معمولی مواقع میسر آئے۔ موجودہ اشاعت میں صفحات کا سائز بدلنے کے باوجود کتاب کے حجم میں کوئی کمی نہیں ہوئی، بلکہ مزید مواد سمیٹنے کے لیے ایک دو اندر آجائے کو جن کا تعلق مذہبی سرگزشت سے زیادہ ادبی تاریخ سے تھا، حذف کرنا پڑا۔ اور خالص مذہبی تاریخ کے متعلق قریباً بیس پچیس فیصدی مواد نیا یا نو ترمیم شدہ ہے۔

اس دوران میں کئی ایسی کتابیں شائع ہوئیں، جن سے عہدِ مغلیہ کی مذہبی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً دو ششمنیہ سلسلہ پر غیر مطبوعہ مواد کی مدد سے پروفیسر ظہور الدین احمد اور مولانا اعجاز الحق قدوسی نے، بالترتیب اپنی کتب پاکستان میں فارسی ادب اور تذکرہ صوفیائے سرحد میں جو کچھ لکھا ہے اس سے حقیقت حال زیادہ واضح ہو گئی ہے۔ اسی طرح حیدر آباد کے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے مجددی بزرگوں کی قلمی اور نایاب تصانیف وغیرہ کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، ان سے بھی تاریخ کے طالب علم کو بڑی مدد ملتی ہے۔ ہم نے ان سب سے استفادہ کیا ہے۔ بعض کتب کی اشاعت میں ہاتھ بٹانے کی سعادت راقم السطور کو نصیب ہوئی۔ مثلاً رسائل مجددیہ۔ مکتوبات سعیدیہ۔ مکتوبات امام ربانی کا امرتسری ایڈیشن (اشاعت ثانی) وغیرہ۔ مکتوبات محصوہ کی (دوبارہ) اشاعت ابھی زیر تکمیل ہے، لیکن اس کی تین جلدیں کسی زمانے میں مختلف مطابع سے ایک ایک کدے چھپی تھیں۔ پہلی ندوہ کے کتب خانہ سے ۱۹۴۶ء میں دستیاب ہوئی تھیں۔ اب دوسری حکیم ذوالقرنین اور تیسری مولوی جمیل الدین احمد (جامعہ بہاولپور) کی بدولت حاصل ہو گئی۔ یہ سب کتابیں میرے زیر مطالعہ رہی ہیں۔ شاید اس سے بھی زیادہ اہمیت افزا وہ مواقع تھے، جو سلسلہ مجددیہ کے بعض مشہور کتب خانوں سے مستفید ہونے کے حاصل ہوئے۔ مدینہ منورہ میں دو مرتبہ حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور دونوں مرتبہ

کافی وقت رباط منظری کے کتب خانہ میں گزرا۔ جہاں سلسلہ 'مجدد یہی نہیں' بلکہ عام تصوف اور علوم اسلامی کا (بالخصوص ان شعبوں کا) جن کا ہند۔ پاکستان سے تعلق ہے) ایک بیش بہا ذخیرہ ہے۔ اسی طرح خانقاہ شریف دہلی اور خانقاہ کنڈیا شریف بھی پہنچنے اور بعض نوادر سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ سرہند شریف کی زیارت بھی نصیب ہوئی، لیکن اگرچہ روضہ مبارک کے باہمت منتظمین نے، عین اغیار کے زرعے میں، درگاہ کا بڑا مستحضر انتظام کر رکھا ہے۔ وہاں علمی ذخیرہ کوئی نہیں۔ ان کے علاوہ انڈیا آفس لائبریری میں ذخیرہ دہلی (Delhi Collection) کے نام سے ایک وسیع مجموعہ کتب ہے۔ جس کی فہرست کبھی شائع نہیں ہوئی۔ لیکن جس میں کتب خانہ شاہی کے بچے کچھے سرمائے کے علاوہ دہلی کے مشہور مدارس اور خانقاہوں کی وہ کتابیں بھی شامل ہیں، جو سن ستاون کی ٹوٹ میں انگریزوں کے ہاتھ آئیں اس میں قلمی نوادر کی افراط ہے۔ اور لیا کے متعدد غیر مطبوعہ، نادر تذکروں کے علاوہ خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ خرد کی قریباً تمام تصانیف ہیں۔ خواجہ کلل کا ایک اہم غیر مطبوعہ رسالہ ہے۔ شیخ آدم بنوری اور ان کے سلسلہ کے متعلق مناقب آدمیہ اور شیخ کے بعض رسائل ہیں۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کی تصانیف کے نہایت قدیم الہد مخطوطے ہیں۔ کلیات باقی باللہ کے ایک مثنیٰ قیمت نسخے میں ان کی وفات کے متعلق بارہ تیرہ ورق کا رسالہ در بیان رحلت ہے جس میں میاں (شیخ) عبدالحق کی لکھی ہوئی تاریخ وفات ہے۔ اور آخر میں 'میاں نور محمد شیخ نور الحق' (ولد میاں شیخ) عبدالحق کا ایک محرر کا مثنیہ ہے راقم السطر کو اس ذخیرہ دہلی سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔

ان کے علاوہ مطبوعہ سد بہار ماخذ زبدة المقامات حضرت القدس (اردو ترجمہ منتخب التلخیص وغیرہ کو پھر سے کھنگالا اور کتبوبات امام ربانی کا کئی بار پھر سے بغور مطالعہ کیا۔

لہ صرف شہر میں ایک ایک کے پاس فارسی کی ایک قلمی تاریخ سرہند کا سراغ ملا۔ لیکن بوجہ میں اس کی تلاش نہ کر سکا۔ لہ افسوس کہ حافظہ نے دھوکا دیا۔ یہ سمجھ کر کہ یہ مثنیہ وہی ہے جو اردو ترجمہ کتبوبات خواجہ باقی باللہ میں شامل ہے، اسے نقل نہ کیا۔

ان سب کی روشنی میں رود کوثر کو نئے سرے سے مرتب کیا گیا ہے متعدد ابواب بالکل نئے ہیں۔ اور کئی نظر ثانی اور اضافوں کے بعد نئے سرے سے لکھے گئے جو مباحث بالکل نئے ہیں۔ ان میں خانِ اعظم خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادگان۔ حضرت مجاہدؒ کے خسر حاجی سلطان تھامیری اور والد ماجد مخدوم عبدالاحدؒ صاحبزادگان (جدیدہ) کی والدہ محترمہ۔ عالمگیر اور بزرگانِ سرسند۔ خانگی صدقات کے مقابلے میں حضرت مجدد کی عالی حوصلگی۔ شیخ عبدالحق محدث اور بدایونی۔ شاہ احمد سعید دہلویؒ مدنی اور مغربی پاکستان میں مجددی سلسلے کی توسیع قابل ذکر ہیں۔ جن ابواب میں تفصیلی اضافے ہوئے ہیں ان میں روشنیہ فرقہ۔ ذکر حضرت خواجہ محمد باقی باللہ۔ ابوالفضل اور اکبر الگار۔ صوفیانہ احوال اور نظریہ قیومیت اور شیخ محدث اور حضرت مجدد والف ثانی شامل ہیں۔

تاریخی تحقیق اور عقیدہ مند ارادت کے تقاضے ایک طرح کے نہیں تھے کم از کم ابتدا میں ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا خاص طور پر دشوار ہوتا ہے۔ لیکن اگر فریقین انصاف اور سمجھ سے کام لیں اور ان کے درمیان نقطہ نظر کا کوئی بنیادی اختلاف نہ ہو تو یہ منزل طے ہو جاتی ہے۔ سلسلہ کوثر شروع کرتے وقت ہمیں راہ کی ان دشواریوں کا احساس تھا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ صد ہا بزرگوں کے اس تذکرے میں دو باتیں کے علاوہ کہیں کوئی خاص مشکل پیدا نہیں ہوئی۔ ان دو باتیں بزرگوں میں سب کا اہم سہی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کی ہے جن کے متعلق ہمارے بعض بیانات سے اور بالجملہ تذکرہ اور روضۃ الصوفیہ سے جو اختلافی نقطہ نظر کا اہم نمند رجہ بالا تمہید میں اظہار کیا ہے، اس سے بعض بزرگانِ سلسلہ نے تفصیل، بلکہ شدت سے اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں جو تحریریں پہلے ہماری نظر سے گزری۔ پروفیسر محمد فرمان کی حیات مجددہ ہے۔ جس میں انھوں نے رود کوثر کو ایک متوازی تصنیف کی حیثیت سے پیش نظر رکھا ہے۔ اور ہمارے بعض بیانات کی تفصیلی تردید کی ہے۔ پروفیسر صاحب کو بعض امور میں غلط فہمی ہوئی ہے (مثلاً شیخ بدیع الدین کی نسبت ہمارے اندراج کے متعلق) اور جیسا کہ انھیں اعتراف ہے ان کا لہجہ کہیں قلیل بھی ہو گیا ہے۔ لیکن چونکہ انھوں نے انصاف اور تحقیق کے اصولوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ اور مورث سلسلہ کی محبت میں بر خوار ہو کر دل کو خوفِ خدا سے خالی نہیں ہونے دیا۔ اس لیے ان کی تصحیح و تنبیہ سے استفادہ کرنا دشوار نہ تھا چنانچہ سوائے ایک اہم بحث کے (جسے اب زیادہ وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے) ہم نے اپنی

کتاب پران کے اعتراضات کی روشنی میں نظر ثانی کی ہے۔ اور حسب ضرورت اپنے بیان میں ترمیم کر دی ہے۔ اس سلسلے میں دوسری تحریر ایک محترم بزرگ کی ہے جن کے احساناتِ مجتبان سلسلہ پر بڑے وقع ہیں اور جن کا مرتبہ سلوک میں ہی نہیں علم و فضل میں بھی بڑا بلند ہے۔ ہم فلان کے ارشادات کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ (بلکہ مدینہ منورہ کے پہلے سفر کا فوری محرک یہ خیال تھا کہ اس پاک سرزمین میں پہنچ کر ایک کھٹن سلسلے میں انسانی کی درخواست کی جائے لیکن افسوس کہ فاضل موصوف اور ہمارے نقطہ نظر میں بنیادی اختلافات ایسے ہیں بحالاتِ موجودہ اس خلیج کو پر کرنا ممکنات سے نہیں۔ دوسرے امور سے قطع نظر اس کی اہم وجہ ملاحظہ فرمائیے۔)

(۱) حضرت مجددؑ کی نسبت محترم کا بنیادی نقطہ نظر وہی ہے جو روضۃ القیومید کے مصنف کا تھا اور جس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے (تذکرہ میں) رنگ و روغن بھرا ہے۔ ان کے نزدیک دورِ حاضر میں حضرت مجددؑ کے متعلق بہترین کتاب ابوالفضل سے مولانا احسان اللہ عباسی گورکھپوری نے لکھی۔ (بس کا سوانحی حصہ روضۃ القیومیکا خلاصہ ہے)۔ فرماتے ہیں: حضرت مجددؑ کے متعلق یہی ایک ایسی کتاب ہے جسے ہمارے دور میں بڑی ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ مولانا مرحوم نے حضرت مجددؑ کے حالات بڑی تحقیق سے لکھے ہیں۔ ہماری رائے اس سے بالکل مختلف ہے۔

(۲) معاملہ صرف تاریخی محاملات کے متعلق اختلاف رائے کا نہیں بلکہ جیسا کہ موصوف کو احساس ہے۔ جلالی اور جمالی نقطہ نظر کا ہے یعنی فلسفہ زندگی اور مسلک کا اختلاف ہے۔ ان کو ہم سے اصولی شکایت یہ ہے کہ ان کے خیال میں ہم نے... ”جلالی رنگ“ والے حضرات کی تنقید یا تنقیص میں بڑا زور صرف کیا ہے۔ ”تنقیص“ کے متعلق تو ہمیں ان اتفاق نہیں لیکن اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ”جلالی رنگ“ والے حضرات کے متعلق متداول نقطہ نظر کو نسبتاً کڑے طریقے سے پرکھا ہے۔ اور جمالی رنگ“ والے حضرات کے حالات کی تلاش اور ان کی خوبیاں سمجھنے اور نمایاں کرنے کی خاص کوشش کی ہے تو ان کی شکایت بے بنیاد نہیں۔ شاید اس میں ہمارے رجحان طبع کو دخل ہو۔ لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ جب تک یہ طریق کار اختیار نہ کیا جائے بیان واقعات میں صحت و توازن کا حصول ناممکن ہے۔ یعنی جلالی شان والے بزرگوں کی عظمت کا احساس تو سطحی نظر میں بھی ہو جاتا ہے، لیکن جو اصحاب ستر احوال اور احوال پر شدتِ عامل ہے ہیں اور جن پر انکسار کا رنگ غالب ہے ان کے حالات کا اندازہ بغیر خاص کوشش کے نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت کو نظر انداز کرنے سے واقعہ نگار میں طرح فاش

غلطیوں کا متحکب ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال احسان مصباحی کی کتاب میں ملتی ہے جو ہادی زمانہ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کے انگسار نہ بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ”حضرت خواجہ باقی باللہؒ بظاہر آپ (حضرت مجددؒ) کے پیر اور دیر پردہ مرید تھے“ !!

اس کے علاوہ ہیں یہ بھی خیال ہے کہ اگر عبد الکریم کی کمزوریوں اور جارحانہ ہندو احمیت کے خلاف جلالی طریق کار اختیار کرنا مستحسن بلکہ عین صواب تھا۔ تو خودی اور خود پسندی کے موجود دور میں جہالی خوبیوں کو نمایاں کرنا بھی اسی طرح ضروری ہے۔

آج یہ خیال کہ ان ہستیوں پر جنہوں نے قومی زندگی کا دھارا بدل دیا جدید تحقیق و تجربہ کی روشنی نہ پڑے گی۔ یا زور بیان اور جوش و جذبہ سے روضۃ القیومیہ کی روایات کو برقرار رکھا جاسکے گا ممکن الحصول نہیں۔ اور ذمہ دار بزرگان سلسلہ اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں۔ (مثلاً خانقاہ شریف دہلی کے سربراہ حضرت زید ابوالحسن فاروقی مدظلہ نے فاضل موصوف کے سالہ کے ساتھ روضۃ القیومیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اس احساس کا بہت اظہار ہے)۔ اب تحقیق و تلاش کے عمل کو روکا نہیں جاسکتا۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ محبان سلسلہ اور غیر جانبدار اہل تحقیق حضرت مجدد قدس سرہ کے ارشادات اور مستند متعلقہ تحریروں کا مؤرخانہ و بیانت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، لیکن پورے ادب و احترام بلکہ حسن ظن کی محبت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں۔ اور ان کی شخصیت مرتبے اور حقیقی احسانات کے نقاب کریں حضرت قدس سرہ کی شخصیت اتنی بلند و بالا تھی اور ان کی شخصی زندگی میں بہت جرات بلذکر و ارفعیت و محبت کا ایسا امتزاج تھا۔ ان کی دینی خدمات اتنی عظیم الشان تھیں اور جارحانہ ہندو احمیت کا (جب اس کا دار السلطنت میں احساس ہی نہ تھا) مقابلہ کر کے انھوں نے قومی شخصیت کو اس طرح خود بینی خود ہمدانی اور توانائی بخشی اور ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اس پلے کی تھی (ان کی دوسری خوبیوں۔ مثلاً عظیم صلاحیت روحانی، علمیت غیر معمولی تنظیمی صلاحیت امتناظر طرز تحریر کے علاوہ)۔ کہ اگر ان پہلوؤں کا صحیح طور پر مطالعہ ہو تو خواہ تحقیق کی روشنی میں روضۃ القیومیہ کے نقطہ نظر کو ترک کرنا پڑے، بلکہ حضرت کے بعض ارشادات (مثلاً ہندو سر اور دوسرے علوم عقلی کے متعلق ان کے اظہار خیال) کو لائق تاویل سمجھا جائے۔ تب بھی ان کے عقو مرتبہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

راقم السطور نے اپنی بساط اور سمجھ کے مطابق اس طریق کار پر عمل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا رحم کے غلطیوں سے بچائے۔

اکلام

رود کوثر

اکبر سے پہلے

عہدِ مغلّیہ | اسلامی ہندوستان کے ابتدائی دور کی تاریخ پڑھیں تو مغلوں سے زیادہ ہیبت ناک اور قابلِ نفرت کوئی ہستی نظر نہیں آتی۔ سلاطینِ دہلی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ”فتنہِ مغول“ کا سدِ باب تھا۔ باقی سب باتیں مجزوی اور ضمنی تھیں۔ منہاج سراج۔ ضیاء الدین برنی اور امیر خسرو منگولوں کا ذکر کرتے ہیں تو ”کفار“ ”کفارِ مغول“ ”ملاعین“ اور اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے جو مسلمان ہو گئے تھے ان پر بھی اعتماد نہ کیا جاتا اور علاء الدین خلجی نے مغل نو مسلموں کا قتل عام کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر ان مظالم کا خیال کریں جو چنگیز خاں اور ہلاکو نے نہیں بلکہ تیمور نے اہلِ دہلی اور شمالی ہندوستان پر توڑے تو یہ خوف اور جذبہٴ نفرت بجا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن قدرت کے طریقے عجیب ہیں۔ جب ہندوستان میں اسلامی حکومت کی کمزوری سے وہ فحشِ جو غیاث الدین بلبن اور علاء الدین خلجی نے مغلوں کے خلاف قائم کی تھی ٹوٹ گئی اور ہندوستان پر مغلوں کا تسلط ہو گیا تو اسلامی ہندوستان کے سب سے زیادہ شاندار اور پُر امن دور کا آغاز ہوا۔ اور نہ صرف ملکی نظم و نسق اور

خلقت کی مرفہ الحالی کا اعلیٰ درجے پر انتظام ہوا۔ بلکہ ہندوستانی تہذیب و تمدن اور قومی علم و ادب کی تاریخ میں ایک درخشاں باب کا اضافہ ہوا۔ اس کی کئی وجہیں تھیں پہلی یہ کہ جو حکمران تاریخ میں شاہان مغلیہ کے نام سے مشہور ہیں، ان کا منگولوں یا منگولوں سے فقط دور کا تعلق تھا۔ وہ حقیقت میں چغتائی ترک تھے، امیر تیمور کی نسل سے۔ ان میں منگولوں نہیں ترکوں کی خصوصیات تھیں۔ اور وہ بھی ان ترکوں کی جنہوں نے امیر تیمور کی عالمگیر فتوحات کے بعد مشرق و مغرب کے تہذیبی عناصر اخذ کرنے کی کوشش کی تھی۔ امیر تیمور کی بڑی آرزو تھی کہ وہ اپنے دارالحکومت سمرقند کو مشرق کا تہذیبی مرکز بنادے۔ اس مقصد کے لیے جہاں کہیں وہ جاتا اہل ہنر، اہل صنعت اور مہماروں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے آتا۔ ان کی مدد سے سمرقند میں عالیشان، خوبصورت عمارتیں تعمیر ہوئیں اور شہر عروس البلاد بن گیا۔ تیمور کے وارث فتوحات ملکی میں تو اس کے مرتبہ کو نہیں پہنچے لیکن علم کی محبت اور تہذیب و ثقافت کی سرپرستی میں اس سے بہت بڑھ گئے۔ اس کی وفات کے جلد ہی بعد اس کی وسیع سلطنت محدود حکمرانیوں میں منقسم ہو گئی۔ لیکن اس کے جانشینوں نے انھی مختصر ریاستوں میں علم و ثقافت کو فروغ دیا۔ تیمور کا بیٹا شاہ رخ خود شاعر اور عالم تھا۔ اس نے چین اور دوسرے دوروزاد ملکوں میں سفارتیں بھیجیں، جو وہاں سے تفصیلی حالات لے کر آئیں اور جن کے سفر نامے مورخین کے لیے معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہیں۔ اس کا ایک بیٹا الخ بیگ تھا جس نے اپنے دارالحکومت استرآباد میں ایک رصد گاہ تعمیر کرائی۔ دوسرے بیٹے بایسنقر نے کتابیں جمع کرنے میں ناموری حاصل کی۔ لیکن میزایان تیموری میں سے جس حکمران نے علم و فن کی سرپرستی کو کمال تک پہنچایا وہ تیمور کے ایک بیٹے عرش کا پڑپوتا سلطان حسین مرزا تھا جو ۱۴۶۸ء سے ۱۴۹۶ء تک خراسان کا حکمران رہا۔ اس کے دارالحکومت ہرات میں بہزاد جیسا منصور، جامی جیسا شاعر، میرخواند اور خواند میر جیسے مورخ اور شیرعلی نوائی جیسے ہر فن

درباری تھے۔

مغلیہ حکومت کا بانی بابر حسین مرزا کا دوست اور مداح تھا لیکن وہ صرف ان عظیم النظیر ہستیوں ہی کا قدردان نہ تھا، جو حسین مرزا کے دربار میں جمع ہو گئی تھیں۔ بلکہ اسے وہ روح عزیز تھی، جو ان مشاہیر کی سرگرمیوں میں کار فرما تھی۔ یعنی جو کام ہاتھ میں لیا جائے، اسے کمال تک پہنچانے کی خواہش۔ بابر اپنی خود نوشت سوانحمر میں کس حسرت اور کس فرط احترام سے لکھتا ہے:-

”زمان سلطان حسین مرزا عجیب زمانے بود۔ از اہل فضل مردم بے نظیر خراسان، ہر خصوص شہر ہری مملو بود۔“

ہر کس بہر کار کہ مشغول بود۔ ہمت و غرض او آں بود کہ ہر کار را بکمال رساند۔“

ان تہذیبی روایات کو بابر اور اس کے جانشینوں نے اپنی نئی سلطنت میں منتقل کیا لیکن مغلیہ تہذیب و تمدن کے سدا بہار باغ کی سیرابی دوسرے شرمپوں سے بھی ہوئی۔ جن میں ایران۔ جسے ایک مورخ نے ”دبستان ہند“ لکھا ہے، سب سے بڑھ گیا۔ بابر کے تعلقات صفوی خاندان کے بانی شاہ اسماعیل سے خوشگوار تھے جب ہمایوں کو شیر شاہ افغان نے ہندوستان سے نکال دیا اور اسے دوبارہ تاج و تخت طہماسپ صفوی کی مدد سے ملا تو مملکت میں ایرانیوں کا عمل دخل بہت بڑھ گیا۔ اس نے جلا وطنی کے اٹھارہ مہینے زیادہ تر ایران میں گزارے تھے۔ اس دوران میں ایرانی تہذیب و تمدن سے اسے گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا اور جب وہ ہندوستان کو واپس لوٹا تو متعدد ایرانی شعرا۔ مصنفین۔ اہل قلم اس کے ساتھ تھے، جنہوں نے ایک نئے تہذیبی عمل کا آغاز کیا، جو آگے چل کر اور مستحکم ہو گیا۔ ان تہذیبی اثرات کے علاوہ ایک اہم حقیقت یہ ہے کہ اسلامی علوم کا بھی برصغیر میں فروغ پہلی مرتبہ عہد مغلیہ میں ہوا۔ اس کی ایک وجہ تو حکومت کا استحکام اور علوم کی سرپرستی، تھا لیکن اس سے بھی بڑا سبب عرب اور بالخصوص عربین نے شمالی ہندوستان کا تعلق تھا، جو اکبر کی فتح گجرات کے بعد

بحری راستے سے پیدا ہو گیا۔ اب علوم اسلامی کے طالبین کو خطرناک صحرا و جنگل کے راستے غیر ممالک میں نہ کاٹنے پڑتے بلکہ سورت اور کھنابت کی بندگاہوں سے جہازوں میں بیٹھ کر سیدھے حجاز جا پہنچتے اور علوم اسلامی کے اصل سرچشموں سے اپنی پیاس بجھاتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس دور میں شیخ عبدالحق محدث - شاہ ولی اللہ - علامہ وجیہ الدین گجراتی - مولانا یعقوب صیرفی کشمیری - سیالکوٹی جیسی کئی ہستیاں برسرِ کار آئیں جو حجاز میں تعلیم کی تکمیل کر کے اپنے اپنے علاقوں میں درس و تدریس کے مرکز بن گئے اور ان کے وجود ہائے گرامی سے علوم اسلامی بالخصوص علم حدیث کو ایک بالکل نیا فروغ حاصل ہوا۔ اور عام اسلامی مسائل کے متعلق بھی محلوٰات زیادہ صحیح اور نقطہ نظر زیادہ راسخ العقیدانہ ہو گیا۔

ان کے علاوہ اور بھی اثرات تھے۔ فرنگی تاج اور پادری، توپچی اور طبیب بھی اب ملک میں پہنچ رہے تھے۔ ہندوستان کی قدیم قوموں سے ربط و مضبوطی رہا تھا اور ان کا ادب و فن بھی دربار میں عزت پاتا تھا۔ مختلف بلکہ مخالف اثرات کی موجودگی سے بعض اوقات تلخ کشمکش کے لمحے آئے اور ایک زمانے میں تو خطرناک صورت حالات پیدا ہو گئی لیکن خدا کا فضل شامل حال رہا۔ اراکین سلطنت اور اہل اللہ میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے حالات پر قابو پالیا۔ اسلامی اثرات بہر صورت غالب رہے اور ساتھ ساتھ مغلوں نے جنہیں اس زمانے میں اہل مغرب Grand Mughals کہتے تھے، فنون لطیفہ - انتظامی معاملات - سیاست مدن - عام تہذیب و تمدن میں ایک ایسا محیار قائم کیا جو نہ صرف برصغیر بلکہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

مغلیہ حکومت کی ابتدا | مغلیہ خاندان کی بنا سلطان ظہیر الدین بابر نے دہلی جو تیمور کی نسل سے تھا۔ گیارہ برس کی عمر میں وہ ترکستان کے شہر فرغانہ میں تخت نشین ہوا لیکن مخالفوں سے ایک

طویل کشمکش کے بعد اسے موروثی وطن چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد اس نے پہلے
کابل میں اپنی حکومت قائم کی اور پھر ہندوستان کے بعض امیروں کی دعوت پر
جو حاکم وقت ابراہیم لودھی کے سلوک سے نالاں تھے، ہندوستان آیا اور ۱۵۱۹ء
میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم کو شکست دے کر دہلی پر قابض ہو گیا۔

بابر نے دہلی فتح کر لی لیکن دہلی کی فتح سے ہندوستان فتح نہ ہوا تھا۔ مرکزی
حکومت کی کمزوری سے ہر طرف صوبیدار خود مختار ہو گئے تھے شمالی ہندوستان
میں رانا سانگا نے بڑا اقتدار حاصل کر لیا تھا اور بابر کا سب سے بڑا معرکہ ۱۵۱۹ء میں
اسی کے ساتھ ہوا۔ حکومت دہلی کے کمزور ہو جانے پر بہت سے ہندو راجاؤں
نے سزا ٹھایا تھا۔ وہ بھی رانا سانگا کے ساتھ تھے۔ اس کا اپنا لشکر ایک لاکھ کا
تھا۔ نارواڑ۔ چندیری اور دونگر پور کے راجاؤں اور دوسرے راجپوت رؤسا
نے بیچاس لاکھ ہزار سوار اس میں اور اضافہ کیے اور لودھیوں کو ملا کر قریب
پونے دو لاکھ فوج بابر کے مقابلے میں آئی۔ شروع شروع میں بابر نے مخالفوں
کی پروانہ کی لیکن جب شاہی فوج کے ہراولوں کو راجپوتوں نے شکست دی اور
بیانہ کی فوج جو ان کی مدد کو گئی تھی اُسے بھی شکست کھا کر محصور ہونا پڑا تو پھر
شاہی لشکر پر فکر و ہراس طاری ہوا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ بڑے قلعے محمّد
سرداروں کے سپرد کر کے پنجاب لوٹ جانا چاہیے اور کسی لطیفہ غیبی کا انتظار
کرنا چاہیے۔ لیکن بابر نے ایک پُر جوش اور دلولہ انگیز تقریر کی اور کہا کہ اطراف و
اکناف کے مسلمان بادشاہ ہم پر اظہارِ نفرت کریں گے اور کہیں گے کہ ہم زندگی کو
عزیز سمجھ کر ایک بڑی سلطنت کو ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ جو امر دی کا تقاضا ہے کہ
ہم شہادت کے لیے تیار ہو جائیں اور جان توڑ کر لڑیں۔

یوں جان آخر از تن ضرورت رود ہماں بہ کہ بارے بعزت رود
سرا انجام گیتی ہمیں است و پس کہ نامے پس از مرگ ماند ز کس
بابر کی اس تقریر سے بڑا جوش پیدا ہوا۔ سب نے الجہاد و الجہاد کا نعرہ لگایا۔

اور قسمیں کھائیں کہ ہم میدانِ غزاسے مُنہ نہیں موڑیں گے۔ مر گئے تو شہید اور کامیاب ہوئے تو غازی۔ بابر نے بھی جو شراب کا بڑا دلدادہ تھا۔ شراب نوشی اور دوسرے غیر مشروع احکامِ حتیٰ کہ ریش تراشی سے توبہ کی اور خداے عزوجل کی بارگاہ میں دعا کر کے میدانِ جنگ میں آگے بڑھا۔ معرکہ سارا دن جاری رہا۔ راجپوت جانتے تھے کہ اس لڑائی سے شمالی ہند کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ جان توڑ کر لڑے لیکن فتح آخر کار بابر کی ہوئی۔ فتح بادشاہ اسلام لڑائی کی تاریخ ہوئی اور اس کے بعد بابر نے غازی کا لقب اختیار کیا۔

سیکری کی لڑائی میں جو راجپوت راجے رانا سالگا کی مدد کو آئے تھے ان میں چندیری کارا جامیدنی رائے بھی تھا۔ رانا سالگا کو شکست دینے کے کچھ عرصہ بعد بابر نے چندیری کا رخ کیا اور اسے فتح کر کے قدیمی قلعہ دار احمد شاہ بن ناصر الدین متدوی کے سپرد کیا۔ بابر نے جب یہ علاقہ فتح کر کے چندیری۔ سارنگپور اور رنتمبور کی مسجدیں اور خانقاہیں دیکھیں تو معلوم ہوا کہ رائے سین نے جو مالوہ کا با اختیار وزیر تھا، انھیں رانا سالگا اور میدنی رائے کے حکم سے حیوانات کا مسکن بنا کر فضلہ گائے سے لپک رکھا ہے، شیخ زہین الدین صدر کی کوشش سے یہ کثافت اور غلاظت دور ہوئی اور مؤذن اور جازوب کش مقرر ہو کر پھر ان مسجدوں میں آوازِ اذان بلند ہونی شروع ہوئی۔

مغلیہ خاندان نے بڑے بڑے نامور بادشاہ پیدا کیے ہیں لیکن بابر کی شخصیت میں ایک خاص دلکشی ہے۔ اس کی ذات اسلامی تمدن کی اس امتیازی خصوصیت کو نمایاں کرتی ہے کہ ہندوؤں کے برعکس جن میں کستری فنونِ جنگ میں اور بہن علم و ادب میں کمال حاصل کرتے ہیں، اسلامی طرزِ معیشت میں ایک ہی شخص بیک وقت صاحبِ سیف و قلم ہو سکتا ہے۔ بابر فقط ایک بہادر سپاہی اور قابل سپہ سالار ہی نہ تھا بلکہ وہ فارسی اور ترکی کا اچھا شاعر بھی تھا۔ اس کی لکھی ہوئی ترکِ بابر اپنی قسم کی ایک بے نظیر کتاب ہے اور بابر کی جامع صفات شخصیت کا دلچسپ مرقع ہے۔ اس میں لفاظی نہیں۔ خلوص ہے۔ اور سنی سنائی باتیں نہیں۔ آنکھوں دیکھی اور مشاہدہ

کی ہوئی چیزوں کا بیان ہے۔ مناظرِ فطرت۔ درختوں اور پرندوں سے بابر کو جو دلچسپی تھی اس کا تفصیلی اظہار ہے اور ترکستان۔ افغانستان اور ہندوستان کے متعلق بڑے پتے کی اور پر مغز باتیں درج ہیں۔ تو زکب بابر کی تصنیف کے علاوہ بابر خطِ بابر کا مؤجد تھا اور اس طرزِ تحریر میں اس نے کلامِ مجید کے کئی نسخے لکھ کر مکہ معظمہ بھجوائے۔ اسے ہندوستان میں بہت عرصہ رہنے کا موقع نہیں ملا لیکن اپنی فطری ذہانت سے اس نے جلد ہی یہاں کی خصوصیات پالیں اور اس نے ہمایوں کے لیے جو وصیت لکھی اس سے اس کی سمجھ۔ انصاف پسندی اور مدبرانہ قابلیت کا پتا چلتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

”فرزند من! ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ اس نے تمہیں اس ملک کا بادشاہ بنایا ہے۔ اپنی بلاؤں کا میں تمہیں ذیل کی باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:-

- (۱) تم مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز جگہ نہ دو اور لوگوں کے مذہبی جذبات اور مذہبی رسوم کا خیال رکھتے ہوئے رورعایت کے بغیر سب لوگوں کے ساتھ پورا انصاف کرنا (۲) گاؤں کشی سے بالخصوص پرہیز کرنا کہ اس سے تمہیں لوگوں کے دل میں جگہ مل جائے اور اس طرح وہ احسان اور شکر لے کی زنجیر سے تمہارے مطیع ہو جائیں۔
- (۳) تمہیں کسی قوم کی عبادت گاہ مسمار نہیں کرنی چاہیے اللہ ہمیشہ سب کے پورا انصاف کرنا چاہیے تاکہ بادشاہ اور رعیت کے تعلقات دوستانہ ہوں اور ملک میں امن و امان رہے
- (۴) اسلام کی اشاعت ظلم و ستم کی تلوار کے مقابلے میں لطف و احسان کی تلوار سے بہتر ہو سکے گی (۵) شیعہ متی اختلافات کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہو۔ کیونکہ ان سے اسلام کمزور ہو جائے گا (۶) اپنی رعیت کے مختلف خصوصیات کو سال کے مختلف موسم سمجھو تاکہ حکومت بیماری اور ضعف سے محفوظ رہ سکے۔

سہ ترجمہ از اندین اسلام [ثانی ٹس] اس وصیت کی ایک نقل اسٹیٹ لائبریری بھوپال میں ہے۔

بابر نے ۱۵۳۱ء میں وفات پائی اور اس کی جگہ ہمایوں تخت نشین ہوا۔ وہ ابھی تیس سال کا نوجوان تھا اور ضرورت سے زیادہ نرم دل۔ شیرشاہ نے اسے شکست دے کر ۱۵۴۰ء میں ایران کی طرف بھگا دیا اور خاندان سور کی بنیاد ڈالی جو تقریباً پندرہ سال برسرِ اقتدار رہا۔

شیرشاہ اور خاندان سور | شیرشاہ جس نے پانچ سال تک تختِ دہلی پر حکومت کی ایک غیر معمولی آدمی تھا۔ اس نے جو پور کے

مدرسوں میں تعلیم پائی تھی۔ سکندر نامہ۔ گلستان۔ بوستان وغیرہ اسے زبانی یاد تھیں۔ فلسفے سے بھی واقف تھا اور عربی میں کافیہ۔ تخرج کافیہ مصنفہ تصانیف شہاب الدین پڑھ چکا تھا۔ وہ قدیم سلاطین کی تاریخ کا شائق تھا اور علماء و فضلا کی بڑی قدر کرتا تھا۔ علم و فضل سے دلچسپی کے علاوہ بڑا منتظم اور قابلِ حاکم تھا اور اسی قابلیت کے زور سے ایک معمولی جاگیردار کے عہدے سے ترقی کرتا ہوا ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔

بدقسمتی سے اسے تختِ دہلی پر فقط پانچ سال بیٹھنا نصیب ہوا۔ اس عرصے میں بھی اسے لڑائیوں سے فرصت نہ ملی لیکن اس تھوڑی سی مدت ہی میں اس نے انتظامِ سلطنت میں نمایاں اصلاحیں کیں جنہیں شمالی ہندوستان میں اکبر اور دکن میں اورنگ زیب نے وسعت دے کر ملک کی خوشحالی کا انتظام کیا۔ عہدِ مغلیہ کے مورخین نے عام طور پر شیرشاہ سے انصاف نہیں کیا لیکن پھر بھی جو حالات ہم تک پہنچتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیرشاہ بڑا بیدار و منظم بادشاہ تھا اور اگر موت اُسے کچھ مدت دیتی تو شاید آج ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا!

شیرشاہ ۱۵۴۵ء میں کالنجر کا محاصرہ کرتا ہوا مارا گیا اور اس کی جگہ اسلام شاہ سوری تخت نشین ہوا۔ اس کا زمانہ مختلف جھگڑوں میں گزرا۔ اور جب ۱۵۵۲ء میں وہ مر گیا تو مغلوں نے اس کے جانشین سے تختِ دہلی چھین لیا اور ۱۵۵۵ء میں ہمایوں بھو دہلی اور آگرے پر قابض ہو گیا۔

عہدِ دہلی تحریک | اس زمانے میں اضلاع یورپ میں ایک تحریک شروع ہوئی۔

جس کا مقصد نہایت نیک تھا۔ یعنی تجدیدِ دین اور احیاءِ ملت اور اس نے بعض مخلص اور قابل افراد کو متاثر کیا۔ لیکن اس قسم کی بہت سی دوسری کوششوں کی طرح یہ تحریک بھی بہت جلد باقی تحریک کے شخصی دعووں۔ جمہوریت کی مخالفت اور اصلاح کے چند نہایت خاص طریقوں تک محدود ہو گئی۔

اس تحریک کے بانی سید محمد جوہری ^{۱۲۳۳ھ} میں پیدا ہوئے۔ دوست دشمن گواہ ہیں کہ وہ ظاہری اور باطنی علوم میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کے مرشد شیخ دانیال چشتی جوہری اور دوسرے علماء جوہری نے آپ کو نوجوانی میں ہی اسد العلماء کا خطاب دے رکھا تھا۔ جوہری کا آخری بادشاہ سلطان حسین شرتی جو ^{۱۲۵۸ھ} میں تخت نشین ہوا اور ^{۱۲۸۸ھ} میں بہلول لودھی کے ہاتھوں تاج و تخت کھو بیٹھا اور بنگال میں پناہ گزیں ہو کر ^{۱۲۹۹ھ} میں فوت ہوا، اس وقت جوہری کے تخت پر قابض تھا۔ ہمدویوں کی روایت ہے کہ وہ راؤ دلپت رائے والی گور کا خراج گزار تھا اور سیّد محمد نے اُسے وعظ و نصیحت سے ایک غیر مسلم کو خراج دینے سے باز رکھا اور اس سے لڑنے کے لیے تیار کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اپنے سلطان کی مدد سے پندرہ سو جوان ہیرا کی ملازم رکھے۔ جب ہنگامہ کارزار گرم ہوا تو مسلمان فوج کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن سید محمد جوہری اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈٹے رہے بلکہ انھوں نے آگے بڑھ کر خود لپ رائے کو تر تیخ کیا اور شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا۔

ہمدوی روایت ہے کہ جب آپ نے راجا پر زور کا وار کیا اور تلوار سر کاٹتی ہوئی سینہ تک جا پہنچی تو دلپ رائے کا دل باہر نکل پڑا۔ آپ نے دیکھا

۱۷۰۰ء یہ گور اسلامی بنگال کا قدیمی دار الخلافہ نہ تھا۔ وہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔ مولوی ابو ظفر ہمدوی کا خیال ہے کہ ترمیٹ کے زمیندار (یاراجا) سے حسین شاہ کی جنگ ہوئی تھی کیونکہ اس نے جوہری کا خراج نہیں ادا کیا تھا اور اس جنگ میں اسد العلماء بہ نظر ثواب جہاد میں شریک ہوئے۔

کہ جس جُبت کی مقتول راجا پوجا کرتا تھا، اس کی صورت دل پر کندہ ہے۔ یہ دیکھ کر آپ پر ایک جذبہ کی حالت طاری ہو گئی کہ اگر جھوٹے معبودوں کا اتنا اثر ہوتا ہے تو حقیقی معبود کا کتنا اثر ہوگا۔ یہ کیفیت آپ پر بارہ برس تک رہی۔ جب افاقہ ہوا تو آپ نے چالیس برس کی عمر میں وطن سے ہجرت کی۔ پہلے جنگل کے راستے بہار میں وانا پور گئے۔ وہاں سے کالپی، چاندیری، چانپانیر اور مانڈو ہوتے ہوئے دکن پہنچے۔ احمد نگر میں احمد نظام شاہ بن نظام الملک بھری کے اولاد نہ ہوتی تھی۔ خدا نے آپ کی دعا قبول کی اور اس کے اولاد ہوئی۔ بیدر میں کئی علما آپ کے مرید ہو گئے۔ بیدر اور چانپانیر میں آپ نے ڈیڑھ ڈیڑھ سال قیام کیا۔ بالآخر گلبرگہ اور بیجا پور ہوتے ہوئے ڈابول بندر آئے اور اپنے تین سوساٹھ ہمراہیوں کے ساتھ ۱۶۹۵ء میں جہاز کے راستے جدہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچے اور حج سے فارغ ہوئے۔ طواف کعبہ آپ نے حجر اسود اور رکن کے درمیان مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ واپسی پر آپ کھمبایت پہنچے، جہاں بہت سے لوگ آپ کے مرید ہو گئے۔ وہاں سے احمد آباد گئے جہاں آپ نے کہا کہ میں اس دنیا میں مادی آنکھوں سے خدا دکھا سکتا ہوں اس پر علما نے مخالفت کی اور آپ کے اخراج کا حکم ہوا۔ وہاں سے پٹن پہنچے۔ جہاں بہت سے معتقدوں کے باوجود یہی صورت پیش آئی۔ پٹن سے آپ برکی گئے جہاں آپ نے مہدی موعود ہونے کا پھر سے اعلان کیا اور مختلف حکمرانوں کو تبلیغی خطوط بھیجے۔ پھر جالور۔ ناگور۔ جیسلمیر ہوتے ہوئے ٹھٹھہ پہنچے جو سندھ کا پایہ تخت تھا۔ یہاں جام نظام الدین والی ٹھٹھہ کی مخالفت کے باوجود کئی اکابر

لے آج کل کی مادی دنیا اس روایت کو شاید ہی تسلیم کرے لیکن ان قدیم ہندوی روایات اور پندرہ سو برائیوں کی شیخ محمد جوہری کی فوج میں شمولیت سے شیخ کے ہندو ماحول کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ عجب نہیں کہ شیخ چلتیانہ کی تحریک سے باخبر ہوں اور انھیں خیال آیا ہو کہ اگر معبود باطل کے لیے یہ کچھ کیا جاسکتا ہے تو معبود حقیقی کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا چاہیے!

اور قاضی قاضی قاضی سندھ آپ کے معتقد ہو گئے۔ ٹھٹھہ میں ایک سال کے قیام کے بعد آپ خراسان کی طرف روانہ ہوئے۔ پہلے قندھار آئے اور وہاں سے قرہ پہنچے، جہاں ۲۳ اپریل ۱۸۷۷ء کو (یہ عارضہ تہدق) آپ وفات پا گئے۔ مزار قرہ کے قریب ہے۔

مولوی ابو ظفر ندوی کا خیال ہے کہ آپ نے مہدی موعود ہونے کا اعلان پہلی مرتبہ برکتی میں (نہروالہ پٹن کے قریب) کیا اور اس سے پہلے دعویٰ کی روایات خلاف قیاس ہیں۔

سید محمد جوہر پوری کے دعویٰ مہدویت کی کمزوری اور ضعیف بنیادی ظاہر ہے لیکن تمام معاصرین آپ کی علمیت، پرہیزگاری اور زہد و تقویٰ کی تحریف کرتے ہیں بدایونی آپ کو ”اعظم اولیائے کبار“ لکھتا ہے۔ آپ کے حالات زندگی اور ابتدائی ماحول کے متعلق مزید تحقیق و تفتیش کی گنجائش ہے لیکن نویں اور دسویں صدی ہجری میں آپ اور آپ کی جاری کردہ تحریک کی بڑی اہمیت ہے۔

مہدویہ جماعت کی ایک خصوصیت تو سید محمد جوہر پوری کے دعویٰ پر ایمان ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بعض چیزیں انہیں نمایاں کرتی ہیں۔ ”مہدیوں کا عقیدہ ہے کہ فرائض و واجبات قرآنی دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ احکام شامل ہیں جن کا تعلق نبوت اور شریعت سے ہے۔ ان احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ لسان شریعت مفصل بیان فرمادیا۔ دوسری قسم میں وہ احکام ہیں جن کا تعلق خاص ولایت محمدیہ سے ہے۔ اب مشیت الہی کو منظور ہوا کہ ان احکام کی بھی تبلیغ ہو جائے۔ لہذا حضرت سید محمد مہدی موعود مبعوث ہوئے جو دافع ہلاکت امت محمدیہ اور ناصر شریعت محمدی و مبلغ احکام ولایت محمدی ہیں۔ مقام ولایت میں جو امور فرض ہیں اور ارکان دین کا درجہ رکھتے ہیں۔ حسب ذیل ہیں:-

- (۱) ترک دنیا (۲) صحبت صادقین (۳) عزت از خلق (۴) توکل (۵) طلب دیدار خدا (۶) عشر (۷) ذکر کثیر (۸) ہجرت

ان اصولوں کی پیروی نے ہمدویوں کی عملی زندگی کو ایک خاص رنگ دے دیا تھا اور انہی کی وجہ سے (جیسا کہ باقی طریقہ کی زندگی میں ہوا اور شیخ علانی نے اسلام شاہ سوری کے عہد میں دیکھا) ہمدویوں کی حکومت وقت سے بسا اوقات کشمکش ہوئی۔ شروع شروع میں یہ تحریک گجرات، خاندیش اور احمد نگر میں زوروں پر تھی اور بڑے قابل اور مخلص لوگ اس میں شامل تھے۔ لیکن شیخ علی مفتی کی علمی مخالفت اور مخدوم الملک کی سیاسی کوششوں نے اسے شمالی ہند میں پھیلنے پھولنے نہ دیا۔ گجرات سے یہ تحریک دکن میں منتقل ہو گئی۔ احمد نگر میں جہاں جمال خاں ہمدوی نظام شاہی افواج کا ایک بااثر سپہ سالار تھا، اس فرقے کو ایک زمانے میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ جمال خاں نے اپنے ہم مشرب ہمدویوں کو ذکر و فکر کے اشغال سے ہٹا کر سیاسیات اور عسکری زندگی کی طرف مائل کیا۔ اسی کے زیر اثر نظام شاہی خاندان کے بیٹے بادشاہ اسماعیل بن برہان نظام شاہ ثانی نے ہمدوی عقائد اختیار کر لیے لیکن تخت نشینی کے دو ہی سال بعد وہ ۱۵۹۷ء میں مارا گیا اور احمد نگر میں پھر اثنا عشری شیعہ اثرات غالب آ گئے۔ اس کے بعد بھی ہمدویوں نے دکن کی عسکری اور سیاسی زندگی میں حصہ لیا۔ ہمدوی سپاہی اور افسر بہادر اور وفادار، لیکن دوسرے تجدیدی گروہوں کی طرح جوشیلے اور سریع الغضب ہوتے تھے۔ حافظ محمود خاں شیرانی لکھتے ہیں: "شہزادہ اورنگ زیب کے ساتھ ایک ہمدوی سردار مع اپنی جماعت کے متعین تھا۔ کسی منہ ہی بحث کی بنا پر آپس میں فساد ہو گیا اور آخر شہزادہ کی فوج کے ہاتھ سے مع اپنے متبعین کی فوج کے مارا گیا۔ سلطان ٹیپو کے پاس بہت سے ہمدوی افغان ملازم تھے۔ ایک بار عدل حکمی کی بنا پر کئی سو مارے گئے اور باقی کا اخراج کر دیا گیا۔ سردار نمڑے نرنی ہمدوی ملازم باجی راؤ والی پونانے اپنے آقا کی ممانعت کے باوجود انگریزی چھاؤنی پر حملہ کر دیا۔ جس سے باجی راؤ کا علاقہ ضبط ہو گیا اور باجی راؤ کو گرفتار کر کے بھڑور پہنچا دیا گیا۔"

راجا چند لال کے دور میں حیدر آباد ہمدوی گروہ کا مرکز بن گیا۔ وہ دس

بارہ ہزار کی تعداد میں بمشاہرہ پیش قرار ملازم رکھ لیے گئے۔ اور آٹنا اقتدار حاصل کر لیا کہ بے باکانہ مذہبی بحثیں شروع کر دیتے۔ یہاں تک کہ ۱۸۳۷ء میں مولوی عبدالکریم کو مذہبی بحث کی بنا پر میر عالم بہادر کی مسجد میں قتل کر دیا۔ جس پر شہر میں فساد ہو گیا اور بہت سے ہستی اور مہدوی مارے گئے۔ نواب سکندر جاہ نے انگریزی فوج کی امداد سے ان کو ملک سے نکالا۔

دورِ حاضر کے سب سے مشہور مہدوی نواب بہادر یار جنگ تھے، جنہیں مہدویوں ہی میں نہیں بلکہ عام مسلمانوں میں بھی بڑا اثر حاصل تھا۔ وہ جذباتی خطابت کے بادشاہ تھے۔ مہدوی مشاہیر میں سے شیخ علانی کا ذکر ہم خاندان سور کی تاریخ کے ضمن میں کریں گے۔ لیکن دسویں صدی ہجری میں مہدویت کی اہمیت فقط مہدوی اکابر کے ناموں سے جاچی نہیں جاسکتی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب مہدی جو پوری کا نام تمام برصغیر میں گونج رہا تھا اور تمام اہل الرائے یا اس کے شدت سے مخالف تھے یا معتقد کئی لوگ تھے جو مہدوی عقیدہ اختیار کیے بغیر حیا سے دین کی اس فضا سے متاثر ہوئے جو اس تحریک نے پیدا کی۔ بہت سے ایک مدت تک اس تحریک سے وابستہ رہے۔ مثلاً فیضی و ابوالفضل کے والد شیخ مبارک۔ بلکہ شیخ علی متقی جنہوں نے بالآخر گجرات میں مہدویت اور دوسری غیر اسخ تحریکوں کے قلع قمع میں سب سے زیادہ گرجوشی دکھائی۔ بعض روایات کے مطابق ایک زمانے میں مہدوی ہو گئے تھے لیکن جب مکہ معظمہ میں پہنچ کر انہوں نے زیادہ تحقیق کی تو ان خیالات کو ترک کیا اور ان کے خلاف ٹھوس مدلل کتابیں لکھیں۔

مہدویت کی تنظیم و اشاعت کا بڑا ذریعہ ان کے ”دارے“ تھے جو مختلف مقامات پر

۱۸۷۱ء کے بعد کا ایک واقعہ ۱۸۹۲ء میں ہوا۔ جب حیدر آباد کے ایک مشہور فاضل اور نظام سابق میر محبوب علی خان کے استاد مولوی زمان خان شاہجہان پوری کو ہدیہ مہدویت کی تالیف کی بنا پر ایک مہدوی نے مسجد میں شہید کیا (تذکرہ علماء ہند ص ۱۸۹)

قائم ہوئے۔ ان میں یہ لوگ مل کے رہتے۔ جو کچھ ایک کے پاس ہوتا، سب میں برابر برابر بانٹ دیا جاتا۔ شرع کی سختی سے پابندی ہوتی۔ سب مل کر ذکر میں شریک ہوتے جس پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ جماعت کا نظام بڑا سخت تھا۔ مولوی ابو ظفر ندوی لکھتے ہیں کہ جب گجرات میں یہ جماعت طاقتور ہو گئی تو اس قدر غلو سے کام لیا گیا کہ منکرینِ ہمدی کو کافر کہہ دیا۔ آخر میں جرأت اس قدر بڑھ گئی کہ جو اہل فہم اس کا انکار کرتا، اس کو قتل کر ڈالتے اور ہر ایک ان میں سے اپنی جان قربان کرنے کو مذہب کی خدمت اور کارِ ثواب سمجھتا تھا۔ سلطان محمود بن لطیف خاں (۱۲۴۴ء) کے عہد میں ان کا حال بالکل اسماعیلیوں (فرقہ حسن بن صباح) کی طرح ہو گیا تھا۔ جس کے باعث گجرات میں فساد برپا ہو گیا اور امن جاتا رہا۔ چنانچہ سنی حاکموں نے سختی اور حکمت عملی سے فرقے کو دبا دیا۔ اگرچہ اب بھی گجرات، جے پور اور حیدرآباد میں یہ لوگ موجود ہیں اور کراچی میں بھی ایک ”ذکری ہمدوی انجمن“ ہے۔

شہانِ سورا اور ہمدویت | سید محمد جوہر پوری کی وفات ۱۲۷۱ھ میں ہوئی۔ لیکن ان کا اثر برقرار رہا اور کئی مشہور اور با اثر

علماء نے ہمدوی طریقہ اختیار کیا۔ ہمدویوں کی خصوصیات سید محمد کے معتقد ہونے کے علاوہ یہ تھیں کہ وہ قیامت کا ہر وقت انتظار کرتے اور دنیا کی ناپائیداری پر زور دیتے۔ ان میں سے اکثر نے اپنا مال و اسباب غریبوں میں بانٹ کر بڑی توکل کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ اس کے علاوہ وہ شرع کی پابندی پر بڑا زور دیتے۔ جہاں کوئی بات خلاف شرع دیکھتے اُسے روک دیتے اور حکام کی ذرا پروا کرتے۔

ہمدوی طریقے کو شیخ علانی کے قبولِ ہمدویت سے بڑا فروغ ہوا۔ وہ بنگالہ کے مشہور عالم تھے۔ حج سے واپسی کے بعد بیانہ میں سکونت پذیر ہوئے اور یہیں میاں عبداللہ افغان نیازی کے زیر اثر ہمدوی طریقہ اختیار کیا۔ شیخ علانی کی زبان میں خدا نے بڑی تاثیر دی تھی۔ اُن کے دوست اور مرید ہمدویت کی طرف رجوع ہو گئے اور بالآخر ہزاروں لوگوں نے یہ عقائد اختیار کر لیے۔

اُس زمانے میں شیرشاہ کا بیٹا اسلام شاہ المعروف سلیم شاہ بادشاہ تھا۔ اور اُس کے دربار میں مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری کو اسی قسم کا رسوخ حاصل تھا۔ جو خلافت عثمانیہ میں شیخ الاسلام کا تھا۔ یہ زمانہ سیاسی بد نظمی اور عام مذہبی انتشار کا دور تھا۔ ہر طرف نئی نئی تحریکیں شروع تھیں۔ مخدوم الملک کی مسلسل پالیسی تھی کہ اقتدار حکومت کے زور سے اور حد شرعی جاری کر کے نئے فرقوں اور غیر اسخ طریقوں کو کچل دیا جائے۔ اس نے بادشاہ کے کان بھرنے شروع کیے کہ بہت سے لوگ شیخ علانی کے پیرو ہو گئے ہیں۔ اگر وہ بغاوت کر بیٹھا تو تدارک مشکل ہوگا۔ چنانچہ سلیم شاہ نے شیخ علانی کو بلا بھیجا۔ شیخ نے بادشاہ سے روکھا پھیکا سلوک کیا۔ دربار میں آئے تو رسوم دربار کا خیال نہ رکھا اور جب بادشاہ نے اپنے خاصے کا کھانا بھیجا تو بادشاہ کے خلاف اظہارِ ملامت کیا۔ بادشاہ کو اس رویے پر افسوس ہوا لیکن وہ خود شیخ علانی کے خلوص اور دینی جوش سے متاثر ہو چکا تھا۔ ان باتوں کو پی گیا اور مہدوی عقائد کے متعلق شرعی فیصلہ کرنے کے لیے علماء کی ایک مجلس منعقد کی۔ اس مجلس میں دربار اور شہر کے برگزیدہ عالم جمع ہوئے۔ سید رفیع الدین محدث اور ابو الفتح تھانیسری کے علاوہ ابوالفضل اور فیضی کے باپ شیخ مبارک بھی بلائے گئے۔ شیخ مبارک نے شیخ علانی کی طرفداری کی۔ اس مجلس کے مباحثے کئی روز تک جاری رہے لیکن قطعی فیصلہ کوئی نہ ہو سکا۔ بادشاہ نے شیخ سے عقیدہ مہدویہ ترک کرنے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ اگر تم یہ عقیدہ ترک کرو تو تمہیں اپنی کل مملکت کا محتسب بنانا ہوں۔ اب تک تم میرے اذن کے بغیر امر معروف کرتے رہے ہو پھر میری طرف سے اختیار لے کر کرنا۔ شیخ کے لیے اپنی اصلاحیں جاری کرنے کا یہ بڑا شاندار موقع تھا۔ لیکن پرجوش تجدیدی اور حیاتی طبعیتوں کو اصلاح کے عام عملی طریقے پسند نہیں آتے۔ اس نے بادشاہ کی تجویز قبول نہ کی اور بادشاہ نے اسے سرحد کن کی طرف ملک بدر کیا۔ وہاں کا حاکم شیخ کا مرید ہو گیا۔ مخدوم الملک نے پھر نئے خطرات بادشاہ کے دل میں پیدا کیے۔ مخدوم تو شیخ کے قتل کا فتویٰ دے چکا تھا۔ لیکن

بادشاہ بیت و محل کر رہا تھا۔ بالآخر بادشاہ نے شیخ علائی کو صوبہ بہار کے ایک جلیل القدر فاضل میاں بڈھے کے پاس بھیجا تا کہ وہ شیخ کے عقائد کے متعلق تحقیق کریں۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ ہمدویت کے متعلق میاں بڈھے نے سلیم شاہ کو ایک خط لکھا کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ ایمان اسی پر منحصر ہو اور علامات ہمدی کے بارے میں بہت اختلاف ہے اور ان سے شیخ علائی کے کفر یا ایمان کے متعلق فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن میاں بڈھے کا یہ خط سلیم شاہ تک نہ پہنچا۔ ان کے لڑکوں نے یہ سمجھ کر کہ مخدوم الملک سے اختلاف مضرت ثابت ہوگا۔ باپ کی طرف سے بادشاہ کے نام ایک گول مول خط لکھا کہ آج مخدوم الملک محققین میں سے ہیں جو فیصلہ وہ کریں وہی صحیح ہے۔ بادشاہ کے پاس جب یہ خط پہنچا تو اس نے شیخ کو مخدوم کے حوالے کر دیا اور کہا کہ ”تو دانی و این“ چنانچہ مخدوم نے شیخ کو کورٹ سے مروا کر شہید کر دیا۔

یہ واقعہ ۱۵۴۷ء کا ہے۔ مخدوم نے اس سے پہلے میاں عبداللہ نیاڑی کے خلاف بادشاہ کو اکسا کر انھیں پٹوایا تھا اور یہ تشدد اس نے فقط انھیں دو بزرگوں کے خلاف روا نہیں رکھا بلکہ ہر اس شخص کے ساتھ جس کے عقائد کے متعلق اسے ذرا بھی شبہ ہوتا، یہی سلوک کیا جاتا۔ مخدوم الملک کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں اور اس زمانے میں یہ طریق احتساب عام تھا۔ لیکن یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اکبر کو علما بلکہ اسلام سے بدظن کرنے میں ان لوگوں کا بڑا ہاتھ تھا جو مخدوم کے زخم خوردہ تھے۔ چاہے اسے شدت احتساب کا نتیجہ سمجھ لیں چاہے یہ خیال کریں کہ مخدوم نے ان لوگوں کے عقائد کی نسبت جو اندازہ لگایا تھا، وہ صحیح ثابت ہوا۔

ہمایوں نے ۱۵۵۷ء میں شیرشاہ سے شکست کھائی اور

ایرانی اور شیعہ اثرات

یہاں عمر کوٹ کے مقام پر اکبر پیدا ہوا۔ جب ہمایوں ہندوستان کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا اور اس کے بھائیوں نے اس کی کوئی مدد نہ کی تو اس نے ایران کا رخ کیا۔ ایران کا بادشاہ طہماسپ صفوی اس کے ساتھ بڑے حسن سلوک سے پیش آیا اور

جب ایک عرصہ قیام کے بعد ہمایوں نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو اسے فوج دی۔ جس کی مدد سے اس نے ۱۵۵۵ء میں قندھار اور ۱۵۵۶ء میں کابل فتح کر لیا۔ ۱۵۵۷ء میں ہندوستان آیا اور دہلی اور آگرہ سے لے کر قابض ہو گیا۔ لیکن ابھی اپنی حکومت مستحکم کرنے کا موقع نہ ملا تھا کہ وہ اپنے کتب خانے کی سرٹھیوں سے پھسلا اور گر کر مر گیا۔ حکومت کے استحکام کا کام اکبر اور اس کے لائق امالیق بیرم خاں کو کرنا پڑا۔ جنہوں نے عادل شاہ سور کے ہندو وزیر ہیمو بقال کو شکست دے کر خاندان سور کا خاتمہ کر دیا۔

جب ہمایوں سفر ایران کے بعد ہندوستان واپس آیا تو اس کے ساتھ بیشا ایرانی سپاہی، امراء اور علمائے تھے اور اس وقت سے ایران اور ہندوستان کے زیادہ قریبی تعلقات کا آغاز ہوا۔ جن کی وجہ سے ہندوستان کی اسلامی تہذیب میں ایرانی اثرات تورانی اور عرب اثرات سے بھی زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے بھی غزنویہ خاندان کے وقت سے ہندوستانی مسلمانوں کی ادبی اور درباری زبان فارسی تھی اور ایران سے قابل اور بہادر قسمت آزا ہندوستان آتے رہتے تھے لیکن ہمایوں کے بعد یہ سلسلہ بہت وسیع ہو گیا۔ ایران کے بڑے بڑے شاعر مثلاً سعدی، نصیر سی، مشہور مصور مثلاً خواجہ عبدالصمد، میر علی فرخ اور قابل مدثر مثلاً علی مردان، آصف خان وغیرہ ہمایوں کے جانشینوں کے عہد میں ہندوستان آئے اور علوم و فنون کی اشاعت اور اسلامی تہذیب و تمدن کی تشکیل میں بہت مفید ثابت ہوئے۔ بنابرین مآثر جمعی کا مصنف ایران کو "دستان ہند" کہتا ہے۔ مغلہ حکومت کے استحکام اور قرار میں بھی ایرانی ذہانت اور تدبیر کو بڑا دخل تھا۔

مورخ لکھتے ہیں کہ ہمایوں ایران جا کر شیعہ ہو گیا تھا اور اسے شاہ ایران سے مدد اس وعدہ پر ملی تھی کہ وہ اپنی مملکت میں شیعہ عقائد کی ترویج کرے گا۔ یہ تو غالباً غلط ہے لیکن اتنا قرین قیاس ہے کہ ہمایوں نے حضرت علیؑ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہو گا اور ذیل کی رباعی اس سے منسوب کی جاتی ہے۔

ہستیم ز جاں بندہ اولاد علی ہستیم ہمیشہ شاد با یاد علی

چوں ستر ولایت ز علی ظاہر شد کردیم ہمیشہ ورد خود نادر علی
اس کے علاوہ جب وہ ہندوستان واپس آیا تو شیعہ عمال کا زیادہ عمل دخل ہو گیا
اور انھیں اپنے مذہبی معاملات میں زیادہ آزادی مل گئی۔ ہمالیوں کا وزیر باندیر بیرم خاں
خود شیعہ تھا اور شیخ گدائی جنھیں عہد اکبری میں سب سے پہلے شیخ الاسلام کا عہدہ ملا۔
شیعہ عقائد کے تھے۔ حضرت علیؑ کی تعریف میں بیرم خاں کا ایک پرجوش قصیدہ
تأثر جمعی میں نقل ہوا ہے، جس کا مطلع ہے۔

شعہ کہ بگزد از نہ سپہ افراو اگر غلام علی نیست خاک بر سراو!
لیکن عام طور پر ملکی معاشرتی اور مذہبی معاملات میں بیرم خاں اس قدر
مخاطب اور مرخباں مرنج تھا کہ اگرچہ شیخ گدائی کی تعیناتی کو کئی تورانی امراء نے
ناپسند کیا لیکن مذہبی حلقوں میں اس کے خلاف شکایت کا ایک حرف نہیں ملتا۔
ملا عبد القادر بدایونی جیسا بزرگ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے اور شیخ
عبد الحق محدث اس کی نسبت لکھتے ہیں:-

خانخانان محمد بیرم خان کہ باوجود علو منصب و جاہ و جلال زیادہ از ہرچ تصدیق تو ان
نمود۔ بسوگ طریقہ درویشاں و اعتقاد محبت ایساں بود و تواضع و رعایت طریقہ تعظیم
الامر اللہ و الشفقت علی خلق اللہ اتصافہ کامل و توفیقہ شامل داشت و مصدق عاش
سعید اومات شہید ابود۔

ہمالیوں کے بعد شیعہ حضرات کی ایک کثیر تعداد ایران سے اس زمانے میں آئی
جب وہاں شاہ اسماعیل ثانی نے اہل سنت و الجماعت کا طریقہ اختیار کیا
اور شیعی عقائد کے عارضی فروغ کے دوران میں برگزیدہ شیعہ علماء اور اکابر پر سختی شروع
ہوئی۔ شیعہ حضرات کی آمد کا سلسلہ اور وسیع ہو گیا اور شمالی ہند میں بھی شیعوں کی مقبول
تعداد ہو گئی۔ حتیٰ کہ ایک انگریز اہل قلم کے انداز سے کے مطابق اورنگ زیب کے امراء
میں اکثریت شیعوں کی تھی۔ ایرانی النسل افراد کے علاوہ سادات بارہہ شیعہ تھے۔

Hollister

اٹھارھویں صدی میں اودھ - مرشد آباد وغیرہ میں شیعہ ریاستوں کا قیام بعض اوقات سیاسی اور مذہبی پیچیدگیوں کا باعث ہوا ہے، لیکن عام طور پر شیعوں نے ملی مفاد کو مد نظر رکھا اور اپنی ذہانت، بلند نظری اور قابلیت سے ہماری تمدنی اور ادبی تاریخ میں کئی رنگین باب اضافہ کیے۔ اہل سنت حضرات نے بھی بالعموم ان سے دوستی اور رواداری کا سلوک کیا ہے اور غالب کو اردو کا بہترین شاعر - آزاد کو اردو کا بہترین نثر نگار اور رائٹ آنریبل سید امیر علی کو اسلام کا بلاد مغرب میں بہترین ترجمان سمجھتے وقت کسی کو ایک لمحہ کے لیے خیال نہیں آتا کہ وہ شیعہ تھے یا سنی!

اسلامی ہند کی تاریخ میں شیعہ اور سنی شخصیتوں کو علیحدہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ ایک تو بعض شیعہ حضرات افشاے مذہب کے معاملے میں تقیہ اور احتیاط کے قائل ہیں۔ دوسرے پاکستانی ہندوستانی اہل سنت والجماعت میں بھی تقضیلیوں کی کوئی کمی نہیں۔ چنانچہ متعدد ممتاز ہستیوں مثلاً میر سید علی ہمدانی، خواجہ محمود گاوڑاں اور حضرت گیسو راز کی نسبت اختلاف ہے کہ وہ شیعہ تھے یا سنی۔ عام طور پر اب مذہبی عقائد کی یہ حالت ہے کہ کسی بحث کے وقت یا ضد اور سنیہ زوری کی وجہ سے کوئی اختلاف ظاہر ہو تو ہو ورنہ عموماً شیعہ و سنی شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں اور انھیں ایک دوسرے سے تمیز کرنا مشکل ہے۔

شطارِ سلسلہ | عبد وسطیٰ میں شطار یہ طریق تصوف نے فروغ حاصل کیا۔ اسے شیخ بایزید بسطامیؒ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو شطار ہی اس لیے کہتے ہیں کہ سلوک اور طریقت میں وہ دوسرے سلسلوں کے بزرگوں سے زیادہ تیز اور سرگرم (شطار) ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جنگلوں میں رہ کر سخت ریاضتیں کرتے تھے اور ان سے غیر معمولی افعال و تصرفات منسوب کیے جاتے تھے۔ شمالی بہار میں جہاں شطارِ سلسلے نے پہلے قدم جمائے، اس میں اور مدار یہ طریقہ میں کئی مقامی چیزیں داخل ہو گئیں۔ سب سے پہلے شمالی ہندوستان میں جس بزرگ نے یہ طریقہ جاری کیا، شیخ عبداللہ شطار ہی تھے جو مرشد کے ایما پر

ایران سے ہندوستان وارد ہوئے۔ شطاری روایات کے مطابق وہ پانچ واسطوں سے حضرت شہاب الدین سہروردی کی اولاد اور سات واسطوں سے حضرت بایزید بسطامی کے مرید تھے۔ ہندوستان آکر انھوں نے کچھ وقت دیارِ پُرب میں گزارا۔ نکیور میں شیخ حسام الدین مانکیپوری سے ملاقاتیں کیں۔ پھر جنوبیہ گئے لیکن سلطان ابراہیم شرقی اور اس کے متشرع اراکین سے ان کی نہ بنی۔ پھر وہ مالوہ گئے۔ جہاں انھوں نے بڑا فروغ پایا اور ظاہری اور باطنی شان و شوکت حاصل کی۔ کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص ان کے پاس مرید ہونے کے لیے آتا تو وہ اسے کھانا اور سالن کھانے کو دیتے اور دیکھتے رہتے کہ دونوں کو ساتھ ساتھ ختم کرتا ہے یا کوئی چیز بچ جاتی ہے۔ اگر دونوں کو ساتھ ساتھ ختم کرتا تو اسے سمجھ دار اور قابلِ عبادت انسان سمجھ کر شغلِ باطنی تعلیم کرتے اور اگر دونوں کو برابر برابر ختم نہ کرتا تو سمجھتے کہ اسے اپنے اوپر ضبط نہیں اور چیزوں کا صحیح اندازہ نہیں لگاتا۔ پھر اس سے فقط ظاہری باتیں کرتے۔ آپ کے طریقِ کار میں لوگوں کو مرغوب و متاثر کرنے والی کئی باتیں تھیں۔ مشہور ہے کہ آپ نقارہ بجواتے اور اعلان کرتے کہ ہے کوئی خدا کا طالب، جسے ہم راہِ خدا دکھائیں۔ ”سطوت شوکتِ ظاہر“ بھی حاصل تھی۔ بڑی شان سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے۔ نقارہ بجواتے۔ علم اٹھواتے۔ خود سلطانی لباس اور ہمراہی صوفی فوجی وردی پہنتے۔ مجلس میں بیٹھتے تو ہر طرف نگاہ دوڑاتے اور کہتے کہ کیا یہاں کوئی تختہ سیاہ یعنی بے اعتقاد اور شکی مزاج طالب علم ہے۔ بعض لوگ تو ان طریقوں کو ناپسند کرتے لیکن بعض پران کا بڑا اثر ہوتا۔ مشہور ہے کہ جب بہار میں بچے تو حسبِ معمول شیخ محمد علا کو جواب شیخ قاضی شطاری کے نام سے مشہور ہیں، پیغام بھیجا کہ اس درویش نے اس خیال سے سیاحی اختیار کی ہے کہ اگر کلمہ توحید کے معنی کوئی اس سے بہتر جانتا ہو تو وہ مسافر کو تعلیم دے اور اگر ایسا نہ ہو۔ تو بے مشقت وہ گنج توحید مسافر سے حاصل کرے۔ شیخ محمد علا نے جواب دیا کہ ایسے فضول کو اشخاص خراسان اور ایران سے بہت آتے ہیں۔ شاہ صاحب نے

من کر فرمایا کہ شیخ محمد علا کے کمالات کا ظہور مجھ ہی فضول گو کی تلقین پر منحصر ہے۔
 گلزار ابرار میں غوثی شطاری لکھتے ہیں کہ اس کے بعد شاہ عبداللہ تو مانڈو کی طرف
 روانہ ہو گئے لیکن شیخ محمد علا کو خواب میں اشارہ ہوا کہ تمھاری گرہ کشائی شاہ عبداللہ
 سے وابستہ ہے۔ چنانچہ وہ وطن چھوڑ کر مانڈو روانہ ہوئے۔ شاہ صاحب کے دروازے
 پر تین روز کھڑے رہے۔ چوتھے روز وہ باہر تشریف لائے۔ سرزنش کی۔ امتحان لیا اور
 بالآخر خلعت خلافت سے سرفراز کر کے واپس روانہ کیا۔

شاہ عبداللہ شطاری کی وفات ۱۲۵۷ھ میں ہوئی۔ مزار مالوہ کے سابق دار الخلافہ
 مانڈو میں قلعہ کے اندر ہے۔ ان کے خلیفہ اعظم شیخ محمد علا المعروف شیخ محمد قاضی شطاری
 تھے۔ مرشد سے خرقہ خلافت پانے کے بعد انھوں نے عمر کے باقی بیس سال ارشاد و ہدایت
 میں صرف کیے۔ آپ کی مساعی کا بڑا مرکز صلیح مظفر پور (بہار) کا جنوبی حصہ تھا اور وہ
 ایک قدیمی ہندو مرکز کے قریب بسر Baseri میں مدفون ہیں۔ آپ کے بڑے بیٹے
 مخدوم منصور حلاج شہید کا مزار بھی یہیں ہے۔ وہ ایک مسجد کی تعمیر کے وقت مقامی
 قبائل کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ دوسرے بیٹے عبدالرحمن شطاری تھے۔ تیسرے بیٹے
 شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست شطاری کا مزار حاجی پور (بہار) کے قریب ہے۔
 ان کے خلیفہ شیخ ظہور حاجی حمید حضور گوالیاری (وفات ۱۲۵۳ھ) بہار کے مقام تن سرا
 میں دفن ہیں۔ شیخ ظہور نے دو چھوٹے بچوں کو پالا۔ ان کے نام تو شیخ فرید الدین جہانگیری
 اور شیخ خطیر الدین تھے۔ لیکن تاریخ میں وہ بالترتیب شیخ بہلول یا شیخ پھول اور شیخ محمد
 غوث گوالیاری کے نام سے مشہور ہیں۔

شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری | اس سلسلے کے دو اور بزرگوں شیخ بہار الدین
 شطاری اور شیخ بدھن شطاری جو پوری کا

ذکر اخبار الاخیار میں ملتا ہے۔ مؤخر الذکر نے شاہ عبداللہ شطاری کے ایک خلیفہ سے
 ظاہری اور باطنی تعلیم حاصل کی اور سکندر لودھی کے زمانے میں شطاریہ سلسلے کی
 اشاعت کی۔ شیخ عبدالرحمن محدث دہلوی کے چچا شیخ رزق اللہ مشاقی (مصنف وقایع مشاقی)

نے انھیں سے شطاری اعمال و وظائف سیکھے۔ لیکن شطاری سلسلے میں سب سے زیادہ شہرت شیخ محمد غوث گوالیاری کو ہوئی۔ وہ شیخ فرید الدین عطار کی نسل سے تھے۔ شیخ ظہور حاجی حمید نے آپ اور آپ کے بھائی کو فرزندگی میں بیا اور سلوک و باطن کی پوری تعلیم دی۔ نامور خانوادوں کے مشائخ جو کمالات اور حالات رکھتے ہیں ان کے اطوار اور اسرار۔ بالخصوص شطاریہ مشرب کی رفتار۔ دعوت کافن۔ افکار کی طرز اور اشغال و تصورات کی سندیں۔ غرض کہ کل چیزیں دو سال کے اندر تعلیم و تلقین فرمادیں۔ مزید فیضان کے لیے انھیں کوہ چنار کے جنگلات میں روانہ کیا۔ جہاں شیخ محمد غوث گوالیاری نے تیرہ برس تک بڑی ریاضتیں کیں اور درختوں کے پتے کھا کر یاد الہی کی۔

گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ ہمایوں شیخ ابوالفتح سرمست شطاری کا معتقد تھا۔ شیخ بہلول سے اس کے اعتقاد و ارتباط کی کتب تاریخ سے بھی تائید ہوتی ہے۔ بلکہ وہ شیخ سے سیاسی محاملات میں مدد لیتا تھا اور اس لیے مرزا ہندال نے انھیں شہید کرادیا۔ (۱۵۳۸ء)۔

بدایونی ہمایوں کے ان دو بھائیوں سے تعلقات کی نسبت کہتا ہے :-

”دہلیوں پادشاہ را بہ ہردو این بزرگوار نسبت عقیدہ و اخلاص بکمال بود۔ چنانچہ بہ کم کسے دیگر آن جہت داشتہ باشند و طریق دعوت اسمائیں اعزہ یاد مے گرفتند۔“

شیخ محمد غوث گوالیاری نے شروع سے ہی مغل بادشاہوں سے روابط قائم کر لیے تھے۔ جب بابر بادشاہ نے قلعہ گوالیار فتح کرنے کے لیے فوج بھیجی تو شیخ ان دلوں قلعہ کے اندر تھے۔ انھوں نے مغل حملہ آوروں کو ایک ترکیب بتائی جس سے قلعہ آسانی سے فتح ہو گیا۔ مغل سرداروں نے شیخ کے مشورے پر تاتار خاں والی قلعہ سے درخواست کی کہ ہمیں اجازت دیجیے کہ چند خدمت گاروں کے ساتھ قلعہ کے اندر رات گزاریں۔ تاتار خاں اس سے پہلے اطراف کے بعض سرداروں کے خلاف بابر سے مدد مانگ چکا تھا۔ اس نے نتائج کا صحیح اندازہ کیے بغیر اس کی

اجازت دے دی اور خود مزے سے لمبی تان کر سو گیا۔ جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ بہت مغل سپاہی خدمت گاہ بن کر قلعہ کے اندر آچکے ہیں۔ قلعہ کے دربان شیخ کے مُرید تھے۔ انھیں بھی شیخ کا حکم پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ تانار خاں نے دیکھا کہ اب قلعہ مغلوں کے نہیں بچایا جاسکتا۔ ناچار اس نے قلعہ کو ان کے حوالے کیا اور خود بابر کی اطاعت اختیار کر لی۔

بابر کے ساتھ شیخ محمد غوث کے تعلقات تو استوار ہو رہی گئے تھے اور ہمایوں بھی ان کا معتقد تھا لیکن اب شیر شاہ کا دور دورہ تھا۔ وہ شیخ کے درپے ہوا۔ چنانچہ شیخ اہل و عیال۔ مُریدوں اور ساز و سامان کے ساتھ گجرات ہجرت کر گئے۔ قریباً اٹھارہ سال اس علاقے میں گزارے۔ کچھ وقت چانپانیر اور بھڑوچ اور باقی وقت احمد آباد صرف کیا۔ وہاں بھی انھوں نے بڑا اقتدار حاصل کیا۔ لیکن شیخ علی متقی نے جو بڑے پایہ کے عالم تھے، ان کی بعض تصانیف کی بنا پر ان کے خلاف کُفر کا فتویٰ دیا۔ بادشاہ وقت سلطان محمود گجراتی نے ایک دوسرے عالم شیخ وجہ الدین سے استصواب کیا لیکن وہ شیخ کی روحانیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ خود ان کی بیعت کر لی اور شیخ علی متقی کے فتوے کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس سے عوام کی نظروں میں شیخ کا اثر اور بھی بڑھ گیا اور کئی لوگ ان کے مرید ہو گئے۔ لیکن اب ایرانی فوج کی مدد سے پھر ہندوستان میں مغل حکومت قائم ہو گئی تھی۔ شیخ نے مغل دربار کا رُخ کیا۔ ہمایوں اس زمانے میں وفات پا چکا تھا اور اکبر اس کا جانشین تھا۔ امور ملکی بیرم خاں کے سپرد تھے اور عہد اکبری کا پہلا صدر شیخ گدانی شیخ کے خلاف تھا۔ جب وہ اگرہ پہنچے تو اس نے بیرم خاں کے کان بھرے کہ رسالہ معراجیہ میں شیخ نے اپنی معراج کا دعویٰ کیا ہے اور اپنے آپ کو بڑے پیغمبروں سے فضیلت دی ہے۔ ان سے پوچھنا چاہیے کہ یہ کہاں تک جائز ہے۔ چنانچہ علماء و مشائخ کے جلسے ہوئے۔ جن میں اس رسالے پر بحث ہوئی اور شیخ پر اعتراض کئے گئے۔ آخر شیخ اندر وہ دل ہو کر گویا رچلے گئے۔

دربار اکبری میں شیخ کی حسب توقع قدردانی نہ ہوئی پھر بھی خاندانی تعلقات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے لیے گراں بہا جاگیر مقرر ہو گئی۔ آثار الامرا میں لکھا ہے:-
 ”گویند از جناب عرش آشیانی یک کر در درم وظیفہ مقرر بود“۔ پھر خود ہی کہتا ہے:-

”در ذخیرۃ الخزانین آوردہ کہ شیخ نہ لک روپیہ دہ جاگیر داشت و چل فیل در فوج او مے رفت“

شیخ نے اس روپیہ سے گوالیار میں ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کرائی۔ جہاں سماع و سرود اور وجد کا شغل رہتا۔ شیخ خود بھی معرفت کے گیت بنواتے اور گنولتے تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ رسالہ معراجیہ کے علاوہ جواہر خمسہ۔ کلید مخازن۔ کنز الوجدہ۔ ضمائر و بصائر آپ سے یادگار ہیں۔ بحر الحیوۃ میں ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے اطوار و اشغال ہیں۔

شیخ محمد غوث گوالیاری نے بحر الحیوۃ میں ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے اطوار و اشغال کو فارسی میں منتقل کیا اور اپنی ابتدائی تصنیف جواہر خمسہ میں بھی ان کی ایک آدھ جھلک دکھائی۔ اس سے شطاریہ طریقے کے اس ارتباط پر روشنی پڑتی ہے جو اس کا ہندو لوگ سے تھا۔ ازمنہ وسطیٰ میں مشرقی ہندوستان کے ہندوؤں میں دو تحریکوں نے جنم لیا (۱) ویشنومت میں چیتنئیہ کی احیاء مذہب کی تحریک نے جس کا اگر ابتدائی رد عمل جو پور سے اٹھنے والی ہندوی تحریک تھی تو آخری جواب حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات تھیں (۲) شیو مت والوں میں تنترک طریقوں نے زور پکڑا۔ جس کی نجلی سطح پر خلاف اخلاق مظاہرے اور آئین و رواج سے آزادی تھی اور اس سے بالا روحانی سطح پر ریاضتوں اور یوگ سے عناصر فطرت کو تسخیر کرنے کے ارمان تھے۔ عجب نہیں کہ اس تحریک کی بے آئینی نے مداری فرقے کو متاثر کیا ہو اور روحانی سطح پر تسخیر فطرت کے نیم روحانی طریقے انھی اثرات سے شطاری سلسلے میں آگئے ہوں۔

شیخ محمد غوث گوالیاری نے ۶۷۷ھ میں ۸ سال کی عمر میں وفات پائی اور

۵ امرت کنڈ کا ترجمہ ہے۔

گوالیار میں اپنے عالیشان روضے میں دفن ہوئے۔ شیخ کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔
 ”بہ سماع و سرود و وجد۔۔۔ اشتغال داشت و خود در ادا وادی تصنیف مے کرد۔“ اور یہ
 ایک اتفاقی امر نہیں کہ ہندوستان کا سب سے بڑا گویا تان سین آن کچھ روضے کے احاطہ میں دفن ہے۔
 شیخ محمد غوث گوالیاری سے شطاری طریقے کو بڑی وسعت ہوئی۔ ان کے ایک
 عالم مرید شاہ وجیہ الدین احمد آبادی تھے جن کے ایک شاگرد شیخ صبغت اللہ بھٹوچی
 نے مدینہ منورہ میں بیٹھ کر اس طریقے کو عالم اسلام میں پھیلا دیا۔ ہم ان کا ذکر آئندہ
 صفحات میں کریں گے۔

مغلیہ حکومت کے استحکام کے ساتھ اسلامی علوم کی جو اشاعت ہوئی اور نقشبندیہ
 طریقے اور شیخ عبدالحق محدث جیسے بزرگوں نے پابندی شرع پر جو زور دیا۔ اس نے
 شطاری سلسلے کی مقبولیت پر اثر ڈالا۔ لیکن سولہویں صدی میں ہندوستان بالخصوص
 بنگال۔ بہار۔ مالوہ اور گجرات میں اس طریقے کی اہمیت باقی مشہور قدیمی سلسلوں
 سے کم نہ تھی۔ اس نے غوثی منڈوی جیسے باخیر اور متوازن الطبع تذکرہ نگار اور شیخ
 عبدالباقی شطاری اکبر آبادی (وفات ۱۰۰۰ھ) جیسے فاضل پیدا کیے۔ جن کی بچا پس کے
 زاید کتابوں کی فہرست تذکرہ علمائے ہند میں درج ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے
 کہ امام الہند شاہ ولی اللہ اور ان کے محبوب استاد شیخ ابوطاہر مدنی نے شطاریہ اعمال
 و اشغال سیکھے تھے۔

اس زمانے میں ایک اور سلسلے نے اہمیت حاصل کی جو اپنی
 سلسلہ مدارج | بے قاعدگیوں کی وجہ سے ثقہ حضرات کو ناگوار تھا لیکن ان پڑھ
 عوام میں اس کا خاصہ اثر تھا۔ اس کا انتساب شاہ بدیع الدین مدار سے کیا جاتا ہے
 جو نواح قنوج میں موضع مکن پور میں مدفون ہیں۔ اخبار الاخبار کے مطابق وہ ہرمز سے
 سے کالی آئے۔ ان کا طریقہ جذب خلائی کا تھا اور عوام میں ان کی بڑی شہرت
 تھی۔ مشہور تھا کہ انھوں نے بارہ سال تک کھانا نہیں کھایا اور جو لباس ایک
 دفعہ پہنا۔ اس کے دھوئے کی ضرورت نہ پڑی۔ ان کی عمر کی نسبت عجیب عجیب
 لے مصنف گلزار ابرار

قصے مشہور تھے۔ کوئی دوسو کوئی تین سو بتاتا اور کہا جاتا تھا کہ صرف پانچ چھ واسطوں سے آپ کا سلسلہ رسالت آج تک پہنچتا ہے۔ کاپی کے حاکم قادر شاہ نے آپ کی شہرت سُنی تو سوار ہو کر ملنے گیا۔ خادموں نے کہہ دیا کہ ایک جوگی آیا ہے۔ شاہ ملکہ اس سے باتیں کر رہے ہیں، اس وقت نہیں مل سکتے اور نہ ہی ہمیں اجازت ہے کہ ان تک کسی کے آنے کی اس وقت خبر پہنچائیں۔ قادر شاہ نے حکم دیا کہ ان سے کہہ دو کہ ہمارے شہر میں نہ رہیں اور چلے جائیں۔ اخبار الاخبار میں لکھا ہے کہ چلتے وقت شاہ مدار نے بددعا دی لیکن اس کا اثر مخدوم جہانیاں کے ایک مُردِ شیخ نیراج سوختہ نے زائل کر دیا۔

گلزار ابرار میں جو عہدِ جاگیر کی تصنیف ہے، لکھا ہے کہ مداری روایات کے مطابق آپ کا سلسلہ رسول اکرمؐ تک صرف چار واسطوں سے پہنچتا ہے۔ اس کتاب کے مصنف غوثی کا بیان ہے: ”برہنگی اور بے حجابی اس گروہ کے مشرب میں دسویں صدی کے آخری نصف میں جوش کے ساتھ پیدا ہو گئی ہے ورنہ بدیع الدین شاہ مدار کے پُر معرفت زمانے میں رازِ وحدت کے ظاہر کرنے سے نہایت روک ٹوک تھی اور ظاہرِ شریعت کی مخالفت سے غایت درجہ کا خوف دلوں میں سمایا ہوا تھا۔ ایک ”تازہ بدعت“ یہ تھی کہ اس سلسلے میں ظاہرِ تجربہ ضروری قرار دی گئی تھی۔ اس خاندان کے بزرگ اپنے لیے صرف ستر عورت اور اسی قدر طعام کا انتظام کرتے جو اسی ایک روز کے اندر کھالیا جائے۔ باقی پوشاک اور خوراک سے دست کش رہتے۔ انتہا پسندوں نے ”مشروعِ ازار کو چار انگشت کی لنگوٹی سے بدل دیا جس سے بمشکل فقط اندامِ نہانی چھپ سکتا ہے اور رات کے وقت پہاڑ کی طرح آگ مشتعل کی جس سے سرا کے لحاف کا کام لیا۔ صبح کو لباس کی جگہ بدن پر رکھ مل لی۔ یہ شعار جو سراپا عار ہے، اختیار کر کے ادب کے دائرے سے ... نکل گئے۔ غوثی نے آپ کے آٹھ خلفاء کے نام لکھے ہیں، جن میں سید جمین بہاری سب سے بختہ کا رہتے۔ باقی زیادہ تر نواحِ کھنؤ، قنوج، بھڑائی سے تھے۔

روشنیہ فرقہ

ایک اور فرقہ جس کے آغاز میں شطاریہ اور مداریہ سلسلوں کی طرح اس دور کے روحانی انتشار کی جھلک نظر آتی ہے۔ روشنیہ فرقہ تھا۔ جس نے افغان علاقے میں فروغ پایا اور جس کی مقبولیت میں شاید اس بے چینی اور ہلچل کو بھی دخل تھا، جو افغانوں میں اپنی حکومت کھونے پر پیدا ہوئی۔

پیر روشن میاں بایزید انصاری | روشنیہ سلسلہ کے بانی میاں بایزید انصاری
(المعروف پیر روشن یا پیر و خاں) ۱۵۲۵ء

میں مشرقی پنجاب کے قدیمی شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ اور اس کے ایک سال بعد بابر نے پانی پت کے مقام پر ابراہیم لودھی کو شکست دی اور ہندوستان میں افغان حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

میاں بایزید ایک ممتاز اور اہل علم خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبداللہ کوہستان (وزیرستان) میں محترم عالم اور قاضی تھے۔ خاندان کے کچھ لوگ تو افغان علاقے میں رہتے تھے اور ایک شاخ ہندوستان میں آباد تھی۔ بایزید کے باپ اور دادا بھی اس سلسلے میں ہندوستان آتے جاتے تھے اور جالندھر میں بایزید کے دادا کا ایک بھائی مقیم تھا۔ یہیں عبداللہ کی شادی ہوئی اور ۱۵۲۵ء میں بایزید پیدا ہوئے۔ اس کے بعد عبداللہ کوہستان چلے گئے۔ وہ بیوی کو جالندھر چھوڑ گئے اور وہیں نان و نفقہ بھجھتے رہے۔ اگلے سال بابر کے حملے سے افغانوں کے خاندان منتشر ہو گئے اور بڑی مشکلوں اور مصیبتوں کے بعد بایزید اور اس کی والدہ بایزید کے ایک چچا کے ساتھ کانی گرام عبداللہ کے

۱۵ یہ اندراج ڈاکٹر ظہور الدین احمد کی کتاب پاکستان میں فارسی ادب سے ماخوذ ہے۔
اور انھوں نے اس کی بنیاد حالنامہ پر رکھی ہے۔

پاس پہنچے۔

کافی گرام پہنچنے کے وقت بایزید کی عمر سات سال تھی۔ ان کے والد کی ایک افغان بیوی تھی، جس سے ان کے دو بچے تھے۔ بایزید کی والدہ کے لیے کوہستان کا ماحول نیا تھا۔ سوکن کی بدسلوکی اور خاوند کی بے رخی نے اس کا دل اُچاٹ کر دیا۔ آخر طلاق ہوئی۔ وہ اپنے خاندان کے پاس چلی گئیں اور بایزید شفقت ماوری سے محروم ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے، ان مناقشات کا بایزید کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ نہ صرف سوتیلی ماں کا ان سے سلوک بُرا تھا بلکہ والد کا رویہ بھی ہمدردانہ نہ تھا۔ اور آگے چل کر ان میں اور بایزید میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے۔

بایزید کے والد چاہتے تھے کہ وہ علم حاصل کرے اور خاندانی روایات کو برقرار رکھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے والد کے ایک خلیفہ کے پاس قرآن ختم کیا۔ اور فقہ و مسائل کی کتابیں مثلاً عمدة الاسلام اور منیر پڑھیں۔ وہ اپنے باپ سے قدوری اور لباب الاخبار کا سبق پڑھا کرتے تھے لیکن جب معلوم ہوا کہ باپ نے جھوٹ کہا ہے تو پڑھنا چھوڑ دیا۔

سوتیلی ماں کے سلوک اور والد سے اختلافات کی وجہ سے بایزید اپنے والد سے الگ ہو گئے۔ اپنے چچا کی بیٹی سے نکاح کیا اور زراعت و تجارت کے کاموں میں لگ گئے۔ لیکن وہ جوانی میں ہی فکر و تدبیر کے عادی ہو گئے تھے۔ انھیں ظاہری عبادات میں ایمان کی چاشنی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ملا۔ قاضی اور صوفی کی ریاکاری اور عام مسلمانوں کی باہمی لڑائیاں ان کو منموم رکھتی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ انھیں کوئی ایسا شخص ملے جو انھیں سیدھی اور سچی راہ دکھائے اور ان کے اطمینان قلب کا سبب بنے۔ اس لیے وہ مرشد کامل کی جستجو میں رہنے لگے۔ ان کے گاؤں میں ان کے چچا زاد بھائی، خواجہ اسماعیل انصاری کی درویشی کا چرچا ہوا اور میاں بایزید نے جاکر ان کے مرید ہو جائیں، لیکن والد نے مخالفت کی۔ اور کہا کہ میں اپنے والد کا سب سے

قابل بیٹیا ہوں۔ میرے لیے یہ باعث تنگ ہے کہ تم میرے بھائی کے بیٹے کے مرید ہو جاؤ۔ اگر مرید ہونا ہے تو شیخ بہاء الدین زکریا کے سلسلہ خاندان سے بیعت کر لو۔

”ملتان جاؤ۔ میں توشہ راہ اور شکرانہ پیردے دوں گا۔“ لیکن بیٹے نے یہ قبول نہ کیا۔

اور بالآخر خود ہی اپنا راستا نکالا۔ بڑی ریاضتیں اور عبادتیں کیں اور کلام الہی۔ احادیث نبوی (یا ان اقوال پر جو اس زمانے میں احادیث کے طور پر مشہور تھے) اور احکام شریعت پر غور و خوض کیا۔ اور ان خیالات و عقائد کو پیش کیا جن کی اس علاقے کے علما اور سرداروں نے مخالفت کی۔ جب کانی گرام والوں نے تنگ کیا تو بعض مریدوں کے مشورے سے منگ توی گئے۔ وہاں بھی مخالفت ہوئی۔ پھر کانی گرام آکر اپنے والد کا مکان چھوڑ کر دوسرے مکان میں چلے گئے۔ مخالفت کے باوجود کئی لوگ ان کے مرید ہو گئے۔ اس کے بعد وہ تیراہ کی طرف گئے۔ وہاں بھی کئی قبیلوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اب ان کے مخالفوں نے کابل کے بادشاہ مرزا محمد حکیم کے پاس شکایت کی۔ اس نے حاکم پشاور کو حکم دیا کہ انھیں گرفتار کر کے کابل بھیج دو۔ جب یہ وہاں پہنچے تو انھیں قاضی خاں قاضی کابل کے پاس مذاکرہ کے لیے بھیجا گیا۔

قاضی خاں نے بایزید سے پوچھا: ”لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ تم اپنے آپ کو مہدی کہتے ہو“ بایزید نے کہا: ”میں مہدی نہیں بلکہ ہادی ہوں اور گمراہوں کو راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہوں“ دوسرا اعتراض تھا: ”تم کہتے ہو۔ مجھ پر وحی آتی ہے“ بایزید نے جواب دیا: ”مجھ پر وحی نہیں آتی بلکہ الہام ہوتا ہے“ اور رسول خدا کی حدیث پیش کی۔ ”الہام نودی نزل فی القلب یعرف بما حقیقۃ الاشیا کہماھی“۔ قاضی نے پوچھا: ”نذائے رحمانی و شیطانی میں کیسے تمیز کرتے ہو“ بایزید نے جواب دیا: ”جو الہام قرآنی آیت و حدیث کے مطابق ہو۔ صرف وہ قابل قبول ہے“ پھر قاضی نے پوچھا: ”کس خاندان کے توسط سے تم نے یہ علم حاصل کیا ہے؟“ بایزید نے جواب دیا کہ ”ہمارا طریقہ اویسی ہے اور حضرت رسالت پناہ کے طفیل بے واسطہ خدا سے تعالے نے مجھے علم لسانی سے بہرہ مند کیا ہے“ قاضی اور حاضرین ان جوابات سے مطمئن ہو گئے۔

اور حکیم مرزا کے پاس جا کر تفصیلات بیان کیں۔ اس نے ایک دو اور سوال کیے اور میاں بایزید کو اس پ دخلت دے کر رخصت کیا۔

پیر روشن کابل سے پشاور پہنچے۔ وہاں اب نیا حاکم تھا جو ان کا بہت مخالف ہو گیا۔ چنانچہ وہ پشاور چھوڑ کر علاقہ مہمند زئی میں چلے گئے اور ویلچ پیمانے پر کام شروع کیا۔ یہاں سے انھوں نے ایک خلیفہ کے ہاتھ اپنی کتاب صراط التوحید اکبر کے پاس بھیجی جس نے خوشی کا اظہار کیا اور نذر و تحائف بھیجے۔ اسی طرح مرزا سلیمان کے پاس بدخشاں میں ایک خلیفہ کو بھیجا۔ اُس نے گھوڑا اور پوستین دی۔ اور خدمت میں حاضر ہونے کی توقع ظاہر کی۔

اس کے جلد بعد مغلوں اور پیر روشن میں لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ابتدائی کی اس طرح ہوئی کہ پیر روشن کے فریدیوں نے ایک قافلہ کو لوٹ لیا، جو مال لے کر ہندوستان سے کابل جا رہا تھا۔ اب حکیم مرزا نے پشاور میں اپنے نائب کو لکھا کہ بایزید کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں۔ اس نے بایزید کو گرفتار کرنا چاہا۔ لیکن بایزید اور ان کے ہمراہیوں نے مقابلہ کی ٹھانی۔ چنانچہ زور کا معرکہ ہوا۔ جس میں مغل سپاہیوں کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بڑھتا گیا۔ مغلوں اور ان قبائل کی جنھوں نے روشنیہ عقائد اختیار کر لیے تھے، کشمکش جاری تھی کہ ۹۸ھ (۱۵۷۷ء) میں بایزید کی وفات ہو گئی۔

میاں بایزید کے پانچ بیٹے تھے۔ شیخ عمر۔ نور الدین۔ خیر الدین۔ کمال الدین۔ جلال الدین۔ ان میں سے شیخ عمر مسند خلافت پر بیٹھے۔ انھوں نے باپ کا سلسلہ جاری رکھا اور یوسف زئی افغانوں کے مال و اسباب میں دست زنی کرنی چاہی۔ لیکن سب یوسف زئی جمع ہو گئے اور شیخ عمر کو مع ان کے کئی ساتھیوں کے ہلاک کر دیا۔ خیر الدین بھی اسی لڑائی میں مارے گئے۔ نور الدین نے راہ فرار اختیار کی۔ لیکن اشنغر کے گوجروں نے انھیں بھی ہلاک کر ڈالا۔ کمال الدین کو اکبر نے قید کر لیا اور بحالت قید ہی انھیں پیغام اجل آپہنچا۔ اب میاں جلال الدین اپنے باپ کے

جانشین تھے (جنھیں منغل مورخین جلالہ کہتے ہیں)۔ ان کے شروع میں مغلیہ دربار سے اچھے مراسم تھے۔ جب ۱۵۸۱ء میں حکیم مرزا کی بغاوت فرو کر کے اکبر کابل سے واپس آیا تو راستے میں میاں جلال الدین اس سے ملے اور سلک ملازمت میں داخل ہو گئے۔ لیکن یہ پالسی ان کے ساتھیوں کو ناگوار تھی۔ چنانچہ کچھ دیر بعد وہ مغلیہ لشکر سے روپوش ہو گئے اور اپنا پرانا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۵۹۱ء میں جعفر بیگ قزوینی کو ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ یہ مہم ایک حد تک کامیاب رہی اور میاں جلال الدین کے اہل و عیال قید ہو کر دارالسلطنت بھیجے گئے۔ لیکن میاں جلال الدین ہاتھ نہ آئے بلکہ وہ ترکستان چلے گئے تاکہ عبداللہ خاں ازبک سے مدد حاصل کریں لیکن اکبر کی حکمت عملی سے یہ حکیم کامیاب نہ ہوئی (اگرچہ اکبر کو شمال مغربی سرحد کی حفاظت کے لیے عبداللہ خاں ازبک کی وفات تک لاہور میں مقیم رہنا پڑا)۔ ۱۵۹۹ء میں میاں جلال الدین نے غزنی پر بلخار کی اور اس مقام کو خوب گوتا۔ لیکن وہاں پاؤں نہ جما سکے۔ اس زمانے میں افغانوں کی قبائلی لڑائیاں بھی جاری تھیں۔ میاں جلال الدین ایک مخالفت شادمان ہزاروی کے ہاتھ سے زخمی ہوئے اور اسی سال وفات پا گئے۔ ان کے بعد ان کے جانشینوں کی بھی مخلوں کے ساتھ کشمکش کا سہہ گاہے ہوتی رہی۔

میاں جلال الدین کے بعد مسند خلافت پر شیخ عمر کا بیٹا اعدا خاں بیٹھا۔ لیکن ۱۶۰۳ء میں وہ بہانگیری لشکر کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا عبداللہ تھا جنھیں شاہجہان کے زمانے میں اعلیٰ منصب مل گیا اور وہ امرائے شاہی میں داخل ہوئے۔ میاں جلال الدین کے بیٹے اللہ داد خاں کو رشید خاں کا خطاب اور چار ہزاری

۱۔ معلوم ہوتا ہے مخلوں سے کشمکش میں اعداے سلطنت کو بھی دخل تھا بقول ڈاکٹر محمد جاگیر خاں، "اعداد نے جاگیر کو... لکھا۔ کہ ذرا اپنا شاہنامہ کھول کر تو دیکھ۔ تجھے معلوم ہو جائے گا کہ سلطان ابو سعید تیموریہ کی دختر کس صاحب حال سے بیاہی گئی تھی۔ ہم اسی بزرگ کی اولاد میں ہیں اور اسی لیے وارث مملکت ہیں" (منقولہ در تذکرہ صوفیائے سرحد ص ۱۲۰-۱۲۱)۔

عہدہ ملا۔ اور فرہر و شنیہ اور منحل حکام کی کشمکش ختم ہوئی۔

فرہر و شنیہ اور مغللوں کی کشمکش کا آثار چڑھاؤ ہوتا رہا لیکن اس فرقے کے زوال کا اصل سبب وہ مسلسل مخالفت تھی جو ان کے عقائد و خیالات کی ان کے اپنے علاقے میں ہوئی۔ سرحد میں اس وقت کئی فاضل علماء ایسے تھے جو جانتے تھے کہ میاں بایزید کی قرآن و حدیث کی ترجمانی صحیح نہیں۔ انھوں نے میاں بایزید کی سخت مخالفت کی۔ ان میں اخوند درویشہ کو بڑی شہرت ہے، جن کا تفصیلی تذکرہ ہم آئندہ صفحات میں کریں گے۔

پیر روشن کے متعلق اختلافات | پیر روشن کے واقعات زندگی بیان کرتے وقت ہم نے زیادہ تر انحصار ڈاکٹر ظہور الدین احمد صاحب

کی کتاب پاکستان میں فارسی ادب پر کیا ہے۔ جس میں پیر روشن کے نقطہ نظر کو اس کی تصانیف کی بنا پر (جس حالت میں وہ اب ملتی ہیں) نمایاں کیا گیا ہے۔ زمانہ حال کے بعض دوسرے اہل علم نے بھی اسی نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے اور ان کے مخالفین کے بیانات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ مسئلہ مزید تحقیق و تفکر کا محتاج ہے۔ روشنیہ سلسلے کے متعلق قریب قریب معاصر احمدی بیانات ملتے ہیں۔ لیکن پھر بھی حقیقت الحال کو جاننا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ اس کے بانی نے حال نامہ کے نام سے اپنی خود نوشت سوانح عمری لکھی۔ جس میں اپنی تعلیمات کا خلاصہ دیا۔ اور اس نام کا ایک مخطوطہ علیگر ٹھکانہ لائبریری میں ہے۔ جس کی نقلیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور دوسرے اداروں میں بھی ہیں۔ لیکن خود اس مخطوطہ سے ظاہر ہے۔ کہ یہ اصل نسخے کی نقل نہیں بلکہ حال نامہ کا ایک بالکل نیا ایڈیشن ہے، جسے مصنف کی وفات کے ستر اسی سال بعد ان کے ایک معتقد نے عہد عالمگیری میں از سر نو ترتیب دیا۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی نے مرتب کے متعلقہ الفاظ تذکرہ صوفیائے سرحد میں مع ترجمہ دیے ہیں اور حسب ذیل ہیں :-

بعد ازیں فقیر حقیر علی محمد بن ابابکر اس کے بعد یہ فقیر حقیر علی محمد بن

قندھاری مرید و خلام خاندانِ بایزید انصاری
 بگوید کہ بعضی از محبانِ مخلصان کہ رعایتِ خاطر
 ایشان از حیلہ لوازمات و واجبات ہفتہ چوں
 ازین فقیر التماس داشتند کہ حالنامہ پر دستگیر کہ
 از تدایرِ دوراں و تسامحِ نسخاں تغیر و تبدل
 بعبارشِ رفیعہ راہ یافتہ و صحتش بسقامت
 بدل گشتہ و نیز سوانح و حقائقِ فرزندان و
 احوالِ ہرگانِ پر دستگیر قدس سرہ و دیگر از
 احوالاتِ در منصفہ ظہور جلوہ گر آمدہ چنانچہ
 شمشیرِ گفتن و رفتن ایشان بجانبِ پشور و
 تراز و کابل و غیر از سوانحات کہ در انضباط
 نیامدہ ازین نسخہ شریفہ زائل گشتہ و از طبع
 زکی شما کہ مفتح ابوابِ معانی متعلقہ و کاشف
 اسرار و فائز مسدودہ است بعید نیست
 کہ عمیق و تطابق دادہ تصحیح نمایند و ارادت و
 تقاضا سے ایشان بسبب قبول و اصفا نمود
 بموقفِ اجابت مقرون گشت بامیدِ توفیق
 حق و ما توفیقی الا باللہ العلی العظیم و
 ہو حبیبی و نعم الوکیل۔

و آنچه از کتاب و ناقلانِ معتبر استماع
 گشتہ بسببِ تحریر و در نظم تقریر آوردہ شد
 معرا از بمنبت سخن پیرائی متبذل از تکلیف
 کلام آرائی و در حیز ارتقام مرسوم گشت

ابا بکر قندھاری جو بایزید کے خاندان کا
 مرید اور خاص خادم ہے عرض کرتا ہے کہ
 بعض مخلص دوستوں نے جن کے پاس خاطر
 کو میں واجبات میں سے جانتا ہوں اور فقیر
 سے کہا کہ پر دستگیر (پیر و شاں) کے
 حالنامے کی عبارت میں زمانے کی طوالت
 اور نقل کرنے والوں کے تسامح سے بہت
 کچھ تبدل و تغیر ہو گیا ہے اور اس کی صحت
 سقم سے بدل گئی اس کے علاوہ اس
 میں ان کے فرزندان اور ذریت کے
 حالات اور دوسرے واقعات جو ظہور پذیر
 ہوئے جیسا کہ مسلح ہو کر پر دستگیر کا پشاور
 تراز اور کابل وغیرہ جانے کے واقعات تحریر
 میں نہیں آئے اور جو اس نسخہ شریف سے زائل
 (غائب) ہو گئے ہیں آپ کی جو دستِ طبع سے
 جو متعلقہ ابواب کے معانی کو کھولنے والی
 اور سرسببہ و فائز اسرار کی کاشف ہے بعید
 نہیں ہے کہ فکرِ عمیق سے اس کا تطابق کر کے
 اس کی تصحیح کریں توفیقِ حق کی امید پر ان کی
 ارادت مندی اور ان کے تقاضے کو سامع
 نے قبولیت کا درجہ دیا۔ و ما توفیقی الا باللہ
 العلی العظیم و ہو حبیبی و نعم الوکیل۔
 اور میں نے جو کچھ کہ کتاب میں دیکھا تھا

تأبفهم مبتدیان و در ذہن متعلمان صورت
معانی روشن و مبرہن نماید و ثواب آل
ایں نافل بہرہ مندر گرد و الثواب من عند اللہ
واللہ عندہ من الثواب والسلام
علی من اتبع الہدی -

اور معتبر ناقلوں سے سنا تھا اسے سادگی کے
ساتھ تحریر میں لایا جو بناوٹ اور عبارت
آرائی سے بالکل پاک ہے۔ تاکہ مبتدیلوں اور
طالب علموں کے ذہنوں میں اس کے معانی و
مطالب واضح طور پر آسکیں اور اس کے
ثواب سے یہ نقل کرنے والا بہرہ مند ہو۔
الثواب من عند اللہ واللہ عندہ من
الثواب والسلام علی من اتبع الہدی -

مندرجہ بالا اندراج سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ حالنامہ پیر روشن
کی خود نوشت سوانح عمری سے کافی مختلف ہے۔ اس کی تشکیل و ترتیب عہد عالمگیری
میں ہوئی۔ جب افغان علاقے میں راسخ العقیدگی غالب آچکی تھی اور خود پیر روشن
کے پوتے اور دوسرے محقق مغللوں کے منصبداروں میں شامل ہو گئے تھے۔
حالنامہ کے متعلق یہ حقیقت اس لیے اہم ہے کہ حالنامہ کے حوالے سے پیر روشن
کے عقائد کا جو خلاصہ دبستان مذاہب میں دیا گیا ہے۔ وہ قلمی حالنامہ پر منطبق نہیں
آتا۔ اس کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں کہ یا تو دبستان مذاہب کے مصنف نے غلط بیانی
سے کام لیا ہے یا حالات کے تبدیل ہو جانے کی وجہ سے حالنامہ کے مرتب نے
کتاب میں تغیر و تبدل کیا ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر اصلی حالنامہ کا کوئی نسخہ مل
جائے اور یہ عقدہ حل ہو جائے۔ لیکن مرتب کے اپنے بیان کے پیش نظر یہ امر
زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ حالنامہ پیر روشن کی تالیف سے کافی
مختلف ہے۔ اور اس سے دبستان مذاہب کے بیانات کی تردید نہیں ہوتی۔
جناب قدوسی صاحب نے جنھوں نے اس مسئلے کا سب سے زیادہ تفصیلی مطالعہ کیا ہے،

۱۔ حالنامہ قلمی ملوک پنجاب یونیورسٹی لائبریری - ص ۱-۲ [منقولہ و تذکرہ مصنفین ۱۹۳۲-۱۹۴۲]

پیر روشن کے مشہور مخالف اخوند درویشہ پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اور پیر روشن کی اہم تصنیف خیر البیان کی نسبت لکھا ہے۔ ”ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ حضرت اخوند درویشہ نے اس کتاب کو کن اسباب کی بنا پر اس قدر مطعون کیا ہے۔“ لیکن خیر البیان کے دیباچہ ہی سے انھوں نے جو حوالے دیے ہیں (باقی کتاب کا جو حصہ ملا ہے، وہ پشتوں میں ہے، اس لیے موصوف نے اس کا بغور مطالعہ نہیں کیا) ان سے خیال ہوتا ہے کہ معتز ضنین کے اعتراضات اس قدر بے بنیاد نہ تھے بلکہ اہل شریعت اس کتاب پر اعتراض نہ کرتے تو حیرت ہوتی۔ یہ کتاب کلام مجید کی طرز پر اس طرح لکھی گئی ہے کہ گویا پیر روشن پر وحی نازل ہو رہی ہے اور وہ ارشادات ربانی کو حرف بہ حرف سپرد قلم کر رہے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

یا بانیذ! بنویس آں حروفہا کہ بسازند بہر زباں برائے منفعت آدمیاں
[توئی دانامن نمیدانم بجز حروفہا قرآن، یا سبحان آیا بانیذ نوشتن حروفہا بر تو
آسان است و نمودن و آموزانیدن نامہا و حروفہا بر من است۔ (منقولہ در
تذکرہ صوفیائے سرحد ص ۱۸۶)۔

قدوسی صاحب نے تو اس طرزِ تحریر کو ”ملہمانہ انداز“ یا ”القائی“ طریق کہہ کر معاملے کو ختم کر دیا ہے لیکن اگر ایسی کتاب کو دیکھ کر اخوند درویشہ یہ کہیں کہ پیر روشن الہام یا وحی کے مدعی ہیں اور ان کے دواہی کو فتنہ عظیم سمجھیں تو اس پر حیرت کیوں ہو؟ انھوں نے قلمی مخالفانہ پیر روشن کے ساتھ بعض علما (مثلاً مرزا حکیم کے دربار میں قاضی خان (تذکرہ صوفیائے سرحد ص ۱۴۲-۱۴۵) یا مولانا زکریا (ص ۱۴۱-۱۴۳) کے مباحثوں کی جو تفصیلات دی ہیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ دوسرے علما بھی پیر روشن پر وہی الزام لگاتے تھے جو اخوند درویشہ نے لگائے۔ مثلاً الہام کا دعوئے۔ نبوت کا ادعا وغیرہ۔ پیر روشن خیر البیان کے متعلقہ اندراجات کی تاویل کرتے تھے، لیکن کم از کم ان مباحثوں سے ظاہر ہے کہ اخوند درویشہ جو کہتے تھے، وہ ان تک محدود نہ تھا۔ تاریخ مرصع اور خوشحال خاں خشک کے بعض اشعار میں بھی اسی نقطہ نظر کا اظہار ہے۔

اخوند درویش صاحب نے پیر روشن کی نسبت جو سخت الفاظ کہے ہیں (ملعون وغیرہ) ان پر جتنا بھی افسوس کیا جائے بجا ہے۔ انھوں نے اس کے افعال کے متعلق جب وہ ان کا ہمان تھا، جس طرح خفیہ طریقے سے خبر رکھی، وہ بھی کسی عالی خیالی کا مظہر نہ تھا۔ وہ پیر روشن کی ذہانت، قابلیت اور اثر کے قائل تھے، لیکن اس کے اہم مثبت پہلوؤں کا انھیں اندازہ نہ تھا۔ انھیں پیر روشن سے جو مذہبی عناد تھا، وہ ان کی کتابوں سے صاف عیاں ہے بلکہ ان کی مذہبی زندگی کا نمایاں جزو تھا، لیکن ابھی تک ایسے شواہد نہیں ملے جن کی بنا پر انھیں دروغ بیانی کا مجرم قرار دیا جاسکے۔

اس کے علاوہ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ جس قسم کے اعتراضات اخوند درویش پیر روشن پر کرتے ہیں، حالنامہ کے بیانات کے مطابق دوسرے کئی معاصرین نے کیے ان کے والد ان کے مخالف تھے۔ مرزا حکیم حکمران کابل کے ایما پر قاضی کابل نے ان پر اعتراضات کیے۔ اگرچہ پیر روشن نے تاویلات سے ان اعتراضات کا جواب دے دیا۔ لیکن اگر ان اعتراضات کو ہی دیکھا جائے، جو متعدد موقعوں پر حالنامہ کے بیان کے مطابق کیے گئے تو پیر روشن کی مخالفت میں اخوند درویش تہنا نظر نہیں آتے بلکہ اور کئی علما و فضلا تھے۔ خیر البیان کے اندازہ بیان سے یہ بات بھی بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے کہ یہ اعتراضات کیوں ہوتے تھے۔ صراط التوحید، مسلمان حکمرانوں کو پیش کرنے کے لیے اس وقت لکھی گئی، جب کابل کا مباحثہ ہو چکا تھا اور پیر روشن کو معلوم تھا کہ ان پر کس قسم کے اعتراضات ہوتے تھے۔ چنانچہ قدرتی طور پر اس میں قابل اعتراض باتیں نہیں۔ (اگرچہ اس کا موجودہ نسخہ بھی بدیہی طور پر ترمیم شدہ ہے)۔ لیکن خیر البیان کو دیکھ کر پیر روشن کے مخالفین کے بیانات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور ہم ان کا خلاصہ درج ذیل کرتے ہیں۔

محزن الاسلام کا اندراج | اخوند درویش صاحب نے اپنی تصانیف (بالخصوص اپنی پشتو کتاب محزن الاسلام کے آخر میں فرقہ روشنیہ اور اس کے بانی کی نسبت کئی ایسی معلومات جمع کی ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں۔ اخوند صاحب کی

میاں بایزید کے ساتھ سخت مخالفت تھی اور انھوں نے اس کے متعلق جا بجا غیظ و غضب اور برہمی کا اظہار کیا ہے۔ میاں بایزید کے بعض کلمات (مثلاً اس کی دو ٹوہوں) سے جو نتائج وہ اخذ کرتے ہیں ان سے ہم متفق نہیں، لیکن انوند صاحب ایک برگزیدہ مذہبی عالم تھے۔ بلاشبہ وہ اپنے خیالات میں سخت تھے اور بعض جگہ محصوم یا قابل تاویل امور سے بھی بڑے مخالفانہ نتیجے اخذ کر لیتے تھے، لیکن یہ خیال کہ انھوں نے دانستہ دروغ بیانی سے کام لیا، قابل قبول نہیں معلوم ہوتا۔

انوند درویش لکھتے ہیں کہ نواح قندھار کے موضع کانی کرم میں عبداللہ نام کے ایک بزرگ رہتے تھے۔ وہ علما و صلحا کی اولاد میں سے تھے اور خود بھی زیورِ علم و صلاح سے آراستہ تھے۔ ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام اس صلحا کے قدردان نے بایزید رکھا۔ اسے بھی انھوں نے دولتِ علم سے بہرہ ور کر دیا۔ کم عمر بایزید ریاضت و عبادت میں مشغول رہتا اور منہیات شرعی سے حتی الوسع مجتنب تھا، لیکن حصولِ تعلیم کے بعد وہ گھوڑوں کی سوداگری کے سلسلے میں ہندوستان گیا اور موضع کالجہ (جالدھر) میں ملا سلیمان ملحد کی صحبت میں رہا۔ اس صحبت اور ہم نشینی سے بایزید کے دل میں خیالات فاسد جانشین ہوئے۔ حتیٰ کہ وہاں سے وہ ایک "کافر مطلق" اور منکر دین برحق "ہو کر واپس ہوا۔

جب کانی کرم میں بایزید نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو اس کے والد سخت برہم ہوئے بلکہ بیٹے کو زد و کوب کیا۔ چنانچہ بایزید وہاں سے بھاگ کر تنگ پور چلا گیا۔ اور صمد علاقے میں ملک سلطان احمد کے مکان پر ایک مدت تک مقیم رہا، لیکن یہاں اہل سنت اور علما کثرت سے تھے۔ انھوں نے اس کی بات نہ سنی۔ وہاں سے وہ پرشور پشاور کے قریب غور یا خیل قبیلے کے درمیان آ مقیم ہوا۔ یہاں کوئی

۱۔ یہ قصبہ جنوبی وزیرستان میں رزک کی مشہور سابق چھاؤنی سے کوئی بیس میل اور ٹانک سے ۸۰ میل دور ہے۔

زبردست اور مجتہد عالم نہ تھا جو بایزید کے بیان کو کتاب و حدیث اور علم و اصول کی کوئی پرکستا۔ اس لیے عوام میں سے کئی لوگ اس کے معتقد ہو گئے۔

انخوند درویش نے میاں بایزید کے جو حالات لکھے ہیں ان سے اور دوسرے ذرائع سے خیال ہوتا ہے کہ میاں بایزید پر ہندو اثر بھی کافی تھا۔ مشرقی پنجاب تو خیر ہندوؤں کی روحانی سرگرمیوں کا بڑا مرکز تھا، لیکن پشاور اور دوسرے افغان علاقوں میں ابھی ہندو موجود تھے۔ خود پیر و خاں کے مریدوں میں ہندو تھے اور انخوند درویش لکھتے ہیں کہ وہ انھیں ”بزبان ہندوی“ ذکر کی تعلیم دیتے۔ ہندوؤں کے عقیدہ تناخ کو تو پیر و خاں نے اپنی تعلیمات کا جزو بنالیا تھا۔ انخوند درویش یہ بھی لکھتے ہیں کہ میاں بایزید مردوں اور عورتوں کو یکجا بٹھاتے اور سرود و رقص اور دستک کا آغاز کرتے۔ شر پٹھے جاتے اور ذکر ہوتا (پس مرداں را باز ناں یکجا مے نشاند۔ سرود و رقص و دستک مے ورزیدند و بیت مے گفتند و ذکر مے گفتند) مردوں اور عورتوں کا اس طرح کا یکجا اجتماع اس بزرگمقام میں کسی اسلامی سلسلے میں پہلے رائج نہ تھا، لیکن اس کا رواج بعض ہندو فرقوں میں عام تھا۔

پیر و خاں پر دوسرے اثرات بھی کئی تھے (مثلاً ”مخیلات فلسفہ و سفسطائیں بیان مے کردہ و مے نوشتہ“) لیکن مقامی حالات و ضروریات کے اثر کے علاوہ جو چیز ان کی تحریک میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ صوفی عقیدہ وحدت الوجود کی غالی پیروی اور طریقت کی انتہائی مطلق العنانی ہے۔ ہندوستان کے چند ایک دوسرے صوفیہ میں بھی یہ رجحان نظر آتا ہے، لیکن میاں بایزید ایک تو پیدا اس زمانے میں ہوئے جب شیخ علی متقیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اصلاحی تحریکیں ابھی شروع نہ ہوئی تھیں۔ دوسرے اپنے خیالات کی تدوین انھوں نے اس علاقے میں کی جہاں اہل علم کی روک ٹوک تھوڑی تھی۔ اس لیے ان کے خیالات میں وہ مطلق العنانی ہے، جس کی مثال اس بزرگمقام کے کسی دوسرے مشہور اور بااثر روحانی راہنما میں نہیں ملتی، لیکن ان کی تحریک کی بنیاد انھیں رجحانات پر تھی جو وحدت الوجودیوں

میں عام ہیں۔ مثلاً غالب کا یہ مشہور شعر ہے ۵
 جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اسے خدا کیا ہے
 میاں یازید نے اس خیال کو جس صورت میں پیش کیا، وہ (بقول انخوند درویزہ)
 یہ تھا۔ ”پہلی جزو وجود خدا پیرے دیگر درجہ وجود نیست“ پس حرام و حلال و روا و ناروا چہ
 معنی دارد؟ اسی طرح بعض صوفیہ میں مرشد کو جو درجہ تعظمی دیا جاتا ہے اسے سب
 جانتے ہیں۔ بقول حافظ ۵

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پر مغاں گوید

کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

میاں یازید کی مطلق الضانی اور انتہا پسندی نے مرشد کو خدا اور پیغمبر کا
 ہم رتبہ بنا دیا اور کہنے لگے کہ پیر کامل کے بغیر خدا تک رسائی نہیں۔ وہ کلام مجید کی
 ایک آیت کا حوالہ دیتے دابتغوا الیہ الوسیلۃ اور کہتے کہ اس کے مطابق خدا
 تک پہنچنے کا وسیلہ پیر ہے۔ و افغاناں از بے علمی تصدیق و باور کردند و ندانستند کہ
 در تفسیر برضاوی وغیرہ آورده کہ وسیلہ بخدا سے ایثار طاعات و ترک محاصی است۔
 پس بے استقامت بر شریعت نبوی صلعم بہ خدا راہ نیست“ [انخوند درویزہ]

اسی طرح شریعت پر طریقت اور معرفت کو ترجیح دینے کا مسئلہ ہے۔ میاں
 یازید کہتے کہ پہلی منزل شریعت ہے۔ جب تک شریعت سے نہ گزریں طریقت تک
 رسائی نہ ہوگی اور جو شخص طریقت سے نہ گزرے گا وہ معرفت و حقیقت تک نہ
 پہنچے گا۔ اس خیال کا اظہار بھی صوفیوں میں عام ہے، لیکن انخوند درویزہ اور ان کے
 ہم خیال کہتے کہ جو کوئی شریعت سے گزر جاتا ہے، وہ کافر ہو جاتا ہے اور کافر کی

۵۔ پیر روشن کی تصنیف صراط التوحید میں جو بہت بعد کی تصنیف ہے اور اکبر اور دوسرے سلاطین وقت
 کے لیے لکھی گئی زیادہ تر عام نقطہ نظر کا اظہار ہے، لیکن حالنامہ میں جو تغیر و تبدل ہوا ہے اسے دیکھتے
 ہوئے پیر روشن کی تصانیف کے قریب العہد قلمی نسخوں کی تلاش جاری رہنی چاہیے۔

خدا تک رسائی نہیں۔ وہ کہتے کہ یہ خیال کہ شریعت کے علاوہ بھی کوئی دوسرا راستا ہے جو خدا تک پہنچا دیتا ہے، سرے سے غلط ہے۔

غرضیکہ میاں بایزید کی تعلیمات کا سراغ دوسرے وحدت الوجودیوں کے ہاں مل جاتا ہے، لیکن انھوں نے ان چیزوں کو ایک تیار رنگ دیا اور ان خیالات میں اس طرح غلو کیا کہ ان کی کایا ہی پلٹ دی۔ شریعت پر طریقت کو اور طریقت پر معرفت کو اس طرح ترجیح دی کہ ایک طرح سے مریدوں کو شریعت سے بالکل آزاد کر دیا بلکہ بعض روایات کے مطابق ایک نئی شریعت کا آغاز کیا اور نماز روزہ و طہارت کے احکام میں بنیادی تبدیلیاں کیں۔ ہم ان کا ذکر دبستان مذاہب کے اندراج کے ضمن میں کریں گے۔

میاں بایزید کی افغان علاقے میں کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے افغان زبان میں اپنے خیالات کی اشاعت کی۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ اپنی تعلیمات کو افغانوں تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ میاں بایزید نے جس زمانے میں نشوونما پائی اس وقت (مثلاً بھگتی تحریک کے دوران میں) سنسکرت اور عربی کی جگہ عام فہم زبان میں تصنیف و تالیف کا رجحان عام تھا۔ چنانچہ اس کے مطابق میاں بایزید بھی مریدوں کی سمجھ اور زبان کے مطابق ذریعہ تعلیم اختیار کرتے۔ انھوں نے درویش لکھتے ہیں۔

”الفقہ ایں محدثوں مردم را بخود معتقد میکرد۔ ایشان را خلوت سے فرمود و ذکر

مے داد۔ اما ذکر اور از نامہ اسے باری تعالیٰ نبودہ بلکہ افغاناں را بہ زبان افغانی یگان

سخنے موافق موزوں ساختہ مے دادہ۔ و بعضے جلا سے فارس را بہ زبان فارسی و

ہندواں را بہ زبان ہندوی و بکذا“

میاں بایزید کا دائرہ کار افغان علاقہ رہا، لیکن ان کی ذہنی ساخت میں فقط مقامی اثرات نہ تھے اور نہ ہی ان کا مطالعہ نظر محض مقامی تھا۔ وہ تو سارے ہندوستان اور خراسان کو مسخر کرنے کے خواب دیکھتے تھے۔ (دولہ ہازدہ کہ تمام ہندوستان و خراسان خواہم

۱۰ یعنی زبان عربی (مولف)

در تصرف خود آوردہ ، اور یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ ان کے خیالات کا مجموعہ خیر البیان فقط پشتو زبان میں نہیں لکھا گیا بلکہ میاں بایزید نے اسے چاند بانوں یعنی عربی فارسی پشتو اور ہندی میں لکھا تا کہ سب زبانوں میں اپنے خیالات کی ترویج کر سکیں ۔

دبستان مذاہب کا اندراج | دبستان مذاہب سے جو غیر محروف فرقوں کے متعلق قابل اعتماد معلومات کا ایک بڑا ماخذ سمجھا جاتا ہے ،

خیال ہوتا ہے کہ میاں بایزید کی نجی مشکلات نے ان کی پریشانیوں میں بڑا اضافہ کیا ۔ ان کے والد شیخ عبداللہ انصاری زیادہ تر سرحد کے افغان علاقے میں (مقامی کریم) رہتے تھے ۔ جب ہندوستان پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا تو اس کے ایک عرصہ بعد بایزید اور ان کی والدہ بھی ان کے پاس چلی گئیں ، لیکن بیوی کی میاں سے نہ بنی ۔ شیخ عبداللہ نے اسے طلاق دے دی اور خورد سال بایزید کو عام بے چینی کے علاوہ سوتیلی ماں اور بے پروا باپ کے ظلم و ستم سہنے پڑے ۔ انھیں شروع ہی سے روحانی اور مذہبی امور سے دلچسپی تھی ۔ کھیتوں کی نگہبانی کے لیے جاتے تو دوسروں کی کھیتوں کا بھی خیال رکھتے ۔ چھوٹی عمر میں حقیقت اشیا اور مبدا و محاد کی نسبت سوال کرتے اور پوچھتے کہ زمین اور آسمان تو موجود ہیں لیکن خدا کہاں ہے ؟ وہ چاہتے تھے کہ اپنے ایک قرابتدار خواجہ اسماعیل کے مرید ہو جائیں ، لیکن والد مانع ہوئے اور کہا کہ یہ باعث شرم ہے کہ اپنے ایک معمولی قرابتدار کی مریدی کرو ۔ مرید ہونا ہے تو شیخ بہاء الدین زکریا کی اولاد میں سے کسی کی بیعت کرو ۔ بیٹے نے کہا ۔ روحانی مرتبہ کوئی مؤردہ چیز تو نہیں ، لیکن بالآخر بایزید کو خود ہی اپنا راستا بنانا پڑا ۔ بڑی ریاضتیں اور عبادتیں کیں اور کلام الہی ، احادیث نبوی اور احکام شریعت پر خود ہی غور و خوض کیا ، لیکن ایسے ایسے معنی نکالے کہ حقیقت سے بہت دور جا پڑے اور شریعت و طریقت کی خورد و ترجمانی سے ایک ایسا ملغوبہ تیار کیا جو مروجہ اسلام سے بالکل مختلف تھا ۔ ان کے معتقد انھیں پروردگار کہتے تھے ، لیکن ان کے مخالف کثرت سے کہتے ۔ وہ انھیں "پیر تارک" کہتے ۔

میاں بایزید نے اپنے پیروؤں کے لیے نئے قواعد و ضوابط بنائے۔ نماز کے لیے قبلہ رو ہونے کی شرط اڑادی۔ غسل کے لیے پانی کو غیر ضروری قرار دیا۔ مریدوں کو تعلیم دی کہ جو ان کے پیر کا قائل نہ ہو اور وحدت وجود کے راستے پر نہ چلیں اس کا ذبح کیا ہو جائز و حرام ہے بلکہ انھوں نے تو اپنے مخالفین کا قتل کرنا اور ان کا مال متاع لوٹ لینا جائز قرار دیا۔ وجہ یہ بتاتے کہ جو لوگ خود شناس نہیں وہ یا تو حیوان ہیں جنہیں دوسرے حیوانوں مثلاً بھیڑ بکری کی طرح ذبح کرنا اور سانپ بھپوؤں کی طرح ہلاک کرنا جائز ہے۔ یا حیات ابدی سے محروم ہونے کی وجہ سے مردے ہیں اور مردوں کا مال زندوں کو پہنچتا ہے۔

”وگفت ہر کہ خدرا و خورانشناس آدمی نیست۔ اگر آدمی است حکم گرگ و پلنگ و مار و کژدم دارد۔ پیغمبر عربی کفۃ اقل المودی قبل الایذ و اگر نیوکار و نماز گزار است حکم گاؤ و گوسفند دارد۔ کشتن آن جائز است۔ بنا بریں مخالفین خود شناسی را کشتن فرمود۔ چہ اینہا حیرانند۔۔۔۔۔ وگفت ہر کسے کہ خورانشناس و خبر از زندگی جاوید و حیات ابدی ندارد مردہ است و مال مردہ کہ وراثت آن جنیں مردہ باشند بہ زندگان رسد۔ بنا بریں نیز حکم بر قتل ناداں کرد۔“

اس فلسفہ پر وہ خود عامل تھے۔ چنانچہ دبستان مذاہب میں جس کے مصنف نے میاں بایزید کے حالات ان کی خود نوشت سوانح عمری حال نامہ اور دوسرے مآخذ سے جمع کیے ہیں لکھا ہے کہ میاں بایزید اپنے بیٹوں کے ساتھ مدتوں تک راستا چلنے والوں کو ٹوٹتے رہے۔ پانچواں حصہ اپنے قائم کردہ بیت المال میں جمع کرتے

۱۰ ”او خود رانی دانستے و مردم را بہ ریاضت فرمودے و نماز بگزاردے۔ اتعین جت را از میان برداشت فایمالتو و اشتر و جہ اللہ فرمود۔ غسل بآب واجب نیست چہ ہمیں کہ باد رسیدن پاک میشود۔ چہ چار عنصر از مطہرات است۔“ (دبستان مذاہب ص ۳۰۸)

۱۱ دبستان مذاہب ص ۳۰۸

اور بوقت ضرورت اہل استحقاق میں تقسیم کرتے۔

پیر روشن کی اہمیت | پیر روشن کے خیالات کا جو خلاصہ ہم نے محزن الاسلام اور دبستان مذاہب سے دیا ہے۔ اس کی دلچسپی نظری اور تحقیقی ہے۔ روشنیہ فرقہ کے اگر یہی عقائد ابتدا میں تھے، جن پر اعتراض کیے گئے، تب بھی وہ ترک ہو گئے۔ پیر روشن کے خاندان کے کئی افراد اپنے عقائد سے تائب ہو گئے اور بہر کیف، جس علاقے سے اللہ تعالیٰ نے اسلام اور مسلمانوں کی اتنی خدمات لیتی تھی، وہاں راسخ العقیدگی غائب آگئی، لیکن اگر محزن الاسلام اور دبستان مذاہب کے اندراجات کو بالکل صحیح مانیں، تب بھی پیر روشن کی تاریخی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ انھوں نے اور ان کے جانشینوں نے کئی سال تک ایک اہم مذہبی، تمدنی، اور سیاسی تحریک کی رہنمائی کی۔ پشتو ادب کے تو وہ بانیوں میں سے ہیں اور خیر البیان پشتو نثر کی سب سے پہلی کتابوں میں سے ہے۔

ایک ایسے بنجر پہاڑی علاقے میں جہاں جائز آمدنی کمانے کے ذریعے کم تھے، لیکن جہاں سے ہو کر ترکستان اور بلخ بخارا کے پُر اموال تجارت لدرے ہوئے قافلے گزرتے تھے۔ میاں بایزید کی تعلیمات کا مقبول ہونا قدرتی امر تھا (اور ایک حد تک یہ تعلیمات مقامی حالات اور اس علاقے کی اقتصادیات کا نتیجہ تھیں، لیکن میاں بایزید کے وسیع اثر کی ایک وجہ ان کی اور ان کے مریدوں کی ادبی سرگرمیاں تھیں۔ ادبیات سرحد میں رضا ہمدانی لکھتے ہیں:-

”پیر درخان بہت بڑی شخصیت کا مالک تھا۔ ادب، فلسفہ، تبلیغ و ارشاد اور قومیت سب میں ماہر تھا۔ اگرچہ پیر درخان زندگی کے تمام شعبوں میں دسترس کامل رکھتا تھا، لیکن اس کی ادبی زندگی بہت نمایاں تھی بلکہ پشتو ادب کی ترقی کا باعث ہی پیر درخان تھا۔ اس نے نثر کے ذریعے پشتو ادب کی بہت بڑی خدمت کی اور ایک نئے مکتب فکر کی بنیاد رکھی۔ اس کی تصانیف میں خیر البیان بڑی مشہور کتاب ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ کتاب پیر درخان نے چار زبانوں میں لکھی

پشتو۔ فارسی۔ عربی اور ہندی۔ یہ کتاب شریعت، طریقت اور دینی مسائل سے متعلق

ہے۔ نیز اس میں پٹھانوں کے سیاسی، اجتماعی اور دین القبیلوں اتحاد کا بیان ہے اور

جا بجا قرآن و احادیث کے ساتھ اپنے خیالات کو تطبیق دی گئی ہے.....

رضا ہمدانی صاحب نے اپنے بیان کا ماخذ نہیں بتایا۔ پشتو ادب کے قدیمی عالم پیر و خاں کو وہ درجہ نہیں دیتے جو رضا صاحب نے دیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جب تک پیر و خاں کی تصانیف چھپ کر سامنے نہ آئیں، پشتو ادب میں ان کا مرتبہ معین کرنا مشکل ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے پشتو زبان کی سرپرستی کی پشتو شاعری بہت پرانی ہے اور پشتو نثر میں بھی پرورش سے پہلے تصنیف و تالیف ہو رہی تھی، لیکن انھوں نے جس مکتب فکر کا آغاز کیا، اس کے متعدد ممتاز ادبی ترجمان تھے۔ شعرا میں سے مخلص اور ارزانی ان کے معاونین خاص تھے۔ لیکن اس مکتب خیال کا سب سے با اثر نمائندہ (میاں بایزید انصاری کا پوتا؟) مرزا خاں انصاری تھا، جس نے پشتو میں پہلا دیوان مرتب کیا۔ وہ آخر میں روشنیہ عقائد سے تائب ہو گیا تھا، لیکن اس نے پہلی مرتبہ پشتو غزل کو صوفیانہ خیالات (بالخصوص نظریہ وحدت الوجود) کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور پشتو شعرا کے سر تاج رحمان بابا کے لیے راستہ ہموار کیا۔

پیر و روشن کے جو احسانات پشتو ادب پر ہیں اس سے زیادہ افعال موسیقی پر ہیں، اس سلسلے میں قدوسی صاحب نے قلمی حالنامہ سے طویل حوالے دیے ہیں اور ہم ان کے شکریے کے ساتھ ان کا تمام اندراج درج ذیل کرتے ہیں:-

حالنامے کے بعض اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ:

”پیر بایزید اور ان کے مریدوں نے اس علاقے کی موسیقی کے فروغ میں بھی بڑا حصہ لیا تھا۔ حالنامے میں ان دونوں خزانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو پیر بایزید کے ذریعے سے قوم کو ملے۔ حالنامے میں ہے کہ:-

روزے... بیارن خود میفرمود کہ ایک روز اپنے دوستوں... سے

دو گنج از افغاناں حق تعالیٰ پوشیدہ داشت
 بہ طفیل و کس آں ہر دو گنج ظاہر ساخت
 یکے از آں گنج علم توحید است کہ از افغاناں
 پوشیدہ بود حق تعالیٰ از طفیل پیر و شاں
 برایشاں کشوف گردانید۔ سخن گنج دوم کہ
 مذکور شدہ بود آن گنج علم موسیقی است کہ
 از طفیل حاجی محمد خلیفہ میر فضل اللہ ولی از افغاناں
 کشف نمود زیرا کہ پیشتر در افغاناں بر غنچگیں
 سترارامی نواختند و بر رباب پنج تار یعنی
 سرمد و تار مدینواختند و دو تارے گفتند
 و از تعلیم و طفیل حاجی محمد سازندہ ایشاں
 تارے بسیار بر ساز ہائے انداختند و
 نغمہائے نو نوا خراج نمودند اما اکثر نغمہائے
 رقص و غیر ملائم می نواختند بچوں آں
 سازندہائے در خدمت پیر دستگیر قدس سرہ
 رسیدند و از برکت و صحبت و طفیل پیر
 دستگیر سرود و سلوک و نغمہائے ملائم فرمودند
 و شش مقام بستند یکے ناصری دوم
 پنج پردہ سوم چار پردہ چہارم سر پردہ
 پنجم پردہ جنگ کہ در وقت جنگ می نواختند
 ششم مقام شہادت است و درین مقام
 بسیارند و نغمہا نواختہ می شود و دیگر
 پیشتر در افغاناں از دوسہ بیت شعر زیادہ

فرماتے تھے کہ دو خزانے حق تعالیٰ نے
 افغانوں سے پوشیدہ رکھے تھے۔ و شخصوں
 کے طفیل سے وہ دونوں خزانے افغانوں
 پر ظاہر کیے۔ ایک خزانہ ان میں سے
 علم توحید ہے جس کو خدا سے تعالیٰ نے
 پیر و شاں کے طفیل سے افغانوں پر ظاہر
 کیا۔ دوسرا خزانہ جو ظاہر کیا گیا وہ خزانہ
 علم موسیقی کا ہے جو حاجی محمد خلیفہ میر فضل اللہ ولی
 (مرید پیر و شاں) کے طفیل سے افغانوں
 پر ظاہر ہوا۔ اس لیے کہ پہلے افغان غنچگیں
 (ساز) پر اکتارہ بجاتے تھے اور پانچ تار
 کے رباب یعنی سرمدہ پر دو تار بجاتے تھے
 اور پانچ تار کے رباب یعنی سرمدہ پر دو تار
 بجاتے تھے اور اسے دو تار کہتے تھے۔
 حاجی محمد کی تعلیم اور طفیل سے ان کے
 سازندوں نے کئی کئی تار سازوں میں ڈالے
 اور نئے نئے نغمے نکالے لیکن وہ اکثر نغمے
 غیر ملائم بجاتے تھے۔

جب یہ سازندے پیر دستگیر (پیر و شاں)
 کی خدمت میں پہنچے تو پیر دستگیر کی صحبت و
 برکت اور طفیل سے نغمہ ملائم بجانے لگے
 اور چھ نغمے ایجاد کیے۔ ایک ناصری دوسرے
 پنج پردہ تیسرے چار پردہ چوتھے تین پردہ

پانچویں پردہ جنگ جو جنگ کے وقت
بجاتے ہیں چھٹے مقام شہادت اور
اس نغمے میں بہت سے نغمے اور بند
گائے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس سے پہلے افغان
(شاعری) میں شعروں میں قسم سے زیادہ
نہ تھے۔ پیر و شگیر نے افغانی زبان میں
قصیدے، غزلیں، رباعیاں، قطعے اور مثنویاں
کہیں اور پیر و شگیر کے طفیل سے ان کے
فرزندوں اور مریدوں کے دیوان کہے۔

نبود و پیر و شگیر قدس سرہ بزبان افغانی
قصیدہ، غزل، لہا و رباعی، ہا و قطعہ اور
مثنویاں ساختند و از طفیل پیر و شگیر
قدس سرہ، فرزندان و مریدانش دیوانہا گشتند

حالانکہ اسے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ”حاجی محمد مرید میر فضل اللہ
ولی متوفی ۹۲۰ھ (۱۳۹۳ء) نے رباب میں چند تاروں کا اضافہ کیا تھا اور ان کی
اس ایجاد پر افغان موسیقاروں نے چند نئے نغمے اضافہ کیے تھے، لیکن موسیقاران
نغموں کو غیر متوازن بجاتے تھے۔ پیر یازید نے ان نغموں میں اصلاح کی۔ ان کی تنہائی
میں موسیقار اس قابل بنے کہ سرود و سلوک اور دوسرے حسب ذیل طریقہ نغمات کا
سرود بنا سکیں۔

ناصری (دھنا سری) پنج پردہ، چار پردہ، سر پردہ، جنگی آہنگ، مقام شہادت۔
سرود کا ذوق پیر یازید میں شروع ہی سے تھا۔ جب سرود ہوتا تو وہ وجد میں آجاتے
تھے۔ ان کے بیٹے اور پوتے بھی ماہر موسیقار تھے۔“

قادر یہ سلسلہ

زمان وسطیٰ کے ہندوستان میں مرکزی حکومت کی کمزوری کا آخری زمانہ مذہبی انتشار کا زمانہ بھی تھا، لیکن سیاسی استحکام اور علوم اسلامی کی اشاعت کے ساتھ حالات سدھر گئے۔ اس اصلاح حالت میں ایک نئے صوفیانہ سلسلے سے بھی مدد ملی۔ جس نے شمالی ہندوستان بالخصوص پنجاب اور سندھ میں بڑا اقتدار حاصل کیا اور جس کا اثر آج کسی دوسرے خاندان کے اثر سے کم نہیں۔ یہ سلسلہ حضرت پیران پیر غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ سے شروع ہوا جو ۶۵۰ھ میں بغداد میں فوت ہوئے اور جن کے نام پر یہ سلسلہ قادر یہ کہلاتا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں کا زور کم ہو گیا تھا۔ ان خاندانوں میں سے اب بھی کئی پاک سیرت اور نیک نفس بزرگ پیدا ہو رہے تھے۔ جن کی زندگیاں عوام کے لیے چراغ ہدایت تھیں، لیکن ان میں سلطان المشائخ جیسی عظیم الشان شخصیتیں نہ تھیں۔ اس کے علاوہ مغلیہ حکومت کے استحکام اور بالخصوص حرمین کے لیے بحری راستا کھل جانے سے ملک میں اسلامی علوم اور فقہ کی اشاعت بڑھ گئی۔ اس لیے بعض متشرع بزرگوں کو جو تصوف اور ذاتی روحانی تجربات کو بھی اہمیت دیتے تھے ایک ایسے صوفیانہ نظام کی تلاش تھی جس کی کوئی بات شرع کی نظروں میں مشتبہ نہ ہو۔ بالآخر نقشبندیہ سلسلے نے اس رجحان کو پورا کیا لیکن اس کے فروغ سے پہلے اس بارے میں قادر یہ سلسلے کو دوسرے قدیمی سلسلوں پر امتیاز حاصل تھا اور اس کی وجہ سے بڑے بڑے پیرمہزگار علما مثلاً شیخ علی متقی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس سلسلے میں بیعت کی اور اسے خواص و عوام میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔

مخدوم محمد کیلانی علیہ السلام | سب سے پہلے طریقہ قادر یہ کے جس بزرگ کا نام ملتا ہے۔ دکن کے شاہ نعمت اللہ قادری متوفی ۱۱۸۰ھ

تھے۔ لیکن ان سے سلسلہ بہت پھیلا نہیں اور صحیح طور پر جس بزرگ نے ہندوستان میں

اس سلسلے کا آغاز کیا۔ وہ حضرت مخدوم محمد گیلانی قدس سرہ تھے۔ آپ حضرت غوث اعظم کی اولاد سے تھے، لیکن جب ہلاکو خاں نے بغداد کو تباہ و برباد کیا تو آپ کے بزرگ حلب چلے گئے۔ آپ وہیں پیدا ہوئے۔ آپ کو ظاہری جاہ و جلال بھی حاصل تھا اور علوم معقولی و منقولی بھی آپ کے پوری طرح حاصل کیے۔ ایک عرصہ ایران۔ خراسان اور دوسرے ملکوں کی سیر کی۔ پھر اپنے والد کی وفات کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور مغربی پنجاب کے مشہور مقام اُچہ میں توطن اختیار کیا۔ سلطان سکندر لودھی آپ کا بڑا معتقد تھا۔ آپ شعر بھی کہتے تھے اور قادری تخلص کرتے تھے۔ اکثر اشعار حضرت غوث اعظم کی تحریف میں ہیں۔ لیکن ایک غزلوں کا دیوان بھی ہے جس میں کئی ترجیع بند ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث نے ایک بند اخبار الاخبار میں درج کیا ہے۔ ہم بھی تبرکاً چند اشعار نقل کرتے ہیں۔

رندیم و قلندریم و چالاک	مستیم و معریدیم و بے باک
جامیم و صراحتیم و بادہ	دُر و صد فیم و بحر و خاشاک
والی و لایت شمش و بیخ	حامی و بلاد فیم و ادراک
مجموعہ راز عالم دل	منصوبہ کشائے ستر لولاک
بگذشتہ ز خویش بے کدورت	نگزشتہ ز عشق جو ہر خاک

ما بلبیل بوستان قدسیم

شہباز سفید دست انسیم

مخدوم عبد القادر ثانی | مخدوم محمد گیلانی کی وفات کا حالہ میں ہوئی۔ آپ کے چار بیٹے تھے۔ سبھی اپنی جگہ بلند مرتبہ، لیکن جو مرتبہ مخدوم

عبد القادر ثانی کا ہے، دوسروں کو حاصل نہیں ہوا۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت مخدوم محمد گیلانی وفات پا گئے تو اگرچہ سجادہ نشینی کا حق شیخ عبد القادر ثانی کا تھا، لیکن ان کے بھائی بادشاہ کے دربار میں تھے۔ انھیں خیال ہوا کہ ہم اپنے اثر و اقتدار سے سجادگی اپنے لیے حاصل کر لیں۔ آپ کو بتا چلا تو آپ نے جاگیر و املاک کے متعلق تمام اسناد

وفراہین بادشاہ کے پاس بھیج دیے کہ جوان کے طالب ہیں انھی کو یہ دے دو۔ اس کے بعد مہموتکلا نہ گزارہ کیا۔ ایک بار بادشاہ نے (غالباً ملتان کا حاکم ہوگا) ان سے اپنے دربار میں آنے کی درخواست کی اور گزشتہ اقدام کی تلافی چاہی، لیکن انھوں نے لکھ بھیجا۔

بہر ہیچ باب ازین باب روئے گشتن فریت ہر آنچہ بر سرِ مے رود، مُبارک باد
 کسیکہ خلعتِ سلطانِ عشق پوشیدہ است بجلدِ ہائے بہشتی کجا شود دل شاد
 کہتے ہیں کہ عنفوانِ شباب میں آپ بڑے عیش و آرام سے زندگی گزارتے تھے بلکہ جہاں آپ جاتے، باجوں اور دوسرے آلات موسیقی سے لدے ہوئے اونٹ ہمراہ ہوتے۔ لیکن جب آپ پر دوسرا رنگ غالب آیا اور اپنے والد کے سجادہ نشین ہوئے تو ان سب باتوں سے مُتہ بھیر لیا۔ سماع سے قطعی پرہیز کرنے لگے اور اپنے مریدوں کو بھی سختی سے اس کی ممانعت کرتے۔ اس تبدیلی کا باعث تذکرہ نگار یوں بیان کرتے ہیں کہ آپ ایک دفعہ اُچھ کے بیابان میں شکار کر رہے تھے کہ ایک دراج نے بڑی دردناک آواز سے نالہ و فریاد شروع کیا۔ ایک درویش اس بیابان میں تھا۔ اُس نے کہا کہ سبحان اللہ ایک دن ایسا بھی ہوگا جب یہ جوان خدا کی محبت میں اسی طرح نالہ و فریاد کرے گا۔ یہ سن کر آپ پر عجیب حالت طاری ہوئی۔ دنیاوی چیزوں سے دل سرد ہو گیا اور روز بروز محبتِ الہی کے آثار زیادہ نمایاں ہونے شروع ہوئے حتیٰ کہ آخر میں ہر طرف سے دل ہٹ گیا اور فقط ذاتِ مولیٰ کا دھیان رہ گیا۔ آپ کو شیخ عبدالقادر ثنائی اس لیے کہتے ہیں کہ آپ کے کمالات حضرت غوثِ اعظم قدس سرہ کے تابع تھے اور آپ روحانیت میں انھیں کے وارثِ حقیقی تھے۔ آپ کی بڑی کرامات بیان کی جاتی ہیں اور تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ آپ کی نگاہ میں ایسی تاثیر تھی کہ جس پر نظر ڈالتے، اس کی کایا پلٹ جاتی۔ گنہگار ہوتا تو تائب ہو جاتا اور کافر ہوتا تو ایمان کی دولت سے شرف یاب ہوتا۔ اخبارِ الاخبار کا بیان ہے: ”بسیار سے از عصاة و کفار بمشاہدہ جمال و معانہ“

کمالش بسعادتِ توبہ نصوح سے رسیدند و بشرف ایمان مشرف سے شدند۔
 شیخ عبدالقادر ثانی کی وفات ۵۳۳ھ میں ہوئی۔ ان کے بعد قادریہ سلسلے میں
 کئی مشائخ کبار گزرے ہیں۔ آپ کے پوتے حضرت سید حامد جو حامد گنج بخش کے نام سے
 مشہور ہیں۔ اپنے زمانے میں شیخ زمانہ سمجھے جاتے تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے
 شیخ موسیٰ پاک شہید تھے جو ملتان میں پاک دروازہ کے اندر دفن ہیں۔ شیخ عبدالحق
 محدث دہلوی نے پہلے انہی سے قادریہ سلسلے میں بیعت کی تھی۔ شیخ موسیٰ بیشتر
 شاہی لشکر میں رہے۔ اُچھ میں ارشاد و ہدایت زیادہ تر ان کے بھائی کرتے۔ بدایونی
 لکھتا ہے کہ اگر شیخ موسیٰ بادشاہ (اکبر) کے حضور میں ہوتے اور نماز کا وقت
 آن پہنچتا تو عین دیوان خانے میں خود اذان دے کر باجماعت نماز شروع کر دیتے
 اور کوئی انہیں روک نہ سکتا۔ شیخ موسیٰ کا اپنے بھائی شیخ عبدالقادر سے سجادہ نشینی
 کے سلسلے میں تنازعہ ہوا تھا اور شیخ عبدالقادر اس سلسلے میں فتح پور آئے تھے لیکن
 ایک بات پر ان کی اکبر سے جھگڑا ہو گئی اور انہوں نے وراثت اور مدد معاش کا
 قضیہ ترک کر کے اُچھ میں واپس جا کر متوکلانہ زندگی شروع کر دی اور قبول عام
 حاصل کیا۔

شیخ داؤد کرمانی شیر گڑھی | شیخ حامد کے ان فرزند ان گرامی کے علاوہ ان کے
 خلیفہ شیخ داؤد کرمانی جو ضلع ٹٹمری (ساہیوال)

کے قصبہ شیر گڑھ میں آرام فرما ہیں۔ ایک بڑے بالکمال بزرگ ہوئے ہیں۔ ملا عبدالغلام
 بدایونی آپ کا ذکر اس عقیدت اور احترام سے کرتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، لیکن
 دوسرے ہم عصر مورخین کے بیان سے بھی اس رائے کی تائید ہوتی ہے شیخ عبدالحق
 محدث لکھتے ہیں۔ ”صاحب حال صحیح و کشف صریح۔ در میں سلوک ریاضیات شاد
 و مجاہدات فوق الطاقہ کشیدہ“ اور شیخ قطب عالم کا جو اس زمانے کے مشہور چشتی
 بزرگ تھے (ملاحظہ ہو ذکر حضرت خواجہ باقی باللہ) کا بیان نقل کرتے ہیں کہ جب
 میں شیخ داؤد کی خدمت میں پہنچا تو ان کے وعظ و نصیحت کے طریقے دیکھ کر

میرے دل میں خیال گزرا کہ کہیں شیخ ہمدوی نہ ہوں، لیکن جو نہی میرے دل میں یہ خیال گزرا۔ شیخ نے بغیر میری طرف سے کسی اظہار کے یا کسی اور تقریب گفتگو کے فرمایا کہ ہمدویہ فرقہ گمراہ ہے اور ان کے پاس اپنے طریقے کی کوئی صحیح سند نہیں۔ شیخ داؤد کے بزرگ عرب سے ہندوستان تشریف لائے تھے اور ملتان کے قریب ایک قصبے میں اقامت پذیر ہوئے۔ آپ کے والد آپ کی پیدائش سے پہلے اور والدہ پیدائش سے تھوڑی دیر بعد انتقال کر گئیں اور آپ دُرِ یتیم ہو کر رہ گئے۔ آپ نے علوم ظاہری، مشہور شاعر اور عالم مولانا جامی کے شاگرد مولانا الطویل اچھ سے شہر لاہور میں حاصل کیے، لیکن جلد ہی جذبہ الہی غالب آگیا اور آپ کی توجہ تمام تر ذاتِ واحد کی طرف منقطعت ہو گئی۔ روحانیت آپ نے حضرت غوث اعظمؒ سے اویسی طریقے سے حاصل کی، لیکن بہت نگاہداشت سلسلہ "شیخ حامد قادری کے مرید ہوئے۔ آپ نے بڑی ریاضتیں کیں۔ برہنہ سر و برہنہ پا آپ علاقہ دیپال پور کے صحرا میں پھرا کرتے تھے۔ اور جنگل کے جانوروں اور پرندوں کے سوا آپ کا کوئی رفیق نہ ہوتا۔ بالآخر آپ نے شیر گڑھ میں اقامت اختیار کی اور جلد ہی آپ کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ اس وقت سلیم شاہ سُوری کی بادشاہت تھی اور ملا مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری رقبہ بدعت کا دُندہ ہاتھ میں لیے مصروفِ کار تھے۔ چنانچہ گوالیار سے فرمان جاری ہوا کہ شیخ داؤد دربار میں حاضر ہوں۔ آپ دو ایک رفیقوں کے ساتھ اس دور دراز سفر پر روانہ ہوئے۔ گوالیار کے باہر مخدوم الملک ملاقات ہوئی، لیکن شیخ کے تقدس نے مخدوم الملک پر بھی اثر کیا اور ان کی ملاقات بڑی خوشگوار رہی۔ ابتدائی گفت و شنید کے بعد آپ نے مخدوم سے پوچھا کہ فقر کی طلبی کس لیے ہوتی ہے؟ مخدوم نے کہا کہ سنا ہے کہ آپ کے مرید ذکر کرتے وقت "یا داؤد" "یا داؤد" کہتے ہیں۔ آپ نے کہا نہیں ممکن ہے سننے والے کو غلطی ہوئی ہو۔ "یا دُود" "یا دُود" کہتے ہوں گے۔ قطع نظر اس جواب کے مخدوم آپ کے ورع و تقویٰ کا قائل ہو گیا تھا۔ آپ نے اُسے چند نصیحتیں کیں اور شیر گڑھ کی راہ لی۔

لے منتخب التواریخ (بدایونی)

آپ کا معمول تھا کہ سال میں ایک بار دو دفعہ جو کچھ آپ کے پاس نذر و فتوحات کی قسم سے آتا۔ تقسیم کر دیتے اور اپنے گھر میں ایک مٹی کے کوزے کے سوا کچھ نہ رکھتے۔ جب حضرت غوث اعظم کا عرس میلاد آپ کی خانقاہ میں ہوتا تو بقول بدایونی ایک لاکھ کے قریب انسان جمع ہوتے اور ان سب کو لنگر میں کھانا ملتا۔ آپ اپنی مجلس میں اکثر اس طرح حیران و پریشان بیٹھے رہتے تھے جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے یا کسی آنے والے کے منتظر ہیں کہ اتنے میں یکایک کوئی حالت طاری ہوتی اور آپ حقائق و معارف کا بیان شروع کر دیتے۔ کبھی کبھی کہتے کہ عراق کی طرف سے جو ہوا آتی ہے، اس کے ساتھ میرے دل پر فیض الہی کے جھونکے آتے ہیں۔

آپ بڑے پابندِ شریعت تھے اور کوئی امر خلاف حدیث شریف آپ سے صادر نہ ہوتا۔ مشہور مورخ ملا عبد القادر بدایونی نے شیر گڑھ جاکر آپ کی زیارت کی۔ وہاں تین چار دن رہا اور شیخ کی روحانیت اور تقدس سے بڑا متاثر ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ شیخ کے جمال۔ کوئی ایسی چیز نظر آتی تھی جس سے دنیا کے سب صاحب جمال محروم ہیں اور تبسم اور تکلم کے وقت ان کے چہرے پر ایک ایسا نور چمک اٹھتا۔ جس سے دلوں کی تاریکیاں دور ہو جاتیں اور ”وجہ اللہ“ کا بھید عیاں ہو جاتا تھا۔ ملاقات کے دوران میں شیخ نے بدایونی پر بڑی مہربانی کی۔ کسی نصائح بیش قیمت کہیں اس کے مطلوبہ سوالات کا جواب دیا اور اپنی کلام بھی عنایت کی۔

بدایونی کی حضرت سے جو گفت و شنید ہوئی اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت امام مہدی کے ظہور کا عام طور پر انتظار ہو رہا تھا۔ بدایونی لکھتا ہے:-
”دورے در وقت وداع بوسیلہ میاں عبدالوہاب... عزم کردم کہ خبر در مشائخ ہند چہن است کہ وقت خروج سید سے نزدیک است و اکثرے از آن جماعت اتفاق بریکے از سادات آن دیار کہ قبل ازین بہ چند گاہ آبا و اجداد اور بر سر سلطنت دہلی و بدایونی ممکن ہوئے نہ ہوئے در تہیہ اسباب جہاد و استعداد و اسلحہ اندو میگویند یا مورخیم بدین امر از جناب حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ و بعض از امراء ہمدانی را نیز بخود متفق رہاتے

بعضی در مقامات واقعات بشارتہایافتہ سے خواہند۔ آں داعیہ را از قوت بفعول آورند۔
 بعض لوگ کہتے ہیں کہ اولیا و مشائخ کے تذکروں میں خارق عادت واقعات کچھ سوا
 کچھ نہیں ہوتا۔ مشنریوں کی طرح اشاعت مذہب کی منظم اور باقاعدہ کوششیں کہیں نظر
 نہیں آتیں۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ فقط خارق عادت واقعات سے جن کی صحت مشتبہ
 ہے یہ بزرگ اشاعت اسلام میں کامیاب ہوئے ہوں، لیکن نکتہ چین مشرقی مذاہب
 کی تاریخ کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ہندو لوگوں اور ریشیوں کے تذکروں میں بھی خارق
 عادت واقعات کے سوا کچھ نہیں اور ایشیا میں مذہب پھیلانے کے لیے دوسرے
 مذاہب کی مذمت کے بجائے طریق کار یہی رہا ہے کہ داعیان مذہب اپنے روحانی
 کمالات اور اپنی خوبیوں کو نمایاں کریں اور عوام الناس عموماً خارق عادت واقعات یا
 مقدس روحانی زندگیوں سے ہی زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ شیخ داؤد کے عالم صوفیانہ
 تذکروں اور ملفوظات میں اشاعت اسلام کا کوئی ذکر نہیں، لیکن بدایونی جو تین چار
 دن ان کی خدمت میں رہا لکھتا ہے کہ شاید ہی کوئی دن ہوگا، جب سو سو پچاس
 پچاس ہندو مع اپنے اہل و عیال کے حاضر خدمت ہو کر مسلمان نہ ہوتے ہوں!
 ”و کم روزے بود کہ صد صد و پنجاہ پنجاہ ہندو کم و بیش با خیل و تبار خویش آمدہ در
 ملازمت آنحضرت بشرف اسلام نئے پیوستند و تلقین نئے گرفتند (منتخب التواریخ جلد سوم)“
 ایک دفعہ اکبر بادشاہ نے جب وہ پنجاب میں تھا، شہباز خاں کو بھیج کر چاہا کہ شیخ
 اس کے پاس آئیں، لیکن انھوں نے عذر کیا اور کہلا بھیجا کہ میں یہاں بیٹھا غائبانہ
 دعا دیتا ہوں۔ مجھ سے یہی کچھ ہو سکتا ہے۔

آپ کی وفات ۱۰۵۷ھ میں ہوئی۔ آپ کے جانشین شیخ ابوالمعالی قادریؒ
 جن کا مزار لاہور میں ہے، صاحب التصانیف اور بڑے اہل دل بزرگ گزرے ہیں۔
 آپ نے قادریہ سلسلے کا فیض لاہور اور وسطی پنجاب میں عام کیا اور ۱۰۵۷ھ میں
 وفات پائی۔ شیخ عبدالحق محدثؒ آپ کے عقیدتمندوں میں سے تھے۔ ہم ان
 دو بزرگوں کے تعلقات کی تفصیل آئندہ صفحات میں دیں گے۔

چشتیہ سلسلہ

شیخ عبد العزیز چشتی دہلوی | حضرت چراغ دہلی کے بعد نظامی سلسلہ دہلی سے منتشر ہو گیا اور جو پورہ کاپی گلبرگہ۔ ٹن اور نڈوہ

ان بزرگوں کے قدوم سے فیض یاب ہوئے، لیکن اکبر کی تخت نشینی سے کچھ عرصہ پہلے دہلی میں اس خانوادہ کے ایک ایسے بزرگ نے ظہور کیا جنہوں نے پھر سے اولیائے کبار کی نیک نفسی اور پاک سیرتی کی یاد تازہ کر دی۔ یہ بزرگ شیخ عبد العزیز دہلوی ہیں جنہیں عوام میں شہرت حاصل نہیں ہوئی، لیکن جن کا ذکر خواص کی رُوح کو تازگی بخشتا ہے۔ ان کے والد شیخ حسن طاہر جو پورہ کے مشائخ کبار میں سے تھے۔ سکندر لودھی کی استدعا پر دہلی تشریف لائے۔

شیخ عبد العزیز اپنے والد کے خلیفہ، میاں قاضی ظفر آبادی کے مرید تھے۔ علوم ظاہری کی تکمیل سید راہو قتال کے خلیفہ حاجی عبدالوہاب بخاری اور ان کے صاحبزادہ میر سید محمد سے کی اور ارشاد و ہدایت میں عمر صرف کر دی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخبار میں لکھتے ہیں کہ شیخ اپنے زمانے میں مشائخ چشت کی یادگار تھے اور اخلاق حسنہ مثلاً تواضع، حلم، صبر و رضا۔ خلق خدا پر شفقت اور عنایت فقر میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ عبد العزیز محتاجوں کی حاجت روائی میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ جب وہ شیخ قاضی خاں کے پاس پہنچے تو اپنا مال و متاع، گھوڑا، گاڑی جو کچھ اپنے پاس تھا، سارے کا سارا راہ خدا میں تقسیم کر دیا۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مثلاً شیخ امان پانی پتی کے رسالہ غیریہ کے جواب میں آپ نے رسالہ عینہ تحریر کیا اور آداب السلوک بھی علم سلوک کے متعلق تصنیف کی۔ آپ کے والد شیخ حسن طاہر بھی مصنف تھے اور تذکروں میں ان کی کتاب مفتاح الفیض کا ذکر آتا ہے۔

اکبر کے ابتدائی زمانے میں شیخ عبد العزیز چشتی کو بڑا قبول عام حاصل ہوا۔ یرم خاں

ان کا معتقد تھا اور دوسرے امراء اکبری بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذ فیض کرتے۔ وفات ۱۵۶۷ء میں ہوئی۔ عوام میں آپ بحر المواج اور شکر باب کے عرف مشہور تھے۔ آپ کے فرزند ارجمند شیخ قطب عالم تھے۔ جن کی نسبت اخبار الاخبار میں لکھا ہے "عالم و فاضل و صاحب اخلاق حمیدہ و صفات پسندیدہ۔ قدم صفا و استقامت بر بجلوہ پدر نہادہ اوقات بطاعت و عبادت محمود دارد۔" ان خوبیوں کے علاوہ شیخ قطب عالم دو اور اسباب کی بنا پر یاد کے مستحق ہیں۔ ایک تو ان کی پوتی حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی دادی تھیں اور انھیں ایک ایسے خاندان سے تعلق تھا جس کے احسان گہلا می ہندستان کبھی عمدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے ایک زمانے میں ان کی خانقاہ میں رہ کر ان سے فیض حاصل کیا تھا۔ تفصیل اس کی ہم انشاء اللہ حضرت خواجہ کے احوال میں پیش کریں گے۔

شیخ سلیم چشتی | ایک اور چشتی بزرگ جنھوں نے اس زمانے میں بڑی شہرت حاصل کی۔ شیخ سلیم چشتی تھے۔ جن کے نام پر اکبر کے بیٹے جہانگیر کا نام سلیم ہوا اور جن کی کشتی سے اکبر نے ایک عرصہ تک فتح پور سیکری کو اپنا دار الخلافہ بنائے رکھا۔ آپ دہلی میں پیدا ہوئے، لیکن آپ کی ولادت کے بعد آپ کے والدین فتح پور سکونت پذیر ہو گئے۔ علوم ظاہری کی تکمیل آپ نے سرہند میں شیخ مجد الدین ملک العلماء سرہندیؒ سے کی۔ کئی جج کیے اور بلاد اسلامی کی سیروسیاحت کی۔ اس سیروسیاحت کے دوران میں شیخ ابراہیم چشتی سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ عرب میں کئی لوگ آپ کے مرید ہوئے۔ وہاں آپ کو شیخ الہند اور ہندوستان میں شیخ الاسلام کہتے تھے۔ ہندوستان واپس آکر فتح پور سیکری کی پہاڑی پر آپ نے بڑی ریاضتیں کیں۔ بالعموم روزہ سے رہتے اور ٹھنڈی اور مضعف چیزوں سے روزہ افطار کرتے۔ ہر روز ٹھنڈے پانی سے غسل کرتے اور کڑکتے جاڑوں میں ایک پیراہن کے سوا کچھ نہ پہنتے۔ آخر میں آپ نے نشادی کی اور بادشاہ اور امراء کے اعتقاد کی وجہ سے آپ کی ظاہری حالت بہت بڑھ گئی۔ عمارتیں اور باغات اور چاہ تعمیر کروائے

بلکہ شیخ عبدالحق تو لکھتے ہیں کہ آپ کی مجلس امرار و اغنیا کی محفلوں کے مشابہ تھی۔
 ”بعضی عادات مخالف شریعت کہ متعارف عوام باشند نیز و داد“ ہمیں کے ہاتھ سے
 آپ کو بہت پریشانیاں اٹھانی پڑیں اور اسی وجہ سے حرمین سے واپسی کے بعد آپ
 ۱۵۵۸ء میں پھر عرب واپس چلے گئے تھے، لیکن ۱۵۶۸ء میں واپس آئے اور اکبر نے
 سب کی تلافی کر دی۔ آپ کا روضہ بالخصوص اس کا بلند و دروازہ ہندوستان کی بہترین
 عمارتوں میں سے ہے۔ آپ کی وفات ۱۵۶۸ء میں ہوئی۔

صابرہ سلسلہ

شیخ سلیم نے چشتیہ سلسلے میں بیعت شیخ ابراہیم چشتی سے کی تھی جو بیرون ہند
 کے بزرگ تھے اور شیخ حسن طاہر کا سلسلہ بیعت راجی حامد شاہ اور شیخ حمام الدین
 مانپوری کی وساطت سے بنگالہ کے مشہور نظامی بزرگ شیخ نور قطب عالم پنڈوی سے ملتا
 ہے، لیکن اس زمانے میں شمالی ہندوستان میں چشتیہ خاندانہ کی ایک اور شاخ صابرہ
 نے فروغ حاصل کیا۔ ہم مخدوم احمد علاء الدین صابرہ کا حضرت بابا فرید کے خلقا کے
 ضمن میں ذکر کر چکے ہیں۔ ان کے اپنے حالات مستند محاصرہ تذکروں میں نہ ہونے
 کے برابر ہیں لیکن مرآۃ الاسرار میں جو ۱۶۲۰ء کی تالیف ہے تفصیلی حالات و روایات
 درج ہیں۔ ان کے پڑجوش معتقد اور بڑے بے شمار ہیں۔ صابرہ سلسلے میں فوق و شوق
 اور گر مجبوعی کی فراوانی ہے۔ نظامی سلسلے کی شہرت نہیں۔ جب نظامیہ سلسلہ
 حکومت دہلی کے ضعف کے دوران میں اطراف ملک میں منتشر ہو گیا اور اس سلسلے
 کے بزرگوں نے شمالی ہندوستان کو چھوڑ کر گلبرگہ۔ جونپور۔ پنڈوہ۔ پٹن۔ کاپری وغیرہ
 میں ارشاد و ہدایت کے فرائض سنبھالے تو شمالی ہند میں صابرہ سلسلے کو فروغ
 ہوا۔ اور فیروز تغلق سے ہمایوں کے عہد حکومت تک جو پُر شور زمانہ گزر رہا ہے۔
 اس میں کئی صابری مشائخ کبار کی آتش نفسی نے مجالس ذکر و ارشاد کو حرارت دینی
 و روحانی عطا کی۔

مخدوم علامہ الدین علی احمد صابر کلیریؒ کے ایک ہی خلیفہ شمس الدین ترک (وفات ۱۳۱۸ھ) کا نام ملتا ہے۔ ان کے خلیفہ اعظم شیخ جلال الدین کبیر الاولیا پانی پتی تھے۔ جن سے اس سلسلے کو صحیح طور پر وسعت اور رواج نصیب ہوا۔ ان کی وفات ۱۳۶۴ھ میں ہوئی۔ آپ کے خلفاء میں سرفہرست شیخ احمد عبدالحق توشہ رودلویؒ تھے۔ جنھوں نے رودلی (ضلع بارہ بکی) میں ایک صابریہ خانقاہ قائم کی۔ وہ حضرت نور قطب عالم پنڈوی کے ہم عصر تھے۔ سیر و سیاحت کے دوران میں آپ نے بمقام پنڈوہ حضرت قطب عالم سے ملاقات کی، لیکن صحبت سازگار نہ آئی۔ روایت ہے کہ جب آپ حضرت کی خدمت میں تشریف لے گئے تو آپ کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ چنانچہ آپ نے ایک برگ گیاہ حضرت کی خدمت میں پیش کیا اور کہا ”بابا صفا است“ حضرت نے جواب میں فرمایا، ”بابا عزت است“ اس کے بعد تھوڑی دیر بیٹھ کر سلسلہ رسوخ کسود بارہ جنبش دیے بغیر آپ واپس تشریف لے گئے۔ آپ کے حالات و ارشادات شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ نے انوار الیمون کے نام سے مرتب کیے ہیں۔

شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ | شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ خود بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ انھوں نے کئی سلسلوں سے فیض حاصل کیا۔

لودھیوں کے عہد میں انھیں مرکزی حیثیت حاصل رہی اور صدراللوگ آپسے فیضیاب ہوئے۔ آپ کے خلفائے سے حضرت مجدد الف ثانی کے والد شیخ عبد الاحدؒ شیخ جلال الدین تھانیسری اور شیخ عبد الغفور اعظم پوری خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ تو زک جہانگیری کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ جہانگیر نے خسرو کی حمایت کی بنا پر گورداسپور اور ایک مسلمان پیر سے مواخذہ کیا تھا۔ یہ مسلمان پیر شیخ نظام الدین بن عبد الشکور بلخیؒ شیخ جلال الدین تھانیسریؒ کے خلیفہ تھے۔ انھیں ہندوستان سے جلا وطن کیا گیا۔

شیخ جلال الدین تھانیسریؒ خود بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ انھوں نے ۹۸۹ھ یعنی ۱۵۸۱ء میں وفات پائی۔ آپ علوم ظاہری اور باطنی میں کامل اور عہد اکبری کے علمائے کبار میں سے سمجھے جاتے تھے۔ اقبال نامہ جہانگیری کا بیان ہے کہ جب اکبر بادشاہ نے

اپنے بھائی محمد حکیم میرزا کے خلاف لشکر کشی کی تو راستے میں تھانیسر کے مقام پر شیخ جلال الدین کی زیارت کی۔ ملاقات کے دوران میں شیخ نے مسئلہ توحید کی وضاحت میں یہ رباعی پڑھی:

آفتابے درہزاراں آگینہ تاختہ پس برنگے ہریکے تابِ عنان انداختہ
جملہ یک نور است آثار گہائے مختلف اختلافے در میانِ این و آن انداختہ

آپ کی ایک دلچسپ تالیف تحقیق اراضی الہند ہے۔ جس میں آپ نے اس خیال کی تردید کی ہے کہ اگر بادشاہ وقت کسی مسلمان کو ہندوستان میں کوئی زمین دیدے تو وہ شرعاً اس کا حق نہیں ہوتی۔ آپ نے ثابت کیا ہے کہ وہ زمین بیت المال کی ہے اور امام وقت جسے چاہے دے سکتا ہے۔

شیخ عبدالنبی جو عہد اکبری میں صدر الصدور تھے اور جن کا نام اس زمانے کی مذہبی تاریخ میں کثرت سے آتا ہے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے تھے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے حالات اُن کے فرزند و سجادہ نشین شیخ زین الدین نے لطائف قدوسی کے

ردولی ناگور اور اجمیر

نام سے ترتیب دیے ہیں۔ یہ کتاب بیشتر حالات زندگی، ارشادات اور کرامات کا بیان ہے۔ لیکن کئی باتیں ایسی ہیں، جن سے اس زمانے کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ شروع شروع میں شیخ موصوف قصبر ردولی میں رہتے تھے، لیکن جب سلطنت کی بد نظمی کے باعث یہاں پھر ہنود کا غلبہ ہو گیا تو شیخ نے ردولی سے ہجرت کی۔ ”در طرف ہندوستان غلبہ کافراں بود۔ در پر گنہ ردولی عمل کافراں شد۔ شعار اسلام مندرس شدند۔ در بازار گوشتِ خوک فروختہ می شد۔ حضرت قطبی دگیر شدہ بیرون آمدند۔ ردولی سے آپ ۱۲۹۱ھ میں شاہ آباد اور وہاں سے طویل قیام کے بعد گنگوہ (ضلع سہارنپور) تشریف لے گئے اور یہیں آپ کا وصال ہوا۔

صنعتِ حکومت سے جو حالت اس وقت ردولی کی ہو گئی تھی وہی کیفیت کئی اور اسلامی شہروں کی تھی۔ مثلاً ناگور۔ سندھ اور گجرات کے درمیان راجپوتانے کی ایک قدیمی اسلامی بستی ہے جو قاضی حمید الدین صوفی ناگوری (متوفی ۱۲۸۷ھ) کے

وقت سے اہل علم کے لیے ممتاز رہی ہے۔ شیخ عبدالحق یہاں کے ایک بزرگ شیخ کبیر کی نسبت لکھتے ہیں: ”بجست تفرقہ کہ درد ناگور از دست کفار آن دیار واقع شدہ بجانب گجرات رفتہ ہماں جاساکن شدہ۔“ عجب نہیں کہ ابوالفضل اور فصیحی کا باب شیخ مبارک بھی اسی کشاکش میں ناگور سے گجرات گیا ہو۔

چندیری وغیرہ میں جو کچھ رائے حسین کے ہاتھوں ہوا، اس کا ذکر ہم باب کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ ہجیر کی حالت بھی چنداں بہتر نہ تھی۔ اخبار الاخیار میں درج ہے

”نقل است کہ چون دراجیر غل شد و قلعہ را راناسا آنگاہ کہ گیرے عظیم بود از دست مسلمانان گرفتہ

اکثر مسلمانان را شہید ساخت۔ شیخ احمد مجد پیش ازین حادثہ ہفت روزہ حکم اشارت خواجہ

بزرگ خواجہ محسن الحق والدین از شہر برآمد و مسلمانان خبر کرد کہ یک چندے بریں شہر نظر

جلال است۔ فرمان بندگی خواجہ برین است کہ مسلمانان از شہر برآئید۔ دوشنبہ صنتہ

اثنی و عشرين و تسعمائتہ باجماع از مسلمانان ازاجیر برآمد۔ دوشنبہ دیگر کا ذراں بربراجیر

آئندہ و آن دیار را زیر دزیر ساختند۔“

یہ شیخ احمد شیبانی وہی بزرگ ہیں جن کے مُرشد خواجہ حسین ناگوری نے حضرت خواجہ بزرگ کی قبر پر پہلی شاندار عمارت تعمیر کرائی۔ ماندو کا فرمان روا سلطان غیاث الدین ان کا

۱۔ رائے بہادر گوری شکر نے اپنی انگریزی کتاب ہسٹری آف اودے پور میں چٹوڑ کے مشہور ستون کی قسطنجا (Kirtti Stambha) کے کتبے کا کچھ حصہ نقل کیا ہے جو ناگور کے متعلق ہے:-

”راتا کتبہ نے سلطان گجرات سے ناگور ایک ترکیب سے فتح کر لیا۔ اس نے فیروز خاں کی بلند مسجد کو

جلا دیا اور قلعے کو ویران کر دیا۔ اس نے ہاتھیوں پر قبضہ کر لیا۔ اس نے مسلمان عورتوں کو قید کیا اور

بہت سے مسلمانوں کو سزا دی۔۔۔۔۔ اس نے شہر کے ساتھ اس کی تمام مسجدوں کو آگ لگا دی اور جس خاں

کے خزانوں پر قبضہ کر لیا۔ جس سے اس کے پاس بہت سا مال و زر جمع ہو گیا۔“

اگر چہ بڑے اس ستون کے سارے کتبے تاریخی کتب میں جگہ پا جائیں تو اس سے راجپوتانہ کی تاریخ

کے کئی تاریک گوشوں پر روشنی پڑے!! ۱۱۵۱ھ میں۔

عقیدت مند تھا اور چاہتا تھا کہ وہ کوئی نذر نیاز قبول کریں۔ وہ انکار کرتے رہے، لیکن پھر بادشاہ کی درخواست قبول کی اور جو کچھ ملا۔ اُسے خواجہ بزرگ (اور شیخ حمید الدین ناگوری) کے مقبروں کی تعمیر میں صرف کیا۔ شیخ عبدالحق لکھتے ہیں: ”در زمانے کہ اجمیر خراب بود و عوالیٰ او بیشہ و شیراں گشتہ۔ در آن زمان بر بالائے قبر شریف عمارت نہ بود۔ اول کسیکہ در آن روضہ بنیاد عمارت نہاد او بود۔“

مُغفلوں کی مخالفت | لطائف قدوسی کے کئی اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ شیخ عبد القدوس گنگوہی اور ان کے اکثر مرید مغفلوں سے

خوش نہ تھے۔ جب ۱۵۲۶ء میں بابر اور ابراہیم لودھی کا میدان پانی پت میں محرم ہوا تو شیخ ابراہیم لودھی کے لشکر میں موجود تھے۔ وہ خود تو کہتے تھے کہ ابراہیم کی فتح بڑی مشتبہ ہے، لیکن بادشاہ نے اصرار کیا کہ وہ شاہی لشکر کے ساتھ رہیں۔ چنانچہ جب بابر کو فتح ہوئی تو یہ بھی گرفتار ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کے ایک دو مرید تھے۔ اُن کے گلے میں مرشد کی سیاہ پگڑی ڈال کر باندھ لیا گیا اور شیخ کو حکم ہوا کہ با پیادہ چلیں۔ چنانچہ وہ پیادہ پانی پت سے دہلی تشریف لائے۔ لیکن بعد میں یہ پانی ٹل گئی۔

شیخ عبد القدوس گنگوہی کو لودھی افغانوں سے خاص تعلق خاطر تھا۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ لودھیوں بالخصوص سکندر لودھی نے پھر سے شعائر اسلام کو بلند کیا۔ اس لیے وہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ سکندر لودھی کے نام ان کا ایک خط ہے جس میں اسے غم خواری، خلق، بالخصوص علما اور ائمہ کی تیمارداری پر توجہ دلائی ہے۔ جب تخت دہلی پر مغل قابض ہوئے تو آپ نے بابر کو ایک خط میں تاکید کی کہ شرع محمدی کی ترویج کے لیے ضروری اقدامات عمل میں لائے۔

”باید و ہرگز کہ برائے شکر نعمت منعم سایہ عدل بر عالمیاں چنناں کشند کہ هیچ کس ظلم نہ کند و ہر خلق و ہر سپاہ بہ او امر و نواہی شرع مستقیم و مستقیم بودند۔ نماز، جماعت، بکرازدن و علم و علما را دوست دارند و در بازار ہر شہرے محتسبان بگردند۔ تا شہر و بازار را بحال شرع محمدی بیاورند و روشن و منور گردانند۔ چنانچہ در عہد سلف و خلفائے راشدین با جمیع شرائط شرعی بود۔“

اسی طرح کے خط انھوں نے اپنے زمانے کے بعض اہم امثال خواص خاں بہیت خاں شروانی۔ ابراہیم خاں شروانی و تردی بیگ وغیرہ کو لکھے اور انھیں اتباع شریعت کی تلقین کی۔ ان خطوط کو مجدد الف ثانی کے زیادہ مشہور اور زیادہ اہم مکتوبات کا پیش رو سمجھنا چاہیے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی وفات ۱۰۳۵ھ میں ہوئی، لیکن مغلوں اور افغانوں کی کشمکش اس کے بعد بھی جاری رہی اور اس میں شیخ کے بعد مریدوں نے حصہ لیا۔ لطائف قدوسی میں کئی ایسے واقعات درج ہیں جن سے اس زمانے کے خیالات اور رجحانات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً لطائف کے مرتب نے ایک واقعہ لکھا ہے:-

”در مقام نندربار رسیدیم۔ در شب در خواب حضرت قطب الاقطاب شیخ عبدالقدوس حاضر شدند فرمودند۔ اے دو پیشتر بیا و پیغام گزاری ما بپیران گجرات یکن۔ اے دو در گجرات برو کل پیران گجرات را اسلام ما برسائ و بگو کہ ہمایوں بادشاہ اسلام را تاراج میکند و میان کفر و اسلام فرق نمی کند۔ ہمہ را تاراج میکند۔ ما بعد اسلام و بعد دشما آمدہ ایم اگر ضلای شما باشد۔ بیا ئیم و ما دشما یکجا شدہ ہمایوں بادشاہ را از گجرات دور کنیم۔ تا اسلام را استند و قرارے باشد۔“

ہمایوں کی یہ مخالفت مغلوں کے خلاف افغانوں سے ہمدردی کے علاوہ اس وجہ سے بھی تھی کہ اس نے گجرات کے اس بادشاہ (بہادر شاہ) کے خلاف چڑھائی کی تھی جس نے چوڑ فتح کر کے اسلام کو راجپوتانہ میں سر بلند کیا تھا۔ چنانچہ جب شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان سے نکال دیا تو بعض مذہبی حلقوں میں خوشی کا اظہار کیا گیا اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مریدان میں شامل تھے۔ لیکن یہ خوشی دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ چند ہی سال بعد ہمایوں نے شاہ ایران کی مدد سے ہندوستان کو دوبارہ فتح کر لیا اور اس کے بیٹے اکبر نے مغلیہ حکومت کی بنیادیں اس ملک میں اس طرح مستحکم کیں کہ صدیوں تک انھیں جنبش نہ ہوئی۔

عہدِ اکبری

اسلامی حکومت کا استحکام | خاندانِ مغلیہ کی بنیاد بوقلموں اور شگفتہ مزاج
بابر نے رکھی، لیکن بابر کو اصل محبت ترکستان
اور افغانستان کے اونچے اونچے پہاڑوں سے تھی اور اُس نے ہندوستان کا رخ بالکل
اخیر عمر میں کیا۔

عیدِ ہونی ذوقِ ولے شام کو!

دہلی کی فتح کو ابھی چار سال نہ گزرے تھے کہ ۱۵۳۵ء میں بابر کو موت کا پیغام پہنچا
اور دس سال بعد اس کے بیٹے اور جانشین ہمایوں کو شیر شاہ نے ہندوستان سے مار بھجایا۔
ہمایوں نے پندرہ سال جلاوطنی میں گزارے۔ لیکن عمر کے بالکل آخری سال میں شاہ ایران کی
مدد سے اسے موقع ملا کہ شیر شاہ کے پوتے سکندر سور کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر چڑھ
مغل پرچم لہرائے۔

ہمایوں کو ہندوستان میں دوبارہ آئے ہوئے چند مہینے گزرے تھے اور خاندانِ سور
اور مغلوں میں کشمکش ابھی جاری تھی کہ بادشاہ ایک اتفاقی حادثے کا شکار ہو گیا اور دہلی
اور آگرہ پھر خاندانِ سور کے ہاتھ میں چلے گئے۔ مغلیہ حکومت کا استحکام بلکہ اس کے اصل
آغاز کا بارِ گراں اس کے سیزدہ سال بیٹے اکبر کے کندھوں پر آن پڑا۔

اکبر ۱۵۵۶ء میں تخت نشین ہوا اور اس کی تخت نشینی سے اسلامی ہندوستان کی سیاسی
تاریخ میں ایک بالکل نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اکبر سے پہلے ایک اسلامی حکمران خاندان
کا زمانہ حکومت سو سال سے زیادہ نہ تھا اور باقاعدہ اور مستحکم حکومت تو کسی خاندان کو
نصف صدی سے زیادہ نصیب نہ ہوئی۔ اکبر سے پہلے اسلامی ہندوستان میں سب سے
زیادہ جاہ و جلال سلطان علاء الدین خلجی کے حصے میں آیا تھا۔ لیکن خلجیوں کی حکومت

کتنے دن رہی؛ فقط تیس پینتیس سال۔ خاندان غلاماں کے تحت کئی ایسے مختلف غلام خاندان جمع کر دیے جاتے ہیں، جن کا آپس میں برائے نام تعلق تھا، لیکن اگر مختلف خاندانوں کو علحدہ کریں تو کسی کی حکومت پچاس سال سے زیادہ نہیں اور سب کی ملا کر سو سال نہ ہوگی۔ خاندان سادات اڑتیس سال برسرِ اقتدار یا برسرِ زوال رہا۔ لودھیوں کی حکومت پچھتر سال سے زیادہ نہیں۔ یہی حال تعلق خاندان کا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ دس پندرہ سال تو ایک خاندان کو پاؤں جمانے میں لگتے اور ابھی انھیں حالات کو سمجھنے اور کوئی اہول جاری کرنے ہی کا موقع نہ ملتا تھا کہ سارا سلسلہ درہم برہم ہو جاتا اور پھر روزِ اول یہی وجہ تھی کہ ابتدائی مسلمان خاندانوں کی حکومت نہایت سطحی تھی اور مرکزی نظم و نسق کے علاوہ باقی اختیار ہندو پنجائتوں اور زمینداروں کے ہاتھ میں تھا۔

اکبر کے زمانے میں اسلام کی کمزوری کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے دو صدیوں میں دہلی کی حکومت بجائے ترقی کے تنزل کر رہی تھی اور ہندو مذہب کا سیاسی اور روحانی احیا ہو رہا تھا۔ روحانی احیاء نے بھگتی تحریک کی صورت اختیار کی۔ جس کے بعض راہتہما مثلاً گورو نانک صلح کے حامی تھے۔ بعض (مثلاً تلخی داس) دوسرے مذہب کا بے تعلق تھے۔ بعض (مثلاً چیتنہ کے جانشین) مسلمانوں کے مخالف تھے۔ سیاسی احیاء کا سب سے اہم واقعہ جنوبی ہند میں وجے نگر کی خود مختار اور وسیع ہندو سلطنت کا قیام ہے۔ جس نے جنوب میں اسلام کی توسیع ختم کر دی اور جس کی خشتِ اول ۱۳۳۶ء میں رکھی گئی۔ شمالی ہند میں ہندو راجاؤں اور مذہبین (مثلاً رانا کنہد۔ رانا ساہگا۔ جہت کھوکھر۔ میدنی رائے۔ ہیموں) نے بڑا اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ جب بابر آیا تو شمالی ہندوستان کا سب سے بڑا اقتدار حاکم ابراہیم لودھی نہ تھا۔ رانا ساہگا تھا جس سے مالوہ۔ گجرات خاندانیش کے مسلمان بادشاہ جو دپدبے اور اقتدار میں شاہِ دہلی سے بڑھ کر تھے، ختم کھاتے تھے اور شکستیں کھا چکے تھے۔ اس نے خود بادشاہِ دہلی کے کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ابراہیم لودھی نے فوجیں بھیجیں، لیکن وہ شکست کھا کر واپس آئیں اور بادشاہ کو لٹو کے گھونٹ پی کر خاموش ہونا پڑا۔ پنجاب میں جہت کھوکھر نے بڑا اقتدار پایا تھا مالوہ میں میدنی رائے

نظاہر وزیر، لیکن فی الواقع حکمران تھا۔ پانی پت کی دوسری لڑائی میں اکبر کا مقابل عادل شاہ
سوری کا وزیر اور سپہ سالار ریواڑی کا ایک ہندو بنیا، تیموں تھا۔ اس طرح کے دوسرے
با اثر ہندوؤں کے نام اس زمانے کی تاریخ میں کثرت سے ملیں گے۔ ضعفِ سلطنت کی
وجہ سے راولی۔ ناگور۔ اجمیر۔ چندیری اور دوسری جگہوں میں مسلمانوں کی مسجدوں اور
دیگر مقدس مقامات کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ بابر اور شیر شاہ
نے ان حالات کی اصلاح کی اور دہلی کے مسلمان بادشاہ کا اقتدار وسیع کیا۔ لیکن
وہ ہوا کے بھونکے تھے جو آئے اور نکل گئے۔ اسلامی حکومت کا اصل استحکام
اکبر کو کرنا پڑا۔

فتوحات اکبری

استحکامِ حکومت کے ضمن میں سب سے پہلے اکبر نے یہ کیا کہ ملک میں جو
مذہب بے خود مختار ہو گئے تھے اور مدتِ مدید سے آزاد تھے،
انہیں پھر حکومتِ دہلی کے تابع کیا۔ اکبر ۱۵۵۶ء میں تخت نشین اور ۱۵۶۰ء میں ہرم خاں
کی معزولی کے بعد حاکمِ خود مختار ہوا۔ ۱۵۶۱ء میں مالوہ فتح ہوا۔ ۱۵۶۲ء میں گوندوانہ
مغلیہ سلطنت میں شامل ہوا۔ اس سے دو سال پہلے اکبر نے امیر (جے پور) کے راجا
بہاری مل سے مصالحت کر لی تھی۔ راجا نے اکبر کی اطاعت قبول کی اور اپنے خاندان
کی ایک کنورانی بادشاہ سے بیاہ دی۔ راجا بہاری مل کے بیٹے راجا بھگوان داس
اور پوتے مان سنگھ کو اعلیٰ منصب ملے۔ میواڑ کے راجا نے اس کی مخالفت کی۔
چنانچہ ۱۵۶۸ء میں چیتور اکبر کے ہاتھوں فتح ہوا۔ اگلے سال کالنجر اور رنتھنبور کے مشہور
قلعے مغلوں کے قبضے میں آئے۔ ۱۵۶۹ء میں جیسلمیر اور بیکانیر کے راجاؤں نے اطاعت
قبول کی۔ ۱۵۷۰ء میں گجرات فتح ہوا اور ۱۵۷۱ء میں تکرانی کی جنگ کے بعد بنگال
پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ اگرچہ جولائی ۱۵۷۱ء تک داؤد خاں حاکمِ بنگالہ لڑتا رہا۔ اور
اس کے بعد بھی بنگالہ میں امن و امان دیر تک قائم نہ ہوا۔

یہ فتوحات اکبری کا پہلا دور تھا۔ دوسرا دور اس زمانے سے متعلق ہے جب
۱۵۸۵ء سے ۱۵۹۸ء تک اکبر لاہور میں مقیم رہا۔ اس دوران میں کشمیر، جو کبھی بھی حکومتِ دہلی

کے تابع نہ تھا، فتح ہوا۔ (۱۵۸۶ء)۔ ۱۵۹۱ء میں سندھ اور ۱۵۹۲ء میں اڑیسہ مقبوضات اکبری میں شامل ہوئے ۱۵۹۵ء میں بلوچستان فتح ہوا اور قندھار اکبر کے قبضے میں آیا۔ اب اکبر کو دکن کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ملی۔ ۶ نومبر ۱۵۹۸ء کو اس نے لاہور کو خیر باد کہا اور چند مہینے آگرے میں قیام کے بعد اگلے سال دکن جا پہنچا۔ چنانچہ اسی سال احمد نگر کا قلعہ فتح ہوا اور ایک وسیع مملکت اکبر کے قبضے میں آئی۔ ۱۵۹۸ء میں خاندیش کا مضبوط قلعہ اسیر گڑھ سر ہوا اور احمد نگر اور خاندیش کے علاقے ایک وسیع مغل صوبے میں منتقل ہو گئے۔ اکبر مئی ۱۵۹۸ء میں آگرے واپس آیا اور چار سال بعد اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

مُخلیہ نظام حکومت | اکبر کی مسلسل فتوحات اسے تاریخ میں ایک خاص درجہ دے دیتی ہیں، لیکن ملک گیری آسان ملک انی مشکل۔ اکبر اس سے بھی اہم کام اس وسیع سلطنت کا کامیاب نظم و نسق اور ملکی حکومت کے لیے نظام مرتب کرنا تھا، جو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ تمام مغلیرور میں برقرار رہا۔ اور کئی امور میں برطانوی نظام حکومت کی بنیاد بنا۔ جس پر بھارت اور پاکستان اب بھی عمل پیرا ہیں۔ مُخلیہ نظام حکومت کا مہمار اکبر تھا۔ عالمگیر نے اس کے نظام سلطنت میں بعض تبدیلیاں کیں، لیکن اس کا درباری مورخ بھی عالمگیر نام میں اکبر کی نسبت لکھتا ہے: "حضرت عرش آشیانی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ طاب ثراہ کہ مجدد آئین جہان بنانی و مشید قوانین آئین اس سلطنت جاودانی اند (ص ۳۸۷)"

اکبر کی مسلسل فتوحات اور اس کے کامیاب نظم و نسق کا راز 'سب سے زیادہ' ان امرا و اراکین سلطنت کی قابلیت، فرض شناسی اور وفاداری میں پنہاں ہے جو اکبر نے اپنے گرد جمع کر لیے تھے۔ جیسا کہ عالمگیر نے اپنے بیٹے کو لکھا۔ "حضرت عرش آشیانی کہ نوکران خوب داشتند، از ہمیں جهت فتوحات متواترہ و مهمات متکاثرہ مے فرمودند" اکبر اس معاملے میں خوش قسمت تھا، لیکن "نوکران خوب" کے حاصل کرنے، انھیں "خوب" سے "خوب تر" بنانے، ان کی "ترہیت" اور ان کی

کی پُر امید نظریں وقت کی سب سے بڑی طاقت کو مفتوح اور اسلام کو فاتح کی حیثیت سے دیکھ رہی ہیں، نگاہ عزیمت کی یہ شان کہ کسریٰ کے کنگن ایک خانہ بدوش بدو کے ہاتھوں میں نظر آ رہے ہیں۔

یہ ہے وہ رجائیت جس کی بنیاد پر تحریکیں وجود میں آتی ہیں؛ آگے بڑھتی ہیں اور اپنی منزل کو پالیتی ہیں۔

ایک بار کلید بردار کعبہ عثمان بن طلحہ سے حضورؐ نے کعبہ کا دروازہ کھولنے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ غور کیجئے مکی دور میں حالات کتنے سخت اور ناسازگار تھے مگر آپؐ نے ان تاریک ترین حالات میں شمع امید کو ان الفاظ سے فروزاں کیا: ”ایک دن آنے والا ہے جب یہ کنجی ہمارے ہاتھ میں ہوگی اور ہم جسے چاہیں گے اس کے حوالے کر دیں گے۔“ (المواہب اللدنیہ)

آئیے غزوہ خندق کے واقعہ پر بھی غور کرتے چلیں۔ اسلام دشمن طاقتوں نے متحدہ محاذ بنا کر اسلام اور مسلمانوں کو ختم کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ تمام عرب قبائل اور یہودی طاقتوں نے مجتمع ہو کر مدینہ پر حملہ کی تیاری مکمل کر لی۔ ذرا غور کیجئے۔ مخالفین کا ٹڈی دل لشکر، خندق کی کھدائی کا مرحلہ، رفیقار کی قلت، بے سروسامانی کی انتہا، فاقہ کشی کا عالم، منافقین کے ہمت شکن عذرات، مدینہ میں یہودیوں کی سازشوں کے اندیشے، انسانی حوصلوں کو دبا دینے والی اس پیچیدہ صورت حال میں اللہ کا رسولؐ اپنے اصحاب کے ساتھ خندق کھودنے میں مہمک ہے مگر کچھ بھی بے بسی و ناامیدی کا دور دورہ تک کوئی نشان نہیں۔ رسولؐ خدا کی عزیمت و ہمت، نشاط و شگفتگی اور بلند ہمتی و بلند حوصلگی، صحابہ کرامؓ کے لیے مہمیز کا کام کر رہے ہیں۔ خندق کی کھدائی کے دوران کچھ سخت چٹانیں صحابہ کرامؓ سے نہیں ٹوٹ پائیں۔ رسولؐ خدا کدال سنبھال کر ضرب لگاتے ہیں۔ پہلی ضرب لگا کر فرمایا کہ میں میرے لیے فتح ہو گیا، دوسری ضرب لگا کر فرمایا شاہ اور المغرب میرے لیے مرنگوں ہو گئے۔ تیسری ضرب لگا کر فرمایا خطہ مشرق (ایران) فتح ہو گیا۔ (محسن انسانیت)

غور کیجئے۔ انتہائی ناسازگار حالات میں اللہ کے رسولؐ عظیم ملکوں اور شہروں کی فتح کی بشارت اپنے اصحابؓ کو سن رہے ہیں۔ جن ناگفتہ بہ حالات میں بظاہر اپنا دفاع بھی مشکل نظر آتا

ہے وہاں رسول خدا کی نظر دور رس، اور نگاہ رجائیت ایران و شام کو فتح ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ رجائیت کا یہی وہ پہلو تھا جو مکہ سے لے کر مدینہ تک اصحاب رسولؐ کو نیا حوصلہ اور نئی امنگ دیتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رجائیت کا یہ نعرہ کہ اسلام کے سامنے عرب و عجم مفتوح ہوں گے تحریک اسلامی کا سلوگن ہے!

تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں امید ورجا کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔ حالات کتنے بھی ناسازگار ہوں، مایوسی و بددلی کا شکار نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ بلند حوصلگی اور عزم و یقین کی قوت کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھنا چاہیے۔ جب تحریکیں رجا و امید کا دامن تھامے بلند حوصلگی سے منزل کی طرف بڑھتی ہیں تو منزل خود ان سے قریب ہونے لگتی ہے اور جب کوئی تحریک مایوسی کا شکار ہو جاتی ہے تو اس کی منزل اس قدر دور ہو جاتی ہے کہ اسے پالینا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اکبر کے ادبی ذوق کا محوڑا سا اندازہ بدایونی کے طرزِ تحریر کے متعلق اس کی رائے سے ہوتا ہے۔ بدایونی اکبر کا پیش امام تھا۔ اس نے اپنی منتخب التواریخ میں اکبر کی بدنامی کا جو سامان جمع کیا ہے۔ اس سے اہل علم واقف ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اکبر نے ایسے شخص کو اتنی مدت کیوں اپنے قریب رکھا؟ یہ صحیح ہے کہ بدایونی اپنی کتاب چھپ چھپا کر لکھتا تھا اور اس نے کسی فرد بشر پر اس کا راز ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ شروع میں آزاد خیال گروہ کا ترجمان تھا۔ اس لیے اکبر کو کچھ عرصہ اس وجہ سے بھی غلط فہمی رہی ہوگی۔ یہ بھی درست ہے کہ بدایونی کا مزاج اپنا تھا۔ وہ اہل شرع سے زیادہ ادیب اور فنکار تھا۔ بین خوب بجاتا تھا، جو متشرع حلقوں میں شاید ہی پسند ہو۔ طبیعت میں ایک طرح کی وارفتگی اور بے نیازی تھی۔ لیکن بدایونی خود لکھتا ہے کہ اکبر نے اس کی ”فقاہت و تعصب“ کا اندازہ لگا لیا تھا۔ (مرامتہم بہ فقاہت و تعصب داشتند) بلکہ بادشاہ نے ابوالفضل سے کہا: ”کہ مافلانے را کہ عبارت از فقیر باشد، جو آنے صوفی مشربے خیال می کردم۔ اما او چنان فقیہ متعصب ظاہر شد کہ بیچ شمشیرے رگ گردن تعصب اورا نتواند برید“ چنانچہ اس کے بعد طے ہوا کہ اسے اجمیر میں روضہ کا متولی بنا کر بھیج دیا جائے۔ بدایونی بہت خوش تھا۔ اس نے یاد دہانی بھی کرائی لیکن کچھ عرصے کے بعد بادشاہ نے ابوالفضل سے کہا: ”اگرچہ از فلاںے (بدایونی) خدمتِ اجمیر ہم خوب می آید۔ اما چوں چیز ہارا باو ترجمہ میفرمایم۔ بسیار خوب و خاطر خواہ مای نویسد۔ نئے خواہیم کہ از ما جدا باشد“ یعنی اکبر بدایونی کو اس کے تعصب اور فقیہ مشربی کے باوجود اس لیے اپنے سے جدا کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ وہ ترجمہ خوب اور خاطر خواہ کرتا تھا!!

اکبر نے صرف علوم و فنون کی سرپرستی نہیں کی بلکہ صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی بھی پوری کوشش کی۔ ایلن کشمیر اور دوسرے ممالک کے کاریگروں کو لاہور۔ آگرہ۔ احمد آباد میں جمع کیا تاکہ وہ سال بانی۔ قالین ساری۔ ملبوسات کے کارخانے قائم کریں۔ عہدہ داروں کو مجبور کیا کہ وہ یہاں کی بنی ہوئی چیزیں پہنیں۔ نتیجہ یہ

تھا کہ بہت سی صنعتیں رائج ہو گئیں جو اکبر کے بعد بھی جاری رہیں۔

طریق صلح کل | اکبر اپنے خاص دائرہ عمل یعنی ملک گیری اور ملک رانی میں بے نظیر تھا اور اسلامی حکومت کو جس طرح اُس نے مستحکم کیا، کسی اور

ہندوستانی بادشاہ سے نہیں ہوا، لیکن افسوس کہ اس نے اپنے صحیح دائرہ عمل کو چھوڑ کر مذہبی معاملات میں بھی دخل دیا اور خوشامدی درباریوں کی واہ واہ میں بعض ایسی بوالہوشیا کا مرتکب بھی ہوا کہ آج اس کے سیاسی احسانات بھی فراموش ہو گئے ہیں۔ اکبر کی مذہبی بوالہبسیوں کو کوئی واقف کار پسند نہیں کرے گا، لیکن چونکہ جن منزلوں سے گزر کر اور جن وجوہات کی بنا پر اکبر نے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کی ان کا مطالعہ بڑا عبرتناک اور سبق آموز ہے، اس لیے ہم انہیں کسی قدر تفصیل سے بیان کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے ایک امر کی وضاحت ضروری ہے۔ اکبر کی مذہبی پالیسی کے دو پہلو تھے ایک انتظامی اور سیاسی معاملات میں ”صلح کل“ کی پالیسی۔ اور دوسرے مریدان شاہی اور دوسروں کے لیے قواعد و آئین کا وہ ملغوبہ جسے بسا اوقات ”دین الہی“ کہا جاتا ہے، لیکن جسے بدایونی اور ابوالفضل دونوں ”آئین راہنموی“ یا ”ارادت“ یا ”مریدی“ کا نام دیتے ہیں۔ بسا اوقات ان چیزوں کو خلط ملط کر دیا جاتا ہے، لیکن فی الحقیقت ان کی حیثیت مختلف ہے اور ان کے آغاز میں کئی سال کا فرق تھا۔ ”صلح کل“ کی پالیسی جو فی الحقیقت ایک سیاسی اور انتظامی طریق کار ہے، اکبری حکومت کی بالکل ابتدا میں اختیار کر لی گئی۔ جہانگیر اپنے والد کی اس ”صلح کل“ پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

ارباب مل مختلفہ را در وسعت آباد دولت بے بدلیش جا، بخلاف سائر ولایات عالم

کہ شیعہ را بغیر از ایران و سنی را در (بغیر از) روم و ہندوستان و توران جانست۔

چنانچہ در دائرہ وسیع الفضائے رحمت ایزدی جمیع طوائف و ارباب مل راجاست

بمقتضائے آنکہ سایہ می باید کہ پر تو ذات باشند۔ در ممالک محروسہ اش کہ ہر حد

بہ کنار دریائے شور منتهی گشتہ۔ ارباب ملتہائے مختلف و عقیدت ہائے صحیح

و ناقص راجا بودہ راہ تعرض بستہ گشتہ۔ سنی یا شیعہ در یک مسجد و فرنگی یا یہودی

نظر انداز فرمادیتے۔

آنحضورؐ جب فتح مکہ کی تیاری کر رہے تھے تو آپؐ کی کوشش تھی کہ اس تیاری کی کوئی خبر باہر نہ جانے پائے۔ اس دوران حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ سے ایک لغزش ہوئی انھوں نے قریش مکہ کے نام ایک خط لکھ دیا جس میں فتح مکہ کی تیاری کی اطلاع دی گئی تھی۔ ظاہر ہے یہ لغزش خیانت کے مترادف تھی۔ اسی لیے جب یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

”اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں۔ یہ منافق ہو گیا ہے۔“

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ کبریٰ سے جو جواب ملا وہ یہ تھا: ”عمرؓ تمہیں کیا معلوم؟ اللہ بدر والوں کے حالات سے آگاہ ہے۔“

”میں نے تم لوگوں کو معاف کر دیا۔“ (بخاری، بحوالہ اسلامی بیداری ص ۲۳)

دیکھیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حاطبؓ کی کتنی بڑی غلطی کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ آنحضورؐ کے سامنے حضرت حاطبؓ کے سابقہ کارنامے ہیں۔ انھیں بدر میں شرکت کی فضیلت حاصل ہے، ہجرت کرنے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا شرف حاصل ہے۔ ان تمام کارناموں کے مقابلہ میں جب حضرت حاطبؓ سخت قسم کی غلطی کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسے وقتی جذبات سے مغلوبیت سمجھ کر یا حضرت حاطبؓ کی اجتہادی غلطی سمجھ کر اور حسن ظن سے کام لے کر ان کو معاف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت حاطبؓ نے اپنی صفائی میں یہی بات کہی کہ اے اللہ کے رسول! فتح تو آپؐ کو ملنا ہی ہے خواہ قریش مکہ کو اطلاع ہو یا نہ ہو۔ میں نے یہ سوچا کہ مکہ میں میرے گھر والے گھرے ہوئے ہیں۔ اگر میں قریش مکہ کو اطلاع فراہم کر دوں گا تو ہو سکتا ہے وہ میرے احسان کے بدلے میں میرے گھر والوں کی حفاظت کریں۔

ایک اور مثال سنئے۔ ایک صحابی شراب پینے کے روگ میں مبتلا ہو گئے۔ ایک سے زائد بار شراب پینے کی حالت میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا۔ ہر بار ان پر

مار پڑتی، سزا دی جاتی، لیکن ہر بار شیطان شراب کی لت بن کر ان پر غالب آجاتا اور وہ پھر شراب پی لیتے۔ پھر آنحضورؐ کے پاس ان کو لایا جاتا انھیں سزا دی جاتی مگر وہ پھر شراب پی لیتے۔ ایسا کئی بار ہوا۔ ایک بار جب انھیں شراب پینے کی حالت میں پکڑ کر لایا گیا تو کسی صحابیؓ نے کہا: ”کیا بات ہے۔ اللہ کی اس پر لعنت ہو! بار بار اسے لایا جاتا ہے۔“

جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجتے ہوئے سنا تو لعنت کرنے والے سے کہا: ”اس پر لعنت نہ بھیجو، یہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ”اپنے دینی بھائی کے مقابلے میں شیطان کی مدد نہ کرو۔“

(الصحة الاسلامیہ)

رسول خدا کی وسیع قلبی کو دیکھیے کہ کس طرح آپؐ نے اس انسان کو اپنی شفقتوں کے سائے میں لے لیا۔ شراب نوشی کے گناہ میں لت پت ہونے کے باوجود اس کے بارے میں حسن ظن کا اظہار کیا۔ اس موقع پر بھی اس کے اچھے پہلو کا تذکرہ کیا اور یہ واضح کیا کہ اگر شراب نوشی بدترین قسم کا گناہ ہے مگر اسلامی اخوت کا رشتہ اب بھی باقی ہے اس لیے لعنت کرنے سے روکا کیونکہ اس سے ایمانی بھائیوں کے درمیان خلیج حائل ہو جاتی ہے۔ اہل ایمان اس سے دور ہو جاتے ہیں اور وہ اہل ایمان سے دور ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ شیطان سے قریب ہو جاتا ہے اس لیے آپؐ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کے مقابلے میں شیطان کے مددگار نہ بنو۔“

یہاں کھڑکھران لوگوں کو غور کرنا چاہیے جو خوردبین لیے دوسروں کے عیوب تلاش کرتے رہتے ہیں اور انھیں اپنے حساب سے ساقط کرتے رہتے ہیں۔ انھیں یہ واقعہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ وہ رسول خدا کے بلند طریق تربیت اور دور رس نگاہ سے موعظت حاصل کریں۔

اس کے مشیر اور رکن سلطنت تھے۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی کا بھی وہ دل و جان سے معتقد تھا۔ کبھی کبھی حدیث سننے ان کے گھر جاتا۔ ایک دفعہ جوڑتے ان کے سامنے اٹھا کر رکھے۔ شہزادہ سلیم کو ان کی شاگردی میں داخل کیا تاکہ جامی کی چل حدیث ان سے پڑھے۔ صدر الصدور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے تھے اور تقوئے و پرہیزگاری میں فرو تھے۔ ان کی تلقین و تعلیم اور فیض صحبت سے یہ حال ہوا کہ نماز باجماعت کی پابندی تو ایک طرف اکبر خود اذان دیتا۔ امامت کرتا اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا۔

اکبر کا جو اپنا رنگ طبیعت تھا، وہ خانگی اثرات سے اور گہرا ہو گیا۔ ایک دفعہ اس کا عالم شباب تھا۔ جشن سالگرہ کی تقریب پر لباس زعفرانی پہن کر مجلس لکے سے باہر آیا۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی نے (جھنپیں بعد میں شہادت نصیب ہوئی) سر دیوار ٹوکا اور اس شدت کے ساتھ کہ عصا کا سرا بادشاہ کو جا لگا۔ اکبر چپ ہو رہا۔ لیکن اندر جا کر ماں سے شکایت کی۔ ماں نے کہا کہ بیٹیا یہ رنج کا مقام نہیں باعث نجات ہے۔ کتابوں میں لکھا جائے گا کہ ایک بوڑھے عالم نے اتنے بڑے بادشاہ کو عصا مارا اور وہ فقط شرع کے ادب سے صبر کر کے برداشت کر گیا۔

ایک دفعہ سلطان الہند خواجہ اجمیری سے عقیدت پیدا ہو گئی اور پھر تو یہ حال ہوا کہ سال بسال اجمیر جاتا تھا۔ کوئی عہم یا خاص مراد ہو تو اس کے علاوہ بھی۔ ایک منزل سے پیادہ پا جاتا تھا اور بعض منٹیں (مثلاً جہانگیر کے تولد سے پہلے) تو ایسی بھی ہوئیں کہ فتح پور یا آگرے سے اجمیر تک پیادہ گیا۔ وہاں ہزاروں لاکھوں روپے چڑھاوا چڑھاتا اور بہروں مراقبے میں بیٹھا رہتا۔ فوج کا نعرہ ”یا ہادی یا حسین“ تھا اور علامہ شیرانی کا خیال ہے کہ حضرت خواجہ بزرگ کو دسویں صدی ہجری سے جو خاص شہرت حاصل ہوئی ہے، اس میں اکبر کی ارادتمندی کو بہت دخل تھا۔

عبادت خانہ | اکبر سلیم چشتی کا بڑا معتقد تھا اور جب جہانگیر پیدا ہونے والا تھا تو حصول برکت کے لیے اس کی والدہ کو شیخ کے حجرے میں بھیج دیا اور انھی کی نسبت سے بیٹے کا نام سلیم رکھا۔ اس کے دو برس بعد اکبر نے فیصلہ کیا کہ جو جگہ اتنی روحانی برکتوں کا سرچشمہ ہے وہاں ایک عظیم الشان شہر تعمیر ہونا چاہیے۔ چنانچہ ۱۵۷۰ء میں فتح پور سیکری کی شاندار عمارتیں بنی شروع ہوئیں اور یہ معمول گاؤں شہنشاہ ہند کا پایہ تخت ہو گیا۔

یہاں اکبر ایک پرانے حجرے میں اکثر اپنا وقت مراقبوں، دعاؤں اور عبادتوں میں گزارتا۔ مذہبی امور میں بالآخر اُس کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ ۱۵۷۵ء میں اس نے شیخ سلیم چشتی کی نئی خانقاہ کے پاس ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی جس کا نام عبادت خانہ رکھا گیا۔ ہر جمعہ کی نماز کے بعد شیخ کی خانقاہ سے آکر یہاں باغیچے منعقد ہوتا تھا جس میں مشائخ وقت، علما و فضلا اور چند مقرب درگاہ شریک ہوتے تھے اور خدا شناسی اور حق پرستی کی حکایتیں اور روایتیں بیان ہوتی تھیں۔

اکبر نے عبادت خانے کی مجالس کا اہتمام خاص مذہبی ذوق سے کیا تھا لیکن بالآخر انھی نے اسے بد مذہبی کا رستہ دکھایا اور ان کا ایک باعث ان علما و فضلا کی کمزوریاں تھیں جو ان مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ پہلی ہی نشست میں جھگڑے شروع ہو گئے کہ فلاں آدمی صفت میں مجھ سے اوپر کیوں بیٹھے اور میں اس سے نیچے کیوں رہوں جب یہ قضیہ طے ہوا تو ہر شخص چاہتا تھا کہ اپنی فضیلت اور دوسرے کی ہالت دکھاوے۔ بات بات پر جھگڑا ہوتا تھا جس سے بادشاہ کا دل کھٹا ہو گیا اور اس نے کہا جو کوئی نامعقول باتیں کرے اسے محفل سے اٹھا دیا جائے۔ ملا بدایونی کو اس کام پر مامور کیا گیا۔ اس وقت آصف خاں پاس کھڑا تھا۔ ملا صاحب نے چپکے سے اس کے کان میں کہا کہ اگر یہی بات ہے تو بہتوں کو اٹھنا پڑے گا۔ بادشاہ نے سنا تو بہت خوش ہوئے اور دوسروں کو بدایونی کے الفاظ سنائے۔

لے آئے۔

ہجرت کا یہ مبارک سفر محض مجبوری و بے بسی کی وجہ سے نہیں کیا گیا تھا، محض مکہ والوں کے مظالم و مصائب سے تنگ آکر نہیں اختیار کیا گیا تھا بلکہ اس ہجرت کے پس منظر میں ایک عظیم مقصد پوشیدہ تھا اور وہ یہ تھا کہ تحریک اسلامی کامیابی کے آخری مرحلے تک پہنچانے اور اپنے اصحابؓ کو اقامتِ دین کے لیے مکمل طور پر تیار کرنے کے لیے ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں کی اجتماعی فضا اس کے لیے سازگار ہو اور یہ سعادتِ شرب کے حصے میں آئی جسے بعد میں مدینہٴ رسولؐ کے نام سے پکارا جانے لگا۔

تاریخِ اسلامی میں ہجرت کا یہ واقعہ تحریکِ اسلامی کے لیے ایک نیا رخ اور ایک نیا موڑ تھا۔ آنحضورؐ اپنے اصحابؓ کے لیے ایک ایسا مقام چاہتے تھے جہاں آپؐ ان کے اندر کردار کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر سکیں اور اسلامی حکومت سے متعلق تمام ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی صلاحیتیں ان میں پیدا کر سکیں اور ان کو عملی تربیت دے سکیں۔ اپنے اصحابؓ کی تربیت کے سلسلہ میں آپؐ نے مقام و ماحول کی سازگاری کا کس قدر اہتمام کیا اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہجرت کا واقعہ ہی کافی ہے۔ انسان کے اصلاح و تربیت میں مقام و ماحول کو کتنا دخل ہے اس کی وضاحت خود نبی کریمؐ نے ایک واقعہ سنا کر فرمائی۔

آپؐ نے فرمایا:

”تم سے پہلے لوگوں میں ایک شخص تھا۔ اس نے ننانوے آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ پھر اس نے پوچھا کہ زمین پر سب سے زیادہ علم رکھنے والا شخص کون ہے؟ چنانچہ اسے ایک راسب کا پتہ بتا دیا گیا۔ وہ راسب کے پاس گیا اور کہا کہ ”میں ننانوے آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں، کیا میرے لیے توبہ کی کوئی صورت ہے؟“ راسب نے کہا: ”نہیں۔ یہ سن کر اس شخص نے راسب کو بھی قتل کر دیا اور اس طرح ستر کا عدد پورا ہو گیا۔ اس نے پھر پوچھا کہ سب سے زیادہ علم رکھنے والا کون ہے؟ لوگوں نے اسے ایک عالم کا پتہ بتا دیا۔ وہ عالم کے پاس آیا اور بولا: ”کہ میں ستر آدمیوں کو قتل کر چکا

ہوں، تو کیا میرے لیے توبہ کی کوئی شکل ہے؟ عالم نے کہا: ”ہاں! توبہ اور تمھارے درمیان کون حائل ہو سکتا ہے؟ تم ایسا کرو کہ فلاں بستی کی طرف جاؤ۔ کیوں کہ وہاں کچھ لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ تم ان کے ساتھ اللہ کی عبادت کرو۔ اور اپنی قوم کی بستی کی طرف نہ آنا کیونکہ یہ بری بستی ہے۔ چنانچہ وہ وہاں سے چل دیا۔ ابھی آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ اسے موت آگئی اس کی روح قبض کرنے کے سلسلہ میں رحمت اور عذاب کے فرشتوں کے درمیان اختلاف ہو گیا! رحمت کے فرشتوں نے کہا: ”یہ شخص خلوص دل سے توبہ کر کے چلا ہے۔“ عذاب کے فرشتوں نے کہا: ”اس نے آج تک ایک بھی اچھا عمل نہیں کیا!“ اتنے میں ایک فرشتہ آدمی کی صورت میں نمودار ہوا۔ فرشتوں نے اس کو اپنا ثالث بنالیا۔ اس نے کہا: ”دونوں بستیوں کے درمیان کی زمین ناپو، وہ جس بستی سے قریب ہو اس کو اسی میں شمار کرلو۔“ چنانچہ انھوں نے زمین کو ناپا اور اس کو اس (نیک) بستی سے قریب پایا جس کا اس نے قصد کیا تھا۔ چنانچہ رحمت کے فرشتوں نے اس کی روح قبض کر لی۔“ (مسلم)

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ صالح معاشرہ اور اچھے ساتھی سیرت و کردار کی تعمیر میں بہت ہی اہم رول ادا کرتے ہیں اور بری بستی بگڑا ہوا ماحول، برے دوست انسانوں کو بگاڑنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے لیے کبھی اور اپنے متعلقین کے لیے صالح لوگوں، نیک دوستوں اور پاکیزہ معاشرت کا انتخاب کر سکیں۔

و اختلاف علماء کہ یکے فعل را حرام میگفت و دیگرے بحلیہ ہماں را حلال می گشت
 علاوہ انکار گشت و چون از علماء سے عہد خویش ہر کدام را بہ اعتبار جاہ و عظمت بہتر از
 امام غزالی و رازی تصور نموده بودند۔ رکاکتہا سے ایشاں را دیدہ قیاس فائب بر شاہد
 کردہ سلف را نیز منکر شدند۔

ملا یزدی نے صحابہ کے خلاف کہا تو بادشاہ نے ابتدائی اسلام کی تاریخ پڑھوانی
 شروع کی۔ اس زمانے کے اختلافات اور صحابہ کبار کے متعلق معترضوں (مثلاً شیعہ
 اہل فکر کے طعن و تشنیع دیکھ کر بادشاہ کا اعتقاد صحابہ میں بھی نہ رہا اور مذہب کی بنا صحابہ
 کی منقولہ روایات پر نہیں بلکہ عقل پر رکھی گئی۔ "چوں تاریخ خواندہ می شد روز بروز
 اعتقاد از اصحاب فاسد شدن گرفت و کام فراخ تر نہادند و نماز و روزہ و جمیع سنتوں
 را تقلیدیات نام نہادند۔ یعنی غیر معقول و مدار دین بر عقل گزاشتند نہ نقل"۔
 صوفی اہل فکر نے ان پریشانیوں میں اور اضافہ کیا۔ بدایونی ان میں سب سے زیادہ شیخ
 تاج الدین ولد شیخ زکریا جو دھنی کی شکایت کرتا ہے، جو کئی کتابوں کے مصنف تھے۔
 ممتاز صوفی تھے۔ تاج الحارثین کہلاتے تھے اور بقول بدایونی علم توحید میں دوسرے
 شیخ ابن عربی تھے۔ (در علم توحید ثانی شیخ ابن عربی بود) انھوں نے وحدت الوجود
 کا راگ الاپا۔ ابن عربی کی تصانیف سے کئی ایسی چیزیں لائے جن سے آزادی اور
 آزاد خیالی کا سبق ملتا تھا۔ آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی ایسی تاویل و ترجمانی کی
 کہ بادشاہ حیران رہ گیا۔ انھوں نے خلیفۃ الزمان کو انسان کامل کہا اور بادشاہ کو اس
 لقب کا مستحق قرار دیا اور بادشاہ کے لیے سجدہ تجویز کیا اور اس کی تائید میں بعض
 روایات اور ان ہندوستانی صوفیانہ طریقوں کی مثال جن میں مرید اپنے مرشد و ملا کو
 سجدہ تعظیم کرتے ہیں، پیش کی۔
 بادشاہ بقول بدایونی "جو ہرے نفیس و طالب حق" لیکن "عامی محض" تھا اور اس کا

ابتدائی زمانہ پست خیال اور اسخ الحقیقہ لوگوں میں گزرا تھا۔ اہل بدع و اہوا کی ان ترجانیوں سے جو باطل کو بصورت حق اور حق کو بصورت باطل پیش کرتی تھیں۔ وہ اپنا توازن کھو بیٹھا اور حق و باطل کی تمیز سے عاری ہو گیا۔

عبادت خانہ کے مباحثوں کی زیادہ تفصیل اور دلچسپ قصے بدایونی کی تاریخ میں ملتے ہیں۔ ابوالفضل نے بھی اکبر نامہ میں ایک باب ان کے متعلق لکھا ہے، لیکن زیادہ تر تغاضلی۔ عبارت آرائی۔ عمومیات۔ البتہ بادشاہ کے خیالات کا خلاصہ اس کی زبان سے پڑھنا ضروری ہے۔ ابوالفضل کہتا ہے کہ بادشاہ فرماتے تھے کہ اس سے پہلے جب میں ظاہر مونیوں کا ہم خیال تھا، میں سمجھتا تھا کہ ظاہر آرائی اور بغیر دلی قبول کے مسلمانی کا دعویٰ کرنا فائدہ مند ہے۔ چنانچہ میں کئی ہندوؤں کو درادھم کا کر اپنے بزرگوں کے دین پر لایا۔ لیکن اربے شہرستان باطن کی حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس آشوبگاہ اختلاف میں عقل سمجھ کا راستا اختیار کرنا چاہیے اور نہیب سلطانی سے زبان پر کلمہ شہادت نکلوانا، ختم کرنا اور ظاہری قسم سے سجدہ کرنا خدا طلبی نہیں ہے۔

طاعت آں نیست کہ برخاک نہی پیشانی صدق پیش آر کہ اخلاص بہ پیشانی نیست ضرورت اس کی ہے کہ نفس خود آرا کو شکست دی جائے اور خواہش اور غصے کو سلطان عقل کے تابع کیا جائے۔

مختلف مذاہب کے متعلق بادشاہ نے بارہا کہا کہ آدمی وہ ہے جو انصاف کو اپنا رہنما بنائے اور ہرگز وہ سے جو چیز عقل کے مطابق ہو اخذ کر لے۔ شاید اس طرح وہ عقل جس کی چابی گم ہو گئی ہے کھل جائے۔ اس سلسلے میں وہ اہل ہند کی حقیقت طلبی کی بڑی تعریف کرتے اور ان لوگوں کی شکست و ناکامی کے وقت وفاداری کے جھنڈے تلے رفاقت اور مال و جان و ناموس و دین (کہ کالائے چار سوے دنیا ازین برنگذر) کی قربانی کا ذکر بڑی شیوہ زبانی سے کرتے ہیں۔ ابوالفضل عبادت نامہ کے مباحثوں کی

بیمار پڑے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کی عیادت کے لیے بہت دور تک پیدل چل کر گئے۔
 پہنچے تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ بے ہوش پڑے تھے۔ آپ نے وضو کیا، پانی کے چھینٹے دیئے اور مریض
 کے لیے دعا کی!

اگر کسی کے عالم نزع کے بارے میں معلوم ہو جاتا یا آپ کو اطلاع دی جاتی تو فوراً پہنچتے۔
 تو بہ الی اللہ کی ہدایت کرتے۔ کسی کی وفات کی اطلاع ملتی تو فوراً اس کے گھر پہنچتے۔ پس ماندگان
 کو صبر کی تلقین کرتے اور ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار فرماتے۔ تجہیز و تکفین میں جلدی کراتے۔
 جنازہ اٹھتا تو خود بھی جنازہ کے ساتھ ساتھ جاتے۔ مسلمان کا جنازہ خود پڑھاتے اور اس
 کے لیے دعائے مغفرت کرتے!

ضرورت پڑتی تو لوگوں کے بہت سے کام کر دیتے۔ عورتوں کا سودا سلف بازار
 سے لا دیتے۔ غریبوں کی مدد کرتے، گنجائش ہوتی تو لوگوں کو قرض دے دیتے یا قرض
 دلا دیتے۔ بھوکوں کو کھانا کھلاتے، غلاموں کی آزادی کا بندوبست فرماتے۔ یتیموں،
 بیواؤں، مسکینوں کی امداد فرماتے اور ان کی امداد پر ابھارتے۔ سماج کے کمزور
 طبقات کو اونچا اٹھانے کی کوشش کرتے۔

ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ اپنے اصحاب کے ساتھ مزاح و مذاق بھی کرتے
 ان کے ساتھ تیراکی اور تیر اندازی کے مقابلے میں بھی شریک ہوتے۔

مختصر یہ کہ نبی کریمؐ نے اپنے کو سماج سے اس قدر قریب کر رکھا تھا کہ سماج کا ہر
 فرد یہ سمجھتا تھا کہ اللہ کے رسولؐ سب سے زیادہ اسی سے قربت و محبت رکھتے ہیں۔ یہ
 برتاؤ اور سلوک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں اپنا گھر بنا لیتا تھا۔ اور صحابہ کرامؓ آپ کے اس
 برتاؤ سے اپنے لیے غذا حاصل کرتے تھے۔

تربیت کے سلسلہ میں انسان کے ذاتی تعلقات اور سماجی روابط کا بڑا اثر پڑتا
 ہے۔ اصلاح و تربیت کا فریضہ انجام دینے والوں کی ذمہ داری قرار پاتی ہے کہ اپنے
 زیر تربیت افراد اور سماج کی اکائیوں سے زیادہ سے زیادہ گہرا تعلق پیدا کریں۔ غمزدوں
 کے زخموں پر بچا یہ رکھیں۔ گرتے ہوؤں کو سہارا دیں۔ قرض کے بوجھ کے نیچے دبے والے

کو اس بوجھ سے نجات دلائیں غریب الدیار اور پردیسی کے لیے ٹھکانہ فراہم کریں۔ ناخواندہ کو زبورِ تعلیم سے آراستہ کریں۔ کمزوروں اور زیر دستوں کو اوپر اٹھانے کی کوشش کریں پھر دیکھیے یہ کردار کس طرح تربیت میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایسی ہی فضا قائم کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا :-

”ہر روز جب سورج طلوع ہوتا ہے تو انسان کی انگلیوں کے ہر پورے پر صدقہ واجب ہوتا ہے۔ دو انسانوں کے درمیان انصاف کرنا صدقہ ہے۔ جب کوئی انسان کسی انسان کے سوار ہونے میں مدد دیتا ہے اس کے سامان کو لا دیتا ہے یا اتار دیتا ہے تو یہ بھی صدقہ ہے۔ کسی سے اچھی بات کہنا بھی صدقہ ہے۔ ہر قدم جو نماز کے لیے اٹھتا ہے وہ بھی صدقہ ہے۔ تکلیف دہ چیز کا راستہ سے ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔“

(متفق علیہ)

شاکی ہے اور تذکرہ علمائے ہند میں بھی ان کی علمیت، (یگانہ مدد وراں بود) اور ترویج شریعت کی تعریف کے ساتھ ساتھ انھیں "سنی معتصب" کہا گیا ہے۔

شیخ عبدالنبی صدر الصدور مشہور ساری بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے تھے۔ حرمین میں جا کر علم حدیث کا مطالعہ کیا اور محدثین کی وضع اختیار کی۔ ان کے والد نے سماع کے جواز میں رسالہ لکھا تھا۔ انھوں نے تردید میں ایک رسالہ لکھا۔ اس آزادی اور شہرت دیانت نے ۱۲۵۳ھ میں صدر کی مسند پر لا بٹھایا۔ وہ مخدوم الملک کے عمر میں چھوٹے تھے اور ان کی طرح غاصب اور ظالم نہ تھے۔ لیکن مسجدوں کے اماموں کو جاگیریں صدر الصدور کے دستخط سے ملتی تھیں اور کہا جاتا تھا کہ اس ضمن میں شیخ کے متوسلین رشوت لیتے ہیں، لیکن اس سے بھی زیادہ جس چیز نے انھیں نقصان پہنچایا وہ مخدوم الملک کا عناد اور دربار کا نیاز نگ تھا۔ مخدوم نے عبادت خانے کے مباحثوں میں ان پر نکتہ چینی شروع کی۔ ان کے خلاف ایک رسالہ لکھا، جس میں اس قسم کی باتیں تھیں کہ شیخ عبدالنبی نے خضر خاں شروانی کو پیغمبر صاحب کو برا کہنے کی تہمت لگا کر اور میر حبش کو رفس کے الزام میں ناحق مروا ڈالا۔ اپنے والد سے حرمین کے متعلق شیخ عبدالنبی کا اختلاف تھا اور شاید والد نے انھیں علیحدہ بھی کر رکھا تھا۔ مخدوم الملک صاحب نے فتوے دیا کہ شیخ کے پیچھے نماز جائز نہیں کیونکہ اسے باپ نے عاق کر دیا ہے اور اسے خونی بوا سیر بھی ہے۔ جب مخدوم الملک نے اس طرح صدر الصدور کی مخالفت اور تضحیک شروع کی تو انھوں نے بھی مخدوم پر بے علمی اور گمراہی کے الزام لگائے اور علماء کے دو گروہ ہو گئے جو نئے نئے مسئلوں میں جھگڑتے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بجائے ایک دوسرے کو ذلیل کرتے۔ بدایونی نے عہد اکبری کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے خیال ہوتا ہے کہ اکبر نے علما کا اقتدار ان کی کج بحثیوں اور حماقتوں کی وجہ سے کم کیا۔ مولنا ابوالکلام آزاد نے بھی تذکرہ میں خواہیوں کا باعث مخدوم الملک اور صدر الصدور کی شخصی کوتاہیوں کو قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانی کی رائے نقل کی ہے: "ہر فتویٰ کہ

دریں زماں در ترویج ملت و دین ظاہر گشتہ۔ از شومئ علماء سوراست کہ فی الحقیقت شرار
مردم و نصوص دین اند۔ اور ان دو بزرگوں کو اس بیان کا مصداق قرار دیا ہے۔ اور اب
یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ ”علماء سور“ سے مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی مراد ہیں حضرت
مجدد نے ”علماء سور“ کی وضاحت نہیں کی، لیکن اس معاملے میں مولانا محمد ناظم ندوی
کی رائے ہمیں زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ جنہوں نے تعلیمات مجددیہ کے پیش لفظ میں
”علماء سور“ سے ”مبارک ناگوری کے دونوں ذہین و طباع بیٹے ابوالفضل اور حفیظ
اور تاج الدین دہلوی (کذا)“ مراد لیے ہیں۔ شاید ان کے علاوہ قاضی خاں بدخشی
کی طرف بھی اشارہ ہو، جنہوں نے بادشاہ کے لیے سجدہ تحیت جائز قرار دیا۔
بدایونی کے علاوہ عہد مغلیہ میں علما کے جتنے تذکرے لکھے گئے اور جن کا
ماخذ منتخب التواریخ نہیں۔ ان میں بالعموم شیخ عبد النبی اور مخدوم الملک کی تعریف
کی گئی ہے۔ مثلاً حضرت مجددؒ کے شاگرد اور خلیفہ (اور ان کی مشہور سوانح عمری
حضرات القدس کے مصنف) جنہیں سترہ سال مرشد کی خدمت میں رہنا نصیب ہوا
سنوات الاقبا (قلمی) میں شیخ عبد النبی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

”شیخ عبد النبی ابن شیخ احمد حنفی رضی اللہ عنہ عالم و محدث بود۔۔۔۔۔ تسرع
بر کمال داشت۔ و در اتباع سنت و رفع بدعت رسوخ تمام نصیب وقت او
شده بود۔ و در امر معروف و نہی منکر بر سلاطین و امرا شدت کردے۔۔۔ صاحب
تصانیف شریفہ است۔ از انجملہ وظائف النبی است۔ در سنہ نہصد و نود و یک
در عہد عرش آشیانی شہادت یافت۔ صاحب فیض گفت سالش عقل ۷۰“

۱۰ ذرا اس تاریخ کا بدایونی کے بیان سے مقابلہ کریں ”نبی اور اخفہ کردند و بحق و اصل شد و شیخ کنی
تاریخ یافتند۔۔۔۔۔ کہ جب شیخ کا نبی گفتند۔۔۔۔۔ کا نبی نیست شیخ ما کنی است“
در بارگیری میں آزاد لکھتے ہیں: ”اس مرحوم کا دم نکل گیا۔ اور ان کا غصہ نہ نکل چکا۔۔۔۔۔ کنب (جنگ)
اور بحق و اصل شد کے لفظ کو دیکھو۔ اس میں کیا کام کر گئے۔ چاہو یہ سمجھ لو کہ ذات حق کے ساتھ واصل
ہو گئے۔ چاہو یہ کہو کہ امر حق کو پہنچ گئے۔“

اخبار الاصفیا (قلمی) میں جو ابو الفضل کے بھانجے عبدالصمد نے اسی زمانے میں لکھی، اسی طرح کا اظہار خیال ہے۔

”شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس حشّی گنگوہی۔ عنوان صحیفہ دین و دانش و فہرست جریدہ علم و عمل بود۔ در عنقوان برتائی... بحرین شریفین شتافت و حدیث دران خیر البقاع نزد شیخ ابن حجر... استماع نموده بوطن گاہ خرامید۔ و (مکر) در رواج ارکان شریعت غراب رستمہ... آرام گاہ فتح پور۔ کتاب سنن الہدایہ از و یادگار است۔“

دوسرے معاصرانہ تذکروں میں بھی (مثلاً مرآۃ العالم میں) (سوائے ان کے جنہوں نے طبقات شاہجہانی کی طرح بدیہی پر انحصار کیا ہے) شیخ عبدالنبی بلکہ مخدوم الملک کا ذکر بھی تحریف کے ساتھ کیا گیا ہے اور بالخصوص حضرت مجددؒ کے شاگرد اور سوارخ نگار خواجہ بدرالدین سرہندی کی شیخ عبدالنبی کی تحریف کے بعد یہ قیاس کہ حضرت مجددؒ نے انھیں ”علیٰ سوء“ میں سے شمار کیا ہوگا، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

مخدوم الملک کی شخصی کوتاہیوں میں کلام نہیں اور عبادت خانہ کے مباحثوں میں علمائے بالعموم بڑی ناواقفیت اندیشی سے کام لیا، جس سے اکبر کے دل میں طبقہ علما کے لیے کوئی احترام باقی نہ رہا۔ لیکن اکبر کے علما سے اختلاف کی وجہ فقط ان کی کوتاہیاں اور قابل اعتراض باتیں نہ تھیں بلکہ ان کی خوبیاں اور ترویج شرع کی کوششیں بھی وجہ مخالفت ہو گئیں۔ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کے ضمن میں یہ بات قابل غور ہے کہ شیخ عبدالنبی پر کوئی جائز اور ذہنی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ ان کی ذاتی کوتاہی پر کسی نے شبہ ظاہر نہیں کیا۔ بے شک وہ احکام شرع کی پابندی میں سخت تھے، لیکن مذہبی نقطہ نظر سے تو یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں اور جس واقعہ (مقتدر کے برہمن کو منزلے قتل پر) اکبر سے ان کا سخت اختلاف ہوا، اس میں تو بے فیصدی علما بلکہ زیادہ شیخ عبدالنبی کے ہم خیال ہوں گے۔ مخدوم میں شخصی کمزوریاں زیادہ تھیں، لیکن ان کی جس چیز کی شکایت کی جاتی ہے، یعنی شدت احتساب۔ وہ بھی شرعی نقطہ نظر سے خوبی ہے برائی نہیں۔ انھوں نے بقول بدایونی، شیخ ابو الفضل کی نسبت جو کہا تھا کہ پتا نہیں

اس شخص سے دین میں کیا کیا فتنے برپا ہوں گے۔ اسے بھی واقعات نے درست ثابت کیا۔ اور شیخ مبارک کی راسخ الاعتقادی کی نسبت انھیں جو شیعے تھے، وہ بھی بجا نہ تھے۔ شیعوں کے متعلق ان کا جو نقطہ نظر تھا، وہی حضرت مجدد الف ثانی کا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی مقبولیت شیعیت کی اشاعت۔ شطاری اور دوسرے آزاد صوفیانہ طریقوں کی ترویج سے ملک میں جو روحانی انتشار رونما تھا، اس کے سد باب میں مخدوم الملک کی محنت سنانہ کوششیں، شیخ مبارک کی علمیت و آزاد خیالی اور شیخ علانی کی نیک نفسی اور خلوص سے زیادہ مفید تھیں۔

علما اور اکبر کے درمیان جو اصل وجہ مخالفت تھی، اسے خود اکبر نے عبداللہ خاں ازبک کے نام ایک خط میں واضح کر دیا ہے اور عقل و براہین کی اہمیت بتاتے ہوئے علماء و برابر کی شکایت کی ہے۔ ”مے خواہند کہ در فرمانروائی و کارگزاری شریک بادشاہی باشند۔“ اور یہ بیان غلط نہ تھا۔ خاندان سور کے عہد حکومت اور اکبر کے ابتدائی ایام میں مخدوم الملک اور صدر الصدور کو بڑے اختیارات حاصل تھے۔ شرع کی ترجمانی ان کا کام تھا اور ملک کا قانون ان کے ہاتھ میں تھا۔ کئی باتوں میں بادشاہ کی کچھ مرضی ہوتی ہوگی اور ان بزرگوں کے فیصلے کچھ اور۔ اکبر جیسے خود سر اور آزاد خیال بادشاہ کو جس نے چند سالوں میں بزم خاں جیسے کار گزار تابع کا جو اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا تھا یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ کسی سے دب کر رہے۔ پھر وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ جن اصولوں پر مجھے ملک کا نظم و نسق کرنا ہے، وہ علما کے بڑھتے ہوئے اختیار کی موجودگی میں ناممکن ہے۔ چنانچہ وہ علما کا زور توڑنے کے لیے ہوا۔ اتفاق سے شیخ مبارک ان کے بیٹے اور بدایونی آن پہنچے اور ان کی مدد سے یہ مشکل حل ہو گئی۔

اکبر اور علما کی کشمکش فی الواقعہ (کلیسیا یا ارباب شرع) Church اور

۱۔ ازبک طالب جمع ریاست دین یا ریاست دنیوی بودند۔ و تبعیت دیگر سے را تکلیف الاطلاق می دانستند۔ (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۶۸)۔

(حکومت) علماء کی کشمکش تھی جس میں حکومت کا پلہ بھاری رہا۔ بدقسمتی سے اکبر کی اپنی مذہبی طبیعت کی وجہ سے یہ کشمکش دنیوی امور تک محدود نہ رہی بلکہ مذہبی امور و عقائد پر بھی اس کا اثر ہوا، لیکن اس کی تہ میں دنیوی اقتدار کا سوال تھا اور اکبر اور علماء دربار کے درمیان اصلی وجہ مخالفت یہ تھی کہ بادشاہ مختار کل ہے یا علماء کے فتوؤں کے تابع۔ مخدوم الملک اور صدر الصدور کے نقائص ضمنی اور ثانوی چیزیں تھیں۔

علماء کا زوال | جن دنوں عبادت خانے کے مباحثوں میں علماء دنیا کو عجیب تماشہ دکھا رہے تھے۔ دربار شاہی میں ایک ایسا شخص آہنچا جو علم و فضل میں یگانہ روزگار تھا، جس نے تعلیم محقق دوانی کے شاگرد ابوالفضل گزندہی سے حاصل کی تھی اور جس کے فیض یافتگان میں ابوالفضل فیضی اور خود عبدالقادر بدایونی تھے۔ لیکن جس نے مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کے ہاتھوں بہت دکھ اٹھایا تھا اور جو اصولی طور پر بھی احتسابی کارروائیوں کا مخالف اور آزاد خیال تھا۔ یہ شخص ابوالفضل اور فیضی کا باب شیخ مبارک تھا۔ شیخ اور مخدوم کے اختلافات پرانے تھے۔ جب سلیم شاہ کے سامنے شیخ علانی کے متعلق علماء کا محضر جمع ہوا تب بھی شیخ نے مخدوم سے اختلاف کیا تھا اور ہمدوی مشہور ہوئے۔ اس کے بعد ایک عراقی سید زادہ کو بچانے کی کوشش میں شیعیت سے متہم ہوئے۔ عہد اکبری کے شروع میں شیخ کو علماء دربار کے ہاتھوں جو مصیبتیں پہنچی تھیں، انھیں ابوالفضل نے بالتفصیل اکبر نامہ کے اخیر میں گنایا ہے اور بدایونی نے بھی مختصر مگر جامع الفاظ میں اس خاندان کی سرگزشت لکھی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ جن دنوں میر حبیب اور دوسرے اہل بدعت گرفتار اور قتل ہوئے۔ ان دنوں شیخ عبدالنبی صدر الصدور اور مخدوم الملک وغیرہ نے مل کر بادشاہ کے حضور میں عرض کی کہ شیخ مبارک ہمدوی بھی ہے اور اہل بدعت (شیعہ) بھی، خود گمراہ ہے اور دوسروں کو گمراہ کرتا ہے۔ یہ کہہ کر برائے نام اجازت لی اور شیخ کا خاتمہ کرنے کے درپے ہوئے محسبوں کو بھیجا کہ

شیخ کو حاضر کریں، لیکن شیخ بچوں سمیت روپوش ہو گیا۔ وہ ہاتھ نہ آیا اور محتسب اس کی مسجد کا منبر توڑ کر واپس آ گئے۔

شیخ مبارک کو جان بچانے کے لیے جابجا خاک چھاننی پڑی۔ مدتِ دراز کی سرگردانی کے بعد ایک امیر (مرزا کوکہ) کی سفارش سے شیخ کی گلو خلاصی ہوئی۔ انھوں نے شیخ کی درویشی اور علم و فضل کی تعریف کی اور بادشاہ سے اُسے گھر جانے اور اپنا درس شروع کرنے کی اجازت دلوائی۔ شیخ کا بڑا بیٹا فیضی تھا۔ ۱۵۴۷ء میں شاعری کے ذریعے دربار میں پہنچا اور مارچ ۱۵۴۹ء میں ابوالفضل بھی دربار میں آکر میرنشی ہو گیا۔ یعنی جب علمائے دربار کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، شیخ مبارک اور اُس کے بیٹوں کا آفتاب طلوع ہوا۔

۱۵۴۹ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اختیاراتِ علما کے مسئلے کو نہایت نازک اور نمایاں صورت میں پیش کیا۔ ابتداً اس کی اس طرح ہوئی کہ متھرا کے قاضی عبدالرحیم نے ایک مسجد بنانے کے لیے مسالہ جمع کیا، لیکن ایک مقامی مالدار برہمن نے اس پر قبضہ کر لیا اور مسالے کو ایک مندر کی تعمیر میں صرف کیا۔ جب قاضی اور اس کے ساتھیوں نے اسے روکنا چاہا تو اس نے بانی اسلام کو گالیاں دیں اور اہل اسلام کی اہانت کی۔ قاضی یہ شکایت لے کر شیخ عبدالنبی صدر الصدور کے پاس پہنچا۔ شیخ نے برہمن کو بلا بھیجا۔ وہ نہ آیا۔ چنانچہ دربار سے ابوالفضل اور بیربر کو بھیجا گیا۔ وہ جا کر برہمن کو لے آئے۔ اصل وقوعہ کی نسبت ابوالفضل نے تصدیق کی کہ برہمن نے رسول اکرم کی بے ادبی کی۔ اب سوال پیدا ہوا کہ اسے سزا کیادی جائے۔ اس پر علما میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض کہتے تھے کہ اہانت نبوی کی شرعی سزا موت ہے۔ دوسرے کہتے تھے کہ قتل کے علاوہ کوئی دوسری سزا بھی دی جاسکتی ہے۔ اور امام اعظم کا فتوہ سناتے تھے کہ اگر ایک ذمی پیغمبر کی شان میں بے ادبی کرے تو عہد شکنی اور ابراء ذمہ جائز نہیں ہوتا۔ شیخ نے بادشاہ سے استصواب کیا۔ بادشاہ ٹال مٹول کرتا رہا۔ صریحاً کچھ نہ کہتا، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا رہا کہ سیاسیات شرعی تمھارے متعلق ہیں مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ اس کشمکش میں معاملے نے بہت طویل کھینچا۔ برہمن

دیر تک قید خانے میں رہا اور بادشاہ کی راجپوت بیویاں اس کی رہائی کے لیے کوشاں ہوئیں۔ شیخ نے بادشاہ سے پھر پوچھا اور حد سے زیادہ اصرار کیا۔ بادشاہ نے کہا کہ میں اس معاملے میں اپنا خیال بتا چکا ہوں۔ اب تم جانو (اور یہ ملزم)۔ چنانچہ شیخ نے برہن کو قتل کر دیا۔ اس پر اندر رانیوں اور باہر راجا مصاحبوں نے کہنا شروع کیا کہ ان علما کو حضور نے اتنا سر پر چڑھا رکھا ہے کہ اب آپ کی خوشی کا بھی خیال نہیں کرتے اور اپنی حکومت و جلال دکھانے کے لیے لوگوں کو بے حکم قتل کر دیتے ہیں۔ بادشاہ اس واقعہ پر بہت بگڑا۔ اتفاق سے ان دنوں شیخ مبارک کسی تقریب سے حضور میں آئے۔ علماء کے اختیارات کی وجہ سے جو دقتیں پیش آئی تھیں، اگر نے ان کے سامنے بیان کیں۔ شیخ نے کہا کہ بادشاہ عادل خود امام وقت اور مجتہد روزگار ہے۔ احکام شرعی اور ملکی کے اجرا میں وہ اس جماعت کا جھنڈا علم سے جھوٹی شہرت کے سوا کوئی حصہ نہیں ملا۔ محتاج نہیں۔ شیخ مبارک نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ اجتہاد کا دعویٰ کرے اور علما سے محضر طلب کرے۔ چنانچہ شیخ نے جو برسوں پہلے بادشاہ کو ریاست دنیوی و دینی کے اجتماع کا مشورہ دے چکا تھا۔ آیتوں اور روایتوں کی اسناد سے اس مضمون کا ایک محضر مرتب کیا۔ علماء کا ایک جلسہ بلایا گیا، جس میں بحث و محیص کے بعد علماء کی فہرست ثبت ہوئی۔ جن لوگوں نے فہرست لگائی ان میں مخدوم الملک، شیخ عبدالنبی، قاضی جلال الدین، قاضی خاں بدشتی، میراں صدر جہاں تھے۔ یہ محضر حسب ذیل تھا۔

۱۔ یہ تمام تفصیلات بدایونی کی منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۸۰ تا ۸۱ سے لی گئی ہیں۔ طبقات البری کے مطابق بھی شیخ مبارک دستخط کنندگان میں سے تھے۔ لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ ابو الفضل جس نے محضر کے متعلق اکبر نامہ میں ایک طویل اندراج دیا ہے۔ اپنے والد شیخ مبارک کا بالکل ذکر نہیں کرتا بلکہ محضر پر دستخط کرنے والے جن علما کے اس نے نام لکھے ہیں ان میں شیخ مبارک کا نام نہیں دیا گیا۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہ تھی کہ محضر اجتہاد پر جس طرح عمل کیا گیا، اسے دیکھتے ہوئے ابو الفضل اس سے اپنے والد کا انتساب نہ چاہتا تھا؟

مقصود از تشیید این مبانی و تمهید این معانی آنکه چون ہندوستان صہبت من
الحذثان بمیان مہدلت سلطانی و تربیت جہانبانی مرکز امن و امان و دائرہ عدل و
احسان شدہ۔ طوائف انام از خواص و عام خصوصاً علمائے عرفاں شعار و فضلاء
و قائل آثار کہ با دین بادیہ نجات و سالکان مسالک او تو العلم درجات انداز عرب
و عجم و بدین دیار نہادہ توطن اختیار نمودند۔ مجبور علمائے فحول کہ جامع فروع و
اصول و حاوی محمول و منقول اند و بدین و دیانت و صیانت اتصاف دارند۔
بعد از تدبیر وانی و تامل کافی در خواص معانی آیت کریمہ اطیعوا اللہ و اطیعوا
الرسول و ادلی الامر منکم و احادیث صحیح ان احب الناس الی اللہ
یوم القیامۃ امام عادل من یطع الامیر فقد طاعنی ومن
یعص الامیر فقد عصانی و غیر ذلک من الشواہد العقلیہ
والدلائل الحقلیہ قرار دادہ حکم نمودند کہ مرتبہ سلطان عادل عند اللہ زیادہ
از مرتبہ مجتہد است و حضرت سلطان الاسلام کہف الانام امیر المؤمنین ظل اللہ
علی العالمین ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ ابداً عادل و
اعلم و اعقل باللہ اند۔

بنابرین اگر در مسائل دین کہ بین المجتہدین مختلف فیہا است بذهن صائب و کثرت
خود یک جانب را از اختلافات بہت تسہیل محیثت بنی آدم و مصلحت انتظام عالم
اختیار نمودہ بہ آن جانب حکم فرمایند۔ متفق علیہ می شود و اتباع آن بر عموم برابر و
کافہ رعایا لازم و متحتم است و ایضاً اگر بموجب رائے صواب نمائے خود حکم را از
احکام قرار دہند کہ مخالف نصیحت نباشد و سبب ترفیہ عالمیاں بودہ باشد۔ عمل بران
نمودن بر ہمہ کس لازم و متحتم است و مخالف آن موجب سخط اخروی و خسران دینی
و دنیوی است۔ و این طور صدق و فور حسبہ اللہ و اظہار الاجراء حقوق الاسلام
بمخضر علمائے دین و فقیہائے ہدیین تحریر یافت و کان ذالک فی شہر ربیع الثانی
سبع وثمانین و تسعمائتہ۔

یہ محضر اگست ۱۹۵۹ء میں مرتب ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس کا خلاصہ دے کر تذکرہ میں لکھتے ہیں :-

اصلاً تو یہ بات ٹھیک تھی۔ فی الحقیقت خلیفہ وقت داراب حل و عقد و اصحاب شورے کو ہر عہد و دور میں حق اجتہاد حاصل ہے اور اس کے سد باب نے تاریخ اسلام کے تمام مصائب کی بنا ڈالی۔

مخالفت | محضر میں اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے کہ امام عادل کو مجتہدین اور علما سے انہی اختلافی امور میں زیادہ اختیارات ہوں گے جو نص

شرعی کے مخالف نہ ہوں اور عوام کی خوشحالی کا باعث ہوں۔ لیکن عملی طور پر ان شرائط کی پابندی نہ ہوئی۔ خوشامدی درباری ہر نئی بات کی تائید میں کوئی روایت، کوئی قول شرعی نقل کر دیتے اور بہت سی ایسی باتیں اختیار ہو گئیں جو نہ نص شرعی کے موافق تھیں نہ ”ترفعہ عالمیان“ کا ذریعہ۔ اس کے علاوہ چونکہ اب عبادت خانے کی محفلوں میں مسلمان علما کے ساتھ ساتھ برتگیز یادری۔ پارسی دستور اور جین سادھو بھی شریک ہو گئے تھے اور ان میں سے برتگیز یادری اسلام اور بانی اسلام کے خلاف نہایت ناگوار باتیں کہتے تھے، اس لیے ملک میں دربار کی نئی روش کے خلاف بڑی بے چینی پھیل گئی۔ شیخ نورالحق محدث زبدۃ التواریخ میں لکھتے ہیں کہ عبادت خانے کے مباحثوں سے بادشاہ کا مقصد فقط تحقیق حق اور حصول ثواب تھا (و بہ حقیقت مطمح و مقصود آنحضرت جُز طلب حق و اصابت ثواب نہ بود) لیکن اہل ہوا و نفس نے اس طرح بحثیں کیں اور قدیم کے پایہ اعتبار میں اس طرح کمی آگئی کہ لوگوں میں غلط فہمیاں پھیل گئیں اور حقیقت حال سمجھ بغیر بادشاہ سے بدظن ہو گئے۔ (عامہ خلق حقیقت حال را نفہمیدہ و بہ کہنہ سخن نرسیدہ و در مقام تفرقہ و تنزیل خیالات و اوہام افتادہ ساعت بساعت این اخبار نقل مجالس کا مے) دیگر افتادہ ”یہ چیز بقول شیخ نورالحق باعث تزلزل اقدام عوام ضعیف الاعتقاد و نفرت خاطر اتراک سادہ لوح آمد“

اسی زمانے میں آئین دربار میں بھی ایسی جہتیں ہوئیں جن سے ان بدگمانیوں کو

تقویت ہوئی اور بالآخر یہ حالت ہوئی کہ جو نیپور کے شیعہ قاضی القضاۃ ملا محمد نیردی نے علی الاعلان فتوے دیا کہ بادشاہ بد مذہب ہو گیا ہے اس پر جہاد واجب ہے۔ دربار میں قطب الدین خاں کو کہ اور شہباز خاں کنہوہ نے بڑی جرأت سے بادشاہ کو سمجھایا، لیکن حکومت اور اقتدار کا نشہ بڑا ہوتا ہے۔ بادشاہ اور بگڑا قطب الدین خاں اور شہباز خاں کو بڑا بھلا کہا۔ (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۷۳) اور ملا محمد نیردی اور معز الملک قاضی القضاۃ بنگالہ، وغیرہ کو ایک بہانے سے بلا بھیجا۔ جب وہ آگرے سے دس کوس پر فیروز آباد پہنچے تو حکم بھیجا گیا کہ ان دونوں کو الگ کر کے دریا سے جون کے راستے کو الیاء پہنچا دو۔ جہاں ملکی مجرموں کا جیل خانہ تھا۔ پھر حکم ہوا کہ ان کا خاتمہ کر دو۔ چنانچہ پہرہ داروں نے ایک ٹوٹی کشتی میں ڈالا اور تھوڑی دور آگے جا کر گرداب کی گود میں دفن کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد سابق قاضی القضاۃ قاضی یعقوب مانیکپوری جنھوں نے منعمہ کے خلاف فتوے دیا تھا اور اب بنگالہ میں قاضی تھے، بلائے گئے۔ ان کے لیے بھی گوالیار کے قلعہ میں قید کرنے کا حکم ہوا، لیکن دوسروں کی طرح انھیں بھی رستے میں ہی عدم کے تہ خانے میں بھیج دیا گیا۔ مخدوم الملک اور صدر الصدور کو ۱۵۸۰ء کے شروع میں حج اور خیراتی کاموں کے بہانے حجاز میں جلا وطن کر دیا گیا اور حکم ہوا کہ بلا اجازت نہ آئیں۔ انھیں جانا ناگوار تھا۔ جب ملک میں بادشاہ کے خلاف عام برہمی اور اضلاع شرقی میں بغاوت پھیلی تو وہ غلط امیدوں کے نشے میں سرشار بلا اجازت واپس آگئے۔ لیکن ان کے یہاں پہنچنے تک مخالفت و بادی گئی تھی۔ مخدوم الملک تو واپسی پر ڈر سے ہی احمد آباد گجرات میں وفات پا گئے۔ (۱۵۸۲ء)۔

۱۵۸۱ء ملا عبداللہ ازیمینا کی قالب تہی کر دہ بود۔ (اکبر نامہ جلد سوم ص ۳۸) مشہور یہ تھا کہ زہر دیا گیا۔ نمش خاموشی سے لیجا کر خاندانی قبرستان میں دفن کر دی گئی۔ اس کی نسبت معلومات نہیں ہیں لیکن مخدوم کے صاحبزادہ شیخ عبدالکریم چشتی جو برہن میں والد کے ساتھ تھے۔ لاہور کے قریب نواں کوٹ میں مدفون ہیں۔ ان کی وفات ۱۵۸۲ء میں ہوئی۔ انھوں نے قصوں الحکم کی شرح لکھی (بزرگان لاہور از نامی ص ۱۸۱)۔

شیخ عبدالنبی کا انجام زیادہ حسرت ناک ہوا۔ انھیں گرفتار کر کے فتح پور سیکری لایا گیا۔ بادشاہ نے سخت باتیں کہیں اور خود بھرے دربار میں ان کے منہ پر مٹکا مارا۔ شیخ بھی ایک قاعدے، وقار اور جرأت کے بزرگ تھے۔ جل کر کہنے لگے کہ چھری سے کیوں نہیں مارتے؟ اس کا بھی سامان ہو گیا۔ انھیں دیر تک بندی خانے میں قید رکھا گیا۔ وقت نہت خیرات کے لیے جو ستر ہزار روپیہ دیا گیا تھا۔ اس کا حساب کتاب ہوتا رہا اور اسی دوران میں انھیں گلا گھونٹ کر ختم کر دیا گیا۔

بدایونی کا غصہ اب بھی ختم نہ ہوا۔ شیخ کنبی تاریخ لکھی اور کہا ”حق و اصل فند“ بقول آزاد ”(کذب بھنگ) اور (حق و اصل شد) کے لفظ کو دیکھو کہ اس میں کیا کام کر گئے ہیں۔ چاہو یہ سمجھ لو کہ ذات حق کے ساتھ اصل ہو گئے چاہو یہ کہو کہ امر حق کو پہنچ گئے۔“

مشہور مخالفوں کے شہید کرانے کے علاوہ اکبر نے پنجاب کے با اثر علما کو جن کا سرغنہ مخدوم الملک کو سمجھا جاتا تھا (معلمائے پنجاب کہ عمدہ ایشاں مخدوم الملک بود) اور جو غالباً مذہبی معاملات میں زیادہ راسخ الخیال تھے، ملک کے مختلف حصوں میں منتشر کر دیا گیا۔ مثلاً بدایونی قاضی صدر الدین جالندھری لاہوری کی نسبت لکھتا ہے: ”زمانیکہ اکبر لاہور را نامزد در اطراف کردہ، ہر یکے را در شہرے یہ منصبے منصوب گردانیدند اورا قاضی بندر بھروج از ولایت گجرات ساخته فرستادند۔“ وہ بھروج میں فوت ہوا۔ قاضی عبدالشکور کو ”جلاوطن“ کر کے جوہر کا قاضی مقرر کیا گیا، لیکن ابھی وہ الہ آباد پہنچے تھے کہ جوہر کی قضاۃ کسی اور کو مل گئی۔ قاضی عبدالشکور معزول ہو گئے اور چونکہ لاہور واپس جانا نہیں سکتے تھے، اس لیے الہ آباد ہی میں تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ لاہور ان دنوں علم و فضل کا بڑا مرکز تھا۔ بلتان اور تلنہ کی ویرانی کے بعد وہاں بیشتر علمایاں آئے اور ایران و ترکستان کے علما کی پہلی بڑی منزل بھی لاہور تھا۔ بدایونی نے پنجاب کے علما کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ لیکن کسی وجہ سے اس نے شیخ منور نبی اسرائیل کا تفصیلی ذکر نہیں کیا، جو ایک اہل علم خاندان کے چشم و چراغ

کئی کتابوں کے مصنف اور اکبر کی تعزیری کوششوں کا نشانہ تھے۔ ہم آپ کو ٹر میں لکھ چکے ہیں کہ حضرت نور قطب عالم پنڈوی کے خلیفہ اعظم شیخ حسام الدین مانکیپوری کے ایک مرید حضرت شاہ کا کو نے موجودہ لنڈا بازار لاہور کے علاقے میں ایک مدرسہ اور خانقاہ قائم کی تھی۔ عہد اکبری میں یہ مدرسہ عروج پر تھا اور صدر مدرس شیخ کا کو کے فرزند شیخ اسحق کا کو تھے۔ انھوں نے طویل عمر پائی اور بقول بدایونی سو سال سے زیادہ عمر پا کر ۹۹۶ھ میں انتقال کیا۔ لاہور کے اکثر علمائے مشہور ان کے شاگرد تھے۔ ان میں سے شیخ سعد اللہ بنی اسرائیل خاص طور پر ممتاز تھے۔ شیخ منور شیخ سعد اللہ کے بھانجے اور شاگرد تھے۔ گلزار ابراہیم میں ان کے حالات بڑی تفصیل سے درج ہیں۔ ان میں خواہر بسیدی اور شان خود نمائی بہت تھی۔ لیکن ان کی علمی خدمات بھی قابل قدر ہیں۔ انھوں نے قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی بحر مواج کا عربی ترجمہ کیا۔ تفسیر در النظم کے عنوان سے قرآن کریم کی آیات اور سورتوں کی ترتیب واضح کی۔ طواریح۔ بدیع البیان اور قصیدہ بردہ کی شرحیں لکھیں۔ فقہ میں وہ مخدوم الملک سے بھی زیادہ کڑے تھے۔ حتیٰ صریح کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا۔ جس میں مخدوم الملک کی اس تحریر کی تردید کی کہ سب کشندگان رسول اکرم کی توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ (غالباً مختصر اولے برہمن کے مقدمہ کے ضمن میں یہ چیزیں لکھی گئی ہوں گی) ۱۰۵۵ھ میں مالوہ کے صدر مقرر ہوئے۔ لیکن پھر محتوب ہو گئے۔ پانچ سال گوالیار کے قلعے میں قید رہے۔ آپ کی تمام کتابیں جو کم و بیش ڈیڑھ ہزار جلدیں تھیں شاہی کتب خانے میں داخل ہوئیں۔ بڑا ظلم یہ ہوا کہ ان کے ساتھ آپ کی تصانیف بھی ضائع ہو گئیں۔ فقط در النظم بچ گئی جو قید خانے میں مصنف کے پاس رہ گئی تھی۔ قید خانے سے نکلنے کے بعد باقی وقت اگرے میں بڑی عسرت میں گزارا۔ ۱۰۶۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کے صاحبزادے شیخ کبیر نے پھر سے خاندانی روایات کو

سے اخبار الاصفیاء میں جو ابو الفضل کے بھانجے عبدالصمد کی تالیف ہے اسحق کا کو اور قاضی سعد الدین لاہوری کو مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطانپوری کا شاگرد دکھا ہے۔

زندہ کر دیا اور بدالیونی کی منتخب التواریخ میں ان کا ذکر ہے۔
 اکبر نے کسی بزرگوں کو مکاری اور حیلہ سانی سے کسی مقدمے یا داد فریاد کے بغیر
 شہید کروادیا، لیکن جن مشکلوں سے سابقہ پڑا وہ ختم نہ ہوئیں۔ اس کے عقائد کے
 خلاف عام شورش پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ ونسٹن سمٹھ لکھتا ہے:-

۱۵۸۱ء کا سال اکبر کی زندگی کا نازک ترین سال تھا۔ ملا محمد ریزی نے ۱۵۸۰ء کے
 شروع میں اکبر کے خلاف فتوے دیا تھا اور اس زمانے میں بہار اور بنگال میں اس
 خلاف جو بغاوت ہو گئی تھی، وہ ابھی تک نہ بچھی تھی بلکہ ٹوڈرل جو اسے مٹانے گیا
 تھا، خود منگیور میں محصور ہو گیا۔

اس کے علاوہ جو لوگ اکبر کی بد اعتقادی سے نالاں تھے، انھوں نے فقط صوبہ بجاتی
 بغاوت پر اکتفا نہیں کی بلکہ عملی طور پر اس بات کی کوشش کی کہ کسی طرح اکبر کو تخت سے
 برطرف کر کے اُس کی جگہ اس کے بھائی مرزا محمد حکیم حاکم کابل کو ہندوستان کا بادشاہ بنادیا
 اس تجویز کے محرک غالباً جو نیپور کے جاگیر دار خان معصوم خاں تھے، جن کی خط و کتابت
 مرزا حکیم سے تھی۔

اکبر نے عملی بغاوت کا تو خاتمہ کر دیا، لیکن عبادت خانے کے مباحثوں کی جو خبریں
 باہر آرہی تھیں، اُن کے خلاف ایک عام برہمی جاری تھی۔

ابوالفضل نے اکبر نامہ کے ایک سیر حاصل باب میں بالتفصیل
اسباب مخالفت | ان اعتراضات کو گنایا ہے جو بادشاہ کے متعلق لگائے جاتے

تھے اور ان اسباب کا بھی ذکر کیا ہے جن سے ان غلط فہمیوں کو سہارا ملتا تھا۔ اگر ابوالفضل
 کے عام انداز تحریر اور اس نقطہ نظر کو جو ایک مشرقی مطلق الحنان بادشاہ کے درباری مورخ
 کو اختیار کرنا پڑتا تھا، ذہن میں رکھیں تو غالباً اس موضوع پر سب کے جامع اور سب کے منصفانہ
 تبصرہ یہی ہے۔ ابوالفضل کو بہر کیف بادشاہ کا نقطہ نظر پیش کرنا تھا، لیکن مخالفین پر
 لعن طعن کرتے کے باوجود اس نے ان کا نقطہ نظر بھی پوری طرح پیش کیا ہے جس کی
 ایک درباری مورخ کو کوئی ضرورت نہ تھی اور ایک آدمی جگہ تو ایسا خیال ہوتا ہے کہ

آئینِ دربار کی پابندی کرتے ہوئے وہ طریقے طریقے سے شاہی روش سے اپنی علحدگی ظاہر کر رہا ہے۔ مثلاً جہاں وہ بادشاہ سے دعوائے الوہیت منسوب ہونے کا ذکر کرتا ہے، وہ اس غلط فہمی کی بنیاد بتاتا ہے کہ جب نصیری اور حلو کی طریقے کے بعض لوگوں نے بادشاہ کو ”منظر حق“ قرار دے کر گفتگو شروع کی تو بادشاہ نے طریقہ صلح کل کی بنیاد پر ان ”بے صرفہ گویانِ آشفۃ عقل و ہرزہ سرا یانِ پریشانِ مخزن“ کو چننا سرزنش نہ فرمائی۔ جس سے بے سمجھ۔ بدنہاد، بدخواہ غلطیوں میں مبتلا ہوئے اور ان کے کذب و افرا کو عام شہرت ہوئی۔

بادشاہ پر دوسری تہمت دعوائے پیغمبری کی تھی کہ بادشاہ ہمیشہ نئے نئے آئین وضع کرتا اور چنار چین دین و دنیا کو سیراب کرتا اور مشکوک اور اختلافی محاملات کی گتھیاں سلجھاتا تھا اس کے علاوہ قدیمی روش کے خلاف اس کا خطبہ پڑھتا اور ”منبر راہمنونی“ پر قدم رکھنا بھی غلط اندیشی میں تقویت کا باعث ہوا۔ جب بادشاہ کے پاس ان غلط بیانیوں کا ذکر ہوتا تو وہ انہیں اہمیت نہ دیتا اور بار بار کہتا: ”سبحان اللہ ورتنگلے خاطر نادان چگونہ مے وید آید کہ امرکائی حدوثِ نمود در ماندہ طبائع نسبت الوہیت بخود دیدہ“ اور تہمت پیغمبری کی نسبت بھی کہتا کہ اتنے بڑے پیغمبر آئے ہیں جنہوں نے ہزاروں معجزوں کے ساتھ اظہار نبوت کیا ہے۔ اس پر بہت زمانہ گزر گیا۔ ان کے ماننے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ لیکن انکار کرنے والے اب بھی انکاری ہیں۔ ان حالات میں مجھے کیسے اس طرح کا خیال ہو سکتا ہے اور لوگوں کو اس کا کس طرح گمان ہو سکتا ہے۔ ”مرا چینیں سگالش چیاں در صفو تکدہ ضمیر راہ یابد و ظاہر نگاہان صورت پرست را ایں تہ خیالی چرا سراسیمہ دارد“ اس کے باوجود بادشاہ ان لوگوں کو اس خیال سے سرزنش نہ کرتا۔ کہ ملامت اور الزام سے بھی صاف دلوں کی اصلاح ہوتی ہے۔ (انرا آخاکہ ملامت کشی وطنز بندی در دہاے صافی فروغ دیگر بخشہ۔ سرزنش آں تیرہ رایان نور افزا نباید کرد)۔

بادشاہ پر تیسرا الزام یہ تھا کہ وہ دین احمدی کی قدر نہیں کرتا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ

بادشاہ دانا دل وسعت مشرب عام شیوہ کرم و شفقت اور وسیع سلطنت کی بنا پر گروہ گروہ انسانوں کو دوست بناتا تھا اور ہر دین و مذہب کے اہل تحقیق سے مطالبہ دینی اور مقاصد حقیقی کے متعلق گفتگو ہوتی تھی۔ لیکن بعضوں سے بیدار نشی اور عدم تحقیق کی بنا پر مناسب جواب نہ ملتا تھا۔ بالخصوص اس دوران میں ”فیلسوفان نصاریٰ“ کی طرف سے ان مجالس میں متفقہا پر گرفت و گیر ہوئی اور بحث و مباحثہ برپا ہوا۔ جن لوگوں نے جھوٹی علمیت کے بڑے بڑے دعوے باندھ رکھے تھے۔ اُن سے ان علمی اور عقلی بحثوں میں تو کچھ بن نہ آئی، لیکن انھوں نے لوگوں سے خفیہ خفیہ کہنا شروع کیا کہ ہمیں دین کا غم کھائے جا رہا ہے اور بادشاہ نے جانبداری سے ہمارے جوابات کو قبول نہ کیا۔ ان لوگوں نے بے انصافی سے بادشاہ پر تہمتیں لگائیں اور یہ بھول گئے کہ بادشاہ خاندان نبوی کا کس قدر احترام کرتا ہے۔ سادات کو اس نے کیسے کیسے عمدے دے رکھے ہیں اور بوقت ملاقات کسی سید کے لیے روا نہیں رکھتا کہ وہ اس کے پاؤں پر سر رکھے۔

بعض کج بینوں نے بادشاہ کو شیعتیت سے متہم کیا۔ وجہ یہ تھی کہ جب مجالس شاہی میں دوسری قوموں کی طرح شیعوں کی لفظ نظر پیش کیا جاتا تو بادشاہ انصاف پسندی اور بے تعصبی سے جو رائے مضبوط ہوتی اُسے ترجیح دیتا۔

بیانے کہ باشد بہ حجت قوی زنا فرخی باشد از نشنوی
بادشاہ اس سلسلے میں فرقے کی قلت و کثرت اور اپنے بیگانے کا کوئی لحاظ نہ کرتا۔ لیکن کوتاہ بینوں نے یہ پودہ گوی شروع کی۔ انھوں نے ایرانیوں کی قدر و منزلت کو (جو بیشتر شیعہ ہیں) بدگمانی کا سامان بنالیا اور تورانیوں کو جو درجہ حاصل ہے، اسے نظر انداز کر دیا۔

بعض ناپاک طینتوں نے بادشاہ کو ”کیش برہمن“ کا طعنہ دیا۔ وجہ یہ تھی کہ بادشاہ دبدہ و راپنی فراخ جو صلی سے دانشمند براہمنوں کو اپنے قریب جگہ دیتا اور ”مصلح ملکی و افزونی حقیقت“ کی بنا پر اس نے کئی ہندوؤں کا پایہ بلند کیا تھا۔ یادہ گویوں کے

جوش و غضب کا سرمایہ تین چیزیں تھیں۔ "نخستین از فروزی شناسائی بارگاہ مقدس مجمع دانشوران مل و نخل آمد و از ان جا کہ ہر آئین شائستگی چند با خود دارد۔ ہر کدام نصیبہ آفریں برگرفت و از فرط انصاف گزینی نکوہیدگی، هیچ طائفہ پر دہ یافت نیکوئی اور توانا نہ شد۔ دوم ہنگامہ صلح گل در پیشگاہ خلافت رونق پذیرفت و گروہا گروہ مردم با گوناگون احوال کامروائے صورت و معنی گشتند۔" سوم تباہ سرشتی و کج گرائی فرومانگان روزگار۔ اکبر نامہ کی ایک اور دلچسپ دستاویز اکبر کا وہ خط ہے جو اس نے اپنے خیالات کی توضیح میں ابوالفضل سے لکھوا کر عبداللہ خاں ازبک والی ترکستان کو اگست ۱۵۸۶ء میں ارسال کیا۔ عبداللہ خاں نے ایک خط میں اکبر کو لکھا تھا کہ آپ کی نسبت پیغمبری بلکہ خدائی کے دعوے سُننے میں آتے ہیں۔ اکبر نے جواب میں ایک طویل طویل خط ارسال کر دیا جس کے دو مختلف مسودے اکبر نامہ اور انشاے ابوالفضل میں ہیں۔ اس خط میں بعض علماء سے دربار کی شکایت کی ہے کہ وہ نہ صرف عقل و خرد سے خالی تھے، بلکہ کلام مجید کی غلط ترجمانی کرتے تھے اور اس کی بنا پر شاہی اختیارات میں شرکت چاہتے تھے (و فرمان آسمانی و نامہ جاودانی را کہ فرستادہ خدا و رسانیدہ پیغمبر است از شاہراہ گردانیدہ برنگ دیگرہ واسے نمایند و مجلات نصوص را تا ویلات و تسویلات نمودہ و خواہند در فرمانروائی و کارگزاری شریک بادشاہی باشند) جب ان باتوں کی تحقیق اور اختلافی امور کی تفتیش کے دوران میں ظاہر بنیوں کا پول کھلا اور وہ پایہ اعتبار سے گر گئے تو انھوں نے حسد اور عداوت سے غلط افواہیں پھیلانی شروع کیں اور ہماری نسبت نبوت اور الوہیت کے دعوے منسوب کیے۔ ورنہ کہاں بندہ عاجز اور کہاں یہ دعوے!

عہد اکبری کے مذہبی موضح | اکبر نے جب ۱۵۸۱ء میں مرزا حکیم کو شکست دے دی اور اضلاع مشرقی کی بغاوت فرو ہو گئی تو اس کے ارادوں اور منصوبوں کو روکنے والا کوئی نہ رہا۔ ان حالات میں اس نے جو طور طریقے شروع کیے اور احکام نافذ کیے وہ اکبر کی مذہبی تاریخ کا ایک بجز حصہ ہیں، لیکن

افسوس کہ معاصرانہ مؤرخین اور راویوں کے اختلافات کی وجہ سے حقیقت حال تک پہنچنا آسان نہیں۔ چونکہ ان مؤرخین کے بیانات پر ہی اس زمانے کی مذہبی تاریخ کا انحصار ہے، اس لیے ان کی تحریروں اور طریق کار کا جائزہ حقیقت حال کو پرکھنے کے لیے ضروری ہے۔

عہد اکبری کے واقعات کے عینی شاہد کئی تھے۔ مثلاً بخش نظام الدین (مصنف طبقات اکبری)، ابوالفضل (مصنف اکبرنامہ و آئین اکبری)، ملا عبدالقادر بدایونی (مصنف منتخب التواریخ)، اسدیگ (مصنف اکبرنامہ)، شیخ عبدالحق محدث (مصنف تاریخ حقیقی) اور ان کے بیٹے شیخ نورالحق محدث (مصنف زبدۃ التواریخ) اور پرتگیزی پادری جن کے تین وفود مختلف وقتوں میں آئے اور دربار اکبری سے مدتوں تک وابستہ رہے۔ ان میں سے مذہبی تاریخ کی تفصیل کے راوی فقط تین ہیں۔ ابوالفضل۔ بدایونی اور پرتگیزی پادری اور وہ اپنے بیان میں متفق نہیں۔ ابوالفضل اور دوسروں کے اندراجات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اگرچہ ابوالفضل تعلیدی اسلام سے اختلاف ظاہر کرتا ہے اور شیخ مبارک اور مخدوم الملک کے نقطہ نظر میں جو اختلاف تھا وہ محتاج بیان نہیں، لیکن وہ اکبر کے احکام اور اسلام میں کوئی تناقض نہیں بتاتا اور اس کی تصانیف میں بادشاہ کا کوئی ایسا حکم نہیں جس سے اسلام کی مخالفت یا تحقیر ظاہر ہو۔ برخلاف اس کے بدایونی اور پرتگیزی پادری یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اکبر مسلمان نہ رہا تھا بلکہ اسلام کا سخت دشمن تھا۔ مثلاً پرتگیزی مشنری کہتے ہیں کہ بادشاہ نے یہ حکم دے دیا تھا کہ نئی مسجدیں تعمیر نہ ہوں۔ پرانی مسجدوں کی مرمت نہ ہو اور اس کے آخری ایام حکومت میں لاہور شہر میں کوئی مسجد نہ رہی تھی اور مسجدوں کو اطمیل بنا دیا گیا تھا۔ ایک اور صاحب لکھتے ہیں کہ اکبر نے عیسائی مذہب قبول کرنے کے لیے ایک کے سوا سب بیویاں اپنے درباریوں میں تقسیم کر دیں اور پرتگیزی پادریوں سے وعدہ کیا کہ میں حج کے بہانے گوا آؤں گا اور وہاں عیسائی ہو جاؤں گا! بدایونی میں اس طرح کی انتہائی بے سرو بایاتیں نہیں، لیکن اکبر کے متعلق اس کا

نقطہ نظر ابوالفضل کی نسبت پر تگیز پادریوں سے زیادہ قریب تھا۔ اس نے دربار میں قدامت پسند گروہ کے مخالف کی حیثیت سے سر اٹھایا تھا، لیکن جدت پسندوں نے جو تیز رفتاری اختیار کی اس کا وہ ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ ان کی قیادت کے لیے دوسرے لوگ آگے، جو اختلاف نقطہ نظر کے علاوہ شاید ٹھوس علمیت میں بھی اس سے بڑھ کر تھے۔ بدایونی کی اصلی خوبیاں ادیبانہ تھیں۔ عالمانہ نہ تھیں۔ (وہ مذہبی طبقے کا ترجمان بنتا ہے، لیکن اصل روحانی خوبیوں یعنی تقویٰ، پرہیزگاری، مخالفوں سے انصاف، ظاہر اور باطن کی ہم آہنگی۔ ان چیزوں کا تو اس نے دعویٰ بھی نہیں کیا، دربار میں اس کے لیے جلنے اور کڑھنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ نئی صورت حالات سے اسے اصولی اور ذاتی اختلاف تھا۔ اس کی کتاب اکبر کے خلاف ایک چالاک بلکہ مکار وکیل استغاثہ کا بیان ہے۔ غیر جانبدار منصف کا فیصلہ نہیں۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب، بے مثال نثر نگار اور نہایت ذہین انسان تھا۔ بطور مورخ کے بھی (اس کی درشت کلامی اور واضح جانبداری کے باوجود) اس کا ایک خاص انداز اور خاص مرتبہ ہے۔ اس کے ہاں صریح غلط بیانی کی شاید ہی کوئی مثال ملے۔ لیکن معمولی حذف و اضافہ قطع و برید، مواد کی ایک خاص ترتیب۔ ذو معنی الفاظ کے استعمال (Passive Construction) ترکیب مجملہ کی افراط جس سے یہ پتہ نہ چل سکے کہ کس سے کونسے خیالات یا حرکات منسوب ہیں۔ مبہم اشارے کنا سے۔ ان سب کی مدد سے بدایونی نے ایک ایسی تصویر کھینچ دی ہے جو حقیقت کے مطابق نہیں۔ اس نے بیسیوں ایسے احکام گنائے ہیں جو اگر واقعی بادشاہ نے جاری کیے تو ان کا آئین سلطنت میں ذکر ہوتا۔ اطراف مملکت میں ان کے اجرا کے احکام جاری ہوتے۔ کوئی دوسرا مورخ ان کا بیان کرتا۔ غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ ان میں کئی باتیں ایسی تھیں جو غالباً دربار میں گفت و شنید کی حد سے آگے نہ بڑھیں اور بعض فقط مریدان شاہی کی رہنمائی کے لیے تھیں۔ کئی مذہبی اور تاریخی امور ایسے ہیں جو عبادت خانے کے مباحثوں میں فریقین نے بیان کیے، لیکن بدایونی ان کا ذکر ایسے کرتا ہے گویا وہ

بادشاہ کے خیالات کا اظہار ہیں۔ اُن احکام کی جو واقعی جاری ہوئے، بدایونی اس طرح قطع و برید کر کے اور ایک خاص نقطہ نظر کی تائید میں پیش کرتا ہے کہ اس کے باقی اندراجات کی صحت پر بھی شبہ ہونے لگتا ہے۔ مثلاً اکبر طریقی تعلیم میں اصلاح کرنا چاہتا تھا اور ابو الفضل نے اس کی تفصیلات دی ہیں، جن کا مذہبی خیالات سے کوئی لگاؤ نہیں۔ لیکن بدایونی کے نزدیک وہ بھی اکبر کی اسلام دشمنی کا ایک کرشمہ ہے، عربی خواندن و دانستن اُن شروفعہ و تفسیر و حدیث و خواندن اُن مطعون و مردود و نجوم و حکمت و طب و حساب و شعر و تاریخ و افسانہ رائج و مفروض، بعض جگہ حقیقت حال واضح نہ کر کے اور صرف مبہم اور الزامی اشارے کنائے سے غلط فہمیوں کا سامان کیا ہے۔ بدایونی نے کئی اقوال کو شہرت دی۔ جن کی نسبت اسے پتا تھا کہ غلط ہیں، لیکن چونکہ وہ اس کے نظریے کی تائید کرتے تھے انھیں درج کتاب کیا اور جو حقیقی چیزیں اس کی نظریوں سے مخالف تھیں۔ انھیں یا تو نظر انداز کیا یا ان کی توجیہ و تاویل کی یا انھیں اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا کہ مثبت کے بجائے منفی پہلو نمایاں ہو۔ مثلاً جہاں تک توجیہ و تاویل کا تعلق ہے۔ فقہی کی تفسیر کلام مجید اور مثنوی نل دمن کا نعتیہ حصہ یہ دو چیزیں ایسی تھیں جو چھپ نہ سکتی تھیں اور فقہی کے خلاف بدایونی نے جو کچھ کہا تھا اس کی قطعی تردید کرتی تھیں اس لیے اُس نے تفسیر کے متعلق تو کہا کہ یہ برائے شمس بدنامی کہ تار و زبر جزا بصد آب شمسہ نگر دو لکھی گئی اور نعت کے متعلق کہا کہ وہ نزدیک بموت بہ مبالغہ و الحاح بعضہ آشنایاں درج ہوئی۔ جہاں تک مخالف مطلب واقعات نظر انداز کرنے کا تعلق ہے۔ ان کی تفصیل دینے میں یہ دشواری ہے کہ بدایونی کے سوا دوسرے مؤرخین نے مذہبی تاریخ پر توجہ نہیں دی۔ مؤرخین عہد کی نظر عام دستور کے مطابق سیاسی اور جنگی تاریخ پر رہی ہے ماسوائے ابو الفضل کے جو صلح کل کی اونچی کرسی پر براجمان تھے۔ چنانچہ اکبر نے شاعر اسلامی کی جہاں پیروی کی ہے اس کی انھوں نے تفصیل نہیں دی، لیکن اس کے باوجود معاصرانہ تصانیف میں مذہبی تاریخ کی چند ایسی اہم جزئیات مل جاتی ہیں جو بدایونی جیسے مذہبی مؤرخ کو اگر اس کا

ایک خاص نقطہ نظر نہ ہوتا) ضرور درج کتاب کرنی چاہیے تھیں، لیکن جنہیں اس نے مخالفت مطلب سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ مثلاً محضر کے واقعہ اور زیارت اجمیر کے بعد ملا نظام الدین بخشتی کا بیان ہے کہ واپسی پر بادشاہ نے حکم دیا کہ ”ایک طولانی خیمہ (بارگاہ) مسجد کے نام سے دولت خانے کے پاس کھڑا کیا جائے اور اس میں وہ پانچ وقت باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔“ اسی طرح ۱۵۸۶ء کے ضمن میں (یعنی محضر سے سات سال بعد) ملا نظام الدین لکھتے ہیں۔ ”خود بدولت کوچ کوچ تادہلی در پیچ جام مقام فرمودند و طواف مزار قاضی الانوار پیر بنہ رگوار نمودہ تمامی مزارات بزرگواراں را زیارت فرمودہ فقر او صالحین دہلی را بہ انعام عام سرسبز و شاداب ساختند۔ ہمدریں در دہلی ہلال شوال نمایاں گشتہ، صبح پنج شنبہ لوازم عید بجا آوردہ از دہلی کوچ فرمودند۔“ یہ عید جس کے ”لوازم“ اکبر بجالایا۔ ۱۵ اکتوبر ۱۵۸۶ء کو تھی۔

سال محضر (۱۵۸۹ء) کے بعد جب بدایونی کہتا ہے کہ قیامت آگئی اور اکبر اسلام سے باغی ہو گیا۔ اس کا نماز پنجگانہ کے لیے بارگاہ (مسجد) کا قیام اور نماز باجماعت کی ادائیگی اور اس کے سات سال بعد بندگان دہلی کی زیارت اور لوازم عید کی بجا آوری ایسی چیزیں نہ تھیں کہ ایک غیر جانبدار مورخ انہیں نظر انداز کر دیتا۔ اسی طرح پرتگیز مشنریوں کی تحریریں ہیں۔ وہ گواہی دے اس امید پر آئے تھے اور یہاں اگر گواہ اور تہذیب میں مسلسل یہ اطلاعیں بھیج رہے تھے کہ اکبر اسلام کا دشمن ہے اور بتسمہ لینے کے لیے تیار۔ اس لیے ان کے خطوں میں اکبر کے موافق اسلام ہونے کی روئاد ڈھونڈنا بے کار ہے، لیکن ان رپورٹوں میں بھی ایک آدھ چیز ایسی مل جاتی ہے جسے بدایونی نے نظر انداز کر دیا!

مثلاً جب اکبر ۱۵۸۱ء میں حکیم مزا کے تعاقب میں کابل گیا تو پرتگیز مشنری ہمکاب تھے۔ ان کا بیان ہے کہ اس سفر میں اکبر نے عیسائیت پر کئی اعتراض کیے۔ ابوالفضل نے بھی انجیل اور تورات کی نسبت ٹیڑھے سوال پوچھے اور جب ایک پرتگیز پادری نے کہا کہ انجیل میں غلے سے روحانی ہے تو ابوالفضل نے

کہا کہ وہ تو قرآن شریف میں بھی ہے۔

جب کابل سے واپسی پر شاہی لشکر درہ خیبر کے قریب علی مسجد کے پاس پہنچا جس کی نسبت بعضوں کا کہنا تھا کہ خلیفہ چارم حضرت علی کرم اللہ وجہہ وہاں تشریف لائے تو پر تگیز پادریوں کے بیان کے مطابق اکبر نے وہاں نماز ادا کی۔

جب سب لوگ دار الخلافہ میں واپس پہنچ گئے تو پادریوں نے علما کے ساتھ پھر مناظرہ کرنا چاہا۔ ”بادشاہ کو یہ بہت ناپسند تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ علما پھر مار جائیں گے۔“ بالآخر پادریوں کے اصرار پر ایک مباحثہ منعقد ہوا۔ پادری کہتے ہیں کہ جب انھوں نے علما کو جواب کر دیا تو بادشاہ نے بحث میں قدم بڑھایا اور علما کی طرف سے ان کے اعتراضات کا جواب دیا۔ پادری بادشاہ سے اب اس قدر مایوس ہو گئے کہ انھوں نے واپسی کی اجازت چاہی۔ بادشاہ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر انھیں روکنا چاہتا تھا، لیکن ایک پادری اپریل ۱۵۸۲ء میں اور دوسرا فروری ۱۵۸۳ء میں واپس چلا گیا۔

پر تگیز پادریوں کا دوسرا وفد ۱۵۹۲ء میں آیا۔ اس کے زیادہ حالات معلوم نہیں۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ اس وفد نے صورتِ حالات پہلے سے بہت بدتر پائی اور بہت جلد واپس بلالیا گیا۔

بدایونی اس مزاحمت کا کیسے ذکر کرتا جو پادریوں کے کام میں اکبر اور ابوالفضل کی طرف سے پیش آ رہی تھی، لیکن شاید اس سے بھی زیادہ دلچسپ اس کا واقعات کو موڑ توڑ کر پیش کرنا ہے یا اکبر کے خلاف ایسی باتیں کہنا ہے جن پر غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ کسی اور چیز کی پردہ داری ہو رہی ہے۔

ملا صاحب ۹۸۹ھ کا ذکر کرتے ہیں۔ یعنی اس وقت جب اکبر نے رامپوری کی قریب ساری منزلیں طے کر چکا تھا۔ گاؤں کشتی بند ہو چکی ہے۔ ریش تراشی عام ہے۔ بعض

خوشامدی دنیا دار ”دین اسلام مجازی و تقلیدی“ کو ترک کرنے کے عہد نامے لکھ رہے
عوام میں مشہور ہو گیا ہے کہ بادشاہ نبوت بلکہ الوہیت کا دعویٰ دار ہے۔ ملا شیری
کے اس شعر کو لکھے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے ۵

بادشاہ امسال دعویٰ نبوت کردہ است

گر خدا خواهد پس از سالے خدا خواهد شدن!

اور ملا صاحب اس سال کے ضمن میں لکھتے ہیں۔ ”دریں ایام بجماعت نماز واذان کج

ہر پنج وقت برائے خاطر جماعت در دربار می گفتند۔ بر طرف شد“ یعنی کم از کم اس

زمانے تک تو عین دربار میں پانچ وقت تک نماز باجماعت ادا ہوتی تھی!!

اسی طرح انھوں نے ایک جگہ حکیم مصری کا قطعہ نقل کیا ہے۔ جن دنوں و آخر

حکومت میں اکبر دیر تک لاہور میں مقیم تھا تو اس نے قلعہ لاہور میں دیوان عام کے

سامنے ایک مختصر سی مسجد بنوا دی تاکہ جو لوگ کارِ ضروری میں مشغول ہوں انھیں نماز

کے لیے دور نہ جانا پڑے۔ اس پر حکیم مصری نے ازراہ تمسخر کہا ۵

شاہ ماکر و مسجدے بنیاد ایہا المومنین مبارک باد

واندریں نیز مصلحت دارد تا نمازاں گزارد بشمارد!

ملا صاحب اور حکیم صاحب جو چاہیں حاشیے چڑھائیں، لیکن خیر ان کے اس

بیان سے ضمناً اس بات کا پتا لگ گیا کہ اس زمانے میں جب عیسائی مؤرخین کہتے

تھے کہ شہر لاہور میں کوئی مسجد نہیں رہی، اور سب مسجدیں ہاتھی گھوڑوں کے اھٹیل

بنادیے گئے ہیں۔ اس وقت خود اکبر نے قلعہ شاہی میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی!!

بدایونی نے بیان واقعات میں اس طرح قطع و برید اور کج نگاہی سے کام لیا

ہے کہ اس کی روئداد کو اکبر کی کامل اور صحیح مذہبی تاریخ سمجھنا انصاف کے خلاف

ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر کے مذہبی آئین و احکام میں فقط وہی باتیں مستند اور اہم

ہیں جنہیں درباری مؤرخ نے آئین اکبری میں درج کیا۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

ایک تو ویسے ہی ظاہر ہے کہ ان باتوں کو کیسے اہمیت دی جاسکتی ہے اور مستند

مانا جاسکتا ہے، جن کے ماننے والا ان کا اقرار نہ کرے۔ وہ آئین ہی کیا، جن کا اعلان نہ کیا جائے اور وہ احکام ہی کیا، جو نافذ نہ ہوں اور ملک کے دستور العمل میں درج ہو کر عمال و حکام کی راہنمائی کا ذریعہ نہ بنیں۔ دوسرے آئین اکبری کو بغور دیکھنے سے صاف نظر آجاتا ہے کہ اس میں حقیقت حال کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ اس میں مذہبی امور کے متعلق کسی مہمل، احمقانہ اور شعائر اسلامی کے مخالف احکام ہیں اور اکبر کو مورد اعتراض کرنے والی باتیں ہیں۔ اس کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ جن چیزوں کا اکبر قائل تھا اور انھیں جاری کرنا چاہتا تھا، وہ آئین اکبری میں موجود ہیں۔

اکبر کے مذہبی آئین و احکام کی نسبت معتبر معلومات تو آئین اکبری میں ملیں گی۔ ان کے علاوہ جو کچھ بدایونی کی تاریخ یا رنگینہ یادریوں کی تحریروں میں ملتا ہے وہ یا تو غلط بازاری افواہوں پر مبنی ہے یا ان نیم بخت تجاویز کا رنگ آمیز بیان ہے جو بادشاہ یا اس کے مستند درباریوں کے سامنے پیش ہوئیں، لیکن احکام کا درجہ نہ حاصل کر سکیں۔

علماء کے محض نے اختلافی مسائل میں فیصلہ کرنے کا حق اکبر کو دے دیا تھا۔ جب ہندو، جینی اور پارسی سادھو اور اہل علم مذہبی مجالس میں شریک ہوئے تو ان میں سے بعض نے بادشاہ کو جلت گرو کہنا شروع کیا اور اپنی کتابوں سے ثابت کیا کہ وہ اقوام و ادیان کے اختلافات مٹائے گا۔

خوشامدی درباریوں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اکبر کو یہ نظریہ ویسے بھی پسند ہو گا کہ دنیوی حکومت کے ساتھ ساتھ وہ روحانی راہنمائی بھی کرے۔ چنانچہ بالآخر اس نے لوگوں کو مُردید کرنا اور ان کے لیے احکام جاری کرنا شروع کر دیا۔ مُردیدین شاہی کے اس نظام (System) میں اکبر کا جو مقام تھا اور اس کی بنیاد پر جو اقوام الناس میں پھیلنے ان کی بنیاد پر مشہور ہو گیا کہ اکبر نبوت کا دعویٰ دار ہے اور شیری نے لکھا ہے شاہ ماہ سال دعویٰ نبوت کر دیا۔ گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن یہی شیری بعد میں اکبر کے مُردید ہوئے اور مثنوی ہزار شعاع بہ طریق تدریس پیش

کی۔ شاید انھوں نے دیکھا ہو گا کہ اکبر نبوت کا دعویٰ دینا نہیں اور یہ مریدی کا سلسلہ محض عقیدت و خوشامد کا اظہار ہے۔ بدایونی بھی جو آخر عمر میں اکبر کے مذہبی خیالات کا سب سے بڑا مخالف ہو گیا تھا اکبر سے لفظی دعویٰ نبوت منسوب نہیں کرتا بلکہ اکبر کے احکامات کا ذکر کر کے لکھتا ہے: ”ایں ہمہ باعث نبوت شد اما بہ لفظ نبوت“۔

اکبر نے دعویٰ نبوت سے ہمیشہ انکار کیا، لیکن مریدان شاہی کا جو سلسلہ اس نے شروع کیا اور اس کے جو عجیب و غریب قواعد و ضوابط مقرر ہو گئے، ان میں صدہا گمراہیوں اور ہزار ہا غلط فہمیوں کی گنجائش تھی اور صرف اکبر ہی نہیں بلکہ اس کے مشیروں مثلاً علامی ابوالفضل کو تاریخ افسوس اور ملامت سے یاد کرتی ہے۔

اکبر اور اس کے خوشامدی درباریوں نے جو نظام ترتیب دیا تھا، انگریز مورخین اسے دین الہی کا نام دیتے ہیں، لیکن ابوالفضل جو بدایونی کے بیان کے مطابق اس طریقے کا خلیفہ اعظم تھا، یہ نام استعمال نہیں کرتا اور اکبر کے روحانی کارناموں کو آئین اکبری میں ”آئین رہنموی“ کے تحت درج کرتا ہے۔ ابوالفضل مختلف مذاہب کے بنیادی اتحاد کا ذکر کر کے لکھتا ہے کہ جب بنی نوع انسان کی خوش قسمتی سے ایسا وقت آجاتا ہے کہ حق پرستی کا دور دورہ ہو تو بادشاہ دوراں ہی کو ”پیشواۃ جہان معنی“ بخش دی جاتی ہے جو جلوہ زار کثرت میں وحدت کا سررشتہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ اکبر بادشاہ کو یہ ”پیر تو اگلی“ میسر تھا۔ اور اگرچہ اس نے اپنے آپ کو ایک عرصہ تک اس کام سے علیحدہ رکھا، لیکن جو مشیت ایزدی ہو، وہ پوری ہو کے رہتی ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اب تو ”راہنموی“ کو رضا مندی ایزدی سمجھ کر ہدایت کا دروازہ کھول رکھا ہے اور تشنہ لبوں کو سیراب کرتا ہے۔ بہت سے ارباب تجرد مثلاً سنیا سی، یوگی، صوفی اور حکیم اور ارباب تعلق مثلاً سپاہی، سوداگر اس کی بدولت حقیقت سے ہمکنار ہیں۔ اور اس کی نگاہ اور فیض انقاس سے وہ فیوض حاصل کرتے ہیں جو چلوں سے بھی حاصل نہیں ہوتے۔ بادشاہ لوگوں کو مرید ہونے سے روکتا ہے اور بارہا ان سے

کہتا ہے کہ مجھے کیا حق حاصل ہے کہ خود کہیں پہنچے بغیر دوسروں کی رہنمائی کا کام بھروسے
لیکن لوگ نہیں مانتے اور ہزاروں اس کی مریدی میں داخل ہو گئے ہیں۔ جب کوئی
بہت اصرار کرتا ہے اور بادشاہ اس کی پیشانی پر اخلاص و راستی کا نشان دیکھتا ہے
تو اس کی بیعت قبول کرتا ہے۔ بیعت اتوار کے روز جب آفتاب نصف النہار پر ہو
لی جاتی ہے۔ مرید اپنی دستار ہاتھ میں لیے بادشاہ کے قدموں پر سر رکھ دیتا ہے۔ گویا
بزبان حال یہ کہتا ہے کہ میں نے خود آرائی اور خوشنق گزینی کو ترک کیا۔ عاجزی اختیار
کی اور دروے جاں بخش کی تلاش میں آیا ہوں۔ بادشاہ دست نوازش دراز کر کے طالب
کو اٹھاتا ہے۔ اس کی دستار کو اس کے سر پر رکھ دیتا ہے اور ایک شخصت خاص جس پر
اسم اعظم اللہ اکبر کندہ ہے اسے عطا کرتا ہے۔

بادشاہ نے اپنے مریدوں کے لیے جو آئین و اصول وضع کیے تھے وہ ابوالفضل
کے بیان کے مطابق حسب ذیل تھے :-

”آئین ارادت گزیناں ہنگام دیدار ہم آنکہ یکے اللہ اکبر گوید و دیگرے جل جلالہ سراید۔
ہمگی قدسی بیچ آنست از صحرایہ ہستی فراموشی نیارند۔ یاد کرد الہی سیراب دل و تر زبان
و شیریں کام باشند و نیز بفرمانش آن پیشوے آگاہ دلائل ہشیار خرام آتھے کہ مردم پس از
فرو شدن بکار بُرند و در زندگی سرانجام و ہند و توشہ واپس سفر پیش رواں شود۔ ہر
سال روز ولادت انجمن بر سازند و خوان گوناگون نعمت برکشند۔ دست نواں برکشایند و
زاد راہ دراز آمادہ گردد و نیز بآئین مقدس در تا خوردن گوشت ہمت گمارند و بر رخ
در ہماں ہنگام کہ ہنگنان را بار دارند دست بدینا لایند۔ لیکن در ماہ ولادت خود
نزد آن نشوند و نیز پیرامون کشہ خود نگردند۔ و بخوردن آن نشایند و باقصاب و
ماہی شکار و کنجشاک گیر ہم کاسگی نکنند۔ و آبستن و کن سال و نالی و نارس نہ پرورند۔
مریدوں کی بیعت کا جو طریقہ تھا۔ اُسے ابوالفضل نے وضاحت سے بیان کر دیا ہے
اس میں کسی تحریری بیعت نامہ کا کوئی ذکر نہیں لیکن چونکہ سارا سلسلہ بادشاہ سے اظہار
عقیدت کا تھا آگے چل کر بعض وفاسخاںوں نے اس میں نئی جڑیں پیدا کیں۔ بدایینی

۱۵۸۲ء کے واقعات کا ذکر کر کے سندھ کے حاکم مرزا جانی کی نسبت جسے عبدالرحیم خاناناں نے شکست دی تھی۔ اور جواب یہ علاقہ اکبر کے صوبیدار کی حیثیت سے حاصل کرنا چاہتا تھا، لکھتا ہے: ”تاکار بعد از دہ و وازدہ سال بجائے رسید کہ اکثر مخالفین چون مرزا جانی حاکم تہ و دیگر اہل ارتداد خط خود نوشتہ دادند بایں مضمون ہندہ صورت۔ منکہ فلاں بن فلاں باشم۔ بطوع و رغبت و شوق قلبی از دین اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدران دیدہ و شنیدہ بودم۔ ابرا، و تبرہ نمودم و در دین الہی اکبر شاہی در آدمم و مراتب چہارگانہ اخلاص کہ ترک مال و جان و ناموس و دین باشد قبول کردم و ایں خطوط کہ لعنت نامہ پیش نبود۔ بختہد شرع جدید سپردہ باعث اعتماد و تربیت ایشان مے شد۔“ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ خوشامد اور دربار داری کے کرشمے تھے یا ممکن ہے کہ جانی خاں کو صحیح صورت حالات سے واقفیت نہ ہو اور اس نے عام افواہوں پر قیاس کر کے نئے گل بوٹے پیدا کیے ہوں، لیکن ابوالفضل کے تفصیلی بیان سے ظاہر ہے کہ بادشاہ کی طرف سے اس طرح کے بیعت نامہ کوئی طریقہ جاری نہ ہوا تھا۔

اکبر کے احکام عمومی | اکبری طریقہ اور مرد و خجہ مذہب اسلام میں سب سے وسیع خلیج مریدان شاہی کے ان شعار و اعمال میں نظر آتی ہے، جنہیں ہم نے گزشتہ اوراق میں آئین اکبری سے نقل کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بسا اوقات بعض معمولی پیر اور مرشد بھی اپنے مریدوں کو (کچھ وقت کے لیے) یاد دہانی طور پر گوشت خوری ترک کرنے اور اس طرح کے دوسرے احکام دے دیتے ہیں یا طریق بیعت اور اظہار عقیدت کے مختلف آئین بنا لیتے ہیں اور انہیں کوئی اسلام سے باہر نہیں سمجھتا اور آج سے تین سو سال پہلے تو ان معاملات میں بہت آزادی تھی۔ ایک مسلمان بادشاہ ملک کی طرف سے اس طرح کے احکام و آئین ضرور قابل اعتراض ہیں اور ضحیف اسلام کا ذریعہ، لیکن بہر کیف وہ ایک مختصر طبقے کے لیے تھے۔ اکبر کے خلاف سب سے بڑی اعتراض یہ ہے کہ اس نے اس طرح کے احکام کو اپنے مریدوں کے لیے محدود نہیں رکھا اور صرف شخصی پسند اور عقیدہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شعائر اسلام

کے خلاف کئی احکام ایسے تھے جن کی بجا آوری کے لیے سرکاری عمال مثلاً کوتوال اور صوبیدار کی مدد لی جاتی۔ آئین اکبری میں صوبیدار (یا سپہ سالار) کے نام جو ہدایتیں ہیں ان میں اس سے کہا گیا ہے:-

”دید بانی نماید که ارادت گزینان ہنگام در خوردن خردا شد اکبر گوید و بزرگ جل جلالہ
بر خواند۔ کمتر از یک سالہ گو سفند و بزر را غذا سازد و از روز زاد خویش یک ماہ از گوشت
خوردن پرہیزد۔ کشتہ خود را نخورد۔ آہستہ کہ مردم پس فروشندگان بکا بہند۔ ہر سال
روز زاد سامان نماید و تہیدستان را کامیاب گرداند۔“

برگ عیشے بگور خویش فرست کس نیار دہیں تو پیش فرست
بچوں آفتاب از بڑے بڑے خراہ (یعنی آدھی رات اور دوپہر کے وقت) بیاس
گزاری بر نشیند و برائے ہشیار نمودن غنودگان بخبری توپ و بندوق را بہ فروش آورد
غنوان نورافروزی آفتاب عالم تاب (یعنی علی الصبح) و نیم شب کہ آغار بر شدت آں
باشد نقارہ بر نواز دو آگہی فرزند۔

صوبیدار کو یہ بھی حکم تھا کہ

و نیایش آفتاب و چراغ خورشید محمودی و آتش پرستی نداند۔

کوتوال کے نام جو ہدایتیں تھیں اس میں کہا گیا تھا کہ گائے بھینس گھوڑے اور
اونٹ کو ذبح نہ کیا جائے۔ بارہ سال سے کم عمر بچے کا ختنہ نہ ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔
و چاں کند کہ گاؤ گاؤ بیش واسپ و شتر تسلیخ نہ شود۔۔۔۔۔ و نگار د کہ کم از دو از دہ
سالہ را ختنہ کنند۔ چون ایں پایہ بگذرد بد و گذارد۔ ملنگاں و قلندراں و دکاتداران
ریاکار را بیرون کنند یا از روش باز دارد و آگاہ باشد کہ دریں میاں گوشہ نشینے
ایزد پرست آزرده نگردد۔ و برہنہ پایاں بادیہ طلب را گزندے نہ رسد۔ قصاب
و صیاد و غسال و کناس را از مردم جدا بنگاہ دہد و مردم را از آمیزہ ایں سنگدلان
سیہ دروں بر کنار دارد۔ و ہر کہ با جلا دہم کاسہ شود۔ بدست او آسیب رساند
و اگر کوچ او با نگشت (ب) و گورستان را بیرون شہر مغرب رویہ قرار دہد۔

وارادت گزیتاں را در سوگواری از کبود پوشی باز دارد و بہ سُرخ پوشیدن کہ شش
نماید۔ فروردین ماہ تاشرف (یعنی فروردین کی اُنیسویں) ہمگی آبان ماہ روز طے
تحويل (یعنی غرة ماہ شمسی) شانزدہم آن الہی جشنہا روز گرفتگی آفتاب و ماہ یکشنبہ
آدم را از تسلیخ باز دارد۔ و شکاری جانور و بیمار را ناگزیر وادارد۔ و بجان شکاری بیرون
شہر کشد۔ و الہی جشنہا را کار بندد۔ شب نوروز و شب شرف (یعنی نورزدہم فروردین)
چراغاں افزود۔ سر آغاز کہ آبستن عید باشد و بہ روز آن ہر پاسے کوس را بلند
آوانہ گرداند و در تقویات پارسی و ہندی تاریخ الہی را رواج دہد۔

بیاضادی کے معاملے میں اکبر کے بعض خیالات اسلامی طریق کار سے مختلف تھے۔
اس نے قومی بیگی کا ایک محکمہ جاری کر کے دو ذمہ دار آدمیوں کو اس امر کے لیے متعین کیا
تھا کہ وہ دولہا دلہن کے متعلق معلومات حاصل کریں۔ ابو الفضل آئین کہ خدائی کے
ضمن میں لکھا ہے۔

(وزنا شوی) دزدن و مردانہ سیدہ (نابالغ) نکوہیدہ شمار د.... و در خورشاد نکل
نزدیک ناسزا داند و بزبان قدسی چتاں رود۔ آنکہ در باستان دختر بتوام ندا سے
نعل بندگاں را زبان بند گرداند۔ تقلید پیشگان احمدی کیش را بیوگانی بین اعمام بشورش
در نیاورد۔ سر آغاز دیں بہ عنفوان آفرینش مردم زاد ماند.... و افراد از یک زن
بہر کس نہ پسندد۔ و شورش طبیعت و آشوب خانہ اندیشد۔

و دو فرہیدہ کم از برگزارد۔ یکے از حال مرداں پڑوش کند و دیگرے در کار زبان
دید بانی کند و ہر دورا قوی بی نامند و بسے باشد کہ اس شغل شگرت یکے باز گردد۔

ان قواعد و آئین کے علاوہ اکبر کی اپنی زندگی میں کئی باتیں ایسی تھیں، جو مسلمانوں
کو ضرور کھٹکتی ہوں گی۔ مثلاً اس کا گوشت خوری سے جتنے الوسع اجتناب اس کے
تورانی اور ایرانی درباریوں کو ضرور عجیب معلوم ہوتا ہوگا۔ خیر ترک گوشت خوری مذہبی
نقطہ نظر سے گناہ نہیں۔ لیکن سورج اور روشنی کے متعلق اکبر کے جو معمولات تھے،
انہیں عام مسلمان آفتاب پرستی کہتے تھے۔ اور واقعی اکبری طریق کار میں اس غلط فہمی

اکبر کے جو معمولات شعائر اسلامی سے متناقض تھے، ان کی تشریح و تاویل ہوتی اور ان کی مصلحتیں بیان کی جاتیں۔ اکبر اور ابوالفضل کے بیانات میں اسلام کی شکائیں نہیں صرف مسلمانوں کے ایک گروہ کا شکوہ ہے۔ دوسرے مذہبوں مثلاً ہندو کا اس سے زیادہ شکوہ ہے۔ مسلمانوں میں صرف ارباب تقلید کا۔ اس کے علاوہ اکبر نے بعض تبدیلیاں جن کا وہ مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں سمجھتا تھا۔ عام مسلمانوں کی تالیف قلوب کے لیے ترک کر دیں۔ (مثلاً ملاحظہ ہو تاریخ الہی کے سلسلے میں ابوالفضل کا بیان) لیکن امور ملکی میں اکبر کا جو بنیادی طریق کار تھا، مسلمان اسے بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اکبر اور ابوالفضل اسے صلح کل کہتے تھے، لیکن یہ طریقہ فقط صلح کل اور رواداری کا نہ رہا۔ کئی مسلمان بادشاہوں (مثلاً کشمیر کے سلطان زین العابدین) نے مسلمان رہتے ہوئے کامل صلح کل اور رواداری کا طریقہ اختیار کیا۔ لیکن اکبر کا راستا دوسرا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستان کے مختلف الاقوام ملک میں بادشاہ ایسا ہونا چاہیے کہ ہندو اسے ہندو سمجھیں۔ مسلمان اسے مسلمان خیال کریں اور پارسی، جین اور عیسائی سب اپنا اپنا ہم عقیدہ تصور کریں۔ مسلمان امرا، علما اور عوام کو قدرتی طور پر یہ طریق کار ناپسند تھا۔ اس کے علاوہ اگر لے آفتاب اور نور کی تعظیم و تکریم اور مریدوں کی معاشرت خوراک اور تدفین کے لیے جو انوکھے بلکہ مضحکہ خیز طریقے اختیار کیے، انھوں نے بادشاہ سے

لہ ہمارا خیال ہے کہ ان مضحکہ خیز جدتوں میں سب سے زیادہ دخل بیربر کو تھا۔ یہ ایک قابل ذکر حقیقت ہے کہ بدایونی اس معاملے میں سب سے زیادہ ابوالفضل اور بیربر کو مطعون کرتا ہے، بلکہ بیربر کو خاص طور پر گالیاں دیتا ہے۔ ابوالفضل تو خیر اکبر کا خلیفہ اعظم اور شاہی خیالات کا ترجمان تھا۔ لیکن بدایونی کا اکبر کے گمراہ کرنے والوں میں بیربر کو اس قدر اہمیت دینا بے وجہ نہیں۔ ہمارے خیال میں اکبر کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے بیربر کی شخصیت کا غلط اندازہ لگایا۔ اس پر ہمیں کچھ ہندو بیانات کے مطابق ایک کڑھندو تھا۔ ایک مخلص مرید شاہی سمجھا اور اس کے مشوروں اور رفاقت کو اہمیت دے کر یہ خیال کیا کہ ان کے اختیار کرنے سے سارے ہندو شاہی چیلے بن کر موجود رہیں گے۔

مسلمانوں کا دل کھٹا کر دیا اور بالآخر یہ حالت ہو گئی کہ جو خلافت اسلام عمل و عقیدہ بادشاہ سے منسوب ہوتا اور جو کچھ بادشاہ کے خلاف کہا جاتا۔ عوام اسے درست تسلیم کر لیتے۔

کیا اکبر نے ایک نیا مذہب جاری کیا؟ | اکبر کی مذہبی تاریخ کا اہم سوال یہ ہے کہ کیا اس نے ایک نیا مذہب جاری کیا؟ ہم

نے اس کے جاری کردہ قواعد و آئین کو تفصیل سے منضبط کر دیا ہے اور قارئین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ انھیں ایک مذہب کہا جائے یا ایک طریقہ۔ اس فیصلے میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے۔ شیخ عبدالحق محدث جیسے متقی اور محتاط بزرگ تو اسے نبوت کہتے تھے۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ اکبر نے کبھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ اکبری طریقے کا سب سے بڑا مخالفت بدایونی ان احکام کا ذکر کر کے لکھتا ہے: ”اس ہمہ باعث دعویٰ نبوت شد۔ اما نہ بہ لفظ نبوت“۔ پرتگیز یادری ۱۵۹۲ء میں لکھتے ہیں کہ ”بادشاہ سب مذہبوں کے کچھ نہ کچھ انہماک کرنا چاہتا ہے اور مشہور ہے کہ وہ اپنا مذہب جاری کرنے والا ہے“ یعنی کم از کم اس وقت تک اس نے ایک نیا مذہب جاری نہیں کیا تھا اور اس بعد تو یقیناً اکبر نے کوئی خاص نئی بات نہیں کی۔ حال کے مورخین اکبر کو ایک نئے مذہب دین الہی کا بانی سمجھتے ہیں۔ لیکن عہد اکبری کی تواریخ میں یہ نام اس صورت میں کہیں نہیں ملتا۔ بدایونی نے فقط مرزا جانی خاں حاکم تہہ کی ایک تحریر کی نقل کی ہے جس میں ”دین الہی اکبر شاہی کا ذکر ہے۔ لیکن یہ تحریر خوشامدی عہدہ داروں کی جدت طرازی تھی۔ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ اکبر کے مُردِ عام طود پر اس طرح کی تحریر لکھ کر دیا کرتے تھے (ہمارے نزدیک یہ خیال ہی کہ غان اعظم یا میراں صدر جہاں یا حضرت موسیٰ پاک شہیدؑ نے جو بقول

[بقیہ فٹ نوٹ ص ۱۱۰]

ہو جائیں گے۔ حالانکہ اس معاملے میں دیانند اور اکبر کے اصل ہی خواہ ہندوؤں کا جو طریقہ عمل تھا اس کا ذکر ہم راجا بھگوان داس اور راجا مان سنگھ کے ضمن میں کریں گے۔ اکبر نے بیربر کی صلاحیتوں کا جو قسط اندازہ لگایا تھا وہ اسی سے ظاہر ہے کہ اس نے اس مسخرے بھاٹ کو راجا کا خطاب دیا۔ اور اپنے دربار کا حکمرانی (ملک الشعرا) بنایا!

بدایونی حلقہ ارادت شاہی میں داخل تھے، ایسی تحریر لکھ کر دی ہوگی کہ وہ رسمی اسلام کو ترک کر رہے ہیں، ناقابل قبول ہے۔ یا اکبر یا ابوالفضل نے کہیں بھی شاہی احکام کو دین الہی کہا ہو۔ ابوالفضل نے سب احکام کے لیے ”آئین رہنمائی“ کی ترکیب استعمال کی ہے اور بدایونی بھی بالعموم مریدی۔ ارادہ۔ اخلاص اور روش اس طرح کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ ہماری نظر سے بدایونی کی لکھی ہوئی کوئی عبارت ایسی نہیں گزری جس میں اس نے لفظ دین الہی اکبر یا ابوالفضل سے منسوب کیا ہو۔ زیادہ سے زیادہ اس نے یہ کہا ہے: ”وروش خود را بہ توحید الہی موسوم ساختند۔“ اور اس وقت بھی مریدان شاہی کا یہ صراحت ذکر تھا اور بتایا ہے کہ ان میں طبقہ خواص کو ”موافق اصطلاح جوگیاں“ چیلہ کہتے تھے اور دوسرے (یعنی درشنیہ) وہ تھے جنہیں محل کے اندر بار نہ تھا۔ اور جو صبح کو جھروکے کے سامنے اکھڑے ہوتے تھے۔ بدایونی یہ بھی کہتا ہے کہ مریدی کی اصل کشتش منصب تھا اور اگرچہ بادشاہ اس خیال کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا، لیکن کفار ہند کا معاملہ الگ تھا۔ ان میں زیادہ سے زیادہ مرید بنانے کی کوشش کرتے۔ دوسروں (مسلمانوں) میں سے جو اس کے خواہاں ہوتے، انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرتے (وغیرہ منصب وجہ) اخلاص کفایت دیگر منظور نبود۔ و ہر چند برفہ اس قید مقید شدند با کفار ہند۔۔۔۔۔ پس نتوانستند آمد و اقوام دیگر را ہر نوع کہ خواستند۔ مالش و کوشش دادند۔

اکبری احکام کے لیے دین الہی کی ترکیب شاید پہلی مرتبہ دبستان مذاہب میں اکبری وفات سے کوئی ساٹھ ستر سال بعد استعمال ہوئی۔ سیر المتاخرین کے مصنف غلام حسین طباطبائی نے بھی بعد میں ”مذہب الہی“ کی ترکیب بے تعصبی اور طریقہ ”صلح کل“ کے معنوں میں استعمال کی۔ (مذہب الہی کہ آسائش غیر متناہی خلق دریاں بود تا عہد جہانگیر رواج داشت۔ باز از عہد شاہ جہان تعصب شروع شدہ در عہد عالمگیر شدت پذیرفت) لیکن جب اکبر کے متعلق معاصرانہ مواد اس قدر موجود ہے، اسے نظر انداز

کر کے بعد کے ایک اہل قلم کی تحریر کو جس کی اصل حال سے کوئی ذاتی واقفیت نہ تھی اہمیت دینا اصول فن کے خلاف ہے۔ بلاک مین نے سو سے یا عیاری سے آئین اکبری کے پہلے انگریزی ایڈیشن میں ”طریقہ“ اور ”روش“ کا ترجمہ ”دین الہی“ کیا جو بعد کی درسی کتابوں میں رائج ہو کر مسلمات کی حیثیت اختیار کر گیا۔

ہمارے خیال میں کوئی وجہ نہیں کہ بلاک مین کی پیروی کی جائے اور ایک غلط فہمی یا غلط نمائی کو برقرار رکھا جائے۔ اکبر کے آئین و احکام کو اکبر اور ابوالفضل ہی نہیں، بدایونی بھی دین نہیں۔ روش یعنی طریقہ (Method) کہتا ہے۔ یہ ایک مذہب نہ تھا۔ ارادت و عقیدت کا سلسلہ تھا، جس کی بنیاد ماننے والوں کی کمزوریوں یعنی طمع اور خوشامد اور رائج کرنے والے کی خود فریبی و خود پسندی پر قائم تھی۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مریدان شاہی، بالخصوص درشنیوں کا تھوڑا بہت سلسلہ اکبر کے بعد بھی جاری رہا اور فی الحقیقت جلال ملوکیت کا ایک کرشمہ تھا۔

اکبر نے مریدان شاہی کے طریقہ میں ہندوؤں کو پسند آنے والی کسی چیزیں داخل کیں۔ اور جیسا کہ بدایونی کہتا ہے، وہ اس طریقہ کو فقط ”کفار ہند“ میں رائج کرنے کے لیے کوشش کرتا۔ لیکن اگر بہمنوں اور سادھوؤں کے کہنے سے اکبر کو خیال ہو گیا تھا کہ ہندو زعماء و اکابر ”جگت گرو“ کے طریقے کو اختیار کر لیں گے تو اس میں اسے ناکامی ہوئی۔ کیونکہ شاہی درباریوں میں سے جن اٹھارہ آدمیوں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ ان میں فقط ایک ہندو تھا اور وہ بھی درباری مسخرہ بیربر! معاصرانہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام سمجھ دار اور دیانتدار ہندوؤں نے اکبر کی خام خیالی کی مخالفت کی۔ ابوالفضل راجا ٹوڈرمل کی جا بجا شکایت کرتا ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں بڑا کٹر تھا۔ راجپوت راجاؤں نے بھی جو مذہبی معاملات سے شاید اتنے واقف نہ تھے۔ اکبر کے نئے مذہب کو اختیار نہ کیا۔ جب اکبر نے اپنے طریقہ کے متعلق امرائے کبار سے مشورہ کیا۔ تو مخالفت کرنے والوں میں امیر الامرا راجا بھگوانداس پیش پیش تھا۔ اُس نے کہا کہ میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ ہندو اور مسلمان دونوں مذہبوں میں خرابیاں موجود ہیں،

لیکن یہ تو بتایا جائے کہ ان سے بہتر فرقہ کونسا ہے تاکہ ہم اس کے قائل ہو سکیں۔ چنانچہ بدایونی، جس نے یہ گفتگو نقل کی ہے، لکھتا ہے کہ بادشاہ بھی لاجواب ہو گیا۔ (اند کے معقول شدہ از شدت گزشتہ)۔

اس واقعہ کے چند سال بعد جب ۱۵۸۸ء میں راجا مان سنگھ بہار کا گورنر ہو کر جانے لگا اور اکبر نے خلوت میں خاص اظہار شفقت کر کے مریدی کا ذکر کیا تو اس نے صاف جواب دیا کہ حضور اگر مریدی سے مراد جاں نثاری ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ جان ستمیٰ پر لیے پھرتا ہوں۔ امتحان کی حاجت نہیں۔ اگر حضور کی مراد مذہب سے ہے تو ہندو ہوں۔ فرمائیے مسلمان ہو جاؤں۔ دوسرا رستا مجھے معلوم نہیں کونسا ہے کہ اختیار کروں چنانچہ اکبر ٹال گیا۔

یہ سوال کہ اکبر کا جاری کردہ طریقہ ایک نیا مذہب تھا یا فقط ایک ”روش“ (Cult) اور ”مریدی“ کا سلسلہ اس لیے اہم ہے کہ اگر یہ ایک مذہب تھا تو نہ صرف اس کا بانی، بلکہ اس کے اختیار کرنے والے اپنے پُرانے مذاہب (مثلاً اسلام) سے خارج سمجھے جائیں گے۔ لیکن ”مریدی“ کے احکام اور ریاضتیں اصل مذہب پر مستزاد ہوتی ہیں۔ ان کے اختیار کرنے سے اصل مذہب کا ترک لازم نہیں آتا۔ اگر اکبر کے جاری کردہ طریقے کو ایک علیحدہ مذہب سمجھیں تو نہ صرف اکبر، بلکہ خان اعظم، میراں صدر جہاں اور کتنے دوسروں کی نسبت یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ دائرہ اسلام سے نکل گئے تھے۔ یہ فیصلہ کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اور بدایونی کے اندراجات بغور پڑھنے سے خیال ہوتا ہے کہ جو لوگ مریدوں میں داخل ہوئے تھے، انھوں نے ترک اسلام نہیں کیا تھا اور احکام اسلامی پر عامل تھے۔ مثلاً بدایونی تو لکھتا ہے کہ ملتان کے مشہور

۱۔ منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۱۳ ۲۔ منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۶۴ ۳۔ مثلاً تبرک جسے اکبری بدعتوں میں ابو الفضل سے کم دخل نہ تھا اور جو واحد ہندو درباری تھا جس نے مریدی کی سب منزلیں طے کی تھیں۔ اسے ہندو اپنے مذہب کے خارج نہیں سمجھتے۔

بزرگ حضرت موسیٰ پاک شہیدؑ بھی رسمی طور پر بادشاہ کے مریدوں میں شامل ہو گئے تھے

”و دریں ایام شیخ موسیٰ بعد از زہد و عبادت و مجاہدت و مشغلت چندین سالہ ارادت

معارف رسمی بہ پادشاہ آورد و شخصت سپاہگری یافتہ و تسلیم نوکری کردہ داخل امر

پانصدی شد۔ (منتخب التواریخ جلد سوم ص ۹۲)

لیکن اسی صفحے پر بدایونی صاف لکھتا ہے کہ اگر شیخ موسیٰؑ بادشاہ کے حضور میں

ہوتے اور نماز کا وقت ہو جاتا تو وہ دیوانخانہ خاص و عام میں ہی اذان دے کر نماز شروع کر دیتے۔ اور کوئی انہیں کچھ نہ کہہ سکتا!

اسی طرح بدایونی کے بیان کے مطابق میراں صدر جہاں سلسلہ میں اپنے دو

بیٹوں کے ساتھ ”حلقہ ارادت“ میں داخل ہوا، لیکن مکتوبات خواجہ باقی باللہ کے پڑھنے

والے جانتے ہیں کہ اس سے پانچ چھ سال بعد یعنی اکبر کی زندگی میں وہ حضرت خواجہ

کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور انھوں نے اسے ”ذکر“ سکھانے کے بعد حضرت مجدد

کے پاس ”توجہ“ کے لیے بھیجا۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ہی ظاہر ہے کہ خواہ جانی بیگ جیسے مضبوط مخالف

خوشامد کی خاطر کیا کہیں۔ مریدی اب عقیدت و وفاداری بتانے کا ذریعہ رہ گئی تھی

اس سے ترک اسلام اخذ کرنا صحیح نہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تمام سلسلہ اسلام کے ضعف کا باعث اور مسلمانوں

کے لیے بڑا رنجہ تھا۔ ملکی نقطہ نظر سے بھی، سوائے اس کے کہ ایک، بااثر طبقہ کے دل

مجرور ہوئے۔ اس سے کوئی نتیجہ مثبت نہیں ہوا۔ حیرت ہے کہ اکبر جیسا بادشاہ جو اپنے

دائرہ عمل یعنی ملک گیری و ملک رانی میں اتنا سمجھ دار اور فرض شناس تھا، خود پسندی اور

خوشامد کا شکار ہو کر کیسی کیسی حماقتوں اور لوجبیلوں کا مرکب ہوا۔ اور ابوالفضل کی

نسبت کیا کہا جائے کہ عقل کے اتنے دعویٰ کے باوجود ان خام خیالیوں کی توجہ نہ کرتا

ہے اور ان کے لیے جواز فراہم کرتا ہے!

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بالقابہ کا محکمہ اکبر کے مذہبی خیالات کی نسبت اس کی

زندگی میں اختلاف رائے تھا اور عہدِ حاضر میں بھی یہ اختلاف باقی ہے۔ ہمارے خیال میں اس معاملے میں سب سے سچی ٹلی اور منصفانہ رائے پاکستان کے مشہور عالم اور مورخ ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی کی ہے جنہوں نے اپنی کتاب *The Muslim Community of the Indo-Pakistan Sub-continent* میں اس موضوع پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ یہیں ان کی رائے سے پورا پورا اتفاق ہے اور ہم متعلقہ اندراج کا ترجمہ اردو دان حضرات کی خاطر پیش خدمت کرتے ہیں۔

”دو برہمہاؤں نے اکبر کے مذہبی خیالات کی نسبت بہت کچھ لکھا ہے۔ بعض نے زیادہ تر بدالیوں پر انحصار کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس نے اسلام بالکل ترک کر دیا اور ایک نئے مذہب کی بنا ڈالی۔ دوسروں کی رائے ہے کہ وہ مسلمان رہا۔ اور مذہب اسلام سے اس کا تجاوز (Deviation) اہم نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مصنفین نے بدالیوں کے بیانات کو زیادہ وسیع مفہوم دیا ہے۔ اس کے لیے اس کے (مغربی) مترجمین ذمہ دار ہیں۔ بدالیوں ایک ذہین اور چالاک (clever) اہل قلم تھا۔ اس میں اتنی قابلیت تھی کہ جو کچھ وہ کہے، اس سے زیادہ سمجھا دے۔ اس کے کئی اندراجات ذومعنی ہیں اور ان کا ترجمہ بڑا مشکل ہے۔ جہاں ایسی صورتِ حالات نہیں وہاں بھی اس کی کتاب کے (انگریزی) ترجمے درست نہیں اور کئی اہم الفاظ جن سے اس کے الزامی اندراجات میں کمی ہوتی ہے چھوڑ گئے ہیں بعض مصنفین نے پرتگیزی پادریوں کے جن بیانات سے اپنی رائے کے لیے تائید حاصل کی ہے، ان بیانات کو غلط یا انتہائی طور پر مبالعہ امتیازات کیا جاسکتا ہے لیکن یہ سب کچھ تسلیم کرنے کے بعد بھی ان لوگوں کی رائے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اکبر نے اسلام سے تجاوز نہیں کیا، صحیح نہیں۔ یہ سچ ہے کہ جان بوجھ کر ترک اسلام (کا اظہار) بہت خفیف ہے [It is true that of conscious abjuring of Islam there was very little.]

معلوم ہوتا ہے، اکبر کو یقین تھا کہ اسلام کا جو مفہوم اس کا تھا، وہ ان علماء کی ترجمانی سے زیادہ محقول تھا۔ جن سے اس نے اختلاف کیا۔ عبداللہ خاں ازبک کے نام کے خط میں جب اس نے ترک اسلام کے الزام پر احتجاج کیا تو غالباً اس کا اظہار دیا نہ تھا۔ اس کا ذہن پیچیدہ (Complex) تھا اور اس کی اتنی تربیت نہ ہوئی تھی کہ وہ اپنے زاویہ ہائے نگاہ کے تناقض کو کچھ سکتا۔ اُس نے کئی ایسی چیزیں کہیں بلکہ اس کے کئی معتقدات ایسے تھے، جن سے معمولاً آدمی دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ مثلاً آفتاب کے لیے اس کی تعظیم عقیدہ توحید کے منافی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اُس کا یہ خیال نہ تھا اور اس معاملے میں وہ اس ذہنی انتشار کو شاید انتہائی صورت میں پیش کرتا ہے، جو کئی مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔
(ص ۴۴-۱۴۵)

اکبر کے آخری ایام

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۵۹۵ء کے بعد اکبر کی مذہبی اور عجیبیاں ٹھنڈی پڑ گئیں" (ص ۱۴۹)۔ مریدی کا سلسلہ غالباً آخر تک جاری رہا۔ لیکن اب یہ بادشاہ سے وفاداری اور عقیدت کا اظہار زیادہ تھا مذہبی عقائد اور طریقوں کا کم۔ پروفیسر جے پداری کا جھول نے دین الہی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ خیال ہے کہ ۱۵۹۵ء میں جب قلعہ لاہور میں نوروز کا جشن منایا جا رہا تھا، آسمان سے آگ برسی (بجلی پڑی؟) جس سے شاہی سائبان اور بہت سا ساز و سامان بھی جل گیا اور بڑا نقصان ہوا۔ اس ساعقہ آسمانی کو بادشاہ کی خود پسندی اور غلط روی کی سزا سمجھا گیا۔ بادشاہ پر بھی اس کا بڑا اثر ہوا اور اس کی انانیت اور مطلق العنانی میں کمی آگئی۔

فیضی کی تفسیر غیر منقوٹ | بظاہر ڈاکٹر قریشی اور پروفیسر رائے چوہدری کی رائے
قیاس پر مبنی ہے، لیکن قرآن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔
(۱۵۹۵ء)

اور متعدد شواہد ایسے ہیں، جن سے خیال ہوتا ہے کہ ہوا کا رخ بدل چکا تھا۔ فیضی نے

۱۵۹۳ء میں کلام مجید کی تفسیر غیر منقوٹ مکمل کی جس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی دو محاصرہ سوانح عمریوں (زبدۃ المقامات اور حضرات القدس) کے مطابق حضرت مجددؒ نے فیضی کی مدد کی۔ حضرت مجددؒ کے استاد مولانا یعقوب میر فی نے اس کی تقریظ لکھی۔ خود بدایونی کے بیان کے مطابق لاہور کے مشہور عالم ”اعلم الحما“ میاں جمال تلویؒ نے (جن کی استدعا پر حضرت مجددؒ الف ثانی نے وحدت الوجود کی وضاحت کی۔ اور وحدت الشہود کا فلسفہ پیش کیا) نے بھی تفسیر میں فیضی کا ہاتھ بٹایا۔ (تفسیر شیخ فیضی را اکثرے او اصلاح داده و مربوط ساخته)۔ یہ تمام تفسیر عامۃ المسلمین کے خیالات کے مطابق ہے۔ مقدمہ میں حمد الہی کے بعد رسول اکرمؐ کی تعریف ہے، جس کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:-

”اعل مقصد و مراد صرف اللہ ہے۔ اس کے بعد رسول ہیں۔ جن کو اس نے عالم

کی اصلاح کے لیے بھیجا ہے۔ وہ مراد تک پہنچانے والے ہیں۔ ان کی تعداد کا احاطہ

نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں سب سے پہلے آدم اور آخری محمد صلعم ہیں۔ جو رسولوں میں سب سے

کامل اسرار کے سب سے زیادہ جاننے والے احوال میں سب سے زیادہ قابل تعریف،

کمالات میں سب سے بلند، ولای میں سب سے اکرم، سب سے اونچے پرچم والے محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ ہی کے لیے حمد کا لوا ہے۔ اور آپ کا مقام محمودیت

اُن کا لوا اہل ولا کا کمال اور ان کی دعا آسمان کی الواح کا نقش ہے۔“

ناظرین اس اندراج کو پڑھیں۔ اور خیال کریں کہ یہ اس شخص کی تحریر ہے، جس کی

نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ نبوت کا منکر تھا۔ جس کی وقت وفات کا بھی ذکر کرتے ہوئے

بدایونی لکھتا ہے:- ”از بس تعصب کہ در وادی الحاد و انکار داشت“۔ اور یہ بھی یاد رکھیں

کہ رسول اکرمؐ کے متعلق مندرجہ بالا عبارت اس وقت لکھی گئی۔ جب (بقول بدایونی) ان کا نام لیتا

جرم قرار دیا گیا تھا۔ اور یہ تفسیر اس زمانے کی یادگار ہے جب (بقول بدایونی) ”فقہ و

تفسیر و حدیث و خواندہ آل مطعون و مردود“ قرار دیے جا چکے تھے!

لے ملاحظہ ہو معارف و مہرۃ ۱۹۶۵ء میں جناب محمد سالم قدوائی کا مضمون تفسیر سوانح الالہام۔

بدایونی کو نظر آ رہا تھا کہ ان کے بیانات کی تردید کے لیے پچیس جزو کی تحریری دستاویز موجود ہے۔ اس لیے وہ یہاں بھی چھری چھوٹنے ہیں اور فحشی کے ذکر میں لکھتے ہیں :-
 ”تفسیر بے نقط برائے سسستن بدنامی کہ تار و درجز ابد آب دریا شستہ نگر دور
 عین حالت مستی و جنابت سے نوشت۔ دسگان آن را از ہر طرف پاٹمال ساختند“ اہل
 انصاف اس کا خود فیصلہ کر لیں کہ حضرت مجدد دیا مولانا جمال تلوی اس تفسیر کی تیاری میں
 ہاتھ بٹاتے۔ یا شیخ یعقوب صیرفی اس کی تعریف کرتے۔ جو بقول بدایونی ”حالت مستی و
 جنابت“ میں لکھی گئی اور جسے ”گتے ہر طرف پاٹمال کہتے پھرتے تھے“ لیکن بدایونی کے
 بیان سے کم از کم یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ اب ”سسستن بدنامی“ کا وقت آگیا تھا۔ اور ہوا
 کا رخ بدلا ہوا تھا!

تفسیر بے نقط ۵۹۳ھ میں مکمل ہوئی۔ اگلے سال فیضی نے مثنوی نل دمن لکھی،
 جس میں ”پونے دو سو شعر کی نعت مع کیفیت معراج اس نزاکت اور لطافت اور بلند پروازی
 کے ساتھ لکھی ہے کہ انشا پر داری اس کے قلم کو سجدہ کرتی ہے۔“

ابوالفضل اور اکبر کا بگاڑ (۵۹۶ھ)
 فیضی کی وفات ۵۹۵ھ کو لاہور میں ہوئی۔
 اکبری طریقے میں خلیفہ اعظم ابوالفضل تھا۔ اس

کے ساتھ بھی کچھ اس طرح کی واردات ہوئی جو بدلے ہوئے حالات پر روشنی ڈالتی
 ہے۔ ابوالفضل اکبر کا شاید سب وفادار اور سب زیادہ محترم علیہ ملازم تھا۔ وہ اکبر کو
 بے حد عزیز تھا، لیکن اب یکایک دونوں میں اس طرح کی بدگمانیاں اور ناچاقیاں پیدا
 ہوئیں کہ ابوالفضل نے دربار جاننا بند کر دیا بلکہ وہ خود اکبر نامہ میں بتاتا ہے کہ ایک عرصے
 تک تو وہ سوچتا رہا کہ وہ خود کشی کر لے یا سب کچھ چھوڑ کر خانہ بدوش ہو جائے!

یہ صورت حالات اکبر کے قیام لاہور کے آخری سال میں رونما ہوئی اور ابوالفضل
 کے مخالفوں نے شاہزادہ سلیم کو شکر رنجی کا ذریعہ بنایا۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ وہ وفاداری
 اور خاموشی سے خدایت شاہی میں اس طرح گن تھا کہ اس سے شاہزادہ کی خدمت میں
 حاضر ہونے اور لوازمات ادب و ظاہر داری بجالانے میں کچھ کوتاہی ہوئی۔ اس نے

اپنی کوتاہیوں کی جو وضاحت کی وہ قبول نہ ہوئی بلکہ بادشاہ نے بھی ان شکایتوں کو وزن دیا۔ حتیٰ کہ ۲۱ مئی ۱۵۹۸ء کو ابوالفضل اس حد تک گرفتہ خاطر تھا کہ اس نے دربار جانا بند کر دیا اور اپنے پرانے سے ملنا چھوڑ دیا۔ اکبر نے اسے بلایا، لیکن اس نے جلے کٹے جواب بھیجے اور اس بات کے لیے بھی آمادہ تھا کہ وہ اپنے الزام کنندہ کے ساتھ جلنے آگ میں کود پڑے۔ یہی وہ زمانہ تھا۔ جب ابوالفضل خود کشی یا خانہ بدوشی کی بھی سوچا رہا۔

ابوالفضل نے اپنے مخالف مدعی کا نام نہیں لکھا اور نہ ہی کسی اور کتاب میں یہ وضاحت ہے۔ لیکن ”اقبال نامہ جہانگیری“ (نو لکھنوی) کا مصنف جو ایک معاصر راوی ہے، لکھتا ہے کہ شیخ مبارک نے جب تفسیر لکھی تو وہ بادشاہ کو نہ دکھائی۔ اور اس کی وفات کے بعد ابوالفضل نے ”بے اجازت“ اس کی بہت سی نقلیں کر کے بلاد اسلامی میں بھیجیں ایک موقع پر اکبر کو اس کی اطلاع ہوئی۔ شہزادہ سلیم نے بھی بادشاہ کو بتایا کہ ابوالفضل کتنا کچھ ہے اور کتنا کچھ ہے۔ ”وہ دلائل و براہین خاطر نشان نمودند کہ آنچہ دریں مدت از اخلاص و کرم نگاری خودلاف سے زد، از فروغ صدق بہرہ نہ داشت۔ و زیادتش بادل آشنابود“ (اقبال نامہ جہانگیری جلد دوم ص ۴۵۷-۴۵۸) مآثر الامراء میں جو بعد کی تالیف ہے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شہزادہ سلیم ابوالفضل کے گھر آیا۔ دیکھا کہ چالیس کاتب قرآن و تفسیر لکھتے ہیں مصروف ہیں۔ وہ سب کو بادشاہ کے حضور میں لے گیا۔ ہمہ را با جزائے کتب نزد بادشاہ بردہ منظر نہ ساخت۔ کہ مارا بہ چیز ہائے دیگر می نماید۔ و چہل خلوت می رود۔ آن کار دیگر می کنند (مآثر الامراء جلد دوم ص ۴۶۱) کئی درباریوں (”مجھے از مقربان بساط عزت“) نے جو موقع کی تلاش میں تھیں جیسی پریل والا (از گوشہ و کنار بہ کنایہ مخرج مقدمات بعرض رسانیدند) [اقبال نامہ جہانگیری]

ابوالفضل نے بالآخر دربار آنا شروع کر دیا، لیکن اب اس کے دشمنوں نے زیادہ موثر حربے استعمال کیے۔ وہ اکبر نامہ میں لکھتا ہے کہ چونکہ وہ کسی کی پروا کیے بغیر اپنی رائے میں مستحکم رہتا تھا اور قوی دلائل سے وہی کہتا تھا، جس میں حکومت کی مصلحت ہو۔ اس لیے اس کے دشمنوں نے اس کے خلاف مچھوٹی بیسی باتیں کہیں اور ان کی سازشوں

کی وجہ سے "۱" پانچ جنوری ۱۵۹۹ء کو اسے دکن بھیج دیا گیا تاکہ شہزادہ مراد کو واپس لائے۔
دکن میں ابوالفضل پر جو گزری اس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔ یہاں اتنا کہنا کافی
ہے کہ دکن کی طرف ابوالفضل کی روانگی دربار کو آخری الوداع تھا۔ پھر اسے دارالخلافہ میں
زندہ قدم رکھنا نصیب نہیں ہوا!

ابوالفضل نے اپنے مخالفوں کے نام نہیں بتائے، لیکن اتنا یقینی ہے کہ وہ کافی بااثر
ہوں گے۔ اکبر کے رضائی بھائی اور وکیل مطلق خان اعظم کی ابوالفضل کی نسبت جو رائے
تھی اس کا اندازہ اس تاریخ سے ہو سکتا ہے، جو اس نے ابوالفضل کے قتل کی لکھی :-

تیغ اعجاز رسول اللہ سر باغی برید

دکن سے لکھے ہوئے ایک رقعہ میں بخشی الملک (شیخ فرید) کی بالوضاحت شکایت ہے۔
ان دنوں شیخ فرید نے بادشاہ پر کافی اثر حاصل کر لیا تھا۔ اکبر نامہ میں جہاں ابوالفضل
کے خلاف سازشوں اور ان کی وجہ سے اس کے دکن بھیجے جانے کا ذکر ہے اس سے
ایک ہفتہ پہلے بادشاہ کا شیخ فرید کے ہاں جانے اور اس کے ہمان ہونے کا بھی بیان
ہے۔ یہ شیخ فرید وہی ہیں جو سلسلہ نقشبندیہ کے بڑے قدردان تھے اور جنہوں نے
حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی خالقاہ کے تمام اخراجات اپنے ذمہ لے لیے تھے۔ یہ امر بھی
قابل ذکر ہے کہ ماوراءالنہر میں مولانا خواجہؒ سے (جن کا عبداللہ خاں ازبک بڑا معتقد تھا)
بیعت کے بعد حضرت خواجہؒ اکبر کے قیام لاہور کے آخری سال میں واپس ہندوستان پہنچ
گئے تھے۔ اور ان دنوں لاہور میں مقیم تھے۔

پریگزیشنری اور مسلمان امرا | خان اعظم اور شیخ فرید کی نسبت ہم آئندہ صفحات
میں زیادہ تفصیلات دیں گے، لیکن پریگزیشنریوں
کی تحریروں سے بھی ظاہر ہے کہ خواہ اکبر کے مذہبی خیالات کچھ ہی ہوں، آخری ایام
میں دربار اور کاروبار سلطنت پر متشرع مسلمان امرا حاوی تھے اور وہ اسلامی مفاد
کو محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔

اکبر نے پریگزیشنریوں کو تحریر و تقریر کی بڑی آزادی دے رکھی تھی اور انھوں نے

اس سے فائدہ اٹھاتے وقت تہذیب اور خوش اخلاقی کے تمام اصول نظر انداز کر دیئے لیکن عام مسلمان اُمرا کا دل ان کی بدزبانی سے جس طرح کڑھتا تھا، اس کا اندازہ ایک مسلمان امیر کے اظہار خیال سے ہو سکتا ہے جو اس نے پادری زیوریر کی تقریر کے بعد کیا۔ مسٹر پین معاصرانہ بیان کا خلاصہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

بہت سے مسلمان درباری جو اس وقت بادشاہ کے ساتھ تھے، پادری کی تقریر پر بہت بگڑے اور ان میں سے ایک نے جو پادری کا دوست تھا، اسے سمجھایا کہ جب وہ شرع اسلامی کا ذکر کرے تو اسے زیادہ احتیاط اور ادب سے گفتگو کرنی چاہیے۔ اس درباری مسلمان نے کہا:- ”یہاں مسلمانوں کے سوا کوئی نہیں اور جب تم شرع اسلامی کی مذمت کرتے ہو تو وہ تمہارے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں اور اگرچہ میں تمہارا دلی اور محکم دوست ہوں۔ جب تم ہمارے نبی کی بے ادبی کرتے ہو تو میرا بھی جی چاہتا ہے کہ تمہارے جسم میں خنجر بھونک ڈوں۔“

گو اسے اکبر کے دربار میں تین مرتبہ پادری بھیجے گئے۔ مندرجہ بالا اندراج تیسرے مشن کے متعلق ہے، جو ۱۵۹۷ء میں لاہور پہنچا اور اکبر کی وفات تک ملک میں موجود تھا۔ دوسرا مشن ۱۵۹۱ء میں بھیجا گیا، لیکن اگلے سال واپس بلایا گیا۔ اس مشن کے ارکان کو بعض شاہزادوں اور امرا کے بیٹوں کو پرتگیزی زبان (بقول ابو الفضل لا طینی زبان) سکھانے پر لگایا گیا۔ اس مشن کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے اور معاصرانہ رپورٹ کو، جو لا طینی زبان میں ہے، درج کرنے کے بعد مسٹر پین لکھتے ہیں:-

”اس (رپورٹ) سے واضح ہوتا ہے کہ خواہ پادریوں کے متعلق اکبر کا اپنا طرز عمل کیا ہو، اس کے اُمرا یقیناً ان کے مخالف تھے۔ بہت ممکن ہے کہ پادریوں نے اس خوش اخلاقی اور تدبیر کا ثبوت نہیں دیا جس کی صورت حالات متقاضی تھی اور امرا کی مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ مشن کو جاری رکھنا بے سود ہو گیا۔“

Akbar and the Jesuits by Payne P 84

P 31

۵
۶ ایضاً

اکبر کے آخری ایام میں خان اعظم وکیل مطلق اور امیر الامرا تھا۔ وہ دربار کا سب سے بااقتدار امیر تھا۔ بادشاہ کی مہراس کی تحویل میں تھی۔ دارالخلافہ میں بخشی شیخ فرید نے بادشاہ کا بڑا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ لاہور کا گورنر قلیچ خاں جس کی بیٹی سے اکبر کا ایک بیٹا دانیال بیابا ہوا تھا، سخت متشعرب مسلماں تھا۔ دکن میں مرزا عبدالرحیم خانخاناں کسی قدر آزاد خیال تھا، لیکن وہ بھی خواجہ باقی باللہ کا معترف اور عام طور پر اسی گروہ کے ساتھ تھا۔ ان امرا اور ان کے رفقاء نے کار سے ملک کی فضا کو بگڑنے نہ دیا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کی ماوراءالنہر سے واپسی (۱۵۹۷ء) کے بعد تو ملک بھر میں ایک نئی روحانی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں اور ایسا مظلوم ہوتا ہے کہ ایک بند ٹوٹ چکا ہے اور فیضانِ روحانی کا دریامو جزن ہے۔

حضرت خواجہ کے تفصیلی حالات ہم آئندہ صفحات میں دیں گے۔ اکبر کے قیام لاہور کے آخری ایام میں وہ ماوراءالنہر سے لاہور پہنچے۔ اس کے بعد انھوں نے دہلی کو اپنی دینی و روحانی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ اکبر اور اس کے امرا دکن میں کچھ عرصہ گزار کے آگرہ آگئے۔ ان دنوں آگرہ میں نقشبندیہ سلسلے کے ایک اور مشہور بزرگ تشریف لائے، جن کے حالات سے اُس زمانے کی روحانی فضا پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ بزرگ حضرت خواجہ خاوند محمود المعروف بہ حضرت ایشاں تھے۔ جن کا پُر شکوہ مقبرہ لاہور کی زینب و زینت ہے۔ وہ بعد میں کشمیر چلے گئے اور وہاں

۱۔ لاہور میں نئی انجینئرنگ یونیورسٹی سے بالکل قریب ہے۔ اور فن تعمیر کے لحاظ سے بڑا دلچسپ ہے۔ اس علاقے میں (جو ایک زمانے میں مغلپورہ کہلاتا تھا) کئی تاریخی عمارتیں ہیں۔ مثلاً نواب عبدالصمد خاں دیر جنگ، جنھوں نے بندہ بیراگی کا قلع فتح کیا تھا۔ اور ان کے بیٹے زکریا خاں حاکم پنجاب کی قبریں شرف النساء زوجہ عبدالصمد خاں کا مقبرہ، جس کے متعلق اقبال نے قصہ شرف النساء کے عنوان سے جاوید نامہ میں ایک پُر اثر نظم لکھی ہے۔ علی مردان خاں کا مقبرہ وغیرہ۔ مثلاً مار باغ بھی یہاں سے دور نہیں ہے۔

لاہور تشریف لائے، لیکن اکبر کے آخری ایام میں آگرہ میں تھے۔ ان کے حالات ان کے صاحبزادے خواجہ محمد معین الدین نے مرآۃ طییبہ میں مرتب کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب حضرت ایشاں آگرے پہنچے تو کئی امرا جن میں سے ایک خان اعظم تھا۔ اور شاہی خاندان کی کئی خواتین نے ان کی بیعت کر لی تھی۔ مورخ الذکر میں سے ایک تو سلیم سلطان بیگم تھیں (جو اکبر کے حرم میں تھیں) دوسری گلرخ بیگم (جن کی بیٹی سے اکبر نے سلیم کی شادی کر دی تھی)۔ گلرخ بیگم نے تو فرط عقیدت سے حضرت ایشاں کے لیے ایک جامہ اس طرح سی کر دیا کہ ایک ایک ٹانگے پر کلمہ شریف پڑھا گیا۔ خواجہ معین الدین کے بیان کے مطابق اکبر نے حضرت ایشاں خواجہ خاوند محمود سے اپنی فلاح کے لیے دعا۔ خیر (فاتحہ) کی درخواست کی۔ اس سے اس زمانے کی روحانی فضا کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

ابوالفضل کا انجام | ہم مخالفوں کی سازش کی بنا پر ۵ جنوری ۱۵۹۹ء میں ابوالفضل کے دکن بھیجے جانے کا ذکر کر چکے ہیں۔ چند مہینے بعد اکبر خود دکن پہنچا۔ ابوالفضل کی اس سے وہاں ملاقاتیں ہوئیں۔ ۶ ستمبر ۱۵۹۹ء میں ابوالفضل

۱۵ وہ خود ایک بڑے عالم، مشہور صوفی اور صاحب تصانیف بزرگ تھے۔ شیخ عبدالحق محدث کے شاگرد تھے۔ جب ان کے والد کو عہد شاہجہانی میں لاہور آنا پڑا تو انھوں نے کشمیر میں ان کی جانشینی کی اور بڑا نام پیدا کیا۔ تاریخ کشمیر (اعظمی) میں تفصیلی حالات ہیں۔ ان کی تصانیف میں کنز السعادات مرآۃ القلوب۔ سیر خیر البشر۔ مرآۃ طییبہ کے نام تاریخ کشمیر اعظمی کے مصحح مفتی محمد شاہ صاحب نے اضافہ کیے ہیں۔ اور فتاویٰ نقشبندیہ کا ذکر تاریخ کشمیر کے متن میں ہے۔ خزینۃ الاصفیاء میں رسالہ رضوانی کا ذکر ہے۔ سعیدیہ لائبریری ٹونک میں ان کی دو ضخیم تفاسیر ہیں۔ زبدۃ التفاسیر عربی میں اور شرح القرآن فارسی میں ہیں جن کی تفصیل معارف ماریج ۱۹۶۷ء میں قاضی محمد عمران خان صاحب کے ایک مضمون میں ملیں گی۔

بادشاہ کے ساتھ اسیر گڑھ کے محاصرے میں شریک تھا۔ جب اکبر شیر گڑھ کی فتح کے بعد شمال کو مڑا تو خانخاناں نے جو اکبر کی طرف سے دکن کی فتح پر مامور تھا، بادشاہ سے درخواست کی ابو الفضل کو میری مدد کے لیے یہاں چھوڑ جائیے۔ چنانچہ بادشاہ نے ابو الفضل کو دکن میں چھوڑا اور خود آگرے روانہ ہوا۔ بادشاہ کی واپسی کے بعد خانخاناں نے شیخ کو اس قدر وق کیا کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ شیخ کے خط اس درد و اندوہ سے بھرے ہوئے ہیں جو اسے دکن کے قیام میں اٹھانے پڑے۔ ایک خط میں بادشاہ کی نسبت لکھا ہے :-

”بخدمت دکن حسب الحکم الیہا آدم۔ اما چہ محنت ہائے کہ نکشیدم و بہ درشتیہائے

کہ ندیدم قبلہ من عساکر ہجراں غلبہ نموده است و هجوم علی العموم فرمودہ و من بکس بے یراق و سلاح در میدان ہجوم و عرصہ غموم فروماندہ۔ نہ یارائے گر بختن دارم نہ قدرت آورد بختن۔“

ایک اور خط میں لکھا ہے کہ کاش میں پیدا نہ ہوتا! تاکہ دکن کا سفر اور اس کی مصیبتیں نہ اٹھانی پڑتیں ”از محنت ہائے چرخ کج رفتار و کلفت ہائے زمانہ غدار چہ گوئم و چہ نویسم کہ چہا نئے بینم و نئے کشتم۔ حق علیم اعلام است کہ زندگی بر من گرانی کند۔ پیدا کنندہ عالم و آدم کاش کہ مرا بوجہ دمنے آورد تا محنت ہائے دکن و امنگیر حیات نئے گردید۔“ شیخ نے اس طرح کے کئی خط شاہزادوں، شاہزادیوں، بادشاہ کی ملکہ اور والدہ کے نام لکھے کہ بادشاہ سے کہہ کر مجھے واپس بلالو۔ ایک خط میں لکھا ہے کہ میں کئی عرضیاں بادشاہ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں، لیکن خانخاناں کے جو حامی دربار میں ہیں، وہ میری عرضیاں بادشاہ تک نہیں پہنچنے دیتے (جماعہ کہ اعوان و انصار اویند۔ عرضیہ مرا بنظر اقدس حضرت نئے آوردند) ایک خط میں بالتصریح بخشی الملک شیخ فرید کی نسبت لکھا ہے کہ میں بادشاہ کو سپہ سالار اور سرداروں کے تباہی کی نسبت ہزار تاکید سے لکھتا ہوں لیکن بخشی الملک کی طرف سے کوئی اور ہی مشورہ ملتا ہے (حرفے را کہ ہزار تاکید محقول حضرت اعلیٰ می سازم۔ ملازمان بخشی الملکی علی الرغم آن نوے دیگر بعض اشرف

مے رساند)۔

ابوالفضل اس کشمکش میں گرفتار تھا کہ نیرنگی زمانہ نے ایک اور کھیل کھیلا۔ جہانگیر نے الہ آباد میں اپنی بادشاہت کا ساز و سامان کر لیا۔ دربار کے کئی با اثر امراء اکبری خیالات سے متفرق تھے۔ انھیں جہانگیر سے ہمدردی تھی۔ جہانگیر کے پاس الہ آباد میں اکبر کے نمائندے میراں صدر جہاں خود جہانگیر کے پرنسے استاد اور ولی خیر خواہ تھے۔ وہ بادشاہی مریدوں میں شامل ہو چکے تھے۔ اور بدایونی نے ان کی کئی لغزشوں کا ذکر کیا ہے، لیکن اسے غالباً پورے حالات کا پتا نہ تھا۔ صدر جہاں شیخ عبدالنبیؒ کے شاگرد تھے اور یا حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی خدمت میں پہنچ چکے تھے۔ یا ایک دو سال میں (یعنی اکبر کی زندگی میں) حضرت خواجہ اور حضرت مجدد الف ثانی سے فیض یاب ہونے والے تھے۔ نئے حالات میں اکبر کو اپنا دیرینہ خادم پھر یاد آیا۔ ابوالفضل کو لکھا کہ اپنا کام اپنے بیٹے عبدالرحمن کے سپرد کر کے فوراً ادھر روانہ ہو جاؤ۔ خبر دینے والوں نے جہانگیر کو خبر دی۔ وہ ڈرا کہ اگر ابوالفضل دربار میں آن پہنچا تو اور الجھنیں پڑ جائیں گی۔ اُس نے بندھیلہ کے راجا نسلکھ دیو کو جس کے ملک سے شیخ کو گزرتا تھا، لکھا کہ شیخ کا کام تمام کر دو۔ بڑی رعایتیں پاؤ گے۔ چنانچہ وہ تین چار ہزار فوج لے کر آگیا۔ شیخ کو ان باتوں کی خبر نہ تھی اور اس کے پاس مختصر سی جماعت تھی۔ بڑی بہادری سے لڑا، لیکن معاملہ اس کے بس کا نہ تھا۔ بارہ زخم کھائے اور میدان جنگ میں کھیت رہا۔ سر جہانگیر کو بھیجا گیا اور جسدِ بے سر گوالیار کے پاس انتری میں دفن ہوا۔

اکبر کے آخری ایام میں حالات کے سدھارنے میں
خانِ اعظم مرزا عزیز کوکہ | جن اراکین سلطنت کو دخل تھا، ان میں سب سے

۱۵ ابوالفضل کے بہنوئی خواجہ حسام الدین نے منصب ترک کر کے خواجہ باقی باللہؒ کی بیعت کر لی تھی۔
 ابوالفضل اس کے بہت خلاف تھا اور خواجہ حسام الدین کو بہت دق کرتا تھا۔ انھوں نے مرشد کے پاس شکایت کی تو
 انھوں نے غلبہٴ خاطر جمع دار کہہ کر ابوالفضل (دریں چند درجہ برہم شود) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ (زبدۃ المقامات)

سربر آوردہ اکبر کا رضاعی بھائی اور وکیل مطلق مرزا عزیز کو کہ تھا۔ افسوس کہ اس کے ساتھ مورخین نے انصاف نہیں کیا۔ ابوالفضل کے متعلق اس کے جو خیالات تھے اور ابوالفضل کے عام زاویہ نگاہ سے اسے جو اختلاف تھا، اس کے پیش نظر اکبر نامہ کے مصنف سے کسی ہمدردی کی توقع بے کار ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی سے یہ توقع ہو سکتی تھی، لیکن بدایونی کی طبیعت ایسی تھی کہ اسے قبا حیاتیں اور بُرائیاں ڈھونڈنے میں زیادہ مزا آتا تھا۔ اس نے شیخ عبدالحق محدثؒ کی سند حدیث اور حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کے متعلق جس طرح طنز و تحریض کے تیر چلپائے ہیں، ان کا ذکر شیخ محدثؒ کے حالات میں آئے گا۔ مثبت باتوں میں اس کا دل نہ لگتا تھا۔ اُس نے خانِ اعظم کے مُردہ شاہی ہونے کا ذکر تو تفصیل سے اور مزے لے لے کر کیا ہے، لیکن خان نے ۱۵۹۲ء میں جو طویل خط اکبر کو اس کے مذہبی خیالات کے متعلق لکھا تھا، اُسے ایک سطر میں گول کر دیا۔ بلکہ اُس ”عریضہ در شتہ طویل الذیل“ کا ذکر اس طرح کیا کہ گویا خانِ اعظم اپنے وہموں کا شکار تھا۔ اور اسے دین کا غم نہ تھا۔ شمس العلماء آزاد نے بھی کچھ بدایونی کی مدد سے اور کچھ تنک جہانگیری کے مخالفانہ اندراجات کی بنا پر دربار اکبری میں خانِ اعظم کا اچھا خاصا کارٹون پیش کیا ہے اور اسے ایک اکٹھ سپاہی، بلکہ ایک احسان فراموش ملازم شاہی کے روپ میں دکھایا ہے۔ عہدِ جہانگیری میں بادشاہ کے باغی بیٹے خسرو سے قریبی تعلقات کی بنا پر خان کا ستارہ گردش میں رہا۔ اس لیے اس زمانے کے مورخین نے بھی اس کی شکائتیں ہی لکھی ہیں۔ کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ خانِ اعظم ایک بڑا تدبیر و داند دار اور جرات مند مشیر اکبر کا سچا ہی خواہ، اکبری بدعتوں کا سخت مخالف اور جو کہ ”ممدانِ اسلام کا سربراہ“ تھا!

خوش قسمتی سے عہدِ عالمگیری میں خانی خاں نے اس خط کا خلاصہ دے دیا، جو اکبری بدعتوں کی نسبت اس جبری دل مسلمان نے اکبر کو لکھا تھا۔ اور بعض ایسی تفصیل دیں، جن سے خانِ اعظم اور ابوالفضل اور بیربر کی حق پرست واضح ہو جاتی ہے۔ بزرگیز مشنریوں کے بیانات میں بھی خانِ اعظم کے ایک اہم خط کا خلاصہ ملتا ہے جو

اس نے حاکم خاندیش کو لکھا اور دربارِ اکبری کے تتمہ میں بھی آزاو نے ایک قدیمی مجموعہ سے لے کر وہ عرصہ داشت درج کر دی ہے جو خانِ اعظم نے مکہ معظمہ سے فرمانِ شاہی کے جواب میں لکھی تھی۔ ترکِ جہانگیری میں خانِ اعظم کے متعلق متعدد اندراجات ہیں اور ذخیرۃ الخوانین میں بھی اس کے متعلق ایک طویل باب ہے۔ ان سب کی روشنی میں حقیقتِ حال کو دیکھنا اور خانِ اعظم کی عظمت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

خانِ اعظم مرزا عزیز کو کلتاش اکبر کا رضاعی بھائی تھا۔ اکبر ابھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ بادشاہِ بگیم (حمیدہ بانو) نے مرزا عزیز کی والدہ سے کہہ دیا کہ میرے ہاں لڑکا پیدا ہوگا تو اسے تم دو دھ پلانا۔ اکبر کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو انھوں نے اکبر کو دو دھ پلانا شروع کیا اور زیادہ تر انھی نے یہ خدمت انجام دی۔ اکبر کی پیدائش کے تھوڑی دیر بعد ہمالیوں اور بادشاہِ بگیم ایران چلے گئے۔ اور اکبر کی نگہداشت مرزا عزیز کی والدہ اور والد کے سپرد کر گئے۔ وہ اسے لے کر ہمالیوں کے بھائی مرزا عسکری کے پاس بچے اور بچے کی خبر گیری کرتے رہے۔ دو ڈھائی سال بعد ہمالیوں ایران سے افغانستان آیا اور کابل فتح کر لیا تو اکبر اپنی حقیقی ماں اور باپ سے ملا۔ لیکن بچے کی نگہداشت اب بھی مرزا عزیز کی والدہ کے سپرد تھی۔ اکبر پونے پانچ برس کا تھا، جب ہمالیوں کے خلاف اس کے دوسرے بھائی کامران نے بغاوت کر دی۔ کامران اس وقت کابل کے اندر تھا اور ہمالیوں باہر گھیرا ڈالے تھا۔ بے در دج چانے یہ ظلم کیا کہ جس مورچے پر گولوں کا زور تھا، وہاں دیوار پر محصور بچے کو بٹھا دیا۔ لیکن اس وقت بھی مرزا عزیز کی والدہ نے بڑی محبت اور وفاداری دکھائی۔ اس نے بچے کو گود میں لیا اور جدھر سے گولے آرہے تھے، ادھر کو پشت کر کے بیٹھ گئی تاکہ اگر گولہ لگے تو پہلے مجھے لگے اور پھر بچے کو اکبری اقبال سے یہ مرحلہ بھی گزر گیا۔ اکبر پیار سے مرزا عزیز کی ماں کو جی جی کہتا تھا۔ ”اور بڑا ادب بلکہ ماں سے زیادہ خاطر کرتا تھا“ (دربارِ اکبری)

اکبر اور مرزا عزیز ہم سن تھے اور بچپن میں اکٹھے کھیلے تھے۔ اکبر تخت نشین ہوا تو

اس نے اس خاندان سے یگانگت قائم رکھی۔ مرزا عزیز کے والد شمس الدین کو آنکھ (رضائی باب) کا خطاب دیا۔ اپنی والدہ اور دوسری بیگمات کو جو ابھی کابل میں تھیں لانے کے لیے بھیجا۔ پنجاب کا صوبیدار مقرر کیا۔ بیرم خاں کو شکست اسی نے دی۔ اس پر اکبر نے اسے خانِ اعظم کا خطاب دیا۔ اور جب وہ ۱۵۶۲ء میں ادب خاں کے ہاتھوں مارا گیا تو اکبر نے مرزا عزیز کی بہت دلداری کی۔ چند روز بعد خانِ اعظم کا خطاب عطا کیا۔ ہمیشہ پیار سے اسے مرزا عزیز یا مرزا کو کہہ کرتا تھا۔ اسے ہر وقت مصاحبت میں رکھتا۔ ہاتھی پر سوار ہوتا تو اکثر اسی کو خواصی میں بٹھاتا۔ مرزا کو کہ بھی اپنے آپ کو بادشاہ کا عزیز بلکہ بھائی سمجھتے تھے۔ اکبر کے ساتھ کھیل کود کر جو ان ہوئے تھے۔ صاف گوئی ان کا ترکانہ شیوہ تھا۔ جو سمجھ میں آتا، خواہ وہ آداب شاہی کے خلاف ہو یا موافق بدھڑک کہہ دیتے۔ اکبر بھی اس سے بُرا نہ مانتا۔ بلکہ کہتا کہ میرے اور مرزا عزیز کے درمیان دودھ کا دریا بہہ رہا ہے۔ اگر وہ مجھ پر تلوار کھینچ کر بھی آئے، تو جب تک یہ وار نہ کرے۔ میرا ہاتھ اس پر نہ اٹھے گا۔ [در بار اکبری]

خانِ اعظم کی تعلیم و تربیت توجہ سے ہوئی۔ وہ نہ صرف فنونِ سپاہگری سے پوری طرح واقف تھا بلکہ مورخین اس کی انشا پر داری اور لطیفہ گوئی کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ بدایونی نے بھی زمرہ شعرا میں اس کی دل کھول کر تعریف کی ہے بلکہ لکھا ہے ”وہ بضم عالی و ادراک بلند او کے دیگر ازامر انشاں نئے دہند۔“ اور کئی شعر درج کیے ہیں۔ جن میں سے دو نقل کرتے کو جی چاہتا ہے۔

چوں نشد حاصل مرا کام دل از ناموس و ننگ
بعد ازین خواہم زدن بر شیشہ ناموس سنگ

اور گشت بیمار دل از درد و غم تنہائی اے طبیبِ دل بیمار چہ فرمائی؟
علمِ سیر و تاریخ میں بھی اسے پورا دخل تھا، لیکن اس کا اصل مرتبہ بطور ایک سپہ سالار اور رکنِ سلطنت کے تھا۔ اس نے کئی لڑائیوں میں حصہ لیا اور کارہائے نمایاں کیے۔ گجرات کی فتح میں اس کا ہاتھ تھا۔ اور جب ایک زمانے میں وہ تھوڑی فوج کے ساتھ

غنیم کی بے شمار جمعیت کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا اور اسے پہن میں محصور ہوتا پڑا تو اکبر فتحپور سیکری سے مارا مار کر تاشتر سوار فوج لے کر اس کی کمک کو پہنچا۔ اور ستائیس دن کی منزلیں اس طرح نو دن میں طے کیں کہ مورخین اسے عجائب روزگار میں شمار کرتے تھے۔ اس کے بعد جب طریقہ داغ اور اکبر کی بدعتوں کی وجہ سے اس کے خلاف بہار و بنگال میں بغاوت ہو گئی تو باوجودیکہ خان اعظم نے داغ کی مخالفت کی تھی اور دربار اکبری کی نئی روش سے وہ متفق تھا، اُس نے بطور ایک وفادار رکن سلطنت کے جان کو خطرے میں ڈال کر اس بغاوت کو فرو کیا۔

تاریخ میں خان اعظم کا بلند مقام اس لیے ہے کہ اس نے عہد اکبری میں قریب قریب وہی دینی خدمت سرانجام دینے کی کوشش کی جو علاء الدین خلجی کی محفل خاص میں علاء الملک کو تو ال سے ظہور میں آئی۔ بظاہر وہ اس میں ناکام رہا۔ کیونکہ اکبر کے ساتھ ابوالفضل جیسے اہل علم تھے، لیکن اپنے فریضہ کی ادائیگی میں اس نے علاء الملک سے کم جرأت نہیں دکھائی اور زیادہ قربانیاں دیں اور بالآخر حالات کو بہت حد تک سدھار میں کامیاب ہو گیا۔

خان اعظم جب بنگالہ سے فتح پور واپس آیا تو مذہبی بحثیں نوروں پر تھیں۔ بدایونی لکھتا ہے:-

در نہم محرم سنہ تسعین و تسمایہ (۹۹۰ھ) اعظم خان از بنگالہ آمد۔ و شبے در اثنائے محاورہ باو گفتند کہ ما دلائل قطعی بر حقیقت تنازع یافتہ ایم۔ شیخ ابوالفضل خاطر نشان شما خواہد کرد۔ او ہم قبول نمود۔ (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۰۰)

ممکن ہے خان اعظم نے (دوسروں کے سامنے) بادشاہ کی تردید مناسب نہ بھی ہو۔ لیکن بدایونی کا یہ بیان کہ خان اعظم تنازع کا قائل ہو گیا تھا، قرآن کے خلاف ہے۔ ذخیرۃ الخوانین کا مصنف جو خان اعظم کا جانتے والا تھا۔ اس کی نسبت لکھتا ہے:-

خان اعظم در رسوخ دین و اسلام و تعصب در مذہب اہل سنت بے نظیر بود۔ اس کے علاوہ خود بدایونی آگے چل کر خان اعظم کی نسبت لکھتا ہے کہ جب وہ

بنگالہ سے فتحپور آیا تو اس نے مذہبی معاملات کے متعلق "سخنان درشت" کہے۔ اور "متعصبانہ" (ذرا بدالیونی کا انتخاب الفاظ ملاحظہ ہو) شیخ ابوالفضل اور بربر کو بادشاہ کے حضور میں گھسیٹ لایا۔ بدالیونی کی اصل عبارت حسب ذیل ہے:-

"چوں در مرتبہ اخیر کہ از بنگالہ بہ فتحپور آمدہ۔ سخنان درشت در وادی مذہب و ملت گفتہ۔ متعصبانہ شیخ ابوالفضل و بربر را بحضور بادشاہ پیش کشیدہ و سخنان

بجائے عجب رسانیدہ" مخاطب خاص و عام بود (ص ۳۸۷)

منتخب الباب میں خافی خان، جس نے خان اعظم کی مکہ معظمہ والی عرضداشت کا پہلی مرتبہ خلاصہ پیش کیا۔ اور جس کے سامنے بعض ایسی تحریریں ہوں گی، جو اس وقت دستیاب نہیں ہیں۔ سئلہ کے ضمن میں خان کی نسبت لکھتا ہے:-

"و در ریش تراشیدن و سجدہ نمودن خلاف امرائے دیگر کہ اطاعت امر مے نمودند بعمل نیارودہ ریش را دراز گذاشتہ بود۔ و مدام بامقربان حضور خصوص بامشیخ ابوالفضل و فیعی دریں مادہ نزاع دینی داشت۔ لہذا ہر دو برادر و مقربان دیگر ماندن اور حضور مصلحت ندانستہ تجویز موبہ داری احمد آباد بعد تسخیر آن بمیان آوردہ" اور انہی بادشاہ جہاں شاہ خاندہ

خان اعظم کو بادشاہ سے جدا کرنے کے لیے جب اس کے مخالفوں نے اسے گجرات بھجوا دیا تو وہ چھ سال تک دارالسلطنت میں نہ آیا۔ حالانکہ قاعدہ تھا کہ اطراف کے گورنر گاہ بگاہ حضور میں آتے رہیں۔ اس کی طلب میں کئی فرمان گئے، لیکن پھر بھی نہ آیا۔ ایک خط میں تو طنز آویہ لکھا گیا: "مگر ریش تو گرانی میکند کہ نمی آئی"۔ اس نے جواب میں ایک سخت خط لکھا (بقول بدالیونی) "ادع رضہ درشتے طویل الذیل در جواب ارسال نمودہ"۔ افسوس کہ ملا صاحب نے یہ اہم خط نقل نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اپنے متعلق معمولی خط (جسے کہ فیضی کے نوشتے) بھی درج کتاب کرتے ہیں۔ ورنہ ان کے اس بیان کی قلعی کھل جاتی کہ "وہ بے بخاطرش راہ یافت و بعضے از اہل نفاق نیز از بادشاہ نسبت باو سخنان گفتہ از جا بردند"۔ اس ضمن میں شمس العلما آزاد نے خان اعظم کی ایک ایسی عرضداشت کا خلاصہ

دیا ہے۔ (دربار اکبری ص ۱۲۷) جو ان کے بیان کے مطابق اس نے مکہ معظمہ کو روانگی سے پہلے، بلکہ "عین روانگی کے وقت لکھی" لیکن فی الحقیقت یہ خلاصہ خانی خاں کی اس تلخیص کا ترجمہ ہے، جو اس نے مکہ معظمہ والی عرسداشت کی تھی۔ روانگی سے پہلے جو طویل الذیل "عریفہ درشتہ" لکھا گیا، اس کے مفہوم کے متعلق ہمیں فقط دو سطریں تاثر الامرایں ملی ہیں۔ جہاں گرانی ریش والے فقرے کا ذکر کر کے لکھا ہے۔ "گوئید مزار ہم در مقدمہ مذہب حرفہائے پوست کندہ و تند نوشت، تا اینجا بجائے عثمان علی فضیٰ ابو الفضل راقرار دادہ اند۔ آیا بجائے شیخیں کرامی گرفتہ اند۔" (جلد اول ص ۶۸۳، ۶۸۴)

بادشاہ سے خان اعظم کی یہ خط و کتابت جاری تھی کہ اس نے جو ناگزیر چڑھائی کی۔ اسے فتح کر لیا اور قریب کے بعض ہندو راجاؤں کو شکست دے کر بڑا زرو مال جمع کیا اور تمام اہل و عیال کو لے کر دیو کی بندرگاہ سے مکہ معظمہ کو روانہ ہو گیا۔ بدایونی کے خان اعظم کے متعلق جو خیالات تھے، ان کا اندازہ ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو اس نے "عریفہ درشتہ طویل الذیل" کی نسبت لکھے۔ لیکن چونکہ خان کی مکہ معظمہ کو روانگی سے اکبر پر چوٹ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ تاریخ لکھی۔

بہ جائے راستاں شد خان اعظم و لے در زعم شاہنشاہ کج رفت
چو پرسیدیم ز دل تاریخ این سال . بگفتا میرزا کو کہ بہ حج رفت
اور آگے ایک فقرہ بڑھا کہ خان اعظم کے متعلق بھی اپنا مافیہ ظاہر کر دیا "و این
کار اورا کہ از کار سلطان التارکین ابن ادہم مے خمر دند آخر رفہ و تار فہ مسادی بود"
(منتخب التواریخ جلد دوم ص ۱۲۸)

خان اعظم مکہ معظمہ چلا گیا تو اکبر کو بڑا رنج ہوا۔ اس کی ماں، جو اکبر کی رضاعی والدہ تھی غم و فکر سے نیم جاں ہو گئی۔ اکبر کو اس وجہ سے بھی بڑی تشویش تھی، لیکن اس نے بڑے حوصلے اور تدبیر سے کام لیا۔ خان اعظم کی تلخ کلامیوں کو بالکل پی گیا۔ بلا اجازت اور جن حالات میں وہ ملک سے چلا گیا تھا، اس پر بھی کسی خفگی کا اظہار نہ کیا۔ خان اعظم کے جو بیٹے اور عزیز دار السلطنت میں رہ گئے تھے، ان کے منصب بڑھا دیئے۔

اور خان اعظم کو ایک بڑا محبت بھرا، برادرانہ خط بھیجا، جو انشائے ابوالفضل دفرآؤل میں درج ہے۔ اس میں لکھا کہ ہم تمھاری آمد کے منتظر تھے۔ جب یہ بتا چلا کہ تم زیارت مزین شریفین زاد ہما اللہ شرفاً کو چل دیے اور اس دہشتناک سمندر میں اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے گئے تو بڑا تعجب ہوا کہ ایسا غلص اور ”مستحسن الخدمت ملازم ہمارے حقوق نظر انداز کر کے ہم سے اجازت لیے بغیر رخصت ہو گیا۔ اور نہ ہی اس نے اپنی والدہ شریفیہ کی رضامندی حاصل کی۔ حالانکہ سارے اہل اللہ نے جملہ معاملات بالخصوص اس طرح کی عبادات میں ماں کی رضامندی کے بغیر کوئی کام نہیں کیا اور اس کی اجازت بغیر ان عبادات و طاعات کو باعثِ ثواب نہیں سمجھا۔ اگر اس مکان مقدس تک پہنچنے کا شوق دامن گیر تھا، تو چاہیے تھا کہ اجازت لیتے۔ اور اگر بہت جلدی تھی تو کم از کم اہل و عیال کو یہاں بھیج دیتے۔ خیر، اس خاندان کی ”خدایات مستحسن“ ایسی ہیں اور بالخصوص جی جی کی خاطر اشرف ہیں اس طرح عزیز ہے کہ اگر ہمیں ملال ہوا تو وہ بھی عارضی تھا۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم پردیس میں مارے مارے پھرو۔ اور خاص و عام کے طعنے سہو۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ چاہیے کہ تم یہاں پہنچنے کا قصد کر کے ہمیں اپنی آمد سے دلشاد کرو۔ اور جی جی کے زخمِ دل پر (جس کی تمھارے فراق میں یہ حالت ہے کہ خدا کسی کو نہ دکھائے) مرہم رکھو اور دُنیوی و اُخروی عقوبت و عذاب سے نجات حاصل کرو۔

اس کے جواب میں خان اعظم نے ایک طویل عرضداشت لکھی، جس کا بدایونی نے مطلق ذکر نہیں کیا، لیکن اس کا خلاصہ بڑی معذرتوں کے ساتھ خانی خاں نے دے دیا تھا اور اب تتمہ دربار اکبری میں پوری عرضداشت چھپ چکی ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت کے خیال سے ہم اسے درج ذیل کرتے ہیں۔

کعبینہ فراشان آستان کیوان مکان لائک آشیاں خاقان جمشید نشان فریدوں نشان
کیخسرو و سلنگاہ کیومرث بارگاہ سکندر جہاد عالم پناہ انجم سپاہ آسمان خروگاہ ظل سبحانی
عزیز کو کہ بعرض می رساند کہ رائے انور بر طلب این غلام کعبینہ قاضی و صادر گشتہ بود

جان و دل را خلاصہ آب و گل ست۔ با جمعی کثیر از روسائے اخلاص و ابہتال
 بخد مت حجاب در گاہ گہمان پناہ کہ مبدائے سخا و منشاء عظمت و کبریایت فرستادن
 چون مفتی عقل و فتویٰ قاضی گمان بلکہ یقین سحر بجزاں مجوری کہ در ولایت بے دربان
 نوشتہ دادہ بود۔ بر ناقابلی فرسودہ دست ملالت در گردن کردہ ماند چوں دانست
 بہ یقین کہ احادیث تحریک اغدا موثر و کارگر افتادہ مزاج اشرف بالغیبت و تہمتی
 چند کہ بمسامع جاہ و جلال رسانیدہ از کمینہ در گاہ منحرف ساختہ اند و ہادی لہے
 عالم آرائے بساط بوسان آں در گاہ بہ قتل و قح ایں بے گناہ را ہمنوں گشتہ بہ
 خاطر رسید کہ چشم خاکسار بے مقدار را کہ در خدمت قابلان آں در کار آسمان نشان
 پرورش یافتہ بمرتبہ اعظم خانی و عزیز کوگی و حکومت گجرات سرفراز شدہ ہم بواسطہ
 ایں تشریفات بنحاک مکہ معظمہ مقادسہ منورہ رسانیدہ کہ با کافران ہندوستان حسمی را
 کہ پروردہ خوان الوان انعام و احسان بادشاہ جہاں پناہ باشد در یک خاک و
 در یک محل مدفون سازد محض گستاخی و غایت بے ادبی است و لاجرم گجرات
 را کہ آنکہ معمورہ دار السلطنت بود بہ محمدان سپردہ بخبار ملال و اختلال خویش را
 از گوشہ خاطر خاک و زبان آں آستان ملائک آشیان شمشہ دست از مطالبات آنجا
 و پائے ادب را کوتاہ ساختہ مواشی کہ محض لسیجی جاں سپاری خود از معارک کفلہ
 جمع ساختہ بود بدست عدل بیرون آوردہ از حلال ترین چیزا دانستہ سفرگزیدہ
 آں قدر جمعیت از مکاسبات مذکور بدست آوردہ کہ اگر خواہند منصب اعظم خانی
 را در بار گاہ بادشاہ روم کہ اشرف مکان ربیع مسکون بتصرف ایشانست می تواند
 خرید۔ اما خلاصہ ہمت مصروف آنست کہ وظیفہ بمر دم مستحق مصالح پاک دین آں ملک
 مقرر سازد و مدرسہ بنام نامی حجاب بار گاہ بندہ پرور حضرت خاقانی با تمام رساند کہ
 تا انقراض عالم و روزبان مورخان جہاں باشد و خود در آں مدرسہ بہ بحث علوم دینی
 و فکر شعر کہ عبارت از توحید و نعت و منقبت اصحاب بودہ باشد و دعائے دولت
 روز افزوں اشتغال می داشتہ باشد۔ امید آنست کہ از رفیق ایں کمترین

غلامان بر حاشیہ ضمیر خاکہ و بان آستان عیار سے نخواہ نشست بلکه مطلب سخن چنان
و عیب کنندگان کہ عدم بود این معدوم است بحصول خواہد پیوست کہ منصب عظم خلای
و حکومت گجرات و عشرت عزیز کوکلی را باین محروم نموده بنابر جمع مذکور است
پیشکش مدعیان نموده کہ ایشان را این نیست بدوں بندہ و تمکن کہ این کمینہ را بتر
باشد بدوں ایشان چون آخر الامریسم لطف شامل حال بوستان مطالب و مقاصد
دیگران شد و نہال امید و حقوق بندہ را بسبب محرومی خشک سالی بخشیدند -
بندہ از فدی کہ نہاد عاقبت اندیشی با بسگان آستان چند کلمہ گستاخی نموده
بعرض می رساند کہ جمعی خاطر اشرف را از دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم بگاہ و محبت
می سازد و حاشا کہ دوست باشند و کمینہ کہ نیک نامی دنیا و عقبہ می طلبد و دشمن
و واجب الاخراج باشد و الا کار دنیا باز یہیست تا پائدار بر حرف دوسہ خوش شد
گوئی آخرت بدنیافروش اعتماد نہ باید کرد - ہمہ عالم را گوش ہوش است پیش ازین
سلاطین بودہ اند کہ ہمہ صاحب تمکین بودند، ہیچ بادشاہی را دغدغہ نہ شد کہ
دعوی بختیاری و نسخ دین محمدی نماید - بل ما دلہے کہ چون مصحف اعجازی چون
چهار بار چند بار پسندیدہ باشد و شوق قمر با مثال این چیز واقع نبود مردم میکند
یارب دغدغہ چار بار بودن کدام جماعت را می شدہ باشد - قلیچ خان کہ صفائی
ظاہر و باطن و عصمت جلی دارد و صادق خاں کہ شرف رکابداری از یرم خاں یافتہ
یا ابو الفضل کہ شجاعت و حیاء بجائے علی و عثمان می تواند بود - بخداوند
بخا کیاے بادشاہ قسم جز عزیز کسی کہ نیک نامی طلب باشد نیست و ہمہ مدار بر خوش آمد
و روزگار زانیدن دارند و آنکہ نیک نامی طلب بندہ است کہ تا بود جز حرف نیک نامی باشد -

خلافت پیبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

فرقے کہ میان اکابر مجلس بہشت آمین و بندہ کمتر است ہمیں است کہ ابو القازی
و فرمان بندہ اضا فہ کردہ دیگر کا قرآن را بر مسلمانان ترجیح دادند کہ بر صحف لیل و نہا
خواہد ماند - آنچہ بر بندہ واجب است در آن تقصیر نرفت والدعا -

اس عرضداشت کی نسبت شمس العلماء آزاد نے عجیب طرز عمل اختیار کیا۔ یہ عرضداشت ان کے پاس تھی اور انھوں نے اسے شائع کر کے تاریخ دالوں کو زیر بار احسان کیا، لیکن انھوں نے اس کے اندراجات پر غور نہیں کیا بلکہ اس کے اندراجات کا اندازہ ابوالفضل کے اس طول طویل خط سے لگانا چاہا ہے جو اس نے اکبر کی طرف سے اس عرضداشت کے جواب میں خان اعظم کو لکھا۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ خیال کہ یہ خوش اعتقاد امیر حبش دینداری میں ہندوستان چھوڑ کر چلا گیا غلط ہے۔ فرماتے ہیں، ”حقیقت میں کچھ بھی نہ تھا۔ جہاں اور بچوں کی سی ضدیں تھیں وہاں ایک یہ بھی تھی۔“ اور اصل میں قلعہ خاں اور لودرمل کے ساتھ مسابقت کا جھگڑا تھا۔

اس نقطہ نظر کی جسے پہلے بدایونی نے ہوادی (حالانکہ شمس العلماء بالکل خلاف واقعہ یہ لکھتے ہیں۔ ”ملا صاحب (بدایونی) نے تو اس کی دینداری پر اپنی انشا پر داری کے سہرے چڑھائے ہیں“) مندرجہ بالا عرضداشت سے پوری پوری تردید ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ خان اعظم نے یہ عرضداشت اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور آداب و براداری کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر لکھی۔ لیکن اس کا عندیہ بالکل واضح ہے۔ اس میں ایک تو اس امر کی شکایت ہے کہ ہندوؤں کو اعلیٰ منصب دیے گئے۔ اور کہا کہ صفحات تاریخ پر یہ بات ثبت رہ جائے گی اور بدنامی کا باعث ہوگی کہ کافروں کو مسلمانوں پر ترجیح دی گئی اور بڑے دلچسپ اور مدبرانہ انداز میں لکھا کہ مجھ پر آپ نے اتنی عنایتیں کیں خان اعظم اور عزیز کو کہ بنایا۔ گجرات کی حکومت سے سرفراز کیا اور اس طرح ”مکہ معظمہ مقدسہ منورہ“ پہنچانے کا انتظام کیا۔ میرے لیے تو حضور کے ساتھ یہ انتہائی گستاخی اور بے ادبی ہے کہ وہ جسم جو آپ کے انعام و احسان سے پرورش یافتہ ہے، اسے ”کافران ہندوستان“ کے ساتھ ایک ہی جگہ سپرد خاک کیا جائے! دوسرے سید اور اس پر زیادہ زور دیا کہ جو لوگ اعلیٰ حضرت کو دین محمدی سے بیگانہ اور محنت بناتے ہیں۔ ہرگز ہرگز آپ کے خیر خواہ نہیں۔ دنیا ناپائدار ہے۔ اور ان دو تین خوشامد کو آخرت بد دنیا فروش لوگوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے پہلے بھی بادشاہ گزرے ہیں جنھیں بڑا جاہ و جلال

حاصل تھا۔ کسی کے دل میں یہ ”دغدغہ“ نہ ہوا کہ وہ دین محمدی میں ترمیم اور دعویٰ پیغمبری کا خیال کرے۔ اور سعدی کا یہ شعر نقل کیا۔

خلافتِ پیغمبر کسے رہ گزیدہ کھر گزیدہ بمنزلِ نخواہد رسید

اور قسم لے کر کہا کہ عزیز کے سوا آپ کی نیک نامی کا خواہاں کوئی نہیں۔ سب ”خوشامدگو“ اور اپنا اُتو سیدھا کرنے والے ہیں۔ میں آپ کی نیک نامی کے سوا ایک لفظ زبان سے نہیں نکالتا اور عرضداشت میں اس کی مثالیں دیں کہ میں تو اس دھن میں لگا ہوں کہ حجاز میں مستحق لوگوں کے وظیفے مقرر کروں اور حضور کے نام پر ایک ایسا مدرسہ قائم کروں جس کی مورخانِ جہاں ہمیشہ تعریف کریں اور جس میں علومِ دینی کی تعلیم اور فکرِ شعر، یعنی ”توحید و نعت و منقبت“ کے علاوہ حضور کی دولتِ روز افزوں کے لیے دعا ہوتی رہے۔

خانِ اعظم کا جو نقطہ نظر تھا اور اکبر کو جس راستے پر وہ لانا چاہتا تھا، وہ اس کی تحریک سے ظاہر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں اپنا اور دربار کے ایک گروہ کا موازنہ کیا گیا ہے اور اپنی خیر خواہی پر زور دیا ہے، لیکن یہ موازنہ کسی قرابت، خدمات یا دوسرے حقوق پر مبنی نہیں۔ دونوں کے طریقِ کار اور مذہب کے متعلق متضاد مشوروں کی بنا پر ہے۔ یہ ایک شخصی مسئلہ نہ تھا۔ اصول کا سوال تھا۔ بادشاہ کو طے کرنا تھا کہ اس کے اصل خیر خواہ کون ہیں اور اس کے لیے نیک نامی کا راستا کونسا ہے۔ بادشاہ نے جو فیصلہ کیا اس کا اندازہ اس منصب اور اقتدار سے ہو سکتا ہے جو خانِ اعظم کو داپسی پر ملا، لیکن ابو الفضل کا وہ خط جو دفترِ دوم میں خان کے نام ہے، بادشاہ کے نقطہ نظر کا اظہار ہے۔ اس میں خانِ اعظم کو ”دوستخواہ حقیقی“ کہا گیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ بادشاہ نے فرمایا کہ ”اگر اعظم خاں در درخانہ (کذا) باشد و متوجہ این خدمت شود۔ اول و اولی است۔ چنانچہ امیر لامر است۔ امیر المعاملہ نیز بود و ہمہ اینہما تاج او خواہند بود۔ یعنی معاملات اسی کے سپرد کیے جائیں گے۔ اور اسی کا طریق کار چلے گا۔“

لہٰذا اس مدبرانہ طرزِ عمل اور اس کے نتائج کا محذور الملک اور شیخ عبدالباقی کے اس طریقِ کار سے مقابلہ کریں

جو انھوں نے حجاز میں اکبر کے متعلق اختیار کیا۔

خان اعظم نے حجاز میں کار خیر کا ایک وسیع سلسلہ قائم کیا۔ ذخیرۃ الخوانین میں بہترین اہل علم اور مستند تذکرہ ہے، لکھا ہے: کہ خان اعظم نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بڑا خرچ کیا۔ اور نام چھوڑا۔ روضہ نبوی کے متعلقہ اخراجات کا حساب بنوایا اور پچاس سال کا خرچ نذر کیا۔ اسی حساب سے (مسجد نبوی کے لیے) فرش (قالین) سائبان، پردے اور سراپدے بھی۔ متعدد حجرے خرید کر وقف کیے اور شریف مکہ اور اس کے اہل و عیال کو اس قدر زر و زیور دیا کہ اس کا حساب نہیں ہو سکتا۔ (ص ۸۰-۸۱)

خان اعظم کی شخصیت پر پردہ ڈالنے میں سب سے زیادہ بدایونی کی تحریروں کو دخل ہے۔ وہ ان نیک کاموں کے بارے میں جو حجاز میں ہوئے بالکل خاموش ہے۔ اور نہ ہی اکبر اور خان اعظم کے درمیان جو خط و کتابت ہندوستان سے روانگی کے بعد ہوئی اور جس کی بنا پر وہ واپس آیا، اس کا ذکر کرتا ہے۔ بلکہ لکھتا ہے کہ خان اعظم کو شرفائے مکہ سے بڑا آزار پہنچا۔ اس کا وہ استغنا جاتا رہا۔ اور وہ واپس آکر مریدوں میں داخل ہو گیا۔ سجدہ اور دوسرے لوازم ارادت بجالایا بلکہ بادشاہ کی ہم زبانوں میں سب سے آگے تھا۔ اس کی اصل عبارت درج ذیل ہے:-

و دریں ایام اعظم خان کہ از شرفائے مکہ معظمہ آزار بسیار کشیدہ و آن استغنا بادوادہ بود از حج بازگشتہ داخل سلسلہ مریدان گشت ہم سجدہ و ہم سائر لوازم ارادت

۱۔ یہ نہ خیال کریں کہ بدایونی کبھی زمین بوس (سجود) جو آئین دربار ہو گیا تھا۔ (اور عہد جاگیر میں بھی جاری رہا) بجا نہیں لایا۔ وہ بحر الاسماء کا ذکر کرتے ہوئے اکبر کی نسبت لکھتا ہے: "مقارن ایں حال شبے در خواب گاہ خاصہ خویش نزدیک بہ پایہ تخت طلسمیدہ تا با مادر حکایات از ہر باب پر سیدہ حکم فرمودند کہ چوں در جلد اول بحر الاسماء کہ سلطان زین العابدین ترجمہ فرمودہ فارسی قدیم غیر متعارف است آں را ہم از سر نو بہ عبارتے مانوس بنویس۔۔۔ زمین بوس نمودہ بہ دل و جان قبول نمود و شروع در آن کرد و بعد از التفات بسیار وہ ہزار تک مرادی انجام و اسب بخشیدند"

(منتخب التواریخ جلد دوم ص ۴۷-۴۸)

بجا آوردہ، وداع محاسن گفت و در صحبتہا و ہم زبانہا ہمہ جا پیش بود۔ و صوبہ
غازی پور و حاجی پور جاگیر یافت و احکام مذہب نو از خدمت علامی یادی گرفت
دریں تعلیم شد عمر و سنوزا بجد ہی خوانم ندانم کے رقوم آموز خواہم شد بدیوالتش
(منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۹۸)

یہ ممکن ہے کہ خان اعظم نے آئین دربار کے مطابق سجدہ زمین بوس کیا ہو اور
یہ بھی غیر ممکن نہیں کہ بادشاہ کے وکیل ہونے کے لیے ارادت کی جو شرط تھی، اُسے بھی
اس نے پورا کیا۔ لیکن بدایونی کا یہ اظہار کہ شرفائے مکہ سے تنگ آکر اس نے اپنا نقطہ نظر
ترک کر دیا تھا اور اکبر اور ابوالفضل کا ہم خیال ہو گیا تھا، بہتان سے کم نہیں۔ یوں تو بدایونی
نے خان کے سفر حجاز کے متعلق تحریری دستاویزوں کو جس طرح نظر انداز کر دیا ہے،
اُس سے ہی اس کی صحت بیان کے متعلق شبہ پیدا ہوتا ہے، لیکن مندرجہ بالا سطور
سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے (اور جسے ہم نے خود بدایونی کی تحریر کی بنا پر قبول کر لیا تھا)
اس کے خلاف شواہد موجود ہیں۔ ابوالفضل کی نسبت خان اعظم کے جو خیالات
تھے، ان کا اندازہ اس تاریخی مصرع سے ہوتا ہے، جو خان نے اس کے قتل پر
(عہد اکبری میں) لکھا تھا۔

تیغ اعجاز رسول اللہ سر باغی بُریدا

اس کے علاوہ خان اعظم (اور اُس کے حجاز سے واپس آنے کے بعد بیشتر مسلمان
عمیداروں) کا جو طریق کار تھا، اُس پر ایک دلچسپ واقعہ سے روشنی پڑتی ہے، جو
پرتگیزیادریوں کو پیش آیا اور جس کی تفصیلات C. H. Payne کی کتاب
Alber and the Jesuits کے سولہویں باب میں بہ عنوان "ایک شاہی
فرمان" درج ہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ پرتگیز مشنریوں نے جنھیں اکبر نے اپنی زندگی
کے آخری سالوں میں گواہ سے پھر بلایا تھا۔ کچھ لوگوں (بیشتر اچھوت ہندوؤں) کو لاہور
میں تبدیل مذہب پر آمادہ کیا تھا۔ جب سالہ عمر میں قلعہ خاں پنجاب کا حاکم ہو کر آیا تو

لے یہ طلبی ظاہر طریقہ صلح کل کا کرشمہ تھی، لیکن ان پادریوں کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ پرتگیزیادریوں سے
[باقی اگلے صفحے پر]

اس نے ان کاموں میں روٹے اٹکاتے شروع کیے۔ اس پر جو پادری دارالحکومت میں تھے، اکبر کے پاس پہنچے۔ حاکمان گوا کی چند تصویریں نذر کیں اور جب بادشاہ نے انھیں خندہ پیشانی سے قبول کیا تو عرض کی کہ ایک فرمان جاری کیا جائے کہ اگر کوئی شخص عیسائی ہونا چاہے تو اس کی مزاحمت نہ کی جائے۔ بادشاہ نے یہ استدعا قبول کر لی اور ایک اہل کار سے کہا کہ پادریوں کے لیے فرمان تیار کیا جائے۔ اہل کار جب یہ فرمان تیار کرنے بیٹھا اور پادریوں نے کہا کہ اس کی ایک شق یہ ہونی چاہیے کہ جو کوئی عیسائی ہونا چاہے، وہ اس معاملے میں آزاد ہوگا۔ تو وہ اہل کار رک گیا اور کہنے لگا کہ جب تک بادشاہ سے اس بارے میں پوچھا نہ جائے، اسے درج نہیں کیا جاسکتا۔ جب چند روز بعد اس نے بادشاہ سے پوچھا تو بادشاہ نے کہا کہ جو وعدہ میں نے پادریوں سے کیا ہے میں اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا اور یہ شق فرمان میں درج کر دی جائے۔

چنانچہ اہل کار نے حسب الامر فرمان تیار کیا اور ایک اعلیٰ عہدیدار کے پاس لے گیا جو مجوزہ فرامین دیکھا کرتا تھا۔ جب اس نے یہ شق دیکھی تو وہ بھی معترض ہوا۔ اور معاملے کو لٹکاتا رہا۔ جب پرتگیز پادری اس کے پاس پہنچے تو اُس نے کہا کہ اس

(بقیہ فٹ نوٹ ص ۱۳۹)

رابطہ ضبط قائم کرنے اور ان کا خاص خیال رکھنے میں سیاسی اور عسکری منصوبے بھی پیش نظر تھے مثلاً قلعہ اسیر کے محاصرے کے وقت اکبر نے کوشش کی کہ پادری زریور کے ذریعے پرتگیزوں سے بڑی توپیں اور گولہ بارود مل جائے۔ اس کے علاوہ یہی پادری لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں اکبر کا ارادہ تھا کہ دکن کی فتح کے بعد پرتگیزوں کو ملک سے نکال دے۔ اور وہ اس ارادے کا اپنے رفقاء کے ساتھ بار بار اظہار کرتا تھا۔ (ص ۱۱۲-۱۱۳) پرتگیز پادری یہ بھی لکھتے ہیں کہ اکبر نے کئی دفعہ اپنے آدمی کو ابھیجے۔ بظاہر تو وہ سفیر ہوتے، لیکن ”ان کا اصل کام یہ دیکھنا تھا کہ پرتگیزی کیا کر رہے ہیں۔ اور ان کی عسکری طاقت کتنی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے کارندے اس وقت بھیجتا۔ جب پرتگال سے جہاز آنے والے ہوتے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان میں کیا سامان اور کتنے آدمی آئے ہیں (ص ۱۱۳-۱۱۴) غالباً ان منصوبوں میں خان اعظم اور قلیچ خاں کو دخل ہوگا جو گجرات رہ چکے تھے اور پرتگیزی خطرے سے آگاہ تھے۔

شق میں بڑی دشواریاں ہیں۔ اس سے شرع اسلامی (Mohammaden Law) کو صنف پہنچتا ہے اور حاکم لاہور (قلچ خاں) بھی اس کے خلاف ہوگا اس لیے جب تک اس کے متعلق بادشاہ سے میں خود نہ پوچھ لوں اسے درج نہیں کیا جاسکتا۔ اگلے روز جب وہ عہدہ دار بادشاہ کے سامنے پیش ہوا اور پادریوں نے کہا کہ وہ بادشاہ سے استفسار کرے۔ تو عہدے دار نے جواب دیا کہ یہ وقت اس کے لیے موزوں نہیں۔ میں بادشاہ سے علیحدگی میں استفسار کروں گا۔ پادری کہتے ہیں کہ یہ وعدہ بالکل جھوٹا تھا اور عہدے دار کی مرضی تھی کہ معاملے کو ٹکا کر اس قصے کو ختم کر دے۔

بالآخر پادری بادشاہ کے وعدے کے مطابق فرمان لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کی صورت اس طرح ہوئی کہ انھیں ایک با اثر نوجوان ایسا مل گیا، جو کسی وقت ایک پادری کا شاگرد رہ چکا تھا اور جس کی بادشاہ تک رسائی تھی۔ وہ تین مرتبہ بادشاہ کو ملا۔ اور بالآخر یہ فرمان جاری ہو گیا۔ لیکن پرتگیز پادری اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ امرائے کبار، جو زیادہ تر مسلمان تھے، اس فرمان کو ”شرع اسلام کے خلاف“ (مر ۱۵۷) سمجھتے تھے۔ اور اس کے مخالف تھے۔ انھوں نے ”بالخصوص (خان اعظم) عزیز کو کہنے“ اس کی ”شدت سے مخالفت کی“ اور اس کے اجرا پر بہت بگڑے۔

اس فرمان کے اجرا کے بعد بھی قلچ خاں نے لاہور میں پادریوں کو جو ناک چنے چھوائے۔ وہ ایک علحدہ و استمان ہے (اس کے لیے مذکورہ بالا کتاب کا انیسواں باب دیکھنا چاہیے) لیکن اس واقعہ کی جزئیات سے صاف نظر آجاتا ہے کہ اگرچہ خاص اتفاقات اور خاص وجوہ کی بنا پر کبھی کبھار ایسے احکام جاری ہو جاتے تھے۔ جن میں شرع کی پابندی نہ تھی، لیکن خان اعظم کے زمانہ اقتدار میں جو فضا دار الحکومت اور اطراف ملک میں تھی، وہ اسلام کے حق میں تھی۔ جن امور پر بادشاہ احکام صادر کر چکا تھا، ان پر شرع اسلام کی رُو سے اعتراض ہوتے تھے۔ اور یہ خیال کہ خان اعظم کے خیالات بدل گئے تھے اور وہ ابوالفضل کا ہم خیال بلکہ شاگرد و رشید ہو گیا تھا۔ واقعات کے بالکل خلاف ہے۔

بدلیوتی نے شعرا کے ضمن میں بھی خان اعظم کا تعریف سے ذکر کیا ہے، لیکن وہ بھی نیش زنی سے خالی نہیں۔ لکھتے ہیں: ”کارنامہ چنڈ از در عالم ماندہ۔ یکے ازاں عالی ہمتانہ بہ حج رفتن بود۔ اما آمدن نہ آچیناں۔“ لیکن ایک پر معنی فقرہ اور ہے۔ ”وایں ہمہ مقتضائے زمان است۔“ حقیقت یہ ہے کہ خان اعظم کا مکہ معظمہ جانا بھی مبارک اقدام تھا اور وہاں سے واپس آکر اس نے ملک میں جو فضا پیدا کر دی، اس کے لحاظ سے واپس آنا بھی کار ثواب تھا۔

خان اعظم کا زمانہ اقدار اکبر کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس موقع پر اس سے ایک سخت غلطی یہ ہوئی کہ اس نے اکبر کا جانشین جہانگیر کے بیٹے خسرو کو بنانا چاہا جس سے اس کی اپنی بیٹی بیاہی تھی۔ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ جہانگیر کے با اثر طرفداروں (مثلاً شیخ فرید) سے اس کے اچھے تعلقات ہوں گے جو انھوں نے جہانگیر کی تخت نشینی سے پہلے اس سے وعدہ لیا کہ وہ خسرو کے طرفداروں کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں نہ کرے گا۔ جہانگیر نے اس کا ایفا کیا لیکن جب اس کے باوجود خسرو نے بغاوت کر دی تو خان اعظم کی طرف پھر شبہ پڑنے شروع ہو گئے۔ اس کے علاوہ ایرانی امرا جو عہد جہانگیری میں شروع سے (جہانگیر کے بچپن کے دوست شریف خاں کے امیر الامرا اور وکیل مطلق ہو جانے کے باعث) با اثر تھے۔ اس کے تخت مخالف تھے۔ اور اس کے خلاف جہانگیر کو ابھارتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ تو اسے گوالیار کے قلعے میں قید کر لیا گیا۔ وہاں سے رہائی عجیب دلچسپ طریقے سے ہوئی۔ جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے۔ کہ عرش آشیانی (اکبر) مجھے خواب میں ملے۔ اور کہا۔ ”بابا۔ گناہ عزیز خاں را کہ خان اعظم است بہجت خاطر من بہ بخش۔“ چنانچہ جہانگیر نے اس خواب کے بعد اسے قلعہ سے بلایا۔ آزاد کر دیا اور تھوڑے عرصے کے بعد اس کا منصب بحال کر دیا۔

۱۔ بیماری کی وجہ سے شریف خاں کو زیادہ مدت امیر الامرا رہنا نصیب نہ ہوا۔ لیکن اس کا جانشین بھی ایک اور ایرانی (آصف خاں) بنا۔

عہدِ جہانگیری میں خانِ اعظم کا ستارہ گردش میں رہا۔ پھر بھی اس سے ایک ایسا کام سرانجام ہوا جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ ایرانی اہل قلم تو اس معاملے میں خاموش ہیں لیکن ذخیرہ الخوانین میں شیخ فرید بکری لکھتے ہیں کہ جہانگیر کے پہلے سالِ جلوس میں امیر الامرا (شریف خاں) نے جو وکیل مطلق ہو گیا تھا، بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ قومِ افغانہ خاندانِ مغلیہ کے خلاف ہے۔ چنانچہ عرشِ آشیانی (اکبر بھی ان کے خلاف کوشاں رہے۔ اور انھوں نے سپاہ گری چھوڑ کر سوداگری شروع کی۔ اب چاہیے کہ ملک سے ان کا اخراج کر کے انھیں اپنے وطنِ رومہ میں واپس بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اس بارے میں حکامِ اطراف کے لیے فرامین تیار ہوئے۔ لیکن خانِ اعظم نے خدمت میں عرض کیا کہ اس اقدام سے ملک میں ایک فتنہ عظیم برپا ہو جائے گا۔ اس گروہ میں کئی مومن، موجد، خدا پرست اور سپاہی ہیں۔ یہ تدابیر انسانی سے برطرف نہیں ہو سکتے۔ ممالکِ محروسہ میں ان کی تعداد کم از کم ایک کروڑ ہوگی۔ اتنے قبیلہ دار انسانوں کو بے گناہ ملک بدر کرنا گناہِ عظیم ہے۔ اور خلقِ خدا میں بھی بدنامی کا باعث۔ بادشاہ نے خانِ اعظم کی عقل و دانش پر آفرین کہی۔ اور ان فرامین کا اجرا روک دیا۔

(ذخیرۃ الخوانین حصہ اول ص ۹۸-۹۹)

خواجہ خاوند محمود (حضرت ایشاں) نقشبندی کے جو حالات ان کے صاحبزادے نے مرتب کیے ہیں، ان میں لکھا ہے کہ خانِ اعظم نے ان سے نقشبندیہ سلسلہ میں بیعت کی تھی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں دو خط خانِ اعظم کے نام ہیں جن میں ایک خاص طور پر اہم ہے۔

خانِ اعظم کی وفات ۱۰۳۳ھ ہجری میں بمقام احمد آباد (گجرات) ہوئی۔ ع۔
حق مغفرت کرے عجب آزاد مروت تھا!

شیخ ابوالفضل ۱۰۴۲ھ عیسوی میں قتل ہوا۔ اکبر اس کے بعد تین سال تک بقیہ حیات رہا۔ جہانگیر کی چھوٹی

اکبر کی وفات
اور
جہانگیر کی تخت نشینی

ترک میں لکھا ہے کہ اکبر نے مرتے وقت کلمہ شہادت دہرایا۔ سورہ یسین پڑھوا کر سُنی اور بطور ایک راسخ الاعتقاد مسلمان کے مرا۔ اس اندراج کی صحت مشتبہ ہے لیکن سفیر انگلستان سر طامس راؤ بھی جو اس واقعہ کے پندرہ بیس سال بعد ہندوستان آیا اور جس نے مقامی حالات کے متعلق ایک تفصیلی خط انگلستان کے لاٹ پادری کو لشکر شاہی سے لکھا۔ اس کا خیال ہے کہ اکبر کی وفات بطور ایک مسلمان کے ہوئی۔ اسی طرح جب پرتگیز پادری بوشلیو سے بیجا پور کے عادل شاہی بادشاہ نے پوچھا کہ اکبر کس مذہب پر فوت ہوا تو پادری صاحب نے بڑے افسوس سے کہا کہ میری تو خدا سے التجا تھی کہ ایسا نہ ہوتا۔ لیکن اکبر ہمیں غلط امیدیں دلاتا رہا اور بالآخر آپ کے دین محمدی پسہی مرا۔

اس وقت اسلام کے لیے اکبر کے عقاید سے بھی زیادہ اہم مسئلہ اس کے جانشین کے مذہب کا تھا۔ اکبر کا جانشین جہانگیر ہوا اور اس نے عہد اکبری کے بیشتر قواعد جو شرع اور اسلام کے خلاف تھے، موقوف کر دیے۔ اکبر کی زندگی کے آخری ایام میں کوشش ہو رہی تھی کہ جہانگیر کی بجائے اس کا بیٹا خسرو اکبر کا جانشین ہو۔ خسرو کی بوی خان اعظم کی بیٹی تھی اور وہ راجا مان سنگھ کا بھی قرابت دار تھا۔ ان دونوں نے اس کے حق میں کوشش کی، لیکن شیخ فرید بخاری نے جنہیں بعد میں نواب مرتضیٰ خاں کا خطاب ملا اور دوسرے مسلمان امراء نے اس موقع پر بڑی قابلیت دکھائی۔ انھوں نے نہ صرف جہانگیر کی تخت نشینی کا انتظام کیا بلکہ نئے بادشاہ سے اس بات کا وعدہ بھی لیا کہ وہ قوانین اسلام کا احترام کرے گا!

پرتگیز پادری جو اس زمانے میں آگرہ میں موجود تھے اور اکبر کو مرتے وقت ہی بستیمہ دینے کے لیے لحظہ لحظہ کی خبر منگاتے رہتے تھے، اس واقعہ کی نسبت لکھتے ہیں۔

اس نسخے کی تاریخی حیثیت مشتبہ ہے، لیکن چھوٹی ترک ہے بہت پرانی۔ اور اس کے عہد شاہجہانی کے متعدد قلمی نسخے ملتے ہیں۔ تاثر الامرا اور دربار اکبری کے مصنفین نے اس پر بڑا بھروسہ کیا ہے۔

۲۰۲۲ Mulla and the Jesuits

”امرانے بالآخر فیصلہ کیا کہ حکومت اُسی کو دینی چاہیے جو اس کا قانوناً حقدار ہے۔ چنانچہ ایک برگزیدہ امیر جسے دوسروں نے اپنا نمائندہ چنا تھا۔ شاہزادہ اجماعگیر کے پاس آیا اور امرا کی طرف سے اسے کہا کہ ہم سب آپ کی بادشاہت کی حمایت کریں گے۔ بشرطیکہ آپ اس بات کی قسم اٹھائیں کہ آپ شرع محمدی کا تحفظ کریں گے اور اپنے بیٹے (خبرو) یا اس کے طرفداروں کو کوئی سزا نہ دیں گے۔ شاہزادے نے ان شرطوں کو پورا کرنے کی قسم اٹھائی اور بہت سے پہرہداروں کے ساتھ اپنے باپ کی ملاقات کو چلا۔“

مقامی مورخین اس وعدے کا ذکر نہیں کرتے، لیکن جماعگیر نے تخت نشین ہوتے ہی جو احکام جاری کیے، ان سے شرع اسلام کی شروع سے پیروی ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً توڑک جماعگیری کے مطابق جماعگیر کا تیسرا حکم تھا کہ جو لوگ لاوارث مرحابیں، ان کی جائداد ”بمصارف شرعی“ کہ ساختن مساجد و سراہا و مرمت پلہائے شکستہ و احداث تالابہا و چاہ ہا باشند“ صرف کی جائے۔ مساجد کی تعمیر اور ”مصارف شرعی“ کی تعین سے ظاہر ہے کہ بالکل ابتدا سے شرع محمدی کو کیا مرتبہ حاصل تھا۔

جماعگیر نے بالعموم شرع اسلامی کی پاسداری کے وعدے کا ایفا کیا اور اگر اکبر کی مذہبی بوجھبجیوں کا کوئی اثر باقی تھا تو وہ عہد جماعگیری میں ناپید ہو گیا۔

عہد اکبری میں علم و فن !

اکبر کے دربار کے مذہبی قضیوں کا ذکر ہم نے کسی قدر تفصیل سے کر دیا ہے، لیکن دربار میں مطلق العنانی اور بے قاعدگی شروع ہوئی تھی ملک پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ عام ملک میں اسلامی اعتقادات برقرار رہے، بلکہ علوم اسلامی کی وسیع اشاعت کا آغاز اسی زمانے سے ہوتا ہے۔

۱۔ اس پر ایڈیٹر کا ملاحظہ ہے۔ ”یہ سیخ فرید تھا جسے عام طور پر قرضے خاں کہتے ہیں۔“

اس وقت جو پورہ۔ دہلی۔ لاہور۔ سیالکوٹ۔ احمد آباد اور دوسرے مرکزوں میں علوم اسلامی کی اشاعت بڑی باقاعدگی سے ہورہی تھی اور قابل علما کی کمی نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ دوسری تمام ہستیوں سے قطع نظر جس زمانے میں حضرت باقی باللہ شیخ مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحی محدث ہندوستان کی سرزمین کو اپنے چشمہ فیض سے سیراب کریں اُسے روحانی نقطہ کا زمانہ نہیں کہا جاسکتا! اکبر کے زمانے میں درس و تدریس میں کئی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ خلیجی اور تغلق خاندانوں کے زمانے میں علوم و فنون کی کتابیں ہندوستان میں کم تھیں اور فقہ اور اصول فقہ کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ لودھیوں کے زمانے میں معقولات کی چند کتابیں بڑھیں، لیکن اکبر کے عہد میں معقولات میں بہت اضافہ ہوا۔ اس کی ایک وجہ ایران اور مرقند سے بعض علما کی آمد تھی۔ جنہوں نے منطق اور فلسفہ کو رواج دیا۔ ان میں شاہ فتح اللہ شیرازی بہت ممتاز تھے جنہیں اکبر نے عضد الملک کا خطاب دیا تھا۔ ان کی نسبت میر غلام علی آزاد لکھتے ہیں: ”تصانیف علمائے متاخرین ولایت (ایران) مثل محقق دوانی و میر صدر الدین و میر غیاث الدین منصور و مرزا جان میر بہ ہندوستان آورد و در حلقہ درس انداخت و جم غفیر از حاشیہ محفل میر استفادہ کردند از ان عہد معقولات رارواج دیگر شد۔“

شاہ سلیمان سجادہ نشین بھلواری شریف کا خیال ہے کہ درس نظامی کے اصلی بانی مولانا فتح اللہ شیرازی تھے۔ وہ اندودہ کے ایک پرچے میں لکھتے ہیں:-

اسی کے قریب زمانے میں ملا فتح اللہ شیرازی کے درس و تدریس کا غلغلہ بلند ہوا اور ہندوستان علماء عموماً اور اہل پورب خصوصاً انھیں اندازہ تعلیم پر چلنے لگے۔ ان کے وقت سے گویا ایک جدید نصاب تعلیم قائم ہوا..... میرا مقصد فقط یہ ہے کہ درس نظامی جس کا ہیرو نے مولانا فتح اللہ شیرازی سے ظہور میں آیا اور صورت نو عبد اس کی روپ بدلا کی۔ یہاں تک کہ درس کامرورجہ موجودہ حال پر استقرار ہوا۔“

۱۔ اکبری دور کا سب سے بڑا فلسفی تھا۔ لیکن اپنے عقیدے پر سختی سے قائم تھا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ اکبر کے عین دیوان خانہ خاص میں جہاں اور کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ علانیہ نماز پڑھے۔ وہ پورے اطمینان اور جمعیت خاطر کے ساتھ مذہب امامیہ کے مطابق نماز پڑھا کرتا تھا (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۱۵)

لیکن معقولات کے فروغ میں جو بعد میں ایک علمی و باکی حد تک پہنچ گیا۔ علمائے ماوراء النہر کو بھی خاصہ دخل تھا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ جب منطق کا علم سمرقند اور بخارا میں پہنچا تو بڑا مقبول ہوا اور مصالح ایسا تیز لگا کہ ہر شخص معقولات اور منطقی ہو گیا اور جب کسی نیک بخت صاحب دل کو دیکھتے تو اس کی پسندی اڑاتے کہ گدھا ہے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں منطقی دلیل یہ دیتے کہ یہ لاجیوان ہے اور حیوان عام ہے انسان خاص ہے۔ جب حیوانیت اس میں نہیں تو انسانیت جو اس سے بھی خاص ہے وہ بھی نہیں پھر گدھا بھی نہیں تو کیا ہے۔ جب یہ بوالفضولیاں حد سے بڑھ گئیں تو مشائخ صوفیہ نے منطق کا پڑھنا پڑھانا حرام قرار دے دیا اور بادشاہ وقت، عبداللہ خاں ازبک سے استدعا کی کہ اس فن کے استادوں کو عطا کیا جائے۔ چنانچہ کئی معقولاتی مثلاً قاضی ابوالمعالی میرزا جان۔ ملا عصام وغیرہ وہاں سے نکالے گئے۔ ان میں سے بعض نے ہندوستان کی راہ لی اور یہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ خود بداینی نے قاضی ابوالمعالی سے چند سبق پڑھے تھے۔ یقین ہے کہ معقولات کی مقبولیت میں ان بزرگوں کو بھی دخل ہو گا۔ دہلی اور گجرات کے سیاسی تعلقات عہد اکبری میں پھر استوار ہوئے۔ گجرات اہل زمانے میں اسلامی علوم کا بڑا مرکز تھا۔ ایک تو ساحلی علاقہ ہونے کی وجہ سے جو لوگ عرب آتے وہ پہلے یہیں قیام کرتے اور یہاں کے لوگوں کو عرب جانے میں آسانی تھی۔ دوسرے شاہان گجرات نے علوم و فنون کی سرپرستی کر کے انھیں بہت فروغ دیا۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح ہے کہ عہد اکبری سے پہلے سو سال تک گجرات کو علم و فضل میں دہلی پر فوقیت تھی۔ لیکن جب اکبر نے گجرات فتح کر لیا اور دہلی کے گورنر وہاں جانے لگے اور وہاں کے لوگوں کو دہلی آنا پڑا۔ گجرات کے علماء دہلی پہنچے شروع ہوئے اور گجرات کی بندرگاہوں کے رستے عام ہندوستانی طلباء کو بھی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جا کر حصول علم کا موقع ملا۔

علوم اسلامی کی اشاعت اور معقولات کی ترویج کے علاوہ اکبر کا زمانہ جس بات کے لیے نمایاں ہے وہ فنون لطیفہ کی ترقی ہے۔ فن تعمیر و مصوری موسیقی شاعری ان سب کو اکبر کے زمانے میں فروغ حاصل ہوا۔ اکبری عہد کے فن تعمیر کے بہترین نمونے فتح پور سیکری ہیں۔

لے ترجمہ (دربار اکبری)

جو مدلول اس کا دار الخلافہ رہا۔ اکثر عمارتیں سُرخ پتھر کی ہیں اور ان کو بالخصوص مزار شیخ سلیم چشتی کے بلند دروازے کو دیکھ کر حیرت اور مُسترت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ لاہور میں بھی جہاں اکبر آخر میں کئی برس مقیم رہا، اس نے قلعہ تعمیر کرایا اور اٹک۔ آگرہ اور دوسرے کئی منتخب مقامات پر قلعے بنوائے جن سے نہ صرف عسکری اور حفاظتی ضروریات کا انتظام ہوا بلکہ جو فنِ تعمیر کے بھی جاذبِ نظر نمونے ہیں۔ ہمایوں کا مقبرہ جسے تاج محل کا نقشِ اولین سمجھا جاتا ہے اسی زمانے میں تعمیر ہوا۔ اس کے علاوہ مغلِ مصوری کا فروغ اکبر کے زمانے میں ہوا۔ اس کا آغاز تو ہمایوں کے آخری سالوں میں ہوا جس نے اپنی بیاباں نوردی کے دوران میں تبریز اور ہرات کے فنکاروں کے شاہکار دیکھے اور دو مصوروں کو اپنے ساتھ لیتا آیا۔ اکبر کے زمانے میں بھی ایران سے کئی مصور آئے جن سے ہندوستانی صناعتوں نے مصوری کی تکمیل کی اور رفتہ رفتہ یہاں بھی فنِ مصوری اس عروج پر پہنچ گیا کہ ایران ہندوستان سے پیچھے گیا۔ موسیقی میں نان سینگ بہت مشہور تھا جو اکبر کے ندرتوں میں سے تھا۔ اس کے علاوہ اکبر نے ادبیات کی سرپرستی کی سنسکرت۔ عربی۔ ترکی۔ یونانی سے فارسی میں کتابیں ترجمہ کرائیں سنسکرت جو کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ ان میں رامائن، مہا بھارت، بھاگوت گیتا، اکتروید اور ریاضی کی ایک کتاب لیلادتی مشہور ہیں۔ ہندی زبان نے بھی اس زمانے میں بڑا فروغ حاصل کیا اور ہندی کے دو بہترین شاعر سورداس اور تلسی داس اکبر کے ہم عصر تھے۔ بیرم خاں کالڑکا عبدالرحیم خانخاناں خود ہندی زبان کا شاعر تھا۔ ملک الشعرا کا عہدہ بھی غالباً اکبر کے زمانے سے شروع ہوا جس پر پہلے غزالی اور پھر فیضی مامور ہوئے جو ہندوستان کے بہترین فارسی شعرا میں گنا جاتا ہے۔ اس عہدہ پر جو شخص مامور ہوتا تھا اس کا کافی وقت مدحیہ قصائد اور یاد شاہ بادشاہزادوں کے کارنامے نظم کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ لیکن بہر کیف اس سے حکومت کی طرف سے شعرو سخن میں دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا اور بالواسطہ اس کے فروغ کا سامان ہوتا تھا کی شاہی سرپرستی کی اراکین سلطنت تقلید کرتے۔ اور شعرو سخن کو رونق دیتی۔ چنانچہ عہد اکبری میں صبر الرحیم خانخاناں جیسے ادب نواز تھے جس کی سرکار سے غزلی شیرازی وابستہ تھا۔

مورخین میں علامہ القادر بدایونی مصنف منتخب التواریخ علامہ نظام الدین احمد مصنف طغلت اکبری لے ہدایوں کے سال وفات فی نسبت عام طور پر بے خبری ہے۔ طبقات شاہجہانی (جلد ۱) میں: ربانی لکھے گئے ہیں۔

اور علامہ ابوالفضل مستفتائین اکبری و اکبرنامہ مشہور ہیں۔ ان میں سے اکبرنامہ کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس سے سرکاری واقعہ نویسیوں کی رپورٹوں اور دوسرے مستند ذرائع سے ہر عہد کی تاریخ لکھنے کا آغاز ہوا جس کی تقلید میں جہانگیرنامہ، شاہجہاں نامہ، بادشاہ نامہ، عالمگیرنامہ وغیرہ لکھے گئے۔ ان میں سے جہانگیرنامہ کو ترک جہانگیری کی چمک دمک نے ماند کر دیا ہے۔ لیکن برابری مورخین کی لکھی ہوئی دوسری کتابیں اس زمانے کے حالات سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ ایسی تالیفات میں بادشاہوں اور بادشاہزادوں کے کارنامے زیادہ ہوتے ہیں اور عام لوگوں کے حالات اور معاشی امور کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر۔ آئین اکبری فی الحقیقت اکبرنامہ کی آخری جلد ہے۔ لیکن اس کا موضوع خاص ہے۔ اکبر کے آئین حکومت دینے کے علاوہ اس میں ملک کے مختلف حصوں کے متعلق بیش بہا معلومات جمع کی گئی ہیں۔ اور کتاب ایک طرح کا گزٹیرن گئی ہے۔ ان مورخین کے علاوہ اکبری کی پھوپھی گلبدن بیگم جس نے ہمایوں نامہ لکھا ہے بڑی قابل اور عالم خاتون تھیں۔ عہدِ مغلیہ کی مشہور خواتین کا ممتاز سلسلہ انھی سے شروع ہوا اور جس طرح چاندنی بی نورجہاں، جہاں آرا اور زیب النساء کی قابلیت اور اثر و اقتدار سے عیسائی مورخین کا یہ اعتراض غلط ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں مستورات کو جائزہ دینا نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح گلبدن بیگم کی علمیت اور زہد و تقویٰ بھی قوم اور ملک کے لیے باعثِ فخر ہے۔

اس زمانے میں بہت قابل اطبا بھی ایران سے آئے تھے۔

عہدِ اکبری کا ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ تمباکو شمالی ہندوستان میں پہلی مرتبہ اسی زمانے میں آیا اور اسد بیگ نے اپنے اکبرنامہ میں اس دلچسپ اور سبق آموز مباحثہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے جو تمباکو نوشی کے فوائد و نقصانات پر اکبر کے دربار میں ہوا۔

عہدِ اکبری کی محدث و ترقیاں | عہدِ مغلیہ کا علمی، فنی اور انتظامی نظام اکبر کے عہد میں ایک سانچے میں ڈھالا گیا۔ عالمگیرنامہ جو عہدِ عالمگیری یعنی اس زمانے میں لکھی گئی، جب اکبری نظام کی ایک اہم ضیق یعنی مذہبی معاملات میں

(بقیہ فٹ نوٹ از صفحہ ۱۴۸)

جہاں اس کی بہت تعریف کی گئی ہے لکھا ہے: ”درست ہزار و بیست و چار از عالم انتقال نمود در عہدِ جہانگیر بادشاہ“
سے ملاحظہ ہو۔ اطباء عہدِ مغلیہ (کوثر چاند پوری)

اکبری طریق کار کو بالکل بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ عالمگیر کا درباری مورخ لکھتا ہے۔
 ”حضرت عرش آشیانی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ طاب ثراہ کہ مجد و آئین جہان بینی
 و مشید قوانین اس سلطنت جاودانی اند“ (ص ۳۸۷)

مغلیہ نظام اور تہذیب و تمدن اپنے دور میں کسی دوسری مشرقی حکومت کے نظام سے پیچھے
 نہ تھا بلکہ روسی مورخ بارٹولڈ لکھتا ہے ”فقط ہندوستان میں مخلوں کے تابع حالات مختلف
 تھے۔ اور اس ملک کی اسلامی حکومت مال و ثروت اور فہمی رواداری میں محاصرہ یورپ سے
 بڑھ کر تھی۔“ تمام یورپ میں مخلوں کو مغلان اعظم کہہ کر یاد کیا جاتا تھا، لیکن جب دو ڈھائی
 سو سال بعد مغلیہ حکومت کے خاتمے کا وقت آیا تھا تو نہ صرف یہ ہندوستان تنازع للبتقا
 کی جنگ میں یورپ سے آگے یا اس کے برابر نہ رہا۔ بلکہ ایک یورپی طاقت کے زیر نگین آ گیا۔
 اس سانحے کا سبب بھی عہد اکبری کے عوامل و رجحانات میں ڈھونڈنا پڑے گا۔ مولانا
 ابوالاعلیٰ مودودی نے تجدید و احیائے دین میں مجددین اور اسلامی علما و زعماء کے اسباب
 ناکامی کا تجزیہ کیا ہے۔ اور مغرب کے مقابلے میں مشرق کی ذہنی اور علمی پسماندگی کا
 نقشہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

”جس دور میں ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ صاحب شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسماعیل شہید
 پیدا ہوئے۔ اُسی دور میں یورپ قرون وسطیٰ کی نیند سے بیدار ہو کر نئی طاقت کے ساتھ اُٹھ
 کھڑا ہوا اور وہاں علم و فن کے محققین، کشفین اور موجدین اس کثرت سے پیدا ہوئے
 کہ انھوں نے ایک دنیا کی دنیا بدل ڈالی۔“ اس کے بعد وہ آدھے پونے صفحے پر اٹھارویں
 انیسویں صدی کے مشہور مغربی حکما، سائنسدانوں اور معاشیات وغیرہ کے ماہرین کے نام
 گنا کر کہتے ہیں کہ ان میں ”ان جیسے لوگ پیدا ہوئے، جنھوں نے اخلاقیات، ادب، قانون،
 مذہب، سیاسیات اور تمام علوم عمرانی پر زبردست اثر ڈالا۔ اور انتہائی حیرت و
 بے باکی کے ساتھ دنیائے قدیم پر تنقید کر کے نظریات و افکار کی ایک نئی دنیا بنا ڈالی۔
 پریس کے استعمال، اشاعت کی کثرت، اسالیب بیان کی قدرت اور مشکل اصطلاحی
 زبان کے بجائے عام فہم زبان کو ذریعہ اظہار بنانے کی وجہ سے ان لوگوں کے خیالات نہایت

وسیع پیمانے پر پھیلے۔ انھوں نے محدود افراد کو نہیں بلکہ قوموں کو بحیثیت مجموعی متاثر کیا۔ ذہنیاتیں بدل دیں، اخلاق بدل دیے۔ نظام تعلیم بدل دیا۔ نظریہ حیات اور مقصد زندگی بدل دیا اور تمدن و سیاست کا پورا نظام بدل دیا.....

اسی زمانے میں مشین کی ایجاد نے صنعتی انقلاب برپا کیا۔ جس نے ایک نیا تمدن نئی طاقت اور نئے مسائل زندگی کے ساتھ پیدا کیا۔ اسی زمانے میں انجینئرنگ کو غیر معمولی ترقی ہوئی جس سے یورپ کو وہ قوتیں حاصل ہوئیں کہ پہلے دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ تھیں۔ اسی زمانے میں قدیم فوجی جنگ کی جگہ نیا فوجی جنگ نئے آلات اور نئی تدابیر کے ساتھ پیدا ہوا۔ باقاعدہ ڈبل کے ذریعہ سے فوجوں کو منظم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا جس کی وجہ سے میدان جنگ میں پلٹیں مشین کی طرح حرکت کرنے لگیں۔ اور پرانے طرز کی فوجوں کا ان کے مقابلے میں ٹھیکرنا مشکل ہو گیا۔ ص ۷۶-۷۷

مولانا مودودی نے جو حقائق بیان کیے ہیں، ان کی صحت و اہمیت انکار نہیں ہو سکتا لیکن انھوں نے پکی ہوئی تیار شدہ فصل کی تفصیل دی ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ اس کے لیے زمین کب تیار ہوئی اور بیج کب بوسے گئے؟

اٹھارویں، انیسویں صدی میں یورپ کی جن ترقیوں اور مشرق کی جس پس ماندگی کا مولانا نے ذکر کیا ہے، وہ ان عوامل و اثرات کا قدرتی نتیجہ تھیں جو صدیوں سے کار فرما تھے۔ اور جنھوں نے عہد اکبری تک ایک واضح صورت اختیار کر لی تھی۔

جب ۱۰۷۱ھ میں سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس فتح کیا، اس وقت تک علمی، اخلاقی، روحانی اور عسکری اعتبار سے مسلمانوں کا پلہ اہل مغرب سے بھاری تھا۔ اس کے بعد اسلامی ممالک پر منگولوں کی یورش ہوئی۔ اور ۱۲۵۸ھ میں سقوط بغداد کا سانحہ پیش آیا۔ اس سیلابِ بلا سے جو عظیم سیاسی اور دینی خطرات پیدا ہو گئے تھے۔ وہ تو اللہ کے فضل سے عارضی ثابت ہوئے اور اہل یورپ نے لاندہب منگولوں سے مل کر دنیا سے اسلام کے خلاف جو منصوبے بنائے چاہئے انھیں بعض باتدبیر مسلمان زعمائے ناکام بنا دیا لیکن ”فقہہ“ منقول کے مسلمانوں کی علمی برتری کا خاتمہ کر دیا۔ خوارزم۔ بخارا۔ خراسان۔ ایران اور بغداد کے

علمی مرکزوں کی ویرانی، مکتب خاتون، مدرسوں اور تجربہ کاروں کی تباہی اور علما کے قتل و انتشار سے علم کا شیرازہ اس طرح بکھرا کہ پھر اس کی بحالی نہ ہو سکی۔ بلکہ علم و تہذیب کے پرانے گہواروں میں تہی ویر بربریت اور سفاکانہ جہالت کا دور دورہ رہا کہ ہمیں بسبت ہو گئیں اور خیالات بدل گئے۔ مغلوں کی تباہ کاریوں سے پہلے اور بعد کے حالات پر غور کریں تو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ سانچا جس میں البرونی جیسے محققین اور سائنس دانوں کے ذہن ڈھلتے تھے، ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ واقعیت پسندی کی جگہ فراریت اور علم کی جگہ تصوف کو فروغ ہوا۔ علم کا مفہوم بہت محدود ہو گیا۔ یعنی نئے علوم اُحد کرنا تو ایک طرف، زوال بغداد سے پہلے جو علوم رائج تھے، وہ بھی متروک و مردود ہو گئے۔ ذہن گویا مفلوج ہو گئے، اور جو لوگ اہل علم کہلاتے تھے، ان کا منتہا مقصود حق کی تلاش نہ رہا۔ بلکہ ایک نقطہ نظر کی ترویج۔

اس کے برعکس یورپ میں بالکل ایک نئی علمی زندگی کا آغاز ہوا۔ اور اُس تحریک کی ابتدا ہوئی جسے یورپ کی نشاۃ ثانیہ یا Renaissance کہتے ہیں۔ اس میں ایک حد تک ان اثرات کو دخل تھا، جو صقلیہ اور اندلس میں عربوں کے بلند علمی اور تدریسی معیار کی بدولت قریبی یورپی ممالک کے اہل علم پر پڑا۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں عربوں کے تمدن اور علم و فن سے اہل مغرب کو جو واقفیت ہوئی، اس سے بھی ان کا افق ذہنی وسیع اور معیار علمی بلند ہوا۔ لیکن یورپ کی علمی نشاۃ ثانیہ کا اصل ذریعہ وہ یونیورسٹیاں تھیں جو اس زمانے میں کثرت سے یورپ کے مرکزوں میں قائم ہوئیں۔ اس وقت وہاں بھی (عالم اسلام کی طرح) تعلیم تدریس کی باگ علما سے مذہب کے ہاتھ میں تھی (مثلاً اسکس فورڈ اور کمبریج کی یونیورسٹیاں بھی شروع میں دینی درس گاہیں تھیں) لیکن یورپ میں ضروریات زمانہ کے لحاظ سے نصاب میں توسیع ہوتی رہی اور یہ یونیورسٹیاں دینی اور دنیوی دونوں قسم کے علوم کا مرکز بن گئیں۔ اس زمانے میں یورپ میں سچا پر خانہ کا آغاز ہوا جس سے علم کی لیے پناہ اشاعت ہوئی۔ کتابیں سستی ہو گئیں اور کتب خانے خاص خاص امرا یا اداروں کا اجارہ ہونے کی بجائے عوام کو بھی میسر ہونے لگے۔ اس کے علاوہ مغرب کی عسکری برتری کا، بالخصوص سمندروں پر اس کے بے روک لوگ اقتدار کا آغاز بھی اس زمانے میں ہوا۔ اور اکبر کی تخت نشینی، بلکہ بابر کی فتح پانی پت سے پہلے

بحر سند ایک پرتگیزی جھیل بن گیا تھا جس میں جہاز رانی پرتگیزی اجازت ناموں کے بغیر مخدوش بلکہ ناممکن تھی۔

اکبر نے جو انتظامی، عسکری، مالی، تہذیبی نظام قائم کیا، وہ مشرقی معیار کے مطابق خاصہ بلند تھا، لیکن چونکہ وہ اور اس کے رفقاءے کار ترقی اور عقلیت کے دعویدار تھے، دیکھنا یہ ہے کہ مغرب میں جو ترقیاں ہوئیں، اور جن سے وہ بے خبر نہ تھا، ان کے مقابلے میں اس نے کیا کیا؟ اکبر کی سب سے بڑی حماقت امور مذہبی میں ہوئی، مغرب کی تمام ترقیاں علما سے مذہبی اور حکومت و عوام میں کشمکش اور اختلافات پیدا کیے بغیر و نما ہوئیں۔ بلکہ بعض دنیوی ترقیوں مثلاً مشرقی سمندروں میں اقتدار کے حصول میں تو دنیوی فوائد سے زیادہ جذبہ مذہبی یعنی عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کو نیا دکھانے کی خواہش کار فرما تھی۔ یونیورسٹیوں کی ابتدا اور توسیع میں بھی مذہبی علما اور حکومت کا پورا اشتراک کار تھا۔ یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ اکبر اور مذہبی علما کی کشمکش کی وجہ سے نہ صرف یہ اشتراک عمل ناپید تھا بلکہ ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی کہ اکبر اور اس کے عقل پسند رفقاءے کار جو تجاویز پیش کرتے، وہ بے ضرر بھی ہوتیں تو علما ان کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے۔ اور فی الحقیقت اکبر کی مذہبی خام خیالیوں نے ایک ایسی صورت اختیار کر لی تھی۔ [اور (ان کے مخالفین کے بیان کے مطابق) نام نہاد عقلیت کے دعویداروں نے انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حکماء کو اس طرح ہم پایہ قرار دے دیا تھا، کہ عقلیت پسندی اور دنیوی علوم کے خلاف ایک نبردست رد عمل شروع ہوا۔ اور وہ دنیوی علوم بھی جو دوسرے ملکوں میں علما گوارا کر لیتے تھے۔ وہ بھی یہاں متروک و مردود ٹھہرائے گئے۔ اس کا سب سے موثر اظہار حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات میں ملے گا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت مجدد نے علوم دنیوی و معقولات کو یوری طرح حاصل کیا تھا۔ جس استاد (علامہ کمال الدین سیالکوٹی) کے وہ شاگرد تھے وہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کا بھی استاد تھا۔ انھوں نے خود ایک مدت تک ان علوم کا درس بھی دیا۔ وہ ایک جگہ ان علوم سے ذاتی طور پر روحانی فائدے اخذ کرتے کا ذکر کرتے ہیں۔

بسیار سے از تحقیقات کلامی و فلسفی دریں سیر و سلوک مدد نموده است و واسطہ معارف

الہی جل شانہ، گشتہ - (۲)

لیکن جب علوم عقلیہ کا مرتبہ معین کرنے کا وقت آیا تو انھوں نے حکما و فلاسفہ کی نسبت لکھا ہے۔
یہ لوگ بہت ہی بے خود اور بیوقوف ہیں۔ اور ان سے زیادہ کمینہ اور بیوقوف و حق وہ شخص ہے
جو ان کو دانا اور عقلمند جانتا ہے۔ ان کے منظم اور مرتبہ علوم میں ایک علم ہندسہ ہے جو محض لالچنی اور یہود
اور لاطال ہے۔ بھلا مشلت کے تینوں زاویہ قائمہ کے ساتھ برابر ہونا کس کام آئے گا اور کل عروج
اور مافوقی جوان کے نزدیک بڑی مشکل اور جانکاہ ہے۔ کس غرض کے لیے ہے؟

علم طب و نجوم اور علم تہذیب و اخلاق جو ان کے تمام علوم میں سے بہتر علم ہیں، گزشتہ انبیاء کی کتابوں
سے چرا کر اپنے باطل اور یہودہ علوم کو رائج کیا ہے۔ جیسے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے
رسالہ المنقذ عن الضلال میں اس امر کی تشریح و توضیح کی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی دعوت جب افلاطون کو جوان بدبختوں کا رئیس ہے پہنچی تو اُس نے کہا کہ
ہم ہدایت یافتہ لوگ ہیں۔ ہم کو ایسے شخص کی حاجت نہیں ہے جو ہم کو ہدایت دے۔
اس بیوقوف کو چاہیے تھا کہ ایسے شخص کو جو مردوں کو زندہ کرتا اور مادر زاد اندھوں اور
کوڑھیوں کو تندہ مت کرتا ہے، [جو ان (حکما) کے اصول و قوانین کے خلاف ہے] اُسے
پہلے دیکھتا، اس کے حالات کو دریافت کرتا اور پھر اسے جواب دیتا۔ بغیر دیکھے اس کا یہ
جواب دینا، اس کی کمال عداوت اور کمینہ پن ہے۔

فلسفہ چوں اکثرش باشد سفہ پس کل آں ہم سفہ باشد کہ حکم کل حکم اکثر است
.... فزندی محمد مصوم نے انھی دنوں میں جو اہر شرح مواقف کو تمام کیا ہے۔ اثنائے سبق میں

ان بے وقوفوں کی بڑی بڑی قیاحتیں ظاہر ہوئیں۔ (۱۴۶)

یہ مواقف وہی کتاب ہے جس کی ملا عبد الحکیم سیالکوٹی سے لے کر اکثر فضلاء ہند نے شرحیں
لکھیں اور جس کے مصنف قاضی عضد الدین شیرازی کی نسبت خواجہ حافظ نے کہا ہے
دگر شہنشاہ دانش عضد کہ در سببش بنائے کار مواقف بنام شاہ تہاد
اس زمانے میں تحقیق حالات میں جو دشواریاں تھیں ان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حضرت مجدد
کامیہ خیال کا افلاطون نے حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ پایا۔ صحیح نہیں۔ افلاطون (۴۲۷-۳۴۷ ق م)۔

حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے کوئی تین سارے تین سو سال پہلے وفات پا چکا تھا۔
 حضرت مجدد نے دوسرے کے ایک خط میں بھی انھی امور سے بحث کی ہے۔ علوم فلسفہ کی نسبت تھیں
 بعض لوگ جو علوم فلسفہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور فلسفی تسویلات پر فریفتہ ہیں ان کو حکما جان کر
 انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے برابر سمجھتے ہیں بلکہ ان کے چھوٹے علوم کو سچا جان کر انبیاء کی شرائع
 پر مقدم سمجھتے ہیں۔ اعوذ باللہ سبحانہ عن الاعتقاد العسور۔ ہاں جب ان کو حکما ملتے
 ہیں۔ اور ان کے علم کو حکمت کہتے ہیں تو پھر کونکر اس بلا میں مبتلا نہ ہوں۔ کیونکہ حکمت مراد کبھی شے
 کا وہ علم ہے جو نفس الامر کے مطابق ہو لیکن وہ علم جو ان کے مخالف ہوں۔ وہ نفس الامر کے غیر مطابق ہوں گے۔
 غرض ان کی اور ان کے علوم کی تصدیق سے انبیاء اور ان کے علوم کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ
 یہ دونوں علم ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ اب جو چاہے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مذہب کو
 لازم پکڑے۔ اور حق تعالیٰ کے گروہ سے ہو جائے۔ اور نجات پا جائے۔ اور چاہے فلسفی بن جائے۔
 اور شیطان کے گروہ میں داخل ہو جائے اور ہمیشہ کے لیے زباں کا اور ناامید بن جائے۔ (۳۳)
 حضرت مجدد و حکما کے تو اس لیے خلاف تھے کہ ان کے خیال میں حکما کے علوم کی تصدیق سے
 انبیاء کرام کی تکذیب لازم آتی ہے۔ لیکن علم ہندسہ کے وہ اس لیے مخالف تھے کہ اس کا کوئی فائدہ
 نہیں۔ اور اس سے وبال و عذابِ آخرت بچنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ فرماتے ہیں:-
 ”باقی رہا علم ہندسہ جو خاص طور پر ان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اگر وہ منظم یعنی کامل اور تمام بھی
 ہوگا تو کس کام آئے گا۔ اور آخرت کے کوئی عذاب و وبال کو دور کرے گا۔ بندہ کی حق تعالیٰ سے
 روگردانی کی علامت بندہ کا یہودہ کاموں میں مشغول ہونا ہے۔

جو کچھ آخرت میں کام نہ آئے۔ وہ لایعنی اور بیودہ ہے“ (۳۴)

حضرت مجدد کے علم ہندسہ کے متعلق مخالفانہ ارشادات پڑھتے وقت یہ خیال رکھنا چاہیے کہ
 انھوں نے علم ہندسہ کا اچھی طرح مطالعہ کیا تھا اور انھوں نے اپنی تصانیف میں بعض اہم امور کو علم ہندسہ

لے غالباً ابو الفضل فیضی اور حکیم ابوالفتح کی طرف اشارہ ہوگا۔ ابو الفضل کی قریباً ساری تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں
 متعلقہ امداد نظر سے نہیں گزرا۔ دوسروں کی تصانیف چھپ جائیں تو شاید حقیقت حال پر روشنی پڑے ممکن ہے
 حضرت مجدد کا زبانی باتوں کی طرف اشارہ ہو۔

اصولوں سے ثابت کیا ہے۔ مثلاً معارف لدنیہ میں وجودِ باری تعالیٰ کے متعلق بعض لطیف و دقیق حقائق کے اثبات میں لکھتے ہیں:-

”دوم۔ آنکہ برہان ہندی ثابت شدہ است کہ مرکزِ دائرہ نقطہ است کہ برہم وچ انعام قولاً کنند“

سوم۔ آنکہ نیز برہان ہندی ثابت شدہ است کہ..... الخ“ [رسالہ مجزیہ ص ۱۵۳]

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی نسبت تو شاید یہ کہا جاسکے کہ عہدِ اکبری میں علوم عقلیہ کے تجماعوں سے جو بے اعتدالیاں ہوئیں، ان کے ردِ عمل کے طور پر ان علوم کے متعلق ان کے خیالات مخالفانہ ہو گئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ منگولوں کی تباہ کاریوں کے بعد علما کا نقطہ نظر علوم کی نسبت بڑا محدود ہو گیا۔ ظالم منگولوں نے اسلامی کتب خانے برباد کر کے اسلامی علوم کے آثار نشانہ اس طرح مٹائے کہ خود مسلمانوں کو یاد نہ رہا کہ انھوں نے اپنے عہدِ عروج میں علوم و معارف کو کتنی وسعت اور بلندی دی تھی؛ الجبر اکبر نے ایجاد کیا تھا؛ یونانی علوم کو کس نے زندہ رکھا؛ اہل ہند کے علوم (مثلاً نجوم ہندیہ) کو کس نے دنیا میں عام کیا؛ طبِ سیہیت۔ ریاضی، کیمیا، طبیعیات میں مسلمانوں نے کیا کیا اضافے کیے اور ان ساری علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اسلام کی محبت، احکام اسلام کی متابعت اور عظیم ترین اخلاقی اور روحانی سر بلندی سے کس طرح سرفراز رہے؟ دہلی میں اسلامی حکومت اس وقت قائم ہوئی، جب منگولوں کے سیلابِ بلا کے بند ٹوٹ چکے تھے۔ ان درندوں سے جان بچا کر جو علما و صلحا بخارا، خوارزم، خراسان اور پھر ایران، عراق سے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ گزین ہوئے۔ ان سے یہاں اشاعتِ اسلام، نئی حکومت کے استحکام اور اسلامی تہذیب و تمدن کی تریب و آرائش میں بڑی مدد ملی۔ لیکن جو افراد اس طرح جان بچا کر بھاگے تھے، وہ اپنے کتب خانے ساتھ نہ لاسکے تھے۔ تجربہ گاہوں اور علمی آلات کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں انھنی چیزوں نے فروغ پایا، جن کے لیے صدیوں جمع کیے ہوئے علمی سرمایہ کی ضرورت نہ تھی۔ یعنی تصوف، شعر و شاعری، انشا، زیادہ سے زیادہ فقہ اور اصول حکومت پر چند کتابیں اور مقامی تاریخ نگاری۔

اسلامی ہندوستان میں بغداد اور غرناطہ، بلکہ بخارا اور خوارزم کی بھی ٹھوس علمی روایات قائم نہ ہوئیں۔ اور دہلی کا علمی افق یہاں کی عسکری اور سیاسی سر بلندیوں کے مقابلے میں نسبت

رہا۔ لیکن ہندوستان سے باہر بھی جو انحطاط آچکا تھا۔ اور علم کا مفہوم اسلام کے عہد زریں کے مقابلے میں جس طرح محدود ہو گیا تھا اس کا اندازہ مقدمہ ابن خلدون کے ایک فقرے سے ہوتا ہے۔ اس کتاب کو فلسفہ تدریج کے ارتقا میں جو مقام حاصل ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ بلاشبہ علامہ ابن خلدون کی علمی حیثیت عالم اسلام کے لیے باعث فخر ہے۔ حکما اور انبیاء کے طریق کار سے اس نے بھی بحث کی ہے۔ اور اس معاملے میں اس کے اور حضرت مجدد کے نقطہ نظر میں ایک لطیف لیکن اہم فرق ہے۔ وہ نبوت اور حکمت کے بنیادی مخالف کا قائل نہیں۔ بلکہ نبوت کو حکمت بالا اور ماوراء سمجھتا ہے۔ جس میں حکمت کی حقیقی خوبیاں بھی ہیں اور (وحی کے توسط کی وجہ سے) اس کے علاوہ بھی کئی چیزیں۔ احکام نبوت کو بہر کیف حکیمانہ استدلال پر فوقیت دے گی۔ یہ نقطہ نظر ٹھیکہ اسلامی ہے۔ اور حکمت کی بھی غیر ضروری نفی نہیں کرتا لیکن علم طبعیات کے متعلق ایک ایسا فقرہ ہے جو علماء وقت کے نقطہ نظر کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور قریب قریب اسی انداز میں جو حضرت مجدد نے علم ہندو کے متعلق اختیار کیا:۔ طبعیات کے مسائل ہمارے دینی معاملات میں ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

..... لہذا ہمیں ان سے کنارہ کش ہی رہنا چاہیے۔

مغرب کی علمی ترقیوں ہی نہیں مسلمانوں کے علمی عہد زریں کے مقابلے میں بھی اب علم کا مفہوم جس طرح محدود ہو گیا۔ اور بعض علوم کے دروازے جس طرح مقفل کر دیے گئے بلکہ صحیح علمی انداز فکر کو جس طرح خیر باد کہہ دیا گیا اس میں عہد اکبری کی بے اعتدالیوں کے علاوہ دوسرے اثرات کو بھی دخل تھا لیکن اسلامی ہندوستان کی روز افزوں علمی پسماندگی کے بعض اسباب ایسے تھے جن کے لیے اکبر کی اپنی کوتاہیاں ذمہ دار تھیں۔ اور اس باب میں جہاں ہم نے عہد اکبری کی علمی ترقیوں کو گنایا ہے مناسب ہے کہ ان کوتاہیوں کی بھی نشان دہی کر دی جائے۔

ہم مغرب کی علمی ترقیوں کے ضمن میں متعدد دینی یونیورسٹیوں کے قیام اور طباعت کی ترویج کا ذکر کر چکے ہیں۔ ان معاملات میں اکبر نے کیا کیا؟

اکبر علم کا مہربان تھا۔ ایک زمانے میں علما و صلحا کی امداد و سرپرستی کے لیے صدر الصدور کو برکات و سیلح اختیارات دے رکھے تھے جن کا بسا اوقات دل کھول کر استعمال کیا گیا لیکن اس نے

یا ابو الفضل نے کتنی یونیورسٹیاں قائم کیں؟ ایک نہیں، بلکہ اس کے پچاس سالہ عہد حکومت میں اس کی طرف سے فیروز تخلق کے قائم کردہ مدرسہ فیروزی یا ابتدائی اسلامی حکومت کے مدرسہ معز یہ یا مدرسہ ناصر یہ کے پایہ کی کسی علمی درسگاہ کے قیام کا کہیں ذکر نہیں (اور بعد میں تو اکبر نے علما اور عامۃ المسلمین سے اپنے آپ کو اس قدر دُور کر لیا تھا کہ اگر وہ کوئی مدرسہ قائم کرتا تو کوئی راسخ الحقیہ مسلمان وہاں پڑھنے پڑھانے کے لیے نہ آتا۔ یا وہ مدرسہ ہی ذہنی انتشار کا سرچشمہ بن جاتا!)

چھاپہ خانہ سے بے اعتنائی اسی طرح افسوسناک ہے۔ عہد اکبری سے بہت پہلے یورپ میں چھاپہ خانہ کی ایجاد ہو چکی تھی۔ اور اکبر کے زمانے میں ہندوستان کے مغربی ساحل پر پرتگیزیوں نے چھاپہ خانے قائم کر رکھے تھے۔ اکبر کے سامنے یہ کتابیں پیش بھی ہوئیں، لیکن اس نے انھیں (خوشنما خطاطی کے مقابلے میں ابتدائی عہد کی بُری چھپائی کو دیکھ کر؟) پسند نہ کیا۔ اور علم کی وسیع اشاعت کا سب سے کارآمد ذریعہ ہاتھ سے کھو دیا۔

علم کی توسیع کے ان بنیادی ذرائع کو نظر انداز کرنے کے علاوہ اکبری علم نوازی کی کمزوریاں اور کوتاہیاں اس وقت ظاہر ہوتی ہیں، جب ہم ان کتابوں کا جو شاہی سرپرستی میں ترجمہ ہوئیں۔ ان علمی کتب سے مقابلہ کریں جو درعباسیہ میں یونانی یا سنسکرت سحر میں منتقل ہوئیں۔ اکبر نے تالیف و ترجمہ کا انتظام کر کے یقیناً علمی خدمت کی۔ اور اس معاملے میں اپنے پیشرو شاہانِ دہلی پر اسے فوقیت حاصل ہے۔ لیکن اس کی سرپرستی میں کتنی اور کس قسم کی کتابیں ترجمہ ہوئیں؟ تعداد کے لحاظ سے ان کو ان کتب کے کوئی نسبت نہیں۔ جو اتنی ہی مدت میں بغداد کے دار الحکومت میں ترجمہ کی گئیں۔ تعداد سے بھی زیادہ اہم کتب کی نوعیت ہے۔ عہد اکبری میں جو کتابیں ترجمہ ہوئیں یا لکھی گئیں۔ ان کے موضوع کیا تھے۔ اور ان میں علمی کتابیں کتنی تھیں؟ ان میں سے بعض کتابیں تو ہنود کی مذہبی کتابوں کا ترجمہ تھیں۔ جن کا مقصد ظاہر ہے، سیاسی تھا۔ بعض داستانیں اور افسانے تھے۔ جن کے ترجمہ سے بادشاہ اور بیگمات کی ضیافت طبع کا اہتمام مقصود تھا۔ چند کتابیں تاریخ کی تھیں۔ اس ساری فہرست پر غور کریں تو خالص علمی کتابیں فقط دو یا تین نظر آتی ہیں۔ ایک ریاضی میں لیلادتی

۱۔ عہد انگری کا ایک شیخ (Ovington) لکھتا ہے کہ کتابوں کے اقتصادی مفاد کی خاطر مغلوں نے چھاپہ خانہ کو فروغ نہ دیا۔

کا ترجمہ دوسری علم ہیئت میں۔

عہد اکبری کی علم نوازی کا اگر مغرب کی محاصرانہ علمی ترقیوں سے نہیں عہد عباسی کے علمی کارناموں سے مقابلہ کریں ججھوں نے ہر طرف سے اخذ فیض کر کے عربی میں متعدد نئے، مستقل علوم کی مستحکم بنیادیں قائم کر دیں۔ تو پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کی علمی سطح کس حد تک گر گئی تھی۔ بلکہ ذہن کس طرح بدل گئے تھے!

حقیقت یہ ہے کہ اکبر اور اس کے رفقاء کے سامنے زیادہ سے زیادہ ہرات کے سلطان حسین مرزا جیسے مربیان ادب و فن کی مثالیں تھیں۔ بغداد اور غرناطہ کی علمی سرگرمیوں سے وہ بے خبر تھے۔ اور اس زمانے میں علم نہیں ادب و فنون لطیفہ کو عروج ہوا۔

ملکی اور عسکری معاملات کو دیکھیں تو یہاں بھی کئی کمزوریاں نظر آتی ہیں۔ عہد اکبری میں پرتگیز بحر ہند پر مسلط تھے۔ یگیات شاہی کے جہاز بھی پرتگیزیوں کے اجازت نامے لے کر سفر کرتے تھے۔ اکبر نے اس صورت حالات کا کیا مداوا کیا۔ یہ صحیح ہے کہ پرتگیزیوں کو سواحل ہند سے نکالنے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ (اور یہ خواب تو شیر شاہ سوری بھی دیکھتا تھا) لیکن عملاً اس نے کیا کیا۔ پرتگیزیوں کو ان علاقوں سے نکالنا تو بعد کی بات تھی۔ وہ کوئی قابل ذکر بحری بیڑہ بھی تیار نہ کر سکا۔ غرضیکہ عہد اکبری میں توسیع مملکت اور بڑی ترقی و تنظیم کے باوجود ایسی کمزوریاں تھیں جو آگے چل کر مملکت ثابت ہوئیں اور جن کی وجہ سے مغرب کا پلہ روز بروز زیادہ بھاری ہو گیا۔ لیکن ان کوتاہیوں کا سبب فقط اکبر اور اس کے مشیروں کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جب ایک محاضرہ میں محمود یا انخطاط آتا ہے تو اس سے فقط ایک طبقہ متاثر نہیں ہوتا۔ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی یہی عمل کار فرما ہوتا ہے۔

عہد اکبری صحیح معنوں میں محمود یا انخطاط کا دور نہ تھا۔ سیاسی اور انتظامی معاملات میں یہ ٹھوس ترقی کا دور تھا، لیکن اگر اس ترقی کا مغرب کی محاصرانہ ترقیوں سے مقابلہ کریں تو رفتار سست اور ترقی محدود نظر آتی ہے۔ کچھ اسی طرح کا عمل علما اور صوفیہ کے ضمن میں کار فرما تھا۔ پہلے علما کو لیجیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عہد میں تعلیم و تعلم میں بنیادی اختلاف ہوئے۔ گجرات کی ساحلی بندرگاہوں کے ایک مدت مدید کے بعد دہلی

کے تابع آجانے سے علما کو حج و زیارت کے لیے ہی نہیں اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے بھی حجاز جانے کا موقع ملا۔ چنانچہ علم حدیث کو شمالی ہند میں ایک نیا فروغ ہوا۔ جس میں سب سے روشن نام شیخ عبدالحق محدثؒ کا تھا۔ کچھ اسی طرح کا معاملہ معقولات میں ہوا۔ ایک وسیع سلطنت کے قیام اور اکبر کی علمی سرپرستی کا شہرہ سن کر ایران و توران سے جو علما اور دانشور آئے، انھوں نے معقولات کو رواج دیا۔ اور علم حدیث کی طرح (حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسے بزرگوں کی مخالفت کے باوجود) ان علوم نے بھی ہمارے درس میں ایک مستقل جگہ حاصل کر لی۔ لیکن اس وقت تو علمی ترقی کی رفتار کا مغربی ترقیوں سے مقابلہ ہو رہا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو رفتار بہت سست اور ترقی بہت محدود نظر آتی ہے۔ امیر فتح اللہ شیرازی جیسے بزرگ چاہتے تو یہاں بھی کم از کم منتخب اولوں میں سائنس کی تعلیم کا آغاز ہو سکتا تھا۔ مغرب میں اس وقت گلیلیو پیدا ہو چکا تھا جس نے نئی ایجاد شدہ دوربین کی مدد سے علم ہیئت اور فلکیات میں بنیادی تبدیلیاں کیں اور فی الحقیقت سائنس میں مغربی ترقیوں کے نئے دور کا آغاز کیا۔ لیکن ہمارے ہاں یہ سلسلہ قائم نہ ہوا بلکہ امیر فتح اللہ شیرازی نے جو کلیں اور مشینیں ایجاد کیں۔ ان کا سلسلہ بھی انفرادی نمود و نمائش کے کھیل سے آگے نہ بڑھا۔ اور یہ سلسلہ بھی امیر کے ساتھ ختم ہو گیا۔

محدود بلکہ ظاہری ترقی کا یہی عمل صوفیہ کے باب میں کار فرما تھا۔ عہد اکبری کے آخر میں سلسلہ نقشبندیہ کا آغاز ہوا، جو شرح سے قریب تھا۔ اور جس کی تعلیم زیادہ مدفن اور تنظیم زیادہ پختہ تھی۔ اس سے متعدد اہم فوائد رونما ہوئے۔ لیکن سوال تو محاصرہ مغربی ترقیوں سے موازنہ کا ہے۔ یورپ میں اُس وقت اللہ سے لوگ انے اور دنیا پر آخرت کے ترجیح دینے والوں کے طریق کار میں ایک بنیادی انقلاب رونما تھا۔ رضائے الہی کے لیے اب عبادتوں، ریاضتوں اور اشغال روحانی میں غلو کی بجائے خدمتِ خلق کو راہِ نجات سمجھا گیا۔ متعدد ایسے سلسلے قائم ہوئے جو محدود مسیحی عبادتوں اور روزوں اور اس طرح کے احکام مذہبی کی بجا آوری میں کوتاہی نہ کرتے۔

لیکن جن کا اصل زور خدمتِ خلق یعنی تبلیغِ مذہب، توسیعِ تعلیم، غریبوں، بیماروں اور دوسرے حاجت مندوں کی خدمت اور اصلاحِ معاشرہ پر تھا۔ افسوس کہ ہمارے ہاں اس جذبے کی نشوونما نہ ہوئی۔ اللہ سے محبت کرنے والوں نے خلقِ اللہ سے محبت اور مخلوق کی عملی خدمت کا راستا اختیار نہ کیا، بلکہ زیادہ تر ریاضتوں اور مجاہدوں میں مستغرق رہے۔ اور آج بھی خدمتِ خلق کے معاملے میں مسلمان اہل مغرب سے ہی نہیں، بلکہ ہندوؤں اور بودھوں سے بھی پیچھے ہیں!

ہم اپنی تاریخ اور عہدِ اکبری کے حالات پر غور کریں تو ظاہری ٹیپ ٹاپ میں اضافے ظواہر میں زیادہ احتیاط اور اشغال و اعمال کی بہتر تدوین کے باوجود روحانی امور میں ایک "ترقی معکوس" نظر آتی ہے۔ ہمارے قدیمی صوفیائے کبار کی نسبت مستند مواد کم ہے۔ ملفوظات کے اکثر مجموعے جلی ہیں۔ لیکن فوائد الفواد کی صحت میں کلام نہیں۔ اسے بغور پڑھیں تو پتا چلتا ہے۔ کہ کس پر اثر طریقے سے اور کتنے تواتر کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیا اخلاقی پاکیزگی و بلندی اور بہتر انسان بننے کا سبق دیتے تھے۔ فوائد الفواد کا عہدِ مغلہ کے صوفی شاہکاروں سے موازنہ کریں تو صرف نظر آتا ہے کہ اگرچہ شرع کی پابندی پر زیادہ زور ہے۔ نادر اور لطیف "معارفِ عالیہ" کی افراط ہے۔ "واقعات" کا کثرت سے بیان ہے۔ (فی الحقیقت "متخیلات" کو "واقعات" کا نام دینا ہی ایک افسوسناک رجحان کی نشاندہی کرتا ہے)۔ نئے نئے اور اور مسمریزم جیسا اثر رکھنے والے اشغال و اعمال کا سبق ہے۔ لیکن اخلاقی پاکیزگی اور باطنی سر بلندی (یعنی بقول سلطان باہو "دل دا کوڑ" دور کرنے) سے وہ شغف، جو حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات میں نظر آتا ہے، موجود نہیں۔ گویا پابندِ شرع اور جو شیخ مسلمان بنانے کا سامان تو ہو رہا ہے۔ لیکن بہتر انسان بننے پر جو سچا مسلمان ہونے کے لیے آنا ہی (یا شاید زیادہ) ضروری ہے۔ پہلی سی توجہ نہیں رہی! مولانا مودودی نے تو مغرب کے مقابلے میں اسلامی ممالک کی فقط عقلی اور علمی پسماندگی کا ذکر کیا ہے، لیکن فی الحقیقت اس پسماندگی کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ اور اس کا آغاز اٹھارویں صدی سے بہت پہلے۔ عہدِ اکبری میں، بلکہ اس سے بھی پہلے ہو چکا تھا۔

رکن سلطنت نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید

گماں میر کہ بہ یک شیوہ عشق سے بازند
قباد و شگل و لاله بے جنوں چاک است!

علماء اور مشائخ نے عہد اکبری کی مذہبی کشمکش میں جو حصہ لیا، اس کا ذکر ہم کر چکے ہیں لیکن اسلام میں مذہب کی حمایت کسی ایک خاص طبقے کا فرض یا اجارہ نہیں۔ اسلام میں بعض دوسرے مذہبوں کی طرح پرستشوں یا پجاریوں کا کوئی علیحدہ طبقہ نہیں۔ جن کے بغیر مذہبی رسوم اور اہمی نہیں ہو سکتیں۔ ہر ایک مسلمان بطور خود نماز پڑھ سکتا ہے عبادت کے لیے اسے کسی پجاری کے واسطے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ انسانی فطرت کے اس رازدار (بانی اسلام) نے توہدایت کی تھی کہ نماز جمعہ کا خطبہ بجائے قاضی یا خطیب کے مسلمان حاکم پڑھے۔ دین کو کسی خاص طبقے کا اجارہ نہ بنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب اسلام پر جب کوئی کشمکش کا زمانہ آیا تو اسلام کی حفاظت کے لیے فقط مذہبی جماعتیں نہ اٹھیں بلکہ دنیا دار مسلمانوں نے بھی اس میں اپنی بساط کے موافق حصہ لیا۔ ہندوستان میں یہ رجحان دوسرے اسلامی ملکوں سے بھی زیادہ ہے۔ جب غلیجیوں کے زوال کے بعد ایک نیم مسلم غلام خسرو تختِ دہلی پر بیٹھا اور مسجدوں اور قرآنوں کی بے حرمتی ہونے لگی تو جس شخص نے اس صورتِ حالات کو ختم کیا۔ وہ دیپالپور کا حاکم غیاث الدین تغلق تھا۔ ۸۵۷ھ کے بعد اسلام پر مشنریوں کے حملے ہوئے تو ان کے جواب کے لیے فقط مولانا محمد قاسمؒ۔ مولانا رحمت اللہ اور دوسرے علمائے کرام ہی نہ اٹھے، بلکہ سرسید احمد خاں۔ سید امیر علی اور خواجہ کمال الدین نے بھی اس بارے میں کچھ کم کام نہ کیا۔

عہد اکبری میں بھی یہی ہوا۔ اکبر کے خیالات بگاڑنے میں جتنا دخل بعض علماء و مشائخ (مثلاً شیخ مبارک۔ ابوالفضل۔ حاجی ابراہیم سرہندی۔ شیخ امان پانی پتی کے بھتیجے ملا ابوسعید) کو تھا۔ امر کو نہ تھا، لیکن علماء میں ہی بعض بزرگوں نے حالات کو

سنوارنے کے لیے بڑی قربانیاں کیں۔ امرا کا معاملہ بھی اسی طرح تھا۔ انھوں نے دربار کے قواعد و آئین تسلیم کر لیے، لیکن بعضوں (مثلاً شہباز خاں کنبوہ - قطب الدین کوکہ - خاں اعظم) نے بڑی جرأت سے بادشاہ کو سمجھایا اور جب یہ کوشش ناکام رہی تو اپنے اثر و رسوخ سے اکبری بے قاعدگی کو دربار اور محل سے باہر عام ہونے سے روکا۔ عہد اکبری کے متدین امرا میں خاں اعظم - قلیج خاں اور دوسرے نام آتے ہیں، لیکن ان میں جو خاص مرتبہ شیخ فرید کا ہے کسی اور کا نہ تھا اور چونکہ انھوں نے دوسرے نیک اور برگزیدہ کاموں کے علاوہ طریقہ نقشبندیہ کو غیر معمولی مدد دے کر اسلامی ہندوستان کی مذہبی تاریخ پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اس لیے ان کے حالات تفصیل سے لکھے جانے کے مستحق ہیں۔ افسوس ہے کہ اس زمانے کے مؤرخین سے اس کام میں بہت تھوڑی مدد ملتی ہے۔ شیخ فرید کا ستارہ اس وقت چمکا۔ جب عہد اکبری کے مشہور مؤرخ مثلاً بدایونی اور خواجہ نظام الدین احمد مصنف طبقات اکبری، وفات پا چکے تھے اور عہد جاگیر کے مؤرخین بیشتر ان کی ملکی خدمات کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے سارے کارنامے کسی نے نہیں گنوائے۔ شیخ کے اپنے ایما پر دو تاریخیں لکھی گئیں۔ ایک شیخ عبدالحق محدث کے صاحبزادے شیخ نورالحق نے، جن کی شادی شیخ فرید کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ شیخ کے ایما پر اپنے والد کی تالیف تاریخ حق کو اضافہ کے بعد زبدۃ التواریخ کے نام سے مرتب کیا۔ دوسری کتاب اکبرنامہ ہے، جسے شیخ الہوداد فیضی سرہندی ابن ملا علی شیر نے لکھا، جو شیخ کی ملازمت میں تھا اور جس کے والد کے شاگردوں میں طبقات اکبری کے مؤلف بخشی نظام الدین احمد کا نام لیا جاتا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں بھی بہ تقاضائے موضوع فقط ملکی خدمات کا ذکر ہے۔ شیخ فرید کے باقی کارنامے کسی میں نہیں۔ ہم کچھ حضرت مجدد اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے مکتوبات اور ملفوظات سے اور کچھ مآثر الامرا اور دوسری تاریخی کتب سے پھول پتی جمع کر کے اس فخر روزگار کے مزار پر اعتراف و عقیدت کا گلہ سترہ پیش کرتے ہیں۔

شیخ فرید بخاری سید حقے۔ حکومت اسلامی کے دوران میں سادات مشائخ کی

قدر ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کے آباؤ اجداد کو بھی مدد معاش ملتی تھی اور اسی پر ان کی گزر تھی۔ شیخ کے جد چہارم سید عبدالغفار دہلوی کو خیال ہوا کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ انھوں نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ مدد معاش ترک کر دینی چاہیے۔ اور نوکری سپاہ گری اختیار کرنی چاہیے۔ چنانچہ اسی پر ان کی اولاد کا عمل رہا۔

شیخ فرید کے والد کا نام احمد بخاری تھا۔ ان کے ایک بھائی محمد بخاری تھے جو شیخ فرید کے بھائی سید جعفر کے ساتھ گجرات کے ایک معرکے میں ۱۵۷۷ء میں کام آئے تھے۔ احمد بخاری کے تو کوئی حالات نہیں ملتے لیکن شیخ محمد کا ذکر تواریخ کی کتب میں آتا ہے۔ اکبر کو ان کی وفاداری اور عقل پر بڑا بھروسہ تھا اور چہار کا قلعہ اسے شیخ کی کوششوں ہی سے ملا تھا۔ وہ ایک عرصہ تک اجمیر میں حضرت خواجہ کی درگاہ کے مہتمم رہے۔

شیخ فرید جن کا پورا نام ان کے لوحِ مزار پر شیخ فرید الدین لکھا ہے دہلی میں پیدا ہوئے۔ صغر سنی میں ہی اکبر کے ملازم ہوئے اور اپنی محاطہ فہمی، ذہانت، دیانتداری اور بہادری کی وجہ سے جلد شہرت حاصل کر لی۔ چنانچہ اکبر نے انھیں کئی اہم کام سرانجام دینے پر مامور کیا۔ ۱۵۹۵-۱۵۹۸ء میں جب ہندوستان میں سخت قحط پڑا تو لوگوں میں روپیہ اور اشیاے ضروری تقسیم کرنے کے لیے بادشاہ نے انھیں مقرر کیا اور سرکاری مدد کے علاوہ انھوں نے اپنے پاس سے بھی غریبوں اور محتاجوں کی بے انتہا مدد کی۔ اس کے بعد جب ۱۵۹۷ء میں اسیر گڑھ کے معرکے کے وقت حاکم خاندیش سے اکبر کے نمائندوں کی گفت و شنید تو شیخ فرید نے ہی اس موقع پر شہنشاہ کی نمایندگی کی۔ شیخ فرید کا منصب بہت بڑا نہ تھا۔ (اکبر کے چالیسویں سال جلوس تک وہ ابھی ڈیڑھ ہزاری تھے) لیکن چونکہ دیانتداری اور کارگزاری مسلمہ تھی۔ اس لیے انھیں اکثر ذمہ داری کے کام سونپے جاتے۔ جب انھیں میرنجی بنایا گیا تو ان کا اثر و اقتدار اور بھی بڑھ گیا بلکہ دیوان تن کے بھی

۱۵ دیوان تن دیوان تنخواہ کو کہتے تھے۔ سلطنت مغلیہ میں دیوان کل (وزیر عظم) کے دو نائب تھے۔ ایک دیوان تن اور دوسرا دیوان خالصہ۔ پہلے کے متعلق تمام ممالک محروسہ کے ملازمان اور جاگیرداروں کی [باقی اگلے صفحے پر]

کئی اختیارات ان سے متعلق ہو گئے۔ (اقبال نامہ جہانگیری)

شیخ فرید نے عہد اکبری کی مہموں میں حصہ لیا۔ ۸۳ھ میں جب بنگالہ میں افغانوں نے بغاوت کر رکھی تھی اور سپہ سالار جنگ خان اعظم اپنے جانشین کا انتظار کیے بغیر اپنی جاگیر پر حاجی پور (بہار) چلا گیا تو شیخ نے ہی ایک اور رفیق کے ساتھ معاملے کو ہاتھ میں لیا۔ بلکہ افغانوں کے سرگروہ قتل کی غداری کی وجہ سے مرتے مرتے بمشکل بچا۔ کشمیر کی مہم میں بھی شیخ فرید نے نمایاں حصہ لیا۔ (۸۶ھ) اس کے پانچ سال بعد مرزا یادگار نے اکبر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اکبر نے جن امرا کو بطور مہراول کے بغاوت فرو کرنے کے لیے بھیجا۔ ان میں خواجہ محمد اعظم مصنف تاریخ کشمیر "امیر الامرا" شیخ فرید بخاری میر بخش "کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ (ص ۱۱۷) ان کے پاس مختصر فوج تھی، لیکن لوگوں نے ان کا استقبال کیا اور ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ مرزا یادگار کا سرکٹ کر اکبر کے پیش ہوا۔ اسیر گڑھ کے محاصرے میں شیخ نے ۶۰ سالہ عمر میں جو کچھ کیا، ابوالفضل اس کی جا بجا تعریف کرتا ہے۔ تتمہ اکبر نامہ کے مطابق ۱۳۰۵ھ میں شیخ کا منصب بڑھا کر "چار ہزاری دو ہزار سوار" علم اور تقارے کے ساتھ کر دیا گیا۔ لیکن شیخ کی اہمیت اور اکبر کے دل میں اس کی قدر و منزلت کا اس سے بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کے لیے دوسرے قرائن پر نظر ڈالنی پڑتی ہے۔ ایشیائی ملکوں میں ایک بادشاہ کا کسی امیر کے گھر جا کر قیام کرنا جس احترام اور اختلاط کا پتا دیتا ہے وہ ظاہر ہے۔ آئین اکبری اور تونک جہانگیری سے پتا چلتا ہے کہ اکبر (اور پھر جہانگیر) نے کئی مرتبہ دہلی میں شیخ فرید کے ہاں قیام کیا۔ دہلی میں لال قلعہ کے قریب سلیم گڑھ ایک قلعہ نما عمارت ہے۔ عہد اکبری میں اس کے سب طرف جہنا بہنتی تھی۔ اکبر نے یہ عمارت شیخ فرید کو عطا کی ہوئی تھی اور وہ کئی مرتبہ اس میں شیخ فرید کا مہمان ہوا۔ آئین اکبری میں ۹۸۵ھ ۱۵۷۷ء

(بقیہ فٹ نوٹ ص ۱۵۶)

تنخواہ کا حساب کتاب تھا۔ دوسرے کے متعلق خالصہ شریفہ کا دفتر رہتا تھا۔ وزیر اعظم کے بعد یہ دونوں عہدے بہت معزز سمجھے جاتے تھے۔

کے ذکر میں ہے :-

”وار الملک دہلی بقدر دم شامشہی فروغ سعادت یافت منازل شیخ فرید بخشی بگی بمقتضائے التماس آل اخلاص گزریں خدمت گزارانہ پر تو گویاں خدیوہ نور آگین شد۔“
توزک جہانگیری میں جہانگیر سلیم گڑھ میں اپنے قیام کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے :-

”روز پنجشنبہ ہیز دہم دہلی محل نزول گردید و در منوے کہ سلیم خان افغان در ایام حکومت خود در میان آب بھمن ساخته بود و سلیم گڑھ نام نہادہ د والد نیز گوارم آنجارا بہ مرتضیٰ خان (شیخ فرید) کہ دہلی وطن اصلی اوست و احدہ بودندا فرو د آدم - خان مذکور بر دریا صفہ از سنگ ساخته در غایت لطافت ... در ایامیکہ حضرت جنت آشیانی در دہلی تشریف داشتند - اکثر اوقات آنجا نشستہ با مصاحبان و مجلسیان خود صحبت میداشتند۔“

شیخ فرید کا عہدہ میر بخشی کا تھا، لیکن جب ابوالفضل دکن کو رخصت ہوا اور پھر مارا گیا تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بادشاہ کے سب سے زیادہ حاضر باش اور معتد افسر شیخ فرید ہی تھے اور انھیں ہر قسم کے فرائض سپرد ہوتے تھے۔ مثلاً آئین اکبری میں لکھا ہے کہ جب اکبر کی ماں مریم مکانی وفات پا گئیں اور دربار میں ماتمی رسوم و آئین جاری تھے تو اس دوران میں دسہرہ کا تہوار آگیا۔ بادشاہ نے چاہا کہ بند و فوں کو یہ خوشی کا تہوار منانے کا موقع دینا چاہیے اور ماتم کی میعاد ختم کرنی چاہیے۔ چنانچہ شیخ فرید کو اس قسم کا فرمان جاری کرنے کا حکم ہوا۔ حالانکہ میر بخشی کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اس کے علاوہ اور کئی اہم موقعوں پر شیخ فرید کو پیچیدہ معاملات ہاتھ میں لینے پڑے۔ اکبر نامہ کے تتمہ میں جو ابوالفضل کی وفات کے بعد لکھا گیا، درج ہے کہ جب ابوالفضل کے قتل کی خبر دار الخلافہ میں پہنچی تو کسی کو ہمت نہ بڑھتی تھی کہ بادشاہ سے جا کر حقیقت حال کہے۔ آخر شیخ فرید کو یہ فرض ادا کرنا پڑا اسی طرح جب اکبر کے مرض الموت میں حکیم علی گیلانی کے معالجے سے تمام ہیکیات ناراض تھیں بلکہ جہانگیر بھی کہتا تھا کہ میرے باپ کو حکیم علی نے غلط علاج سے ہلاک کر دیا تو

حکیم نے شیخ فرید کے گھر جا کر پناہ لی۔ اکبر نامہ کا تتمہ نگار شیخ کے اس فعل کی شکایت کرتا ہے کہ انھوں نے کیوں حکیم علی کو امان دی۔ لیکن شیخ کے اثر و رسوخ کا اس بات ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تمام بیگمات اور نئے بادشاہ کے غیظ و غضب کے باوجود انھوں نے حکیم کو کوئی آزار نہ پہنچنے دیا۔

عہدِ جہانگیری میں شیخ کا مرتبہ بڑھ گیا بلکہ اکثر الامرا میں لکھا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں بلکہ تمام اعیانِ سلطنت سے باندی لے گئے (اعتبار و رتبہ اور اقراں و امثال بلکہ جمیع اعیان و ارکانِ سلطنت برگزشت) اس کا باعث ان کے دوہم کام بھٹے جو انھوں نے بڑی خوبی سے سرانجام دیے۔ ایک تو جہانگیری کی تخت نشینی کا اہتمام جس سے خوش ہو کر جہانگیر نے "صاحبِ سیف و قلم" کا خطاب دیا اور ان کا منصب بڑھا کر پانچزار دی کر دیا۔ دوسرا اہم کام خسرو کی شکست تھا جس پر اظہارِ خوشنودی کے لیے بادشاہ خود شیخ کے خیمے میں گیا۔ اس سے بغل گیر ہوا اور شیخ کو نوابِ مرتضیٰ خاں کا خطاب دے کر گجرات کا صوبیدار مقرر کیا۔ یہ واقعہ جہانگیری کے پہلے سال جلوس میں ہوا۔ اس کے چار سال بعد شیخ کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا گیا اور اسی عہدے پر انھوں نے ۱۶۱۶ء میں وفات پائی۔ بادشاہ نے انھیں قلعہ کانگرہ کی فتح پر مامور کیا تھا، کہ پٹھان کوٹ میں انھیں موت کا بلاوا آن پہنچا۔ حسبِ وصیت نعش کو دہلی میں لا کر ان کے بزرگوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

لیکن یہ صورتِ حالات عارضی ثابت ہوئی۔ جہانگیر نے امیر الامرا اور وکیلِ مطلق اپنے بچپن کے دوست شریف خاں (ابن عبد الصمد خاں مصور) کو کیا اور آہستہ آہستہ ایرانی امرا و دربار پر چھا گئے شریف خاں شیخ فرید کا شروع سے بدخواہ تھا۔ چنانچہ جب شیخ فرید خسرو کے تعاقب میں گئے تو شریف خاں نے کہنا شروع کیا کہ شیخ وائستہ معاملے کو طول دے رہا ہے اور اس کی نیت نیک نہیں ہے۔ (جہانگیر نامہ)۔ جہانگیر آخر تک ان کا معترف رہا، لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ جو وسیع اثر و اقتدار شیخ فرید کو اکبر کے آخری سالوں میں حاصل تھا پھر نصیب نہیں ہوا۔

نواب مرتضیٰ خان شیخ فریدی کی اسلامی ہندوستان کے امرا میں ایک عظیم النظیر حیثیت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے وجہ شخصیت دی تھی۔ ”بسیار خوش قد، بالا بلند خوش محاورہ بود“ لیکن ان کا اصل مرتبہ ان کے کاموں کی وجہ سے ہے۔ ان کے نیک کاموں کا سلسلہ بڑا وسیع تھا اور بزرگان کبار ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ حضرت مجددؒ ایک خط میں ان کی تعمیر مسجد کا ذکر کرتے ہوئے ان کو لکھتے ہیں: ”ایک درویش لاہور کی طرف سے آیا ہوا تھا۔ اس نے بیان کیا کہ شیخ جیو پرانی منڈی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے لیے حاضر ہوئے تھے اور میاں رفیع الدین نے آپ کی التفات کے اظہار کے بعد کہا کہ نواب شیخ جیو نے اپنی حویلی میں جامع مسجد بنائی تھی (یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب نواب شیخ فرید لاہور کے گورنر تھے)۔ الحمد للہ ذالک۔ حق تعالیٰ آپ کو زیادہ توفیق عنایت فرمائے مخلصوں اور اوریاروں کی اس قسم کی باتیں سن کر بہت ہی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ نے انقاس العارفین میں ایک ضیافت کا ذکر کیا ہے، جو نواب شیخ نے کسی رفاہ عام کی عمارت بنانے کے سلسلے میں منعقد کی تھی اور جس میں شہر کے سارے مشائخ کو دعوت دی تھی۔ اس سلسلے میں کہتے ہیں:-

”شیخ فرید بخاری کہ از احاطہ امر سے اس زمانہ بود و جامع بود در میان نجابت و صلاح و اعتقاد مشائخ صوفیہ عمارتے تعمیر داد۔ کاروانسرائے مشہور یاد گیرے۔“

ماثر الامرا میں ان کی داد و دہش کی داستان تفصیل سے لکھی ہے، جسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاید اسلامی ہندوستان کی ساری تاریخ میں اس پایہ کا سخی اور عالیٰ درجہ امیر کوئی نہیں ہوا۔ نواب شاہنواز لکھتے ہیں:-

لے ذخیرۃ الخواص ص ۱۴۱۔ ہم نے اسلامی حکومت کی جو تاریخ انگریزی میں لکھی ہے، اس میں شیخ فرید کی تصویر ایک معاصرانہ مرقع سے لے کر پیش کی ہے۔

لے اقبال نامہ جاگیر میں شیخ کی نسبت لکھا ہے: ”اگرچہ اسمت بخشی داشت لیکن بخشی بود وزیر نشان و چند سال دفتر تن را، کہ لازمہ خدمت دیوانی است از بے رشدی دیوان بجانب خود کشیدہ، محال جاگیر را بار بای طلب تنخواہ سے نمود۔ ظاہر و باطن شیخ بغایت آراستہ و [باقی اگلے صفحے پر]“

”شیخ ظاہر و باطن آراستہ داشت۔ شجاعت و اباحت جمع نموده بخشش عام اور در
فیض بروئے خلق باز کردہ۔ ہر کہ باور سیدے۔ چہرہ ناکامی و آئینہ خیال ندیدے۔“
آگے چل کر ان کی فیاضی کی تفصیلات دی ہیں۔ لکھا ہے کہ وہ دربار پہنچنے تک قبا
اور کمبل اور چادر اور پافر از راستے کے درویشوں میں تقسیم کرتے اور اشرفیوں اور روپوں
کی ریزگاری اپنے ہاتھ سے خیرات کرتے۔ ایک دفعہ ایک درویش نے سات مرتبہ ان کو
ان سے خیرات لی۔ آٹھویں بار پھر آیا۔ اس وقت شیخ نے اس کے کان میں کہا کہ
سات دفعہ جو کچھ لے گئے ہو اُسے چھپا کر رکھنا۔ کہیں دوسرے درویش تم سے
چھین نہ لیں۔ شیخ نے بیواؤں اور اہل خانقاہ اور ارباب توکل و احتیاج کا سالیانہ
مقرر کر رکھا تھا، جو خواہ وہ حاضر ہوں یا غیر حاضر انھیں باقاعدہ پہنچاتا تھا۔ جو لوگ
ان کی ملازمت میں وفات پا گئے تھے، ان کے بچوں کے لیے شیخ نے مناسب
ماہانہ مقرر کر رکھا تھا اور استاد مقرر کر کے ان کی تربیت کا انتظام کیا تھا۔ یہ بچے
شیخ کی گود میں اس طرح کھیلتے کہ گویا ان کے اپنے بچے ہیں۔ گجرات میں انھوں نے
سادات کی فہرست بنا کر ان کے بچوں کے لیے شادی کے اخراجات اپنی سرکار سے
مقرر کیے تھے، لیکن شیخ بھاٹوں اور میراثیوں کو جو امر کی تعریف میں کبت پڑھ کر
ان سے روپیہ بٹورتے تھے کچھ نہ دیتے۔ انھوں نے کئی مسافر خانے اور سرائیں تعمیر
کرائیں۔ احمد آباد میں ایک محلہ تعمیر کیا، جو ان کے نام پر بخاری محلہ کہلاتا ہے۔ مشہور
احمد آبادی عالم شاہ وجہ الدین کا روضہ اور مسجد بھی انھی کی تعمیر کی ہوئی ہیں۔ دہلی
کے قریب فرید آباد اور اس کی عمارتیں اور تالاب شیخ کی یادگار ہیں حضرت سلطان المشائخ
کے مزار پر انھوں نے صندل کا چھپر کھٹ بنوایا تھا اور اس پر سیپ کی چتر کاری کرائی
تھی۔ لاہور میں بھی ایک محلہ انھوں نے بنوایا۔ لیکن اپنے لیے کبھی کوئی مکان یا

(بقیہ فٹ نوٹ ص ۱۹۰)

سنبہ بود۔ بزرگی و دولت از وقدر و شرف داشت، نہ از بزرگی و دولت۔ شجاعت را بہ
سخاوت فراہم آوردہ غیر بالذات بود۔“

سویلی تعمیر نہیں کرائی۔ ہمیشہ اس طرح قیام کرتے کہ گویا کوچ پر ہیں۔ سپاہ کی تنخواہ اپنے روز بروز تقسیم کر دیتے۔ ہر روز ایک ہزار آدمی کو ان کی سرکار سے کھانا ملتا۔ پانسو کا کھانا تو ان کے گھر پر بھیج دیا جاتا اور پانسو کے ساتھ شیخ خود بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ لوگ کتنا بھی شور مچاتے، لیکن شیخ کی پیشانی پر شکن نہ آتا۔

نواب شاہنواز مصنف آثار الامرا نے بڑے بڑے امرا دیکھے تھے۔ وہ خود نظام الملک آصف جاہ کے زمانے میں برار کے دیوان اور پھر نواب ناصر جنگ کے وزیر رہ چکے تھے۔ سادات بارہ اور دوسرے عظیم الشان امرا کی فیاضیوں سے واقف تھے، لیکن وہ افسوس کرتے ہیں کہ شیخ فرید کے پائے کا انسان اس زمانے میں نہیں ملتا۔ وہ شیخ کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ وہی دن ہے اور وہی رات اور وہی ستاروں کی گردش، لیکن ملک اس قسم کے انسانوں سے خالی ہو گیا ہے۔ شاید وہ لوگ کہیں دوسری جگہ چلے گئے ہیں۔ ”سبحان اللہ! اگرچہ یہاں قلب لیل و نہار است ویر کر اکب و دویر سپہر۔ لیکن دریں جزو زماں ایں ولایت انیں مردم خالی است۔ شاید کہ بختہ دیگر مملکتے رفتہ اند۔“ نواب شیخ فرید فوت ہوئے تو ان کی تاریخ ہونی داد۔ خورد۔ برو یعنی اس نے لوگوں میں اپنا مال و زر تقسیم کر دیا۔ خود خرچ کیا اور دارین کی سعادتیں ساتھ لے گیا۔ جب وفات کے بعد اس امیر کبیر کا اثاثہ گنا جانے لگا تو معلوم ہوا کہ چونکہ اس حاتم ثانی نے اپنی زندگی میں ہی اپنا سب کچھ لوگوں کی حاجت روائی میں خرچ کر دیا تھا۔ اثاثہ میں ایک ہزار اشرفی کے سوا کچھ نہیں۔

عظیم النظیر فیاضی اور خدمات ملکی کے علاوہ شیخ فرید کا بڑا کام طریقہ نقشبندیہ کی حمایت اور سرپرستی ہے۔ ہندوستان میں اس سلسلے کا صحیح آغاز حضرت مجدد الف ثانی کے مرشد حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ نے کیا جو اپنی وفات سے چار پانچ سال پہلے اس کام پر مامور ہوئے۔ اس قلیل مدت میں ان کا سلسلہ بڑا وسیع نہ ہوتا، لیکن شیخ فرید نے

۱۰ حضرت مجددؒ کی سوانح عمری حضرات اقدس میں شیخ فرید کا ذکر حاتم وقت کہہ کر کیا گیا ہے (ص ۱۵۱)

ان کی اور ان کے سلسلے والوں کی کمال خدمت کی۔ خانقاہ کے سارے اخراجات اپنے فتنے لیے اور درویشوں اور دوسرے متعلقین کے لیے معقول وظیفے مقرر کر دیے تاکہ وہ مفکری سے اللہ اللہ کریں اور ارشاد و ہدایت میں مشغول رہیں۔ شیخ فریدؒ اور خواجہؒ کے تعلقات کچھ اس قسم کے تھے کہ حضرت خواجہؒ کی زندگی میں ہی نکتہ چیں کہتے تھے کہ حضرت خواجہؒ کی کامیابی شیخ فریدؒ کی وجہ سے ہے۔ یہ اعتراض کسی نے حضرت خواجہؒ تک بھی پہنچایا، لیکن آپ شیخ فریدؒ کی عظمت و فضیلت سے واقف تھے۔ آپ نے اس پر کوئی دھیان نہ دیا بلکہ شیخ فریدؒ کی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا۔ آپ کے ملفوظات میں لکھا ہے :-

ایک عزیز نے حضورؐ کی خدمت اقدس میں بیان کیا کہ بعض کوتاہ بین سیاہ دل کہتے ہیں کہ حضورؐ کی مشیخت کا مدار (یگانہ زمانہ مرجع خلق) نواب قدس القاب شیخ فریدؒ علیہ السلام کی دوستی پر ہے اور ہمیشہ رقعات میں جو شیخ کی طرف لکھتے ہیں ان کا منامہ قبلہ کا ہی سلامت باشند۔ تحریر فرماتے ہیں۔ فقرا سے اس قسم کی خوشامد اچھی نہیں حضورؐ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہم پر شیخ کے بہت حق ہیں۔ اور ان کے وجود کی برکت

۱۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعض مکتوبات سے جو حضرت خواجہؒ کے نام لکھے گئے، خیال ہوتا ہے کہ نہ صرف خانقاہ باقویہ کے درویشوں کا ذمہ شیخ فریدؒ نے لیا تھا بلکہ دوسرے فقرا، علما اور مستحقین کو جو کچھ شیخ فریدؒ کی سرکار سے ملتا۔ وہ حضرت خواجہؒ کی وساطت سے تقسیم ہوتا تھا۔ حضرت مجددؒ ایک خط میں مرشد کو لکھتے ہیں "لشکر سے ایک شخص نے آکر بیان کیا کہ دہلی اور سرہند کے وظیفہ دار فقرا کا رویہ گزشتہ خریف کی بابت حضورؐ کی بلند درگاہ کے خادموں کے حوالے ہوا ہے تاکہ حق ثابت کرنے کے بعد حق داروں کو پہنچا دیں۔۔۔ ہزار تنکہ فضلانہ شیخ ابوالحسن حافظ و اہل علم کے نام اور ہزار تنکہ فضلانہ شیخ شاہ محمد حافظ کے نام نواب شیخ کی سرکار سے مقرر ہے۔ دونوں مذکورہ بالا شخص زندہ ہیں۔۔۔ ان دونوں کا رویہ حامل عریضہ ہذا کے حوالے کر دیں۔" اس سے اگلا خط حبیب اللہ سرہندی کی والدہ اور اس کی بیوی اور دوسرے بزرگوں کے وظائف کی ادائیگی کے متعلق ہے۔

ہم نے بڑی فتوحات اور کشائش دیکھی ہیں۔ اب بھی ہمیں کوئی ایسی وجہ شرعی معلوم نہیں ہوتی جس کے باعث شیخ موصوف سے دوستی کا تعلق قطع کر لیں۔
حضرت مجدد الف ثانی بھی ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں: "حضرت قبلہ گاہی قدس (یعنی حضرت خواجہ باقی باللہ) فرمایا کرتے تھے کہ شیخ جو (شیخ فرید) کے حقوق تم سب پر ثابت اور مقرر ہیں۔ اس جمہیت کا باعث آپ ہی ہیں۔" یہ مکتوب حضرت مجدد نے شیخ موصوف کو مرشد کی وفات پر لکھا تھا۔ اس میں حضرت خواجہ کی وفات پر اظہار کرم کے لکھتے ہیں:-

"لیکن اللہ تعالیٰ کی حمد و در احسان ہے کہ اس ہولناک حادثہ اور وحشتناک واقعہ کے باوجود ان بے شمار مال و فخر کا مرنے والا مرد دنیا بھی دین و دنیا کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم کی اہل بیت سے سزاوارتر ہے۔ (شیخ فرید کی سیادت کی طرف اشارہ ہے) جو اس سلسلہ حلیہ کے انتظام اور نسبت نقشبندیہ کی جمہیت کا وسیلہ ہے۔

ہاں یہ نسبت حلیہ بھی جو اس ملک میں بہت غریب ہے اور اس نسبت والے لوگ ان ملکوں میں بہت محظوظ ہیں۔ چونکہ اہل بیت کی نسبت کی طرح ہے تو اس کا مرنے بھی اہل بیت ہی سے ہونا مناسب ہے۔ اس کی تقویت کے لیے بھی انہی نسبت والوں سے ہونا بہتر ہے تاکہ اس بڑی دولت کی تکمیل غیروں کے حوالے نہ کی جائے۔ جس طرح اُس بڑی نعمت کا شکر فقرا پر واجب ہے اسی طرح اس دولت کا شکر بھی ان کے ذمے لازم ہے۔ انسان جس طرح باطنی جمہیت کا محتاج ہے اسی طرح ظاہری جمہیت کی بھی اس کو احتیاج ہے۔۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ خدا تعالیٰ کی توفیق سے ان فقرا کی ظاہری جمہیت کے ضامن اور کفیل آپ ہی ہیں۔

ایک اور خط میں حضرت مجدد لکھتے ہیں:-

"ہر کسے کہ شکر آدمی بجا نیارد۔ شکر خدا کے عزوجل بجا نیارد۔ پس بر ما فقیرا ذکر احسان شما لازم است۔ اولاً سبب جمہیت خاطر حضرت خواجہ (حضرت

خواجہ باقی باللہؒ، شہماوردہ ایدہ۔ لطفیل شہادراں جمعیت طلب حق سبحانہ و تعالیٰ
کریم و حفظہائے واقربہ دیم و ثانیاً چوں بحکم کبوت ہمتاً لکبواء نوبت بایں
طبقہ رسید۔ واسطۂ اجتماع فقر و باعث انتظام طالبان نیز شہما سید جزاکم اللہ

گر برتن من زباں شود ہر موسے

یک شکر تو از ہزار نتواں کرد

شیخ فرید کے حسن عقیدت اور دستِ کرم نے بہت سے مزارات کی شان و
شوکت بڑھائی، لیکن ان کا اپنا مزار کس میرسی کی حالت میں ہے۔ دہلی سے قطب کو جو
راستا جاتا ہے، اس پر ایک سڑک حضرت چراغ دہلی کو مڑتی ہے، اس سڑک پر ایک
سرخ گنبد کے سامنے ایک قبرستان میں شکستہ چار دیواری کے اندر بہت سی قبریں ہیں
ان کے درمیان لوہے کے ایک مختصر کھڑے کے اندر سنگ مرمر کی ایک چھوٹی سی
قبر ہے۔ سر پرانے قد آدم کتبہ سنگ مرمر کا لگا ہوا ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے:-

یا اللہ

سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوت وَلَا يَفُوت

در زمان دولت حضرت عرش آشیانی جلال الدین اکبر بادشاہ غازی شیخ فرید الدین
سید احمد بخاری بعنايات آنحضرت ممتاز بود و در عهد عدالت نور الدین جہانگیر بادشاہ
ابن اکبر بادشاہ ب خطاب مرتضیٰ خاں سرفراز گمردید تباریخ ۹۰ جلوس مطابق ۱۲۵۰
ہجری برحمت الہی پیوست۔

مرتضیٰ خاں چوں بحق واصل شد گشت اقلیم بقا مفتوحش
بہر تاریخ ملائک گفتند باد پر نور الہی روحش

۱۔ ذخیرۃ الخوانین سے پتا چلا۔ کہ یہ شیخ کی اپنی مرضی کے مطابق تھا۔ چوں شیخ بجز میت ہم
کاگرہ بدلی رسید، بطواف پدر و اجداد بزرگوار خود رفت۔ جانے قبر خود را در تحت اقدام بزرگان خود
نشان داد کہ در آنجا مدفون سازند۔ و نہ ہمار عمارت بر سر قبر باگفتند۔ در رنگ قبر غریباں باشند۔ (ص ۱۲۸)

حضرت خواجہ محمد باقی باللہ قدس سرہ

خواجہ باقی باللہ | عہد اکبری میں علماء و صلحا کی کوئی کمی نہ تھی۔ مورخین عہد نے ان کی جڑ طویل فہرستیں دی ہیں، ان سے خیال ہوتا ہے کہ اس دور کو علم اور تصوف کا عہد بتی سمجھنا چاہیے، لیکن عام طور پر ان بزرگوں نے عہد اکبری کی مذہبی اور عجیبوں کو روکنے کے لیے کوئی موثر کوشش نہ کی۔ ان میں سے جو غالی وحدت الوجودی خیالات کے تھے (مثلاً شیخ امان پانی پتی کے قبیلہ دار) وہ تو اکبر کی مذہبی اختراعوں میں اس کے شریک کار ہو گئے۔ جو شیخ عبدالحق محدث کی طرح ان اختراعوں سے متنفر تھے، وہ دربار سے کنارہ کش رہے اور گوشہ تنہائی میں اللہ اللہ یاد دہا کر تدریس کرنے لگے۔ مخدوم الملک اور شیخ عبدالباقی صدر الصدور کو آپس کی مخالفتوں اور دوسری کمزوریوں نے بے اثر کر دیا تھا۔ جنپور کے ملا محمد یزدی اور پنجاب کے علماء اکبر کی تعزیری کوششوں کا شکار ہو گئے۔ فتنے کا سد باب اور حالات کی اصلاح کسی سے نہ ہو سکی۔ دربار اکبری کے مذہبی رجحانات کے خلاف مستحکم محاذ ایک ایسے بزرگ نے قائم کیا جنہوں نے حصول فیض اور ارشاد و ہدایت کے لیے ایک زمانہ ہندوستان میں گزارا تھا، لیکن وہ پھر ماوراء النہر گئے اور نقشبندیہ سلسلے میں منسلک ہونے کے بعد عہد اکبری کے آخر میں دوبارہ ہندوستان آئے۔ اس کے بعد انھیں چار پانچ سال سے زیادہ کام کرنا نصیب نہیں ہوا، لیکن اپنی روحانی پاکیزگی اور سر بلندی سے انھوں نے اکبر کے اراکین سلطنت (مثلاً شیخ فرید، قلیچ خاں، صدر جہاں) اور علماء و مشائخ (مثلاً حضرت مجدد الف ثانی، شیخ عبدالحق محدث) کو اس طرح مستحکم کیا۔ اور بالجمہ ملک میں اسلامی روحانیت کی ایک ایسی زبردست لہر دوڑادی اور (اکبر کی براہ راست مخالفت کیے بغیر) اس طرح ایک نئی دینی زندگی کا آغاز کیا کہ اس فضا میں اکبری رجحانات کا فروغ پانا ناممکن ہو گیا۔

خواجہ باقی باللہ کا طریق کار وقت کی ضرورت کے لیے خاص طور پر موزوں تھا

عام طور پر ہمارے اہل اللہ ارباب اقتدار سے الگ تھلگ رہے۔ چنتی، سہروردی، قادری سلسلوں کی تمام روایات گوشہ تنہائی میں یاد خدا کرنے کی ہیں، لیکن اس وقت برابر شاہی سے بدعت و تجدد کی لہریں آ رہی تھیں اور اگرچہ ان سے عوام پر کوئی اثر نہ ہوا تھا، بعض درباریوں کے طور طریقے بگڑ گئے تھے۔ اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ ارباب فیض و رہبر شاہی اور ارباب اقتدار سے الگ تھلگ رہنے کی بجائے ان سے ربط و ضبط پیدا کریں اور ان خرابیوں کی اصلاح کریں جو اکبر کی مذہبی اور معاشرتی بدعتوں نے پیدا کر دی تھیں۔ صوفیہ میں اس طریقہ کار کے سب سے بڑے ورثہ جہان نقشبندی حضرات ہیں جن کے ایک مشہور بزرگ خواجہ عبید اللہ احرار کا ایک قول حضرت مجدد الف ثانیؒ کے کئی مکتوبات میں نقل ہوا ہے۔

”اگر ماضی سے کر دیم۔ دریں روزگار هیچ مرید نماند یافت، لیکن مارا کار دیگر فرمودہ اند کہ مسلمانان را از شر ظلم نگاہداریم۔ بواسطہ ایں بباد شاہان بالیست اختلاط کردن و نفوس ایشان را مستحضر گردانیدن و بتوسط ایں عمل مقصود مسلمین بر آوردن۔“

ہندوستان میں جس بزدگ نے اس اصول پر سب سے پہلے کثرت سے عمل کیا اور نہ صرف ہندوستان میں نقشبندی سلسلے کی مستحکم بنیاد رکھی بلکہ امرا و اکابر سے اختلاط پیدا کر کے نہایت خاموشی سے درباری بدعتوں کے خلاف متشرع اور دیندار امرا کا محاذ قائم کیا، وہ حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ بزرگ تھے جنہیں حضرت خواجہ عبید اللہ احرار سے خاص طور پر تعلق خاطر تھا۔ انھوں نے سلسلہ الاحرار کے نام سے جو رباعیات لکھیں ان میں سے ایک یہ ہے۔

ایں سکھ کہ من ز دم بنام فقر است دیں روشنی از نور تمام فقر است
بر خیز و رہ خواجہ احرار بکھر کال راہ ز سرحد مقام فقر است
حضرت خواجہ باقی باللہؒ ۵ ذی الحجہ ۱۰۱۹ھ یعنی ۱۵ جولائی ۱۵۹۲ء کو بمقام کابل

۱۰ یہ تاریخ حافظ عزیز حسن تعالیٰ نقشبندی کی تالیف سیرت باقی میں درج ہے۔ اس کتاب میں اسما و سنین کی بعض غلطیاں ہیں، لیکن چونکہ مصنف حضرت خواجہ کی اولاد سے تھے، اس لیے ہم نے [باقی اگلے صفحہ پر]

پیدا ہوئے۔ اسم مبارک محمد رضی الدین تھا، لیکن زیادہ تر باقی باللہ یا محمد باقی باللہ یا عبد الباقی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کے والد قاضی عبدالسلام خود اہل علم تھے۔ انھوں نے شروع سے آپ کی تعلیم و تدریس پر نظر رکھی۔ جب ابتدائی مراحل طے ہو گئے تو آپ ملا صادق حلوانی کی خدمت میں پہنچے جو اس زمانے کے ایک مشہور فاضل اور ایک خوش گو شاعر تھے۔ ان کا وطن سمرقند تھا، لیکن جب وہ ۱۲۵۷ھ میں حج سے واپس آئے تو اکبر کے چھوٹے بھائی مرزا حکیم نے جو کابل کا حکمران تھا، انھیں آمادہ کیا کہ وہ کابل میں کچھ عرصہ قیام فرما کے وہاں سلسلہ تدریس شروع کریں۔ خواجہ باقی باللہ وہیں ان کے حلقہ شاگردی میں داخل ہوئے اور جب وہ کابل چھوڑ کر ماوراء النہر چلے گئے تو خواجہ بھی ساتھ تھے۔

خواجہ صاحب نے علوم متداول بڑی تیزی سے حاصل کرنے شروع کیے۔ آپ کے عزیز واقارب اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے اور ان کی خواہش تھی کہ آپ بھی تکمیل تعلیم کے بعد اسی سلسلے میں منسلک ہو جائیں۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ تحصیل علوم کا ابھی کچھ حصہ باقی تھا کہ آپ کو بعض ایسے معاملات پیش آئے کہ آپ کی توجہ حقیقت و معرفت کی طرف منحطف ہو گئی اور مرشد راہ نما کی تلاش شروع ہوئی۔ پہلے اپنے گرو و نواح میں نظر دوڑائی اور ماوراء النہر اور افغانستان میں جو صوفی اور مشائخ تھے، ان کی خدمت میں حاضر ہو کر تزکیہ نفس کی کوشش شروع کی، لیکن دل کا مقصود حاصل نہ ہوا۔ حضرت خواجہ کی جو روحانی سرگزشت ان کے ملفوظات میں ان کے ایک خط سے ماخوذ ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ نگاہ بڑی اونچی تھی۔ اس لیے خاطر خواہ صفائی قلب اور تسکین میسر نہ آتی تھی۔ پہلے خواجہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر گناہوں کو توبہ کی، لیکن اس پر ایسے کچھ طے معیار کے مطابق قائم نہ رہ سکے پھر حضرت شیخ افتخار کی خدمت میں حاضر

[نقصہ ذکر شدہ] اختیار کیا۔ نبدۃ القلائد ماہ وریوم نہیں۔ سال ولادت باختلاف قولین ۹۴۱ھ یا ۹۴۲ھ ہجری لکھا ہے۔ حیات باقیہ میں اس اختلاف کا حل یہ بتایا گیا ہے کہ آپ ۹۴۱ھ ہجری کی اخیر تاریخوں یا ۹۴۲ھ ہجری کے ابتدائی ایام میں پیدا ہوئے۔ میرت باقی کی درج کردہ تاریخ اس قیاس پر پوری اتمتی ہے۔

ہو کر اصلاح حال کی کوشش کی۔ وہ بزرگ راضی نہ تھے اور فرماتے تھے کہ تم جوان ہو لیکن چونکہ حضرت کا ارادہ پکا تھا اس لیے چار و ناچار قاتحہ پڑھا اور دُعا فرمائی کہ خدا کے تعالیٰ استقامت بخشے، لیکن یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی اور طرح طرح کی خرابیاں آئیں۔ اس کے بعد آپ نے امیر عبداللہ بلوچی کی خدمت عالیہ میں حاضر ہو کر از سر نو توبہ کی۔ اب طبیعت کو استقامت حاصل ہوئی۔ آئینہ طبیعت صاف ہو گیا اور مدارجِ روحانی میں ترقی شروع ہوئی، لیکن ہمت غضب کی تھی اس بلندی پر پہنچنے کے بعد بھی دل نہ مانتا تھا کہ فیض کے کسی سرچشمے سے محروم رہ جائیں۔

بیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو باز مہداشت
دانہ سے چیدم دلاں رُوندے کہ خرمی و اشتم

زبدۃ المقامات میں آپ کی نسبت لکھا ہے:-

”و تقرید ایشاں را آں پایہ بود کہ از بدایت تا نہایت پہنچ یک از احوال بلند و مکاشف
ارجمند سہمت ایشاں فرود نمے آمد۔ در عین بحر یافت دم از نایافت زدہ خشک لب
بودند۔ ایں رباعیہ شریفہ نیز دلالت بر حال ایشاں نماید۔ رباعی

در راہِ خدا جملہ ادب باید بود تا جاں باقیست در طلب باید بود
دریا دریا اگر بکامت بریزند گم باید کرد و خشک لب باید بود

چنانچہ پیرانِ کامل کی تلاش جاری رہی۔ اس سلسلے میں آپ عنفوانِ شباب میں ہی (در آغاز برائی) برکوچک ہندو پاکستان میں آگئے اور مختلف بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ آپ کے ملفوظات میں کشمیر جاکر شیخ بابا والی سے فیض حاصل کرنے کا ذکر بھی ملتا ہے۔

۱۵ شیعہ چکوں کی حکومت پر کشمیر کے صلی اکبر کی حکومت کو اس طرح ترجیح دیتے تھے کہ بابا داؤد خاکی اور شیخ یعقوب میرنی کشمیری نے اکبر کے پاس حاضر ہو کر اسے کشمیر فتح کرنے کی ترغیب دی اور جب مرزا داؤد گار نے اکبر کے خلاف بغاوت شروع کر کے عوام کو اکبری حکام کے خلاف ورغلانا چاہا تو شیخ بابا والی نے عوام کی تسکین کی اور اس کوشش میں جان دی۔ بغاوت فرو کرنے کے لیے اکبر نے جوہر اولیٰ امر ایچچان میں شیخ فرید سرفراز تھے۔ اس وقت خواجہ باقی باللہ شیخ بابا والی کی درگاہ میں تھے۔ کیا شیخ فرید اور حضرت خواجہ کے تعلقات پہلی مرتبہ اس زمانے میں استوار ہوئے؟ (ملاحظہ ہو تاریخ اعظمی)

وہ ترکستان کے رہنے والے تھے۔ شیخ حسین خوارزمی کے خلیفہ خاص تھے۔ ۹۹۹ھ میں کشمیر تشریف لائے، لیکن دو سال بعد مرزا یادگار نے جس نے اکبر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا، انھیں زہر دلا دیا۔ تفصیل اس کی تاریخ کشمیر (اعظمی) میں بدین الفاظ درج ہے: ”یادگار مرزا یادگار کہ میان مردم کشمیر و کسان اکبر بادشاہ نفاق شدہ کار بہ فتنہ عظیمہ انجامیدہ بود۔ جناب شیخ خود توجہ فرمودہ رفع نزاع کردند۔ بہرہاں قضیہ مخالفان دین و دولت شریعت مسموم بہ شیخ رسانیدہ شہید ساختند“ (ص ۱۰۹)۔ حضرت خواجہ اس دوران میں کشمیر میں آکر ان سے مستفید ہوئے۔ خواجہ محمد اعظم لکھتے ہیں کہ خواجہ دو سال تک شیخ بابا والی کی صحبت میں رہے۔ انھیں سلسلہ نقشبندیہ میں بھی تعلیم کی اجازت تھی۔ ”اور طالب کی استعداد بھی اپنے بزرگوں کی طرف لگی ہوئی تھی“۔ اس لیے اس سلسلہ سے تعلق خاطر ہو گیا۔ پیروان طریقت سے فیض حاصل کرنے کے لیے اور مرشد کی تلاش میں خواجہ باقی باللہ جابجا گئے۔ سنبھل میں شیخ الہ بخش سنبھلی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ خرد کے رسالہ رباعیات و شرح رباعیات میں سید علی لودی بانہ (۹) اور شیخ الہ بخش گڑھ مکتبہ دی کے بھی نام اس سلسلے میں آتے ہیں۔ ایک تذکرے میں آپ کے سفر سرہند اور وہاں کے قیام کے دوران حضرت مجدد الف ثانی کے والد شیخ عبدالاحد کے متعلق استفسار کرنے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ وہ ان دنوں سرہند سے باہر تھے۔ آخر میں آپ دہلی آئے اور حشمتیہ سلسلہ کے نامور بزرگ شیخ عبدالعزیز کی خانقاہ میں مقیم ہوئے۔ اور ان کے صاحبزادے شیخ قطب العالم کی خدمت میں رہ کر یاد دہی کرنے لگے۔ شاہ ولی اللہ انفاس العارفین میں لکھتے ہیں کہ ایک رات شیخ قطب العالم پر منکشف ہوا کہ حضرت خواجہ کا حصہ بخارا میں ہے۔ وہ اُسی وقت باہر آئے۔ اور حضرت خواجہ سے کہا

”شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں: ”بعد ازاں کہ خواجہ محمد باقی بہ نشر طریقہ نقشبندیہ مشغول شد قطب العالم بسیار بخدمت مے رسید۔ و فیض صحبت کہ عمدہ دریں طریقہ ہماں است حاصل مے کرد۔ اگرچہ در مبداء حال بخدمت شیخ تلمذ کردہ اند۔ و در خانقاہ ایشان مے تہ مجاورت نمودند۔“

کہ آپ کو مشائخ بخارا بلاتے ہیں۔ روانہ ہو جائیے۔ اس وقت خرقہ موجود نہ تھا۔ فقط ایک ازار تھی۔ شیخ نے وہ عنایت کی۔ حضرت خواجہ نے اسی کو بطور دستار کے لپیٹا اور بخارا روانہ ہو گئے۔ شاہ صاحب نے یہ روایت اپنے بزرگوں سے یا دہلی میں خانقاہ باقویہ کے کسی بزرگ سے سنی ہوگی۔ اسے لفظ بلفظ صحیح ماننا ضروری نہیں۔ حضرت خواجہ کو سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق خاطر پہلے سے تھا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ آپ کا میلان دیکھ کر یا اپنے کشف سے اندازہ لگا کر شیخ قطب العالم نے آپ کو بخارا جانے کا مشورہ دیا ہو۔ لیکن حضرت خواجہ کے ایک رقعہ سے جسے ہم آگے چل کر نقل کریں گے۔ یہ خیال ہوتا ہے کہ ماوراءالنہر کا سفر بخیر کسی تیاری یا سوچ کے اضطراری حالت میں نہیں ہوا۔ اس رقعہ میں وہ لکھتے ہیں: ”دریں روز ہاداعیہ سیر ولایت قوی گشتہ۔ امید است کہ بعد از چند روز دیگر متوجہ شویم۔“

ماوراءالنہر میں آپ اکمنہ (مضافات سمرقند) کے مولانا خواجگی کی خدمت میں پہنچے جن کا عبداللہ خان ازبک والی توران بڑا معتقد تھا اور جنہوں نے عزت گزینی اور ستر احوال کے باوجود ملکی معاملات میں نتیجہ خیز جھٹ لیا تھا۔ انہوں نے کمال محبت سے آپ کے نقشبندی سلسلے میں تعلیم دی۔ خلافت عطا کی اور ہندوستان کو واپسی کا حکم دیا۔ مولانا ہاشم کشمی زبدۃ المقامات میں مولانا خواجگی املنگی کے بعض عزیزوں کی بنانی لکھتے ہیں کہ جب حضرت خواجہ کو چند روز کی حاضری کے بعد خلافت مل گئی تو مولانا کے قدیمی دوستوں نے شکانت کی، لیکن مولانا نے فرمایا کہ اس کا معاملہ تربیت کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ فقط تصحیح احوال کی ضرورت تھی۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی حضرت خواجہ نے اپنی ہمت بلند کی وجہ سے ارشاد کا وسیع سلسلہ شروع نہ کیا تھا، لیکن وہ مقامات عالیہ تک پہنچے ہوئے تھے۔ اور سفر ماوراءالنہر سے پہلے ہی اہل نظر ان کے پاس کھینچ کر آتے تھے۔ ان کے برگزیدہ خلق میں سے کم از کم تین اس سفر سے پہلے ان کی

خدمت میں حاضر ہو چکے تھے۔ ایک تو [ابوالفضل کے بہنوئی] خواجہ حسام الدین تھے جنہوں نے بیعت تو سفر ماوراءالنہر کے بعد کی، لیکن اس سے پہلے وہ آپ کی صحبت میں رہ چکے تھے (زبدۃ المقامات)۔ دوسرے آپ کے اولین مُريد شیخ تاج الدین سنبھلی تھے اور تیسرے شیخ الہ داد جنہیں آپ نے اپنی غیر حاضری میں اپنے رفقا کی خبر گیری پر کی چنانچہ ایک مخلص کے نام اس زمانے کا ایک خط ہے:-

”دیں روز ہا داعیہ سیر ولایت قوی گشتہ۔ امید است کہ بعد از چند روز دیگر متوجہ شویم۔ و خدمت شیخ الہ داد، خوشنق داری کردہ خود را بہ بردن و ماندن قرار دادند۔“

داغ بے یاری و در در بیدلی

ایں ہمہ بر خود پسندیدیم و رفت

بارے ہر کرامت ایشاں عیسر شود۔ غنیمت است.....

داویم ترا ز گنج مقصود نشان گرمانہ رسیدیم، تو شاید برسی

ماوراءالنہر سے واپسی کے بعد حضرت خواجہ پہلے لاہور آئے۔ لاہور میں آپ کی آمد کا سال تذکروں میں نہیں ملتا۔ لیکن لاہور سے آپ دہلی آئے اور یہاں کچھ عرصے کے بعد حضرت مجددؒ نے آپ کی بیعت کی۔ اس بیعت کا سال زبدۃ المقامات میں سنہ ہجری (جس کا آغاز ۲۴ جولائی ۱۵۹۹ء کو ہوا) درج ہے۔ قرین قیاس ہے کہ اس بیعت سے پہلے حضرت خواجہ کو دہلی میں قیام کرتے آتنا عرصہ گزر گیا ہوگا کہ ان کا بلند مرتبہ روحانی ملقول میں مستکم ہو جائے۔ ورنہ حضرت مجددؒ جو حج کے ارادے سے گھر سے نکلے تھے، علم و عرفان کی اتنی منزلیں طے کر چکے تھے اور عمر میں بھی حضرت خواجہ سے کم نہ تھے، شاید ہی ان کی طرف متوجہ ہوتے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ اس بیعت سے پہلے دہلی میں حضرت خواجہ کو قیام فرمائے کم از کم ایک سال ہو گیا ہوگا۔ اور یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ دہلی آنے سے پہلے آپ نے زبدۃ المقامات کے ایک اندراج کے مطابق لاہور میں ایک سال گزارا۔ (ممکن ہے مدت قیام کچھ اس سے زیادہ ہو) تو قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۱۵۹۶ء میں (یا شاید اس سے پہلے) لاہور پہنچ گئے

ہوں گے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب اکبر اپنے درباریوں کے ساتھ لاہور میں مقیم تھا۔ کلزا اربار
میں جو آپ کی وفات کے دس سال بعد مکمل ہوئی، لکھا ہے۔ ”جب آپ دارالسلطنت
لاہور میں پہنچے تو شیخ فرید بخاری اکبر شاہ کے بخشی بیگی جو نہایت غریب دوست شخص تھے۔
انھوں نے آپ کے روزینہ مصارف کی ذمہ داری اپنے اوپر لازم کر لی۔“ اس عبارت
میں اس انتظام کی طرف اشارہ ہے، جس کے تحت شیخ فرید نے آپ کی خانقاہ
کے اخراجات اپنے ذمہ لے لیے تھے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ آپ
لاہور اس زمانے میں تشریف لائے جب شیخ فرید (اور اکبر اور اس کے دو کئے رباری)
ابھی لاہور میں تھے۔ اس امر کی تائید ایک اور بات سے ہوتی ہے۔ ”زبدۃ المقامات
میں حضرت خواجہ کی نسبت لکھا ہے۔“ آپ کی شفقت و رحمہ کی یہ حالت تھی کہ ایک
دفعہ شہر لاہور میں سخت قحط سالی واقع ہوئی۔ اس زمانے میں آپ شہر لاہور میں تشریف
رکھتے تھے۔ ”کئی روز تک آپ نے کھانا نہیں کھایا۔ جب آپ کے سامنے کھانا لایا
جانا۔ فرماتے، انصاف سے بعید ہے کہ کوئی بھوکا پیاسا گلی کو چوں میں جان دے اور ہم
کھانا کھائیں۔ جس قدر کھانا ہوتا۔ سب آپ بھوکوں کے لیے بھجوا دیتے۔“ (زبدۃ المقامات)
اس اندراج میں یقیناً اس عظیم قحط کی طرف اشارہ ہے، جو شمالی ہندوستان میں ۱۵۹۵ء
سے ۱۵۹۸ء تک جاری رہا۔ اور جس میں اکبر نے لوگوں میں روپیہ اور اشیا سے ضروری کی
تقسیم کا کام شیخ فرید کے سپرد کر رکھا تھا۔

اکبر نے ۱۵۸۵ء سے ۱۵۹۸ء تک لاہور کو اپنا دارالسلطنت بنائے رکھا۔ وہ بالآخر
یہاں سے ۴ نومبر ۱۵۹۸ء کو آگرے کی طرف روانہ ہوا۔ اکبر کے قیام لاہور کے آخری دو
سال اس لیے اہم ہیں کہ اس دوران میں ابوالفضل کا ستارہ گردش میں آگیا۔ اور
شیخ فرید کا معاملات ملکی میں عمل دخل بہت بڑھ گیا۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ مئی ۱۵۹۷ء
میں ابوالفضل کی یہ حالت تھی کہ اس نے دربار جانا ترک کر دیا۔ بلکہ خود کشی یا خانہ بدوشی
کے ارادے بھی اس کے ذہن میں آئے۔ پھر جنوری ۱۵۹۹ء میں اس کے مخالفوں نے
اسے دکن بھجوا دیا۔ جہاں سے اسے آگرے واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ (اکبر نامہ)

لاہور سے حضرت خواجہ دہلی تشریف لے گئے۔ قلعہ فیروزی میں قیام فرمایا اور ہدایت خلق میں مشغول ہوئے۔ یہاں آپ کو بڑا عروج ہوا اور حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث جہسی ہستیاں آپ کے حلقہ عقیدت میں داخل ہوئیں، لیکن افسوس کہ آپ کو طویل عمر نصیب نہیں ہوئی۔ دہلی میں آپ کا قیام تین چار سال سے زیادہ نہیں ہوا۔ اور آپ نے ابھی عمر کے چالیس سال ہی ختم کیے تھے کہ تیس دسمبر ۱۶۰۲ء کو روح مبارک قید جسم سے آزاد ہو گئی۔

حضرت خواجہ کے واقعات زندگی کہیں تفصیل سے جمع نہیں ہوئے۔ فقط ان کے چند روز کے ملفوظات اور مختصر حالات ایک ایسے بزرگ کی بدولت جمع ہو گئے ہیں، جنہوں نے اپنا نام نہیں بتایا۔ لیکن جن کی نسبت ایک اندراج سے خیال ہوتا ہے کہ وہ ”استاذی“ میاں شیخ احمد سرہندی (حضرت مجدد الف ثانی) کے شاگرد تھے۔ زبدۃ المقامات اور حضرات القدس میں بھی حالات ہیں، لیکن معاصرانہ تذکروں کو بغور پڑھیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ حالات بالکل نامکمل ہیں۔ اور ان سے حضرت خواجہ کے کام اور ان کے فیض یافتگان کی تفصیل کا بالکل اندازہ نہیں ہو سکتا۔ معاصرانہ اور قریب الحد تذکروں مثلاً طبقات شاہجہانی میں متعدد ایسے بزرگوں کے نام آتے ہیں جنہوں نے آپ سے فیض پایا یا جنہیں آپ نے تھوڑی سی تعلیم دے کر مزید تربیت کے لیے حضرت مجدد کے سپرد کیا۔ لیکن آپ کے حالات میں ان کا بالکل ذکر نہیں۔ ان منتشر بیانات پر غور کریں اور دیکھیں کہ آپ کے فیض یافتگان ملک کے کس کس حصے سے تھے تو خواجہ بدرالدین سرہندی (مرید حضرت مجدد الف ثانی) کے بیان کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے اور خیال آتا ہے کہ آپ نے مختصر مدت میں ایک زبردست روحانی تحریک جاری کر دی تھی۔ اور ملک کے گوشے گوشے سے علما و فضلاء اور مشائخ و مجاہدین بزرگ ”چوں مورو ملخ“ پروانہ وار آپ سے فیض حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ خواجہ بدرالدین سنو ات الاتقیاء میں حضرت خواجہ کی نسبت لکھتے ہیں:-

”رواج سلسلہ عالیہ نقشبندیہ و اشترار و انتشار میں طریقہ انیسۃ در دیار ہندوستان

انہ آنحضرت است۔ قطب وقت بودند۔ علما و فضلا و مشائخ و سجادہ نشینان از
راہ دور و نزدیک بہ درگاہ ولایت پناہ اور چوں مورد ملخ سے رختند۔ و عرفا و صلی
از کنار زمیں بجناب عرفاں مآب ادچوں پروانہ بر شمع گردے آمدند۔
دوسرے ذرائع سے بھی خواجہ بدرالدین کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً
زبدۃ المقامات میں لکھا ہے :-

بعض طلاب دور دراز جگہوں سے آپ کی خدمت میں پہنچے۔ اور بہتوں کو تو اٹلے
راہ میں آپ کے انتقال کی خبر ملی (ترجمہ)

اسی کتاب میں خواجہ ہاشم کشمی لکھتے ہیں کہ آپ کی تشریف آوری کے بعد شہر
دہلی کے بعض مشائخ کبار آپ سے رشک و غیرت کرنے لگے۔ انھوں نے آپ کے
خلافت توجہ اور کوشش کی۔ لیکن نقصان اٹھایا۔ اور بالآخر آپ کے مخلصین میں
داخل ہوئے۔

آپ سے فیض حاصل کرنے کے لیے لوگ دور دور سے جس طرح کھچ کر آرہے تھے،
اس کا اندازہ آپ کی مختصر سوانح عمری سے اتنا نہیں ہوتا جتنا حضرت مجدد کے تفصیلی تذکروں
سے۔ حضرات القدس میں حضرت مجدد کے خلفائے کبار کے حالات غور سے پڑھیں تو
نظر آتا ہے کہ ان میں سے خاصی تعداد ان کی تھی جو پہلے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر
ہوئے اور پھر حضرت مجدد کے سپرد ہوئے یا حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضری کچھ لیے
گھر سے نکلے، لیکن چونکہ ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ حضرت مجدد کے پاس سرمنہ جا کر فیض
حاصل کیا۔ حضرت مجدد کے صاحبزادہ بزرگ (خواجہ محمد صادق) جو تکمیل علوم اور
راہ سلوک کی بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد عین جوانی میں وفات پا گئے) آٹھ
برس کی عمر سے حضرت خواجہ کے مرید تھے۔ ان کے اور حضرت خواجہ کے درمیان جو
گہرا قلبی تعلق تھا، اس کے لیے زبدۃ المقامات اور حضرات القدس کا مطالعہ کرنا چاہیے
باقی اولین خلفا میں سے سرفہرست میر محمد نعمان برہانپوری تھے۔ جن کا مرتبہ اتنا تھا کہ
جب ایک دفعہ حضرت مجدد و سخت بہار ہوئے اور خیال ہوا کہ شاید ہماری وفات اس

بیماری میں ہو جائے تو حضرات خواجگان قدس اللہ تعالیٰ نے اسرار کی امانت کا متحمل حضرت خواجہ محمد صادق اور حضرت میر (محمد نعمان) کے سوا کسی کو نہ پایا۔ پس امانت ان دونوں کے سپرد فرمائی۔ (حضرات القدس ص ۲۶۹)۔ میر محمد نعمان بھی پہلے حضرت خواجہ کی خدمت میں پہنچے تھے اور انھوں نے تربیت باطنی کے لیے حضرت مجدد کے سپرد کیا تھا۔ اسی طرح حضرات القدس کے بیان کے مطابق مولانا یوسف (ص ۱۳۶)۔ شیخ نور محمد مٹنی (ص ۲۷۹) اور مولانا عبدالہادی بدایونی (ص ۳۱۴) پہلے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور ذکر وغیرہ کی تعلیم کے بعد تکمیل کے لیے حضرت مجدد کی خدمت میں بھیجے گئے۔ خواجہ محمد صادق کابلی حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضری کے لیے گھر سے نکلے تھے، لیکن ان کی وفات کے بعد دہلی پہنچے۔ انھیں خواجہ حسام الدین نے سرزند بھیجا (ص ۲۱۵)۔

خواجہ محمد صدیق کشمی کا معاملہ خاص طور پر دلچسپ ہے۔ وہ بدخشاں کے قریب کشم کے رہنے والے تھے۔ عنفوان شباب میں ہندوستان آئے اور محب الفقرا عبدالرحیم خانخاناں کی صحبت اختیار کی۔ شاعر تھے۔ ہدایت تخلص کرتے تھے۔ کئی مثنویاں اور غزلیں لکھیں۔ ایک غزل کے چند شعر بڑے پُر اثر ہیں۔

خوش وقت آں دے کہ بکاسے رسید است خوش روز شہر دے کہ بیارے رسید است
از فرق تا قدم ہمہ عطر مہجوب مدار دستم بچین زلف نگارے رسید است
خوش روز کار عیش ہدایت کہ درخزاں رخشن بہ تازہ رنگ بہارے رسید است

حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں پہنچے۔ ان سے ذکر سیکھا۔ حضرت خواجہ بہت مہربانی کرتے تھے۔ لیکن مہربان و اقبال نہ تھے۔ جوانی و شغف شعر خوانی و کامرانی بہت ترقی نہ کی۔ حضرت خواجہ نے انھیں سرزند میں حضرت مجدد کے پاس جانے کے لیے کہا۔ یہ آواز نہ ہوئے۔ وہ اس دوران میں وفات پا گئے۔ خواب میں نظر آئے اور سخت تاکید کی کہ سرزند جاکے فیض حاصل کرو۔ چنانچہ یہ وہاں پہنچے۔ حضرت مجدد سے بے حد متاثر ہوئے (”وے راجہ حضرت ایشاں اخلاص و عشق فراواں“)۔ کئی مکاتیب ان کے نام

ہیں۔ مبداء و معاد میں حضرت مجدد کے ارشادات ان کی بیاضوں سے نقل کر کے مرتب کیے۔ اکثر سفر میں رہتے تھے۔ جس سال مبداء و معاد مرتب ہوئی (۱۹۱۰ ہجری) اس سے ایک سال پہلے حضرت خواجہ باقی باللہ کے مرید ظہیر الدین حسن کے ساتھ دکن پہنچے۔ مانڈو میں گلزار ابرار کے مؤلف غوثی سے ملے۔ اس نے ان سے لے کر حضرت مجدد کے ایک رسالے کا مختص درج کتاب کیا۔ جس کے اکثر اندراجات مبداء و معاد میں ملتے ہیں۔ گلزار ابرار میں حضرت خواجہ باقی باللہ کا تذکرہ ”صوفی محمد صدیق ہدایت تخلص“ کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرت مجدد کی شخصیت سے کس طرح متاثر ہو چکا تھا۔

زبدۃ المقامات میں حضرت مجدد کے کئی دوسرے خلفائے کبار کے حالات درج ہیں جنہیں حضرت خواجہ باقی باللہ نے سرہند بھیجا۔ یا جنہوں نے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضری کے لیے دہلی کا قصد کیا اور ان کی وفات کی بنا پر حضرت مجدد کی خدمت میں پہنچے۔ مثلاً شیخ طاہر بدخشی (ص ۳۵۲) مولانا یوسف سمرقندی (۲۵۵) مولانا قاسم علی (۳۶۶) مولانا عبدالواحد لاہوری (ص ۳۷۶)

طبقات شاہجہانی میں سید مصطفیٰ باغیت کا ذکر ہے جنہوں نے مدقوں بزرگوں کی مسند مشیخت پر بیٹھ کر سجادہ نشینی کی۔ لیکن جب خواجہ باقی باللہ کی ارشاد و ہدایت کا شہرہ سنا، تو سب کچھ چھوڑ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلسلہ نقشبندیہ میں ان سے بیعت کی۔ ”سالہا بر مسند مشیخت قیام داشت۔ و صاحب سجادہ پدران خود بود و مروج را ہدایت می کرد۔ از انجا کہ صدق و راستی تمام داشت، بھوں آوازہ ارشاد و ہدایت حضرت خواجہ باقی باللہ کی قدس سرہ شنیدہ، ترک مشیخت کردہ، پیش آنحضرت آمدہ و در اندک مدت طریقہ نقشبندیہ را از او سے در گرفت و نصرت یافتہ بوطن اصلی رفت (ورق ۳۶۸)“

حضرات القدس میں میر نعمان کی زبانی لکھا ہے کہ انھوں نے آگرہ کے شفا خانہ میں خدایان کے ایک نوجوان کو بیمار دیکھا۔ حال و احوال پوچھا تو بتایا کہ وہ دکن میں تھا۔

حضرت خواجہ کو خواب میں دیکھا اور ان کے اشتیاق میں وہاں گروانہ ہوا۔ یہاں پہنچ کر ان کے انتقال کی خبر ملی۔ اسے اتنا صدمہ ہوا کہ بیمار ہو گیا۔ وہ اپنا حال بیان کرتا تھا اور زرارہ روتا تھا۔

طبقات شاہجہانی کا مطالعہ کریں تو حضرت خواجہ کے بعض ایسے مریدوں کے نام ملتے ہیں جن کا ان کی سوانح عمری اور نقشبندیہ تذکروں میں ذکر نہیں۔ مثلاً شیخ احمد بکری (مر ۴۰۳) شیخ مرتضیٰ اسنبھلی (ایضاً) شیخ نعمت اللہ جو پوری (ص ۲۰۶) شیخ نور الحق ابن مولانا عبدالحق (مر ۴۱۹) ہم شیخ قطب عالم کا ذکر کر چکے ہیں جن کی خالقاہ میں کچھ عرصہ حضرت نے یاد خدا فرمائی ان کے بیٹے شیخ رفیع الدین محمد کی شادی تھی اور وہ مصر ہوئے کہ حضرت خواجہ بھی شرکت کریں۔ آپ کی طبیعت ناساز تھی اور شادی ہو بھی رہی تھی دہلی سے بہت دور اعظم پور میں۔ آپ نے ضعف و علالت کی بنا پر معذرت چاہی۔ لیکن شیخ نہ مانے۔ بلکہ کہا کہ اگر آپ نہیں آتے تو میں بھی شادی کے لیے نہیں جاؤں گا۔ حضرت خواجہ نے شیخ کے والد سے فیض حاصل کیا تھا۔ ان کے اصرار کو رد نہ کر سکے۔ اس پر شاہ ولی اللہ الفاس العارفین میں لکھتے ہیں کہ جب صوفیہ کو معلوم ہوا کہ حضرت خواجہ اس تقریب پر آرہے ہیں تو اہل اللہ کا بڑا ہجوم ہوا اور سو سو کوس تک کوئی کمشہور صوفی نہ تھا جو حضرت خواجہ کی زیارت کے لیے اس تقریب میں شریک نہ ہوا ہو۔

صوفیہ آں ناحیہ جوں مقدم خواجہ شنیدند۔ ہمہ جمع آمدند و در نواحی صد کردہ کم کسے باشد از صوفیہ کہ در آن صحبت حاضر نہ شد۔ مجلس عجیب کہ ہرگز مثل آن مسموع نہ شدہ منعقد گشت۔

خداے تعالیٰ نے اس شادی کو اسلامی ہندوستان کے لیے بڑا مبارک بتایا اور شیخ رفیع الدین کے ہاں اس زوجہ سے جو بیٹی ہوئی اسے شاہ ولی اللہ جیسا یگانہ روزگار پوتا عطا ہوا۔ حضرت خواجہ کی ہمت اور کارشناسی کی داد دینی چاہیے کہ اگرچہ طریقہ نقشبندیہ میں منسلک ہونے کے بعد انھیں ہندوستان میں چار پانچ سال سے زیادہ رہنا نصیب نہیں ہوا اور اس مدت میں طبیعت نحیف ہی رہی، لیکن اس قلیل عرصے میں

انھوں نے نقشِ بند یہ سلسلے کی بنیاد مستحکم طریقے سے اس ملک میں رکھ دی۔ آپ کو خوش قسمتی سے ایک نو مرید، حضرت مجدد الف ثانی جیسا میسر آیا۔ جس کے فیض سے اس سلسلے کا مستحکم ہو جانا لازمی تھا، لیکن ان کے علاوہ آپ نے دوسرے کئی ایسے بزرگوں کو متاثر کیا، جن کے ذریعے سے نہ صرف اس سلسلے کی بقا کا سامان ہوا بلکہ ملک میں اسلام کو تقویت ہوئی اور جو پراگندگی اکبری بے اعتدالیوں کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی، اس کا ازالہ ہوا۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ خواجہ عبید اللہ احرار کا اصول تھا کہ بادشاہوں اور امیروں کا قرب ترک کرنے کے بجائے، ان سے ربط بڑھاتے اور انھیں مستحضر کر کے اسلام کی رونق اور مسلمانوں کے آرام کا انتظام کرتے۔ خواجہ محمد باقی باللہ بیرنگ اس اصول اور اس اصول کی مصلحت سے خوب واقف تھے اور جب وہ ہندوستان تشریف لائے تو اس اصول پر عمل کرنے کی ضرورت خاص طور پر تھی۔ اکبری بدعتوں نے اگرچہ عام مسلمانوں کو متاثر نہ کیا تھا، لیکن اونچے طبقوں میں جو دربار سے قریب تھے، خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اس لیے اس طبقے کو اسلام سے قریب لانے کی بڑی ضرورت تھی۔ حضرت خواجہ نے ادھر خاص طور پر دھیان رکھا اور خدا نے ان کی کوششوں میں بڑی برکت دی۔ بد قسمتی سے ان کے تفصیلی حالات صحیح طور پر جمع نہیں ہو سکے۔ ان کے جو مکتوبات موجود ہیں، ان میں سے اکثر کے متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس کی طرف لکھے گئے۔ مطبوعہ نسخوں سے اتنا پتا چلتا ہے کہ کسی امیر کے نام یا کسی مخلص کے نام لکھے گئے۔

۱۰ جب حضرت خواجہ باقی باللہ بار دوم دہلی تشریف لائے تو اس وقت عہد اکبری کے تمام مشہور و مخفی مثلاً امیر نظام الدین مصطفیٰ طبقات اکبری، ملا عبدالقادر بدایونی و وفات پا چکے تھے۔ اس لیے ان کے حالات کتب تواریخ میں پورے طور پر درج نہیں۔ خافی خان آپ کی نسبت لکھتا ہے ”دیگر از واصلان حضرت خواجہ باقی باللہ دہلی کے مقتدائے زلل بود۔ صفات ذاتی و خوارق ایشان زیادہ از انست کہ زبان ظلم و انشود اکثر از دگر زندہ با مخلوق کم جو شیدہ۔ و ان اکثر علوم عقلی و نقلی بہرہ تمام داشتند۔“

صرف شیخ احمد سرہندی یا بعض دوسرے خلفاء کے نام کے خطوں میں وضاحت سے مکتوب الیہ کا نام درج ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ تیار گانا دشوار نہیں کہ حضرت خواجہ کے عقیدت مندوں میں عہد اکبری کے بڑے بڑے سردار اور امرا شامل تھے، بالخصوص نواب مرتضیٰ خاں جن کی مدد سے جہانگیر کی تخت نشینی کے کٹھن مراحل طے ہوئے اور جنہوں نے جہانگیر سے پاس شریعت کا عہد لیا۔ حضرت خواجہ کا بڑا معتقد تھا۔

ہم حضرت خواجہ اور نواب مرتضیٰ خاں کے تعلقات کا ذکر کر چکے ہیں، لیکن حضرت خواجہ کے تعلقات فقط نواب مرتضیٰ خاں تک محدود نہ تھے۔ معاصرانہ تذکروں (مثلاً زبدۃ المقامات) کا بیان ہے کہ طبقہ امرا میں ان کے کئی معتقد (امراے مخلص) تھے جو انہیں زبردست محبت بھیجتے رہتے اور حضرت خواجہ اسے محتاجوں میں تقسیم کر دیتے۔ ایک خاص معتقد عبدالرحیم خانخاناں تھا (”بہ حضرت خواجہ عقیدت و ارادت تمام داشت“) جس نے یہ سن کر کہ حضرت خواجہ کوچ پر جانے کی خواہش ہے ان کی خدمت میں ایک لاکھ روپیہ بھجوایا۔ لیکن آپ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس طرح دوسروں سے پیسے لے کر حج پر جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آپ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر جہاں بھی آپ کا عقیدت مند تھا۔ حضرت مجدد کو ایک خط میں لکھا ہے۔

”جناب صدر جہاں نے ذکر و مراقبہ سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ذکر تو بتلے دیا گیا لیکن

چونکہ اس گروہ کا خاص مراقبہ درس اور بیان کی قسم سے نہیں ہے اور ان کا ارادہ بھی یہی

تھا۔ اس لیے یہی مناسب دیکھا گیا کہ آپ کی خدمت میں اس کی صحت کرے۔ اب

فقیر بضعف بہت غالب ہے صحبت کی فرصت اور توجہ کی طاقت نہیں رہی۔“

قلیچ خاں عہد اکبری کا ایک سربراہ اور وہ سردار تھا۔ اکبر کا بڑا بیٹا وانیال اس کی بیٹی

سے بیاہا تھا۔ وہ خود مختلف علاقوں کی صوبیداری پر مامور رہا اور اکبر کے آخری ایام

میں کئی سال تک پنجاب کا گورنر تھا۔ وہ ایک دلیر، متدین، اسلام کا درور کھنے والا مسلمان

تھا۔ مائثر امرا میں لکھا ہے کہ وہ لاہور کی گورنری کے دوران میں ہر روز مدرسہ میں جا کر

تین گھنٹے تک فقہ و تفسیر و حدیث کا درس دیتا۔ علوم شرعی کی ترویج کرتا اور لاہور کے بہت سے لوگ اس کی خوشنودی اور اپنے (دینی) مقاصد کے حصول کے لیے ان علوم میں زیادہ دلچسپی لینے لگے !

قلیچ خاں صلاح و تقویٰ بسیار داشت و در تہمت متعصب بود۔ وہ ہمیشہ مدرس علوم و افادہ طلب اشتغال میں نمود۔ گویند در صوبہ داری ۱۰۔ ایک پاس مدرس فقہ و تفسیر و حدیث در مدرسہ قیام میں ورزید و باقی غایت در ترویج علوم شرعیہ میں کوشید۔ مردم آنجا بامید روشناسی و انجام مطالب غریبے تمام تحصیل علوم کردند پرتگیز مشنری بھی لکھتے ہیں کہ وہ بڑا پکا مسلمان تھا۔ پرتگیز مشنری اس کے ڈر سے لرزہ بر اندام رہتے تھے۔ اس نے لاہور کے ہندوؤں کی شکایت پر جس گھر میں عیسائی پادری رہتے تھے وہ ان سے خالی کر لیا اور مشنریوں سے وہ تمام مراعات چھین لیں جن کی اکبر نے سیاسی مصلحتوں یا مذہبی رواداری سے اجازت دے رکھی تھی۔

حضرت مجدد الف ثانی بھی اسے مخاطب کر کے لکھتے ہیں :-

”ثانیاً اظہار محبت گزارمی ایشان میں نمایند کہ در بلدہ محظریہ لاہور یہ وجود ایشان بسیار سے از احکام شرعیہ دریں طور زمانہ رواجے پیدا کردہ است۔ و تقویت دین و ترویج ملت دلائل بقعہ حاصل گشتہ است۔“

حضرت خواجہ باقی باللہ کے تذکروں میں تو قلیچ خاں کا کہیں ذکر نہیں (۱) لیکن حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات سے پتا چلتا ہے کہ اس امیر کے تعلقات بھی حضرت خواجہ باقی باللہ سے بڑے گہرے تھے اور چونکہ اس کی گورنری کے زمانے میں حضرت خواجہ ایک سال سے زیادہ لاہور میں مقیم رہے۔ قرین قیاس ہے کہ قلیچ خاں کی کوششوں میں حضرات خواجہ کے فیض صحبت کو بھی دخل ہوگا۔ حضرت مجدد الف ثانی کا قلیچ خاں سے تعارف نہیں۔ لیکن اسے ایک سفارشی خط لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ میرے مرشد اور آپ کے درمیان بڑی گہری محبت تھی اس لیے آپ کو یہ جید سطور

لکھنے کی جرات ہوئی :-

چوں ایشاں را رشتہ ارتباط محیی بہ حضرت معرفت پناہی قبلہ گاہی خواجہ با محکم بود۔
بنابر آں بہ تسوید چند کلمہ محرک آں نسبت گشت ۔

حضرت خواجہ کے ایک خط (رقعہ ۴۲) میں ”مرزا کوکر (خان اعظم) اور اس کی والدہ“ کا ذکر ہے۔ مطبوعہ مکتوبات میں ایسے رقعے کئی ہیں جن کے متعلق لکھا ہے۔ ”ایک امیر کی طرف لکھا“ ایک عالیتان امیر کی طرف لکھا، بعض میں حاجتمندوں کی سفارشیں ہیں بعض میں فقط ارشاد و ہدایت۔ ان کا ایک دلچسپ رقعہ ہے ”ایک دوست کے نام“ اس کے نصف اول سے (جو حضرت مجدد کے تذکروں میں عام طور پر نقل ہوتا ہے) ایک نو حضرت مجدد کی عظمت و فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسرے اس مرید کی فہم و فراست سے واقفیت ہوتی ہے جس کی نگاہ دور بین نے اپنے مرید کی آئندہ عظمت کا صحیح اندازہ لگایا تھا۔ نصف ثانی سے (جو ان تذکروں میں نہیں ملتا) خواجہ صاحب کی اس کوشش کا پتا لگتا ہے جو وہ اپنے مریدوں مثلاً حضرت مجدد کی اصلاح و امداد کے لیے ہر پہلو میں کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں :-

سرمد میں شیخ احمد نام ایک آدمی بڑے علم والا اور قوی عمل والا ہے چند دن فقیر
لی مجلس میں رہا۔ فقیر نے اس کے روزگار اور اوقات سے بہت عجیب عجیب باتیں
مشاہدہ کیں۔ امید ہے کہ وہ ایسا چراغ ہوگا جس سے تمام جہاں منور ہو جائے گا۔
اس کے احوال کاملہ یقینی ہیں۔ اس کے کامل احوال دیکھ کر میرا بچہ یقین ہے کہ وہ ایسا ہی
ہوگا۔ الحمد للہ شیخ مذکور کے جتنے بھائی اور قریبی رشتہ دار ہیں سب کے سب نیک اور
عالم آدمی ہیں۔ اس دعا گو نے بعض سے ملاقات کی ہے۔ سب بیش قیمت ہوتی

۱۔ یہ رقعہ آخری سفر ماوراء النہر سے پہلے لکھا گیا اور خان اعظم نے عہد اکبری کے اواخر میں خواجہ
خاوند محمود نقشبندی سے بیعت کی۔ لیکن اس رقعے سے پتا چلتا ہے کہ اس سفر ماوراء النہر سے پہلے ہی
بائیں لوگوں سے حضرت کے روابط تھے۔ اور ان میں سے بعض آپ کے مخلصوں میں داخل تھے۔

ہیں اور بڑی عجیب استعداد رکھتے ہیں۔ اس شیخ کے فرزند جو اپنے بچے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں۔

غرض سب کے سب خجھرہ طیبہ یعنی پاک درخت کی طرح ہیں۔ جس سے پاک ہی شاخیں نکلی ہیں۔ لیکن عیال کی کثرت اور فقر و تنگدستی کی زیادتی اور وجہ معاش کے نہ ہونے کے باعث ان سب اوقات میں پرانگی آ رہی ہے۔ اگر ہر سال زکوٰۃ کے طور پر ان لوگوں کے لیے کچھ محبتیں ہو جائے اور تقسیم کرنے والا منتظم ان کے درمیان مناسب طور پر بانٹ دیا کرے تو بہت ہی اچھا ہے۔ اور بہت ہی شکی اور اجر کا باعث ہے۔ حقوڑا بہت جس قدر بھی مقرر ہو جائے۔ خیرات اور نیکیوں کا کارکن عظیم ہوگا۔ فقرا اللہ تعالیٰ کے دروازے ہوتے ہیں اور بہت ہی عجیب دل رکھتے ہیں۔ زیادہ کھنا بے ادبی ہے۔

(مکتوبات خواجہ باقی باللہ رقمہ ۶۱)

خواجہ باقی باللہ کے متعلق منتشر اور نامکمل اندراجات بھی دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ ان کے عقیدت مند امر میں بخشی الملک شیخ فرید۔ قلیچ خاں حاکم پنجاب۔ (خان اعظم) مرزا کوکہ۔ امیرالامرا مرزا عبدالرحیم خان خاناں سپہ سالار وکن۔ صدر جہاں صدر الصدوق اور ابو الفضل کا بہنوئی خواجہ حسام الدین شامل تھے۔ علما میں شیخ عبدالحق محدث کوآن کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور حضرت مجدد الف ثانی تو ان کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اگر یہ بات دھیان میں رکھیں کہ یہی وہ مبارک ہستیاں تھیں جنہوں نے اکبری خیالات کا قلع قمع کیا تو حضرت خواجہ باقی باللہ کی تاریخی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جو ان بزرگوں کے درمیان رشتہ نسب کی حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اکبر بادشاہ خواجہ باقی باللہ کا مرید ہو گیا تھا۔ اس کی تائید میں کوئی قابل اعتماد شہادت ہماری نظر سے نہیں گزری لیکن

آپ کے رقصات میں ایک فقرہ ہے جس کا سبب ارشاد پوری طرح روشن نہیں، لیکن اس کے واضح مفہوم سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہیں کہ آپ نے حالات پر پوری طرح قابو پالیا تھا۔ اور آپ بادشاہ کے خیالات و افعال سے بے پروا تھے۔ یہ فقرہ حضرت مجدد الف ثانی کے نام کے ایک رقصہ میں ہے۔ اور اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:-

”اندیشہ بادشاہ را در خاطر نیارند“ [رقصہ یک]

حضرت خواجہ کے حالات پڑھنے سے خیال ہوتا ہے کہ طبیعت میں مسکنت بھید تھی اور تالیفِ قلوب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ وہ ایک اہم خط کے اخیر میں جس کا ایک حصہ ان کے ملفوظات میں نقل ہوا ہے فرماتے ہیں:- ”اے اللہ! تو مجھے مسکین ہی زندہ رکھ اور مسکین ہی مار اور مسکینوں کے گروہ میں اٹھا۔“ فروتنی اور کسر نفسی ان کی رگ رگ میں تھی۔ انھوں نے حضرت مجدد الف ثانی کی اتنی تعریف کی ہے کہ بعض کوتاہ فہم سخت غلطی، بلکہ بے انصافی اور بے ادبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر حضرت خواجہ کے ان ارشادات سے جو انھوں نے حضرت مجدد کی نسبت فرمائے ہیں، اس قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کے دل میں اپنے مرید کی تھی تو اس بلند بہت مرشد کی بھی تعریف کرنی چاہیے، جس نے یہ خوبیاں دیکھ لیں اور انھیں اس طرح سراہنے سے نہ ہچکچایا۔

بعض مجددی تذکرہ نگاروں (مثلاً مناقب الحضرات اور روضۃ القیومیہ کے مصنفین) نے احوال و مکاشفات کے اظہار کے متعلق جو نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔ اس کا ذکر ہم آئندہ صفحات میں کریں گے۔ اس معاملے میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ ان کی عین صند تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے واقعات اور روحانی مدارج کو چھپاتے اور انتہائی روحانی سر بلندیوں پر پہنچ کر بھی ان کی عالی ظرفی ”ہل من مزید“ کا نعرہ لگاتی۔ ان کے سب سے قدیمی تذکرے میں ان کی جس خصوصیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ ”ستر احوال“ اور ”غایت انکسار“ ہے۔ زبدۃ المقامات میں لکھا ہے:-

”شیوہ مرضیہ حضرت خواجہ باقر قدس سرہ ہنگی ستر احوال و اخفا و خمول و انزوا و بدوا“

غایت انکسار ہمیشہ دیدہ قصور احوال و منتہم داشتن نیت نصب عین الیساں۔“

حضرت خواجہ عجز و انکسار میں اتنا غلو کرتے کہ جب کوئی طالب ان کے پاس بیعت کی غرض سے آتا تو وہ کسر نفسی سے یہی کہتے کہ میں اس کا رِ عظیم کے لائق نہیں ہوں کہیں دوسری جگہ طلب کا دامن بڑھاؤ اور اگر مردِ کامل کا پتا ملے تو مجھے بھی خبر دیتا تاکہ اس کی خدمت میں پہنچوں۔ خواجہ حسام الدین کے ساتھ یہی ماجرا پیش آیا اور وہ آپ کی عذر و معذرت سے مجبور ہو کر مُرشد کی تلاش میں آگرے گئے۔ وہاں سر اسیمہ اور حیران پھر رہے تھے کہ ایک جگہ سے قوالی کی آواز آئی۔ انھوں نے کان لگا کر سنا تو قوال یہ گارہے تھے۔

تو خواہی آستیں افشاں و خواہی دامن اندر کش

مگس ہرگز نخواہد رفت از دکانِ حلوائی

چنانچہ آپ پھر حضرت خواجہ کی خدمت میں واپس آگئے اور بڑے اصرار کے بعد ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہوئے۔ اسی طرح کا واقعہ ایک خراسانی نوجوان کو پیش آیا جو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر محفل تھا اور کسی زندہ مُرشد کے ملنے کا طالب تھا۔ اسے خواب میں اشارہ ہوا کہ نقشبندیہ سلسلہ کے ایک مردِ کامل اس شہر میں آئے ہیں تو جا کر ان کی خدمت میں حاضر ہو۔ وہ پوچھتا پوچھتا خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچا اور اپنے خواب کا ماجرا بیان کیا۔ آپ نے کہا کہ میں مردِ کامل کہاں؟ وہ کوئی اور بزرگ ہوں گے! یہ کہا اور کثرت انکسار سے اس طرح معذرت کی کہ وہ نوجوان بھی پلٹ گیا۔ دوسری رات اسے پھر اشارہ ہوا کہ وہ بزرگ وہی ہیں جن کی خدمت میں تم پہنچے تھے۔ اور ان کی عاجزی تو ان کا زیور ہے۔ چنانچہ وہ نوجوان پھر واپس آیا اور جب تک آپ نے اس کی رہنمائی قبول نہ کر لی۔ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

”غایت انکسار“ کے علاوہ تذکرہ نگار آپ کی جس صفت پر زور دیتے ہیں، وہ مشقت و ترقم ہے۔ لاہور میں قحط سالی کے دوران میں آپ نے جو طریق کار اختیار کیا تھا، اس کے بارے میں زبدۃ المقامات کا بیان نقل ہو چکا ہے۔ فی الواقع

آپ کے ترجمہ اور تھم و بُرد باری کی اتنی مثالیں تذکروں میں ملتی ہیں کہ اگر ہم چند مستند واقعات کو ہی جمع کرنا شروع کریں تو ایک دفتر کی ضرورت ہو۔

غم زلف و رُخت را شرح دادن
شبے باید دراز و ماہتا بے!

آپ کی غیر معمولی فہم و فراست کی بھی قدیمی تذکروں میں بڑی تعریف ہے۔ مثلاً زبدۃ المقامات میں لکھا ہے کہ اگرچہ آپ نے علوم ظاہری پوری طرح نہیں حاصل کیے، لیکن ”ذکائے فطرت“ اور ”صفائے نسبت“ سے آپ کی عقل سمجھ کا پایہ بلند تھا ”ذائش الیثاں پایہ بلند داشتہ“۔

آپ کا اصل جوہر آپ کی اخلاقی پاکیزگی تھی، جسے دیکھنے والے ”نفسِ علی“ (زبدۃ المقامات) کے نام سے موسوم کرتے۔ آپ کو شروع میں ہی استخارہ میں بتادیا گیا تھا کہ ”حاصل سلوک تہذیب الاخلاق“ ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنی تمام کوششیں تزکیۂ نفس اور روحانی پاکیزگی پر مبذول رکھیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ آپ کی خوبیاں فقط منصفیانہ قسم کی تھیں۔ آپ کو علمی دنیا میں وہ پایہ حاصل نہیں جو آپ کے ایک محققہ شیخ عبدالحق محدث کو میسر تھا اور نہ ہی آپ کو اپنے دوسرے جلیل القدر مرید حضرت مجددِ کاندوز قلم نصیب ہوا، لیکن جہاں تک اصل کام یعنی ارشاد و ہدایت کا تعلق ہے آپ اپنے زمانے میں منفرد تھے اور ہندوستان کی تاریخ تصوف میں آپ کی جگہ حضرت خواجہ بزرگ۔ حضرت سلطان المشائخ اور حضرت مجددؒ کے ساتھ ساتھ ہے جو اس ملک میں اہم نئے سلسلوں کے موسس ہوئے۔

جس شریعت سے آپ نے تین چار سال کے قلیل عرصے میں نقشِ بند یہ سلسلے کی بنیادیں مستحکم طور پر اس ملک میں رکھ دیں، وہی آپ کی روحانی عظمت کا ثبوت ہے اور شروع سے تذکرہ نگار اس کی تحریف میں رطب اللسان ہیں۔ حضرت مجددؒ الف ثانی کے مرید خواجہ محمد باستم کشمی لکھتے ہیں:-

”شاہِ عظیم بر علو رتبۃ الیثاں ہمیں بس۔ کہ دوسرے سال بر مسندِ شریعت بودند درین

مدتِ قلیلہ چہ مردم کہ از خوان دولت ایشان روزی مند گردیدند۔ و چہ برکات و آثار کہ در کشور وسیع ہندوستان از ایشان انبساط گرفت و این سلسلہ طریقہ نقشبندیہ کہ دریں دیار غریب بود ترویج تمام یافت۔ با آنکہ بسیار دریاں دیار ماندہ بودند۔ اما برکات ایں دوسر سالہ در آن سالہا کجا بود؟

حضرت خواجہ کے مُرشدِ کامل ہونے کا اندازہ لگانے کے لیے کوئی ثانوی دلائل درکار نہیں۔ ان کے سب سے نامور مُرید نے اپنی ایک تصنیف میں اس پر روشنی ڈالی ہے اور حضرت کے طریقہ تعلیم اور مرشدانہ شان کی اس پُر زور انداز سے تعریف کی ہے کہ ایک مسلمان کے قلم سے اس سے زیادہ نہ دردار اظہار تصور میں نہیں آسکتا۔ حضرت مجدد الف ثانی مبداء و معاد میں لکھتے ہیں :-

”ماچارہ کے بوزیم در ملازمت حضرت خواجہ خود کہ پیش مردم در میان سائر یاران امتیاز داشتیم۔ و ہر کدام مارا نسبت بحضرت خواجہ قدس سرہ اعتقاد علیحدہ و معاملہ جدا بود۔ ایں فقیر بہ یقین میدانست کہ مثل ایں صحبت اجتماع و مانند آن تربیت و ارشاد بعد از زمان آن سرور علیہ و علیہ آلہ الصلوٰت و تسلیات ہرگز بوجد نیامدہ است۔ و شکری نعمت بجائی باید آورد کہ اگرچہ بشری صحبت خیر البشر علیہ و علیہ آلہ الصلوٰۃ والسلام مشرف تشدیم۔ بارے از سعادت ایں صحبت محروم نماندیم۔“

خواجہ کلان حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات سے کوئی دو سال پہلے، قریباً چار مہینوں کے تفاوت سے، ان کے دو بیٹے دویولیوں سے پیدا ہوئے۔ وہ ابھی نو دو سال اور آٹھوں کی گود میں تھے کہ حضرت خواجہ نے حضرت مجدد سے انھیں توجہ فرمائی۔ اور اپنے بلند مرتبہ مرید سے فرمایا کہ صنعتِ بدن مجھ پر غالب ہو گیا ہے اور امیرِ برہات کم رہ گئی ہے۔ آپ ان بچوں کے حال کی خبر گیری رکھیں۔ ان دو میں سے بڑے کا نام جو غرہ زیج الاول سنہ ۸۷۱ یعنی ۱۴۶۵ نومبر ۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ خواجہ عبد اللہ احرار کے نام پر عبد اللہ رکھا گیا، لیکن وہ زیادہ تر خواجہ کلان کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی

ولادت کی حضرت کو بڑی خوشی تھی۔ چنانچہ آپ نے ان کی ولادت، اذانِ اقامت اور تسمیہ کی نسبت کئی اشعار لکھے۔ انھوں نے بڑے ہو کر طریقہ نقشبندیہ کے اشغالِ شیخ الہ داد سے اخذ کیے۔ (زبدۃ المقامات) اور تکمیل حضرت مجدد کے زیرِ ہدایت کی۔ اور کئی مکتوبات ان کے نام ایسے لکھے جن میں بڑی نیاز مندی کا اظہار ہے۔

خواجہ کلاں نے علوم ظاہری کی بھی (شیخ عبدالحق محدث کی نگرانی میں) تکمیل کی۔ حضراتِ القدس میں جو زبدۃ المقامات کے کچھ سال بعد مکمل ہوئی، آپ کی نسبت لکھا ہے: ”آپ علمِ تاریخ اور انساب میں حصہ کامل رکھتے ہیں اور تصوف میں آپ کو شغفِ خاص اور علمِ انشا میں قدرتِ کاملہ حاصل ہے اور مطالعہ کتب آپ کا انیس ورفیق ہے۔ آپ کے اکثر اوقات تصنیف میں صرف ہوتے ہیں۔ تذکرہ مشائخ بقدرہ ایک لاکھ اشعار (سطور) یا کم و بیش آپ نے تصنیف فرمایا ہے۔ اس کے سوا بھی آپ کی کئی تصانیف ہیں“ (ص ۲۶۱)۔ اسی کتاب میں ایک اور جگہ خواجہ حسام الدین کے مقامات کے بیان میں آپ کی ایک علیحدہ کتاب کا ذکر ہے۔ (ص ۲۷۵)۔ روضۃ الصیومیہ میں (رکنِ اول ص ۲۱۱ پر) ”حضرت خواجہ کلاں کے کلیات“ کا ذکر ہے جس میں بظاہر وہ مکتوبات بھی ہیں جو خواجہ حسام الدین کی طرف مختلف اشخاص نے لکھے۔ اور شیخ عبدالحق محدث کا وہ خط دیا ہے جو انھوں نے خواجہ حسام الدین کو حضرت مجدد سے غایت محبت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا۔ اسی طرح طبقاتِ شاہجہانی میں آپ کی ”تصنیفاتِ نافع“ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ”احوالِ صحابہ و تابعین و تبع تابعین و مشائخ دینِ تا وقت خود نوشتہ“ (شاید یہ وہی کتاب ہو جسے حضراتِ القدس میں تذکرۃ المشائخ کہا گیا ہے)۔

افسوس کہ ان کتابوں میں سے ہمیں ایک بھی دستیاب نہیں ہوئی۔ لیکن انڈیا آفس لائبریری (ذخیرہ دہلی) میں خواجہ کلاں کی ایک اہم تصنیف مبلغ الرجال پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ چھوٹے سائز کے ۱۱۸ اوراق ہیں۔ اس کا مقصد تصنیف اس انتشار کو

رفح کرنا تھا۔ جو ”آراء اہل فکر و نظر و اقوال ارباب کشف و شہود“ کی وجہ سے ”معرفت حقیقت عالم“ کے متعلق پیدا ہو گئی تھی۔ کتابچہ کا کافی حصہ قرامطہ اور ملاحدہ کے بیان میں ہے۔ اکبر ابو الفضل اور شیخ مبارک پر بڑی نکتہ چینی کی ہے۔ بعض صوفی تصانیف اور ان صوفیوں کی جو علت ادراک کی وجہ سے غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے، شکایت کی ہے۔ اور حضرت مجدد کا ذکر اپنے والد کے ”اعظم الخلفا“ کہہ کر کیا ہے۔ حضرت مجدد کے خالوادہ باقویہ سے قریبی تعلقات کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خواجہ کلان کی صاحبزادی حضرت مجدد کے سب سے چھوٹے صاحبزادے جو والد کی وفات کے وقت خرد سال تھے، بیاہی گئیں۔

خواجہ خرد | حضرت خواجہ کے دوسرے صاحبزادے ۶ رجب ۸۱۷ھ یعنی ۲۴ فروری ۱۴۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا اسم گرامی خواجہ محمد عبداللہ تھا۔ لیکن خواجہ خرد کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی ولادت پر بھی حضرت خواجہ نے نور دار شعر کے ۵

یارب کہ طلسم خود کشائی	ایں طغلب ما باو نمائی
خود را بہ تمام خود گزارد	بچوں نخل ز دانتہ سر بر آرد
چندیں ہمہ آفتاب رفتند	در بحر تو چوں حباب رفتند
ایں قطرہ ہم از شمار انیشاں	در موج خودش کن پریشاں
باشد کام ازو بر آید	بچوں ہمیش از تو یاد م آید
ہر جا کہ ترشح تو بینم	در العطش آیم و تشنیم
لے بحر طرب یکام من شو	امروز یکے بہ جام من شو
من جام چہ مے کنم کدایم	مشتاق تو ام دہن کشایم

خواجہ خرد کو خواجہ کلان کی نسبت حضرت مجدد سے زیادہ فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ وہ کئی مرتبہ ان کی خدمت میں سرسند اور ایک مرتبہ لاہور پہنچے اور دیر تک وہاں قیام کیا۔ زبدۃ المقانات کے بیان کے مطابق آپ نے حضرت مجدد سے بعض

کتب علم کلام جیسے شرح مواقف وغیرہ یا بعض رسائل صوفیہ بھی پڑھے۔
خواجہ خرد ربا عیات و شرح ربا عیات میں لکھتے ہیں کہ آپ کو حضرت مجددؒ سے
”اجازت عمل طریقہ و اجازت تعلیم ہا“ حاصل تھی۔

”اس فقیر خچہ مرتبہ از وطن مالوت بخد مت ایشاں در سربند و یکبار در لاہور مشرف شد
و ہر بابہ خچہ گاہ در خدمت بسر بردہ۔ الطاف بسیارے فرمودند۔ و امیدواری چنانست
کہ آن الطاف سبب نجات اخروی گردد۔ اجازت عمل طریقہ و اجازت تعلیم ہا
نیز فرمودند۔ و بشارتہا میدادند“

حضرات القدس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔۔۔ چند بار پیادہ و سوار نہایت
مسکنت و انکساری اور تجرید و تغرید کے ساتھ دہلی سے سربند تک آنحضرت قدس سرہ
کی عتبہ بوسی کے لیے آئے۔ اور مدقول تک آنحضرت کی خدمت میں بسر کی اور فیض و
برکات پائے۔ اور آنحضرت کی خلافت و اجازت سے سعادت گیر ہوئے۔

خواجہ خرد کے مزاج میں کسی قدر وارستگی تھی۔ حضرت مجددؒ اس خواجہ زادہ
کے وسعت مشرب سے ہمیشہ ہر اسال رہتے تھے کہ ان تمام تعینات کے ساتھ
اپنے والد ماجد کے مسند ارشاد اور سجادہ پر جانشین ہو سکیں گے یا نہیں۔ اور
طالبوں کو فائدہ رسانی میں دباغ بیوزی اور سرگرمی دکھا سکیں گے یا نہیں چنانچہ
اسی طرح واقعہ ہوا کہ دو ایک شخصوں کو حکم حضرت کی تعمیل کے لیے طریقہ کی تعلیم
دی اور حضرت وارستگی اور بے تعینتی سے اس امر جلیل القدر کی پابندی نہ کر سکے۔
حضرات القدس کے اس اندراج کی شاہ ولی اللہؒ کے بیان سے تائید ہوتی
ہے۔ ان کے والد شاہ عبدالرحیم خواجہ خرد کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔ اور وہ بھی
ان کے جد شیخ قطب عالم اویسیخ رفیع الدین کے اپنے والد بزرگوار سے تعلقات کی
وجہ سے انھیں بڑا عزیز رکھتے تھے۔ شاہ عبدالرحیم نے خواجہ خرد سے حاشیہ خیالی
کے چند سبق بھی پڑھے تھے۔ لیکن جب انھوں نے بیعت کے لیے کہا تو خواجہ صاحب
نے ٹال دیا۔ اور کہا کہ چونکہ مجھ سے بعض بے قاعدگیاں ہوئی ہیں، میں نہیں چاہتا

کہ علاقہ ربیت کی وجہ سے تم کو کوئی ضرر پہنچے۔ اور مشورہ دیا کہ حضرت آدم بنوری کے کسی خلیفہ سے بیعت کریں۔

خواجہ خرد نے کئی صوفیانہ رسائل لکھے اور اتفاق سے وہ قریباً سارے کے سارے محفوظ ہیں۔ ان میں سے دو ایک تو چھپ چکے ہیں، لیکن شاید ان کا سب سے مکمل مجموعہ انڈیا آفس لائبریری (دہلی) میں ہے۔ ان میں بیان احوال و ملحوظات خواجہ خرد (جس میں آپ کے بعض مکتوبات بھی ہیں) کے علاوہ رسالہ سماع۔ رسالہ خواجہ خرد (توحید و جمودی کے متعلق) رسالہ فوارح۔ پردہ بر انداخت و پردہ کہ شناخت۔ پر تو عشق۔ رسالہ سید اور شرح تسویر کے علاوہ ایک دلچسپ تصنیف رباعیات و شرح رباعیات ہے۔ موزن الذکر میں بعض محاصرانہ بزرگوں کی نسبت مدحیہ رباعیات لکھ کر ان کے متعلق واقعات اور اپنے تاثرات دیے ہیں، جو حضرت باقی باللہؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حالات کے طالبین کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔

حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے خلیفہ اعظم حضرت مجدد الف ثانیؒ

خواجہ حسام الدینؒ

آپ کے کئی اور خلفائے حق جن میں سے شیخ تاج الدین سنبھلی۔ شیخ الہ داو۔ خواجہ محمد نور اور مرزا حسام الدین احمد زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں سے مرزا حسام الدین کے حالات بڑے دلچسپ ہیں۔ وہ ۸۷۹ھ ہجری (۱۴۷۹ء) میں بلا دہشتاں کے قصبہ قندوز میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قاضی نظام الدین بدخشی مخاطب غارخاں اکبر کے مقربین میں سے تھے۔ بلکہ بدایونی کہتا ہے کہ ”سجدہ زمیں بوس“ کی تجویز انھی نے پیش کی۔ مرزا حسام الدین خود شیخ مبارک کے داماد تھے اور ابو الفضل اور فیضی کی بہن ان سے بیاہی تھی۔ باپ کی وفات پر موروثی منصب انھیں ملا اور خانانہ

لے چشتی (کم از کم نظامی) حضرات مرشد کو سجدہ تعظیمی جائز قرار دیتے ہیں۔ (خواجہ حسن نظامی نے اس موضوع پر ایک رسالہ بھی لکھا تھا) اور قدیم سلاطین میں بلین نے اسے شروع کیا تھا۔

کے ساتھ دکن کی مہم کو گئے۔ اس اثنا میں فقرا سے ملتے رہے۔ اور محبت الہی کا جذبہ ایسا غالب ہوا کہ ترک دنیا کا فیصلہ کیا۔ خانخاناں نے جو آپ کے والد کا شاگرد تھا۔ مخالفت کی۔ آپ نے اس سے کہا کہ اگر ترک منصب کی درخواست دوں گا تو منظور نہ ہوگی۔ میں دیوانہ ہو جاتا ہوں اور قیود دنیوی سے رہائی پا کر باقی عمر سلطان المشائخ کے مزار پر گزار دوں گا۔ خانخاناں نے منتیں کیں، لیکن آپ نہ مانے۔ دوسرے دن کپڑے پھاڑ کر پھینک دیے۔ بدن کو کچھڑ ملا اور دیوانوں کی طرح گلی کوچوں میں پھرنے لگے۔ خانخاناں نے اب بھی انھیں روکنا چاہا۔ دوسرے امر کو ساتھ لے کر بڑے اعزاز سے انھیں اپنی قیام گاہ پر لایا اور پھر وعظ و نصیحت شروع کی۔ انھوں نے جواب نہ دیا۔ ناچار خانخاناں نے ان کی عرضی بادشاہ کے پاس بھیجی۔ وہاں سے دلی آنے کی اجازت ہوئی۔ یہاں پہنچے تو خواجہ باقی باللہ کے مرید ہوئے اور اتنی خدمت کرنے کا موقع ملا کہ جب مُرشد دم توڑ رہا تھا تو مزار احسام الدین کے سوا کوئی دوسرا خدمت میں موجود نہ تھا۔

جب حضرت خواجہ نے وفات پائی تو ان کے دونوں بیٹے خردسال تھے۔ ان کی عمر دو دو سال سے زیادہ نہ تھی۔ انھوں نے حضرت مجددؒ سے کئی طرح کے روحانی فیوض حاصل کیے۔ لیکن ان کی عام خبر گیری کی سعادت مزار احسام الدین کے سہتے میں آئی۔ حضرت مجددؒ خود ایک خط میں اپنے مرشد کے احسانات کا ذکر کر کے اپنے مُرشد زادوں کو لکھتے ہیں:-

”وہر گاہ این دولت رفیع القدر از حضرت ایشان بدیں فقیر رسیدہ باشد۔ اگر دلت عمر سرخوردہ یا ثمال اقدام خدمت عتبہ عالیہ خوار کردہ باشد۔ ہیج نکر دہ باشد۔ از تعصبات خود چہ عرض کند و از شرمندگیہا سے خرد چہ اظهار نماید۔ اما محارف آگاہ خواجہ حسام الدین راسخ سبحانہ اند ما جزا سے خیر و یاد کہ معونت بمقصران بر خود التزام نمودہ کمر ہمت برادر خدمت عتبہ عالیہ نسبتہ اند و ما دور افتادگان را قادر ساختہ“

شاہ ولی اللہ الفاس الحارثین میں لکھتے ہیں:-

”محقق نماںد کہ خواجہ حسام الدین در اوائل حال در سلک امرائے وقت انتظام داشتند
والد ایشان از اعظم امرائے زمان بود۔ چون بصحبت خواجہ رسیدند و جذب طریقہ ایشان
تأثیر کرد۔ ہمہ را ترک کردند۔ و طوعاً و رغبتاً از ہمہ برآمدند۔ چون اقارب ایشان نمی گزاشتند
کہ وضع فقرائے بخود قرار دہند۔ خود را بدیوانگی انداختند و در مجمع بر مزبلہ شستند و خود
را ملوث ساختند۔ از ان باز دست تشویش آن جماعہ از ایشان کوتاہ شد۔ آنقدر مراعات
جانب خواجہ در بارہ اولاد ایشان و اتباع ایشان و طریقہ ایشان و اشغال ایشان کہ
ازین دو عزیز خواجہ حسام الدین و شیخ الوداد بطور پیوستہ۔ از دیگران بوقوع نیامد۔
خواجہ حسام الدین کی مفصل سوانح عمری حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے
خواجہ کلاں نے لکھی۔ وہ اب دستیاب نہیں ہوتی، لیکن منتشر حالات معاصرانہ
کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ آپ کی طبیعت میں مسکنت بے حد
تھی بلکہ خواجہ خود جو آپ کو افضل و اکمل اصحاب حضرت خواجہ با” اور ان کے جانشین
حقیقی” کہتے ہیں۔ رباعیات و شرح رباعیات (قلمی) میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ آپ کو
حضرت خواجہ سے خلافت عطا ہوئی تھی اور آپ ارشاد و ہدایت کے مجاز تھے، لیکن
آپ یہ کہتے رہے کہ میں اس اہم ذمہ داری کے قابل نہیں۔ اور سلسلہ ارشاد شروع
نہ کیا۔

در مقام عبودیت کہ نہایت مقامات ولایت است مستقر داشتند۔ با آنکہ از
حضرت خواجہ مجاز و از غیب با ذوق بودند۔ بہ مشیخت و ارشاد متوجہ نشدند و از
کمال علو ہمت و نہایت تجرید طریقہ طبعی اختیار نہ فرمودند۔

خاست انکسار و انزوای کے باوجود آپ کا اپنے زمانے میں بڑا اثر تھا۔ شیخ عبدالحق
محدث سے جو حضرت خواجہ کے عقیدت مندوں میں سے تھے، آپ کے بڑے
روابط تھے۔ بلکہ سفینۃ الاولیاء میں داراشکوہ لکھتا ہے۔ کہ بعض ”سخنان غیر واقع“
کی بنا پر جہانگیر نے، جب وہ کشمیر میں تھا۔ آپ کو اور شیخ محدث کو دہلی سے چلے
جانے کا حکم دیا۔ اس روایت میں بعض غلطیاں ہیں (مثلاً آپ کو از مریدان باکمال

شیخ احمد سہرندیؒ لکھا ہے۔ لیکن اگر نفس مضمون میں کچھ صحت ہے تو غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ آپ (اور شیخ محدث) شہزادہ خرم (شاہجہاں) کے طرفدار سمجھے جاتے ہوں گے۔ جو ایک زمانے میں نورجہاں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اپنے والد جہانگیر کے خلاف بغاوت پر مجبور ہو گیا تھا۔ مثلاً طبقات شاہجہانی کا مصنف بڑی تفصیل سے لکھتا ہے کہ خواجہ حسام الدین کی بڑی خواہش تھی کہ خرم (شاہجہاں) پادشاہ ہو۔ مخفی اور علانیہ اس خواہش کا اظہار کرتے۔ خود اس کے لیے دعا کرتے اور درویشوں اور گوشہ نشینوں سے اس مقصد کے لیے دعا کی درخواست کرتے۔ طبقات کا متعلقہ اندراج حسب ذیل ہے :-

باوجود کمال اجتناب و احتراز حضرت حسام اولیا (خواجہ حسام الدین) از دنیا و اہل دنیا و ملاقات ملوک و سلاطین، چوں دینداری و دیں پروری حضرت صاحبقران ثانی در خاطر شریف و سے متمکن بودہ۔ ہمیشہ بدعا و زاری از درگاہ حضرت قادر باری سلطنت اور میخواستہ و سر او علانیہ طالب آں بود کہ لوائے سلطنت حضرت بادشاہ دین پناہ شاہ جہاں مرقع شود۔ و شب و روز بخت رفاہیت خلق اللہ از درویشاں و گوشہ نشیناں التماس فاتحہ برائے بر آمدن ایں مطلب میکردہ تا آنکہ حضرت صاحبقران ثانی نیز چوں از زمان شاہزادگی سوابق دوستداری و دولت خواہی و سے میدیدند۔ حسن عقیدہ تام بر سے داشتند۔ بعد از وفات آنجناب چنانچہ باید بر احوال فرزند و ان برداشتند۔ خلد اللہ۔

خواجہ حسام الدین کا ذکر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے دونوں قریب الحدیثوں (زبدۃ المقانات، حضرات القدس) میں بڑی تفصیل اور تعریف کے ساتھ ہوا ہے۔ دونوں موصوفین لکھتے ہیں کہ اگرچہ آپ عزت گزین تھے۔ اور امر اور وسایے اختلاط سے نہیں رہتے تھے۔ لیکن محتاجوں کی حاجت روائی میں بڑے عریض تھے۔ ان کا سمارش کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے۔ بلکہ کبھی ایسے ایسے امرا سے بھی سفارش کرتے کہ آپ کے مخلصین کو ناگوار ہوتا۔ اور آپ کے فرزند اعظم

کرتے، لیکن آپ نے اس طریق کار کو نہ چھوڑا۔

آپ نے مرشد کے مزار کے گرد ایک باغیچہ لگوایا تھا۔ بقول خواجہ ہاشم کشمی "امروز بہ من سخی خدمت خواجہ حسام الدین احمد سلمہ اللہ تعالیٰ حوالی آں مزار از آبشار و اشجار و از بار بہشتی شدہ یزار و تبرک و منفعت"۔ آپ دن کا زیادہ حصہ وہاں گزارتے اور تلاوت قرآن شریف اور نماز اور مراقبہ میں مشغول رہتے۔ آپ کی وفات اگست ۱۶۳۳ء کو آگرہ میں ہوئی۔ کچھ دیر کے بعد جسدِ خاکی کو وہاں سے دہلی لا کر مرشد کے پائیں مزار دفن کیا گیا۔ خواجہ حسام الدین کی وفات کے بعد ان کی بی بی نے ان کے نیک کام جاری رکھے۔ اپنے بھائیوں اور خویشتوں سے منہ موڑ لیا اور جب تک جیتی رہی، ۱۲ ہزار روپے سالانہ جو خانخاناں کی دی ہوئی جاگیر سے آتا تھا حضرت خواجہ کی خانقاہ کے خرچ کے لیے بھیجتی رہی۔ خواجہ حسام الدین کی وفات پر طبقاتِ شاہ جہانی کے مصنف نے جو پراثر قطعہ لکھا۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

چوں حسام الحق از جہاں بگزشت حصن دیں را اساس محکم رفت
بازید و جنیدِ دوراں شد شبلی وقت و ابنِ آدم رفت
یارِ بیچارگانِ خستہ نماند اہل دیں را انیس ہدم رفت

شیخ تاج الدین سنبھلی | خواجہ خرد سے شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم نے چند سبق پڑھے اور ان کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔ شاہ عبدالرحیم، خواجہ محمد باقی کے بڑے تلامذہ اور ان کے خاص طریقے کے

۱۰ محمد صالح نام۔ شیخ عبدالحق محدث سے ان کے بڑے روابط تھے۔ ان کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ وہ بھی بڑی شفقت فرماتے تھے۔ یہ ایک دفعہ بیمار ہوئے اور علالت نے طول کھینچا۔ شیخ ہر روز بیمار پر کسی اور نسل کے لیے رقعہ لکھتے۔ کبھی دن میں دوبار۔ "قریب صد و پنجاہ رقعہ" آنحضرت پیش فقیر کہ ہمہ بدستخطِ خاص نوشتہ اند۔ جمع شدہ "طبقات شاہ جہانی میں شیخ عبدالحق محدث کے کئی رقعات نقل ہوئے ہیں۔

پیرو تھے۔ وہ اسے نقشبندیہ طریقہ کے دوسرے شعبوں پر فضیلت دیتے تھے شاہ ولی اللہ
اس سلسلے میں لکھتے ہیں:-

”محضی نمائند کہ حضرت ایشاں (شاہ عبدالرحیم) از شعبات طریقہ نقشبندیہ القدرہ شعبہ حضرت خواجہ
محمد باقی را پسند میکردند و میل نمودند کہ مثل ایں میل بدگر شعبہ نبود۔ ہمارا ارشاد و تربیت
ایشاں بایں شعبہ بود است۔ شیخ تاج الدین سنہلی کہ اول خلفائے حضرت خواجہ
بودند و در آخر بمکہ اقامت اختیار کردہ ہما نجامہ فون شدند و ایں فقیر از متاخران مشائخ
اہل ہند ہیچ کس را ندید کہ اہل مکہ زیادہ از شیخ تاج محققا و باشند۔ کرامات و سے
روایت کنند۔ در بیان اشغال شعبہ باقوۃ کہ ہماں طریقہ نقشبندیہ است
بے افراط و تفریط۔ رسالہ عربیہ دارند و حضرت ایشاں (والدہ من) ترجمہ آن رسالہ
فارسیہ نوشتند ملتقط از عبارات سلف۔ ایں فقیر ایں ہر دورا بخد مت حضرت
ایشاں گزرا ندہ و الحمد للہ“

شیخ تاج الدین سنہلی جن کے اشغال نقشبندیہ کے متعلق عربی رسالے کا
فارسی ترجمہ شاہ عبدالرحیم نے کیا تھا، خواجہ باقی باللہ کے سب سے پہلے مرید تھے۔
(زبدۃ المقامات) وہ غالباً ان کے حلقہ ارادت میں اس وقت داخل ہوئے،
جب حضرت خواجہ بزرگوں کی تلاش میں سنہلی آئے تھے۔ حضرت خواجہ کی وفات کے
جلد بعد وہ بلاد عرب میں چلے گئے تھے۔ ان کی نسبت علامہ مرتضیٰ زبیدی نے
جن کی عمر کا بیشتر حصہ یمن، حجاز اور مصر میں گزرا، نفحۃ القدوسیہ میں لکھا ہے کہ شیخ
تاج الدین نے بصرہ، یمن، احسا، نجد اور خود حجاز میں طریقہ نقشبندیہ کو پھیلایا
اور ان علاقوں میں ان کے مریدوں کی ایک بڑی جماعت تھی۔ انھوں نے عربی میں
متعدد کتابیں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ اور اہل عرب کو نقشبندیہ سلسلے سے روشناس
کروایا۔ اس سلسلے کے متعلق آپ کی مشہور تصنیف الرسالہ فی سلوک خلاصۃ السادۃ
نقشبندیہ ہے۔ جس کی علامہ عبدالغنی النابلسی نے تفصیلی شرح ”مفتاح المعیت
فی طریقۃ النقشبندیہ“ کے نام سے لکھی ہے۔ آپ نے ایک عربی رسالہ پیری مریدی

کے جواز میں منکرین کو قائل کرنے کے لیے لکھا۔ تصوف کی کئی مشہور کتب (مثلاً جامی کی نفحات الانس اور ملا واعظ کا شفی کی رشتحات) کا عربی میں ترجمہ کیا۔ نفحات الانس کے اس عربی ترجمے کا ایک نسخہ کتب خانہ رام پور میں ہے۔

حجاز میں شیخ تاج الدین کو غیر معمولی کامیابی کچھ اس وجہ سے ہوئی کہ شیخ محمد علان جو اعیان و اکابر حرم میں سے تھے اور حنفی طریقہ نقشبندیہ سے پہلے سے دلچسپی تھی، آپ کے حلقہ ارادت میں آئے اور دیار عرب میں آپ کو شیخ شیخ علان کہا جانے لگا۔

حجاز میں کچھ عرصہ قیام کے بعد آپ ہندوستان تشریف لائے۔ لیکن پھر واپس چلے گئے۔ اور اپنی طویل عمر کا کافی حصہ حجاز اور عربستان گزارا۔ آپ کو وہاں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آخری دفعہ بصرہ و کوفہ کی طرف گئے تو حاکم بصرہ آپ کے مخلصین میں داخل ہوا (زبدہ)۔ بالآخر آپ نے بیت اللہ شریف کے قریب زمین خریدی اور وہاں سکونت اختیار کی۔ آپ کی وفات نوافس برس کی عمر میں ۸۱۵ھ ہجری میں ہوئی اور مکہ معظمہ میں مدفون ہوئے۔ آپ کے حالات میں ایک مستقل عربی کتاب بانکے پور لائبریری میں ہے۔

اب ہم حضرت خواجہ کے سب سے نامور خلیفہ اور ہندوستان کے بطل عظیم حضرت مجدد الف ثانی کا ذکر خیر کریں گے۔

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ

حضرت مجدد الف ثانی ۱۲ شوال ۹۷۱ھ یعنی ۲۶ جون ۱۵۶۲ء کو بمقام سرہند پیدا ہوئے۔ آپ کا اسم گرامی احمد تھا۔ لقب بدرالدین اور کنیت ابوالبرکات۔ آپ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق کی اولاد سے تھے۔ اور آپ کا سلسلہ نسب کابل کے ایک ممتاز خاندان سے ملتا ہے۔ خاندانی روایات کے مطابق آپ مغربی پاکستان کے مشہور بزرگ حضرت بابا فرید گنج شکر کے ہم جد تھے۔ کیونکہ دونوں کا سلسلہ نسب شیخ شہاب الدین علی المعروف بہ فرخ شاہ الفاروقی الکابلی سے ملتا ہے۔

تعلیم | حضرت مجدد الف ثانی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مخدوم عبدالاحد اور سرہند کے دوسرے علماء سے حاصل کی۔ اس کے بعد ملک کے بعض بہترین علماء سے فیض حاصل کیا۔ سیالکوٹ میں آپ نے علامہ کمال الدین کشمیری سے جن کے حلقہ درس سے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جیسے فاضل روزگار اٹھے۔ تھنڈی اور اس قسم کی دوسری مشکل کتابیں پڑھیں۔ حدیث میں آپ کے سب سے مشہور استاد شیخ یعقوب مرقی کشمیری تھے، جن کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا۔ ان کے علاوہ قاضی بہلول بدخشانی رحمہ اللہ سے تفسیر واحدی مع دیگر مولفات واحدی (مثلاً بسیط و وسیط و اسباب نول) تفسیر بیضاوی مع دیگر مصنفات قاضی بیضاوی (مثلاً منہاج الوصول وغایت القصوی) صحیح بخاری اور امام بخاری کی دوسری تالیفات (مثلاً تلاشیات و ادب المفرد و افعال العباد و تاریخ وغیرہ)۔ مشکوٰۃ مصابیح۔ شمائل ترمذی۔ جامع صغیر سیوطی اور قصیدہ برودہ و حدیث مسلسل کی اجازت حاصل کی۔ افسوس کہ قاضی بہلول بدخشانی کے متعلق تفصیل نہیں ملیں۔ لیکن زبدۃ المقات میں جہاں ان کی اسناد حدیث درج ہیں، یہ وضاحت کی گئی ہے کہ حدیث میں ان کے استاد معظم شیخ عبدالرحمان بن فہد تھے، جو حجاز کے ایک مشہور محدث خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

مخدوم عبدالاحد

مخدوم عبدالاحد جو حضرت مجددؒ کے والد اُستاد اور پیر و مُرشد تھے۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے صاحبزادہ شیخ رکن الدین کے ممتاز خلیفہ اور بڑے صاحب علم بزرگ تھے۔ آپ کئی صوفیانہ کتب مثلاً کنوز الحقائق اور رسالہ تشہد کے مصنف اور بڑے سیاح تھے۔ چنانچہ زبدۃ المقامات میں آپ کے بنگالہ۔ جونپور۔ رہتاس وغیرہ کے سفر اور اُٹارے سفر میں اولیائے اور علمائے کرام سے ملاقات کا ذکر ملتا ہے۔

آپ نے شیخ اکبر محی الدین ابن العربی اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتابوں کا غار مطالعہ کیا تھا اور فصوص الحکم اور تصوف کی دوسری اہم کتابوں مثلاً عوارف المعارف کا درس دیا کرتے تھے۔ بلکہ زبدۃ المقامات کے ایک اندراج سے خیال ہوتا ہے کہ حضرت میاں میر لاہوری نے فصوص الحکم آپ سے پڑھی تھی (مولانا ہاشم کشمیری لکھتے ہیں "قدوة المشائخ جناب شیخ میر جو آج کل شہر لاہور میں سکونت فرما اور نہایت عزت پسند ہیں۔ آپ کے تلامذہ فصوص الحکم سے ہیں۔")

سب والدین کو اپنی اولاد عزیز ہوتی ہے، لیکن تذکرہ نگار بالصراحت اور تفصیل لکھتے ہیں کہ مخدوم صاحب کو اپنے بلند اقبال صاحبزادے سے غیر معمولی محبت تھی۔ والد ماجد ایشاں را با ایشاں القبت تمام بودہ و از جان عزیز خود عزیز تر سے داشتند و ہمیشہ صحبت ایشاں مشغوف بودند۔ و از دقائق علوم دینی و اسرار یقینی در میان سے آوردند۔ (زبدۃ المقامات ص ۱۳۳)

اور حضرت مجددؒ نے بھی ان سے پوری طرح اخذ فیض کیا۔ ملتزم خدمت و صحبت والا بزرگوار شدہ و ہمگی اقتباس التدارک بزرگ عالمہ دار گردید و فوائد باطنیہ کثیرہ از ایشاں دیدہ (ایضاً)

یہ صرف ایک شفیق باپ اور سعادت مند صاحبزادے کا تعلق نہ تھا بلکہ مخدوم صاحب ان کے اُستاد اور پیر و مُرشد بھی تھے۔ حضرت مجددؒ نے شروع میں اکثر علوم ان سے پڑھے۔ چشتیہ اور قادریہ سلسلے میں ان کے مرید ہوئے۔ اور جیسا کہ انھوں نے

مبدأ و محاد میں لکھا ہے۔ "نسبت فردیت" ان سے حاصل کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت مجددؒ کی اکثر صلاحیتیں خدا داد تھیں اور ان کے جوہر نقشبندیہ سلسلے میں بحیثیت اور حضرت باقی باللہ کی خدمت میں پہنچنے کے بعد کھلے۔ لیکن شاید ان کے خیالات کی ساخت میں سب سے زیادہ دخل ان کے شفیق باپ کی صحبت اور ابتدائی ماحول کو تھا۔ (مخدوم عبدالاحد کو شیخ ابن العربی کے خیالات سے بڑا شغف تھا۔ اس کا اثر ان کے فخر پر صاحبزادہ پر بڑا گہرا اور وسیع ہوا۔ حضرت مجدد و الف ثانی ایک خط میں لکھتے ہیں :-

مکرما! معتقد فقیر از خردی بامشرب اہل توحید بود۔ والد فقیر قدس سرہ بظاہر برہمیں مشرب بودند۔ و بر سبیل دوام بہ ہمیں طریقہ اشتغال داشتہ اند.....
بحکم ابن الفقیہ نصف الفقیہ فقیر ازین مشرب اند و علم حظ وافر بود و لذت عظیم داشت۔

نقشبندیہ سلسلے میں داخل ہونے کے بعد بھی مدت تک یہی حالت رہی۔ اس کے بعد حضرت مجددؒ پر وحدت شہود کی کیفیت منکشف ہوئی۔ اس زمانے میں انھوں نے شیخ ابن العربی اور ان کی تصانیف کے متعلق بعض مخالفانہ فقرے لکھے۔ شیخ کی مخالف شرع باتوں سے اختلاف ظاہر کیا۔ لیکن شیخ کی عظمت و بزرگی کے ہمیشہ معترف رہے۔ بقول خواجہ ہاشم کشمی "شیخ محی الدین ابن العربی قدس سرہ را بس بزرگ مے دانستند و نیک یاد مے کردند" انھوں نے توحید و ہود کی پوری نفی نہیں کی۔ بلکہ اسے توحید شہودی سے نیچے ایک مقام قرار دیا۔ اور "توحید وغیرہ امور خلافیہ" کے متعلق کہا۔ "علما ان امور کی قباحت کے قائل ہیں۔ اور فقیر بشرط عبود ان امور کے حسن کا" (دفتر دوم ۱۲) قطب۔ ابدال۔ اوتاد کے جس باطنی نظام کو شیخ ابن العربی نے تصوف میں داخل کیا تھا، اسے آپ نے ترقی اور تقویت دی اور طریقہ مجددیہ کے قیوم کو شیخ ابن العربی کے قطب کی اگلی منزل سمجھنا چاہیے۔

شیخ یعقوب صر فی کشمیری | حضرت مجدد کے دوسرے با اثر استاد شیخ

یعقوب صرف کشمیری تھے، جن سے انھوں نے حدیث کی بعض کتابیں پڑھیں اور سلسلہ کبریٰ میں بحیثیت کی (حضرات القدس) برصغیر کی روحانی، ادبی اور سیاسی زندگی میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ۹۲۸ھ میں پیدا ہوئے۔ کشمیر کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ تعلیم ظاہری کے بعد سمرقند جا کر شیخ حسین خوارزمی کے مُرد ہوئے۔ مُرشد نے خاص توجہ اور مہربانی کی۔ واپس کشمیر آئے تو خلقت کے ٹھٹ کے ٹھٹ فیض کے لیے حاضر ہوئے۔ انھوں نے کچھ عرصے کے بعد خراسان کے رستے حجاز کا رخ کیا۔ شیخ ابن حجرؒ سے حدیث پڑھی اور سند لی۔ بڑے سفر کیے اور کئی اولیاء اللہ سے ملاقات کی۔ واپس کشمیر پہنچے تو یہاں شیعہ سنی جھگڑے زوروں پر تھے۔ جب یعقوب چک نے قاضی موسیٰ کو شیعہ طریقے سے خطبہ نہ پڑھتے پر شہید کر دیا اور اہل سنت کے لیے حالات بہت ناسازگار ہو گئے تو شیخ یعقوب، بابا داؤد خاکی کو ساتھ لے کر اکبر کے پاس لاہور پہنچے اور کشمیری عوام کی طرف سے دعوت دی۔ اکبر تو اس موقع کا پہلے سے منتظر تھا۔ اس نے اپنی فوجیں بھیجیں اور اکتوبر ۱۵۸۶ء میں کشمیر مملکت مغلیہ کا حصہ ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد اکبر اور شیخ کے درمیان خاص روابط ہو جانا عجیب نہیں۔ لیکن بدایونی کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ روابط پہلے سے تھے۔ بلکہ وہ تو کہتا ہے کہ ہمایوں کو بھی شیخ سے غیر معمولی اعتقاد تھا:-

وہم پادشاہ مغرت پناہ (ہمایوں) وہم شاہنشاہی (اکبر) نسبت و سے اعتقاد غریب بود۔ بشرف محبت اختصاص داخستہ و منظور نظر شفقت از گشتہ معزز و مکرم و محترم بود۔ شیعہ سنی مسئلے پر شیخ یعقوب کے جوشیدہ احساسات تھے، اس کا اندازہ ان اقوال سے ہو سکتا ہے، جو انھوں نے قاضی موسیٰ کی شہادت پر شروع کیے۔ لیکن ان کی

۱۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ شیخ یعقوبؒ اثنائے سفر میں شاہ طہماسپ کے ایام حکومت میں ایلان پہنچے تھے۔ غالباً یہ زمانہ تھا جب ہمایوں بھی وہاں مقیم تھا۔ شاید ان ایام میں ہمایوں سے روابط قائم ہوئے ہوں۔

مثالیں اس سے پہلے بھی ملتی ہیں۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد اپنی کتاب پاکستان میں فارسی ادب (جلد اول) میں لکھتے ہیں کہ شیخ یعقوب صرّنی کا سرِ سنگیہ میں ایک اُستاد تھے۔ انھوں نے ملا بصیر بڑے بڑے صاحبِ عظمت بزرگ ان کے حلقہ تلمذ میں شریک تھے۔ مثلاً شیخ داؤد خاکی۔ لوگوں نے مشہور کیا کہ ملا بصیر بھی مالک بہ تشیع ہیں تو شیخ صرّنی ان کے مدرسے سے اُٹھ آئے۔

حضرت مجدد کا شیعیت کی نسبت ایک خاص نقطہ نظر تھا۔ اور ان کی ابتدائی تصانیف میں ایک رسالہ تھا ردِ و افض۔ کیا اس نقطہ نظر کے پیدا کرنے یا اسے تقویت دینے میں ان کے مُرشد اور اُستاد شیخ یعقوب صرّنی کا اثر بھی کار فرما تھا؟ شیخ یعقوب کی ہستی جامع صفات تھی۔ وہ عالم اور شیخ ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ خمسہ کا جواب لکھا۔ پاکستان میں فارسی ادب میں ان کا تذکرہ ساٹھ صفحات پر محیط ہے۔ بدایونی نے ان کے متعلق جو طویل اندراج دیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ ان کے فیضی سے بڑے مراسم تھے۔ اس کی علمی اور ادبی صحبتوں میں وہ اکثر شریک ہوتے۔ ان کی لکھی ہوئی تفسیری کی تکمیل کی تاریخ اکثر موزّین نے نقل کی ہے۔ حضرت مجدد کی بھی فیضی اور ابوالفضل کے ہاں کافی آمد و رفت تھی۔ اور ان کے تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ انھوں نے تفسیر بے نقط کی تکمیل میں فیضی کا ہاتھ بٹایا۔ کیا فیضی (اور ابوالفضل) سے ان تعلقات کی استواری میں ان کے اُستاد کو بھی دخل تھا؟

شیعہ سُنی مسئلے پر شیخ یعقوب اور حضرت مجدد کے اشتراکِ احساسات اور فیضی سے دونوں کے قریبی تعلقات کی بنا پر بعض سوالات ان کے سوانح نگار کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن ان کا یقینی جواب نہیں دیا جاسکتا ہے۔ اتنا یقینی ہے کہ حضرت مجدد اپنی تمام عمر میں تین بزرگوں کے حلقہ ربیعیہ میں داخل ہوئے۔ ایک ان کے والد بزرگوار تھے۔ دوسرے حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ۔ تیسرے شیخ یعقوب صرّنی کشمیری۔ مؤخر الذکر کا بھی ان کی علمی اور روحانی زندگی میں ایک اہم مقام ہے۔

جب حضرت مجدد علوم عقلیہ و نقلیہ سے استفادہ کر چکے تو آپ نے سرسبز میں درس علوم کا سلسلہ شروع کیا اور مدت تک طالبان علوم کو فیوض و برکات سے بہرہ ور کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ (بیس سال کی عمر میں) اکبر آباد تشریف لے گئے اور ایک مدت تک وہاں قیام کیا۔

قیام اکبر آباد | سوانح نگار لکھتے ہیں کہ قیام اکبر آباد کے دوران میں آپ کو ابو الفضل اور فیضی سے کئی بار ملنے کا موقع ہوا اور بعض اختلافات کے باوجود دونوں بھائی آپ کے علم و فضل کے بڑے معترف ہو گئے۔ آپ کے مشہور خلیفہ خواجہ محمد ہاشم کشمیری نے زبدۃ المقامات میں لکھا ہے: (ترجمہ)

چونکہ ابو الفضل اہل علم کی قدر کرتا تھا اور اہل علم کو بھی بعض مجبور یوں کی بنا پر اس سے ملنا پڑتا تھا۔ اس لیے حضرت مجدد کئی بار اس کی مجلس میں آئے۔ اور چونکہ وہ بھی آپ کی متعدد خوبیوں سے واقف تھا اس لیے وہ آپ کا خاص پاس کرتا۔ چنانچہ اس کے ایک شاگرد نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ ایک دفعہ ابو الفضل کسی دوست کو چند باتیں لکھ رہا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک واقعہ درج کیا جو اس نے حضرت شیخ (مجدد) سے سنا تھا اور اس ضمن میں حضرت کی بڑی تعریف لکھی۔

ابو الفضل کا ایک اور مصاحب مجھ سے کہتا تھا کہ ایک دفعہ تمہارے مرشد ابو الفضل کی مجلس میں حاضر تھے۔ اس وقت ابو الفضل نے فلسفیوں اور ان کے علوم کی تعریف شروع کی اور اس میں اس طرح مبالغہ کیا کہ علماء اسلام کی توہین منہوم ہوتی تھی حضرت شیخ سلمہ اللہ تعالیٰ سے نہر پا گیا اور انھوں نے فرمایا کہ امام غزالی قدس سرہ نے رسالہ شریفہ

۱۰ حضرات القدس میں لکھا ہے ”تحصیل علوم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے والد ماجد کے حضور میں درس علوم میں مشغول ہوئے“۔ زبدۃ المقامات میں ”والد ماجد کے حضور“ کا ذکر نہیں۔ ”چوں حضرت ایشاں استفادہ علوم معقول و متقول و فروع و اصول فارغ شدہ اند۔ رخت بستاند افادہ کشیدہ اند۔ و مدتہا طلبہ علوم را از برکات خویش بہرہ ور کردہ اندیدہ“۔ ممکن ہے اکبر آباد میں بھی یہ سلسلہ قائم رہا ہو۔

منقذ عن الضلال میں لکھا ہے کہ جن علوم کی ایجاد کا فلسفی دعویٰ کرتے ہیں ان میں سے جو کام کے ہیں، مثلاً ہیئت - نجوم - ہیئت - طب - وہ انھوں نے قدیم انبیاء کی کتابوں اور ان کے کلام سے چلے گئے ہیں۔ اور جو ان کی اپنی ایجاد ہیں مثلاً ریاضی وغیرہ۔ وہ کسی دینی کام کے نہیں۔ ابو الفضل یہ سن کر جوش میں آگیا اور کہنے لگا کہ غزالی نے نامعقول بات کہی ہے۔ حضرت شیخ نے اس بات سے بڑا برا مانا۔ فوراً ابو الفضل کی مجلس سے اٹھے اور فرمایا کہ اگر اہل علم کی صحبت کا شوق ہے تو اس طرح بے ادبی کے الفاظ زبان سے نہیں نکلانے چاہئیں۔

یہ کہہ کر وہ مجلس سے باہر چلے گئے اور پھر کئی روز تک ابو الفضل کے پاس نہ گئے۔ حتیٰ کہ اس نے آدمی بھیج کر معذرت چاہی اور انھیں بلا بھیجا۔

ایک روز حضرت (مجدد) ابو الفضل کے بھائی ابو الفیض [فیضی] کے مکان پر گئے وہ تفسیر غیر مجرہ کے لکھنے میں مشغول تھا۔ جب آپ کو دیکھا تو بڑا خوش ہوا اور کہا کہ آپ اچھے وقت آئے۔ اس وقت میں تفسیر کے لیے ایک ایسی بات لکھنا چاہتا ہوں جس کے لیے غیر منقوط الفاظ نہیں ملتے۔ بہت دماغ سوزی کی، لیکن خاطر خواہ عبارت نہیں لکھ سکا۔ آپ نے اسی وقت باوجودیکہ آپ کو غیر منقوط عبارت لکھنے کا محاورہ نہ تھا، اس مقام کی تفسیر اس طرح فصاحت و بلاغت سے لکھ دی کہ فیضی حیران رہ گیا۔

حضرات القدس میں بھی جو حضرت مجدد کی دوسری قریب الحد سوانح عمری ہے، آپ کے خلیفہ اور شاگرد مولانا بدر الدین سرمدی نے لکھا ہے کہ آپ نے تفسیر غیر منقوط کی تحریر میں (فیضی کو) بڑی مدد دی تھی۔ اور تفسیر کا ایک حصہ لکھ کر دیا تھا۔ (صرا) تفسیر کے مقام تصنیف کے متعلق اہم آئندہ سطور میں اظہار خیال کریں گے۔

۱۔ ترجمان زبدۃ المقامات (نو کشور) ص ۱۳۱-۱۳۲ ۲۔ اردو ترجمہ میں ابو الفضل چھپا ہے، جو صحیح نہیں۔ شاید اصل میں ابو الفیض ہو۔ یا چونکہ اس سے پہلے ابو الفضل کا ذکر تھا کسی نقل کرنے والے نے ابو الفضل لکھ دیا۔

لیکن اتنا یقینی ہے کہ اگرہ (یا فتح پور سیکری) میں حضرت مجدد کا ابو الفضل اور فیضی کے ہاں آنا جانا تھا۔ اور یہ وہی زمانہ تھا، جب وہ درس و تدریس اور افتائے طلباء میں مشغول تھے۔

عجب نہیں کہ ابو الفضل نے آئین اکبری کے آخر میں جن فضلاء عصر کا ذکر کیا ہے ان میں شمارہ ۳۱ پر شیخ احمد آپ کا اسم گرامی ہو۔ اکبر نے اپنے دار الحکومت کو علمی اور ادبی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز بنا دیا تھا۔ فیضی اور ابو الفضل دونوں بڑے عالم اور صاحب طرز ادیب تھے۔ اور ان کے ہاں اہل علم کا جھگڑا رہتا تھا۔ یقین ہے کہ وہاں کتابوں کی علم و حکمت کی باتیں ہوتی ہوں گی۔ کئی کتابیں جو عام اہل مدرسہ کو تیسرے نہ تھیں۔ ان کا ذکر ہوتا ہوگا۔ مصنفوں کے انداز بیان پر تبصرے ہوتے ہوں گے اور عبارت آرائی اور زور بیان کے طریقے سوچے جاتے ہوں گے۔ یہ صحیح ہے کہ اہل دین کے لیے ان محفلوں میں دماغی کوفت کا بڑا سامان تھا۔ لیکن شاید یہ محض اتفاق نہیں کہ طبقہ علما کے دو سب سے بڑے نثر نگار (حضرت مجدد اور شیخ عبدالحق محدث) اور خود بدایونی ان مجلسوں میں بیٹھنے والے تھے۔ ان تینوں (بلکہ ابو الفضل فیضی کو ملا کر چوں) کا طرز تحریر جدا گانہ ہے۔ اس میں ان کی اپنی اپنی شخصیت جھلکتی ہے۔ بدایونی کی نثر میں ایک موسیقی کے رسیا، خوش الحان قادی کی شعری دلاویزی ہے۔ حضرت مجدد کی شخصیت جامع صفات تھی۔ ان کے طرز تحریر میں قوس قزح کے سارے رنگ ہیں۔ کہیں زور خطابت ہے، کہیں متکلمانہ موثر گافی اور کہیں علمی متانت۔ اور ان سب میں اعلیٰ درجے کی فصاحت و بلاغت (شیخ عبدالحق تھی) کے ہاں عالمانہ وقار کے ساتھ دلی کششگی و نفاست ہے۔ علامی ابو الفضل کا طرز تحریر ہمیں زیادہ پسند نہیں۔ لیکن اُس کی عربیت، علم و فضل اور شکوہ سلطانی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح فیضی کے ہاں زور کلام، جوش، علمیت اور شعروں کی فراوانی ہے۔ ان سب کا رنگ اپنا اپنا ہے۔ ”ہر گلے راز نگ و بے دگر است“ لیکن ان میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے انداز بیان کی اہمیت کا احساس۔ دوسرے علما (جسے کہ شاہ ولی اللہ) بالعموم

اس بات پر قانع ہیں کہ ان کا مافی الضمیر موزوں الفاظ میں ادا ہو جائے۔ لیکن عہد اکبری کے اہل علم، بالخصوص جو لوگ فصیحی۔ ابوالفضل کی مجلسوں میں آتے جاتے تھے، طرز ادا کی خوبیوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ اور عبارت کی نوک پلک سنوارنے پر بھی توجہ دیتے تھے۔

قیام اکبر آباد میں حضرت مجدد کو اپنی معلومات بڑھانے، علمی اور فکری مسائل پر مختلف نقطہ نظر جاننے اور انداز بیان کی پختگی کا موقع ملا ہوگا۔ لیکن آپ کا زاویہ نگاہ فصیحی۔ ابوالفضل سے بالکل مختلف تھا۔ اس کا اندازہ آپ کے رسالہ اثبات النبوت سے ہوتا ہے۔ جس کی ضرورت ممکن ہے، آپ نے ابوالفضل سے اس زبانی بحث کے بعد محسوس کی ہو۔ جس کا ذکر زبدۃ المقامات میں ہے۔ اور جس میں غزالی کی متقد من الضلال کے طویل اندراجات ہیں۔

رسالہ اثبات النبوة | بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجدد کی موجودہ تصانیف میں سب سے قدیم اثبات النبوة ہے۔ اس کے ابھی تک نامکمل نسخے ہی ملے ہیں، جنہیں پہلے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے اردو ترجمہ کے ساتھ اور اب مولوی محبوب الہی صاحب نے رسائل مجددیہ میں شامل کر کے شائع کر دیا ہے۔

رسالہ اثبات النبوة جس کا بعض نسخوں میں تحقیق النبوة نام لکھا ہے۔ چھوٹے سائز کا چوالیس صفحے کا رسالہ ہے۔ اس میں تمہیدی عبارت کے بعد دو بحثیں ہیں۔ ایک نبوة کے معنی کی تحقیق میں۔ دوسری مجرہ کے بارے میں۔ اس کے بعد ایک طویل مقالہ ہے، جس کا ”پہلا مسلک بعثت اور نبوت کی حقیقت“ اور اس کی ضرورت کے بیان میں اور دوسرا مسلک خاتم الانبیاء کی نبوت کے اثبات میں ہے۔

دوسرا مقالہ ”فلاسفہ کی مذمت میں اور ان کے علوم کی ممارست اور ان کی کتابوں کے مطالعہ سے جو ضرر ہوتا ہے، اس کے بیان میں ہے۔“ لیکن ابھی تک جو تین قلمی نسخے ملے ہیں، ان میں سے کسی میں بھی یہ مقالہ موجود نہیں۔ چنانچہ

اس کا کیا سبب ہے۔ ممکن ہے کسی وجہ سے یہ رسالہ مکمل نہ ہو سکا ہو۔ یا شاید موجودہ نسخے کسی ابتدائی، غیر مکمل نسخے کی نقلیں ہوں۔

اثبات النبوت کے ابتدائی صفحات تمہیدی ہیں، جن میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ عہد اکبری کی مذہبی بدعنوانیوں کا ذکر ہے۔ اس اندراج سے بدیونی کے بیانات کی تائید ہوتی ہے، لیکن رسالہ کو بخور پڑھیں تو اس عظیم بعد و تفاوت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، جو حضرت مجدد اور بدیونی کی اخلاقی اور ذہنی سطح میں تھا۔ اثبات النبوت ایک اہم مسئلے کا ایک نہایت بلند پایہ تجزیہ ہے۔ اس کا موضوع بحث و مناظرے کا ہے، لیکن اس میں ایک لفظ ایسا نہیں، جو نہایت اونچے درجے کی علمی ثقاہت و متانت کے خلاف ہو۔ یا جس سے مخالفین کے ساتھ خوش اخلاقی میں ذرہ بھر کمی محسوس ہو۔ ان کا نقطہ نظر بڑی احتیاط اور بڑے انصاف سے پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ نفس مضمون ایسا تھا، جس کے متعلق مصنف کے احساسات شدید تھے، لیکن انھوں نے کہیں اپنے جذبات کو غالب آنے نہیں دیا اور نہایت بلند علمی اور فکری سطح برقرار رکھی ہے۔

رسالے کی تصنیف کے محرکات مقامی اور محاصرہ تھے، لیکن تمہیدی عبارت کے سوا اس میں فقط انہی امور سے بحث ہے، جو اصولی اور دوا می ہیں۔ اور اگرچہ یہ رسالہ (غالباً) ابو الفضل سے ایک بحث سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔ لیکن فی الحقیقت اس میں ایک ایسے سوال (کیا انسانی راہنمائی کے لیے عقل کافی ہے یا نبوت کی بھی ضرورت ہے؟) کا عالمانہ، بلکہ محققانہ جواب ہے، جو صرف اہل اسلام کے لیے ہی نہیں، بلکہ دوسرے مذاہب والوں کے لیے بھی اہمیت رکھتا ہے۔

تمہیدی عبارت کے بعد آپ فرماتے ہیں:۔ (ترجمہ)

”میں نے بعض لوگوں سے مناظرہ کیا جنھوں نے علم فلسفہ پڑھا تھا اور کافروں کی کتابوں سے بہرہ یاب ہو کر فضل و فضیلت کے مدعی ہو گئے تھے اور لوگوں کو گمراہ کیا۔ اور اصل نبوت کے تحقق اور ایک خاص شخص کیسے اس کے ثبوت میں خود بھی گمراہ ہوئے

اور یہاں تک کہنے لگے کہ نبوت کا حاصل حکمت اور مصلحت ہے۔ خلق کے ظاہری حالات کی اصلاح ہے اور عوام کو شہوات میں آزاد روی، باہمی نزاع اور اختلاف سے محفوظ رکھنا ہے۔ اور اس کا نجات اُخرویہ سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس کا تعلق صرف تہذیب، اخلاق اور قلبی اعمال کے ان فضائل کی تحصیل سے ہے جنہیں حکماء نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔

مخالفین کے نقطہ نظر کی توضیح اور ان کے بعض اعتراضات کا جواب دے کر آپ لکھتے ہیں ”میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ اور میرے سینے میں جم گئی کہ میں ان کے لیے ایسی تقریر کروں جو ان کے شکوک دُور کر دے۔ اور ان کے لیے ایسی بات لکھوں جو ان کے شبہ کو زائل کر دے۔“

اثبات النبوت اسی ارادے کی تکمیل ہے۔ یہ تمام کا تمام رسالہ مطالعہ اور غور و خوض کا مستحق ہے، لیکن اس کے متعلق چند باتیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ ایک تو بلند علمی معیار جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ چونکہ اس رسالے کا مقصد عقل کے دعویداروں کے شبہات و شکوک رفع کرنا تھا اس لیے اپنے نقطہ نظر (یعنی نبوت کی ضرورت اور عقل کی واماندگی) کو مضبوط عقلی دلائل کی مدد سے واضح کیا ہے۔ اور مخالفین کے اعتراضات کو سلسلہ وار گنا کر ان کا نہایت خوش اسلوبی اور وضاحت سے جواب دیا ہے۔ رسالہ کی تیسری خصوصیت اس کا فصیح و بلیغ انداز بیان ہے، جو حضرت مجدد کی تمام تحریریں کا زلیور ہے اور جس نے انھیں مذہبی مسائل پر اسلامی ہندوستان کا سب سے قادر الکلام اہل قلم بنا دیا تھا۔

ابتدائی حالات کے متعلق دشواریاں | حضرت مجدد الف ثانیؒ کے احوال زندگی کے کئی معاصرانہ مآخذ ہیں، لیکن ابتدائی

حالات کے متعلق کئی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ آپ کے حالات و تعلیمات کا مستند مخزن تو آپ کے اپنے مکتوبات ہیں، لیکن وہ اس زمانے سے شروع ہوتے ہیں جب آپ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی صحبت میں پہنچے۔ ابتدائی چھتیس سالوں کے لیے

ہمیں زبدۃ المقامات اور حضرات القدس پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یہ دونوں تذکرے بے حد کارآمد ہیں۔ لیکن شاید وہ بھی الحاقی عبارتوں سے پوری طرح محفوظ نہیں رہے۔ اس کے علاوہ آغازِ ارشاد سے پہلے کے واقعات کے متعلق ان تذکروں میں جو ان واقعات کے وقوع کے کافی بعد لکھے گئے، سو کا امکان رہتا ہے۔

اس سہو کی ایک نمایاں مثال حضرت مجدد کے ابتدائی رسائل کے زبانِ مالیت کے متعلق نظر آتی ہے۔ حضرات القدس کے (اردو ترجمہ) کی متعلقہ عبارت ہے: ”اثنائے تحصیل علوم ظاہر میں آپ نے عربی و فارسی میں متعدد رسالے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ تحریر فرمائے۔ چنانچہ رسالہ تہلیلۃ اور رسالہ اثبات نبوت اور رسالہ ردِ شیعہ انہی رسائل میں سے ہیں۔“ حضرات القدس کا یہ اندراج کہ رسائل مذکورہ بالا ”اثنائے تحصیل علوم ظاہر میں“ (جس سے آپ سترہ سال کی عمر میں.... فارغ ہو گئے۔“ حضرات القدس (یقیناً صحیح نہیں۔ زبدۃ المقامات میں صرف دو رسائل کے نام لیے گئے ہیں (رسالہ تہلیلۃ اور رسالہ ردِ شیعہ) اور ان کا ذکر درس و تدریس کے دور میں، بلکہ اس کے بعد کیا گیا ہے۔ یہ بیان زیادہ قرین قیاس سے خوش قسمتی سے حال ہی میں اثبات النبوت اور رسالہ تہلیلۃ شائع ہو گئے ہیں۔ (تیسرا رسالہ ان سے پہلے مکتوبات کے ساتھ نو کشور پریس والوں نے شائع کر دیا تھا)۔ اور اب حضرات القدس وغیرہ کے بیان کی صحت کا بہتر اندازہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے نشان دہی کی ہے۔ رسالہ تہلیلۃ میں حضرت مجدد کے والد ماجد کے ساتھ قدس سرہ لکھا ہے۔ اس لیے اس کی تصنیف مخدوم صاحب کے سال وفات (۱۰۰۷ ہجری) کے بعد ہوئی ہوگی۔ اس میں اثبات النبوت کی تائید میں ایک سالہ کا

مے زبدۃ المقامات بوجہ حضرت مجدد کا بہترین تذکرہ ہے، لیکن اس میں بھی ایک دو الجھنیں ہیں مثلاً اس کی تاریخ تکمیل ۱۰۳۷ھ ہے، لیکن ایک جگہ شاہ محمد یحییٰ صاحب (ولادت ۱۰۲۷ھ) کے متعلق لکھا ہے۔ ”امروز کہ سال عمر آں بنخوردار بہ پانزدہ رسیدہ“۔

ذکر ہے۔ اس کے وہ رسالہ تہلیلہ سے پہلے کا ہوگا۔ اثبات النبوت کے مقدمہ میں ڈاکٹر صاحب نے اس رسالے کی تصنیف ”۹۹۰ھ کے قریب“ قرار دی ہے۔ اور زبدۃ المقامات کے اندر درج کی بنا پر اس سال کے متعلق فٹ نوٹ دیا ہے کہ ”اسی عمر میں ردّ شیعہ وغیرہ رسائل بھی لکھ چکے تھے“ محترمی ڈاکٹر صاحب نے ایک اور جگہ اثبات النبوت کے ۹۹۸ھ کی تصنیف ہونے کا امکان بھی ظاہر کیا ہے۔ دونوں بیانات قیاسی ہیں۔ اور رسالہ اثبات النبوت کے سال تصنیف کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ (سولے اس کے کہ اس کی تصنیف رسالہ تہلیلہ سے پہلے ہوئی تھی۔ اور غالباً حضرت مجدد کی سب سے پہلی تصنیف ہی رسالہ تھا)۔

رسالہ ردّ و افض بھی ابتدائی تصانیف میں سے ہے، لیکن اس میں اس خط کا ذکر ہے، جو علمائے مشہد نے علمائے ماوراء النہر کو لکھا۔ اور جیسا کہ ڈاکٹر الطہر عباس رضوی نے وضاحت کی ہے۔ یہ خط شاہ عباس صفوی کے دوسرے سال جلوس یعنی ۹۹۷ھ میں لکھا گیا۔ اس لیے حضرت مجدد کا رسالہ بھی اس کے بعد کا ہوگا۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے کہ اگرچہ حضرات القدس اور زبدۃ المقامات کی تاریخی اہمیت بہت ہے۔ ان کے مصنفین کو تلاش واقعات کی بڑی سہولتیں حاصل تھیں اور ان کے بیانات کی عمومی صحت پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن ابتدائی حالات کی جزئیات کے متعلق ان کے لفظ لفظ کا پابند ہونا یا اسے متعلقہ واقعات کا مکمل بیان سمجھنا خطرے سے خالی نہیں۔

اسی طرح کی الجھنیں حضرت مجدد کے سفروں کے متعلق ہیں۔ زبدۃ المقامات میں آپ کے آگرہ جانے کا تو ذکر نہیں، لیکن ابوالفضل کی مجلس میں آنے جانے اور اس سے مقام نبوت پر ایک بحث اور مخدوم صاحب کے آگرے آکر آپ کو مرہند بیجانے کی تفصیلات درج ہیں۔ زبدۃ المقامات کا بیان آگرے کے متعلق ہے۔ لیکن ابوالفضل تو غالباً ان دنوں فتح پور سیکری میں تھا۔ یہ دونوں مقامات ایک دوسرے سے بہت دور نہیں۔ اس لیے عمومی طور پر آگرے کا نام لیا گیا۔ لیکن زیادہ الجھن

ابوالفیض فیضی کی تفسیر کے متعلق ہے۔ زبدۃ المقامات اور حضرات القدس دونوں میں حضرت مجدد کی شرکت کا ذکر ہے۔ یہ تفسیر سنہ ۹۹۲ھ میں لاہور میں ختم ہوئی۔ اکبر اور اس کے ساتھ فیضی وغیرہ ۹۹۲ھ سے لاہور میں تھے۔ ان حالات میں فیضی کی تفسیر کے متعلق حضرات القدس اور زبدۃ المقامات کے اندراجات قبول کرنے میں بعض الجھنیں ہیں۔ اگر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کا ارشاد ہے۔ ”حضرت مجدد الف ثانی قدس... قریب ۲۰-۲۲ سال کی عمر میں اگر تشریف لے گئے تھے۔ وہیں فیضی اپنی بے نقط تفسیر سواطع الالہام کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس لیے حضرت علیہ الرحمۃ نے برحسبہ ایک بے نقط عبارت مرحمت فرمائی تھی۔ وہ تفسیر نظر ثانی کے بعد (بدایونی ص ۳۸۹) سنہ ۹۹۲ھ میں مکمل ہوئی۔“ تفسیر غیر منقوط کا اگر سے میں شروع ہونا ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ شاید زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اگرچہ حضرت مجدد اگر سے تشریف لے آئے، جس کے بعد ان کی شادی ہو گئی۔ اور وہ کافی دیر سرسند مقیم رہے۔ لیکن اس کے بعد وہ کچھ عرصے کے لیے لاہور تشریف لے گئے۔ جہاں انھوں نے (علمائے مشہد کے ۹۹۴ھ-۱۵۸۸ء) والے خط کے ہندوستان پہنچنے اور یہاں اس کے مضامین عام ہونے کے بعد ”مجالس امرا و سلاطین“ میں شیعہ اہل علم سے بحث و مباحثہ کیا۔ فیضی کو تفسیر غیر منقوط میں مدد دی اور رسالہ رد و افاضت تحریر کیا۔

یہ صحیح ہے کہ معاصرانہ تذکرہ نگار اس سفر لاہور کا ذکر نہیں کرتے، لیکن ان سے آپ کے تمام سفروں کا ذکر متوقع نہیں۔ مثلاً حضرت مجدد نے ایک مکتوب (دفتر اول شمار ۳۱۳) میں پرگنہ بنارس کے سفر کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کے بارے میں تذکرہ نگار بالکل خاموش ہیں۔ اسی طرح تذکروں میں حضرت باقی باللہ کی وفات کے بعد کسی وقت حضرت مجدد کے سفر لاہور کا ذکر ہماری نظر سے نہیں گزرا بلکہ سوائے واقعہ گوالیار اور لشکر کی نظربندی کے، سرسند میں ہی قیام کی صراحت ہے، لیکن خواجہ خرد کی رباعیات و شرح رباعیات سے پتا چلتا ہے کہ وہ حضرت مجدد کی خدمت میں تین مرتبہ بمقام سرسند اور ایک مرتبہ لاہور حاضر ہوئے۔ چونکہ خواجہ خرد اپنے والد کی وفات کے وقت دو سال کے تھے

اس لیے ظاہر ہے کہ لاہور کا سفر اس کے بہت بعد ہوا ہوگا اور وہاں حضرت مجدد کا قیام خاصہ طویل ہوگا کہ خواجہ نثر نے نزدیکی مقام سرسند میں ان کا انتظار کرنے کی بجائے لاہور حاضری دی۔

اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ تذکرہ نگاروں نے عمومی طور پر اکبر آباد سے دارالحکومت مراد لیا ہو۔ نہ ہی فتح پور سیکری کی وضاحت کی اور نہ ہی یہ خیال کیا کہ اکبر اور اس کے امرا ۹۹۴ھ سے سناہ تک لاہور میں مقیم تھے۔

اگر سنہ ۹۹۴ھ میں یا اس کے جلد بعد کچھ عرصے کے لیے حضرت مجدد کا سفر لاہور تسلیم کر لیا جائے تو نہ صرف تفسیر بے نقط کے متعلق زبدۃ المقامات اور حضرات القدس کے اندراجات بلکہ رسالہ رد و افض کی بعض الجھنیں دور ہو جاتی ہیں۔ لیکن بہر حال یہ معاملہ قیاسی ہے۔۔۔۔۔ ممکن ہے۔ نئی شہادت یا مزید غور و توجہ کی روشنی میں صورت حالات زیادہ صحت کے ساتھ واضح ہو جائے۔

تثاوی خانہ آبادی زبدۃ المقامات میں اس امر کی وضاحت ہے کہ جب حضرت مجدد کو اکبر آباد رہتے ایک مدت گزر گئی تو ان کے والد ماجد فرط محبت سے مجبور ہو کر بعد مسافت اور کبر سنی کے باوجود ان کے پاس پہنچے۔ اور حضرت مجدد نے وطن کو مراجعت فرمائی۔ اور بعد میں والد ماجد کی خدمت میں رہے۔

وایسی کے سفر کے متعلق مولانا احسان اللہ گورکھپوری سوانح عمری حضرت مجدد الف ثانی سرسندی میں لکھتے ہیں:-

حضرت مجدد عرصے تک اکبر آباد میں رہے۔ آپ کے والد مجدوم عبدالاحد آئے اور اپنے ساتھ سرسند واپس لے گئے۔ وایسی پر شیخ سلطان ایک مقرر شاہ ہند کی لڑکی سے حضرت مجدد کا عقد ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس عقد کی بابت حضرت محمد مسلم سے شیخ سلطان کو خواب میں علم ہوا تھا۔ اس عقد سے حضرت مجدد کی مالی حالت بہت درست ہوئی اور ایک نئی حلی حضرت مجدد نے اپنے لیے سرسند میں بنوائی۔ (ص ۱۰۰)

مولانا احسان اللہ کا بیان روضۃ القیومیہ پر مبنی معلوم ہوتا ہے جو بیان واقعات میں محتاط نہیں۔ لیکن چونکہ مصنف خاندانِ مجددیہ سے تھا اس لیے اس کی کتاب خاندانی روایات کا ایک کارآمد ذخیرہ ہے۔ وہ اس شادی کا ذکر کر کے لکھتا ہے۔ "اس شادی کے بعد حضرت قیوم اول (حضرت مجدد الف ثانی) کے پاس ظاہری مال و دولت بکثرت ہو گیا۔ اپنے والد بزرگوار کی حویلی چھوڑ کر ایک نئی حویلی بنوائی۔ جہاں بہرہ آج کل آنجناب کا روضہ مبارک اور آنجناب کی اولاد کا محلہ ہے۔ حویلی کے قریب ہی ایک مسجد بنوائی۔" آپ کے دوسرے بھائی پُرانی حویلی میں رہتے رہے۔ اس لیے ان کی اولاد کا لقب پُرانی حویلی والے پڑ گیا۔ (ص ۶۸-۶۹)

حضرت مجدد کی زندگی میں اس شادی کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک تو آپ کی اہلیہ محترمہ کے درجہ عالی کی بنا پر دوسرے ان کے والد شیخ سلطان کی وجہ سے جو ایک ممتاز عالم ادیب اور حاکم علاقہ تھے۔ اکبر سے قریب رہنے کے باوجود اس کی مذہبی پالیسی کے سخت مخالفت تھے۔ اور قرن قیاس نہیں کہ ان کے خیالات اور واقعات زندگی کا ذہن اور قابل داماد پر کوئی اثر نہ ہوا ہو۔

حضرت مجدد کی شادی کی تاریخ نہیں ملتی۔ لیکن آپ کے بڑے صاحبزادے شیخ محمد صادق کی جو جو پیش پچیس برس کی عمر میں وفات پا گئے تاریخ ولادت سنہ ۹۹۹ ہے۔ ان سے پہلے کسی اولاد کا ذکر نہیں ملتا۔ قرن قیاس ہے کہ شادی اور اکبر آباد سے واپسی کا زمانہ دسویں صدی ہجری کے آخری سال ۹۹۹ء سے بہت پہلے نہ ہو گا۔

روضۃ القیومیہ میں شیخ سلطان کے متعلق عجیب حاجی سلطان تھانوی

کوالف لیلہ کے قصے بنا دیے ہیں حالانکہ ان بیانات کے پس پشت حقیقت کا ایک عنصر موجود ہے جو خود اتنا دلچسپ ہے کہ اگر تاریخی کتب سے ہی صحیح حالات کو جمع کر دیا جائے تو ایک غیر معمولی شخصیت کا عبرتناک مرقع تیار ہوتا ہے۔

روضۃ القیومیہ میں لکھا ہے کہ شیخ سلطان کو اکبر کے ہاں بڑا قرب و اقتدار حاصل تھا۔

بادشاہ نے ان سے کہا۔ تم ہمارے لیے قرآن لکھو۔ انھوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اور پوچھنے پر کہا کہ آسمان سے جبریل تمہارے لیے قرآن شریف لائے تو میں بھی لکھوں۔ بادشاہ نے شرمندہ ہو کر انھیں اپنے ہاں سے دور کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور لاہور اور دہلی کے درمیانی علاقے کی حکومت ان کے سپرد کی۔ وہ وہاں پہنچے تو سرکاری لگان علما و فقرا میں تقسیم کرنا شروع کیا۔ بارہ برس تک یہی کیا۔ بادشاہ کو ایک پیسا نہ بھيجا جب وہ کسی تقریب سے ادھر سے گزرا اور بارہ سالہ خراج کی نسبت پوچھا تو شیخ صاحب نے کہا۔ تو مُرد ہو گیا ہے۔ اور مُرد کا مال اڑانا جائز ہے۔ اس لیے میں نے اسے فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیا۔ یہ کہہ کر بغل سے ایک پتھر نکال کر بادشاہ کے چہرہ پر ایسا تاک کر مارا کہ پیشانی سے خون بہنے لگا۔ شیخ صاحب کو سولی چڑھایا گیا۔ (ص ۳۶)

حقیقت حال یہ ہے کہ شیخ سلطان جو تھانیسری کے رہنے والے تھے اور کتب تاریخ میں حاجی سلطان تھانیسری کے نام سے معروف ہیں۔ ایک عالم فاضل بزرگ تھے۔ (”علویم نقیہ را خوب و زریہ“) آج وزارت سے مشرف ہوئے۔ مقاربت شاہی میں رہے۔ چار سال تک مہاجھارت کے ترجمے پر جو رزم نامہ کے نام سے تیار ہوا، مامور رہے۔ ابوالفضل اور بدایونی کے ہاں ان کی آمد و رفت تھی۔ اور بدایونی کے وہ دلی خیر خواہ تھے۔ چنانچہ جب بدایونی مخدوم الملک سے ان کے زمانہ اقتدار میں ملنے گیا تو ابوالفضل اور شیخ سلطان اس کے ساتھ تھے۔ بدایونی کی مخدوم سے روضۃ الاحباب کے متعلق تاثر گوار بجٹ شروع ہو گئی تو وہ اشاروں سے بدایونی کو منع کرتے رہے کہ احتیاط کرے اور سمجھے سے کام لے۔ یہ ابتدائی ایام کا واقعہ ہے۔ جب ابوالفضل دربار میں پہنچ گیا تھا۔ لیکن اسے کوئی منصب نہ ملا تھا۔ شیخ سلطان سے بادشاہ کی ناچاقی اس وقت شروع ہوئی جب تھانیسری کے مُردوں نے ان کے خلاف گاو کشی کی شکایت کی۔ انھیں بھکرے جلا وطن کر دیا گیا۔ اتفاقاً خانقاہی اس علاقے کی حکومت پر مامور ہوا۔ وہ اہل علم کا ہوا خواہ تھا۔ شیخ سلطان سے

بڑے التفات سے پیش آیا۔ ان کے زنجیروں پر مرہم رکھا اور فتح سندھ کے بعد انہیں اپنے ساتھ واپس لایا۔ شیخ محفی طور پر اپنے وطن چلے گئے۔ لیکن خانخانان نے دکن سے ان کی سفارش کی۔ اور جلاوطنی کے حکم کی تیسخ کی درخواست کی۔ یہ سفارش منظور ہوئی۔ شیخ سلطان کا کام بن گیا۔ بادشاہ نے، غائبانہ حکم دیا کہ انہیں تھانیسیر کرناں کا کروڑی بنا دیا جائے۔ چنانچہ جب بدایونی نے اپنی تاریخ لکھی (جس سے یہ حالات ماخوذ ہیں)۔ اس وقت وہ اس خدمت پر مامور تھے۔

شیخ سلطان کا عتاب شاہی کے بعد تھانیسیر کا کروڑی ہو جانا حیرت انگیز تھا۔ [بدایونی نے بھی ایک عربی شعر درج کر کے (کسی قدر شک کے ساتھ) اس امر کا اظہار کیا ہے کہ بسا اوقات 'عنایت الہی سے اس طرح کام بن جاتے ہیں کہ عقل ان کے سمجھنے میں حیران رہتی ہے']۔ لیکن بالآخر یہی تقرر ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ تھانیسیر ہندوؤں کا ایک مقدس مقام اور ان کی حیائیت کا ایک گڑھ تھا۔ ان لوگوں سے شیخ کی پہلے بھی کشمکش ہو چکی تھی جس کی وجہ سے وہ بھکر جلاوطن ہوئے۔ یہ کشمکش پھر تازہ ہو گئی۔ اور اس دفعہ ان کے دشمنوں کا وار بڑا کاری تھا۔

اکبر ۵۹۸ھ کے آخر میں لاہور کے طویل قیام کے بعد جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں کوکب شاہی تھانیسیر میں مقیم ہوا تو لوگوں (مقامی ہندوؤں؟) نے شیخ کے ظلم و ستم اور خلقت آزاری کی شکایت کی اور بادشاہ کو اس کا قائل کر دیا۔ اکبر ان دنوں ان کروڑیوں کے ساتھ جن کے خلاف شکایات ثابت ہوتی تھیں۔ خاص طور پر سختی کر رہا تھا۔ اس نے سترائے موت کا حکم دیا۔ چنانچہ یکم جنوری ۵۹۹ھ کو شیخ سلطان کو پھانسی دی گئی۔

۱۷۔ اس سے چند عینے پہلے جب اکبر کشمیر سے واپس آ رہا تھا تو الوداع (کنجاہ) کی رعایا نے عذریہ کروڑی کے ظلم و ستم کی فریاد کی۔ وہیں اس ستم پیشہ کے گلے پر چھری پھر وادی تاکہ ظالم حاکم عبرت پکڑیں۔ (خلاصۃ التواریخ ص ۵۲۶)

اس سلسلے میں اکبر نامہ میں حسب ذیل اندراج ہے :-
 دریں روز شیخ سلطان راز خلق کشیدند۔ درگروہ عمامہ داراں مے زیت -
 آرزوئے عمل گزاری اور کالیوہ ساخت۔ تھانیسیر (کہ بنگاہ او بود) بدو سپردند۔
 از بدستی دنیا کھینچا، رازہ بر ساخت۔ و بہ جان گزالی نیکوای برخاست۔ چون او خدا
 را بدان شہر گزار شد۔ و نختے ستم گاری او خاطر نشین گشت۔ بسزائے کردار خود رسید۔
 (اکبر نامہ۔ جلد سوم ص ۴۸)

اقبال نامہ جہانگیری میں اس سانحہ کا ذکر بدین الفاظ ہے :-
 چوں مرکب اقبال بنواچی تھانیسیر رسید۔ خلق انبوہ ازیر و سے سلطان کر وری آنجا
 دادخواہ شدند۔ و بعد از تحقیق بطور سویت کہ دریں ملک تعظم و بیداد از و بفعل
 آمد۔ حکم شد کہ ہماں جا از خلق برکشند۔ کہ عبرت دیگران شود۔
 (اقبال نامہ جہانگیری (نو کشور) جلد دوم ص ۴۵۹)

روضۃ القیومیہ میں لکھا ہے کہ شیخ سلطان محاصل شاہی کو فقرا و مساکین میں
 بانٹ دیتے تھے۔ ممکن ہے۔ اس میں صداقت کا کوئی عنصر ہو۔ شیخ صاحب کی سخاوت
 کا تذکرہ نگار بالصراحت ذکر کرتے ہیں۔ حضرات القدس میں انھیں ”عالم و فاضل اور پرہیزگار
 و سخی بزرگ“ (ص ۲۶) کہا گیا ہے لیکن ابوالفضل کے الفاظ ”کہن کین ہا راتمانہ ساخت“
 کو بدایرنی کے بیان کی روشنی میں دیکھیں تو خیال ہوتا ہے کہ یہ پُرانے گاؤ کشتی والے
 جھگڑے کا شاخسانہ تھا۔ شاید شیخ نے اپنے قدیمی دشمنوں کے خلاف کوئی قدم
 اٹھایا ہو۔ جن کے طرفدار ہندوؤں نے موقع مل جانے پر اکٹھے ہو کر بادشاہ سے
 شکایت کی۔

واقعہ کی جزئیات پوری طرح واضح نہیں، لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ شیخ سلطان کا
 کرناک انجام ایسا نہ تھا کہ اس سے ان کے اقربا کو دجن میں ان کی صاحبزادی اور
 حضرت مجدد الف ثانی خود بچتے، اکبر یا اس کی پالیسی یا ہندوؤں سے شکایت نہ ہوتی اور
 حقیقت یہ ہے کہ اس سانحہ نے اکبر کے احکام اور ہندوؤں کے اثر کا مسئلہ ایک

ایسی بھیانک صورت میں پیش کر دیا جس کا پورا اندازہ دارالحکومت میں نہ ہو سکتا تھا۔ شیخ سلطان کا نقطہ نظر دکھانے کے لیے ہم ان کے حالات کو ان کی وفات تک لے آئے ہیں، لیکن اس سے پہلے انھوں نے بڑی شان کی زندگی بسر کی تھی۔ وہ برسوں ایک اہم علاقے کے کروڑی رہے جو اس زمانے میں بڑے رتبہ اور اقتدار کا عہدہ تھا۔ علمی اور ادبی حلقوں میں بھی ان کا اپنا مقام تھا۔ اہل دربار سے ان کے پرانے مراسم تھے۔ قرین قیاس ہے کہ ان سے قریبی تعلق قائم ہونے سے حضرت مجدد کا حلقہ اثر بھی وسیع تر ہو گیا ہوگا۔

اس سے بھی اہم معاملہ نقطہ نظر کا ہے۔ معاصرانہ مسائل پر حضرت مجدد کا جو زاویہ نگاہ شروع سے تھا۔ وہ اثبات النبوت سے واضح ہے، لیکن اگر اس کا مقابلہ رد و رافض سے کریں تو اندازہ بیان میں ایک لطیف فرق نظر آتا ہے۔ اثبات النبوت کا طرز اظہار عالمانہ بلکہ محققانہ ہے۔ دوسرے رسالے میں بھی علمیت کی کمی نہیں۔ لیکن لمحے میں ایک نئی گرمی اور تیزی ہے۔ ”رگ فاروقیم“ کی جو ترکیب پہلی مرتبہ اس رسالے میں استعمال ہوئی ہے وہ اس کا مایہ الامتیاز ہے۔ اس رگ فاروقیم سے جیسا کہ ان کے واقعات زندگی گواہ ہیں، شیخ سلطان کو بھی وافر حصہ ملا تھا۔ اور کیا یہ خیال بے جا ہے کہ ان کے ساتھ ربط و ضبط بڑھنے اور ان کے خیالات و احسانات جاننے سے حضرت مجدد کی شخصیت کے اس پہلو کو تقویت پہنچی؟

شیخ سلطان ایک سخی انسان تھے۔ اپنے پسماندگان کے لیے انھوں نے بہت کچھ نہ چھوڑا۔ (ممکن ہے) جائیداد ضبط ہو گئی ہو۔ جیسا کہ مغتوب کروڑیوں کے ساتھ اکثر ہوتا تھا۔ حضرت مجدد کا ایک بالکل ابتدائی عربی خط ہے۔ خواجہ جہاں کے نام۔ اس میں غالباً شیخ کے بیٹوں کا ذکر ہے۔ ”بقیہ مضمون یہ ہے کہ شیخ سلطان مرحوم کے دونوں بیٹوں کے لیے گزارہ و معیشت کی بہت تنگی و ناچاری ہے۔ اس واسطے آنجناب سے التماس ہے کہ ان کی ہر طرح مدد و اعانت کریں۔ کیونکہ آپ اس بات کے لائق ہیں۔“ (ذکر اول - مکتوب ۲۵)۔

شیخ سلطان کے ایک بھائی تھے، شیخ زکریا۔ (حضرات القدس ص ۲۶) حضرت مجدد کے مکتوبات میں کسی شیخ زکریا کا بار بار ذکر ہے، جو کسی پرگنہ کے کروڑی تھے۔ ان کے حضرت مجدد پر بہت حقوق ہوں گے۔ کیونکہ ایک نہیں، تین مکتوبات ان کی سفارش اور حاجت براری کے لیے لکھے گئے۔ اور شیخ زکریا یہ توقع کرتے تھے کہ حضرت مجدد ان کی خاطر بعد مسافت کے باوجود (شاسی) شکریہ میں جا کر ان کی مخلصی کے لیے کوشش کریں۔ (دفتر اول مکتوب ۱۷) کیا یہ شیخ زکریا، شیخ سلطان مرحوم کے بھائی نہ تھے؟

معلوم ہوتا ہے۔ شیخ زکریا کو عہدہ شیخ فریدی کی سفارش سے ملا تھا۔ پہلے سفارشی خط میں انھیں لکھا ہے۔ ”ہمچناں کہ ایشان را نواختہ اند۔ تا آخر دستگیری فرمانید۔ و از گراں حوادث محفوظ دارند۔“ (دفتر اول مکتوب ۱۳)۔ دوسرے خط میں شیخ فرید کو لکھا ہے کہ نئے دیوان پر بھی یہ ظاہر کر دیا جائے کہ شیخ زکریا آپ کے آدمی ہیں۔ ”بہ دیوان جدید نیز ظاہر شود کہ ایشان از خادمان آں درگاہ عالی اند۔“ (دفتر اول مکتوب ۱۵) حاجی سلطان تھانیسری کے حالات کی نشان دہی میں بدایونی سے پیش بہامد ملتی ہے لیکن اس سے دو ایک الجھنیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ خانخاناں نے ”بعد فتح ولایت آسیر و برہان پور“ حاجی صاحب کے متعلق ایک سفارشی عرضداشت بھیجی۔ اس سے عتاب شاہی دور نہوا۔ اور کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے انھیں کروڑی مقرر کیا لیکن کبری فوجیں ۲۵ رمضان ۱۰۰۸ھ کو برہان پور میں داخل ہوئیں اور اکبر نے قلعہ آسیر ۲۲ رجب ۱۰۰۸ھ میں اس وقت فتح کیا جب حاجی سلطان کو پہچانسی دی جا چکی تھی۔

۱۰ بدایونی کے بیان میں ایک الجھن یہ ہے کہ عام خیال کے مطابق اس نے ۱۰۰۸ھ تک کے واقعات لکھے ہیں۔ یہ اندازہ دوسری جلد کے متعلق، جس میں سیاسی حالات اور اکبری احکام کا خلاصہ ہے، صحیح ہے لیکن شاید تیسری جلد کا ایک حصہ بعد میں لکھا گیا۔ اور بہر کیف چونکہ بدایونی ۱۰۰۸ھ تک نہ رہا، لہذا اس کی کتاب کے بعد کے اضافے کیے ہوں۔

بدلیونی کو اس معاملے میں کچھ تسامح ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے اسیر اور برہانپور کے قلعوں کا نہیں۔ "ولایت" کا ذکر کیا ہے، لیکن فتح سندھ کے بعد پہلی مرتبہ خانخانان دکن کو ستلہ میں گیا۔ اور حاجی سلطان کی صاحبزادی کی شادی ۹۹۹ھ کے آخر تک ہو چکی ہوگی۔ شاید یہ شادی اس وقت ہوئی، جب حاجی سلطان بھکر سے مخفی طور پر واپس آچکے تھے، لیکن ابھی کر وڑی مقرر نہیں ہوئے تھے۔

شادی کے بعد کچھ عرصہ حضرت مجدد الف ثانی سرہند میں مقیم رہے۔ جہاں ستلہ میں آپ کے بڑے صاحبزادے

رسالہ ردّ و افض

خواجہ محمد صادق پیدا ہوئے۔ (ان کا سال وفات زبدۃ المقانات میں درج ہے۔ تاریخ ولادت نہیں۔ لیکن چونکہ تاریخ وفات ۹ ربيع الاول ۱۰۰۰ھ ہے، جب آپ کی عمر چوبیس سال سے کسی قدر زیادہ تھی۔ اس لیے تاریخ ولادت ستلہ کے ۱۰۱۰ھ میں ہوگی)۔

ہم یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ شاید حضرت مجدد کا رسالہ ردّ و افض شادی کے بعد کی تصنیف اور غالباً سفر لاہور کی یادگار ہے۔ یہ رسالہ اصل میں اس رسالے کا جواب ہے جو علمائے شیعہ نے علمائے ماوراء النہر کو اس وقت بھیجا۔ جب عبداللہ خاں ازبک نے ۹۹۷ھ میں مشہد کا محاصرہ کر رکھا تھا، لیکن اس کی تصنیف کی فوری وجہ یہ تھی، کہ ۱۵۸۸-۸۹ء میں مشہد کے علمائے شیعہ علمائے مشہد کے مضامین دہراتے اور امرا و سلاطین کی مجلسوں میں انھیں بڑے فخر سے بیان کرتے۔ حضرت مجددان محفلوں میں ان کی تردید کرتے، لیکن انھیں خیال ہوا کہ اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ سپرد قلم ہونا چاہیے تاکہ عوام الناس میں بھی غلط فہمیوں کی گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ وہ اس رسالے کے آغاز میں تحریر فرماتے ہیں:-

بعضے از طلبہ شیعہ کہ متر و دایں حدود بودند۔ بایں مقدمات افتخار و مباہات نمودند

و در مجالس امرا و سلاطین این مخالطات شہرت می دادند۔ و این حقیر در ہر مجلس و محفل

مشافہہ بمقدمات معقولہ و منقولہ ردّ آنہا می کرد۔ و غلطہای صریحہ ایشان را اطلاع

می داد۔ اناحیت اسلام و رگ فاروقیم بایں قدر رد و الزام کفایت نمی کرد و خوش
سینه بے کینه تشقی نیافت۔ و بخاطر فاتر قرار یافت کہ اظهار مفاسد ایشان تازمانے کہ
در قید کتابت نہ آید۔۔۔۔۔ نفع عام نہ بخشد۔

اس رسالے میں شیعوں کی نسبت وہی نقطہ نظر ہے جس سے مکتوباتِ امام
ربانی اور مکتوباتِ خواجہ محمد معصوم کے پڑھنے والے واقف ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ کافر
ہیں۔ اور واجب القتل۔ یہ رسالہ اثباتِ نبوت اور رسالہ تہلیلہ کے برعکس جو
عربی زبان میں ہیں فارسی میں لکھا گیا۔ لیکن اپنے نقطہ نظر کی تائید میں کثرت سے روایات
واحادیث دی ہیں جو عربی میں ہیں۔

رسالہ رد و افض مکتوبات کے نو لکھنوی ایڈیشن کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔
لیکن مطبوعہ رسالہ اور اس قلمی نسخہ میں جو خاتماہ کنڈیاں شریف ہیں۔ سرکہ یہ قدر فرق ہے
حضرت مجدد الف ثانی کا ایک رسالہ جو انھوں نے خواجہ باقی باللہ
رسالہ تہلیلہ کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے لکھا۔ اور اب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ
صاحب کی بدولت پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا۔ رسالہ تہلیلہ ہے۔ جس میں بائیس صفحے کا
چھوٹی تقطیع کا مختصر رسالہ ہے۔ جس کے ساتھ حافظ رشید احمد صاحب ارشد کا
سلیس، با محاورہ اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔

چونکہ اس میں حضرت محی الدین "سنی والدی" (مخدوم عبدالاحد) کے ساتھ
"قدس سرہ" لکھا ہے۔ اس سے ڈاکٹر صاحب موصوف نے استنباط کیا ہے کہ
یہ رسالہ مخدوم صاحب کی وفات کے بعد لکھا گیا۔ انھوں نے "محض اندازے سے
عام اور نفس مضمون کی مناسبت سے اس کا تاریخی نام "معارف لالہ اللہ محمد رسول اللہ"
(سنہ ۸۰۰) رکھا ہے۔ مولوی مجرب الہی مرتب رسائل مجددیہ سنہ ۸۰۰ کے بعد والے استنباط
سے متفق ہیں۔ لیکن اس خیال سے کہ اس کا ذکر زبدۃ المقامات میں ان رسائل کے ضمن میں
ہوا ہے جو حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضری (ربیع الآخر سنہ ۸۰۰) سے
پہلے لکھے گئے۔ اس لیے انھوں نے اس کا زمان تصنیف سنہ ۸۰۰ کا آخر یا سنہ ۸۰۰ کا

آغاز قرار دیا ہے۔

ہم زبدۃ المقامات اور حضرات القدس کی نسبت یہ رائے درج کر چکے ہیں۔ کہ ابتدائی آیات کے متعلق ان کے اندراجات کو تخمینی اور عمومی سمجھنا چاہیے۔ لیکن مولوی صاحب کا اندازہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ رسالے میں حضرات چشت مثلاً مخدوم عبدالاحدؒ اور شیخ عبدالقدوسؒ (۹) اور وحدت الوجودی خیال کے صوفیہ (مثلاً شیخ ابن العربیؒ اور شیخ صدرالدین قونویؒ) کی تصانیف سے طویل اقتباسات ہیں، لیکن بزرگان نقشبندیہ میں سے کسی کا ذکر نہیں۔ حضرت خواجہؒ سے بیعت کے بعد حضرت مجدد کی ابتدائی تصانیف میں ان کا ذکر اکثر آجاتا ہے۔ وہ بھی نہیں۔ اس لیے یہ خیال کہ یہ رسالہ حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضری سے پہلے لکھا گیا، مستبعد نہیں۔ رسالہ تہلیلہ میں کلمہ طیبہ کے متعلق مختلف امور سے بحث ہے۔ ابتدا کا کی بحث سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد لفظ اللہ کی حقیقت اور اس کے اشتقاق کے متعلق نحوی علما اور مفسرین کے اقوال کی روشنی میں بحث کی ہے۔ پھر لفظ اللہ کے لطائف وحدانیت الہی کی دلائل اور کلمہ طیبہ کے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ اس کے بعد ایک طویل اندراج ہے جس کا عنوان حافظ رشید احمد صاحب ارشد نے ”توحید صوفیا“ اور مولوی محبوب الہی صاحب نے ”توحید العوام و توحید الخواص“ دیا ہے۔ پھر ایک مختصر اندراج میں وجود باری کے عین ذات ہونے میں فلاسفہ کے دلائل دیے ہیں۔ اور اس محالے میں فلاسفہ اور صوفیائے کرام کے اتفاق رائے کا ذکر ہے۔ آخری حصہ (بلکہ باب) کلمہ طیبہ کے جزو ثانی (یعنی رسالت محمدیہ) کے متعلق ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل، معجزات اور اخلاق کریمہ و اوصاف عظیمہ کا

۱۔ مطبوعہ رسالے میں ”الشیخ العارف عبداللہ القدوس الحنفی“ لکھا ہے۔ اور ان کے فارسی مکتوبات سے اقتباس دیا ہے۔ چونکہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے فارسی مکتوبات مشہور ہیں۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ شاید ان کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ مکتوبات سے نام میں ذرا تبدیلی ہو گئی۔

ذکر ہے۔

اثبات النبوت اور رسالہ تہلیلہ ایک ہی صاحب نظر کا عطیہ ہیں۔ ایک ہی دور کے متعلق ہیں۔ رسالہ تہلیلہ کے آخری حصہ کا تو موضوع بھی وہی ہے جو اثبات النبوت کے ایک جزو کا ہے۔ چنانچہ اخلاق نبوی کے متعلق بعض عبارتیں (خفیف اختلافات کے ساتھ) رسالہ تہلیلہ میں وہی ہیں جو اثبات النبوت میں تھیں۔

اثبات النبوت اور رسالہ تہلیلہ میں کئی چیزیں مشترک ہیں، لیکن اگر ان کا غور سے مطالعہ کریں تو ان میں ایک لطیف فرق نظر آتا ہے۔ یہ دونوں رسالے ایک بلند پایہ عالم اور سچے محب اسلام کے لکھے ہوئے ہیں اور دونوں کی سطح بہت بلند ہے۔ لیکن اثبات النبوت میں صوفیانہ رنگ بہت ہلکا ہے۔ اور رسالہ تہلیلہ میں بڑا نمایاں ہے۔ امتیاز کی ایک وجہ تو اختلاف مباحث ہے۔ اور دوسری یہ کہ اثبات النبوت میں ردائے سخن ان لوگوں کی طرف محقق جو عقل کے ترجمان بنتے تھے۔ اس لیے حوالے بھی زیادہ تر ان مفکرین و علما کے ہیں جنہیں وہ مانتے تھے (مثلاً جالینوس، امام رازی، امام غزالی، معتزلہ میں سے جاحظ اور النظام)۔ رسالہ تہلیلہ عام مسلمانوں کے لیے لکھا گیا۔ اس لیے اس میں انداز بیان مختلف اختیار کیا گیا۔ یہ دونوں اسباب امتیاز تو مسلم ہیں، لیکن دوسرے رسالے میں صوفیانہ عنصر کا اس شدت سے اضافہ ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ اس کا ہیولے اس زمانے میں تیار ہوا، جب تکمیل علوم اور درس و تدریس علوم ظاہرہ کے بعد (شاید اثبات النبوت زمان درس و تدریس کی یادگار ہے۔ زبدۃ المقامات کے مطابق ابوالفضل سے نبوت کے متعلق بحث اس زمانے میں ہوئی تھی) آپ کو والد ماجد کی خدمت میں پھر سے زیادہ رہنے کا موقع

۱۔ مثلاً رسول اکرم کے احوال "قبل النبوت و حال الدعوت و بعد اتماہلہ الخافہ مشترک ہیں" کے ضمن میں اثبات النبوت میں "اخلاق العظیم و احکام الحکیمہ" کا ذکر ہے لیکن رسالہ تہلیلہ میں "اخلاق الکریمہ و احکام الحکیمہ" لکھا ہے۔ یہ تغیر صوفی اعتبار سے بھی بہتر ہے اور معنی لحاظ سے بھی زیادہ روحانی سر بلندی کا مظہر ہے۔

ملا اور تصوف کی منتہیانہ تصانیف کا گہرا مطالعہ ہوا۔
رسالہ تہلیلہ میں نہ صرف صوفیائے کبار کی مشہور تصانیف سے طویل اقتباسات
ہیں بلکہ صوفیائے کرام اور قطب و اوتاد کے متعلق آپ نے اسی نقطہ نظر کا اظہار کیا
ہے، جو شیخ محی الدین ابن عربی کا تھا۔ متعلقہ عبارت کا حسب ذیل ترجمہ حافظ
رشید احمد صاحب ارشد نے کیا ہے:-

وہ صوفیائے کرام جو خدا پرست، صاحب کشف اور شمع نبوت کے نور حاصل کرتے ہیں
زمین ان کے سہارے قائم ہے۔ اور انھیں کے فیض و برکات سے اہل زمین پر نزول
رحمت ہوتا ہے۔ انھیں کی وجہ سے لوگوں پر بارش برساتی جاتی ہے۔ اور انھیں
کی بدولت ان کو رزق دیا جاتا ہے۔ (رسالہ تہلیلہ ص ۲۷)

رسالہ تہلیلہ کی تالیف کے بعد حضرت مجدد نے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کی۔
جس میں مشرع کی پابندی ہے۔ اس بیعت کے بعد آپ نے وحدت الشہود کی توضیح
کی۔ اور ابن العربی سے بعض باتوں میں اختلاف کیا۔ لیکن ابتدائی اثرات کو جڑ سے اکھڑ
دینا آسان نہیں ہوتا۔ ابن العربی نے قطب۔ ابدال۔ اوتاد کا جو باطنی نظام پیش کیا
تھا۔ اور جس کا پر تو رسالہ تہلیلہ کی مندرجہ بالا عبارت میں نظر آتا ہے، اس کا اثر آپ پر
تمام عمر رہا۔ بلکہ آپ نے اس میں اضافہ کر کے (اور قرآن مجید کی ایک آیت کی تاویل محکمہ
قیومیت کا نظریہ پیش کیا۔ جسے بعد والوں نے بہت وسعت دی۔ اور بے حد غلو کیا۔ یہ
نظریہ فی الحقیقت ابن العربی کے ان اثرات کا حاصل ہے، جن کا بیج مخدوم صاحب کی
صحبت اور تعلیم باطنی کے زمانے میں بویا گیا۔

مختلہ کا سال، حضرت مجدد
حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت | کے لیے بڑا درجہ و الم کا زمانہ تھا۔

اس سال ۲ جمادی الآخر کو آپ کے خضر شیخ سلطان کے حسرت ناک انجام کا سانحہ
پیش آیا۔ پچیس روز بعد یعنی ۲۷ جمادی الآخر شنبہ کو (روضۃ القیومیہ ص ۳۳)
آپ کے والد ماجد جو آپ کو بیحد عزیز تھے وفات پا گئے۔ ان دونوں سانحوں کا آپ کو بڑا صدمہ ہوا۔

ہوگا۔ لیکن الفرح بعد الشدّت بسا اوقات رنج و الم ہی رحمت الہی کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ اگلے ہی سال خوبی قسمت آپ کو سخت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں لے گئی۔ جن کے فیض صحبت سے آپ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کی خدمت میں آپ اواخر ربیع الثانی سنہ ۱۵۹۹ھ یعنی نومبر ۱۵۹۹ء کے وسط میں پہنچے۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ آپ والد کی وفات کے بعد حج کے ارادے سے گھر سے نکلے تھے۔ راستے میں دہلی تھی۔ جب آپ وہاں پہنچے تو مولانا حسن کشمیریؒ کے ایک شاگرد نے جو آپ کے دوستوں اور حضرت خواجہ کے مخلصوں میں سے تھے، آپ سے حضرت خواجہ کے کمالات کا اظہار کر کے ملاقات کی تحریک کی اور آپ ان کے ہمراہ خدمت عالیہ میں پہنچے۔ "حضرت خواجہ صاحب کی یہ عادت نہ تھی کہ کسی سے کوئی اپنی خواہش ظاہر فرماتے۔ البتہ آپ سے حضرت خواجہ صاحب نے خلاف عادت خالقہ شریف میں چند یوم قیام کرنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ آپ نے ایک ہفتہ قیام کا وعدہ کیا، لیکن رفتہ رفتہ دو ڈھائی مہینے کی نوبت پہنچ گئی اور رجب کا مہینا آگیا۔ لیکن اس سے بہت پہلے آثار تصرف و کشش حضرت خواجہ صاحب علیہ الرحمۃ کے نمودار ہو چکے تھے۔ اور آپ پر شوق انابت و اخذ طریقہ خواجگان علیہ الرحمۃ نے غلبہ کیا۔ یہاں تک کہ آپ نے حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ سے بیعت کے لیے درخواست کی۔ بجز عرض کرنے کے بلا استخارہ (خلاف عادت)

۱۵ مہار و معاد (رسائل مجددیہ ص ۶۷) ۱۵ حضرت مجدد نے ایک خط میں ملا حسن کشمیریؒ کا زوردار غفلوں میں شکریہ ادا کیا ہے (دفعہ اول ۲۷۹) ۱۵ مہار و معاد ۱۵ حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ خرد رباعیات و شرح رباعیات میں لکھتے ہیں۔ "حضرت مجددی قبلہ گاہی شیخ اکمل در دہلی بخدمت حضرت خواجہ بزرگ قدس سرہ رسیدند۔ و در اندک مدت فتوحائے عظیم روئے نمودہ۔ مے فرمودند۔ اول نفی و اثبات تعلیم کردند۔ چندان دنگرفت۔ بعد از سہ چار روز باستانہ حضرت خواجہ قطب الدین تشریف بردہ بودند۔ آنجا طلبیدند۔ و ذکر اسم ذات تلقین کردند۔ فی الفور اثر عظیم پیدا شد۔"

حضرت خواجہ نے آپ کو خلوت میں طلب کر کے ذکر قلبی تعلیم فرمایا۔ آپ کا دل فوراً ذکر ہو گیا۔ اور آرام و خلوت ذکر قلبی و التذات تمام حاصل ہوا۔ یوماً فیوماً ترقیات عالیہ و عروجات متعالیہ ظاہر ہوتے رہے۔ حضرت خواجہ صاحب کی توجہ تہ اور اپنی استعداد عالی کی بدولت آپ نے طریقت کی بہت سی منزلیں تھوڑے ہی عرصے میں طے کر لیں۔ آپ کی علمی قابلیت، حوصلہ اور روحانی استعداد نے خواجہ صاحب کو قائل کر لیا۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے اپنے خطوں میں آپ کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”شیخ احمد نام مردیست از سرمند کثیر العلم و قوی العمل۔ روزے چند فقیر با او نشست
برخواست کرد عجبائب بسیار از روزگار اوقات او مشاہدہ نمود۔ ہاں ماند کہ چرانے
شود کہ عالمہا از روشن گرد د“

حضرت خواجہ باقی باللہ آپ کا بڑا پاس کرتے۔ آپ سن و سال میں عین ان کے ہم عمر تھے۔ علوم ظاہری میں ان سے بڑھے ہوئے تھے اور تقریر و تحریر میں آپ کو ایک غیر معمولی ملکہ تھا۔ لیکن بالغ نظر مرشد نے آپ کی غلطیاں بتانے سے بھی گریز نہ کیا۔ اور آپ کی تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی۔ مثلاً ایک زمانے میں آپ پر حد الوجود کا رنگ غالب تھا۔ ان دنوں آپ نے ایک رباعی لکھی :-

اے دریا کیں شریعت ملت آبائی است ملت ما کافری و ملت ترسانی است
کفر و ایمان ہر دو زلف دے آن نیابی است کفر و ایمان ہر دو اندر راہ مایکتائی است
تو مرشد نے فوراً انھیں لڑکا اور ایک خط میں اس پر سختی سے تنبیہ کی فرماتے ہیں (ترجمہ)
”اور وہ رباعی ملحدانہ جو آپ نے لکھی تھی۔ بہت ہی بے بھی اور کم عقل
ہے۔ ایسی رباعی کے کہنے والا ہرگز مقبول نہیں ہو سکتا۔ ادب کو نگاہ رکھنا
چاہیے۔ اللہ تعالیٰ بڑا غنی اور غیرت مند ہے۔“

لے ملخص از تذیبة المعانی :-

اسی طرح حضرت کجکشفی واقعات اور مقامات عروج کے اظہار کا مسئلہ ہے۔ ان کے متعلق بھی حضرت خواجہ باقی باللہ کی مسلسل ہدایت تھی کہ ان کے بارے میں اخفا سے کام لیا جائے۔ مثلاً جب حضرت مجدد نے ایک خط (مکتوب ہفتم) میں اپنے مقامات عروج کا ذکر کیا تو حضرت خواجہ نے ایک طویل خط (رقعہ ہفتم) میں ان کی نسبت اپنی رائے ظاہر کی اور آخر میں لکھا:۔ (ترجمہ)

”... اسرار کو محفوظ رکھیں یعنی حضرت ختم الخلافت کے ساتھ اس مقامات کی جو خصوصیت ہے وہ ظاہر نہ کریں۔ ایسا نہ ہو۔ لوگ غلطی میں پڑ جائیں اور ان کے عقیدے بگڑ جائیں۔

حضرت خواجہ کے ملفوظات میں بھی لکھا ہے:۔ (ترجمہ)

ایک دن میاں شیخ احمد سرہندی کو جو حضور کے جلیل القدر اور ممتاز رفقا میں سے تھے سرہندی کی طرف رخصت کر رہے تھے۔ انھیں فرمایا کہ نسبت کو حتی المقدور پوشیدہ رکھنا صبح کی نماز سے لے کر شام تک جاسے نماز پڑھنا لیکن حلقہ نہ کرنا۔ اس کے بعد علوم دینی کا درس دینا۔۔۔۔ اکثر اوقات تصحیح کتب اور مطالعہ میں مشغول رہنا۔ اگر سخن کا اتفاق ہو تو بطور علما کے کہنا۔ بطور صوفیا کے نہیں اور اگر احیاناً بطور صوفیہ کچھ کہا جائے تو اجمال اور اغلاق کے ساتھ کہو۔ تاکہ جسے خطاب کرنا منظور ہو۔ وہی سمجھے اور دوسرا اس سے کوئی ایسی چیز جو اس کی لغزش کا باعث ہو۔ اخذ نہ کرے۔“

۱۔ ایک بزرگوار نے ان اقتباسات پر جو ہم نے حضرت خواجہ کے ارشادات سے دیے ہیں اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے: ”اس کے بعد مترق صاحب نے نہیں معلوم کس مقصد سے وہ نصائح بھی دیج کر دیے ہیں جو حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو تحریر فرمائی تھیں۔ اور جو اس سلسلے میں تقویت و ترقی کے لیے خصوصی طور پر کی جاتی ہیں۔“ گزارش ہے کہ مندرجہ بالا اقتباسات درج کرنے سے راقم السطور کا مقصد حقیقت حال کو پیش کرنا اور یہ دکھانا ہے کہ حضرت خواجہ اور حضرت مجدد کے تعلقات کے متعلق متداول نقطہ نظر حقیقت سے کس قدر بعید ہے۔ اس نقطہ نظر کی ایک واضح مثال احسان اللہ صاحب گورکھپوری کی اس سوانح عمری حضرت مجدد ثالث ثانی میں ملتی ہے۔

[باقی صفحہ پیرا]

حضرت خواجہ باقی باللہ نے حضرت مجدد کی تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی۔ جس چیز کو قابل اصلاح سمجھتے تھے، اس کی نشان دہی کی، لیکن آپ کے مراتب عالیہ کی دل کھول کر تعریف کی۔ پہلی مرتبہ حضرت مجدد دو ڈھائی مہینے دہلی مقیم رہے۔ اس کے بعد آپ دو مرتبہ اور مرشد کی زندگی میں دہلی تشریف لائے۔ اب حضرت خواجہ کی عنایات آپ پر بہت بڑھ گئی تھیں۔ جب آپ دوسری دفعہ دہلی تشریف لائے تو حضرت خواجہ نے نہ صرف خلعت خلافت عطا کر کے اجازت ارشاد عطا فرمائی بلکہ چند منتخب حضرات جن کی تعلیم و تربیت خاص طور پر منظور تھی، انھیں آپ کے سپرد کیا۔ اس وقت آپ کو اپنے کمال و تکمیل میں تردد تھا۔ حضرت خواجہ نے اپنی صفائی باطن سے اس تردد کو معلوم کر کے فرمایا کہ تردد نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے شیخ کے کمال میں تردد لازم آتا ہے۔ چنانچہ آپ سرمد شریف واپس پہنچے۔ اور طالبان راہ ہدایت کی تربیت میں مصروف ہو گئے۔ دہلی کا تیسرا سفر آپ نے حضرت خواجہ کے ایک خط سے متاثر ہو کر کیا۔ مرشد نے بڑی محبت و تپاک کا اظہار کیا۔ بسا مرتبہ

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵۰)

جس کے متعلق خود محرم فرماتے ہیں "حضرت مجدد کے متعلق صرف یہی ایک ایسی کتاب ہے جسے ہمارے دور میں بڑی ممتاز حیثیت حاصل ہے" اور جس میں حضرت مجدد کے متعلق لکھا ہے "کہ حضرت خواجہ باقی باللہ بظاہر آپ کے پیر اور در پردہ مرید تھے" (ص ۷۹)

۱۰ غالباً دوسرا سفر رمضان ۱۰۸۸ھ ہجری (اپریل ۱۸۷۷ء) میں کیا گیا۔ حضرت خواجہ کے ملفوظات کا مرتب لکھا ہے کہ اس نے دو تین مجالس (بابت یکم صفر۔ دوم صفر۔ ششم صفر ۱۰۸۸ھ) کے ارشادات بغیر اجازت لکھ لیے تھے۔ لیکن جب انھیں حضرت خواجہ کو سنایا۔ تو انھوں نے منع کر دیا۔ لیکن کوئی آمٹھ مہینے کے بعد قسمت نے یاوری کی۔ "یعنی حضرت شیخ احمد سرمدی جو حضور کے مقررین اور مقبولوں میں سے ہیں، کسی قریب پر حاضر ہوئے اور دوبارہ اس ضروری کام کے قبول کرنے کی درخواست کی۔ شیخ کی سفارش سے یہ درخواست منظور ہوئی۔ اس کے بعد رمضان ۱۰۸۸ھ یعنی ۱۶ اپریل ۱۸۷۷ء کے واقعات میں

آپ کو سر حلقہ بنایا۔ ایک آدھ چھوڑ کر نئے طالبوں کی تعلیم و تربیت آپ کے سپرد کی۔ اور اپنے شیر خوار بیٹوں کو بلا کر اپنے عالی مرتبہ مرید سے توجہ دلائی۔ اور حضرت مجدد کے متعلق مختلف مواقع پر اتنے پرجوش فقرات مدحیہ کہے کہ ”احاطہ تحریر میں نہیں آسکتے“ (زبدۃ المقامات)۔

لاہور ۱۰۰۰ھ میں | اس ملاقات کے بعد آپ سرمنہ تشریف لے گئے۔
قطب الاشراف است | لیکن چند روز کے قیام کے بعد مرشد کے ایما کے مطابق لاہور تشریف لے گئے۔ یہاں آپ کو بڑی کامیابی ہوئی۔ کئی لوگ حلقہ عقیدت میں داخل ہوئے اور علما و فضلاء نے بھی آپ کی بڑی قدر کی، بالخصوص مولانا جمال تلوی جنہیں بدایونی ”اعلم العلماء“ کہتا ہے۔ اور جن سے غالباً آپ کا تعارف فیضی کی تفسیر نویسی کے زمانے میں ہو چکا تھا۔ آپ کا اتنا احترام کرتے تھے کہ ان کے شاگرد حیران بلکہ محترض ہوتے۔ مولانا جمال نے ہی ان ملاقاتوں کے دوران مسئلہ وحدۃ الوجود کے متعلق اپنے شبہات بیان کیے اور اس کے حل کی خواہش ظاہر کی حضرت مجدد نے اس وقت تو مختصراً ان کے کان میں چند کلمات کہے، لیکن پھر اس مسئلے پر تفصیل سے اپنے رسالوں اور مکتوبات میں لکھا۔ اور وحدت الوجود سے بالاحدیت الشہود کا مقام متعین کیا۔

حضرت مجدد کی لاہور پر خاص نگہ التفات تھی۔ اس زمانے میں اس شہر نے جو ابتدائی دور میں قبة الاسلام کہلاتا تھا، لیکن منگولوں کی تباہ کاریوں کے بعد عرصہ تک تک نیم ویران حالت میں رہا، قلعہ اکبری اور دوسری عمارتوں کی تعمیر سے نئی رونق پائی تھی اور اگرہ اور سیکری کے مقابلے میں یہاں اسلامی اثرات زیادہ زوروں پر تھے۔ قلیچ خاں جس نے اپنے زمانہ حکومت میں یہاں تقویت دین اور ترویج علوم اسلامی کی بڑی کوشش کی۔ اس وقت برسرِ اقتدار تھا۔ حضرت مجدد ایک خط میں جو

۱۰۰۰ھ خاں ۱۰۰۰ھ سے ۱۰۰۵ھ تک حاکم پنجاب تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس عہد سے پرماورد

جو خواجہ باقی باللہ کی وفات کے بعد سکین اکبر کی زندگی میں (دریں طور زمانہ) لکھا گیا اسے تحریر فرماتے ہیں :-

”در بلدہ معظمہ لاہور بہ وجود ایشان بسیار سے از احکام شرعیہ دریں طور زمانہ راجعہ پیدا کردہ است و تقویت دین و ترویج ملت و دلیل بقعہ حاصل گشتہ است و آن بلدہ نزد فقیر ہجو قطب ارشاد است نسبت بہ سائر بلاد ہندوستان - خیر و برکت آن بلدہ بہ جمیع بلاد ہندوستان ساریست - اگر آنجا ترویج دین است در ہمہ جا نحوئے از روئے مستحق است - حق سبحانہ تعالیٰ مؤید و ناصر ایشان باد“ (دفتر اول مکتوب ۴۶)

حضرت مجدد لاہور میں تھے - جب ۳ نومبر ۱۶۰۳ء کو آپ کے مرشد نے وصال فرمایا - آپ فوراً دہلی کے لیے روانہ ہوئے - سرمندر راستے میں تھا، لیکن آپ وہاں نہیں رُکے، بلکہ مکان کی شکل تک نہ دیکھی اور شبانہ روز چل کر دہلی پہنچے - اور مرشد کے مزار پر انوار کی زیارت کی -

خاتقاہ باقویہ | دہلی میں بدقسمتی سے آپ کے اپنے پیر بھائیوں سے بعض اختلافات ہو گئے - شاید ان میں سے بعض کی محدود صلاحیتوں کی نسبت آپ نے مرشد کی زندگی میں ہی اظہار خیال کیا تھا - دفتر اول کے مکتوب سوم میں حضرت خواجہ باقی باللہ کو سرمندر سے لکھتے ہیں :-

و دیگر بعضے از یاران آنجانی (دہلی؟) بطریق مقربین مناسبت ندارند - موافق حال آنها طریق ابرار است - فی الجملہ یقینے کہ حاصل کردہ اند - ہم غنیمت است بھماں طریق

امریاد فرمود ع

ہر کسے را بہر کار سے ساختند

در تفصیل اسامی انہا جرات نمود - کہ از ایشان محقق شود - زیادہ گستاخی نمود -

اس عبارت کا مفہوم یقینی نہیں، لیکن حضرت خواجہ کی وفات کے بعد جو اختلافات ان کے دہلوی مریدوں اور حضرت مجدد دین رونما ہوئے وہ واضح ہیں - ان پر تذکرہ نویسوں نے بہت غاشیے چڑھائے ہیں - لیکن اصل معبر بیان حضرت مجدد کا اپنا ہے -

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت خواجہؒ کے سب سے برگزیدہ خلیفہ وہی تھے انکی شان میں مرشد نے جو تعریفی کلمات کہے اور محترمانہ برتاؤ رکھا۔ اس کا عشرِ عشر بھی دوسرے کو نصیب نہ ہوا۔ خواجہ خرد ربا عیات و شرح ربا عیات میں لکھتے ہیں: ”مے فرمودند کہ حضرت خواجہ جیو فرمودند کہ بر ما ظاہر شدہ است۔ کہ از شما (حضرت مجدد) سلسلہ ماباقی خواہد ماند“ لیکن حضرت مجددؒ زیادہ تر سرہند (یالاہور) میں رہے۔ مرشد کی زندگی میں وہ فقط تین مرتبہ دہلی گئے۔ اس کے علاوہ جب حضرت خواجہؒ ماوراء النہر گئے تھے تو مریدوں کی دیکھ بھال شیخ الہ داد کے سپرد کر گئے تھے۔ اپنی بیماری کے دوران میں بھی انھوں نے شیخ الہ داد کے ذمے بعض خدمتیں کی تھیں۔ چنانچہ حضرت مجددؒ لکھتے ہیں:-

اخیری ملاقات کے وقت حضور قدس سرہ نے فقیر کو فرمایا تھا۔ کہ تم تجوزیہ کرو۔ کہ شیخ الہ داد ہماری طرف سے جا کر بعض طالبوں کو مشغولی یعنی ذکر کے لیے کہے۔ اور لیسن کے احوال ہم تک پہنچائے۔ کیونکہ حضور میں بلانے اور ذکر بتلانے اور احوال پوچھنے کی طاقت اب ہم میں نہیں رہی۔

فقیر اس بارے میں بھی متروک تھا۔ لیکن ضروری معلوم ہوا تو فقیر نے بھی اس تجوزیہ کو پسند کیا۔ (دفتر اول۔ مکتوب ۳۲)

حضرت مجددؒ فرماتے تھے کہ جو خدمت شیخ الہ داد کو سپرد ہوئی تھی، وہ ”محض علمی گیری کی قسم سے ہے۔۔۔۔۔۔ یہ سفارت بھی حضور قدس سرہ کی زندگی تک مخصوص ہوگی۔“ لیکن جو لوگ خالقہ باقویہ میں مقیم تھے، ان کا خیال تھا کہ اس انتظام سے مستنبط ہوتا تھا۔ کہ حضرت خواجہؒ یہ مقام شیخ الہ داد کو سپرد کر گئے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف محض شخصی نہ تھا۔ بلکہ نقطہ نظر کا بھی تھا۔ خالقہ والے حضرت خواجہؒ کے طریقے کو بغیر کسی کمی بیشی کے جاری رکھنا چاہتے تھے، لیکن حضرت مجددؒ کی نگاہ بلند تھی۔ وہ اس میں مزید تکمیل و ترقی کے قائل اور اس کے لیے کوشاں تھے۔ وہ اسی خط میں خواجہ حسام الدین کو لکھتے ہیں:-

”آپ نے لکھا تھا کہ پیر دستگیر خواجہؒ باقی باللہ صاحب کی نسبت باقی رہتی ہے

یعنی زیادتی اور نقصان قبول نہیں کرتی۔ میرے مخدوم! ہر فن کی تکمیل بہت سے
فکروں کے ملنے سے ہوتی ہے۔ جو نوکر سینوریہ نے وضع کیا تھا۔ متاخرین کی
فکروں نے اس کو دس گنا زیادہ کر دیا ہے۔ اس کا اصلی حالت میں رہنا عین
نقصان ہے۔ وہ نسبت جو حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ رکھتے تھے۔ حضرت
خواجہ عبدالخالق قدس سرہ کے زمانے میں نہ تھی۔ علیٰ ہذا القیاس

خاص کہ ہمارے حضرت خواجہ قدس سرہ اس نسبت کو کامل کرنے کے دیے
رہتے تھے۔ اور اس کو (ابھی) تمام و کمال نہیں سمجھتے تھے۔ اگر زندگی وفا
کرتی۔ خدا تعالیٰ کے ارادے سے، معلوم نہیں، اس نسبت کو کہاں تک لے جاتے
اس نسبت کے زیادہ ہونے میں کوشش نہ کرنا مناسب نہیں (دفتر اول مکتوب ۳)
حضرت مجدد شیخ الحداد کو اس اہم کام کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے دہلوی
پیر بھائی اپنے خیال پر قائم رہے۔ لیکن حضرت مجدد نے حسب معمول بلند ہمتی سے
کام لیا۔ ان اختلافات کو قطع تعلق کا باعث نہ ہونے دیا۔ اسی خط میں خواجہ حسام الدین
کو لکھتے ہیں: ”سرمنہ کو اپنا گھر تصور فرمائیں۔ محبت کا علاقہ اور پیر بھائی ہونے کی نسبت
اس قسم کی نہیں ہے کہ ایسی عارضی باتوں سے ٹوٹ جائے۔ چنانچہ خواجہ حسام الدین
ان کی خط و کتابت آخر تک جاری رہی۔ شیخ تاج الدین سنبھلی سے بھی جو شاید
جانشینی کے مسئلے میں پیش پیش تھے۔ آپ کا دل صاف ہو گیا۔ چنانچہ جب وہ حجاز
سے کچھ عرصے کے لیے وطن واپس آئے تو آپ نے بڑا محبت بھرا خط لکھا۔“ اپنے
قدم رنجہ فرمایا ہے تو جلدی تشریف لائیں، کیونکہ مشتاق مدت سے منتظر ہیں۔ اور
بیت اللہ کی خبریں سننے کی آرزو رکھتے ہیں۔“

حضرت مجدد کے اپنے پیر بھائیوں سے جو شخصی اختلافات حضرت خواجہ کی
وفات کے بعد پیدا ہو گئے تھے، وہ قد فرح ہو گئے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ طریقہ
باقویر سے کمی بیشی کے متعلق جو اصولی اختلاف تھا، وہ ختم نہ ہوا۔ اور حضرت مجدد
اور خواجہ حسام الدین کے درمیان دوستانہ شکایت و تردید کے ایسے خطوط لکھے گئے۔

جن کی تہ میں یہی اصولی مسئلہ تھا۔ مثلاً مکتوبات امام ربانی کے دفتر اول میں بعد کا ایک خط ہے۔ (شمارہ ۲۲۹) جو خواجہ صاحب کے ”شہادت و تردیدات“ کو رفع کرنے کے لیے لکھا گیا۔ حضرت مجدد نے اپنے پر بھائی کو لقب دلا یا کہ میرا طریقہ وہی ہے جو حضرت خواجہ قدس سرہ کا تھا۔ روزِ مرتہ اور شست و برخاست میں اس طریق کے آداب و لوازم کی پوری رعایت کی جاتی ہے وغیرہ۔

اسی طرح جب ایک مرتبہ حضرت مجدد کو ان کے پر بھائیوں کے مولود سننے کی اطلاع موصول ہوئی تو انھوں نے اس پر اعتراض کیا۔ اور جب خواجہ حسام الدین نے لکھا کہ میر محمد نعمان نے رسالت مآب کو واقعہ میں دیکھا کہ اس مجلس سے خوش ہیں۔ اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے ”مشرّب قوی العذب“ کا ذکر کیا تو حضرت مجدد نے ایک زوردار خط میں اس سے اختلاف کیا۔

حضرت مجدد اور خاتقاہ باقریہ والے بعض امور میں پوری طرح ہم خیال نہ تھے۔ لیکن چونکہ یہ اختلافات دیانتدارانہ تھے اور ان کے اظہار میں پورا ادب بلکہ دوستانہ طرز بیان ملحوظ رکھا گیا۔ اس لیے ان اختلافات نے ذاتی تعلقات اور عقیدت و احترام کو متاثر نہ کیا۔ خواجہ حسام الدین نے (دوسرے طالبین کے علاوہ) اپنے بڑے بیٹے کو کمپل طریقہ کے لیے سرسند بھیجا۔ حضرت خواجہ کے صاحبزادوں کو انھوں نے دو برس کی عمر سے پالا پوسا اور بے انتہا خدمت کی۔ وہ بھی ان سے بڑے وابستہ تھے، لیکن حضرت مجدد سے انھوں نے جس طرح فیض حاصل کیا، اس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ خواجہ کلاں کی صاحبزادی تو حضرت مجدد کے چھوٹے صاحبزادہ، خواجہ محمد یحییٰ سے بیاہی گئیں۔ ان قریبی تعلقات میں حضرت مجدد کی بلند حوصلگی اور فرہنگ شناسی کو بڑا دخل تھا۔ وہ مرشدزادوں کی بہترین تعلیم و تربیت کے لیے جس طرح بے قرار تھے، اس کا اندازہ مکتوبات سے ہوتا ہے۔ خاتقاہ باقریہ سے بھی ان کی دلی وابستگی تھی۔ اور وہ مرشد کی وفات کے بعد عرس میں باقاعدہ شرکت کرتے۔

رسالہ معارف لدنیہ | سربند میں حضرت مجدد نے ابتدائے طالبین کی تعلیم
رسالہ مبداء و معاد وغیرہ | و تربیت سے کی، جنہیں حضرت خواجہ نے آپ کے

پاس بھیجا تھا یا جو خود بخود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن اس شخص کی ارشاد
و ہدایت کے علاوہ آپ کو اپنے زورِ قلم کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اور آپ نے ان تحریری
صلاحیتوں کو بڑی قابلیت سے قہ و سبب دین اور ترویج سلسلہ کے لیے استعمال کیا۔
اس میدان میں آپ کا اصل شاہکار تو مکتوبات کی تین جلدیں ہیں، جن کا ہم آگے
چل کر تفصیلی ذکر کریں گے۔ لیکن آپ نے اس زمانے میں بعض رسائل بھی لکھے جن کا
مجمل ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہم آپ کے تین رسائل کا ذکر کر چکے ہیں، جو آپ نے حضرت خواجہ کی خدمت میں
پہنچنے سے پہلے لکھے تھے۔ ان میں سے پہلے دو (اثبات النبوت اور ردِّ و افض)
معاصرانہ ضروریات کو ملحوظ رکھ کر لکھے گئے اور ان کا اندازہ بیان علمائے ظاہر کا ہے۔
تیسرے رسالہ (تملیلیہ) پر صوفیہ کا رنگ غالب ہے۔ بعد کے رسائل میں یرنگ
اور گہرا ہو گیا ہے بلکہ وہ تمام تر صوفیہ مسائل یا اپنے احوال و مقامات کے متعلق ہیں۔
بعد کے رسائل میں سے شاید معارف لدنیہ پہلے لکھا گیا۔ کیونکہ اس کا ذکر
مبداء و معاد میں ہے۔ جس کی تاریخ تکمیل ۱۹۱۷ء ہے۔ اس میں زیادہ تر معرفت
الہی کے مختلف پہلوؤں کا بیان ہے۔ شریعت و طریقت کی ہم آہنگی پر زور دیا ہے
اور ان نام نہاد صوفیہ کی مذمت کی ہے جو شریعت کے مخالف باتیں کہتے ہیں۔
”و عجیب است از بعض درویشان خام تا تمام کہ کشف خیالی خود را اعتبار نموده بالکار
و مخالفت این شریعت باہر اقدام می نمایند۔ و حال آنکہ موسیٰ علیہ السلام و علیہ السلام
باین کلیمی و قرب اگر زندہ مے بود، غیر از متابعت این شریعت امر دیگر نمی نمود۔“

مبداء و معاد میں حضرت مجدد کے خلیفہ خواجہ محمد صدیق بدخشی نے ان کی بیاض
سے بعض عبارتیں جمع کی ہیں۔ مختلف صوفیانہ مسائل کا بیان ہے۔ لیکن کئی اندراجات
سے حضرت مجدد کی اپنی روحانی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

رسالے کے آخر میں خواجہ محمد صدیق نے اس کی تاریخ تکمیل ۱۹ سنہ دی ہے لیکن اصل اندراجات اس سے پہلے کے تھے۔ اگرچہ ان میں اصلاح و ترمیم ہوتی رہی۔ ۱۸ سنہ میں خواجہ محمد صدیق (اؤڈ ظہیر الدین حسن مرید مولانا خواجہ باقی نقشبندی اویسی) اثنائے سفر میں مانڈو پہنچے اور گلزار ابرار کے مصنف غوثی سے ملے۔ اس وقت (خواجہ محمد صدیق کے پاس) ایک رسالہ تھا جس سے غوثی نے کچھ عبارت نقل کی ہے۔ یہ عبارت مبداء و معاد کی ہے۔ اگرچہ مطبوعہ نسخوں سے قدرے مختلف ہے۔ غوثی نے ”معارف لدنیہ کہ از جملہ مصنفات او (شیخ احمد سرہندی) است“ کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کا اقتباس درج کتاب کیا ہے۔

علاوہ ازیں ایک مختصر رسالہ تعلیقات بر شرح رباعیات خواجہ باقی باللہ میں آپ نے حضرت خواجہ کی رباعیات کی اُس شرح پر اضافے کیے جو حضرت خواجہ نے خود ان رباعیات کی وضاحت کے لیے لکھی تھی۔ یہ رباعیات وجود واجب تعالیٰ اور ربط حادث بالقدیم کے دقیق مسئلے سے متعلق تھیں اور حضرت مجدد نے ان کی وضاحت اپنے معارف خاصہ اور حضرت خواجہ کے بعد کے خیالات کی روشنی میں کی ہے۔ یہ رسالہ ”رسائل مجددیہ“ میں شامل ہے۔

حضرت مجدد کے ایک اور رسالہ تعلیقات عوارف کا نام بھی تذکروں میں آتا ہے لیکن ابھی چلیبہ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ رسالہ ارشاد المریدین کا نام بھی لیا جاتا ہے، لیکن یہ بھی نہیں چھپا۔ حال میں مکاشفات عینیہ مجددیہ کے تلخیصی نام سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے ایک رسالہ شائع کیا ہے جسے نبدۃ المقامات کے مصنف اور مکتوبات کے دفتر سوم کے مرتب مولانا ہاشم کشمی نے حضرت مجدد کی وفات کے بعد ان کے ایسے مسودات سے ترتیب دیا، جو بعض خلفائے محفوظ کر لیے تھے۔ متفرق صوفیانہ مسائل اور مکاشفات کا بیان ہے۔ جن میں سے بعض اندراجا پڑانے ہوں گے۔ مثلاً مکاشفہ کی عبارت سے خیال ہوتا ہے کہ یہ اندراج حضرت خواجہ باقی باللہ کی زندگی میں کیا گیا۔

ارشاد و ہدایت

حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی وفات ۳۰ نومبر ۱۶۰۳ء کو ہوئی۔ اس کے قریباً دو سال بعد ۱۔ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو اکر انتقال کر گیا اور اس کی جگہ جہانگیر تخت نشین ہوا۔ اسے باپ کی طرح جگت گورو بننے کا خبط نہ تھا۔ لیکن اس کے عہد حکومت میں حضرت مجدد کو ایک اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا جس کا رد بقول بعض تذکرہ نگاروں کے، ان کی اسیری میں بھی دخل تھا۔ جہانگیر کے دربار پہلے سال سے، شریف خاں کے امیر الامرا اور وکیل مطلق ہو جانے سے، ایرانی چھائے ہوئے تھے اور ان کا اقتدار کسی نہ کسی صورت میں آخر تک قائم رہا۔ ان میں سے کئی شیعہ یا مائل بہ شیعیت تھے۔ شیعوں کی نسبت حضرت مجدد کا جو نقطہ نظر تھا، وہ پوشیدہ نہیں۔ انھوں نے نہ صرف ان کے خلاف رسالہ رد و رافض لکھا تھا بلکہ ”امرا و سلاطین“ کی مجلسوں میں بھی انھوں نے شیعہ اہل علم سے بحثیں کیں۔ اور مکتوبات میں بھی کئی جگہ اظہار خیال کیا۔ ایرانی امرا سے روابط پیدا کرنا اور انھیں متاثر کرنا، ان کے لیے بڑا مشکل تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے باوجود وہ اصلاح حال کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ جہانگیر کی تخت نشینی کے فوراً بعد بالخصوص انھوں نے بڑی سرگرم کوشش کی۔ کہ آغاز کار ٹھیک طرح سے ہو، اور ان تمام امرا کو جنھیں وہ خواجہ باقی باللہ کے ذریعے سے، یا کسی اور وجہ سے جانتے تھے، پر زور خط لکھے۔ لیکن اب ان امرا ہی کو وہ اثر و اقتدار پیشہ نہ تھا، جو انھیں او آخر عہد اکبری میں حاصل تھا۔ خان اعظم برہنہ کی وجہ سے اعتماد نہ کیا جاتا۔ اور ایک زمانے میں تو اسے قلعہ گواہیار میں قید کر لیا گیا۔ شیخ فریدی کی عظیم خدمات کی وجہ سے جہانگیر ان کا معترف تھا، لیکن اب انھیں مرکز سے دور رکھا گیا۔ اور انھیں وہ اثر و اقتدار حاصل نہ ہوا جو عہد اکبری میں تھا۔

حضرت مجدد کے لیے عہد جہانگیری میں کئی مشکلات تھیں، لیکن ان پر گزریہ ہستیوں کے لیے مشکلوں کے خاطر میں لانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دربار جہانگیری میں ان کے مخالف امرا برسر اقتدار تھے۔ لیکن اب انھوں نے عوام

سے رشتہ جوڑا اور اپنی روحانی عظمت، علم و فضل، قوت تحریر و تقریر اور انتظامی قابلیت کے
نقشبندیہ سلسلے کو ملک میں بے انتہا وسعت دی۔ ہم خیال امرا کو وہ ترویج شریعت کی
مسلسل تلقین کرتے رہے۔ جہاں طریقہ اہل سنت سے انحراف دیکھتے (مثلاً جب
سامانہ کے ایک خطیب نے خطبہ میں چاروں خلفاء کا نام نہ لیا) تو اصلاح حالت کے لیے
متعلقہ افراد کو پُر زور طریقے سے ہدایت کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ عام ہدایت
و ارشاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ سلسلہ نقشبندیہ کی بڑی باقاعدگی سے تنظیم کی۔ ملک
کے تمام بڑے بڑے مرکزوں میں ان کے منتخب خلفائے جو آپ کے خیالات کی
ترویج کرتے۔ وہ اپنے مریدوں کی جس طرح خبر گیری کیا کرتے تھے۔ اس کا اندازہ
دو معمولی مثالوں سے ہو سکتا ہے۔ ان کے ایک بنگالی خلیفہ تھے، مولانا حمید الدین
وہ وطن واپس گئے تو دیر تک ان کی طرف سے اطلاع نہ آئی۔ حضرت مجدد نے پہلے تو
انہیں محبت بھرے خط لکھے۔ اور جب پھر بھی خاطر خواہ جواب آیا تو اپنے بیٹے کے خلیفہ شیخ عبدالحی
شادمانی کو ان کے پاس بنگال بھیجا تاکہ ان کے احوال سے آگہی اور جماعت سے ان کا ربط قائم رہے
جہاں تک مریدوں کی انفرادی تعلیم و تربیت کا تعلق ہے، خواجہ عبداللہ سرمندی کا تفصیلی بیان پڑھنے کے
لائی ہے (حضرات القدس ص ۱۲۹)۔ وہ کہتے ہیں: "کہ ہر روز کم و بیش دس مرتبہ حضرت
میرے احوال باطنی کو دریافت فرماتے تھے" یا خود اندازہ لگاتے۔ اور مسلسل بہتر
سے بہتر صورت حال پیدا کرنے کی کوشش فرماتے۔

مُرشد کی وفات کے بعد حضرت مجدد زیادہ تر سرمندی میں مقیم رہے۔ لیکن ان کے
مزار کی زیارت کے لیے جمادی الثانی میں جو حضرت خواجہ کی وفات کا مہینا ہے،
دہلی تشریف لاتے اور دو تین مرتبہ آگرے تشریف لے گئے۔

خانگی صدات اور حضرت مجدد
کی عالی حوصلگی اور تسلیم رضا

مارچ ۱۹۱۶ء کے آخری ہفتے میں
آپ کو پے درپے کئی صدات کا
سامنا کرنا پڑا۔ اس زمانے میں

طاعون زوروں پر تھی۔ اور آپ کا خاندان اس سے خاص طور پر متاثر ہوا۔ تین

چار روز کے اندر آپ کے گھر سے کئی جنازے نکلے۔ جن میں آپ کے بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادق (عمر ۲۲-۲۵ سال) دو کم عمر صاحبزادوں (محمد فرخ اور محمد عیسیٰ) ایک صاحبزادی (ام کلثوم) اور دوسرے افرادِ خاندان کی میتیں شامل تھیں۔ ان اندوہناک بلکہ ہمت شکن حالات میں آپ نے جو صبر و سکون دکھایا اور علیٰ عرصگی اور تسلیم و رضا کا ثبوت دیا، وہ آپ کی بزرگی اور خدا رسیدگی کی تین دلیل ہے۔

ملا بد الدین سرہندی نے حضراتِ القدس میں ان حوادث کی چند کربناک جزئیات محفوظ کر دی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ چھوٹے صاحبزادے محمد فرخ اور محمد عیسیٰ بیک وقت بیمار ہوئے۔ لوگوں نے کہا کہ دونوں کو الگ الگ رکھنا چاہیے تاکہ ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں۔ چنانچہ جماعت خانہ کے سحرہ میں صاحبزادہ محمد فرخ کو اور زنانہ میں محمد عیسیٰ کو رکھا گیا۔ پہلے رحلت موخر الذکر کی ہوئی۔ بیمار بھائی کو اطلاع نہ دی گئی، لیکن انھیں خود بخود اس کی خبر ہو گئی اور انھوں نے کہنا شروع کیا۔ کہ محمد عیسیٰ رحلت میں مجھ سے سبقت لے گئے۔ شام کو انھوں نے خود انتقال کیا۔ بڑے محمد و مزادہ کا انتقال اور بھی حسرت ناک تھا۔ وہ بڑے عالم اور برگزیدہ حال صوفی تھے۔ مشکل کتب کا درس دیتے تھے۔ مثلاً مطول مع حاشیہ میر۔ شرح عقائد مع حاشیہ خیالی۔ تحریر اقلیدس آپ سے ملا بد الدین نے پڑھی تھیں۔ آپ اپنے چھوٹے بھائی محمد عیسیٰ کے جنازے کے ہمراہ پیادہ یا مقبرہ جد بزرگوار تک گئے۔ واپسی میں طاعون کی گھٹی نمودار ہوئی۔ چنانچہ بیرون مکان حجرہ خانقاہ میں آپ کو لٹا دیا گیا۔ آپ کی والدہ ماجدہ کی جو حالت ہوئی ہوگی، اس کے قیاس سے ہی کلیجہ شق ہوتا ہے۔ انھوں نے آپ کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ بدقت تمام دو شخصوں کی گردن میں ہاتھ ڈال کر گئے۔ اور والدہ ماجدہ اور تمام اربابِ حقوق سے پوری طرح سے رخصت ہو کر حجرہ مذکور میں واپس آئے۔ اور دوسرے روز رحلت فرمائی۔

صاحبزادہ محمد صادق کی وفات کا جو آپ کے مرشد خواجہ باقی باللہ کو بڑے عزیز

تھے۔ اور بڑے عالم فاضل تھے۔ حضرت مجدد کو بڑا صدمہ تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔
 ”مفارقت اعزی قدس سرہ از اعظم مصائب است۔ معلوم نیست کہ کسے بمثل ایں
 مصیبت مصاب شدہ باشد“ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کی تیمارداریوں اور افراط غم
 نے آپ کی اپنی صحت پر اثر ڈالا۔ اس زمانے کا ایک خط ہے۔ ”چند روز است۔ کہ
 بلغم و سرفہ زبوں ساختہ است۔ وضعف بدن بہم رسیدہ“ لیکن جس ہمت اور صبر و
 رضا سے آپ نے یہ صدمہ برداشت کیے۔ اس پر آپ کے وہ مکاتیب گواہ ہیں
 جو آپ نے خطوط تحریریت کے جواب میں لکھے۔ ایسے مکتوبات (دفتر اول کے آخر
 اور دفتر دوم کے شروع میں) اکئی ہیں۔ ایک خط میں خواجہ حسام الدین کو لکھتے ہیں۔
 ”یہ مصیبتیں بظاہر حرجات نظر آتی ہیں۔ مگر حقیقت میں ترقیات اور مرہم ہیں۔
 وہ صبر و شکر جو حق تعالیٰ نے اس مصیبت میں اس ضعیف القلب کو کرامت فرمایا
 ہے۔ بڑی اعلیٰ نعمت اور اعظم انعام ہے (دنیا اور آخرت اللہ تعالیٰ ہی کے
 لیے ہے)۔“

اس خط میں ”تسلیم و رضا“ کا ذکر ہے، لیکن متعدد خطوط ایسے ہیں جن سے خیال
 ہوتا ہے کہ معاملہ تسلیم و رضا سے بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ کئی خطوط میں یہ اظہار
 ہے کہ تسلیم و رضا اچھی چیز ہے۔ لیکن اگر محبوب حقیقی سے سچی محبت ہے تو اس کے
 ہر فعل سے محبت ہونی چاہیے۔ اور بظاہر ناخوشگوار واقعات پر نہ صرف تسلیم و رضا
 بلکہ خوشی اور التذاد محسوس ہونا چاہیے۔ چنانچہ ایک مکتوب نگار (خواجہ محمد طالب
 بدخشی) سے تلقین صبر اور تسلیم آموزی کی شکایت کی ہے۔ اور لکھا ہے۔
 ”میرے برادر عزیز! حق تعالیٰ مومنوں کے نزدیک ان کے مالوں۔ جانوں اور
 تمام اشیاء سے زیادہ عزیز اور محبوب ہے۔ زندہ کرنا اور مارنا اسی کا فعل ہے
 اس میں کسی اور کا دخل نہیں۔ اس لیے اس کا فعل بھی زیادہ عزیز اور محبوب
 ہوگا۔ محبت اپنے محبوب کے فعل سے لذت پاتے اور خوش ہوتے ہیں۔ ان کو
 صبر کی ترغیب دینی مکروہ اور نامناسب ہے۔ مقام رضا اگرچہ رغبت و سرور

کی خبر دیتا ہے۔ لیکن التذاذ کا مرتبہ امر دیگر ہے۔
ایسے مکاتیب کئی ہیں جن میں یہ اظہار ہے کہ محبوب کی سختی اور جو روحنا اس کی
مہربانیوں سے زیادہ عزیز ہے۔ ایک خط شیخ عبدالحق محدث کے نام ہے اور سارے کا
سارا نقل کرنے کے لائق ہے۔

”میرے خدوم و مکرّم۔ مصائب میں اگرچہ بڑی تکلیف و ایذا برداشت کرنی پڑتی
ہے، لیکن ان پر بڑی کرامت اور مہربانی کی امید ہے۔ اس جہاں کا بہتر اسباب
حزن و اندوہ ہے۔ اور اس دسترخوان کی خوشگوار نعمت الم و مصیبت ہے۔
ان شکریہ یاروں پر دار وئے تلخ کا رقیق غلاف چڑھایا ہوا ہے اور اس حیلہ سے
ابتلا و آزمائش کا راستا کھولا ہے۔ سعادت مند لوگ ان کی شیرینی پر نظر کر کے
تلخی کو شکر کی طرح چبا جاتے ہیں اور کڑواہٹ کو صفر کے برعکس شیریں معلوم
کرتے ہیں۔ کیوں شیریں معلوم نہ کریں۔ جبکہ محبوب کے افعال سب شیریں ہوتے ہیں
علتی اور بیمار شاید ان کو کڑوا معلوم کرے تو کرے، جو ما سوار میں گرفتار ہے۔
گ۔ ولت مند محبوب کے ایلام و رنج میں اس قدر حلاوت اور لذت پاتے ہیں
جو اس کے انعام میں لاگتہ متصور نہیں۔ اگرچہ دونوں محبوب کی طرف سے ہیں
لیکن ایلام میں محب کے نفس کا دخل نہیں ہوتا۔ اور انعام میں اپنے نفس کی نرا
پر قیام ہوتا ہے۔“

هَيْتَا لَكَ رِيَابِ التَّعْبِيرِ نَعِيمَهَا

وَلِلْعَاشِقِ الْمُسْكِينِ مَا يَتَجَرَّعُ

ترجمہ: مبارک منعموں کو اپنی دولت مبارک عاشقوں کو داد و کلفت
اللّٰهُمَّ لَا تَحْزِنْهَا أَجْرَهُمْ وَلَا تَفْتِنَا بَعْدَهُمْ (یا اللہ! تو ہم کو ان کے
اجر سے محروم نہ رکھ۔ اور ان کے بعد ہم کو فتنہ میں نہ ڈال) اس غریب اسلام
کے زمانے میں آپ کا وجود شریف اہل اسلام کے لیے غنیمت ہے۔ سَلِّمْکُمْ
اللّٰهُ تَعَالٰی دَائِلًا کُمْ (اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت و باقی رکھتے)۔ والسلام۔

خانگی حوادث سے حضرت مجدد نے ارشاد و ہدایت میں ذرا
شیخ بدیع الدین ضعف نہ آنے دیا۔

۱۶۱۹ء میں جب آپ کی مجددانہ مساعی کو کئی سال ہو چکے تھے اور آپ کے
 مرید اور خلفاء تمام ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی (مثلاً ممالک افغانستان
 و ترکستان) میں پھیل چکے تھے۔ آپ نے ایک پُر جوش مرید شیخ بدیع الدین کو
 جوائگیر کے دار الحکومت آگرہ میں ارشاد و ہدایت کے لیے بھیجا۔ شیخ بدیع الدین میں
 جوش اور جذبہ زیادہ تھا۔ احتیاط اور توازن کم۔ وہ اس سے پہلے عشق مجازی میں
 مبتلا ہوئے تھے تو ارکان اسلام کو ہی جواب دے بیٹھے۔ جب اس سے نجات
 پائی اور سلوک کی طرف توجہ کی تو اپنے فطری ذوق و شوق کی مدد سے بڑی ترقی
 حاصل کی، لیکن کسی الجھنوں کا سامان بھی کیا۔ آگرہ میں انھیں بڑی کامیابی حاصل
 ہوئی اور بہت سے آدمی آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے، لیکن مخالفت کا
 کا بازار بھی خوب گرم ہوا۔ شیخ بدیع الدین اپنے مرشد کو ایک خط میں اپنے احوال بلند
 اور اپنے مریدوں کی عقیدت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں :-

بعضے از طلبہ از کثرت التذاذ ترک خاں دماں می کنند۔ اقربائے آنها میں فقیر بسیار
 آواز زنی دهند و آنها را تکلیف وضع سابق می نمایند۔ بعضے مردم اینجا کہ در سلاسل دیگر
 شغل کرده اند۔ الحال کہ دریں طریقہ علیہ داخل شدہ خیلے متلذذ اند۔ و بر عمر گزشتہ
 متأسف۔ ازین جهت یکے از مشائخ اینجا غایت عداوت گرفته تا بجائے کہ بایں طریقہ
 واعزہ آن سخنان بیوردہ می گوید۔ روزے جمعے از مریدانش را فرستاد۔ تا بہ حضرت خود
 بزرگ و حضرت مخدومی خواجہ باقی قدس سرہما و سائر اعزہ دشنام دادند۔ (زبدۃ الطاہرات)
 شیخ بدیع الدین نے مرشد کی بھی نافرمانی کی اور ان کے حکم کے خلاف آگرہ چھوڑ کر
 اپنے وطن کو واپس چلے گئے۔ یہ امر حضرت مجدد کو بہت ناگوار گزرا۔ اور جب شیخ ان
 ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس پر شیخ نے
 معافی چاہی اور تلافی یافتہ طور پر گھر سے جا کر پہلے سے بھی زیادہ زور شور سے اپنا

کام شروع کیا لیکن اسی زور سے مخالفت ہوئی اور اس ضمن میں حضرت مجدد کو بھی بادشاہ کے دربار میں حاضر اور زندان شاہی میں محبوس ہونا پڑا۔ اس واقعہ کے متعلق حضرت مجدد کی سب سے قدیمی سوانح عمری میں جو اس واقعہ کے دس بارہ سال بعد ان کے صاحبزادوں کے ایما پران کے ایک ممتاز خلیفہ نے لکھی، ذیل کا اندراج ہے:-

شیخ (بدیع الدین) باضطراب متوجہ دار الخلافت شد بامید آنکہ خاطر مبارک کہ غبار یافتہ است، مصفا شود۔ چوں رسید۔ اول آن مقام گرمی با و فیضہا بخلافت رسید۔ لیکن چوں آن شہر دارالامارت بود و مجمع عسکریاں ہنگامہ طلب دور از اخلایں و ادب۔ ازاں گزردہ جمعی کہ بخدمت رسیدند۔ بازنہ انصاریاں خشونت آمیز در میاں نہاد و احوالات بلند خویش بر زبان آورد۔ بلکہ بعض وقایع و کشوف کہ اظہار آنہا ایضا فتنہ مے نمود۔ بگوش منکراں رسانید تا بجای رسید کہ در آن شہر بودن نتوانست بلکہ آن شور و شر بہ پیر بزد گوارا و قدس سرو العزیزہ سراں نمود و سلطان آن وقت کہ بایں طائفہ بے مناسبتی تمام داشت، حضرت ایشان را طلب نموده ایذا نمود و حبس فرمود۔ اگرچہ بعد ازاں سلطان انریں امر نام و پشیمان شد و غایب خواست۔ اما وے را ایں سوء ادب نامبارک آمد۔ شور با و فتور با در مملکتش پیدا شد و بہ بعضی دیار معتبرہ او ایرانیان غلبہ نموده در تصرف خود آوردند و خودش بضعفہار ملک مبتلا گشت تا بہماں رفت۔ (زبدۃ المقامات)

مکتوب یازدہم کی مخالفت

شیخ بدیع الدین کے طریق کار سے جو شور و شر پیدا ہوا۔ اس کا اثر ان

مرشد عالی مقام کو بھی پہنچا اور مکتوبات کے بعض اندراجات پر اعتراض شروع ہوئے جس بیان پر اس زمانے میں زیادہ حریف گیری کی گئی، وہ دفتر اول کے مکتوب یازدہم میں درج ہے اور اس میں حضرت مجدد نے اپنے عروج روحانی کا ذکر کیا ہے۔ زیادہ اعتراض ذیل کی عبارت پر تھا:- (ترجمہ)

دوسری عرض یہ ہے کہ اس مقام کے ملاحظہ کے وقت اور بہت سے مقام

ایک دوسرے کے اوپر ظاہر ہوئے۔ نیاز و عاجزی سے توجہ کرنے کے بعد جب اس پہلے مقام سے اوپر کے مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت ذی النورین کا مقام ہے اور دوسرے خلفاء کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے۔ اور یہ مقام بھی تکمیل و ارشاد کا مقام ہے اور ایسے ہی اس مقام سے اوپر کے دو مقام بھی جن کا اب ذکر ہوتا ہے۔ تکمیل و ارشاد کے مقام ہیں۔ اور اس مقام کے اوپر ایک اور مقام نظر آیا۔ جب اس مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مقام ہے اور دوسرے خلفاء کا بھی وہاں عبور واقع ہوا ہے۔ اور اس مقام سے اوپر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام ظاہر ہوا۔ بندہ اس مقام پر بھی پہنچا۔ اور اپنے مشائخ میں حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ کو ہر مقام میں اپنے ہمراہ پاتا تھا اور دوسرے خلفاء کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے۔ سوائے عبور اور مقام اور مرور اور اثبات کے کچھ فرق نہیں ہے اور اس مقام کے اوپر سوائے آنحضرت صلیع کے اور کوئی مقام معلوم نہیں ہوتا۔ اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابل ایک اور نہایت عمدہ نورانی مقام کہ اس جیسا کبھی نظر میں نہ آیا تھا ظاہر ہوا۔ اور وہ مقام اس مقام سے تھوڑا سا بلند تھا جس طرح کہ صفہ کو سطح زمین سے ذرا بلند بناتے ہیں۔ اور معلوم ہوا کہ وہ مقام مجتہب کا مقام ہے اور وہ مقام نگین اور منقش تھا۔ اپنے آپ کو بھی اس مقام کے عکس سے نگین معلوم کیا۔

شیخ بدیع الدین تک بھی یہ اعتراض پہنچائے گئے اور کہا گیا کہ تمہارا پیر تو اپنے آپ کو صدیق اکبر سے بھی افضل سمجھتا ہے۔ انھوں نے ایک عریضہ مرشد کی خدمت میں ارسال کر کے عبارت کی توضیح چاہی۔ چنانچہ دفتر اول کا ایک مکتوب (شمارہ ۹۲) اسی خط کے جواب میں ہے۔ اس میں حضرت مجدد لکھتے ہیں کہ میں نے پہل خط اپنے مرشد کے نام لکھا تھا۔ اور اس سلسلے کا یہ اصول ہے کہ مرید کو جتنے بھی اوقات پیش آئیں۔ صحیح ہوں یا سقیم۔ بے تحاشا انھیں اپنے مرشد کے حضور میں عرض کر دینا

چاہیے تاکہ غیر صحیح ہونے کی صورت میں ان کی تعبیر ہو سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ معترضین کی اس سے تشقی نہ ہوئی۔ اور آپ کے کئی مریدوں (مثلاً مرزا فتح اللہ گیلانی اور قاضی ستام) نے مکتوب یازدہم کی بنا پر آپ کے طریقہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس پر آپ نے ایک مفصل مکتوب مرزا فتح اللہ کو لکھا جس میں ظاہر کیا کہ میں قطعاً اپنے تئیں حضرت صدیق اکبرؑ سے افضل نہیں سمجھتا۔

”وہ شخص جو اپنے آپ کو حضرت صدیقؑ سے افضل جانے اس کا حال دوام سے خالی نہیں ہے۔ یا وہ زندیق محض ہے یا جاہل... وہ شخص جو حضرت امیرؑ کو حضرت صدیقؑ سے افضل کہے۔ اہل سنت والجماعت کے گروہ سے نکل جاتا ہے تو پھر اس شخص کا کیا حال ہے جو اپنے آپ کو افضل جانے؟“

حضرت مجدد دربار جہانگیر میں | حضرت مجدد کی تشریح سے معترضین کی تسلی ہو جانی چاہیے تھی، لیکن تیار نہیں تھے۔ تشریح بہتوں تک پہنچی یا نہ۔ بہر کیف ”علمائے ظاہرین“ نے جہانگیر کے حضور میں شکایت کی کہ سرہند کا ایک مشائخ زادہ اپنے تئیں حضرت صدیق اکبرؑ سے افضل سمجھتا ہے اور ایسے دعوے کرتا ہے جن سے کفر لازم آتا ہے۔ اس کے علاوہ شیعہ اُمرا اور دوسرے مخالفوں نے نمک مرچ لگائی ہوگی کہ شیخ احمد نے مجددیت کا دعویٰ کیا ہے۔ ہزاروں آدمی اس کے حلقہ بگوش ہیں۔ عجب نہیں کہ اس کا اثر حکومت کے لیے مضرت ثابت ہو۔ چنانچہ جہانگیر نے حاکم سرہند کی معرفت حضرت مجدد کو بلا بھیجا۔

۱۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۱

اپنی عربی تصنیف سبحة المرجان میں مولانا غلام علی آزاد بگرامی مکتوب یازدہم کا خلاصہ دیکر لکھتے ہیں کہ بعض علمائے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت مجددؑ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا مقام صدیق اکبرؑ سے بلند تر ہے۔ پس وہ مناظرہ کے لیے کمر بستہ ہو گئے وغیرہ (ص ۸۸)

جہانگیر نے اس واقعہ کی نسبت تو زک جہانگیری میں کسی قدر تفصیل سے اظہار خیالات کیا ہے۔ بد قسمتی سے اسے اس قدر مہکا یا گیا تھا کہ اس نے اپنی رائے بڑی بے ادبی سے ظاہر کی ہے۔ حضرت مجدد کی نسبت اس نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں وہ حضرت مجدد کے تمام معتقدوں بلکہ تاریخ کے غیر جانبدار ناظرین کو بھی محسوس معلوم ہوں گے۔ لیکن چونکہ جہانگیر کے بیان کی تاریخی اہمیت بہت ہے اس لیے ہم اس کے وہ الفاظ حذف کر کے جو خاص طور پر قابل اعتراض ہیں، ذیل میں اس کا بیان درج کرتے ہیں۔ جہانگیر چار دہم سال جلوس کے ضمن میں لکھتا ہے:-

”دیں ایام بعض رسید کہ شیخ احمد..... کتابے فراہم آوردہ مکتوبات نام کردہ..... از انجملہ در مکتوبے نوشتہ کہ در اشائے سلوک گزارم بمقام ذی النورین اُفتادہ مقالے دیدم بغایت عالی و خوش بصفاء۔ از انجا در گزشتہ بمقام فاروق پیوستہ و از مقام فاروق بمقام صدیق عبور کردم۔ و ہر کدام را تعریفہ در خور آن نوشتہ و از انجا بمقام محبوبیت واصل شدہ، مقالے مشاہدہ اُفتادہ بغایت متور و ملون۔ خود را با انواع الوار و الوان منعکس یافتہ۔ یعنی استغفر اللہ از مقام خلقا و گزشتہ بجالی مرتبت رجوع نمودم۔ و دیگر گستاخی ناکردہ کہ نوشتن آن طوسے دارد و از ادب و دراست۔ بنا برین حکم فرمودم کہ بدرگاہ عدالت آئین حاضر سازند۔ حسب الحکم بملازمت پیوست و از ہرچ پرسیدم جواب معقول نتوانست سامان نمود و با عدم بخرد و دانش، بغایت مغرور و خود پست ظاہر شد۔ صلاح حال او منحصر دریں دیدم کہ روزے چند و زندان ادب محسوس باشد تا شوریدگی مزاج و آشفتگی و ماغش قدرے تسکین پذیرد و شورش عوام نیز فرو نشیند۔ لاجرم برانی رائے سنگدلن حوالہ شد کہ در قلعہ گوالیار مقید دارد“

(تزک جہانگیری ص ۲۷۵)

حضرات القدس میں جسے آپ کے خلیفہ مولانا بدر الدین سرہندی نے ترتیب دیا، اس واقعہ کے متعلق ذیل کا اندراج ہے:-

”جبکہ آنجناب قدس سرہ کو اس کلام کے باعث جہانگیر بادشاہ کے پاس لے گئے۔“

بادشاہ نے آپ سے پوچھا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ نے لکھا ہے کہ میرا مرتبہ حضرت صلیبی
اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بلند تر ہے۔ آپ نے یہی جواب دیا۔ اور ایک مثال بھی
بیان کی کہ مثلاً آپ کسی ایک آدمی کو خدمت کے لیے بلائیں اور اس سے
ازراہ توارش اسرار کی باتیں کریں تو وہ لا محالہ پنج ہزاری امرا کے مقام کو طے کر کے
پیشی تک پہنچے گا۔ اور پھر اپنے مقام پر واپس جا کر کھڑا ہو جائے گا۔ اس سے یہ
لازم نہیں آتا کہ اس کا مرتبہ امرا پر پنج ہزاری سے زیادہ ہو جائے۔ اس جواب
کو سن کر بادشاہ کا عتاب دور ہو گیا۔

اسی اشار میں ایک شخص نے جو خدا شناسی سے دُور تھا، بادشاہ سے
کہا کہ اس شیخ کا حال دیکھیے کہ آپ ظل اللہ اور خلیفۃ اللہ ہیں۔ آپ کو سجدہ نہیں
کیا بلکہ معمولی تواضع باہمی بجا نہیں لایا۔ بادشاہ اس کلام کے سننے سے خفا
ہوا اور گوالیار میں حضرت کو قید کرنے کا حکم دیا۔ اس واقعہ سے پہلے شہزادہ دین پاہ
شاہجہاں کہ آنجناب سے خلوص کامل رکھتا تھا۔ علمائے مقامی افضل خاں اور
خواجہ عبدالرحمن مفتی کو کتب فقہ کے ساتھ حضرت کی خدمت میں بھیج چکا تھا کہ
سجدہ تحیت سلاطین کے لیے آیا ہے۔ اگر آپ سجدہ کر لیں تو کوئی گزند بادشاہ
سے آپ کو نہ پہنچے گا۔ میں ضامن اور ذمہ دار ہوتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ مسئلہ
ضعیف حکم رخصت ہے۔ اور مسئلہ قوی عزیمت یہ ہے کہ غیر حق کو کبھی سجدہ
نہ کریں۔ (حضرات القدس دفتر دوم ص ۸۹ - ۹۰)

حضرت مجدد کی مجبوسی جہانگیر کا ایک ایسا فعل ہے جس کا کوئی جواز نہیں اور
ان کے متعلق جہانگیر (یا اس کے درباری مؤرخ نے) جو بے ادبانہ الفاظ استعمال کیے
وہ تو بہر صورت قابل مذمت ہیں۔ لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس امر کا اظہار
کروا جائے کہ حضرت مجدد کو جہانگیر نے اس لیے طلب نہیں کیا تھا کہ اسے حضرت سے

لے یعنی مجبور و مرور اور اتبات کے فرق کے متعلق۔

کوئی ذاتی عناد تھا بلکہ اس طلبی کی اگر ایک وجہ ملکی مصلحتیں تھیں تو دوسری وجہ مذہبی تھی۔ مکتوبات کے جن اندراجات کی توڑک جہانگیری میں شکایت کی گئی ہے۔ ان پر کئی دوسرے ہم عصر معترض تھے۔ بلکہ خزینۃ الاصفیاء میں تو لکھا ہے کہ علمائے حضرت مجدد کے قتل کا فتوے دے دیا تھا۔ (پس ہمہ علما بخاطر داری امرائے دربار فتوے بر قتل شیخ نوشند) خزینۃ میں حضرت مجدد کے متعلق جو طویل اندراج ہے، اس کا ایک اہم ماخذ (روضۃ السلام) ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن سجنۃ المرجان میں بھی میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ جہانگیر کے پاس مکتوب یازدہم کی شکایت علمائے کی تھی (ص ۴۸)۔ اس کے علاوہ خیال ہوتا ہے کہ حضرت مجدد کے خلاف ایک عام شورش کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ جہانگیر حضرت مجدد کی قید کا ایک مقصد یہ بھی بتاتا ہے کہ ”شورش عوام“ ٹھنڈی پڑ جائے۔ اور زبدۃ المقامات میں بھی لکھا ہے کہ شورش کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ شیخ بدیع الدین کے لیے اکبر آباد میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ بلکہ اس شورش کی

لے شاید مغل بادشاہ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر نہ چاہتے تھے کہ مذہبی راہنماؤں کا اثر بہت بڑھ جائے۔ توڑک جہانگیری میں ایک جگہ لکھا ہے ”بہن خبر رسید کہ شیخ ابراہیم بابا افغانی دکان شیخی و مربدی دریکے پرگنہ از پرگنات لاہور ترتیب دادہ چنانچہ طریقہ ادبانش است جمع کثیر سے از افغانان وغیرہ بروگرد آمدہ اند۔ فرمودم کہ اور احاضر آوردہ بر پر ویز سپارند کہ در قلعہ چارنگاہ وارد نہ تائیں ہو گامہ باطل بر ہم خورد“ گلزار ابرار میں بھی سید احمد افغانی کے ذکر میں لکھا ہے کہ جن سال خسرو نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کی، ان دنوں ایک مجلس میں سادات صفوی کے ایران پر قبضہ پانے کا ذکر ہو رہا تھا تو کسی نے کہا کہ اس وقت بھی کئی درویش صورت اشخاص ایسے ہیں جن کے فرمانبردار معتقدین کی تعداد ایک ولایت کی فوج سے کم نہیں اور اس سلسلے میں باجوڑ کے سید احمد افغانی کا نام لیا۔ وہ بلائے گئے۔ آداب ملازمت بجانہ لائے اور تین سال تک گوالیار میں قید رہے۔ وہ بھی وحدت الوجود کے خلاف تھے۔ شاہجہان نے بھی حضرت مجدد کے خلیفہ اعظم شیخ آدم بنوری کو جج پر جانے کے لیے مجبور کیا تھا۔ (سید احمد افغان کے حالات کے لیے ملاحظہ فرمادہ ۱۲۵۲)

انچ پیریز گوار تک پہنچی۔

سُنّتِ یوسفی | حضرت مجددِ تقریباً ایک سال گوالیار کے قلعے میں قید رہے۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو شیخ بدیع الدین کا ذوق و شوق بالکل مُردہ ہو گیا (نوشتہ بودند کہ از وقت ظهورِ فتنہ نہ ذوق ماندہ است و نہ حال) لیکن حضرت مجدد کے ذوق و شوق میں اور اضافہ ہوا۔ انھوں نے دفترِ سوم میں کئی جگہ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ محبوب کی جفا اس کی مہربانی سے زیادہ دلاویز ہوتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض لحاظ سے واقعہ قید حضرت مجدد کے لیے زیادہ ترقیات اور روحانی اصلاح کا باعث ہوا۔ قید کے فوراً بعد آپ نے صاحبزادگان کو جو پہلا خط لکھا۔ (دفترِ سوم، مکتوب دوم) وہ بھی کامل تسلیم و رضا، فصاحت و بلاغت اور شفقت و محبت کا ایک دلاویز مرقع ہے۔

جہانگیر سپردِ صوفیوں سالِ جلوس کے ضمن میں لکھتا ہے :-

”دریں ایام شیخ احمد سرہندی را کہ بخت دکان آرائی و خود فروشی و بی صرفہ گوئی روزے چند روز زندان ادب مجوس بود۔ بجنور طلب داشتہ خلاص ساختہ خلعت ہزار روپیہ خرچ عنایت نموده در رفتن و بودن مختار گردانیدم۔ و از رفئے انصاف معروض داشت کہ ایں تنبیہ و تادیب در حقیقت ہدایت و کفایت بود۔“

جہانگیر نے حضرت مجدد کے مرتبہ اور ظرف کا صحیح اندازہ لگایا ہو یا نہ۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ انھوں نے واقعہ قید سے بھی مزید روحانی ترقی کا سامان کیا۔ اس آزمائش میں انھوں نے جس وقار، استقلال اور علو ہمت کا مظاہرہ کیا۔ وہ ہماری روحانی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ تذکرہ نگار تو نہیں لکھتے لیکن پروفیسر محمد فرمان نے ایک مکتوب سے قیاس لگایا ہے کہ معاملہ صرف قید و بند کا نہ تھا، بلکہ جائداد بھی ضبط کی گئی۔ اور انھیں اذراں خانان کو تحویلی و سرا و چاہ و باغ و کتب و اشیاء دیگر سے محروم ہونا پڑا۔ لیکن اس پر تسلیم و رضا پر ذرہ بھر اثر نہ ہوا۔ صاحبزادگان گرامی قدر خواجہ محمد سعید اور محمد معصوم کو لکھتے ہیں کہ ان چیزوں کی پرواہ نہیں۔ ”باید کہ کچھ چیز مزاجم وقت شمائ شود۔ و غیر از مضیات حق

جلا و علا مراد و مرضی شما نباشد۔ اگر مائے مریم۔ ایں ہمہ اشیائے رفت گہ در حیات با
رفتہ باشد۔ ہیچ فکر نہ کنند۔۔۔۔ والدہ خود را تسلی دہند۔
قید خانے میں اس نئی صورتِ حالات کو آپ جس نظر سے دیکھتے تھے اس کا
تفصیلی اظہار میر محمد نعمان کے نام ایک خط میں ہے :- (ترجمہ)

”پوشیدہ نہ رہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اس عنایت نے حق تعالیٰ کے
جلال و غضب کی صورت میں تجلی نہ فرمائی اور قید خانے کے قفس میں قید نہ ہوا۔ تب تک
ایمان شہودی کے تنگ کوچہ سے کلی طور پر نہ نکلا۔ اور ظلال و خیال و مثال کے کپڑوں
میں سرگردان رہا۔ ایمان بالغیب کی شاہراہ میں مطلق الحنان ہو کر نہ دوڑا۔ اور حضور
سے غیب کے ساتھ اور عین سے علم کے ساتھ اور شہود سے استدلال کے ساتھ
کامل طور پر نہ ملا اور ذوق کامل اور وجدان بالغ کے ساتھ دوسروں کے ہنر کو عیب
اور ان کے عیب کو ہنر نہ معلوم کیا۔ بے تنگی اور بے ناموسی کے خوشگوار شربت
اور رسوائی اور خواری کے مزے دار مرتبے نہ چکھے اور خلق کے طعن و سلامت کے
جمال سے حنظل نہ پایا۔ اور لوگوں کے بلا و جفا کے حسن سے محفوظ نہ ہوا اور کلی طور
پر اپنے ارادہ و اختیار کو ترک نہ کیا اور آفاقی اور نفسی تعلقات کے رشتہ کو کامل طور پر
نہ توڑا اور تضرع و التجا، انابت و استغفار اور ذلت و انکسار کی حقیقت حاصل نہ ہوئی
اور حق تعالیٰ کے استغنا کی رفیع الشان بارگاہ کو جس کے گرد عظمت و کبریا کے پردے
تھے ہوئے ہیں، مشاہدہ نہ کیا اور اپنے آپ کو بندہ خوار و ذلیل و بے اعتبار
و بے ہنر و بے طاقت اور کامل محتاج اور فقیر معلوم نہ کیا۔“

ہم جہانگیر کا بیان نقل کر چکے ہیں کہ قید خانے سے رہائی کے بعد اس نے حضرت
مجدد کو اجازت دی تھی کہ وہ چاہیں تو لشکر کے ساتھ رہیں اور چاہیں تو گھر چلے جائیں
آپ نے لشکر کے ساتھ رہنا قبول کیا۔ اس طرح آپ کو سارے لشکر میں بلکہ ساری

لے پروفیسر محمد فرمان کا خیال ہے کہ جہانگیر کا حضرت مجدد کی نسبت یہ لکھنا کہ ”در رفتن و ماندن محتاج
گردانیدم“ جھوٹ اور ڈپلومیسی کا اظہار ہے۔ اور اس نے حضرت مجدد کو آخر وقت تک نظر بند
[باقی اگلے صفحے پر]

مملکت میں جہاں جہاں لشکر جاتا، تلقین و ہدایت کا موقع ملتا۔ اس سے پہلے بھی جب آپ جیل خانے میں محبوس تھے تو آپ نے اپنے رفقاء زندان میں سے کئی بُت پرستوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا تھا۔ لشکر کے ساتھ قیام کے دوران میں آپ کو بادشاہ کو تلقین کرنے کا بھی موقع ملتا۔ چنانچہ دفترِ سوم میں ایک خط بادشاہ کے نام ہے اور ایک اور خط میں اس گفتگو کا ذکر ہے جو آپ نے مجلسِ شاہی میں کی تھی۔ لکھتے ہیں (ترجمہ)

”عجیب و غریب صحبتیں گزر رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے امورِ دینیہ اور اصولِ اسلامیہ میں سرِ موسیٰ اور داہنت دخل نہیں پاتی اللہ تعالیٰ

کی توفیق سے ان محفّوں میں بھی وہی باتیں ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہو کر تھیں۔ اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفترِ موجودہ جاسے۔ خاص کر آج ماہ رمضان کی سترھویں رات کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اور عقل کے عدم استقلال اور آخرت کے ایمان اور اس کے عذاب و ثواب اور رست و دیدار کے اثبات اور حضرت خاتمِ الرسلؐ کی نبوت کی خاتمیت اور ہر صدی کے مجدد اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی اقتدار اور تراویح کی سُنّت اور تناسخ کے باطل ہونے اور جنوں اور جنونیوں کے احوال اور ان کے عذاب و ثواب کی نسبت بہت کچھ مذکور ہوا۔ بادشاہ بڑی خوشی سے سُنتا رہا۔ اس آٹھویں اور بھی بہت سی چیزوں کا ذکر ہوا اور قطاب و اوماد اور ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیتوں وغیرہ کا بیان ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ سب کچھ قبول کرتے رہے اور کوئی تغیر ظاہر نہ ہوا۔ ان واقعات اور ملاقات میں شاید کوئی اللہ کی پوشیدہ حکمت اور خفیہ ذمہ ہوگا۔“

(تقریب نوٹ صفحہ ۲۷۲)

رکھا۔ (حیاتِ مجدد ص ۳۵) یہ خیال بے بنیاد نہیں۔ مکتوباتِ امام ربانی کا بغور مطالعہ کریں تو اس کی تائید ہوتی ہے۔ لشکر سے جب حضرت محمدؐ جاتے تھے تو شخصیت لکھتے تھے ان کا طریقہ انتہائی تسلیم و رضا کا تھا لیکن خواجہ حسام الدین کے نام بھی ان کا خط پڑھیں تو عین بلا اور عین تفرقہ کا جس طرح ذکر ہے اور جو دوسرے پر معنی بچھتے ہیں (دفتر دوم ص ۱۷) ان سے پروفیسر محمد فرمان کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

جہانگیر آپ کی قید خانے سے رہائی کے تین سال بعد اپنی سالگرہ کے ذکر میں لکھتا ہے :-

”بدستور ہر سال خود را بہ طلا و اجناس وزن فرمودہ در وجہ مستحقان مقرر فرمودم۔

از آن جملہ شیخ احمد سرہندی را دو ہزار روپیہ عنایت شد۔“

حضرت مجدد قلعہ گوالیار سے واپسی کے بعد تقریباً تین چار سال تک بادشاہ کے لشکر میں رہے۔ اس دوران میں انھوں نے کئی خط لکھے جو جلد سوم میں موجود ہیں۔ لیکن ان میں سوانحی واقعات بہت تھوڑے ہیں۔ یہ معلوم نہیں کہ آیا حضرت مجدد بادشاہ کے ساتھ کشمیر اور کانگرہ بھی گئے۔ لیکن تزک جہانگیری کے مطالعہ سے خیال ہوتا ہے کہ ان تین چار سالوں میں جہانگیر کو ترویج شریعت کا خاص خیال رہتا تھا اور اس کے دل میں مذہب کا بڑا جوش تھا۔ عجب نہیں کہ اس میں حضرت کی تعلیمات کو بھی دخل ہو۔ جہانگیر نیدرھویں سال جلوس کے واقعات میں یعنی جس سال حضرت کو رہائی ملی علاقہ راجوری (کشمیر) کے بعض مسلمان راجپوتوں کی نسبت لکھتا ہے :-

”زمینداران ایں جا را راجامی گفتند۔ سلطان فیروز مسلمان کردہ۔ و مع ذالک خود را

راجامی گویانند و ہنوز بدعت ہائے ایام جہالت در میان آنها مستراست از جملہ خانیچہ

بھنے از زنان ہندو باشو ہر خود مے سوزند۔ اینہارا زندہ باشو ہر گوری آرنند شہنشاہ

کہ در ہیں ایام دختر سے دہ دوازده سال باشو ہر خود کہ ہم سال بادبود زندہ بقبر در آورند

دیگر آنکہ بھنے از مردم بے بضاعت را کہ دختر بوجودی آید خفہ کردہ می کشند۔ با ہنود

پیوند خویشی مے کنند۔ دختر می دہند و می گیرند۔ گرفتن خود خوب۔ اما دادن! بخود باندہ

فرمان شد کہ بعد ازیں پیرامون ایں امور نگردند۔ و ہر کس کہ مرتکب ایں بدعت ہا شود۔

اور اسیاست کنند“ (تزک جہانگیری ص ۳۲۳)

پھر اگلے سال فتح کانگرہ کے ذکر میں لکھتا ہے :-

”جہانگیر کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مسلمان عوام جو الالمکھی کی پرستش کرتے تھے قطع نظر از کفار کہ بت پرستی آئین انہاست۔ گر وہ گروہ از اہل اسلام مسافت بعید طے نمودہ نذورات می آرنند۔ و پرستش ایں سنگ سیاہ می نمایند“ (تزک جہانگیری ص ۳۲۴)

”متوجہ سیر قلعہ کانگرہ شدم و حکم کردم کہ قاضی و میر عدل و دیگر علماء اسلام کہ در کاب
بودہ - آنچه شعار اسلام و شرائط دین محمدی است در قلعہ مذکور بعمل آورند - بتوفیق ازین بجا
بانگ نماز و خواندن خطبہ و کشتن گاؤں و غیرہ کہ از ابتدائے بنا این قلعہ تا حال نشدہ بود -
ہمراہ در حضور خود عمل آوردہ - سجدات شکر این مہمبت عظمی کہ ہیچ بادشاہے توفیق
براں نیافتہ بود بتقدیم رسانیدہ ، حکم فرمودہ کہ مسجد عالی درون قلعہ بنا ہند۔“

(توزک جہانگیری ص ۳۴۶)

یہ امر غیر غلب نہیں کہ ”دیگر علماء اسلام“ جو بادشاہ کے ساتھ تھے ان میں
حضرت مجدد بھی تھے!

جہانگیری کی حکومت میں نور جہاں کے شیعہ بھائی اور وزیر سلطنت آصف کو بڑا غل
تھا اور حضرت مجدد کو ان کا طریق کار ضرور ناگوار ہوتا ہوگا۔ لیکن قیام سلطنت کے دوران
میں کسی الجھنوں کے باوجود حضرت مجددؑ نے اپنی جمعیت خاطر اور روحانی مشاغل میں
فرق نہیں آنے دیا۔ ایک خط میں خواجہ حسام الدین احمد کو لکھتے ہیں :-

”اس طرف کے فقرا کے احوال و اوضاع حمد کے لائق ہیں کہ عین بلا میں عافیت اور
عین فقرہ میں جمعیت حاصل ہے۔ وہ فرزند دوست جو ہمراہ ہیں۔ ان کے اوقات بھی
جمعیت سے گزر رہے ہیں۔ اور ان کے احوال میں ترقی ہو رہی ہے۔۔۔ الحمد للہ کہ
باوجودیکہ ارباب فقرہ سے بہت میل جول ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہماری
میں سے کسی کو ابھی تک فقرہ کی نوبت نہیں پہنچی اور مطلب سے نہیں روکا۔“ (دفتر سوم مکتوبات)

۱۵۔ ہم نے اپنے زعم میں بڑی محنت کی۔ اور مجددی تذکرہ نگاروں کی تائید میں ترک جہانگیری سے جو کچھ مل سکا اسے
جمع کیا۔ اور حضرت مجددؑ کے اثرات کے ثبوت میں پیش کیا۔ لیکن چونکہ ہم نے ترک جہانگیری کی عبارت کے لحاظ سے
حضرت مجدد کے ساتھ دوسروں کو بھی شامل کر لیا تھا۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ کہ ہم نے حضرت مجددؑ کی خدا
پر پردہ ڈالنا چاہا ہے۔ خیر خبر و علیم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ہمیں شکایت نہیں۔ لیکن پروفیسر
محمد فرمان نے جو کچھ لکھا ہے اس کی روشنی میں جہانگیر اور حضرت مجددؑ کے تعلقات کا نئے سرے سے مطالعہ مناسب ہے۔

لشکر کے ساتھ ہی آپ ۱۶۲۲ء میں اجمیر تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے حضرت خواجہ بزرگ قدس سرہ کے مزار کی زیارت کی۔ دیر تک وہاں مراقبہ کیا اور بڑا فیض حاصل کیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے حق مہمانی ادا کیا۔ طرح طرح کی ضیافتیں کیں اور بہت سی اسرار کی باتوں کا ذکر ہوا۔ اسی جگہ مزار کے خادموں نے حاضر ہو کر حضرت خواجہ کے مزار کا قبر پوش آپ کی خدمت میں پیش کیا جسے آپ نے ادب کے ہاتھوں سے لے لیا۔ اور فرمایا کہ چونکہ یہ لباس حضرت خواجہ سے بہت نزدیک رہا ہے۔ اس لیے اسے میرے کفن کے لیے سنبھال رکھا جائے۔

مکتوبات سے خیال ہوتا ہے کہ آپ کبھی کبھی رخصت لے کر سرہند تشریف لے جاتے اور مدت رخصت کے اختتام پر واپس تشریف لے آتے۔ خواجہ زادگان میں سے بھی کبھی کبھی کوئی لشکر میں ساتھ ہوتا۔ ایک زمانہ میں فقط خواجہ محمد ہاشم کشمی ساتھ تھے اور وہ بھی سفر اجمیر کی صعوبتوں سے گھبرا گئے تھے (جلد سوم مکتوب ۸۲)۔

اب آپ کی عمر زیادہ ہو رہی تھی۔ سفر میں تکلیف ہوتی تھی۔ ضعف جسمانی غالب آ رہا تھا اور سمجھتے تھے کہ رحلت کا وقت قریب آ رہا ہے۔ چنانچہ بادشاہ سے اجازت ملی تو آپ سرہند تشریف لے گئے۔ جہاں پہنچ کر آپ نے خلوت اختیار کی۔ ان ایام میں کئی دفعہ آپ اپنی موت کا ذکر کرتے تھے۔ کئی دوستوں کے نام خط میں ”استغفر سے چلے“ کا فقرہ لکھا اور بعض کو تو بالصراحت بتایا کہ عمر کا اخیر ہے۔ اس دوران میں آپ پر دسے کا بڑا سخت حملہ ہوا۔ پھر طبیعت بحال ہو گئی۔ لیکن آپ موت کا اکثر ذکر کرتے رہے۔ اس زمانے میں کثرت سے خیرات دی۔ کسی نے سمجھا کہ دفع بلیات کا صدقہ ہے۔ تو آپ نے ہندی کا یہ مصرع پڑھ کر حقیقت حال واضح کی:

آج ملاوا کنت سون سکھی، سب جگے یواں وار

یعنی آج وصال کا دن ہے اے سکھی۔ میں اس خوشی پر تمام دنیا کو نثار کر دوں۔

مقررے ہی عرصے بعد موت کا پیغام آن پہنچا۔ اور آپ ۲۸ صفر ۱۰۳۲ھ ہجری

مطابق ۱۰ دسمبر ۱۹۲۳ء کو انتقال فرما گئے۔

کیا حضرت مجددؒ اور تین تہا حضرت مجددؒ نے اکبری الحاد کا قلع قمع کیا؟

حضرت مجددؒ کی مذہبی خدمات پر تبصرہ کرنے سے پہلے اس سوال کا جواب دینا ضروری

ہے کہ حضرت مجددؒ کا اکبری الحاد کے خاتمہ میں کس قدر حصہ تھا؟ آج سے تیس چالیس سال پہلے سوائے مجددیہ حضرات کے کوئی اہل علم اس امر کا قائل نہ تھا کہ حضرت نے عہد اکبری کی بد مذہبی کا خاتمہ کیا۔ یہ صحیح ہے کہ روضۃ القیومیہ اور حضرت مجددؒ کی بعض سوانح مریوں میں جو ان کی وفات کے بہت مدت بعد ان کے غالی معتقدوں نے لکھیں۔ اس امر کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ لیکن علمی حلقوں میں اسی خوش اعتقادی کو اسی قدر اہمیت دی جاتی۔ جس قدر علاء الدین خلجی کے متعلق نظامی حضرات کے اس دعوے کو کہ اس کی فتوحات سلطان المشائخ کی مرہون منت تھیں یا مغلوں کے متعلق شطاریوں کے اس بیان کو کہ خاندان سورپہ انھیں فتح حضرت غوث گویاری کی مدد سے ہوئی۔

حضرت مجددؒ کے متعلق ان کے بعد ہمارے بہترین علماء و صلحا مثلاً شاہ ولی اللہ شیخ نور الحق ابن شیخ عبد الحق محدث اور مرزا جانجاناں مظہر نے اپنے خیالات قلمبند کیے ہیں۔ اور یہ خیالات عقیدت مندانہ تھے، لیکن ان میں کسی نے حضرت مجددؒ کو اکبری الحاد کا قاطع قرار نہیں دیا۔ علمی حلقوں میں یہ دعویٰ سب سے پہلے آج سے تیس سال قبل مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا۔ انھوں نے تذکرہ میں لکھا ہے۔

”شہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہد جاگیرگری کے اوائل میں کیا ہندوستان علماء و مشائخ حق سے بالکل خالی ہو گیا تھا؟ کیسے کیسے اکابر موجود تھے؟ لیکن مفاسد وقت کی اصلاح و تجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ صرف مجدد و الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود گرامی ہی تین تہا“ اس کا روبرو کا کفیل ہوا۔

(تذکرہ ص ۲۳۸)

پھر فٹ نوٹ میں اس عبارت پر مزید اضافہ کیا :-
 ”عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ان (حضرت مجددؑ) کی تجدید محض رویدعات
 جہاں صوفیہ و تحقیق بعض معارف تصوف و اعلان و اشتہار توحید شہودی میں منحصر
 ہے۔ حالانکہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔“

مولانا لکھتے ہیں کہ حضرت مجددؑ کے کاموں کی تفصیل کے لیے انھوں نے ”متوسط
 تقطیع کے ۱۷۳“ صفحات پر سیرت حضرت مجددؑ لکھی۔ اس کتاب کا کہیں سراغ نہیں
 ملتا۔ لیکن مولانا نے تذکرہ میں جو ولولہ انگیز مبہم اشارے کیے تھے اور حضرت مجددؑ کے
 مقابلے میں جس طرح انھوں نے نام لے کر شیخ عبدالحق محدثؒ کی ”غزیش“ اور
 حضرت خواجہ باقی باللہ کی ناتمامی کا ذکر کیا۔ اس سے روضۃ القیومیہ اور اس قسم کے
 متاخرانہ مجددی تذکرہ نگاروں کے اس نظریہ کو بڑی تقویت ملی کہ اکبری دور کی خرابیوں
 کو دور کرنے والے حضرت مجددؑ اور ”تہا“ حضرت مجددؑ تھے۔

اس کے بعد کسی مؤرخ نے اس مسئلے پر محققانہ نظر نہیں ڈالی اور چونکہ اقبال
 کے فلسفہ اور ہماری روحانی زندگی کے موجودہ رجحانات کی وجہ سے تمام وہ حضرات
 جنھوں نے اخلاقی جرات اور جلالی شان دکھائی خاص و عام میں مقبول ہیں۔ اس لیے
 مولانا ابوالکلام آزاد کے نقطہ نظر کی بڑی خوشی سے پیروی ہوئی اور آج عوام الناس ہی
 نہیں، بلکہ اہل علم حضرات بھی اکبری الحاد کا قاطع فقط حضرت مجددؑ کو قرار دیتے ہیں۔
 لیکن کسی قوی قیاسات اور شواہد ایسے ہیں جن کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ حضرت
 مجددؑ کے متعلق یہ دعویٰ محل نظر ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی قابل ذکر حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ یا شیخ
 عبدالحق محدثؒ یا شیخ نورالحق جو حضرت مجددؑ کے ہم عصر یا قریب العهد تھے، وہ حضرت
 مجددؑ کو اکبری الحاد کا قاطع نہیں کہتے۔ وہ حضرت سرہندی کی دوسری خوبیوں اور
 کارناموں کا ذکر کرتے ہیں، لیکن ایک ایسا امر جو اگر امر واقعی ہو تو حضرت سرہندی کی
 دوسری سب خوبیوں سے اہم ہوگا۔ اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حضرت مجدد کے رسالہ ردّ و افض کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمے کے شروع میں عہد اکبری کے مذہبی رجحانات پر تبصرہ ہے۔ اور حضرت مجدد کے تمام احسانات و کارنامے ایک ایک کر کے تفصیل سے گنائے گئے ہیں۔ اس بحث میں شاہ صاحب نے رسالہ اثبات النبوت اور ان مکتوبات کا ذکر کیا ہے۔ جن کی بنا پر معتقدین حضرت مجدد کو اکبری الحاد کا قاطع قرار دیتے ہیں، لیکن شاہ صاحب نے ان چیزوں کی جتنی اہمیت تھی وہ بتا دی ہے۔ نہ زیادہ نہ کم۔ اور حضرت مجدد کے تمام کارنامے گنانے کے باوجود کہیں یہ نہیں کہا کہ انھوں نے اکبری الحاد کا قلع فتح کیا۔

یہی نہیں بلکہ حضرت مجدد کی وفات کے فوراً بعد دو مبسوط تذکرے ان کے خلفائے لکھے۔ ایک (زبدۃ المقامات) ان کے صاحبزادوں کے ایمان پر ان کے خلیفہ اعظم خواجہ محمد شمس کشمی نے لکھا۔ دوسرا (حضرات القدس) مولانا بدر الدین سرہندی کی تصنیف ہے جو آپ کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ سترہ برس آپ کی خدمت میں رہے۔ ان دونوں میں حضرت مجدد کے اس کارنامے کا کہیں ذکر نہیں۔ اگر حضرت مجدد نے واقعی اکبری بد مذہبی کا ازالہ کیا تو کیا یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ یہ سب بزرگ اس مسئلہ میں خاموش ہیں۔ آخر انھیں آج کے مصنفین کی نسبت ثقات کو جاننے کا زیادہ موقع تھا۔

لیکن لطف یہ ہے کہ نہ صرف کوئی ہم عصر یا قریب العہد مستند عالم حضرت مجدد کے اس تجدیدی کارنامے کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ ان کے زمانے کا سب سے بڑا عالم ابن کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث کے اکبری بد مذہبی کی نسبت جو خیالات ہوں گے، ان کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ ان کا تھوڑا بہت اظہار انھوں نے شیخ فرید کے نام ایک خط میں کیا ہے۔ فیضی ان کا بڑا قدردان تھا۔ لیکن وہ اس کے اور اکبر کے مذہبی خیالات سے برگشتہ ہو کر فتح پور سیکری چھوڑ گئے۔ اب اگر کوئی شخص اس بد مذہبی کا ازالہ کرتا تو کیا شیخ عبدالحق محدث اس کے سامنے سر عقیدت نہ جھکاتے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ مکتوبات کے بعض اندراجات کی بنا پر حضرت مجدد کے مخالفین میں

پیش پیش تھے اور انھوں نے ایک مستقل رسالہ حضرت مجدد کے بعض بیانات کی تردید میں لکھا۔

جہانگیر اکبر کا جانشین تھا، لیکن اکبر کے مذہبی منصوبوں سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ابوالفضل کا وہ سخت مخالف تھا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے جو احکام جاری کیے، ان سے شرع کا احترام ٹپکتا ہے۔ پرتگیز مشنری کہتے ہیں کہ اس نے احترام شرع کا وعدہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ الحاد کا مخالف ہوگا۔ اب اگر حضرت مجدد نے اکبری الحاد کا قلع قمع کیا تو کیا یہ امر عجیب نہیں کہ جہانگیر نہ صرف ان کے کارناموں سے ناواقف ہے اور ان کا خاص احترام نہیں کرتا، بلکہ انھیں قید کر لیتا ہے۔

جہانگیر نے حضرت مجدد کی طلبی اور قید کا واقعہ بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ حضرت کی حراست کی ایک وجہ ان کا غرور و تفاخر تھی۔ (یعنی غالباً یہ کہ انھوں نے سجدہ دربار نہ کیا) اور دوسری وجہ یہ تھی کہ انھیں چند دن قید میں رکھنے سے ان کے خلاف جو عوام کی شورش تھی وہ ختم جائے (شورش عوام فرو نشیند)۔ عوام کی اس شورش سے ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ معاصرین کی رائے حضرت مجدد کے متعلق کیا تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ کسی محاصرہ اور مستند تاریخ یا تذکرہ میں اس امر کا ذکر نہیں کہ حضرت مجدد نے اکبری بد مذہبی کا قلع قمع کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد کا وہ نظریہ جو تذکرہ سے اخذ کیا جاتا ہے، مستبعد بلکہ ناقابل قبول معلوم ہوتا ہے لیکن مولانا غالباً ان مکتوبات سے متاثر ہوئے ہیں، جن میں حضرت مجدد نے اکبریہ کو شرع کے استحکام اور مذہب کی استواری کی تلقین کی ہے۔ اس لیے واقعات کو پرکھنے کے لیے ان مکتوبات پر نظر ڈالنی پڑے گی۔

ان مکتوبات کی نسبت ایک قابل ذکر امر یہ ہے کہ اگر ان کی بنا پر یہ تسلیم کیا جائے کہ شیخ فرید خان اعظم اور دوسرے اکابر کو حضرت مجدد کی یاد دہانی اور وعظ و تلقین کی وجہ سے حفاظت مذہب کا خیال پیدا ہوا۔ اور پھر انھوں نے اس امر کے لیے کوششیں

کیں۔ تب بھی بہ نظر انصاف ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وعظ و نصیحت آسان ہوتی ہے اور اس پر عمل پیرائی کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اس وعظ و نصیحت کی وجہ سے ہمیں شیخ فرید اور دوسرے اکابر عہد کے ساتھ بے انصافی نہیں کرنی چاہیے جنہیں بادشاہ کو قائل کرنے میں جو عملی مشکلات تھیں ان کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان مکتوبات کے بغیر ہی مسلمان امراء کو اپنے فرض کا احساس تھا بلکہ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں ان مکتوبات کے لکھے جانے سے پہلے ہی اصل مراحل طے ہو گئے تھے اور اکبری الحاد کا قلع قمع ہو چکا تھا۔

ان مکتوبات میں سب سے زیادہ شیخ فرید کے نام ہیں۔ ہم شیخ فرید کے حالات ذرا تفصیل سے لکھ چکے ہیں اور ان کی نسبت مجدد الف ثانی کے مرشد خواجہ باقی باللہ اور خود حضرت مجدد کے جو عقیدت مندانہ خیالات تھے وہ نقل کر چکے ہیں۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کے ساتھ ان کا جو رگائنگت کا رشتہ تھا۔ وہ بیان ہو چکا۔ اُسے دیکھ کر کوئی با انصاف انسان نہیں کہے گا کہ شیخ فرید کو اسلام سے یا طریقہ نقشبندیہ سے دلی لگاؤ نہ تھا۔ یا یہ کہ حضرت مجدد کی یاد دہانی کے بغیر شیخ فرید کو اپنے فرائض کا خیال نہ ہوتا۔

لیکن حضرت مجدد کے مکتوبات سے ہی خود اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ وہ اس وقت لکھے گئے جب اکبر کے ساتھ اس کی مذہبی بوالفضولیاں ختم ہو چکی

۱۰ حضرت مجدد اس اہم فرق کو خوب سمجھتے تھے۔ خان جہاں کو ایک خط میں شرع میں کی تابعداری اور دشمنان دین کی مخالفت کی تلقین کر کے لکھتے ہیں۔ ”یہی خدمت جو اب آپ کر رہے ہیں۔ اگر اس کو شریعت کی بجا آوری کے ساتھ جمع کریں تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا سا کام کریں گے۔ جس سے دین منور و مہمور ہو جائے گا۔ ہم فقیر اگر سالوں تک اس عمل میں جان سے کوشش کریں۔ تب بھی آپ جیسے بہادروں کی گردن تک نہیں پہنچ سکتے۔“ ایسا اظہار خیال کسی خطوط میں ہے۔

تھیں۔ جہانگیر مذہبی امور میں اکبر کا ہم خیال نہ تھا اور پرتگیز مشنری باکراہ تسلیم کرتے ہیں کہ جہانگیر نے تخت نشین ہونے سے پہلے اس امر کا وعدہ کیا تھا کہ وہ شعائر اسلامی کی پابندی کرے گا۔

یہ سب مرحلے طے ہو گئے ہیں، جہانگیر تخت نشین ہو چکا ہے اور وہ ابتدائی احکام جن میں ایک تعمیر مساجد کے متعلق ہے، جاری ہو چکے ہیں۔ اس وقت حضرت مجدد سرہند سے شیخ فریدی کے نام خط لکھتے ہیں:-

”امروز کہ نوید زوال مانع دولت اسلام و بشارت جلوس بادشاہ اسلام گوش خاص و عام رسید۔ اہل اسلام بخود لازم دانستند کہ ممد و معاون بادشاہ باشند و بر ترویج شریعت و تقریب ملت دلالت نمایند۔“

اس کے بعد بادشاہوں کو علماء سنیوں سے بچانے کی ضرورت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں (ترجمہ) یہ فقیر بے سروسامان بھی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو اسلام کے مددگار گروہ میں داخل کرے (کہ خود را در جرمہ ممدان اسلام اندازد) اور اس بارے میں کوشش کرے۔ من کثر سواد قوم فھو منہم کے موافق ہو سکتا ہے کہ (آپ) اس فقیر کو ان بزرگوں کی جماعت میں داخل کر لیں۔ فقیر اپنے آپ کو اس بڑھیا کی طرح خیال کرتا ہے جو اپنا تھوڑا سا سوت لے کر حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خریداروں میں شامل ہو گئی تھی۔

اس خط کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ جرگہ ممدان اسلام پہلے سے موجود تھا اور حضرت مجدد اپنے مقابلے میں دوسرے اہل دل مسلمانوں کے کام کی قدر و قیمت بھی سمجھتے تھے۔

مکاتیب کے متعلق یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان میں بظاہر کوئی ایسا نہیں، جو حضرت مجدد نے حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے لکھا ہو۔ اور تذکرہ نگار بھی حضرت کا آغاز ارشاد و نقشبندی سلسلہ سے بیعت کے بعد شروع کرتے ہیں۔ مرشد کی زندگی میں بہر کیف حضرت مجدد کی حیثیت ثانوی تھی۔ اور

مرشد کی وفات کو دو سال نہ ہوئے تھے کہ اکبر مر گیا۔ اور جاگیر تخت نشین ہوا۔ اس دوران میں آپ کے پیروکاروں سے اختلافات رونما ہوئے۔ اور آپ سرسبز میں مقیم ہو گئے۔ اکبر کے طور طریقے یقیناً آپ کو ناپسند تھے۔ اور رسالہ انبیا النبوت معاصرانہ خیالات کی اصلاح کے لیے لکھا گیا، لیکن اس ایک رسالہ سے جس کے فقط نا تمام مخطوطے ملتے ہیں اور جو بظاہر کبھی مکمل نہ ہوا۔ اکبری خیالات کا کس طرح قلع قمع ہو سکتا تھا؟

مولانا ابوالکلام آزاد (اور عام مجددی تذکرہ نگاروں) کے بیان کا سب سے قابل افسوس پہلو یہ ہے کہ انھوں نے تمام صورت حالات کو ذہن میں رکھنے کی بجائے حضرت خواجہ باقی باللہ کے چند ارشادات سے جو انھوں نے اپنے بلند مرتبہ مرید کی تعریف میں کئے، مرشد کے کام کی اہمیت کو کم کرنا چاہا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں: ”اصحاب طریقت میں حضرت خواجہ باقی باللہ جیسے عارف کامل خود دہلی میں بعد اکبری مقیم رہے، لیکن وہ خود کہتے تھے کہ میں چراغ نہیں، چقماق ہوں۔ آگ نکال دوں گا۔ چراغ شیخ احمد سرسبز ہی ہیں“ حضرت خواجہ کا کوئی بیان بدیں الفاظ خاص ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن حضرت کا طریقہ درویشی اور انتہائی مسکنت کا تھا۔ وہ شیخ عبدالحق محدث سے بھی اس طرح برتاؤ کرتے۔ گویا وہ استاد ہیں اور حضرت خواجہ شاگرد۔ حضرت مجدد کے تو وہ خاص طور پر قدردان تھے۔ اور ان کی انھوں نے دل کھول کر تعریف کی۔ جس سے مجددی تذکرہ نگاروں اور مولانا ابوالکلام آزاد نے غلط نتائج اخذ کر لیے، لیکن صحیح صورت حالات جاننے کے لیے فقط حضرت خواجہ کے درجہ ارشادات پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ حضرت مجدد کے ان بیانات کو بھی دیکھنا چاہیے جو انھوں نے مبداء و معاد میں اور دوسری جگہ مرشد کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے لکھے۔ اور بالخصوص وہ مکاتیب ملحوظ خاطر رہنے چاہئیں جو انھوں نے حضرت خواجہ کو لکھے۔ یا مرشد نے بلند پایہ مرید کی اصلاح و ہدایت کے لیے تحریر کیے۔ ان کے مطالعہ کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان

مرشد اور سعادت مند مرید کا رشتہ تھا۔ حضرت مجدد کے خطوط خاص طور پر دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اپنے مقامات عروج کا ذکر کرتے ہیں۔ اور بار بار لکھتے ہیں کہ یہ سب آپ کا فیض ہے، ورنہ ع۔

من ہماں احمد پارینہ کہ ہستم ہستم!

مولنا ابوالکلام آزاد (اور عام مجددی تذکرہ نگاروں نے جس طرح حضرت خواجہ

حضرت مجدد کی مذہبی خدمات

باقی باللہ کے ساتھ بے انصافی کی ہے اور مفاسد وقت کی اصلاح کا کفیل "تنہا" حضرت مجدد الف ثانی کو قرار دیا ہے۔ اس کی تصحیح کے لیے ہمیں مندرجہ بالا سطور لکھنی پڑیں، لیکن اس اختلاف سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس ضمن میں ہمیں حضرت مجدد کے کام کی اہمیت سے انکار ہے۔ یا ان کے علو مرتبہ کے اعتراف میں ہم کسی سے پیچھے ہیں۔ (عبادت خانہ کی تلخ اور نا عاقبت اندیشی نہ بھٹوں بھونگا اور صورت اختیار کر لی اور درباری خوشامدیوں اور علما سود کی جدت طرازیوں نے جو انتشار پیدا کر دیا، اسے روکنے کے لیے متعدد مسلمان امرا و علمائے کرام نے کوشش کی اور بعضوں نے بڑی قربانیاں دیں۔ اس کے کامیاب سد باب میں جن محبان اسلام نے اواخر عبدالکبریٰ میں حصہ لیا ان میں مرکزی حیثیت حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی تھی جن کے دست راست دو شخص تھے۔ امرا میں سے شیخ فرید اور اہل باطن میں شیخ احمد سرمدی۔ موجد الذکر کا مرتبہ بہر کیف بلند ہے، لیکن معاملہ صرف ان خرابیوں کا نہ تھا جو عبادت خانہ اور دربار شاہی کی بھٹوں سے پیدا ہوئی تھیں۔ اطراف ملک میں جن حقیقی مشکلوں سے مسلمان دوچار تھے، وہ ہندومت کی جارحانہ اجیائیت کی پیدا کردہ تھیں۔ ان کا تودار الخلافہ میں پورا احساس ہی نہ تھا۔ ان کی طرف حضرت مجدد نے توجہ دلائی۔ امرا و اراکین سلطنت کو ان کے فرائض یاد دلانے اور شعائر اسلام کی بجا آوری اور اسلام کی سر بلندی پر زور دیا۔ لیکن حضرت مجدد کی کوششیں صرف مسلمانوں کے با اثر طبقے کو اپنے فرائض یاد دلانے اور امرا کے خیالات کی اصلاح تک محدود نہ تھیں۔

انھوں نے عامۃ المسلمین بلکہ جمہور علما اور صوفیہ کے خیالات کی بھی اصلاح کی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عہد اکبری کی مذہبی بے قاعدگیوں کے خلاف جو ردِ عمل ہوا اور شرع و دین نے جو تدریج دوبارہ فروغ حاصل کیا۔ اُسے حضرت مجددی ذیہ والہ صفات سے بڑی تقویت ملی۔

حضرت مجددی ایک اہم اسلامی خدمت یہ ہے کہ آپ نے اس سلسلہ تصوف کی اشاعت کی جو ہندوستانی طریقوں میں شریعت سے قریب ترین ہے ہندوستان میں شروع ہی سے اسلام پر تصوف کا رنگ اس قدر چڑھا ہوا ہے کہ بیسویں صدی کے شروع تک کسی کو یہ خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ کسی صوفیانہ سلسلے میں داخل ہوئے بغیر انسان اسلام کی برکات سے مستفید ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کی بڑی خدمت اسی میں تھی کہ ایک ایسے صوفیانہ سلسلے کو ترقی دی جائے جو بعض دوسرے سلسلوں کی طرح شرع سے آندہ نہ ہو۔ حضرت مجددی نے یہی کیا اور ہندوستان کے مشہور اور پرانے سلسلوں کو چھوڑ کر ایک ایسے طریق کی اشاعت کی جس میں شرع اسلام کی پیروی پر بڑا زور ہے۔ جواہر مجددیہ کے مصنف لکھتے ہیں کہ ”اس طریقے کے تمامی اصول اور فروع میں اتباع سنتِ سنّیہ اور اجتناب بدعتِ نامرضیہ بدرجہ کمال ہے۔ یعنی اصحاب کبار کا سالک باس مشروط ہے۔ انھی کی سی معاشرت، ویسے ہی کم ریاضتیں اور فیضان کثیر اور کمالات ولایت کے علاوہ کمالات نبوت کی بھی تعلیم ہے۔ نہ اس میں چلہ کشی کی ضرورت ہے نہ ذکر بالجہر کی اجازت ہے۔ نہ سماع بالمزامیر ہے نہ قبور پر روشنی۔ نہ خلاف و چادر اندازی۔ نہ هجوم عورات۔ نہ سجدہ تعظیمی نہ سر کا جھکانا۔ نہ بوسہ دنیا۔ نہ توحید و جود کی دعوائے انا الحق و ہمہ اوست۔ نہ مریدوں کو پیروں کی قد مہوسی کا حکم۔ نہ مرید عورتوں کی ان کے پیروں سے بے پردگی“ (مکمل)

سچ یہ نہ سمجھا جائے کہ نقشبندیہ طریقے کی کسی بات پر اہل شرع یا دوسرے سلسلوں کے ماننے والے اعتراض نہیں کرتے مثلاً تصویر شیخ کے متعلق ترجمان القرآن بابت مئی ۱۹۵۱ء وغیرہ ملاحظہ ہو۔ اسی طرح بعض نقشبندی اشغال کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ یوگیوں میں بھی رائج ہیں

اس کے علاوہ نہ صرف آپ نے طریقت کا وہ سلسلہ اختیار کیا جس میں احکام شرعی کا سب سے زیادہ پاس تھا۔ اور اس سلسلے کو ترقی دی بلکہ طریقت کے مقابلے میں شرع کی اہمیت و ضح کر دی۔ آپ کے کئی ارشادات ایسے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ تعلیم دینی کو تعلیم سلوک پر مقدم رکھتے تھے اور صحابہ کرام کو تمام اولیاء سے بزرگ تر مانتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ حال تابع شریعت ہے نہ شریعت تابع احوال جب آپ نے دیکھا کہ صوفیائے متقدمین کے کلام کی خلاف شرع ترجائیاں ہوتی ہیں تو اپنے مکتوبات میں تشریح اور تاویل کر کے انھیں شرع کے مطابق ثابت کیا۔ مشائخ متاخرین بعض خلاف شرع امور کو رد رکھتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ وہ لازم الاتباع نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ ایک قابل عالم، شیخ طریقت تھے، جو تاویل و تشریح سے اور مخالف شرع اقوال و احوال سے علحدگی اختیار کر کے تصوف کو احکام شرعی کی حدود میں لے آئے۔ اس سے تصوف کی بنیادیں زیادہ مستحکم ہوئیں اور طریقت و شریعت کے اختلافات بھی کم ہوئے۔

آپ نے عقیدہ وحدت الوجود کی نئی توجہ کی اور وحدت الشہود کا نظریہ قائم کر کے مسلمان صوفیاء اور علماء کے اختلافات رفع کر دیے۔ آپ خود ایک طویل مدت تک وحدت الوجود کی منزل میں سرگردان رہے تھے (ملاحظہ ہو دفتر اول مکتوب) لیکن عالم اور محتجب شرع ہونے کی وجہ سے اس اختلاف سے بھی واقف تھے، جو وحدت الوجود کی بعض ترجائیاں سے اہل شرع کو تھا۔ چنانچہ آپ نے مکتوبات میں اس گٹھنی کو سلجھایا۔ آپ کا قول ہے کہ مقام وحدت الوجود سالک کو ابتداء سلوک میں

لیکن آپ بنیادی طور پر ایک شیخ طریقت تھے۔ آپ کے ہاں "کشف و شہود" کی افراط ہے۔ اور بعض جگہ اپنے طریق کار کو علماء کے طریق کار سے جو "نظر و استدلال" پر مبنی ہے، مختلف بتایا ہے۔ (مثلاً ملاحظہ ہو دفتر دوم مکتوب ص ۴۷)

پیش آتا ہے، جس سے اسے گزر جانا چاہیے اور جو شخص اس سے بالاتر مقام پر عروج کرتا ہے، اس پر مقام وحدت الشہود منکشف ہوتا ہے، جو شرع کے عین مطابق ہے۔

شرع کی حمایت اور ترجمانی کے علاوہ آپ کا ایک بڑا کام رد بدعت تھا۔ نئے فرقوں اور نئے طریقوں سے نہ صرف دین میں رخنے پیدا ہوتے تھے بلکہ اسلامیان ہند کے اجتماعی نظام میں بھی انتشار پیدا ہوتا تھا۔ آپ نے رد بدعت کی پوری کوشش کی۔ جن نئے فرقوں سے قومی نظام میں خلل کا اندیشہ تھا۔ ان کی ہر طرح مخالفت کی۔ اس زمانے میں صفویوں کی وجہ سے شیعیت ایران میں عروج پر آئی۔ اور چونکہ ایران سے عہد مغلیہ میں گہرے روابط قائم ہو گئے تھے۔ ہندوستان میں بھی شیعہ اثرات بڑھنے لگے۔ آپ نے انھیں روکنے کے لیے زبان اور قلم سے کام لیا۔ امرا و سلاطین کی محفلوں میں اس کی مخالفت کی۔ شیعہ خیالات کی تردید میں ایک پُر زور رسالہ لکھا۔ جب کہیں شیعہ طریقوں کو فروغ پاتا دیکھتے۔ ذمہ دار حضرات کو ان کے خطرات سے آگاہ کرتے۔ مہدویت کی بھی آپ نے مخالفت کی اور تصوف میں بھی بدعتوں کے خلاف آواز اٹھائی۔

شرع کی ترویج۔ طریقہ نقشبندیہ کی اشاعت۔ شریعت اور طریقت کی تطبیق اور بدعت کی مخالفت کے علاوہ شیخ مجدد نے جو اہم کام کیا۔ وہ اسلام کا عام احیاء تھا۔ اس زمانے میں جب ایک طرف اکبر کے ”صلح کل“ طریقے نے اسلام کو اس حمایت و دین پناہی سے محروم کر دیا تھا، جو اسلامی حکومت کی ابتدا سے اسے حاصل تھی۔ اور

۱۔ آپ کے رسالہ رد و رافض کا جو نسخہ خانقاہ سراجیہ کنڈیاں شریف میں ہے، اس میں امیر خسرو کی متعدد ابیات بدیع مضمون نقل کی ہیں (۱۲) کہ ہندوستان میں اسلام کو رونق اور کجیتی حاصل ہے اور لکھا ہے کہ تمام کسان آں اراہل اسلام بر عقیدہ حقہ اہل سنت و جماعت اند۔ و نشانے اراہل بدعت و ضلالت دلائ دیار پیدا نیست۔ لیکن اب شیعوں کی آمد سے یہ فضیلت دیکھتی جاتی رہی ہے۔

دوسری طرف ہندو اچائییت نے مسلمانوں کے لیے (جیسا کہ ہم تفصیل سے آگے چل کر بتائیں گے) طرح طرح کی مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ آپ نے شعائر اسلام کے احترام پر زور دیا۔ امرا و اراکین سلطنت کو اس کی تلقین کی۔ خود اپنی زندگی میں اسلامی نقطہ نظر کے احترام کی بڑی جرات مندانہ مثال قائم کی۔ آپ نے جہانگیر کے سامنے سجدہ نہ کر کے قید و بند کی سختیاں جھیلیں اور اپنی جرات اور احترام دین سے خلاف شرع احکام کی عملی مخالفت کی۔ آپ کی اس نیک مثال نے لوگوں کو جرات دلائی جو دے بیٹھے تھے وہ دلیر ہو گئے۔ حکمران طبقے میں جو اسلام پسند گروہ تھا، اسے تقویت ملی۔ اور جو غیر اسلامی آداب و رسوم دربار شاہی میں عجمی ملوکیت کی تقلید میں یا ہندو اثرات کی وجہ سے رائج ہو گئی تھیں، ان کے ازالے کا سامان ہوا۔ اور شعائر اسلامی کے احترام کا پھر سے خیال کیا جانے لگا۔

حضرت مجدد نے خود احیاء اسلام کی کوشش کی اور اس کے علاوہ ایک ایسا وسیع نظام قائم کر دیا۔ جس سے آپ کے مقاصد کی تکمیل ہوئی۔ آپ کے صدرا خلفائے جو ہندوستان کے کونے کونے میں، بلکہ ہندوستان سے باہر بھی آپ کے خیالات کی اشاعت کر رہے تھے۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند ان ارجمند نے آپ کا کام جاری رکھا۔ آج بھی آپ کے سلسلے کا فیض جاری ہے اور نقشبندیہ مجددیہ سلسلے میں

۱۔ مجددی تذکرہ نگاروں کا یہ خیال، کہ جہانگیر حضرت کامریہ ہو گیا تھا اور ان نے آپ کے حسب حکم تمام شرعی احکام جاری کرائے قابل قبول نہیں شیخ مجدد کے ان مکتوبات سے جو آخری سالوں میں لکھے گئے، یہ خیال ہوتا ہے کہ آپ اس زمانے کے حالات سے بھی بالواسطہ تھے اور شاید سمجھتے تھے کہ ظہور قیامت کا زمانہ قریب ہے۔ ایک خط میں صاحبزادگان کو لکھتے ہیں: "قیامت قریب ہے اور ظلمتوں کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ کہاں خیریت اور کہاں نورانیت۔ شاید حضرت ہدی علیہ الصلوٰۃ خلاف ظاہری کی تائید یا کراس کو رواج دیں گے۔" (دفتر سوم مکتوب ۱۱۱) اسی زمانے کا ایک اور خط ہے: "یہی باعث ہے کہ ہزار سال کے بعد اندھیرا غالب آ گیا ہے اور سنت و انہام کا نور مایہ گیا ہے" (دفتر سوم مکتوب ۹۹)

اتباع شریعت اور ترویج سنت کا جوش دوسرے سلسلوں سے زیادہ ہے۔
 نقشبندیہ (مجددیہ) سلسلہ کے کامیاب طریقہ اشاعت اور اس سلسلے کے مشائخ
 کبیر کے خلفاء کی کثرت کا ایک مبارک نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے سارے حصوں میں اہل ذوق
 اس سے متسلک ہو گئے اور ایک روحانی یکسانیت اور تنظیم کے آثار نمایاں ہوئے۔
 نظامی سلسلے کی اشاعت کے بعد (شطاری سلسلے کو چھوڑ کر جس نے قوم کے مرکزی روحانی
 نظام میں جگہ حاصل نہ کی) یہ غالباً پہلا موقعہ تھا کہ سارے ملک میں ایک روحانی نظام
 نے اقتدار حاصل کر لیا۔ بنگال میں حضرت مجدد الف ثانی کے محبوب خلیفہ شیخ حمید
 دانشمند بنگالی ارشاد و ہدایت کے بڑے مرکز تھے۔ سندھ میں ان کے پوتے شیخ
 سیف الدین کے ایک خلیفہ مخدوم ابوالقاسم نے اس طریقے کی اشاعت کی اور
 ان کی کوششوں کو خدا نے اس طرح مقبولیت دی کہ اب اس علاقے میں یہ سلسلہ
 اگر سروردی اور قادری سلسلوں پر غالب نہیں تو ان سے کسی طرح پیچھے بھی نہیں۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دوسرے سلسلے اتباع شریعت سے عاری تھے۔ یا ان کی جو
 خاص خوبیاں تھیں ان کی روحانی اور اخلاقی سر بلندی کے لیے ضرورت نہ تھی۔ بلکہ ایسا اوقات تو خیال ہوتا
 ہے کہ اگرچہ بعض دوسرے سلسلوں (مثلاً چشتیہ) میں غلو اور شرعی کی پابندی پر اتنا زور نہیں لیکن ان کی مستند
 کتابیں پڑھیں تو جتنا زور باطنی اصلاح اور اخلاقی پاکیزگی پر ان میں نظر آتا ہے سلسلہ مجددیہ کی کتابوں میں
 نہیں ملتا۔ مثلاً اگرچہ فوائد القواد میں وہ معارف عالیہ اور علمی مسائل نہیں جو طریقہ مجددیہ کے شاہکاروں میں
 ہیں لیکن اخلاقی پاکیزگی اور سر بلندی پر جو جگہ جگہ زور دیا گیا ہے (خواہ وہ حضرت بانیر بد بطنی کے یہودی
 دور کے بیانات کو دہرا کر ہو۔ یا لاہور کی تباہی کو وہاں کے تاجروں کے ضعف دیانت سے متعلق کر کے وغیرہ)
 مجددیہ سلسلے کی کتابوں میں (اس موثر انداز سے اور اس تکرار کے ساتھ) شاید ہی ملے اور قومی اور
 انفرادی بلندی کے لیے اس کی بھی بڑی ضرورت ہے، بلکہ حاصل سلوک تہذیب الاخلاق کی اصل
 تشریح ہے۔ اس سندھ میں پرنے والا سلسلہ ہی دو تھے۔ چشتیہ سلسلے کو سندھ میں کبھی فروغ
 نہیں ہوا۔ (مکملہ مقالات الشعراء ص ۱۸۴)

مخدوم صاحب کو مرشد نے نور الحق کا خطاب دیا تھا، لیکن چونکہ اس سلسلے میں نقشبندی سلسلے کی اصل اشاعت انھوں نے کی اس لیے سندھ میں انھیں حضرت نقشبندی صاحب کہا جاتا ہے۔ ان سے پہلے مخدوم آدم صاحب بھی نقشبندی سلسلے میں منسلک تھے اور مخدوم ابوالقاسم نے سرسبز جانے سے پہلے ان سے کسب فیض بھی کیا، لیکن مخدوم آدم سے سلسلہ بہت چلا نہیں اور مخدوم ابوالقاسم کے پاس تو لوگ ٹھٹ کے ٹھٹ آنے لگے۔ اور نقشبندیہ سلسلہ نے اس ملک میں جڑ پکڑ لی۔ آپ عقیدتمندوں میں سورت اور دوسرے علاقوں کے لوگ بھی تھے، لیکن آپ کا اصل کام سندھ میں نقشبندیہ سلسلے کی اشاعت ہے۔ آپ کے ماننے والوں میں ”حضرت عمدة العلماء الربانی وقدرہ المفسرین والمحدثین مخدوم محمد معین“ سندھی ہیں جنھوں نے شاہ ولی اللہ سے درس حدیث حاصل کیا، بلکہ کلمہ مقالات الشعرا میں مخدوم خلیل تنوی نقشبندی لکھتے ہیں کہ جب مخدوم محمد معین نے مخدوم ابوالقاسم کی تعریف میں رسالہ لکھنا چاہا تو انھوں نے اجازت نہ دی۔ مخدوم ابوالقاسم کی وفات ۱۲۶۷ھ میں ہوئی۔

سابق پنجاب اور افغان علاقے میں تو مجددی سلسلہ کو اس سے بھی بڑھ کر فروغ ہوا۔ اس کا زور دار آغاز حضرت مجدد کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا، لیکن آپ کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم اور خلیفہ شیخ آدم بنوری نے کام کو بڑی وسعت دی۔ جنوب میں برہان پور مجددیہ نقشبندیہ طریقے کا ایک بڑا مرکز تھا، جس کی سربراہی میر محمد نعمان اور خواجہ ہاشم کشمی جیسے بزرگوں نے کی۔ غرضیکہ تمام ملک میں ایک منظم طریقے سے سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ بچایا ہوا تھا۔

جو اثرات حضرت مجدد الف ثانی کی بدولت اسلامی ہندوستان میں عام ہوئے، انھی کا فیض یہاں کی سرحدوں سے گزر کر باقی عالم اسلام کو پہنچا۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کے قدیمی خلیفہ تاج الدین سلجلی نقشبندیہ طریقہ لے کر حجاز پہنچے اور وہاں کثرت سے اس سلسلے کی اشاعت کی، لیکن شیخ تاج الدین کا طریقہ تھا

نقشبندیہ باقویہ۔ اس میں جمالی رنگ زیادہ نمایاں تھا۔ اور اصل زور تزکیہ نفس اور اصلاح حال پر تھا۔ سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں جلالی شان غالب تھی۔ اس کا طریق کار احیائی تھا۔ اس کی اشاعت کا ایک اہم ذریعہ مکتوبات امام ربانی تھے، جن کا جلد ہی عربی میں ترجمہ ہو گیا۔ اور دوسرا ذریعہ خلفا و مرید۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی سبقتہ المرحان میں حضرت مجدد کی نسبت لکھتے ہیں: ”سلسلہ ان کا ہند سے ماوراء النہر اور روم، شام و عرب تک پہنچا۔ تصنیفات میں ان کی مکتوبات تین جلدوں میں ہیں.... میں نے سنا ہے کہ بعض علماء نے ان کے مکتوبات کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ اگرچہ میں نے یہ عربی ترجمہ نہیں دیکھا۔“ حضرت خواجہ باقی باللہ خود کابل کے رہنے والے تھے اور انھوں نے تعلیم ماوراء النہر میں پائی تھی۔ اس لیے ان کے خلیفہ اعظم کے طریق کار کی افغانستان اور ترکستان میں اشاعت قدرتی تھی۔ چنانچہ ان کے ماننے والے ان علاقوں میں بہت ہیں۔ مثلاً موجودہ افغانستان کے سب سے بڑے روحانی بزرگ حضرت نور المشائخ اسی سلسلے سے متعلق ہیں۔ حجاز اور خلافت عثمانیہ میں اس سلسلے کی اشاعت کو حضرت مجدد کے صاحبزادے خواجہ محمد مصحوم کے سفر حج سے بہت تقویت حاصل ہوئی ہوگی۔ لیکن خلافت عثمانیہ میں طریقہ مجددیہ کی سب سے وسیع اشاعت انیسویں صدی میں ہوئی۔ جب حضرت خالد کردیؒ نے دہلی میں ایک سال رہ کر شاہ غلام علی قدس سرہ سے یہ طریقہ اخذ کیا۔ اور واپس جا کر عراق، شام، اناطولیہ میں اس کی بڑے زور اور کامیابی سے اشاعت کی حضرت خالد کردیؒ خلافت عثمانیہ کے آخری دور کے بہت بڑے بزرگ تھے اور انھوں نے (اہل شرع کی مدد سے) طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کو سلطنت کا سب سے بااثر صوفی طریقہ بنادیا۔ خاص طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کی اشاعت کے علاوہ حضرت مجدد کی تعلیمات عام ہونے کا ایک بڑا نتیجہ احیائی اور شرعی رنگ کا غلبہ تھا جو آہستہ آہستہ عالم اسلام میں ظاہر ہوا۔ اس میں متعدد اثرات کو دخل تھا اور ابھی اس مسئلے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے، لیکن بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ احیائی رنگ کی مقبولیت اور وہابی

تحریک کے لیے مختلف اسلامی علاقوں میں زمین کو ہموار کرنے میں شیخ احمد سرہندی کی تجدیدی تحریک کا بڑا دخل تھا۔

صوفیانہ احوال اور نظریہ قیومیت | حضرت مجدد الف ثانی کی مذہبی خدمت

مکتہ چینیوں کی بھی کمی نہیں اور ان میں بڑے بڑے متقی پرہیزگار اور قابل عزت بزرگ شامل ہیں۔ ان کی اپنی زندگی ہی میں مکتوبات کی وجہ سے علماء نے ان کے خلاف جہانگیر کے پاس شکایت کی تھی اور ان کے معترضوں میں شیخ عبدالحق محدث جیسے فاضل اور دیندار بزرگ تھے، لیکن یہ سلسلہ اس پر ختم نہیں ہوا۔ ان کے بعد بھی کئی اور بزرگوں نے مکتوبات کے اندراجات اور مجددی بزرگوں کے دعاوی پر اعتراض کیے ہیں اور حضرت مجدد کے مشہور عقیدوں نے ان اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ مرزا مظہر جانجاناں کے کئی خطوط ان شبہات کے ازالہ کے لیے لکھے گئے۔ اور شاہ ولی اللہ کا ایک اہم خط بھی جو انھوں نے اپنے ایک عزیز ارادتمند خواجہ محمد امین کی تشفی کے لیے لکھا۔ اسی مسئلے کے متعلق ہے۔

صوفیہ کے اختلاف تو ایک حد تک حضرت سرہندی کے نظریہ وحدت الشہود

۱۔ مکتوبات کے بعض اندراجات پر عہد عالمگیری میں بھی اعتراض ہوئے تھے، بلکہ عالمگیری کی طرف سے بعض ایسے خط حضرت قیوم ثالث وغیرہ کو لکھے گئے جن میں مجددی حضرات جعلی بتاتے تھے اور جن میں لکھا تھا کہ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کی بعض عبارتیں بظاہر خلاف شرع ہیں اور تمام علماء نے متفق ہو کر اس بات کا فتوے دیا ہے کہ مکتوبات کا پڑھنا بند کر دیا جائے۔ چنانچہ عہد عالمگیری میں علماء کا ایک محضر بھی بلایا گیا جس میں مکتوبات پر بحث ہوئی۔ (روضۃ الشیومہ رکن سوم صفحہ ۷۳-۷۴) خارج الولايات میں قاضی شیخ الاسلام کا وہ مراسلہ درج ہے۔ جس میں اورنگ زیب کے حسب الحکم مکتوبات کا پڑھنا بند کر دیا گیا تھا۔ اس لیے یہ خط جعلی نہ تھے۔ لیکن عالمگیری اس بعد بھی سلسلہ مجددیہ کا بڑا مقلد نظر آتا ہے۔ جیسا کہ خواجہ نعشبند ثانی کے خطوط سے ظاہر ہے۔

کی وجہ سے ہے، جس کی مدد سے آپ نے ابن العربی کے نظریہ وحدت الوجود کو اسلامی عقائد سے تطبیق دینے کی کوشش کی۔ لیکن علما کو زیادہ اعتراض ان دعویٰ پر ہے جو آپ کے بعض واقعات اور احوال سے اخذ ہوتے ہیں۔ ہم مکتوب یازدہم کی اس عبارت کو نقل کر چکے ہیں۔ جس کی بنا پر عہدِ جہانگیری میں شور و غوغا بلند ہوا تھا اور جس کی تشریح و توضیح حضرت سرسندی نے کئی جگہ کی ہے، لیکن محترضین اس عبارت کے علاوہ اور بھی کئی اندراجات کی شکایت کرتے ہیں۔ خواجہ محمد امین نے مکتوبات کی اس عبارت کی توضیح چاہی تھی، جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ (استغفر اللہ) رسول اکرمؐ اپنی وفات سے ایک ہزار سال بعد ایک فردِ اقامت (حضرت مجددؑ) کی وجہ سے مقامِ خلیلی سے مستجاب ہوئے۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں :-

”برادر عزیز القدر خواجہ محمد امین اگر مہ تعالیٰ بشہودہ سوال کردہ بودند کہ حضرت شیخ مجدد قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز در مکتوب نود و چہارم از جلد ثالث و غیر آن نیز تصریح کردہ اندہ بانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را بعد ہزار سال بواسطہ بعض افراد اقامت مقامِ خلت حاصل شد و دعائے اللہ وصل علی محمدؐ کما صلیت علی ابراہیمؑ مستجاب گشت۔ و بشارہ مفہوم میگردد کہ مراد از ان فرد ذاتِ حضرت مجدد است و اس مقدمہ بظاہر مورد اشکالات کثیرہ است۔ ازاں جملہ آنکہ توسط فرد سے از افراد اقامت در حصول مقامِ خلت کہ از اعلیٰ مقامات است مستلزم فضلِ او بر ذاتِ حضرت خاتم الانبیاء است علیہ الصلوٰۃ و التسلیمات۔“

حضرت مجددؑ نے اس خیال کا اظہار تیسری جلد میں ہی نہیں، بلکہ دوسری جلد کے چھٹے مکتوب میں بھی کیا تھا اور ان کی زندگی میں ہی پڑھنے والوں کو عجیب معلوم ہوا تھا۔ ان کے مشہور خلیفہ اور سوانح نگار علامہ کشمیری نے اس کی توضیح چاہی تھی اور اسی جلد کے ستائویں مکتوب میں حضرت مجددؑ نے جواب لکھا تھا۔ آپ نے پوچھا تھا کہ اس عبارت کے کیا معنی ہیں، جو چھٹے مکتوب میں واقع ہے کہ میں خیال کرتا ہوں کہ

میری پیدائش سے مقصود یہ ہے کہ ولایت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ولایت ابراہیمی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے رنگ میں رنگی جائے اور ولایت محمدی کا حسن ملاحیت ولایت ابراہیمی کے جمالی صباحت کے ساتھ مل جائے اور اس انصباغ اور امتزاج سے محبوبیت محمدیہ کا مقام درجہ بلند تک پہنچ جائے۔ اپنے دعوے کے جواز میں حضرت مجدد نے کہا تھا "وہ انتفاع و استفادہ جو صاحب دولتوں کو غلاموں اور خادموں کی جہت سے طیسر ہوتا ہے۔ کوئی ممنوع و محذور نہیں اور نہ ہی اس میں ان کا کسی قسم کا تصور و نقصان ہے بلکہ صاحب دولتوں کا کمال غلاموں اور خادموں کی خدمت ہی میں ہے۔"

شاہ ولی اللہ نے زیادہ ملائم اور قابل فہم طریقے سے اس کی تاویل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں غرض شیخ اثبات اصل خلت است آنحضرت راضی اللہ علیہ وسلم در اول امر بغیر تشریح و اثبات خود در فیضان خلت بر بنی آدم بائی معنی کہ بتوسط او بعد ہزار سال مردماں آیتہ از ازل خلت یافتند۔

اس طرح کے کسی اندراجات حضرت مجدد کی تصانیف اور سوانح میں ملتے ہیں جنہیں بغیر تشریح و تاویل کے قبول کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اور جن کی نسبت خود انھوں نے کہا "مخدوما۔ ہر کہ اس قسم سخناں نوشتہ است۔ منشاء آن سکر است۔ و بے مزج سکر وریں باب دست بقلم نہیروہ۔"

واقعہ یہ ہے کہ صوفیوں کے احوال و مقامات کا عجیب معاملہ ہے۔ یہ بزرگ صبح و شام اُن خیالات میں مستغرق رہتے ہیں۔ جن سے عوام کو برائے نام دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ غذا فقط اتنی کھاتے ہیں جس سے جان سلامت رہے۔ زیادہ وقت تنہائی و خلوت اور ذکر و فکر میں گزرتا ہے۔ مراقبے اور دوسرے اشغال اتنے سخت ہوتے کہ دل و دماغ پر ایک خاص رنگ غالب آجاتا ہے۔ نفسیات کا اصول ہے کہ جو دھن سر پر سوار ہو، وہی عالم خواب یا عالم انجذاب میں نظر آجاتی ہے۔ چنانچہ انھیں بھی جذب و بے خودی یا واقعات کے عالم میں ایسی ایسی باتیں نظر آتی ہیں کہ عوام جن کی

دنیا ہی ان سے مختلف ہوتی ہے، سمجھ نہیں سکتے اور محض ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے انکار کرنا، جب تک کہ صاحبِ احوال ہی اس انکار کا مستحق ہو صحیح نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ تمام محتاط صوفیہ ان احوال کو، جو شرع اور عقل کے موافق نہ ہوں اور جن کی مناسب تاویل نہ ہو سکے، فاسد سمجھتے ہیں۔ مُرشد کو ان احوال کا من و عن بتانا ضروری ہے تاکہ وہ اس بات سے واقف رہے کہ مرید کے دل و دماغ پر کونسا رنگ غالب ہے اور اس کے تحت الشعور کا کیا حال ہے، لیکن اس سے زیادہ ان کی اہمیت نہیں۔ حضرت مجدد بھی اس بُنکے سے خوب واقف تھے اور انھوں نے کئی خطوط میں ان احوال پر بھر دسارہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ ایک خط (جلد اول شمارہ ۲۰۷) میں مرزا حاتم الدین کو لکھتے ہیں :-

صوفیوں کی بیہودہ باتوں سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ اور ان کے احوال سے کیا بڑھتا ہے ”وہاں“ وجد و حال جب تک شرع کی میزان پر نہ تولیں نیم جیل سے نہیں خریدتے اور کشف اور الہاموں کو جب تک کتاب و سنت کی کسوٹی پر نہ پرکھ لیں۔ نیم جو کے برابر پسند نہیں کرتے۔“

شیخ حمید بنگالی کے نام ایک خط (جلد اول ۲۲۱) میں تفصیل سے ان غلط فہمیوں کی تشریح و اصلاح کی کوشش کی ہے جو مقاماتِ عروج میں اپنی فضیلت کے متعلق پیدا ہو جاتی ہیں، اس میں اپنی نسبت لکھتے ہیں کہ میں ”توبہ و استغفار و انابت سے التجا کرتا تھا اور عاجزی و زاری سے دعا کرتا تھا کہ اس قسم کے کشف ظاہر نہ ہوں اور اہل سنت و جماعت کے معتقدات کے خلاف سرِ مو منکشف نہ ہو“ حضرت مجدد اس بُنکے کو خوب سمجھتے تھے۔ کہ اگر احوال اور غیر معمولی نفسیاتی مشاہدات کو اہمیت دی جائے تو چونکہ ہر ایک انسان کے مشاہدات مختلف ہوتے ہیں، اس لیے ہر ایک اپنے ہی مشاہدات کو حق مانے گا اور شرع و سنت کی پیروی کی ضرورت نہ سمجھے گا، جس سے روحانی اور مذہبی معاملات میں بڑی بد نظمی پیدا ہوگی۔ اس کی ایک دلچسپ مثال ان کے اپنے مکتوبات میں ہی ملتی ہے (جلد اول شمارہ ۲۷۳) ان کے نامور خلیفہ میر محمد نعمان اور

بعض دوسرے بزرگوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ رسول اکرم مجلس مولود خوانی کے انعقاد سے خوش ہیں۔ چنانچہ وہ انھیں ترک کرنا نہ چاہتے تھے۔ حضرت مجدد اس باب سے میں مرزا حسام الدین احمد کو لکھتے ہیں:-

”آپ نے لکھا تھا کہ اگر سماع کے منع ہونے کا مبالغہ مولود کے منع ہونے کو بھی شامل ہے جو نعتیہ قصیدوں اور غیر نعتیہ شعروں کے پڑھنے سے مراد ہے تو برادر عزیز میر محمد نعمان اور بعض اس جگہ کے یار جنھوں نے واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ اس مجلس مولود خوانی سے بہت خوش ہیں۔ ان پر مولود کا سننا اور ترک کرنا بہت مشکل ہے۔

میرے مخدوم! اگر واقعات کا کچھ اعتبار ہوتا اور منامات اور خوابوں کا کچھ بھروسا ہوتا تو مریدوں کو پیروں کی حاجت نہ رہتی۔ اور طریق میں سے کسی ایک طریقے کا لازم پکڑنا عبث معلوم ہوتا کیونکہ ہر ایک مرید اپنے واقعات کے موافق عمل کر لیتا اور اپنی خوابوں کے مطابق زندگی بسر کر لیتا.... اس طرح سلسلہ پیری و مریدی ہم پر ہم ہو جاتا اور ہر لوہوس اپنی وضع پر مستقل اور برقرار ہو جاتا۔“

یہ خیال کرنے کی قطعاً کوئی وجہ نہیں کہ جن احوال و مقامات کا ذکر حضرت مجدد کے مکتوبات میں ہے وہ انھیں پیش نہ آئے تھے، جو شخص ٹھنڈے دل سے ان کی تصانیف اور حالات پر نظر کرے گا، وہ ان کی بزرگی، علم و فضل اور صاف گوئی کا قائل ہو جائے گا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان مقامات کو بڑی اہمیت نہیں دی جاسکتی اور نہ ہی ان کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ ان میں غلطی کا امکان نہ تھا (شیخ عبدالحق محدثؒ نے تو بعض کا شرع اور سلوک کی رو سے انکار کر کے یہاں تک لکھا ہے ”ظاہر آن است کہ شہاد غا خورده اید“) لیکن اس سے اس مقام میں کمی نہیں ہوتی۔ جو حضرت مجددؒ کو ہماری روحانی، دینی اور سیاسی تاریخ میں حاصل ہے۔ ان کی بزرگی ان کے کاموں میں، ان کی تعلیمات میں، ان کے کردار میں اور ان کی بلند پایہ تصانیف میں ہے۔ ان

مقامات اور احوال میں نہیں، جن پر وہ خود اعتماد نہ کرتے تھے اور اعتماد نہ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ ان کے عقیدت مندوں نے بالعموم یہ نکتہ نہیں سمجھا۔ ان کی تعلیمات کو ترتیب دے کر پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں ہوئی۔ ان کے حالات زندگی ہی صحیح طور پر مرتب نہیں ہوئے۔ زیادہ تو تجربہ ان کے مقامات و احوال پر رہی ہے۔ اور خود بھی ماشاء اللہ مجددیوں نے اپنی طرف سے ایسے واقعات کا اشتہار دیا ہے کہ عقل حیران ہوتی ہے اور خیال آتا ہے کہ اگر ان بزرگوں نے پُرانے صوفیوں کی بعض غلطیوں کی اصلاح کی ہے تو کیا انھوں نے مبتدیلوں اور خوش اعتقادوں کو الجھانے کا اس سے زیادہ سامان تو نہیں پیدا کر دیا!

احوال و مقامات پر بھروسہ رکھنے سے انسان جن خام خیالیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس کا اندازہ اس خط سے ہو سکتا ہے جو حضرت مجدد کے جانشین خواجہ محمد معصومؒ نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے والد کے ایک مشہور خلیفہ شیخ آدم بنوریؒ کی نسبت لکھا۔ بعض نامکمل اولاد دھورے سالک اپنے خواب اور واقعات پر گمان کر کے اکابر دین کی برابری کرتے ہیں، لیکن برابری کہاں۔ ان سے برابری کی خواہش ایک خیال محال ہے جو محض نادانی اور خام خیالی ہے۔ بہت سے نادان از روئے جہل مرتب اپنے واقعات پر بھروسہ کر کے خیالات فاسدہ میں خود بھی مبتلا ہیں اور اوروں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ گمراہ ہیں۔ انھوں نے ضائع کیا کھویا اور گنوا یا۔ اصل تو درکنار ابھی شاخ کے خیال تک کو نہیں پہنچے۔ محض خواب میں ہیں۔ ان کی مثال چوہے کی سی ہے جو بھڑکی کی گانٹھ پر پینساری بن بیٹھا ہے۔

قیومیت کا نظریہ جس کے متعلق مکتوباتِ امام ربانیؒ میں کوئی واضح اندراج نہیں نہیں ملا، لیکن جسے حضرت مجدد کے بعض عقیدتمندوں نے بڑی تفصیل سے مدقن کیا ہے۔ اسی ذہنیت کا ایک کرشمہ تھا۔ قیوم کون ہوتا ہے؟

”قیوم اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کے ماتحت تمام اسماء و صفات شیونات اعتبارات اور اصول ہوں اور تمام گزشتہ و آئندہ مخلوقات کے عالم موجودات انسان - وحوش - پرند - نبات - ہر فی روح - پتھر - درخت - بحر و بر کی ہر شے - عرش - کرسی - لوح - قلم - ستارہ - ثوابت - سورج - چاند - آسمان - بروج سب اس کے سائے میں ہوں - افلاک و بروج کی حرکت و سکون - سمندروں کی لہروں کی حرکت درختوں کے پتوں کا ہلنا - بارش کے قطروں کا گرنا - پھلوں کا پکنا - پرندوں کا چونچ بھیلانا - دن رات کا پیدا ہونا اور گردش کفہ آسمان کی موافق یا ناموافق رفتار - سب کچھ اسی کے حکم سے ہوتا ہے - بارش کا ایک قطرہ ایسا نہیں جو اس کی اطلاع کے بغیر گرتا ہو - زمین پر حرکت و سکون اس کی مرضی کے بغیر نہیں - جو آرام و خوشی اور بے چینی اور رنج اہل زمین کو ہوتا ہے اس کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا - کوئی گھڑی کوئی دن کوئی ہفتہ کوئی مہینہ کوئی سال ایسا نہیں جو اس کے حکم کے بغیر اپنے آپ میں نیکی بدی کا تصرف کر سکے - غلہ کی پیدائش - نباتات کا اُگنا - غرض جو کچھ بھی خیال میں آسکتا ہے وہ اس کی مرضی اور حکم کے بغیر ظہور میں نہیں آتا -

روئے زمین پر جس قدر زاہد، عابد، ابرار اور مقرب، تسبیح، ذکر، فکر، تقدیس اور ترویہ میں عبادت گاہوں، جھونپڑوں، کٹیوں، بہار اور دریا کے کنارے، زبان قلب، نوح، سرخشی، اخفی اور نفسی سے شافل اور محکف ہیں اور حق تعالیٰ کی راہ میں مشغول ہیں - سب اسی کی مرضی سے مشغول ہیں - گواہیں اس بات کا علم نہ ہو - اور جب تک ان کی عبادت قیوم کے ہاں قبول نہ ہو، اللہ تعالیٰ کماں قبول نہیں ہوتی - (روضۃ القبریہ جلد اول ص ۹۴)

حضرات مجددیہ چار بزرگوں کی قیومیت کے قائل ہیں - قیوم اول حضرت مجدد الف ثانی - قیوم ثانی خواجہ محمد معصوم - قیوم ثالث خواجہ محمد نقشبند - قیوم رابع خواجہ محمد زبیر اور ان کے بعد بھی بعض بزرگوں (مثلاً شاہ ابوسعید) کے حالات میں تفویض قیومیت کا ذکر ملتا ہے - لیکن عجیب بات ہے کہ باوجودیکہ قیوم کو صفات نبوی سے نہیں صفات الہیہ

سے متصف کیا جاتا ہے۔ کوئی آیت، کوئی حدیث اس نظریے کی قطعی تائید میں پیش نہیں کی جاتی۔ عقل اس بات کو قبول نہیں کرتی، لیکن کشف اور صوفیانہ احوال کے زور پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے اور عقیدت مندان لیتے ہیں۔

حاکمی نے کیا خوب کہا ہے ۷

کرے غیر گریب کی پوجا تو کافر جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
کے آگ کو اپنا قبلہ تو کافر کو اکب میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں

پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں

مزاروں پہ دن رات نندیں چھائیں شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں

نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے

نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جالے

استدراک

رود کوثر کی تیسری اشاعت کے بعد مجددی سلسلہ کے دو فاضل بزرگوں نے قیومیت کے موضوع پر اظہار خیال کیا ہے، جس سے اس مسئلہ کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب جنھیں ہمارے مندرجہ بالا اظہار خیال سے شدید اختلاف ہے۔ تحریر فرماتے ہیں :-

”قیومیت“ مقامات عروج سے متعلق ہے۔ اور سلسلہ عالیہ نقشبندیہ جو حضرت خواجہ

باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے تک لطائف سبعہ، نفی اثبات، تحلیل سانی، مراقبہ

احدیث، پھر مراقبات، مشارب اور مراقبہ منعیہ تک محدود تھا وہ حضرت مجدد درجہ

اللہ علیہ کی برکت سے ولایت کبریٰ، مراقبات کمالات نبوت و رسالت و اولوالعزم،

مراقبہ حقیقت کعبہ، حقیقت قرآن، حقیقت صلوٰۃ، معبودیت صرفہ، حقیقت

ابراہیمی حقیقت موسوی حقیقت محمدی حقیقت احمدی حُب صرفہ اور لا تعین کے مقامات تک وابستہ ہو گیا ہے۔ یہ چیزیں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے طفیل میں اُن کے وابستگان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ امدان کے متعلق کسی نظریاتی بحث و تمحیص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ ان چیزوں کا ذکر بھی اس مضمون میں نہیں ہونا چاہیے۔

محترمی ڈاکٹر صاحب کا اپنا اندازِ خیال تو مندرجہ بالا اندراج سے ظاہر ہے، لیکن شاید ان سطور کے لکھنے کے بعد انھیں احساس ہوا کہ مسئلہ قومیت پر نظریاتی بحث و تمحیص اتنی غیر ضروری نہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس موضوع کی وضاحت کے لیے حضرت مولانا زید ابوالحسن فاروقی مدظلہ کو زحمت دی۔ جو نہ صرف دہلی کی مشہور تاریخی خانقاہ (خانقاہ شاہ غلام علی) کے سجادہ نشین ہیں۔ بلکہ بھارت کے اہل علم میں بھی ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس مسئلے پر ایک مفصل مدلل اور منصفانہ مضمون لکھا۔ جسے محترمی ڈاکٹر صاحب نے اپنے رسالے کے ساتھ بطور ضمیمہ کے شائع کر دیا۔

مولانا زید صاحب کے مضمون کا لب لباب یہ ہے کہ قومیت ولایت کا ایک بلند مرتبہ ہے۔ ”ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہوئی۔ اور ضرورت پیدا ہوئی کہ مراتبِ عالیہ کا علاحدہ علاحدہ ظہور ہو۔ چنانچہ جب بھی جس عہدہ کے ظہور کا وقت آیا وہ عہدہ ظاہر ہوا۔ یعنی قلب، غوث وغیرہ اور قومیت کا ظہور حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرسندی قدس اللہ سرہ السامی کی مبارک ذات سے ہوا۔“ محترم مضمون نگار نے جن تفصیلی دلائل سے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے اُن سب کو یہاں دہرانا مشکل ہے، لیکن انھوں نے اس مضمون میں روضۃ القیومیہ اور بالخصوص اس اندراج پر جو ہم اوپر درج کر چکے، سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اسے نقل کرنا غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کتاب کی عمومی صحت

لہذا اب اسے خانقاہ منظرہ کہتے ہیں لیکن یہ وہی بابرک مقام ہے جو تاریخ میں خانقاہ شاہ غلام علی یا صرف خانقاہ کے نام سے معروف ہے۔

متعلق وہ لکھتے ہیں :-

”مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب روضۃ قیومیہ کا ذکر کر دیا جائے۔ کیونکہ قیومیت کے سلسلے میں بعض افراد اس کتاب کی عبارت سے متحیرہ گئے ہیں۔ اور ان کا متحیر ہونا اپنی جگہ صحیح ہے۔ یہ کتاب جناب محمد احسان مجددی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔ یہ حضرت خواجہ محمد زہیر کے خلیفہ تھے۔ اور وہ اپنے دادا حضرت خواجہ محمد نقشبند حجتہ اللہ کے اور وہ اپنے پدر بزرگوار حضرت خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہم کے۔ ان کو اپنے پیرو مرشد سے کامل عقیدت تھی۔ دقایق علمیہ سے پوری طرح باخبر تھے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں قدس اللہ سرہ نے ان کو ایک خط لکھا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں۔ ”آپچہ از احوال شہود نوشتہ اند کہ ہر فردہ ظہور ذات اللہ تعالیٰ و تقدس معلوم می شود۔ و این را توحید متعارف دانستہ اند غلط است۔“ روضۃ قیومیہ میں بھی ان سے لغزشیں ہوئی ہیں۔ بعض واقعات بھی صرف از وجہ سماع قلمبند کر دیے ہیں، حالانکہ وہ صحیح نہیں ہیں۔ بنا بریں حضرات عالی قدر نے اس کتاب کو قابل اعتنا نہیں سمجھا ہے۔ قیومیت کے سلسلے میں ان کا مسلک جادہ صواب سے ہٹا ہوا ہے۔ اس کے بعد قیوم کے متعلق روضۃ القیومیہ کی اس عبارت سے جسے ہم نے اوپر نقل کیا ہے کچھ اقتباس دے کر مولانا زید صاحب فرماتے ہیں :-

محمد احسان صاحب بموجب اس اردو ترجمہ کے جو پیش نظر ہے، نہ حضرت عالی قدر کے کلام کو سمجھ میں آیا اور نہ قیوم کے مرتبہ کو۔ انھوں نے اسماء، صفات، شہونات، اصول اور تمام گزشتہ اور آئندہ مخلوقات کے متعلق لکھ دیا کہ سب اس کے سایے میں ہوں۔ العبادۃ باللہ من ہذا القول الفاسد۔ بھلا اسماء باری تعالیٰ اور اس کی صفات و شہونات کس کے سایہ میں آسکتے ہیں۔ اصل کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ انبیاء اور ملائکہ کے لیے تجلی صفات اسل ہے۔ باقی افراد کوئی کے لیے تجلی صفات کا ظل اصل ہے۔ بھلا تجلیات صفات یا ظلال تجلیات صفات پر کون حاوی ہو سکتا ہے۔ استغفر اللہ۔ اور لکھا ہے تمام گزشتہ اور آئندہ مخلوقات الہز

یہ اللہ کے بندے انسانہ سمجھے کہ تمام گزشتہ مخلوقات میں صحابہ کرام انبیاء عظام ملائکہ
 عالی مقام اور سردار دو جہاں محبوب کبریا جناب محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ السلام
 جمیع انبیاء و الملائکہ و جمیع عباد اللہ الصالحین و بارک وسلم بھی شامل ہیں۔ حالانکہ بڑے
 سے بڑا ولی بھی صلی رضوان اللہ علیہم کے خاک پا کی برابری نہیں کر سکتا چہ جائیکہ
 انبیاء علیہم السلام (کی)

ہم نے سطور بالا میں لکھا تھا کہ نظریہ قومیت کے متعلق ہمیں ”مکتوبات امام ربانی میں
 کوئی واضح اندراج نہیں ملا“ اور ”کوئی آیت کوئی حدیث اس نظریے کی قطعی تائید میں
 پیش نہیں کی جاتی“ کتاب کی اشاعت کے بعد ہمیں دفتر دوم کے مکتوب ۱۴ اور دفتر
 سوم کے مکتوب ۱۴ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مؤخر الذکر میں حضرت مجدد کی خلعت
 قومیت خواجہ محمد محصوم کو منتقل ہونے کا بیان ہے۔ اور پہلے مکتوب میں دو آیات
 قرآنی کی تاویل و تشریح سے قومیت کا نظریہ مستنبط ہوتا ہے۔ ان دو آیات میں سے زیادہ
 متعلقہ وہ مشہور آیت ہے جس کا اردو ترجمہ ہے: ”ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین
 اور پہاڑوں کے پیش کی، لیکن انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا۔ اور اس سے
 ڈر گئے۔ اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ یہ بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے۔“ اس آیت کی
 توضیح کرتے ہوئے حضرت مجدد و قوم کے متعلق لکھتے ہیں:-

”آں امانت بزعم ایں حقیر قومیت جمیع اشیاست۔ بر سبیل نیابت کہ مخصوص بمکمل
 افراد انسان است۔ یعنی معاملہ انسان کامل تا بجائے میرسد۔ کہ اور قوم جمیع اشیاء کلم
 خلافت می سازند۔ و ہمہ را افاضہ وجود و بقا و سائر کمالات ظاہری و باطنی بتوسط او
 میرسانند۔ اگر ملک است باد متوسل است۔ و اگر انس و جن است باد متشیت“
 (دفتر دوم مکتوب ۱۴)

آگے چل کر فرماتے ہیں:-

— مارفہ کہ بہ منصب قومیت اشیاء مشرف گشتہ است، حکم وزیر دارد کہ جماعت
 مخلوقات را باد و مرجوع داشته اند۔ ہر چند انعامات از سلطان است، اما وصول آئنا

بموسط وزیرست (ایضاً)

ان اندراجات سے بظاہر ہمارے اس بیان کی کہ نظریہ قومیت کی تائید میں محمدی ایت پیش نہیں کی جاتی۔ تخلیط ہوتی ہے (ادبیہ صحیح ہے کہ اصل تحریر کے وقت ہماری نظر میں یہ مکاتیب نہ تھے)۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ آیات قرآنی کی اس تاویل و تشریح کو پڑھتے وقت وہ عربی جملے ذہن نشین رکھنے چاہئیں جو حضرت مجدد نے اس سے پہلے حقیقت حال کو واضح کرنے کے لیے لکھے۔ ان کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

ان دونوں آیتوں کی مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ لیکن ہم تاویل بیان کرتے ہیں جو ہم پر بظاہر ہو گئی ہے۔ یا اللہ تو ہماری بھول چوک پر مواخذہ نہ کر۔

[اردو ترجمہ مکتوبات امام ربانی جلد دوم ص ۲۴۱]

کیا اس ابتدائی عبارت سے یہ امر واضح نہیں کہ حضرت مجدد کو اس ترجمانی پر جسے وہ تاویل کہتے ہیں یقین نہ تھا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اگر اس معاملے میں ان سے کوئی بھول چوک ہوئی ہے تو اس پر ان سے مواخذہ نہ کیا جائے؟

روضۃ القیومیہ کی عبارت پر مولانا زید ابوالحسن صاحب مدظلہ نے جو تبصہ کیا ہے اس سے ایک حد تک صورت حالات کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا یہ بہتر نہ ہو کہ حضرت مجدد نے ابتدائی عربی عبارت میں جو وضاحت کی ہے اسے زیادہ اہمیت دی جائے اور یہ خیال کر کے کہ مفسرین میں سے کسی (یا کم از کم سوا و اعظم) نے متعلقہ آیت کریمہ کی یہ تاویل نہیں کی۔ قومیت کو امور مشتبہ میں شمار کیا جائے؟ ہماری حقیر رائے میں یہ انداز فکر حضرت مجدد کی ابتدائی عربی عبارت کے مطابق ہوگا۔ روضۃ القیومیہ میں خواجہ محمد مصمم کو قیوم ثانی قرار دیا ہے۔ اور ان کے ایک مکتوب (دفتر اول ۸۶) میں خلعت قومیت کے حصول اور اس مرتبہ کے متعلق ایک تفصیلی بیان ہے۔ لیکن ان کے آخری ایام کا ایک خط ہے (دفتر سوم ۱۹۵) جس میں اس قسم کے خطاب پر اظہار ناراضگی فرمایا ہے شیخ محمد خلیل اللہ کو لکھتے ہیں:-

..... دیگر فرشتہ ہوند اگر چہ این حکم ببار یافتگان جناب قومیت بے ادبی است الخ

فقیر بایں قسم عبارات کہ در بارہ ایں دُور از کار نبوسند۔ راضی نیست۔ (گزشت آنچہ)
گزشت۔ من بعد نخواہند نوشت۔۔۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں خواجہ محمد مصطفیٰ قیومیت سے اپنی نسبت کے اظہار کو ناپسند کرتے تھے۔ افسوس کہ متاخرین نے یہ طریق کار اختیار نہ کیا۔ بعد میں قیومیت کے نظریے کو جس طرح وسعت دی گئی۔ وہ روضۃ القیومیہ سے ظاہر ہے۔ قدرتی طور پر یہ طریق کار علما کو کھٹکتا ہے۔ قیومیت کے مسئلے پر علما کی (آپ انھیں علما سے ظاہر کہہ لیجیے) جو رائے ہے اس کا اندازہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ایک جملہ سے ہو سکتا ہے۔ ”معاذ اللہ“۔

وہ رسالہ تجدید و احیاء دین (اشاعت اول) کے ص ۷ پر لکھتے ہیں ”حضرت مجدد صاحب کی وفات پر کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ان کے حلقہ کے لوگوں نے ان کو قیوم اول اور ان کے خلفا کو قیوم ثانی کا خطاب عطا کر دیا۔ معاذ اللہ“

جناب مولانا زید ابوالحسن فاروقی صاحب مدظلہ نے اپنے روضۃ القیومیہ | ارشادات میں روضۃ القیومیہ کے مصنف جناب محمد اسحاق

مجدودی کی لغزشوں کا ذکر کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ انھوں نے ”بعض واقعات بھی صرف از وجہ سماع قلمبند کر دیے ہیں۔ حالانکہ وہ صحیح نہیں۔ بنا بریں حضرات عالی قدر نے اس کتاب کو قابل اعتناء نہیں سمجھا ہے۔“ جہاں تک اہل نظر خواص کا تعلق ہے ان کا فرمانا بجائے لیکن سطحیت اور جذباتیت کے اس دور میں اہل نظر کہتے ہیں؟ عام طور پر اس کتاب کو ”قابل اعتناء“ ہی نہیں سمجھا گیا، بلکہ بعد کے تذکرہ نگاروں نے تو زبدۃ المقامات اور حضرات القدس جیسے معاصرانہ اور حضرت مجدد الف ثانی کے خلفائے کبار کے لکھے ہوئے تذکروں کو چھوڑ کر جمع حالات اور نقطہ نظر میں روضۃ القیومیہ کو چراغ راہ بنایا ہے۔ پروفیسر محمد فرمان صاحب (جنھوں نے حضرت مجدد کے حالات و خیالات کو زیادہ تر مکتوبات کی روشنی میں جمع کیا ہے) روضۃ القیومیہ کی نسبت لکھتے ہیں۔ ”اسی کتاب پر حضرت مجدد الف ثانی کے اکثر

سوانح نگاروں نے انحصار کیا ہے۔۔۔ نقشبندی حضرات کے ہاں اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ (حیات مجدد ص ۲۹۱) بعض بلند پایہ اور اہل علم مجددی بزرگوں کو بھی اس کتاب کا نقطہ نظر اور اس کی روایات جس قدر عزیز ہیں اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے ایک مشہور و معروف فاضل علامہ ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی گورکھپوریؒ کی سوانح عمری حضرت مجدد الف ثانی سرسندی کی نسبت جس کا سوانحی حصہ روضۃ القیومیہ کا ملخص ہے لکھتے ہیں۔

”حضرت مجدد کے متعلق صرف یہی ایک ایسی کتاب ہے جسے ہمارے دور میں بڑی ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ مولانا مرحوم نے حضرت مجدد کے حالات بڑی تحقیق سے لکھے ہیں۔“ مولانا احسان اللہ نے اپنی کتاب کے ابواب و اندراجات کی ترتیب جدید طریقے سے اور مذاقِ حال کے موافق کی۔ ایک اہم کام یہ کیا کہ مکتوباتِ امام ربانی کے تینوں دفتروں کے ایک ایک مکتوب کا حوالہ اور اس کا عنوان اردو میں دیا ہے۔ دورِ رسائل (یعنی مبداء و معاد اور معارف لدنیہ) کا بھی کارآمد خلاصہ درج کتاب کیا، لیکن جہاں تک ”حضرت مجدد کے حالات“ کا تعلق ہے، مولانا احسان اللہ کی کتاب روضۃ القیومیہ

نے کتاب کے سرورق پر مصنف کا نام اس طرح لکھا ہے۔ سب ٹائٹل پر موضوع کتاب کی توضیح ہے۔ ”حضرت شیخ احمد سرسندی ملقب (کذا) بہ قیوم اول و مشہور بہ مجدد الف ثانی کے حالات۔“

۱۵ ملاحظہ ہو تحریر و تقریر (مثنوی کردہ حکیم محمود الزمان لطیف آباد۔ حیدر آباد) ص ۱۵۹

۱۶ ایضاً۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال کہ ”پروفیسر (محمد فرمان) صاحب نے (حیات مجدد میں) صرف یہ کیا ہے کہ (مولانا احسان اللہ عباسی کے) انہی عنوانات کو یکجا کر دیا ہے۔“ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا احسان اللہ نے فقط عام فہم اندراجات لیے تھے۔ اور اقتباسات کے مطابق عنوانات دے دیے۔ بعض اقتباسات بڑے مختصر ہیں۔ پروفیسر محمد فرمان نے بطور خود مکتوبات کا بڑا ذخیرہ مطالعہ کیا ہے۔ اور اس مطالعہ میں حضرت مجدد کی تعلیمات اور مذہبی احساسات کے جملہ اہم پہلو نظر آئے۔ انہیں گیارہ بارہ عنوانات کے تحت طویل اقتباسات سے کران کی وضاحت کی ہے۔

کی صدائے بازگشت ہے۔ وہ خود کتاب کے شروع میں لکھتے ہیں۔ ”روضۃ القیومیہ ہر چار جلد اور مکتوبات کے ہر سہ دفتر دیکھ کر پورے دو ماہ میں میں نے سوانح عمری حضرت مجددؒ کی تیار کر لی“ (ص ۱۴) ممکن ہے نظر ثانی کے وقت اور کتابوں سے بھی افادہ کیا ہو لیکن اس میں جو حالات سال بسال درج ہیں، ان کا روضۃ القیومیہ سے موازنہ کرنے سے صاف نظر آتا ہے کہ مولانا کی کتاب کا سوانحی حصہ موخر الذکر کی تلخیص ہے۔ اب اگر ایک مشہور مجددی بزرگ اور نامور اہل علم ایسی تالیف کو حضرت مجددؒ کے حالات کا ایک محققانہ بیان سمجھیں۔ تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عوام الناس میں روضۃ القیومیہ کے قصے کہانیاں کیسے مقبول ہوں گے۔

چونکہ روضۃ القیومیہ کے اندراجات پر پہلی مرتبہ کڑی تنقید رود کوثر میں ہوئی، اس لیے شاید بیجا نہ ہو۔ اگر راقم السطور ایک دو امور کی وضاحت کر دے۔ اس کتاب کے متعلق بڑی دشواری یہ ہے کہ فقط اس کا اردو ترجمہ دستیاب ہوتا ہے۔ اصل کتاب کا ایک قلمی مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں ہے لیکن وہاں سے اس کی نقل حاصل کرنا بے حد مشکل ہے۔ اس لیے اس کے متعلق جو کچھ لکھا جاسکتا ہے، وہ اس اردو ترجمہ کے متعلق ہے، ہولاہور سے شائع ہوا۔ اور عام طور پر متداول ہے۔

روضۃ القیومیہ کے اندراجات کثیرہ سے شدید اختلاف کے باوجود یہ اظہار ضروری ہے کہ اگر یہ کتاب احتیاط سے مطالعہ کی جائے۔ اور ان بیانات کو جو مستند تاریخی شواہد یا شرعی اعتراضات کی بنا پر قابل قبول نہیں، نظر انداز کر دیا جائے تو اس سے بڑے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ مصنف خاندان مجددیہ سے تھے۔ انھوں نے چار قیومیوں کے حالات دیتے ہوئے، ان کے تمام بیٹوں بیٹیوں اور خلفاء بلکہ بعض معاصرین کے حالات لکھے ہیں۔ جن کے جاننے کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں اور اس طرح سے اس خاندان عالی کا، جس کے متعلق حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے لکھا تھا۔ ”سب سے شجرہ طیبہ یعنی پاک درخت کی طرح ہیں، جس سے پاک ہی شاخیں نکلی ہیں“

اس طرح حال بیان کیا ہے کہ اس شجرہ طیبہ کی ٹہنی ٹہنی، بلکہ پتاپتہ نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ ایک احسانِ عظیم ہے۔ خدا انھیں اس کی جزا سے خیر دے اور درگزر فرمائیں۔

مولانا زید الرحمن صاحب نے روضۃ القیومیہ کے غیر صحیح اندراجات کی نسبت تحریر فرمایا ہے کہ وہ بغیر قوی شہادت کے ”از وجہ سماع“ قلمبند کر دیے گئے۔ عجیب نہیں کہ اس میں مولف یا ان کے ماخذ کی ”تاریخ سازی“ کو دخل ہو۔ یہیں کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ شاید یہ کتاب مناقب الحضرات کے جواب میں لکھی گئی، جو اس کی تالیف سے چند سال پیشتر شیخ آدم بنوریؒ کے سلسلے کے ایک اہل قلم نے لکھی تھی۔ اس میں حضرت مجددؒ کے اجمالی ذکر کے بعد شیخ آدم بنوریؒ اور ان کے سلسلے کے بعض بزرگوں کے حالات میں اسی قسم کے قصے بیان کیے ہیں، جو روضۃ القیومیہ میں قیومانِ الرعبہ کے متعلق ملتے ہیں۔ مناقب الحضرات کا جو انداز فکر اور ”بنیادی نظریہ“ ہے، وہ ایک اقتباس سے ظاہر ہو جائے گا۔

”بعد از رحلت جہانگیر بادشاہ یک پیر دے بر تخت سلطنت نشست۔ محمد خرم شاہ جہاں پیر دگیر دے دد کن بود۔ حضرت خضرؒ نزد حضرت سیدنا و مولانا قدس آمد و گفت کہ میں خدمت بر تو مقرر شدہ و حضرت افضل المخلوقات صلی اللہ علیہ و علیٰ آکہ وسلم مرا نزد تو فرستادہ اند کہ ہر کرا او تجویز کند، پادشاہ باشد۔ ایشان متوجہ شدند مرضی مالک حقیقی جل شانہ و رسولی او صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم شاہ جہاں دیدند۔ بحضرت خضرؒ گفتند کہ مرضی چنانست۔ دے گفت۔ موقوف بر تجویز تست۔ ایشان شاہ جہاں را مقرر کردند۔ دد پاسبانی میبودند۔ ظاہرا هیچ آشنائی با او نہ داشتند۔“ (مناقب آدمیہ قلمی ورق ۲۰۲)

حضرت سیدنا و مولانا قدس سرہؒ سے جنھوں نے (مصنف کے بیان کے مطابق) شاہ جہاں کو بادشاہ ”مقرر“ کیا۔ شیخ احمد بنوریؒ مراد ہیں، جنھیں شاہ جہاں نے سعد اللہ خاں اور ملا عبد الحکیم کے مشورے پر ایک طرح سے ملک بدر کیا اور مکہ معظمہ

روایت کر دیا۔

مناقب المحضرات کے آخر میں اظہارِ احوال کا تفصیلی جواز پیش کیا گیا ہے۔ بالجملہ مصنف کا نقطہ نظر ہے۔ ”اظہارِ احوال مناقب و افشاءِ نعم و فضل الہی سکر است و اخفے او کر“۔ اس عبادت اور بالخصوص آخری جملے سے اندازہ لگائیے کہ اندازِ خیال حضرت خواجہ باقی باللہ کے نقطہ نظر سے کتنی دُور تھا!

مناقب المحضرات جس کا پورا نام ہے مناقب آدمیہ و حضرات احمدیہ نہم محرم ۱۲۵۲ھ کو مکمل ہوئی۔ روضۃ القیومیہ اس کے بارہ سال بعد ۱۲۶۹ھ میں یعنی جملہ نادر کے زمانے میں شروع ہوئی۔ لیکن اس کی تکمیل میں کئی سال لگے۔ دونوں کتابوں کے زمانِ تالیف اور موضوع سے خیال ہوتا ہے کہ شاید روضۃ القیومیہ اکابرِ سلسلہ آدمیہ کے مقابلے میں بزرگانِ سرہند کے تصرفات نمایاں کرنے کے لیے لکھی گئی۔

روضۃ القیومیہ کے مؤلف خواجہ ابوالفیض کمال الدین محمد احسان کی نسبت حیاتِ مجدد میں پروفیسر محمد فرمان لکھتے ہیں: ”مؤلف کے خلوص پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس خلوص نے غلو کے تصوف کی خدمت سے کہیں زیادہ اسے نقصان پہنچا دیا ہے۔“ (ص ۲۹۱) ہمیں اس سے اتفاق ہے۔ لیکن وہ پہلے صوفی تذکرہ نگار نہیں تھے غلو سے نقصان زیادہ پہنچا ہے۔ فائدہ کم۔ یہ سلسلہ اس سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ شیخ عبدالحق محدث نے بھی حضرت مجددؒ کی زندگی میں ان کے بعض معتقدین کی غیر مستند حکایات کا ذکر کیا تھا۔ ”گفت و گوئے مریدان ایشان کہ در نقل اقوال و ذکر حکایات بے صرفہ و بے احتیاط۔“ (حیات شیخ عبدالحق محدث بلوی)۔ روضۃ القیومیہ نے اس عمل کو انتہا تک پہنچا دیا۔ اس کا آغاز نہیں کیا۔

خواجہ باقی باللہؒ کی آمد سے پہلے جو صوفی سلسلے ہندوستان میں سرحدِ عراق کی پیدوار تھے۔ قادریہ سلسلہ کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی بغداد کے رہنے والے تھے۔ سہروردی سلسلہ سہرورد کے متعلق ہے جو بغداد سے چند میل کے

فاصلے پر ایک قریہ تھا۔ چشت بھی خراسان کی ایک بستی ہے۔
 ان تینوں سلسلوں میں جزوی اور فردی اختلافات تھے لیکن ان کا روحانی پس منظر
 ایک تھا۔ اور ان سب میں وہ عجبت جو درعباسیہ کو دوراموی سے اور بغداد کے متکلمین
 اور فلسفیوں کو مدینہ منورہ کے محدثین و فقہاء سے منفرد کرتی تھیں۔ موجود تھی۔ تینوں میں وہ
 ”صلح کل“ کا طریقہ مقبول تھا۔ جس کے تحت غیر مروجہ بلکہ غیر اسلامی طریقوں سے کئی برسزہ
 کیا جاتا۔ تینوں میں شرع کے معاملے میں تھوڑی بہت آزادی تھی اور تینوں میں حدالوجہ
 کا طریق رائج ہو گیا تھا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ جس سلسلے کو لے کر ہندوستان آئے وہ ایران نہیں تو ران
 کا تحفہ تھا اور ماوراء النہر کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ نقشبندیہ سلسلے میں شرع کی پابندی
 پر بڑا زور تھا۔ سماع کی ممانعت تھی۔ ذکر خفی کی تلقین تھی اور فرائض شرعی کو نوافل پر
 واضح ترجیح تھی۔

نقشبندیہ سلسلہ، حضرت مجدد کے ظہور سے پہلے ہی کئی اہم امور میں قدیم صوفیہ
 سلسلوں سے ممتاز تھا۔ اول شرع سے بہت قریب تھا۔ لیکن اس کا بنیادی فلسفہ دوسرے
 سلسلوں سے مختلف نہ تھا۔ جو فرق تھا، وہ خواجگان بخارا و سمرقند کی آئین پسندی، دسپن
 اور شرعی جوش و خروش کی وجہ سے تھا۔ اور ابھی تک کوئی ایسا صاحب فکر پیدا نہ ہوا

۱۔ مرزا غالب نے ایک دفعہ بہادر شاہ کے دربار میں ایک رباعی پڑھی تھی یہ
 جن لوگوں کو مجھ سے ہے عداوت گہری
 دہری کیونکر ہو جو کہ ہو دے صوفی
 شیعہ کیونکر ہو ماوراء النہری
 آخری مصرع پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا حالی فرماتے ہیں: ”چوتھے مصرعہ کا یہ مطلب ہے کہ ماوراء النہر
 یعنی ترکستان کے لوگ مستعجب سنی ہونے میں ضرب المثل ہیں۔ یہاں تک کہ شیعہ ان کو ناموسی اور خارجی
 سمجھتے ہیں۔“ مولانا نے تو فقط ایک پہلو پر تبصرہ کیا ہے، لیکن ترکستان کے لوگ ایرانیوں کی نسبت عام طور پر
 زیادہ متشدد اور شرع کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔

تھا جو نقشبندیوں کو ایک ایسا فلسفہ دے دیتا جو اس معاملے میں بھی انھیں ایک امتیازی رنگ دے کر ان کے خاص رجحانات کے لیے ایک فکری اساس کا کام دیتا۔ یہ کمی حضرت مجدد نے پوری کر دی۔ ان کے ظہور سے پہلے تمام صوفیوں میں ایک ہی فلسفہ رائج تھا۔ ابن العربی کا فلسفہ وحدت الوجود بیشک اس کے اخذ و قبول میں مراتب و منازل تھے۔ بعض انتہا پسند صوفی تو وحدت الوجود میں اتنا غلو کرتے کہ وہ قریب قریب دائرہ اسلام سے باہر آجاتے۔ اور کئی دوسرے فقط اُسی حد تک اختیار کرتے جس حد تک اسلام مانع نہ ہو۔ لیکن اب پہلی دفعہ ایک ایسا جدِ گاہِ فلسفہ مدون ہوا جو فلسفہ وحدت الوجود کا مدِ مقابل ہو سکتا تھا۔ یہ فلسفہ وحدت الشہود تھا جو معنوی لحاظ سے وحدت الوجود کی ضد یعنی تشنیہ الوجود کا فلسفہ کہلا سکتا ہے۔

حضرت خواجہ بانی باللہ کا مسلک شروع میں وحدت الوجود کا تھا اور گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ ان کے دہلوی جانشین مرزا حسام الدین احمد نے اسے جاری رکھا۔ لیکن حضرت مجدد لکھتے ہیں کہ آخری ایام میں خواجہ نے یہ مسلک ترک کر دیا تھا "معرفت پناہی" قبلہ گاہی، حضرت خواجہ باقر علی سرہ چند گاہ مشرب توحید و جود و دانشمند و در رسائل و مکتوبات خود آں را اظہار می فرمودند اما آخر کار حق سبحانہ و تعالیٰ اہمال غایت خویش ازاں مقام ترقی ارزانی فرمودہ بشاہراہ انداختہ از ضیقِ این معرفت خلاصی داد۔ میاں عبدالحق (محدث) کہ از مخلصان ایشانند۔ نقل کردند کہ پیش از مرضِ موت بہ یک ہفتہ فرمودند کہ مرا عین الیقین معلوم شد۔ کہ توحید کوچہ ایست تنگ۔ شاہراہ دیگر نیست۔ پیش ازین ہم میدانستم اما اکنون یقین دیگر حاصل گشت۔ و این حقیر نیز کہ چند گاہ در حضرت

لے وحدت الشہود کی کچھ بھلک شیخ علاء الدولہ سمنانی کی تحریروں میں ملتی ہے جو قدیمی خواجگان ترکستان میں بڑے دیدہ وریز تھے۔

۲ گلزار ابرار میں خواجہ محمد صدیق بدیشی کا بیان اس واقعہ کے متعلق دیکھیے۔ اور اندازہ لگائیے کہ معتقدین بیان واقعات میں کس طرح بے احتیاطی کرتے ہیں۔

ایشان ایں مشرب توحید داشت و مقدمات کشفیہ در تائید ایں طریق بسیار لائح گشته۔
اما عنایت خداوندی جل سلطانہ ازاں مقام گزرانیدہ، بہ مقاصد کہ خواست مشرب
گردانیدہ ۛ

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے دونوں فلسفے ذات باری اہل مخلوقات
کے تعلقات کو بیان کرتے ہیں اور ان کے مطالب کے لحاظ سے انھیں توحید عینی اور
توحید ظاہری بھی کہہ سکتے ہیں۔ تصوف کی ایک مشہور کتاب تذکرہ مغوشیہ میں دونوں کا
فرق اس طرح سمجھایا گیا ہے:-

وجود یعنی ہستی حقیقی واحد ہے لیکن ایک ظاہر وجود ہے اور ایک باطن۔ باطن وجود
ایک نور ہے جو جملہ عالم کے لیے بمنزلہ ایک جان کے ہے۔ اسی نور باطن کا پیر تو ظاہر وجود
ہے جو ممکنات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ہر اسم و صفت و فعل کہ عالم ظاہر میں ہے
ان سب کی اصل وہی وصف باطن ہے اور حقیقت اس کثرت کی وہی وحدت
صرف ہے۔ جیسے امواج کی حقیقت عین ذات دریا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جملہ
افراد کائنات تجلیات حق ہیں۔ سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْأَشْیَاءَ وَهُوَ عِنْدُهَا
اور اس کثرت اعتباری کا وجود اسی وحدت حقیقی سے ہے۔ الْحَقُّ یُخْشَوْنَ وَالْخَلْقُ
مَعْقُولٌ۔

یہ خلاصہ وحدت الوجود کی تقریر کا ہے اور وحدت الشہود کا بیان یہ ہے کہ وجود
کائنات اور ظہور آثار و صفات مختلفہ، واحد مطلق کی ذات و صفات کا عکس ہے
جو عدم میں منعکس ہو رہا ہے۔ اور یہ غل عین صاحب غل نہیں ہے بلکہ محض ایک مثال ہے۔
مندرجہ بالا تشریح دیکھ کر شاید بعض بزرگ کہیں کہ ان دونوں فلسفوں میں تو کوئی
خاص بعد نہیں اور سچ یہ ہے کہ ان مسائل پر فلسفہ اور تصوف کی بھول بھلیاں دیکھ کر
بار بار اس ذات حکیم کا فرمان یاد آتا ہے کہ اس ذات اور صفات کے جھگڑوں میں نہ پڑو
لیکن فی الواقعہ یہ دونوں نظریے دو مختلف بلکہ متضاد نفسیاتی رجحانات کے ترجمان ہیں۔ نواب
سراج الدین نظام جنگ بہادر نے اپنی کتاب فلسفہ فقہاء میں ان دونوں کے فرق کو ایک نقشے

کی مدد سے نمایاں کیا ہے۔

وحدت الوجود (ہوالہادی)

نظریہ ہمہ از اوست

رجحان تصوف - بوش کی طرف مائل -

اس کے ساتھ میں اور میرے

ساتھ وہ ہے۔

عشق

اعتقاد - میں کون؟ انا عبدہ (عاشق)

وحدت الوجود (ہوالکلی)

نظریہ ہمہ اوست یا اندر ہمہ اوست

رجحان تصوف - سکون کی طرف مائل -

میں اور وہ مجھ انتہیں (وہ دریا

تو میں قطرہ ہوں

وصل

اعتقاد - میں کون؟ انا الحق (عارف)

علامہ اقبال نے ایک خط خواجہ حسن نظامی کو لکھا تھا:-

”حضرت امام ربانی نے مکتوبات میں ایک جگہ بحث کی ہے کہ گسستن اچھا ہے یا

پیوستن؟ میرے نزدیک گسستن عین اسلام ہے اور پیوستن رہبانیت یا ایرانی تصوف

ہے.... آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ نے مجھے سُر الوصال کا خطاب دیا تھا۔ تو میں نے

آپ کو کہا تھا کہ مجھے سُر الفراق کہا جائے۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں یہی امتیاز

تھا جو مجدد الف ثانی نے کیا ہے۔“

اقبال نے سُر الفراق کے جس خطاب کی خواہش کی تھی، حضرت مجدد الف ثانیؒ

اس سے بھی زیادہ مستحق ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ابن العربی کو سُر الوصال اور حضرت

مجدد کو سُر الفراق کہا جائے تو ان کے فلسفوں اور وحدت الوجود اور وحدت الشہود

کا امتیاز بخوبی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ وحدت الوجود کا قائل ہونے کی وجہ سے شیخ

ابن العربی کا دوسرے مذہبوں کی نسبت جو طرز عمل ہو گیا، اسے انھوں نے چند عربی

اشعار میں بڑی وضاحت سے نظم کیا ہے۔ (ترجمہ)

”آج کے دن سے پچھلے میرا یہ حال تھا کہ جس ساعتی کا دین مجھ سے نہ ملتا میں اس کا

انکار کرتا اور اسے اجنبی سمجھتا۔

لیکن اب میرا دل ہر صورت کو قبول کرتا ہے۔ وہ اب ایک پرگاہ بن گیا ہے۔

غزالوں کی۔ اور دیر ہے راہیوں کا۔ اور آتش کدہ ہے آتش پرستوں کے لیے اور کعبہ ہے حاجیوں کے لیے اور الواح ہے تورات کی اور صحیفہ ہے قرآن کا۔

میں اب مذہبِ عشق کا پرستار ہوں۔ عشق کا قافلہ جدھر بھی چاہے مجھے لیجائے میرا دین بھی عشق ہے، میرا ایمان بھی عشق ہے۔“

برخلاف اس کے حضرت مجدد کا دوسرے مذاہب کی نسبت جو خیال تھا اس کا اندازہ اس مکتوب سے ہو سکتا ہے جو امضوں نے ایک ہندو ہر دے رام کو لکھا۔ اور جس میں رام اور رحمان کو ایک سمجھنے کی بڑی خشکی سے تردید کی تھی۔

مندرجہ بالا سطور سے حضرت مجدد کے روحانی اسلوب خیال کا اندازہ ہوتا ہے اور تاریخ تصوف میں ان کی منفردانہ حیثیت سمجھی جاسکتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ یا ان میں سے اگر ایک حق پر ہے تو دوسرا ضرور باطل ہوگا۔

یہ دونوں رجحانات مختلف اور متضاد ہیں، لیکن حالات کے مطابق مختلف رجحانات برسر کار آتے ہیں اور جداگانہ حالات میں جداگانہ رجحانات ہی مفید ہوتے ہیں۔ ایک انگریزی مقولہ ہے:-

“There is a season and time for every purpose under Heaven;

‘A time to love and a time to hate.’”

دنیا کی ہر ایک چیز کے لیے کوئی نہ کوئی وقت ہوتا ہے۔

کوئی وقت محبت کرنے کا ہوتا ہے اور کوئی وقت نفرت کا۔

یعنی کسی وقت سرائی وصال کی راہنمائی مفید ہوتی ہے اور کسی وقت سرائی وصال کی یا تصوف کی اصطلاح میں یوں سمجھیے کہ کوئی وقت شانِ جہالی کا ہوتا ہے کوئی وقت شانِ جلالی کا۔

یہی وجہ ہے کہ امام الہند شاہ ولی اللہ نے جو ہمارے سب سے متوازن مزاج اور معاملہ فہم عالم ہوئے ہیں۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اور اسماعیل آفندی کے نام ایک طویل عربی خط میں (جواب مع اردو ترجمہ کے فیصلہ وحدت الوجود والشہود کے نام سے چھپا ہے) شیخ اکبر اور شیخ مجدد کے خیالات کی تطبیق کی۔ شاہ صاحب نے دیکھا ہوگا کہ ایک اصول ہے اخذ و انجذاب کا اور دوسرا فلسفہ ہے تطہیر و تزکیہ کا۔ ایک کے پیرو مشابہتوں اور کمیونگیوں کو دیکھتے ہیں۔ اور دوسروں کی نظر اختلافات پر پڑتی ہے۔ ابن العربی۔ رومی۔ غزالی اور داراشکوہ عیسائی، نوافلاطونی اور ہندو فلسفوں اور طریقوں کو کھنکالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان میں کوئی چیز اچھی ہے اور اخذ کی جاسکتی ہے، لیکن ابن تیمیہ۔ ابن عبد الوہاب۔ مجدد الف ثانی۔ اقبال اور اورنگ زیب ان چیزوں کو اسلام کی کسوٹی پر کستے ہیں۔ تاکہ جو چیز شرعی معیار پر پوری نہ اترے، اسے رد کر دیا جائے۔ اگر پہلا گروہ نہ ہو تو خیالات اور فلسفہ کی نشوونما ختم ہو جائے۔ دماغ ایک محدود اور تنگ تاریک دائرے سے باہر نہ نکلے۔ اور خیالات میں وسعت اور بچک نہ رہے۔ اگر دوسرا گروہ اپنا کام بند کر دے تو ہر طب و دینا بس، بلکہ ملحدانہ اور مضر خیالات قبول کر لیے جائیں اور قوم کا نہ صرف شرعی، بلکہ فکری اور روحانی نظام درہم برہم ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں دونوں اصول کا رفرار ہے ہیں۔ وحدت الوجود میں اور حق کو ہر گوشے میں تلاش کرنے والوں نے دوسروں قوموں اور دوسرے طریقوں سے استفادہ کیا۔ اور ان کے قابل اخذ خیالات کو اسلام میں داخل کیا، لیکن جب اس طرح بعض مضر خیالات اور شعائر بھی رائج ہو گئے اور باہر کے عناصر قومی تختل پر اس طرح چھا گئے کہ اصل اسلامی احکام نظر سے اوجھل ہونے شروع ہوئے تو ابن تیمیہ۔ ابن عبد الوہاب۔ حضرت مجدد اور اقبال نے اپنا کام شروع کیا اور اسلام کو غیر اسلامی عناصر سے پاک صاف کرنے کی کوشش کی۔

ظاہری نقطہ نظر سے تو دوسری کوششیں شرع کی پابند اور اسلام کے لیے زیادہ

مفید معلوم ہوتی ہیں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام کی روح کے لیے پہلی کوششیں اسی قدر ضروری نہیں؟ اسلام تو وہ مذہب ہے جس نے سابق کے تمام پیغمبروں اور ان کے مذہبوں کو سچا تسلیم کیا ہے اور ان کی نیک اور مفید باتیں اخذ کر لی ہیں۔ کیا یہ امر اسلام کی عین روح کے مطابق نہیں کہ اخذ و انجذاب کا یہ اصول جاری رہے اور جو باتیں اسلام کے بنیادی اصولوں کے متناقض نہیں، ان میں وسیع النظری سے کام لیا جائے اور حقیقت کو ہر گوشے میں تلاش کیا جائے؟

حضرت مجدد اسی زمانے میں پیدا ہوئے، جب ہندو حیاسیت اور اکبر الوافضل کی مصلحت کوشیوں سے اسلام کے لیے ایک عظیم خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور اسلامی معاشرے کو بچانے کے لیے سرائی کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ انھوں نے وحدت الوجود کی بالکل نفی نہیں کی۔ بلکہ اسے 'وحدت الشہود' سے نچلے درجے پر ایک صوفیانہ مقام ظاہر کیا ہے۔

حضرت مجدد اور شیخ ابن العربی | حضرت مجدد نے بعض جگہ شیخ ابن العربی کی کتابوں کے خلاف ایسی ادیبانہ شان

سے اور ناقابل فراموش الفاظ میں (مارا بہ نص کاراست نہ بہ نص۔ مارا فتوحات مدنیہ از فتوحات مکیہ مستغنی ساختہ است) اظہار خیال کیا ہے۔ اور ان کا فلسفہ وحدت الشہود اس طرح فلسفہ وحدت الوجود کے مخالف سمجھا جاتا ہے کہ شیخ کے متعلق حضرت مجدد کے نقطہ نظر کو ذرا وضاحت سے بیان کرنا مفید ہوگا۔

ہم حضرت مجدد کے والد مخدوم عبدالاحد کا ذکر کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں کہ وہ وحدت الوجودی خیالات کے تھے۔ اور حضرت مجدد کا بیان بھی نقل کر چکے ہیں کہ ابن الفقیہ نصف الفقیہ۔ ان کے بھی یہی خیالات ہو گئے۔ اور ایک مدت تک ان پر توحیدی رنگ غالب رہا۔ اس کے بعد ان پر وحدت الشہود منکشف ہوئی۔ اور انھوں نے شیخ ابن عربی سے اپنے اختلاف کا اظہار زوردار طریقے سے کیا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کلیتاً شیخ کے منکر تھے۔ زبدۃ المقامات میں خواجہ ہاشم کشمی

جو آخری سالوں میں کافی عرصہ ان کے ساتھ رہے لکھتے ہیں۔۔۔ شیخ محی الدین ابن العربی قدس سرہ راہیں بزرگ سے دانستند و نیک یاد سے کردند۔ (زبدۃ المقامات) فی الحقیقت شیخ کی نسبت ان کا نقطہ نظر بڑا پیچ در پیچ تھا۔ بعض باتوں میں انہیں ان سے اختلاف تھا۔ اور بعض میں اشتراک رائے، لیکن شیخ کی عظمت اور پاکیزگی پر وہ بڑا زور دیتے تھے۔ شیخ کے متعلق حضرت مجدد نے اظہار خیال کئی جگہ کیا ہے۔ آخری آیام کا ایک خط (دفر سوم ۷۹) صاحبزادہ محمد معصوم کے نام ہے۔ اس میں شیخ ابن العربی کی نسبت لکھتے ہیں:-

”وہیں عرصہ شیخ ست قدس سرہ کہ گاہے باوے جنگ است و گاہے صلح“
آگے چل کر لکھتے ہیں (ترجمہ)

”ہم پسماندوں نے بھی اس بزرگ کی برکات سے استفادہ کیا ہے۔ اور اس علوم و معارف سے بہت فائدے حاصل کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہماری طرف سے جزائے خیر دے۔ لیکن چونکہ بشریت کے مطابق تخطا و صواب ایک دوسرے کے ساتھ ملا جلا ہے۔ اور انسان احکام میں کبھی خطا پر ہے۔ اور کبھی صواب پر۔ اس لیے اہل حق کے سوا و اعظم کے احکام کی موافقت کو صواب کا مصداق اور ان کی مخالفت کو خطا کی دلیل سمجھنا چاہیے۔ کہنے والا خواہ کوئی ہو۔ اور خواہ کوئی کلام ہو۔“

اسی زمانے کے ایک اور خط میں شیخ کی بعض شیطیات کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:-
عجب معاملہ ہے۔ کہ شیخ باوجود اس گفتگو اور ان خلاف جواز اور مخالفت شیطیات کے مقبولوں میں سے نظر آتا ہے۔ اور اولیاء کے زمرہ میں گنا جاتا ہے۔۔۔ شیخ کو قبول کرنا چاہیے۔ اور ان کی مخالفت باتوں کو قبول نہ کرنا چاہیے (دفر سوم ۷۷)
حضرت مجدد نے وضاحت کی ہے کہ توحید و جود کی متعلق ان کا اپنا نقطہ نظر علما کا نہ تھا۔

”علما کا خلاف مشائخ کے ساتھ مسئلہ توحید وغیرہ امور خلافیہ میں نظر و استدلال

کی وجہ سے ہے۔ اور فقیر کا خلاف ان کے ساتھ ان امور میں کشف و شہود کی راہ سے ہے۔

علماء ان امور کی قیاحت کے قائل ہیں اور فقیر بشرط عبور ان کے حسن کا (دفتر دوم) دفتر دوم کا پہلا مکتوب سارے کا سارا شیخ ابن العربی کے خیالات کے متعلق ہے اس ضمن میں شیخ کی بڑی تعریف کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

پس شیخ برہان متقدمان اس طائفہ آمدہ و حجت متاخران ایشان گشتہ۔ محذالک و قائل کثیرہ درین مسئلہ مخفی ماندہ است و اسرار غامضہ، ظہور نیامدہ کہ فقیر باظهار آن توفیق یافتہ است و بہ تحریر آں مبشر گشتہ۔

حضرت مجدد نے شیخ ابن العربی کی بعض باتوں کی تردید کی۔ [مثلاً جہاں وہ اپنے آپ کو ختم ولایت مجدیہ بتا کر یہ کہتے ہیں کہ بعض علوم ختم النبوت نے ختم الولایت سے اخذ کیے (معاذ اللہ) اور اصولی طور پر بھی وہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ ہر بات کو مخبر صادق کے ارشادات کی روشنی میں پرکھنا چاہیے۔] کہنے والا خواہ کوئی ہو۔ اور خواہ کوئی کلام ہو۔ (کاش ان کے اپنے پُر جوش معتقدان میں ہول کو اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کریں)۔ لیکن جیسا کہ (دفتر دوم مکتوب اول کی) مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہے۔ وہ اپنے آپ کو شیخ ابن العربی کے کام کو آگے بڑھانے والا اور اس کی تکمیل کرنے والا سمجھتے تھے۔ صاحبزادہ محمد معصوم کے نام کے مکتوب کے آخر میں، اگرچہ صراحت اسی نہیں، لیکن مفہوم قریباً یہی ہے۔ توحید و جود کی متعلق جو ان کے اور شیخ کے درمیان سب سے بڑی وجہ اختلاف سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے بالصراحت کہا کہ ”بشرط عبور“ وہ اس کے حسن کے قائل ہیں۔ ان کی توحید شہودی شیخ کی توحید و جود کی ضد نہیں، بلکہ اس سے اگلی منزل ہے۔ اسی طرح ابن العربی کے نظام باطنی کا مسئلہ ہے۔ حضرت مجدد نے نہ صرف اسے قبول کیا بلکہ اسے ترقی دی۔ اور طریقہ مجددیہ کا قیوم شیخ ابن العربی کے قطب کی ارتقائی صورت ہے۔

جارحانہ ہندو اچاریت اور حضرت مجددِ کارِ عمل

حضرت مجدد کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا غیر مسلموں کے متعلق نقطہ نظر ہے۔ ان سے پہلے ہندوستان میں بزرگان اہل طریقت نے

غیر مسلموں کے ساتھ سختی اور شدت کی تلقین نہیں کی۔ مسلمان بادشاہوں کا ملکی اور فوجی مصلحتوں کی بنا پر ان سے خواہ کیا سلوک ہو اور فقہاء اور علماء ان کے متعلق خواہ کچھ ہی فتوے دیں، لیکن حضرات صوفیہ نے ان کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار نہیں کیا۔ حضرت خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ کو (بعض روایات کے مطابق) ایک ہندو راجا جانے تکلیفیں دیں۔ انھوں نے اس کے حق میں بددعا بھی کی۔ لیکن عام ہندوؤں کے خلاف جوش اور غصے کا اظہار ان کے ارشادات میں نہیں ملتا اور خواجہ بزرگ کے معتقدین میں ہندو بھی شامل تھے۔ شہزادہ داراشکوہ آپ کی نسبت سفینۃ الاولیاء میں لکھتا ہے:-

”و جمع کثرے از کفار بہ برکت قدم ایشان مسلمان شدند و جماعت کہ مسلمان نشدہ بودند فتوح و دینار بے حد بخدمت ایشان می فرستادند و ہنوز کفار سے کہ در ان نواحی اند بہ زیارت ایشان می آیند۔ و مبلغا بہ مجاوران روضہ منورہ می گزرا نند۔“
رائے بہادر پنڈت ہربلاس ساروا حضرت خواجہ کی نسبت اپنی انگریزی تصنیف اجمیر میں لکھتے ہیں:-

انھوں نے کبھی کسی کو تنگ کرنے کا مشورہ نہیں دیا اور خدا کی تمام مخلوقات کی نسبت ان کا نقطہ نظر صلح جوئی اور خیر خواہی کا تھا (ترجمہ)
حضرت خواجہ کے علاوہ جن و سب سے بزرگوں نے ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کی ان کے حالات اور ارشادات بھی کسی غصے کے جذبے سے عاری ہیں۔ حضرت مجدد کا نقطہ نظر اس سے بہت مختلف تھا۔ ان کے خطوط میں غیر مسلموں کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کثرت سے ہوا ہے اور انھیں دلیل کرنے کی جا بجا تلقین ہے۔ اس نئے زاویہ نگاہ کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حضرت مجدد نے وہ زمانہ دیکھا تھا جب مسلمان

ایک مسلمان بادشاہ کے عہد حکومت میں احکام اسلامی جاری کرنے سے عاجز تھے۔
 ”در قرون ماضی کفار بر ملا طریق استیلا اجرائے احکام کفر و دارالاسلام می کردند و
 مسلمانان از اظہار احکام اسلام عاجز بودند و اگر می کردند قتل می رسیدند۔ و اوایل
 و امصیبتا، و احسرا، و حزنا! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ محبوب رب العالمین است
 مصدقان او ذلیل و خوار بودند و منکران او عزت بودند و معاندان بسخریہ و استهزا
 بر جرات پائے ایشان نمک پاشیدند۔“

حضرت مجدد کے تئیں دل پر ان واقعات کا بڑا اثر ہوا اور نہ صرف اکبر کے
 خلاف بلکہ غیر مسلموں کے متعلق بھی ان کے دل میں غصے اور انتقام کے جذبات پیدا
 ہو گئے۔ لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ اگرچہ درباری مؤرخوں نے جنگوں اور جہنوں کی داستانوں
 سے حقیقت حال پر پردہ ڈال رکھا ہے، جیسا کہ ہم آگے چل کر تفصیلات دیں گے۔
 اس وقت ہندوؤں میں احیائے مذہب کی تحریک زوروں پر تھی اور اطراف ملک
 میں اس کے جو مظاہرے ہو رہے تھے، ان سے باغیر مسلمانوں کے دل مجروح
 ہوتے تھے حضرت کو ان واقعات کا بڑا قلق تھا اور ان کے دل میں انتقام اور غیظ
 و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ شاید اس میں نہ صرف اس زمانے کے حالات کو،
 بلکہ حضرت مجدد کی اپنی حساس اور پر جوش طبیعت (رگ فاروقیم) کو بھی دخل تھا۔ وہ
 خود ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں:-

”ہر کسے را در دل تمنائے امریت از امورہ و تمنائے این فقیر شدت نمودن
 است، بدشمنان خدا و دشمنان پیغمبر و اہانت رسانیدن بایں بے دولتاں و خوارداشتن
 ایشان و بیقین میدانند کہ هیچ عملی نہ در حق عمل مرئی تر نیست۔“

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فرید اس انتہائی نقطہ نظر کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ حضرت مجدد
 بار بار انھیں خطوں میں، غیر مسلموں کو اپنی مجلس میں جگہ نہ دینے اور اگر آئیں تو ذلیل
 رکھنے کی ہدایت کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

نہ شاید ذبح بقریہ پابندیوں کی طرف اشارہ ہے۔

”پس اسلام کی عزت کفر اور کافروں کی خواری میں ہے۔ جس نے اہل کفر کو عزت رکھا اس نے اہل اسلام کو خوار کیا۔ ان کے عزت رکھنے سے فقط تعظیم کرنا اور بلند بٹھانا ہی ملد نہیں۔ بلکہ اپنی مجلسوں میں جگہ دینا اور ان کی ہم نشینی کرنا اور ان کے ساتھ گفتگو کرنا سب اعزاز میں داخل ہے۔ کتوں کی طرح ان کو دُور کرنا چاہیے۔ اور اگر دنیاوی غرض ان کے متعلق ہو، جو ان کے بغیر حاصل نہ ہوتی ہو تو پھر بھی بے اعتباری کے طریق کو مد نظر رکھ کر بعد ضرورت ان کے ساتھ میل جول رکھنا چاہیے۔ اور کمال اسلام تو یہ ہے کہ اس دنیاوی غرض سے بھی درگزر کریں اور ان کی طرف نہ جائیں“ (ترجمہ)

۱۵۔ یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ اخیر عمر میں حضرت مجدد کے طرز عمل میں زیادہ ملائمت آگئی جس قسم کے خطوط کا ہم نے حوالہ دیا ہے وہ دفترِ اول میں بہت ہیں۔ دفترِ دوم میں شاذ و نادر اور دفترِ سوم میں بالکل نادر۔ بلکہ دفترِ سوم میں ایک خط ایسا ہے (مکتوب ۲۲) جس میں ”المشکون نجس“ کی تاویل مشرکوں کے حق میں کی ہے اور ملا مقصود علی تبریزی کو لکھا ہے ”آپ خلقِ خدا پر رحم کریں۔ اور عام طور پر ان کی نجاست کا حکم نہ دیں۔ اور مسلمانوں کو بھی کفار کے ساتھ ملنے جلنے کے باعث جس سے چارہ نہیں نجس نہ جائیں“۔ اسی طرح ایک اور خط میں انھوں نے چند سوالات کے جواب میں بعض ہندوؤں کے ”جذبہ“ بلکہ ”ایک قسم کی محبوبیت“ کا ذکر کیا ہے۔ ”... ہم نے بہت سے ہندوؤں کو دیکھا ہے کہ جذبہ رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ صاحبِ شریعت علیہ السلام کی متابعت سے آراستہ نہیں ہیں۔ اس لیے خراب و ابتر ہیں اور جذب کی صورت کے سوا کچھ نصیب نہیں۔“

سوال۔ جذب کا حاصل ہونا ایک قسم کی محبوبیت چاہتا ہے۔ پس کفار کے لیے جو اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں، جذبہ کا نصیب کس طرح تصور کیا جاتا ہے؟

جواب۔ ہو سکتا ہے کہ بعض کفار ایک قسم کی محبوبیت رکھتے ہوں جو ان کے جذب کے حاصل کرنے کا باعث ہوتی ہوں۔ [دفتر سوم مکتوب ۱۲۱ - ص ۳۱۷]

اسی طرح جب شیخ فریدی کی وفات کے بعد جہانگیر نے فتح کا ٹکڑہ کے لیے ایک ہندو جرنیل کو مامور کیا تو مجددی تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق حضرت مجدد نے اسے دعا و بشارت سے نوازا فرمایا

غیر مسلموں کے متعلق عام صوفیہ اور حضرت مجدد کے نقطہ نظر میں جو اختلاف تھا اس کا کچھ اندازہ سکھ راہنماؤں کے متعلق ان کے زاویہ نگاہ سے ہو سکتا ہے۔ حضرت میاں میر کی محاصرہ سکھ گرو سے دوستی تھی اور سکھ روایات کے مطابق امرتسر کے مشہور تالاب کا سنگ بنیاد حضرت میاں میر سے رکھوایا گیا۔ لیکن جب گرو ارجن دیو کی (شہزادہ خسرو کی سرپرستی کی وجہ سے) چھانگیر کے ساتھ (اور بعض نجی معاملات کی بنیاد پر) لاہور کے دیوان چند دلال سے کشمکش ہوئی۔ اور اس کشمکش میں اس کی موت واقع ہوئی تو حضرت مجدد نے شیخ فرید کے نام ایک خط میں اس پر بڑی غورشی کا اظہار کیا:-

”دریں وقت کشتن کا فرعون گور بند وال بسیار خوب واقع شد۔ و باعث شکست عظیم بر ہنود مردود گشت۔ بہر نیت کہ کشتہ باشد و بہر غرض کہ ہلاک کردہ خواری کفار نقد وقت اہل اسلام است۔“

غیر مسلموں کے متعلق عام صوفیہ اور حضرت مجدد کے نقطہ نظر میں جو فرق تھا اس کی بنیادی وجہ وہی تھی جس کا ہم ذکر کر چکے۔ یعنی ہندو اکیائییت کی تحریک جو بسا اوقات وارا سلطنت یا بڑے اسلامی شہروں مثلاً لاہور سے دور (اور بالخصوص ہندوؤں کے مقدس مقامات کے گرد و نواح میں) بڑی خطرناک صورت اختیار کرتی تھی۔ عہد اکبری میں متھرا کے ایک برہمن نے مسجد کی اینٹ پتھر کو ایک مندر کی تعمیر میں جس طرح استعمال کیا۔ اور مسلمان مالک کی مزاحمت پر رسول اکرم کی شان میں گستاخی کی اس کا ہم ذکر کر چکے۔ اس واقعے کا بیان صفحات تاریخ میں اس لیے آجاتا ہے کہ اس برہمن کو سزائے قتل دینے پر اکبر کے دربار میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ ہندوؤں کی سینہ زوری کے اور بھی کئی واقعات اطراف ملک میں ہو رہے تھے، لیکن درباری مورخین یا تو ان سے باخبر نہ تھے یا انھیں درج کتاب کرنا اپنے مروج بادشاہوں کی شان کے منافی سمجھتے تھے۔ حضرت مجدد کے مکتوبات میں ان کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک جگہ تھانیس میں ایک ایسے واقعہ کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

کفار ہند بے تحاشا مسجدوں کو گرا کر وہاں اپنے معبد و مندر تعمیر کر رہے ہیں۔
 چنانچہ تھانیسر میں حوض کرکھیت (کور و کشتیر) کے درمیان ایک مسجد اور ایک بزرگ
 کا مقبرہ تھا۔ اس کو گرا کر اس کی جگہ بڑا بھاری مندر بنایا ہے (دفتر دوم مکتوب ۹۲)۔
 اسی خط میں وہ آگے چل کر مسلمانوں کی مشکلات کی اور مثالیں دیتے ہیں (جو
 ہندو علاقوں میں دیہی اور کاروباری نظام ہندوؤں کے ہاتھ میں ہونے سے پیدا
 ہوتی تھیں)۔

نیز کفار اپنی رسموں کو کھلم کھلا بجالا رہے ہیں۔ اور مسلمان اکثر اسلامی احکام کے
 جاری کرنے میں عاجز ہیں۔ ایکادشی کے دن ہندو کھانا ترک کر دیتے ہیں۔ بڑی
 کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی شہروں میں کوئی مسلمان اس دن روٹی نہ پکائے
 اور نہ بیچے۔ اور ماہ مبارک رمضان میں بر ملا نان و طعام پکاتے اور بیچتے ہیں۔
 مگر اسلام کے مغلوب ہونے کے باعث کوئی روک نہیں سکتا۔

ہائے افسوس! بادشاہ وقت ہم میں سے ہو اور پھر ہم فقیروں کا اس طرح خستہ
 و خراب حال ہو۔

یہ حالت تو شاہی علاقے کے قصبات و دیہات میں تھی۔ جہاں (مثلاً مشرقی
 پنجاب کے پہاڑی علاقے میں) ہندو ریاستیں ابھی قائم تھیں۔ وہاں قریب کی
 مسلمان آبادیوں پر گاسہے گاسہے حملے اور بڑے مظالم برپا ہوتے۔ حضرت مجدد
 ایک خط میں خواجہ شرف الدین حسین کو لکھتے ہیں:-

تم کو معلوم ہو گا کہ ان ہی دنوں میں دارالحرب کے کفار نے نگر کوٹ کے گرد و نواح میں
 مسلمانوں اور مسلمانوں کے شہروں پر کیا کیا ظلم و ستم کیے ہیں۔ اور کیسی اہانت
 کی ہے۔ (دفتر دوم مکتوب ۶۹)

سریند کا مقام وقوع ایسا تھا کہ اس کے ایک طرف ہندوؤں کا مذہبی مرکز تھا نیر
 تھا۔ دوسری طرف گوند وال جہاں ان دنوں گوند والین کا قیام تھا اور سکھ قوم
 کی نئی تنظیم ہو رہی تھی۔ جس میں جیسا کہ ترک جہانگیری سے پتا چلتا ہے، بعض

مسلمان بھی جذب ہو رہے تھے۔ تیسری طرف پُرانا تیرہ نگر کوٹ تھا۔ یہ سب ہندو سکھ احیائیت کے مرکز تھے۔ بیچ میں سرہند تھا۔ اس لیے حضرت مجدد کو ہندوؤں کی جارجانہ سرگرمیوں سے واقف ہونے کے وہ سامان میسر تھے، جو دارالسلطنت میں رہنے والوں (حتیٰ کہ بدایونی) کو بھی حاصل نہ تھے۔

اس کے علاوہ انھوں نے اپنے خُسر (حاجی سلطان تھا تیسری) کی زندگی (اور موت) میں (تھا تیسرے ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے) جو کچھ دیکھا۔ وہ ایک الگ درس عبرت تھا۔

حضرت مجدد کے گرد و پیش جب اس طرح کے واقعات پیش آرہے تھے تو چنچاں جاے تعجب نہیں کہ غیر مسلموں کی نسبت ان کا زاویہ نگاہ عام صوفیہ سے بالکل مختلف تھا۔

حضرت مجدد کا غیر مسلموں کے متعلق جو خاص نقطہ نظر تھا، اور جو فی الحقیقت ہندوؤں کی جارجانہ احیاء کی تحریک کے خلاف ردِ عمل تھا، اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ اکبر کے زمانے سے ہندوؤں کی تالیفِ قلوب کے لیے جو مصالحانہ کوششیں ہوئی تھیں، ان کی مخالفت شروع ہوئی۔ اکبر کے زمانے میں جزیہ موقوف ہوا تھا اور ذبح بقر پر پابندیاں لگائی گئیں۔ حضرت مجدد کو یہ دونوں باتیں ناگوار تھیں اور ان کی بڑی خواہش تھی کہ جزیہ نئے سرے سے لگایا جائے اور ذبح بقر عام طور پر رائج ہو۔ اس کی کوشش انھوں نے جہانگیر کی تخت نشینی کے فوراً بعد شروع کی۔ کئی خطوں میں اس بات کا افسوس کیا ہے کہ ہندوؤں سے جزیہ لینا برطرف کر دیا گیا ہے۔ ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں: ”جزیرہ ازل کفر کہ در ہندوستان بر طرف شدہ است“

۱۰ حضرت مجدد نے ہنود کے لیے ذمی کا لفظ کہیں نہیں استعمال کیا۔ ہمیشہ اہل کفر کہتے ہیں۔ جزیہ کفار سے نہیں لیا جاتا۔ اہل کتاب ذمیوں سے لیا جاتا ہے۔ لیکن جب مسلمان ہندوستان میں آئے اور انھوں نے دیکھا کہ اکثر مندوبت پرست ہیں، لیکن ان کے طریقے کفار مکہ سے مختلف ہیں۔ اور [باقی اگلے صفحے پر]

بواسطہ شومی مصاحبت اہل کفر است باسلاطین ایں دیار۔ ایک اور خط میں ذبح بقر کی تائید کی گئی ہے۔ ”ذبح بقر در ہندوستان از اعظم شعائر اسلام است۔ در ابتدائے بادشاہت اگر مسلمانی رواج یافت۔ فہما و اگر عیاذاً باللہ سبحانہ در وقت افتاد کار بر مسلمانان بسیار مشکل خواهد شد۔“

اختلافات کا حل

حضرت مجدد نے ہندوؤں کی جارحانہ حیثیت کا شرکیہ ترک کی جواب دیا۔

وہ ان کوششوں کے بھی خلاف تھے، جو اسلام اور ہندومت کے امتزاج کے متعلق بعض ہندو اور مسلمان پسند کرتے تھے۔ دفترِ اقل میں ایک خط ایک ہندو ہوسے رام کے نام ہے، جس نے حضرت مجدد کے نام دو خطوں میں فقرات صوفیہ سے محبت کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ رام اور رحمان حقیقت میں ایک ہیں۔ حضرت مجدد کو اس طرز استدلال میں خطرہ نظر آتا تھا۔ انھوں نے ایک پُر زور خط میں مکتوب نگار کے نقطہ نظر کی تردید کی اور لکھا۔ ”رام اور رحمان کو ایک جاننا بڑی بے وقوفی ہے۔ خالق مخلوق کے ساتھ ایک نہیں ہوتا۔ اور چوں بے چوں کے ساتھ متحد نہیں ہوتا۔“ غیر مسلموں کی نسبت حضرت مجدد کا انداز بیان عام صوفیہ سے مختلف تھا۔ لیکن ان کا نقطہ نظر محض منفيانہ نہ تھا۔ انھوں نے حالات کے تحت بعض جگہ بڑے سخت الفاظ استعمال کیے، لیکن ہندو مسلم مسئلے کا انھوں نے ایک حل بھی پیش کیا۔ اور شاید کشیدگی کو دور کرنے اور ملک میں ایک خوشگوار فضا پیدا کرنے کے لیے سب سے کارآمد طریق کار وہی تھا۔ ان کی نگہ تیز بین نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات اتنے بنیادی ہیں کہ دین الہی کا ملغوبہ بنا کر رام اور رحمان کو ایک کہہ کر انھیں جوڑا نہیں جاسکتا۔ یہ ایک سعیِ لاحاصل ہے۔ یا خرابیوں کا پیش خیمہ

(بقیہ نوٹ ص ۳۲۳)

ان میں سے کئی اپنے خیال کے مطابق خدا سے واحد کی عبادت کرتے ہیں تو انھوں نے ان سے بھی وہی سلوک کیا جو فقہی کتب میں اہل کتاب ذمیوں کے لیے مخصوص تھا۔ حضرت مجدد ہندو کو کافر کہتے ہیں لیکن وہ قدیم ہندوستان میں پیغمبرِ مبعوث ہونے کے قائل تھے۔

اور بہر کیف اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک خطرہ عظیم ہے۔ باہمی امن و امان کی خاطر اور ہندوستان کے خاص حالات کے لیے، زیادہ سے زیادہ وہ جس بات کو گوارا کر سکتے تھے، وہ یہ تھی۔ ”مسلمانانِ بر دین خود باشند و کفار بر کیش خود۔“ (آیہ کریمہ) لکم دینکم ولیٰ دینِ بیانِ این معنی است“ (مکتوبات) یعنی امتزاج یا اتحاد (Co-existence) نہیں۔ رواداری (Co-existence) اور کیا یہ طریق کار حالات کا واحد قابل عمل ہونے کے علاوہ منصفانہ نہ تھا؟

ہندوؤں کے متعلق حضرت مجدد نے بسا اوقات اظہارِ خیال بڑی تلخی اور غیظ و غضب سے کیا۔ اور بہر کیف ان کا اندازِ فکر اور اسلوبِ اظہار ان صوفیہ سے بالکل مختلف تھا، جنہیں ہندو و احیائیت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ہندو مسلم اختلافات کے متعلق تاریخ نے ان کے نقطہ نظر کی تائید کی۔ ہندو مسلم اتحاد کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ انگریزی عہد میں اختلافات اور بڑھ گئے۔ اور برصغیر کو بھارت اور پاکستان میں تقسیم کرنا پڑا۔ شاید ان ملکوں کے رہنما اور بیرونی خیر خواہ بھی کبھی سرسند کے اس ”مردِ آخریں“ کی رائے تسلیم کر لیں کہ ان دونوں کے درمیان امن اور سلامتی کا رشتہ اتحاد نہیں بلکہ ہمسایانہ رواداری (Neighbourly Coexistence) ہے۔

ہندوستان میں تصوف کی تھوڑی کتابوں کو وہ قدر و منزلت دیتے آئے ہیں جو مکتوباتِ امام ربانی کو نصیب

مکتوباتِ امام ربانی

ہے۔ حضرت سرہندی کی زندگی ہی میں ان کی نقلیں، ہندوستان اور ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں میں پھیل گئی تھیں۔ اور آج بھی ان کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی لکھتے ہیں:-

”تصوف اسلام کے ذخیرہ میں سب سے زیادہ اثر میرے اوپر دو ہی کتابوں کا پڑا ہے۔ نمبر اول پر مشتمل ہے جس نے دہریت و الحاد سے کھنچ کر مجھے اسلام کی راہ دکھائی۔ اس اجمال کے بعد ضرورتِ تفصیل کی تھی۔ یعنی اسلام کے اندر عمائد و اعمال میں مستحقینِ راہ کون سی اختیار کی جائے۔ اس باب میں شمعِ ہدایت کا کام مکتوبات ہی دیا۔“

مکتوباتِ امام ربانی حضرت مجدد کی زندگی میں ہی مرتب ہو گئے تھے۔ ان کی تین جلدیں ہیں۔ دفترِ اوّل۔ جسے دُرّ المعرفت بھی کہتے ہیں۔ ۳۱۳ خطوط پر مشتمل ہے۔ اسے خواجہ یار محمد بدخشی نے ۱۶۱۶ء میں یعنی ثبوسی سے تین سال پہلے ترتیب دیا ہے۔ یہ مجموعہ سب سے مفصل ہے۔ اور اس میں کئی سالوں کے خطوط جمع ہیں۔ پہلے میں خطوط وہ ہیں جو حضرت سرہندی نے اپنے پیرو مرشد خواجہ باقی باللہ کو لکھے۔ پھر متعدد خطوط شیخ فرید اور دوسرے امراء جہانگیری کے نام ہیں جن میں انھیں تلقین کی گئی ہے کہ وہ نئے بادشاہ کے زمانے میں ترویجِ دین کی کوشش کریں۔ باقی خطوط میں سوالوں کے جواب ہیں۔ یا علمی اور مذہبی مسائل کی توضیح ہے۔ چونکہ اس زمانے میں ان کے مکتوبِ باز و دم پر (جس میں انھوں نے اپنے عروج کا ذکر کیا تھا) اعتراضات شروع ہو گئے تھے۔ اس لیے اس جلد کے آخر میں کئی خطوط اپنے معترضوں کی تسکین کے لیے لکھے گئے ایک چالیس صفحے کا خط اپنے مرشد زادوں کے نام ہے۔ جس میں اہل سنت والجماعت کے عقائد بیان کیے ہیں۔ دفترِ اوّل کے آخر میں جواں مرگ صاحبزادہ خواجہ محمد صادق کے وہ تین خطوط درج ہیں جو انھوں نے اپنے والد ماجد کی خدمت میں ارسال کیے۔ دفترِ دوم جس کا تاریخی نام نور الخلائق ہے۔ ۱۶۱۹ء میں یعنی واقعہ قید سے ذرا پہلے مرتب ہوا۔ اسے خواجہ عبدالحی نے خواجہ محمد محصوم کے ایما پر جمع کیا۔ اس میں خطوط مقوڑے ہیں۔ فقط ننانوے۔ لیکن ان میں سے بعض بڑے طویل اور مفصل ہیں۔ ایک خط بیس صفحے سے زیادہ خواجہ محمد تقی کے نام ہے۔ جس میں اہل سنت اور شیعہوں کے خیالات سے بڑی مدلل بحث کی ہے اور اپنے نقطہ نظر کی توضیح کی ہے۔ ایک پندرہ صفحے کا خط خان جہان کے نام ہے۔ اس میں اسلامی عقائد کو تفصیل سے منضبط کیا ہے۔ چند ایک خط اپنے مرشد زادوں کے متعلق ہیں۔ باقی خطوط میں بیشتر مسائل صوفیہ کی توضیح ہے۔

دفترِ سوم موسوم بہ معرفت الحقائق کی ترتیب میر محمد نعمان نے شروع کی۔ لیکن انھوں نے فقط تین کے قریب مکاتیب جمع کیے تھے۔ باقی کو خواجہ محمد ہاشم کشمی

برہانپوری نے ۱۶۲۲ء میں یعنی حضرت مجدد کی وفات سے تین سال پیشتر نقل کرنا شروع کیا۔ پہلے اس میں ۱۱۴ خطوط تھے۔ خواجہ محمد ہاشم زبدۃ المقامات میں لکھتے ہیں کہ دفتر سوم ۱۱۴ مکاتیب پر ختم کر دیا گیا۔ اور دفتر چہارم شروع ہوا، لیکن ابھی چودہ مکاتیب بکھے گئے تھے کہ حضرت مجدد کا وصال ہو گیا۔ اس لیے ان چودہ مکاتیب کو بھی دفتر میں شامل کر لیا گیا۔ اس حساب سے دفتر سوم میں ۱۲۸ مکاتیب ہونے چاہئیں۔ لیکن مطبوعہ دفتر سوم میں ۱۲۴ مکاتیب ہی ملتے ہیں۔ یعنی زبدۃ المقامات کے بیان کے مطابق ۴ مکاتیب مطبوعہ نسخوں میں نہیں۔ دفتر سوم کے بیشتر خطوط اس وقت لکھے گئے، جب حضرت مجدد قلعہ گوالیار میں محبوس تھے یا لشکر شاہی کے ہمراہ رہتے تھے، کئی ایک خطوط مخدوم زادگان کے نام ہیں۔ ایک خط (۱۰۹) میں اس گفتگو کا ذکر ہے، جو حضرت مجدد نے ایک دفعہ جہانگیر کی مجلس میں کی تھی۔ ایک خط جہانگیر کے نام ہے۔ جس میں دُعا کے اسرار اور علماء و صلحا کی تعریف بیان کی ہے۔ ایک نہایت دلچسپ خط (۴۱) ایک صالحہ عورت کے نام ہے، جس میں ان شرطوں کی توضیح کی ہے، جن پر عورتوں کی بیعت ہونی چاہیے۔ اور اس میں تمام وہ بدعتیں بالتفصیل گنائی گئی ہیں۔ جن میں ہندوستانی عورتیں خاص طور پر گرفتار ہیں۔ (مثلاً سیٹلا اور چچک کے موقع پر دیوی کی منت ماننا۔ مشائخ کی قبروں پر منت کے جانور ذبح کرنا۔ پیروں کے روزے رکھنا۔ شگون کا اعتبار کرنا۔ جادو کا قائل ہونا) اور جن کی اصلاح کے لیے حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید نے کوشش کی مکتوبات سے ہم نے اس قدر حوالے دیے ہیں کہ اب کسی طویل اقتباس کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ تو تمام کے تمام پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہیں۔ لیکن انھیں پڑھنے سے پہلے تصوف اور مذہب اسلام کے مشہور مسائل اور ان کی تاریخ سے تھوڑی بہت واقفیت ہونی چاہیے۔ تاکہ حضرت مجدد کی قابلیت و راست خیالی اور سلیم الطبعی کا صحیح اندازہ ہو سکے اور یہ معلوم ہو کہ جو صدیوں کی بُرائی گتھیاں تھیں، انھیں شرع اور عقل و سمجھ کے موافق انھوں نے کس طرح سلجھانے کی کوشش کی۔

اس کے علاوہ عہدِ اکبری اور عہدِ جہانگیری کے واقعات اور ممتاز شخصیتوں سے متھوڑی بہت واقفیت ہو تو مکتوبات کی دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے۔

مکتوبات کی مقبولیت کی اگر بڑی وجہ ان کے مضامین کی خوبی، تنوع اور صاحب مکتوبات کی علمیت اور روحانی فصیلت ہے تو اس کے علاوہ حضرت مجدد کے طرزِ تحریر کو بھی ان کے اثر میں بڑا دخل ہے۔ ان مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ مجدد بڑے بلند پایہ اہل قلم تھے اور خط لکھتے وقت مکتوبات کی انشائی خوبیوں پر بھی پوری نظر رکھتے تھے۔ ان کے خطوط میں بیشتر علمی اور دینی مسائل ہیں اور ان کے لیے وہی عالمانہ طرزِ تحریر اختیار کیا ہے۔ جس میں زیادہ سے زیادہ معانی تھوڑے سے تھوڑے الفاظ میں ادا ہو جائیں۔ وہ اربابِ تصوف کی مروجہ مطلق کثرت سے استعمال کرتے تھے اور جو لوگ ان سے ناواقف ہیں، انھیں بعض مطالب سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ لیکن عام طور پر تفصیل الفاظ تھوڑے ہیں اور بالخصوص ان مکتوبات میں جو عقائد کی توضیح میں یا مبتدیانوں اور نوجوان طالبوں کو لکھے گئے، زبان بڑی سلیس اور عام فہم ہے۔ مکتوباتِ انام ربانی کا ایک اہم جز معاصرانہ اُمرائے نام ہے۔ جس میں انھیں شریعت کو سمجھانے اور اسلام کی مدد کرنے کی تلقین کی ہے۔ ان خطوط کا طرزِ تحریر علمی خطوط سے مختلف ہے۔ عالمانہ مطلق ان میں بہت کم ہیں۔ الفاظ پر وقار مگر سیرج الفہم ہیں، لیکن طرزِ تحریر میں ایک ہوش ہے۔ خطیبانہ اور پُر تاثیر۔ یہ خطوط دل سے نکلے ہوئے جذبات کا آئینہ ہیں۔ اس لیے دل پر اثر کرتے ہیں۔

آپ تشریح اور تاثیر کے لیے گاہے گاہے مکاتیب میں کوئی دلچسپ شعر یا مصرع بھی درج کر دیتے۔ جس سے انداز کی دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا۔ اس کے علاوہ الفاظ کے انتخاب اور تقابل کا بھی خیال کرتے۔ ایک خط میں ملا حسن کشمیری کو لکھتے ہیں :-

”نوشتہ بودند کہ شیخ عبد الکبیر یعنی گفتہ است کہ حق سبحانہ و تعالیٰ عالم الغیب نیست“

بے اختیار رگ فاروقیم در حرکت می آید۔ فرصت تاویل و توجیہ نمی دهد۔ قائل اس
سخن شیخ کبیر مینی باشد یا شیخ اکبر شامی، کلام محمد علیہ وآلہ و الصلوٰۃ والسلام
در کار است۔ نہ کلام محی الدین عربی و صدر الدین قونیوی و عبدالرزاق کاشی۔ مارا
بہ نص کار است۔ نہ بہ نص۔ مارا فتوحات مدینہ (یعنی احادیث) از فتوحات مکہ مستغنی
ساختہ است۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت کا طرزِ تحریر یا تو علمی ہوتا ہے، علمی مسائل کی توضیح کے لیے
یا خطیبانہ۔ جب اپنے جذبات کا اظہار اور دوسروں کو کسی اقدام کی تلقین مقصود ہو۔
لیکن چند ایک خطوط اس تقسیم سے باہر ہیں۔ ان میں سے ایک خط جو انھوں نے
صاحبزادوں کو حالتِ قید میں لکھا اور جس میں پدرانہ محبت نے نہایت ملائم اور شیریں
الفاظ کا جامہ پہنا ہے، درج کیے بغیر جی نہیں مانتا۔

» فرزندان گرامی بہ جمعیت باشند۔ مردم ہمہ وقت محنتا ہے مارا در نظر میدارند و مخلصی
ازین مضیق می طلبند۔ نمیدانند کہ در نامرادی و بے اختیاری چہ بلا حسن و جمال است۔
و کدام نعمت بزرگ آن است کہ ایں کس را بے اختیار از اختیار او بر آرند۔ و با اختیار خود
اور از زندگانی دہند۔ و امور با اختیاری اور انیز تابع آن بے اختیاری اور ساختہ اور از زواری
اختیار او بر آرند۔... در ایام مجلس گاہے کہ مطالعہ ناکامی و بے اختیاری خود می نمود۔
عجب حظ می گرفتہ و طرفہ فوق می یافتہ۔ بلے ارباب فراغت، ذوق ارباب، بلا را چہ
دریابند۔ و از بلاے جمال او چہ درک نمایند۔ طفلان را حفظ مخلص در شیرینی است و
آنکہ از تلخی حظ وافر گرفته است۔ شیرینی را بجز سے نمی خورد و
مُرغ آتش خوارہ کے لذت شناسد و اندہ را

تاریخی لحاظ سے اس سے بھی اہم خط وہ ہے، جو صاحبزادگان کے نام واقعہ قید
کے بالکل آغاز میں لکھا گیا۔ اس میں ان کے لیے پدرانہ نصیحتیں ہیں۔ عتابِ شاہی سے
جو صورتِ حالات پیدا ہو گئی تھی، اس کا اظہار بھی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں ظرف
اور حوصلے اور تسلیم و رضا کا مظاہرہ ہے۔ ہم اسی ”وصیت نامہ“ پر اس بیانِ ختم کرتے ہیں

فرزندِ عزیز!

ابتلا کا وقت اگرچہ تلخ و بے مزہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر فرصت دیں تو غنیمت ہے۔ تم کو اب فرصت مل گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد بجالا کر اپنے کام میں لگے رہو۔ اور ایک دم بھی فراغت و آرام اپنے لیے پسند نہ کرو۔ اور تین چیزوں میں سے ایک میں ضرور مشغول رہو۔ قرآن شریف کی تلاوت کرو۔ یا لمبی قرات کے ساتھ نماز کو ادا کرو۔ یا کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کی تکرار کرتے رہو۔ کلمہ لا الہ الا اللہ کے ساتھ حق تعالیٰ کے سوا تمام جھوٹے خداؤں اور اپنے نفس کی خواہشات کی نفی کرنی چاہیے۔ اور تمام مرادوں اور مقصودوں کو دفع کرنا چاہیے۔ کیونکہ اپنی مراد کا طلب کرنا اپنی الوہیت کا دعویٰ کرنا ہے۔ بلکہ سینہ میں کسی مراد کی گنجائش نہ رہے۔ اور متخیلہ میں بھی کوئی ہو جس باقی نہ رہے تاکہ بندگی کی حقیقت حاصل ہو۔ اپنی مراد کو طلب کرنا گویا اپنے مولا کی مراد کو دفع کرنا اور اپنے مالک کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔ اس امر میں اپنے مولا کی نفی اور اپنے موٹے بننے کا اثبات ہے۔ اس امر کی بُرائی اچھی طرح معلوم کر کے اپنی الوہیت کے دعوے کی نفی کرو۔ تاکہ تمام ہوا و ہوس سے کامل طور پر پاک ہو جاؤ۔ اور طلبِ مولا کے سوا تمھاری کوئی مراد نہ رہے۔ یہ مطلب اللہ تعالیٰ کی عنایت سے بلا و ابتلا کے زمانہ میں بڑی آسانی سے میسر ہو جاتا ہے۔ اور اس زمانہ کے سوا ہوا و ہوس سدا سکندری ہے۔ گوشہ میں بیٹھ کر اس کام میں مشغول رہو۔ کہ اب فرصت غنیمت ہے۔ فتنہ کے زمانے میں تھوڑے کام کو بہت اجر کے عوض قبول کر لیتے ہیں۔ اور فتنہ کے زمانے کے سوا سخت ریاضتیں اور مجاہدے درکار ہیں۔ اطلاع دینا ضروری ہے۔ شاید ملاقات ہو مانہ ہو۔

یہی نصیحت ہے کہ کوئی مراد ہوس نہ رہے۔ اپنی والدہ کو بھی اس امر پر اطلاع دے دو۔ اور اسے اس پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دو۔

باقی احوال چونکہ یہ جہاں قانی اور گزرنے والا ہے کیا لکھے جائیں۔ بھولوں پر شفقت رکھو۔ اور ان کو پڑھنے کی ترغیب دو۔ اور جہاں تک ہوس کے تمام

اہل حقوق کو ہماری طرف سے راضی کرو۔ اور ایمان کی سلامتی کی دُعا سے مُند و معاون ہو۔
 بار بار یہی لکھا جاتا ہے کہ اس وقت کو بیودہ امور میں ضائع نہ کرو۔ اور ذکرِ الہی
 کے سوا کسی کام میں مشغول نہ ہو۔ اب کتابوں کے مطالعہ اور طلبہ کے تکرار کا وقت
 نہیں ہے۔ اب ذکر کا وقت ہے۔ تمام نفسانی خواہشوں کو جو چھوڑے خدا ہی لا
 کے نیچے لاکر سب کی نفی کر دو۔ اور کوئی مُراد و مقصود سینے میں نہ رہنے دو۔ سستی کہ
 میری خلاصی بھی جو کہ تمہارے لیے نہایت ضروری ہے۔ تمہاری مُراد و مطلوب
 نہ ہو۔ اور حق تعالیٰ کی تقدیر اور فعل اور ارادہ پر راضی ہو۔ اور کلمہ طیبہ کے
 اثبات کی جانب میں غیب ہوتیت کے سوا جو تمام معلومات و متخیلات کے درار
 الود ہے۔ کچھ نہ رہے۔ حویلی و سرائے و چاہ و باغ اور کتابوں اور دوسری تمام اشیاء
 کا غم سہل ہے۔ ان میں کوئی چیز تمہارے وقت کی مانع نہ ہو اور حق تعالیٰ کی مرضیتاً
 کے سوا تمہاری کوئی مُراد و مرضی نہ رہے۔ ہم اگر مرجاتے تو یہ چیزیں بھی چلی جائیں۔
 بہتر ہے کہ ہماری زندگی میں چلی جائیں تاکہ کوئی فکر نہ رہے۔ اولیا رہنے ان امور
 کو اپنے اختیار سے چھوڑا ہے۔ ہم حق تعالیٰ کے اختیار سے ان امور کو چھوڑ
 دیں۔ اور شکر بجالائیں۔ امید ہے کہ مخلصین بفتح لام میں سے ہو جائیں گے۔
 جہاں تم بیٹھے ہو۔ اسی کو اپنا وطن خیال کرو۔ چند روزہ زندگی جہاں گزرے۔
 یادِ حق میں گزر جائے۔ دُنیا کا معاملہ آسان ہے۔ اس کو چھوڑ کر آخرت کی طرف
 متوجہ رہو۔

اپنی والدہ کو تسلی اور آخرت کی ترغیب دو۔ باقی رہی ایک دُوسرے کی ملاقات
 اگر خدا سے تعالیٰ کو منظور ہوگا۔ تو ہو کر رہے گی۔ ورنہ اس کی تقدیر پر راضی رہو۔
 اور دُعا کرو کہ دارالسلام میں سب جمع ہوں۔ اور دُنیاوی ملاقات کی تلافی
 کو اللہ تعالیٰ کے کرم سے آخرت کے حوالہ کریں۔ الحمد للہ علی کل حال۔
مخدوم زادگان کی والدہ محترمہ | حضرت مجدد الف ثانی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ
 آپ کے دو خوارق تھے۔ ایک تو آپ کے مکاتیب، دوسرے آپ کے فرزند ان گرامی۔

ایک سے آپ کی علمیت، ذہنی جرأت، سلیم الحیالی، حمیت دینی اور سلیقہ، تحریر کا پتہ چلتا ہے، جن کا ظہور آپ کے مکتوبات میں ہوا ہے۔ دوسرے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ آپ ایک خوش قسمت، شفیق اور فرض شناس باپ تھے، جنہوں نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت اس طرح کی کہ وہ مراتب عالیہ کو پہنچے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کڑی آزمائشوں (مثلاً زمانہ سلاطین میں تین صاحبزادگان اور ایک صاحبزادی کی وفات، عہدِ جاگیر میں قید اور پھر لشکر میں نظر بندی) کے باوجود آپ کے خاندان کو ایک مثالی خاندان سمجھنا چاہیے۔

آپ کی زوجہ محترمہ ایک بڑے باپ کی بیٹی تھیں اور آپ سے انتساب اور آپ کے دکھ سکھ میں شریک رہنے کی وجہ سے ہی ہماری روحانی تاریخ میں انھیں جو مرتبہ مل جاتا ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ لیکن مکاتیب اور تذکروں میں جو ضمنی اندراجات ملتے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ محترمہ نہ صرف ایک بڑی عابدہ، متدین اور باہمت خاتون تھیں، بلکہ آپ دونوں کے درمیان غیر معمولی محبت اور یگانگت کا رشتہ تھا۔ اور آپ کو ان کا بڑا پاس خاطر ملحوظ تھا۔

حضرت مجددؑ کو جس طرح آپ کا خیال رہتا تھا، اس کا مقوڑا بہت اندازہ اس اہم خط سے ہوتا ہے، جو انھوں نے قید کے بالکل آغاز میں صاحبزادگان کے نام لکھا۔ (دفتر سوم، مکتوب دوم)۔ اس میں صبر و تسلیم کی پوری وضاحت کر کے اور رضائے الہی کے سامنے اپنی خواہشات کو بالکل مٹا دینے کے بارے میں متعدد دلائل دے کر لکھتے ہیں۔ ”والدہ خود را نیز بدین معنی مطلع سازند و دلالت نمائند“ خط کے آخر میں پھر انھیں کا ذکر ہے۔ ”والدہ خود را تسلی دہند“ لیکن شاید اس سے بھی اہم ایک اور واقعہ ہے، جو غیر معمولی یگانگت، محبت اور اعتماد کی نشاندہی کرتا ہے۔ جب آپ اجیر میں تھے۔ تو حضرت خواجہ اجیری کے خادمان درگاہ نے ان کے مزار کا قبر پوش جو ہر سال اُتارا جاتا ہے، اور کم از کم اس زمانے میں، فقط خواص کے لیے وقف تھا، آپ کو پیش کیا۔ آپ نے ادب سے قبول کیا۔ اور خادم کو دے کر کہا۔ کہ یہ

لباس جو حضرت خواجہ کے اس قدر قریب تھا ہمارے کفن کے لیے محفوظ رکھا جائے۔ یہ روایت خواجہ ہاشم کشمی کی ہے، جو سفرِ اجیر میں ساتھ تھے۔ لیکن آگے چل کر وہی لکھتے ہیں کہ جب آپ کا وقت وصال آن پہنچا تو آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ سے فرمایا: ”باید کہ از مبلغ ہر خود کفن من سازی۔“ اس غیر معمولی وصیت کی سوائے اس کے کوئی اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ کو محترمہ کی انتہائی عقیدت کا احساس تھا جس کی تائید تذکرہ نگاروں کے بیان کردہ دوسرے واقعات سے بھی ہوتی ہے، اور اس اعزاز سے اس عقیدت کا اعتراف اور پوری یگانگت کا اظہار مقصود تھا۔

تذکرہ نگار صاحبزادگان کی والدہ محترمہ کی عبادت اور پرہیزگاری کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور ہم حضرات القدس کی بیان کردہ ایک حکایت سے اس راجعہ عصر کے متعلق اس مختصر اندراج کو ختم کرتے ہیں:-

ایک دفعہ آپ زمانہ شباب میں بیمار ہوئے۔ اور اتنا ضعیف بڑھا کہ سب لوگ مایوس ہو گئے۔ والدہ حضرت مخدوم زادگان عالی قدر یعنی حضرت کی بی بی صاحبہ نے جو ایک صالحہ اور عابدہ بی بی تھیں، نیا وضو کیا۔ اور دو رکعت نماز ادا کی۔ اور کمال گریہ زاری و نیاز درگاہ باری جلالت عظمیٰ میں آپ کی صحت و عافیت کے لیے دعا کی۔ اس حال میں اس زہراء وقت کو نیند آگئی۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا آپ سے کہہ رہا ہے کہ اطمینان رکھو۔ ہم کو ان سے بڑی خدمتیں لینی ہیں۔ اور ابھی تو ہزار خدمتوں میں سے ایک بھی نہیں لی گئی۔ خدا سے پاک و قریب آپ کو صحت کامل عطا فرمائے گا۔ اور مرا تیب قرب تک پہنچائے گا۔ (۱۸)

خواجہ محمد سعید | حضرت مجدد کے بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادق تھے، جو عین جوانی میں بعارضہ طاعون وفات پا گئے۔ دوسرے بیٹے خواجہ محمد سعید تھے، جو شہان شاہ (اپریل ۱۵۹۷ء) میں پیدا ہوئے۔ علوم متداولہ، عقلیہ و نقلیہ کی پوری طرح تحصیل کی اور پھر درس و تدریس شروع کی۔ حضرات القدس میں لکھا ہے۔ ”کتاب متعلقہ مثل شرح حکمت الحین اور عضدی اور بیضاوی کا درس دیا کرتے

تھے۔ اور تصانیف لطیفہ تحریر فرمائیں۔ چنانچہ آپ نے مشکوٰۃ شریف پر حاشیہ لکھا۔ اور حنفی مذہب کی تائید کی۔ اور ایک حاشیہ متن حاشیہ خیالی پر لکھا۔۔۔ ایک رسالہ تشہد میں دفع سبابہ کی ممانعت کے بارے میں تحریر فرمایا۔ آپ کے مکتوبات حال (۱۹۶۶ء) میں مکتبہ حکیم سہیلی لاہور کی طرف سے شائع ہو گئے ہیں۔ بعض مکاتیب

۱۔ مکتوبات سعیدیہ کے ناشر حکیم ذوالقرنین صاحب نے کتاب کے شروع میں لکھا ہے: ”چیف ایڈمنسٹریٹر صاحب اوقات مغربی پاکستان جناب شیخ محمد اکرام صاحب نے [مکتوبات سعیدیہ کی] کتابت کے حسن و جمال اور صاحب کلام کے علوم مرتبہ و کمال کو دیکھ کر اس کی طباعت و اشاعت کے لیے محکمہ سے قرض حسنہ دینا منظور فرمایا۔“ یہ بیان ذرا وضاحت طلب ہے۔ مکتوبات سعیدیہ کی اشاعت کے لیے مجھے سب سے پہلے جناب مولانا ابوالخلیل حسنا سجادہ نشین خانقاہ کنڈیاں شریف مدظلہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ بلکہ انھوں نے کمال محبت دینی و معارف پروری اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ بھی ارسال فرمایا۔ چنانچہ اسی نسخہ کی بنا پر کتاب کی اشاعت کا ارادہ تھا۔ لیکن اس دوران میں سید شبیر بخاری صاحب مشیر تعلیمات و ناظم نشریات محکمہ اوقات حکیم ذوالقرنین صاحب والا نسخہ لائے جس کی کتابت میں واقعی بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔ چنانچہ اسی کی اشاعت کا انتظام ہوا۔ (۱) مکتوبات سعیدیہ کی اشاعت کے علاوہ راقم السطور کی نظامت اوقات کے زمانے میں مجددیہ سلسلہ کی جن اصل فارسی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ حسب ذیل ہیں: (۲) مکتوبات امام ربانی ہر سہ دفتر (امریٹری ایڈیشن) (۳) رسائل مجددیہ (۴) مکتوبات خواجہ محمد مصحوم (ہر سہ دفتر) (۵) زبدۃ المقامات (۶) حضرات القدس (دفتر ثانی مع تذکرہ حضرت خواجہ باقی باللہ از دفتر اول) اور (۷) کلیات حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ۔ [دیوان ہاشم کشمیری کے لیے بھی کوشش جاری ہے] محکمہ اوقات کتاب کی نصف لاگت کے لیے قرض حسنہ دینے کے علاوہ اس کے سونے خریدنا تھا۔ فی الواقع ان کتابوں کی اشاعت ناشرین کی ہمت اور محبت و عقیدت کی مہربان منت ہے۔ افسوس کہ اب فارسی کا رواج اس قدر کم ہو گیا ہے کہ ان کتابوں کی عام کاسی بہت تھوڑی ہے لیکن انھیں کم از کم سب کتب خانوں میں ہونا چاہیے اور سلسلہ کے سجادہ نشین حضرات اور دوسرے محبوں کو بھی باہمت ناشرین کی سرپرستی کرنی چاہیے۔

عربی میں ہیں۔ اور سب ملاکر ایک سو سے زیادہ نہیں (غالباً یہ ایک انتخابی مجموعہ ہے) لیکن ”ہر چند بقامت کہتر“ بقیمت بہتر“ والا معاملہ ہے۔ معانی کی گہرائی اور عبارت کی شیرینی نے اس مختصر مجموعہ میں عجب دلکشی پیدا کر دی ہے۔ نو خطوط اورنگ زیب عالمگیر کے نام ہیں۔ جن میں شاید بعض (مثلاً مکتوب ۱۸) اس کی شہزادگی کے زمانے کے ہیں ان مکاتیب کا خواجہ محمد معصوم کے مکاتیب کی تین جلدوں اور عالمگیر نامہ کے ساتھ ملا کر مطالعہ کریں تو خیال ہوتا ہے کہ اگرچہ عالمگیر دونوں بھائیوں کا قدردان تھا۔ اور ان دونوں کے درجاتِ عالیہ میں کلام نہیں۔ لیکن شاید حضرت مجدد کا جانشین (ان کے زندہ بیٹوں میں سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے) خواجہ محمد سعید کو سمجھا جاتا تھا خواجہ محمد معصوم کے مکاتیب کی پہلی جلد میں فقط ایک خط ”شاہزادہ دین پناہ سلطان محمد اورنگ زیب“ کے نام ہے۔ جہادِ اصغر و جہادِ اکبر کے فضائل میں (مکتوب ۶۲)۔ دوسری جلد میں بھی ایک ہے ”درفتے قلب و فناے نفس“ (مکتوب ۵) تیسری جلد میں چار اہم مکاتیب اورنگ زیب کے نام ہیں۔ (۶، ۱۲۲، ۲۲۱، ۲۲۴) اور تین خطوط شیخ سیف الدین کے نام ایسے ہیں جو عالمگیر کے متعلق ہیں۔ (۲۲۰، ۲۳۳، ۲۳۲) اس تفاوت کی وجہ غالباً یہ ہے کہ تیسری جلد خواجہ محمد معصوم کے آخری سالوں کے متعلق ہے۔ جب خواجہ محمد سعید وفات پا چکے تھے۔ خواجہ محمد معصوم کا دوبارہ ارشاد و ہدایت کے تنہا ذمہ دار تھے۔ اور انھوں نے اپنے صاحبزادے شیخ سیف الدین کو لشکرِ شاہی میں بھیج رکھا تھا۔

خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کے تعلقات میں براہِ راست محبت اور لگائیت تھی۔ شاہجہاں کے آخری ایام میں ۱۶۵۷ء (۱۰۶۵ھ) وہ اکھٹے جج کے لیے روانہ ہوئے۔ اور قریباً تین سال ہندوستان سے باہر رہے۔ جب وہ روانہ ہوئے۔ تو داراشکوہ کا ستارہ عروج پر تھا۔ واپس پہنچے تو عالمگیر تختِ سلطنت پر متمکن تھا۔ دونوں بھائیوں کی، بلکہ خاندانِ مجددیہ کے تمام سربراہان اور وہ افراد کی قدردانی ہوئی۔ لیکن خواجہ محمد سعید کی صحت اب بھیک نہ رہتی تھی۔ وہ سفرِ حج

میں ہی ایک دفعہ اتنے بیمار ہوئے تھے کہ امیدِ زیست نہ رہی تھی۔ واپسی پر ایک مرتبہ اور رنگِ زیب کی دعوت پر دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں سخت بیمار ہو گئے۔ بادشاہ نے علاج میں بڑا اہتمام کیا، لیکن طبیعت نہ سنبھلی۔ چنانچہ آپ سرہند کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ سرہند میں مدفون ہوئے۔ آپ کا سالِ وفات ۱۰۶۶ھ بتایا جاتا ہے۔

شیخ محمد معصوم | حضرت مجدد الف ثانی کے دوسرے مشہور خلیفہ آپ کے صاحبزادے، عروۃ الوثقی، قیوم ثانی، شیخ محمد معصوم تھے۔ آپ کی نسبت فرحت الناظرین میں لکھا ہے:-

”مرید و خلیفہ والدِ نذر گوار خود، شیخ احمد بود۔ در تربیتِ مریدان و تجریر و قانع و حل مشکلاتِ اینان، از برادران و سایر شیوخِ زمان امتیاز داشت و از تصانیف او سرحدِ کمالات است کہ بس اسرارِ غریبہ و نکاتِ عمیقہ و علومِ بدیعہ در ان اندراج یافت و بنا بر استدعای بادشاہ دینِ پناہ (عالمگیر) چند بار بہ بارگاہِ عظمت و جاہ رسید۔ باقیہ تبجیل و تکریم و الوارِع توقیر و تعظیم مخصوصِ گشتہ بود۔“

آپ کی نسبت مشہور ہے کہ اورنگ عالمگیر آپ کا مرید ہو گیا تھا۔ اس کا تو کوئی ثبوت ہماری نظروں سے نہیں گزرا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ عالمگیر آپ کا اور آپ کے بھائیوں کا قدردان تھا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ آپ اپنے صاحبزادے شیخ سیف الدین کو اورنگ زیب کے لشکر میں ارشاد و ہدایت کے لیے بھیجا۔ اور اورنگ زیب نے ان کے ارشادات کو توجہ اور ادب سے سنا۔ عالمگیر نامہ میں آپ کے بڑے بھائی (خازنِ الرحمت) شیخ محمد سعید (المتوفی سنہ ۱۰۵۹ھ) کی نسبت لکھا ہے:-

”و شیخ محمد سعید و شیخ محمد معصوم پسرانِ شیخ مغفور و واقف اسرارِ حقانی و علومِ شیخ احمد سرہندی کہ بہ کمال فضائل و کمالات صوری و محنوی خلف الصدق آن سالک مسالک طریقت و عرفان است، بانعام سے مددِ شرفی... موردِ نوازش گیریدند۔“

ایک اور جگہ بھی مؤرخ لکھتا ہے ”و تفرغے شعار شیخ محمد سعید خلف شیخ احمد سرہندی“

خلعت و دو ہزار روپیہ مرحمت شد۔“

شیخ محمد معصوم کی نسبت فرحت الناظرین کا اندراج ہم نقل کر چکے ہیں۔ اسی تذکرہ میں آگے چل کر لکھا ہے کہ شیخ محمد معصوم کے دوسرے بھائی شیخ محمد یحییٰ، شیخ محمد سعید اور مؤخر الذکر کے دو فرزند شیخ سعد الدین اور شیخ عبد الاحد المعروف بہ میاں لکھنؤ کسی بار ”بادشاہ دین پناہ“ کی بارگاہ میں پہنچے اور الطاف شاہ ہنشی سے فیض یاب ہوئے۔ اس سے اور دوسرے شواہد سے خیال ہوتا ہے کہ بادشاہ کی عقیدت فقط شیخ محمد معصوم سے نہ تھی، بلکہ حضرت مجدد کے تمام خاندان سے تھی۔

خواجہ محمد معصوم کے کاموں کا صحیح طور پر مطالعہ نہیں ہوا۔ مکتوبات کی تین جلدیں مختلف مطبعوں سے منتشر طور پر شائع ہوئیں۔ اور اب غنقا ہیں۔ ان کی محاصرہ ہوا خمر یا بھی ابھی طباعت سے محروم ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر سلسلہ مجددیہ کو بے انتہا وسعت دی۔ ان کے خلفا کابل، پشاور، ننگرہار کے علاقے میں بہت تھے۔ ایک خلیفہ شیخ مراد نے شام میں اقامت اختیار کی۔ وہاں انھیں بڑا عروج ہوا۔ اور ان کی بدولت سلسلہ مجددیہ نقشہ بندیر کو بڑی وسعت ہوئی۔ ہندوستان میں بھی کئی امرا و اکابر آپ کے حلقہ ارادت میں تھے۔ مثلاً بختاورد خاں (جو مرآۃ العالم کا مؤلف سمجھا جاتا ہے) کامگار خاں وغیرہ۔

خواجہ محمد معصوم کا ایک اور مشہور مرید فارسی شاعر ناصر علی سرسندی تھا جس نے آپ کی تعریف میں کئی شعر کہے ہیں۔

منور از فروغش ہند تاروم	جراغ ہفت محل خواجہ معصوم
نظر بے کار ماند پانہ گنجد	رود جائے کہ جا آنجانہ گنجد
چوں صبح از پاکی باطن قطب پوش	ردائے ماہتابی شرع بردوش

اے آدم الشعر اے اردو کی دکنی کے استاد گلشن کے پیر و مرشد تھے۔ اور آپ کے عرف گل پر ہی اس نے اپنا تخلص گلشن رکھا۔ آپ کا ضخیم دیوان (دیوان وحدت) ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے۔

ستونِ بارگاہِ شرع اسلام بہ افعالِ پیمبرِ گامِ برگام
 زہے عزت کہ ربُّ العزتِ داد کھ بر سر تاجِ قیومیش بہناد
 شیخ محمد معصوم کی وفات اور گنگے بیگے دسویں سالِ جلوس ۱۰۷۹ھ ۱۶۶۸-۶۹ء
 میں ہوئی۔ مزار مبارک سرہند میں ہے۔

حضرت مجددِ الف ثانی کے سب سے چھوٹے بیٹے شیخ محمد بیگے عرف شاہ جبر تھے۔
 وہ ۱۰۲۲ھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے علومِ ظاہری بڑے انہماک سے حاصل کیے
 موطا شیخ عبدالحق محدث سے پڑھی۔ ان کی شادی حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے
 خواجہ کلاں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ روضۃ القیومیہ میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے آپ کو
 مدد و معاش کے طور پر بہت کچھ دیا ہوا تھا۔ چنانچہ آج تک سرہند میں ضرب المثل ہے۔
 ”الملک الملک والملک ایچی“۔ سرہند میں آپ نے ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی۔ دینی
 علوم میں کئی کتابیں لکھیں۔ ۲۷ جمادی الثانی ۱۰۹۶ھ کو وفات پائی۔ اور سرہند میں
 مدفون ہوئے۔

خواجہ محمد معصوم کے جانشین خواجہ محمد نقشبند تھے۔ ان کا ذکر ہم عہدِ عالمگیری کے
 ضمن میں درج کریں گے۔

ہم حضرت مجدد کی تصانیف کے سلسلے میں ان کے رسالہ ردِّ و افض کا ذکر کر چکے
 ہیں۔ شیعہوں کی مخالفت حضرت مجدد کی تعلیمات کا ایک اہم جزو تھی۔ وہ خلفائے اربعہ
 کے احترام میں ذرا بھی کمی گوارا نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ شہر سامانہ کے خطیب نے
 خطبہ عید کے دوران میں خلفائے راشدین کا نام نہ لیا تو آپ نے فوراً اس شہر کے
 مشائخ و قضاة کو خط لکھا کہ خطیب کی اس فروگزاشت پر اس کے ساتھ سختی کیوں نہ کی گئی۔

”شنیدہ شد کہ خطیب آن مقام در خطبہ عید قربانی ذکر خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ

عنہم ترک کردہ واسامی متبرکہ ایشان را نخواندہ... و نیز شنیدہ کہ اکابر و اہل آن مقام

دریں باب مباہلہ و زیدند۔ و شدت و غلظت بآن خطیب بے انصاف پیش نیاندند

و اے نزدیکار بلکہ ضد بار وائے!... چو استماع این خبر وحشت اثر در شورش

آورد و رگ فاروقیم را حرکت داد۔ بجز کلمہ اقدام نمود۔“

خواجہ محمد معصوم کا بھی اس مسئلے میں وہی طرز عمل تھا، جو ان کے والد بزرگوار کا تھا۔ اور ان کے مکتوبات میں ایک اہم خط ہے (دفتر اول - شمارہ ۶۴) جو کہا جاتا ہے کہ انھوں نے شاہزادہ اورنگ زیب کو لکھا۔ اور جس میں تکفیر و افض اور ان کو قتل کرنے کے حق میں کئی حدیثیں درج کی ہیں۔ ایک حدیث ہے:-

ابو دردار میں لکھا ہے کہ ابن عباسؓ نے روایت کی کہ آخری زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے جن کو روافض کہیں گے، جو اسلام کی توہین کریں گے۔ ان کو قتل کرنا

کیونکہ یہ مشرک ہوں گے۔“

شیخ آدم بنوری | حضرت مجدد کے خلفاء اور فیض یافتگان کا سلسلہ بڑا وسیع تھا۔ صاحبزادگان شیخ محمد سعید اور شیخ محمد معصوم کے بعد ان میں سب بزرگ میر محمد نعمان اور خواجہ ہاشم کشمی کو سمجھا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر زبدۃ المقانات کے مصنف، مکتوبات کے دفتر سوم کے مرتب اور ایک بڑے خوشگو شاعر تھے۔ ہم نے ارغوان پاک (اشاعت چہارم) میں ان کی کئی پوسوز غزلیں درج کی ہیں۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کے کام کا میدان برہان پور کا علاقہ تھا، جہاں سلسلہ مجددیہ بلکہ اسلام کی بھڑکیں بہت نہیں پھیلیں۔

۱۔ جتنی وضعی حدیثیں اس مسئلے پر ہیں، شاید ہی کسی اور مسئلے کے متعلق ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ بنی امتیہ اور بنی عباسیہ کی کشمکش کے دوران میں مخالف فریق ایسی حدیثیں گھڑ کر اپنے مخالفوں کو ذلیل اور بدنام کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ سولھویں صدی میں ایران و توران کی کشمکش سے پھر ایرانی تلخ بحثیں تازہ ہو گئیں۔ ایک طرف اسماعیل صفوی شاہ ایران تھا، جس کی ترجمانی علمائے مشہد وغیرہ نے کی۔ دوسری طرف شیبانی خاں ازبک، جس کو علمائے ماوراء النہر سے مدد ملی تھی حضرت مجدد اور دوسرے نقشبندیہ بزرگوں کا شیعہ شنی مسئلے پر علمائے ماوراء النہر کا نقطہ نظر تھا۔ لیکن شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں اس نقطہ نظر میں ملائمت آئی۔ اور علیگڑھ تحریک میں شیعہ شنی زعمائے بل کر کام کیا۔ خود بانی پاکستان قائد اعظم آٹھ عشری شیعہ تھے۔

حضرت مجدد کے ایک اور خلیفہ جنھیں ان کے بے شمار معتقدین صاحبزادگان سے بھی بڑھ کر سمجھتے تھے۔ اور جو مختصر تعلیم کے باوجود صفحات تاریخ پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئے۔ شیخ آدم بنوری تھے۔ وہ بنور کے جو سرسند سے بیس میل دور ایک بستی ہے، رہنے والے تھے۔ پہلے شاہی لشکر میں ملازم تھے۔ لیکن ایک واقعہ سے متاثر ہو کر ملازمت ترک کر دی۔ اور پہلے حاجی خضر خاں افغان اور پھر حضرت مجدد کی خدمت میں حاضر ہو کر نعمت باطنی سے فیض یاب ہوئے۔ شروع میں اُمتی محض تھے۔ ایک جذبہ بڑبڑ کے تحت قرآن مجید حفظ کیا۔ اور علوم ظاہری بھی حاصل کیے۔ پھر ایک عالم کو سیراب کیا۔ آپ کی شخصیت بڑی قوی الاثر تھی۔ کہتے ہیں کہ آپ کی خانقاہ میں ایک ہزار سے زیادہ طلبائے معرفت جمع رہتے تھے۔ جن کو آپ کے لنگر سے کھانا ملتا تھا۔ آپ کے خلفاء کی تعداد ایک سو اور مریدین کی تعداد ایک لاکھ بتائی جاتی ہے۔ جہاں آپ جاتے تھے، ہزار ہا پیٹھان آپ کے ساتھ ہوتے تھے۔ ۱۶۲۲ء میں آپ لاہور تشریف لے گئے۔ ایک کثیر جماعت آپ کے ساتھ تھی۔ بعض مخالفوں نے شاہجہان کو خبر پہنچائی کہ شیخ کے پاس اتنی جمعیت ہے کہ اگر وہ چاہے تو حکومت کا تختہ پلٹ سکتا ہے۔ شاہجہان نے اپنے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خاں اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کو تحقیق حالات کے لیے بھیجا۔ آپ ان سے سردھری سے پیش آئے۔ دیر تک ملے نہیں اور جب ملے تو بے رخی سے بات چیت کی۔ انھوں نے واپس جا کر سارے حالات بادشاہ کو سنائے اور کہا کہ بے شمار افغان شیخ کے ساتھ ہیں۔ ممکن ہے کوئی فتنہ پیش آئے۔ چنانچہ بادشاہ نے کہلا بھیجا کہ شیخ حج کو چلے جائیں۔ شیخ پہلے ہی حج کو جانا چاہتے تھے۔ بڑی خوشی سے اس حکم کی تعمیل کی اور وہیں مدینہ منورہ میں قریباً ۲۷ سال کی عمر میں ۲۵ دسمبر ۱۶۴۳ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ شیخ آدم بنوری توحج کے لیے چلے گئے، لیکن انھوں نے فیض کے جوہر چٹے لگائے تھے، ان کا فیض جاری رہا۔ ان کے خلفاء بے شمار تھے۔ جن میں سے کئی افغان علاقہ میں تھے۔ (شاید روشنیہ فرقہ کے زوال کا ایک باعث یہ بھی تھا۔ کہ ان

افغان علاقے میں نقشبندیہ سلسلے کے بزرگوں مثلاً شیخ آدم بنوری اور خواجہ محمد مصوم کو جن کے اجداد کا روہ یا کابل سے خاندانی تعلق تھا، بڑا قبول حاصل ہوا۔ اور لوگوں کی توجہ اس طرف پھری۔ آپ کے خلفاء میں سے لاہور کے شیخ سعدی (جن کے کئی افغان مرید تھے)۔ کوہاٹ میں حاجی عبداللہ کوہاٹی اور پشاور میں شیخ نور محمد پشاوری خلف اخوند درویشہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ایک بزرگ حافظ سپید عبداللہ اکبر آبادی تھے۔ جن کے مرید شاہ ولی اللہ کے والد اور چچا شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا ہوئے۔ جن سے خود شاہ صاحب نے فیض حاصل کیا۔ شاہ صاحب نے انھیں العارفین میں شیخ آدم بنوری اور حافظ صاحب بہت سے واقعات لکھے ہیں اور شیخ کی بڑی تحریف کی ہے۔

شیخ آدم بنوری صاحب تصانیف تھے۔ کلمات معارف میں نقشبندی سلسلہ کی تعلیمات کو مدون کیا ہے۔ اور بہت سی محرفت کی باتیں بیان کی ہیں۔ اس سے پہلے لکات الاسرار میں اسی مضمون پر لکھا تھا۔ مناقب المحضرات میں آپ کے حالات شیخ محمد امین بدخشی نے بڑے غلطی سے بلکہ تاریخی صحت کو نظر انداز کر کے لکھے ہیں۔ اہل تشیع کے متعلق حضرات مجددیہ کا جو نقطہ نظر تھا، وہ تو مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے، لیکن اس مسئلے پر دوسرے نقشبندیہ حضرات کا بھی یہی نقطہ نظر تھا (نقشبندیہ سلسلے کو ماوراء النہر کی سرزمین سے خاص تعلق ہے اور شیعہ سُنی مناقشات زیادہ تر نقشبندیہ سلسلے کی ایک اور شاخ کے ذریعے ظہور پذیر ہوئے۔ ہندوستان میں اس سلسلے کے بانی خواجہ خاوند محمود نقشبندی المعروف بہ حضرت خواجہ ایشاں تھے، جو شیخ سرہندی کے ہم عصر تھے۔ وہ بخارا میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم پائی۔ اور سمرقند و کابل ہوتے ہوئے ہندوستان تشریف لائے۔ کشمیر میں آپ کے سلسلے کو خاں فروغ ہوا۔ یہاں ان دنوں شیعہ سُنی سوال زوروں پر تھا۔ دربار دہلی کی طرف سے نواب خاں والی کشمیر تھا۔ قنارہ شیعوں اور اہل سنت کے درمیان بلوہ ہوا اور بہت سے کشت و خون کے بعد قاضی ابوالقاسم اور قاضی محمد عارف کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ انھوں نے اہل تشیع کی سزا دہی میں توقف کیا۔ اس سے

اہل سنت ناراض ہو گئے اور خواجہ خاوند محمود کی سرکردگی میں شہر چھوڑ کر ہفت چنار آگئے۔ ناظم صوبہ انھیں آکر مناکے لے گیا اور شیعوں کے خلاف کارروائی بھی کی۔ لیکن اس نے ساتھ ساتھ دربار شاہی میں خواجہ کی شکایت لکھی۔ چنانچہ دربار میں بلائے گئے اور ان کے متعلق فیصلہ ہوا کہ وہ شاہی لشکر کے ساتھ ساتھ رہیں۔ کشمیر واپس نہ جائیں اس کے بعد وہ مختلف مقامات میں شاہی لشکر کے ساتھ رہے اور بالآخر ۱۶۴۲ء کو بمقام لاہور وفات پا کر وہیں دفن ہوئے۔

خواجہ خاوند محمود تو شاہی حکم کے بعد کشمیر نہیں گئے، لیکن شیعہ سُنی چیلش ان کے جانشینوں کے عہد میں جاری رہی۔ ان کے ایک سجادہ نشین خواجہ کمال الدین نقشبندی تھے۔ انھوں نے شیعوں کی مخالفت جاری رکھی اور ان کی کوششوں سے امین نامی ایک شیعہ کو قتل کی سزا ہوئی۔ اس پر شیعہ برا فروختہ ہو گئے اور ایک آدمی کو آمادہ کیا کہ خواجہ صاحب کو شہید کرے۔ چنانچہ ۱۶۴۶ء کی رات کو (یعنی مرزا جانجاناں کی شہادت سے پندرہ سال پہلے) آپ اپنی خانقاہ میں شہید کر دیے گئے۔ آپ کی شہادت کے بعد شیعوں، سُنیوں میں پھر بلوے ہوئے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی

حضرت مجدد الف ثانی ایک بڑے عالم تھے۔ اور شریعت کی پیروی پر بڑا زور دیتے تھے۔ وہ اپنے صوفیانہ احوال و واقعات کو کتاب و سنت کی روشنی میں پرکھتے۔ اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے۔ انھوں نے تصوف کو شریعت سے قریب لانے کی مسلسل کوشش کی۔ اور بعض صوفی حلقوں میں جو مطلق العنانی اور آزاد روی وسطی دور میں پھیل گئی تھی۔ اس کی مخالفت کی لیکن شاید یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ صوفی پہلے تھے اور عالم (متشرع) بعد میں۔ ان کا شمار فی الحقیقت "علمائے باطن" میں سے ہوتا ہے۔ اب جس بزرگ کا ذکر ہو رہا ہے۔ انھیں بھی تصوف سے بڑی دلچسپی تھی۔ متحدہ بزرگوں سے فیض پایا تھا۔ صوفیہ کا جو تذکرہ انھوں نے اخبار الاخیار کے نام سے لکھا۔ وہ اس زمانے کے ادبی شاہکاروں میں سے ہے۔ لیکن تصوف سے گہرے لگاؤ کے باوجود وہ صوفی کم تھے۔ اور عالم متشرع زیادہ۔ وہ شمالی ہندوستان کے پہلے بڑے عالم تھے۔ جنھوں نے اکبر کی فتح گجرات کے بعد حجاز کے سمندری راستوں کے کھل جانے کا پورا فائدہ اٹھایا۔ حرمین جاکر علم حدیث کی تکمیل کی۔ اور واپس آکر اس علم کی وسیع اشاعت کی۔ علوم اسلامی کے بڑے سرچشمے، یعنی مقامات مقدسہ سے اسلامی ہندوستان کا رشتہ جوڑنا ہی اتنا اہم تھا۔ کہ محض اس کی بدولت انھیں علوم دینی کی تاریخ میں ایک بلند مقام مل جاتا ہے۔ لیکن حجاز میں جس بزرگ سے آپ زیادہ تر وابستہ رہے۔ ان کا موروثی وطن ہندوستان تھا۔ اور انھیں یہاں کی مذہبی مطلق العنانی کے ازالے اور روحانی اصلاح کا خاص خیال رہتا تھا۔ شیخ عبد الوہاب متقی فی الحقیقت شیخ علی متقی کے جانشین تھے۔ جنھوں نے ہدایت کے قلع قمع میں زندگی صرف کر دی۔ شیخ عبد الوہاب نے یہ طریق کار جاری رکھا۔ بلکہ اسے

وسعت دی۔ اور اپنے شاگرد اور مرید کو ان خطرات سے بچایا جو راسخ العقیدگی کو بعض مشہور اور بااثر، لیکن آزادہ و صوفیہ مثلاً شیخ ابن العربی۔ شیخ عبدالکریم جلی۔ شیخ غوث گوالیاری شطاری سے پیش آ رہے تھے۔

بالجملہ شیخ عبدالوہاب کے زیر اثر شیخ عبدالحق محدث نے جو راستا اختیار کیا وہ اسی سمت جاتا تھا، جدھر صوفیہ کو حضرت مجدد الف ثانی لیجا رہے تھے۔ لیکن (تصویر) لگاؤ کے باوجود شیخ عبدالحق کی اصل جگہ "علمائے ظاہر" کے ساتھ تھی۔ ان کے عرفان پر ان کی فقاہت غالب تھی۔ راسخ العقیدگی کی راہ پر وہ حضرت مجدد سے بہت آگے نکل گئے۔ انھوں نے نہ صرف اکبری بے قاعدگیوں پر تنقید کا اظہار کیا۔ اور فیضی سے علیحدگی اختیار کی۔ بلکہ ایک زمانے میں حضرت مجدد کے بعض احوال و مقامات کے خلاف ایک زوردار رسالہ لکھا۔ بعض روایات کے مطابق اس کے بعد شیخ محدث کو حضرت مجدد کی بزرگی کا زیادہ احساس ہوا۔ لیکن جیسا کہ حضرت شاہ غلام علی مجددیؒ نے اس رسالے کی وضاحت میں لکھا ہے۔ "حضرت شیخ عبدالحق... سخن بطور علمائے ظاہر فرمودہ اند و کلام حضرت مجدد بطور علمائے باطن است۔ شیخ عبدالحق علمائے ظاہر اور ٹھیکہ راسخ العقیدگی کے ترجمان تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے آبا و اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد حکومت میں

خاندانی حالات

ہندوستان آئے اور معزز فوجی عہدوں پر مامور ہوئے۔ شیخ کے دادا شیخ سعد اللہ تھے۔ ان کی زیادہ توجہ سلوک اور طریقت کی طرف رہی اور ان کے دو بیٹوں کو بھی یہی ذوق وراثت میں ملا۔

شیخ کے چچا شیخ رزاق اللہ مشتاقی نے علم و ادب میں نام پایا۔ وہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے فاضل اور ہندی کے نامور شاعر تھے۔ ہندی میں ان کا تخلص راجن تھا اور اس زمانے میں ان کے کئی رسالے (مثلاً بہیمان۔ جوت نرنجن) مشہور ہیں۔ ہندوؤں کے علوم کا بھی انھوں نے خوب مطالعہ کیا تھا اور علم تاریخ سے بھی

گہری دلچسپی تھی۔ ان کی مشہور تالیف واقعاتِ مشائقی لودھیوں کے متعلق مسلوبات کا بیش قیمت خزانہ ہے۔ طریقت میں وہ شطاری سلسلے سے منسلک تھے جو اس زمانے میں مشرقی اور وسطی ہندوستان میں زوروں پر تھا۔ ان کی وفات ۱۵۸۷ء میں ہوئی۔

شیخ سیف الدین | شیخ کے والد شیخ سیف الدین سیفی قادری نے باطنی اور روحانی امور پر زیادہ توجہ کی۔ وہ شیخ امان پانی پتی کے مرید اور صاحبِ استعداد بزرگ تھے۔ صوفیانہ ذوق و شوق اور عشق و محبت اس خاندان میں شیخ عبدالحق کے دادا سے شروع ہوا۔ وہ آزاد صوفیانہ خیالات کے آدمی تھے۔ راتوں کو جاگتے اور سوز و گداز کے اشعار پڑھتے۔ ایک روز شیخ سیف الدین نے اپنے والد سے پوچھا کہ کبیر جس کے دوہے مشہور ہیں۔ مسلمان تھا یا کافر؟ آپ نے فرمایا موحّد تھا۔ انھوں نے دہرا کے پوچھا کہ کیا موحّد کو اسلام و کفر سے کوئی تعلق نہیں (کہ موحّد مگر غیر کافر و مسلمان است) انھوں نے ٹال دیا اور کہا کہ یہ نکتہ سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ آہستہ آہستہ سمجھ جاؤ گے۔

شیخ سیف الدین کے مُرشد شیخ امان پانی پتی وحدت الوجودی خیالات کے صوفی اور ابن العربی کے مقلد تھے۔ شیخ عبدالحق ان کی نسبت لکھتے ہیں۔ ”وہ از صوفیہ موحّدہ است از تابعان ابن العربی۔ در علم ایں طائفہ مرتبہ بلند و پایہ ارجمند داشت و در تقریر مسئلہ توحید بیان شافی و تقریر وافی، و سخن توحید را فاش گفتے۔“ ان کی زندگی میں کئی باتیں ایسی تھیں جن کی شرع تائید نہیں کرتی۔ ان کا مشرب ملامتیہ تھا۔ اور یہ شیخ امان پانی پتی وہی ہیں جن کے ایک مشہور شاگرد شیخ تاج الدین زکریا جو دھنی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انھیں اکبر کے خیالات بدلنے میں دخل تھا۔ بدایونی ان کی اکبر سے ملاقات کے سلسلے میں لکھتا ہے۔

”تمام شب شطیحات و تریات اہل تصوف از وہے شنیدند و چون بہ شرعیات مقید نمود۔ مقدمات وحدت وجود کہ متصوفہ مبطلہ دارند و عاقبت منجر باباحت

والحامی شوند در میان آور دند

شیخ سیف الدین کو شیخ امان سے بڑی عقیدت تھی۔ جس کا اظہار انھوں نے اشعار میں بھی کیا ہے ۵

سرچہ از من در سخن آید یقین ہست ہم از صحبت آل مریدیں

ورنہ چہ حد است کہ راز درو از دہن چوں منے آید بدوں

من کیم و کیستم و چستم از دم عیٹے نفسے زیستم

اوست دیں راہ مرا راہنما خاک درش چشتم مرا تو تیا

شیخ امان کے خیالات پر اہل شرع اعتراض کریں۔ لیکن ان کی علمی قابلیت میں شبہ نہیں اور مریدوں کی تعلیم و تربیت بھی وہ بڑی سوچ سمجھ سے کرتے تھے۔ شریعت کی مخالفت کے باوجود طریقت کے سلسلوں کے زیر پاہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان سلسلوں کے بزرگ انسانی نفسیات کو خوب سمجھتے تھے اور اپنی تعلیم و تربیت میں اس کو نظر انداز نہ کرتے تھے۔ آج کل ہمیں نفسیات کے عالم بتا رہے ہیں کہ ذہن انسانی میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہمیں افراد کے ذہن تحت الشور یعنی ان خیالات اور تصورات سے آگہی ہو جو ان کے ذہن کی گہرائیوں میں موجزن ہیں۔ اہل تصوف اس اصول پر شروع سے ہی عمل پیرا تھے۔ اور سب اہل نظر شد مرید کو تلقین کرنے سے پہلے اس کے تحت الشور سے بخوبی واقف ہو جاتے۔ شیخ امان بھی اس اصول کو پوری طرح ملحوظ رکھتے۔ چنانچہ شیخ سیف الدین فرماتے تھے کہ جب میں پہلے پہل شیخ امان کی خدمت میں پہنچا تو انھوں نے کہا کہ اپنے تصورات اور خیالات کا کچھ حال بیان کرو۔ شیخ سیف الدین جواب دیا کہ مجھے تو صوفیانہ احوال ہی کوئی نہیں پیش آتے۔ میرے تصورات اور خیالات کیا ہوں گے۔ شیخ امان نے کہا کہ یہ میں اس لیے پوچھتا ہوں کہ تمھاری طبیعت مناسبت کا اندازہ لگاؤں۔ اور یہ معلوم کروں کہ تمھارے ذہن کا کیا اسلوب ہے۔ انھوں نے عرض کیا کہ کئی دفعہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سارا جہان فرش سے لے کر عرش تک

میں نے گھیر رکھا ہے (محاطہ من است۔ ومن برہمہ محیط) شیخ نے فرمایا کہ تمہارے دل میں توحید کا سمندر موجزن ہے اور اس لیے مسئلہ توحید میں ہی زیادہ تعلیم و تربیت دی۔

شیخ محدث کے سمجھدار اور ضعیف والد نے اپنے ہونہار فرزند پر اپنے خیالات مسلط نہیں کیے لیکن دونوں میں مسئلہ توحید پر اکثر گفتگو ہوتی تھی اور شیخ سیف الدین اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوں گے۔

”شب و روز در خدمت ایشان در تذکرہ و تذکار و بحث و تکرار میگزشت و بندہ را بہ ہمزبانی خود قبول داشتہ محفوظ بودند۔ خصوصاً در تلقین علم توحید و تحقیق مسئلہ وحدت وجود بر وجہ کہ موافق علم و شہود است۔ اگر گاہے بمقتضائے تقدیر مقامات علم کسی و بقصد تحقیق ایں علوم وہی دغدغہ و شبہ در میان آوردہ می شد۔ فرزند مارا از ایں نوع شبہات و شکوک دریں مسئلہ بسیار بود۔ انشاء اللہ رفتہ رفتہ پرودہ از روی کار بکشد و جمال یقین روئے نماید۔“

ابتدائی تعلیم | شیخ سیف الدین نے اہل علم کی مجلس میں اونچی جگہ حاصل نہیں کی، لیکن انھوں نے اپنے ہونہار بیٹے کی تعلیم و تدریس پر پوری نظر رکھی اور شیخ کی تربیت بڑے نیک اصولوں پر کی۔ علوم ظاہری سے بھی آپ کو بہرہ وافر دلایا۔ اور بے تعصبی اور انصاف پسندی کی تلقین بھی شروع ہی سے کی۔ چنانچہ آپ اکثر اپنے بیٹے سے کہا کرتے تھے: ”با هیچ کس در بحث علم نزاع نہ کنی و کلفت نرسیانی۔ اگر دانی کہ حق بجانب دیگر است قبول کنی۔ و گرنہ دوسہ بار بگو۔ اگر قبول نکنند بگو کہ بندہ را چنین معلوم است۔“ اسی طرح طمع و حرص سے بھی وہ بالکل خالی تھے اور کہا کرتے تھے کہ حرص اور طالب جاہ عالم سے گمنام لیکن متوکل اور مستحق کم علم اچھا ہوتا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق سے انھوں نے کہا کہ ”چون شاہدہ کردہ می شود کہ علما و فضلا در طلب جاہ و عزت و کثرت اسباب و جمعیت اموال و نزاع و خصومت کہ با خلق می افتد۔ مرا شکرانہ آید باین کہ بسیار بخواندیم و اکابر نشدیم۔“

لیکن آپ کی بڑی خواہش تھی کہ بڑا علم و فضل میں شہرہ آفاق ہو۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی چاہتے تھے کہ اہل دل ہو۔ ملائے خشک و ناہموار نباشی۔“

شیخ عبدالحق کو شروع ہی سے پڑھنے لکھنے سے بے حد رغبت تھی۔ اخبار الاخیار کے اخیر میں لکھتے ہیں۔ ”از ابتدا سے ایام طفولیت ہی دائم کہ بازی چہیت و خواب کلام و مصاحبت کیست و آرام چہ و آرائش و سیر کجا۔ شب خواب چہ و سکون کلام است خود خواب بعاشقال حرام است

ہرگز در شوق کسب و کار، طعام بوقت نخورده و خواب در محل نبرده۔“ رات کا زیادہ حصہ پڑھنے میں اور دن کا زیادہ حصہ کتابیں نقل کرنے میں گزرتا۔ والدین ان سے کہتے کہ محلے کے لڑکوں سے جا کر کھیلو۔ تو وہ جواب دیتے کہ آخر کھیلنے سے مقصد دل خوش کرنا ہے۔ میرا دل اس مطالعہ سے خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ آدھی رات گزر گئی اور والد نے آواز دی کہ سو جاؤ۔ تو میں لیٹ گیا۔ اور جب والد کی آنکھ لگ گئی تو پھر اٹھ کر پڑھنا شروع کر دیا۔ چند ایک مرتبہ تو یہ بھی ہوا کہ پڑھتے پڑھتے کتاب میں اتنے منہمک ہو گئے کہ چراغ کی لوسے پگڑی کو آگ لگ گئی۔ اور انہیں اس وقت معلوم ہوا، جب سر کو گرمی پہنچی۔

چہ دودھائے چراغے کہ در داغ نرفت کلام بادہ محنت کہ در ایاغ نرفت
کدام خواب و چہ آسائش و کجا آرام چہ خار خار کہ در بستر فراغ نرفت
بحیر تم نہ دل خود کہ عمر رفت و لے نہ کنج غم کہ ہرگز بھجن باغ نرفت

شیخ عبدالحق کے علمی انہماک کا یہ عالم تھا تو جائے تعجب نہیں

دربار اکبری

کہ بیس بائیس برس کی عمر میں آپ نے جہاں تک دہلی میں ممکن تھا، تکمیل تعلیم کر لی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ فتح پور سیکری تشریف لے گئے جو ان دنوں اکبر کا دار السلطنت اور علمی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہاں آپ نے دین و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کیا۔ لیکن علمی اور روحانی ترقیوں کا سلسلہ

برابر جاری رہا۔ اور ایک برگزیدہ اور نڈر بزرگ سے اسی زمانے میں بیعت ہوئی۔
 سیکری میں شیخ عبدالحق کا قیام کوئی دس بارہ برس رہا ہوگا۔ آپ کی علمی قابلیت
 نے کئی علماء دربار مثلاً فیضی، مرزا نظام الدین بخشنی مصنف طبقات اکبری ملا عبدالغادر
 بدایونی کو مستحضر کیا۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اکبر سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی اور شاید فیضی
 ابوالفضل اور اکبر کی خواہش تھی کہ آپ ان کے ہم خیال ہو جائیں۔ آپ زراد المتقین
 میں اختتام تعلیم کا ذکر کر کے لکھتے ہیں :- (ترجمہ)

”محب اللہ کے فضل و کرم سے مجھے (علم کا) خاصہ حصہ مل گیا تو بعض اہل حقوق
 نے مجھے اہل دنیا کی طرف بلایا۔ اور میں بادشاہ وقت اور امرار کے پاس گیا۔
 انھوں نے میری طرف بہت توجہ کی۔ میرا رتبہ بلند کیا۔ بلکہ ارادہ کیا کہ میرے ذریعے
 اپنی جماعت بڑھائیں اور مجھ ضعیف سے اپنی قوت میں اضافہ کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ
 نے مجھے محفوظ رکھا۔“

شیخ محدث اور اکبری دربار کے تعلقات کی تفصیل نہیں ملتی، لیکن اتنا معلوم
 ہے کہ فیضی ان کا بڑا مداح بلکہ شیدائی تھا۔ اور شیخ امان پانی پتی کے جس گھرانے
 سے آپ کے والد نے فیض حاصل کیا تھا۔ اس کے کئی افراد اکبر کی مذہبی بے راہ روی
 میں اس کے راہنما تھے۔ عجب نہ تھا۔ آپ کا قدم بھی صراط مستقیم سے دور جا پڑتا۔
 لیکن عنایت ایزدی اور ایک نیک نفس باپ کی تربیت کا فیض تھا۔ آپ پر اکبری دربار
 کے اثرات غالب نہ آ سکے۔ آپ نے بیعت کی تو وہ بھی ایسے بزرگ سے جو اس
 زمانے میں بھی اکبر کے دیوانخانے میں اذان دے کر باجماعت نماز شروع کر دیتے
 تھے۔ اور جب شعائر اسلامی کی محبت اور بیرونی ماحول میں کشمکش بڑھ گئی تو صوبہ
 کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک جذبہ کے ماتحت پہلے دہلی آئے اور پھر حجاز کا رخ کیا۔

لے شیخ کے یکایک سفر پر (بلا اطلاق) روانہ ہونے پر فیضی نے جل جہنم کر جو خط لکھا، اس کا ایک پرمی
 فقرہ ہے: ”خدا نخواستہ باشد۔ حق خدمت و نمک صحبت (نمک و صحبت)“ رافرا موش بکنند۔“

شیخ موسیٰ پاک شہید ملتانی | شیخ سیف الدین کا سلسلہ بیعت پانی پت

دیکھیے کہ انھوں نے اپنے بیٹے کو مرید اس بزرگ کا کرایا، جو علمی دنیا میں شہرت نہیں رکھتا، لیکن روحانی اور اخلاقی میدان میں دوسروں سے آگے تھا۔ شیخ موسیٰ گیلانی جن کے ”بہ امریدر“ شیخ محدث شاہ میں یعنی والد کی وفات سے پانچ سال پہلے مرید ہوئے، آج کے قادری بزرگ تھے۔ ان کے والد مخدوم شیخ حامد جیلانی نے اپنی زندگی میں انھیں اپنا جانشین منتخب کیا تھا، لیکن بڑے بھائی کو اس سے اختلاف تھا۔ چنانچہ عہد اکبری کے اواخر میں شیخ موسیٰ آج چھوڑ کر دربار میں آگئے۔ یہاں آپ کو پانسو کا منصب ملا۔ اور ایک زمانہ آپ لشکر شاہی میں رہے، لیکن جس جرأت کے ساتھ آپ دربار اکبری میں آمد و رفت رکھتے تھے، اس کا بیان بدایونی کی زبان سے سنئے:-

”وہ حضور بادشاہ در عین دیوان خانہ خاص و عام اگر وقت نمازی رسید۔ خود اذان گفتہ نماز بحضور خلیفہ وقت بہ جماعت ہی گزار دے۔ ویک کس چیزے نے توانست گفت۔“

شیخ محدث نے اخبار الاخبار میں مرشد کا تذکرہ بڑی عقیدت و احترام سے کیا ہے۔ اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ شیخ موسیٰ اکبری دور میں احیائے اسلام کے سرگرم ترجمان تھے:-

اگر دیگران قطب اند۔ او قطب الاقطاب است۔ و اگر ایشان سلاطین، او سلطان السلاطین۔

محمی الدین کہ دین اسلام زندہ گردانید و ملت کفر بمیرانید۔

شیخ موسیٰ گیلانی ایک عرصے تک لشکر شاہی اور دار السلطنت میں اسلام کا بول بالا کرتے رہے۔ اور کئی شہر نشینوں کو اس بادیہ پیمای کی بدولت روحانی تازگی اور

ملہ بدایونی کے بیان سے خیال ہوتا ہے کہ حصول منصب پہلے آپ مریدان شاہی میں داخل ہو گئے تھے۔ ”و درین ایام شیخ موسیٰ بعد از زہد و عبادت و شجاعت چنداں سالہ ارادت متعارف رسمی بہ بادشاہ آورد و شخصت سپاہگری یافتہ و تسلیم توکری کردہ داخل در پانصدی شدہ۔“ (منتخب التواریخ جلد سوم ص ۹۲)

استقامت نصیب ہوئی۔ بالآخر آپ کسی سلسلے میں ملتان تشریف لے گئے اور
سلسلہ میں وہاں شہادت پائی۔

سفرِ حرمین | شیخ موسیٰ گیلانیؒ کے فیضِ صحبت سے شیخ محدث کی اسلامی حمیت
کو اور تقویت ہوئی، لیکن فتح پور سیکری کا ماحول ٹھیکہ اسلامی خیالات
کی نشوونما کے لیے سازگار نہ تھا۔ اس لیے طبیعت ایک سخت باطنی کشمکش میں
گرفتار تھی۔ بالآخر عنایتِ ایزدی شامل حال ہوئی۔ اکبر کی فتح گجرات (۱۵۷۵ء)
نے سمندری سفر کا راستا آسان کر دیا تھا۔ اور شاید آپ شمالی ہندوستان کے پہلے
برگزیدہ عالم تھے، جو فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے ہی نہیں بلکہ مزید علمی ترقیوں کی خاطر
اس راستے سے مجاز روانہ ہوئے۔

شیخ محدث نے اپنا سفر ایک جذبہ کے تحت، بغیر کسی تیاری اور ساز و سامان
کے (”بہ طریق جذبہ“ بہ بیچ چیز مقید نشدہ) بلکہ پوری معلومات حاصل کیے بغیر شروع
کیا تھا، لیکن اس وقت تک علماءِ امرا میں ہر جگہ آپ کے قدردان موجود تھے۔ انھوں نے
آپ کی آمد کو اپنی خوش قسمتی خیال کیا اور راستے کی مشکلات باسانی کٹ گئیں۔ گلزارِ ابراہ
کا مصنف غوثی لکھتا ہے کہ ۹۹۵ھ (۱۵۸۶ء) میں آپ گھر سے نکلے۔ پہلے
مالوہ پہنچے۔ یہاں کا حاکم اکبر کا رضائی بھائی اور مشہور متدین امیر مرزا عزیز کو کہہ تھا۔ کچھ
عرصہ اس کے پاس قیام فرمایا۔ مالوہ کے قدیمی دار الخلافہ مانڈو تشریف لے گئے۔
وہاں غوثی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مستفید ہوا۔ پھر احمد آباد پہنچے اور اپنے
قدیمی دوست مرزا نظام الدین اکبری کے پاس قیام کیا۔ جو ان دنوں صوبہ گجرات کے
بخشی تھے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جہاز کا موسم گزر چکا ہے۔ چنانچہ کوئی ایک سال تک
رکنا پڑا۔ اس دوران میں علمی اور روحانی مشاغل برابر جاری رہے۔ بلکہ شاید آپ کے
مشہور تذکرۃ الاولیاء اخبار الاخبار کے زیادہ وسیع نقطہ نظر اور زیادہ صحیح معلومات
کا ایک سبب یہ ہے کہ آپ نہ صرف دہلی کے اہل علم یا ان بزرگوں سے جو اپنی ضرورت
کے سلسلے میں دار الخلافہ میں آتے تھے، واقف تھے۔ بلکہ آپ نے (جہاز کے علاوہ)

پنجاب - بندھیل کھنڈ، مالوہ اور گجرات کا سفر کیا تھا۔ وہاں کی زیارتیں دیکھی تھیں۔ اہل علم سے ملاقاتیں کی تھیں۔ اور اطراف ملک کی روحانی زندگی سے ذاتی واقفیت تھی۔ احمد آباد میں آپ کو وہاں کے سب سے برگزیدہ عالم شیخ وجیہ الدین علوی سے ملنے اور فیض پانے کا موقع ملا اور اخبار الاخبار میں آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے ان کے فادریہ سلسلہ کے کئی اذکار و اشغال بھی حاصل کیے۔ مولانا سلیمان کردی نے (جن کے صاحبزادے مولانا احمد کردی احمد آبادی گجرات کے مشہور فاضل شیخ نور الدین احمد آبادی کے استاد تھے) آپ سے احمد آباد میں حدیث پڑھی۔

۱۵۸۷ء کا اخیر یا ۱۵۸۸ء کا شروع تھا جب شیخ نے ساحل ہندوستان کو خیر باد کہا۔ زاد سفر مہیا کرنے اور جہازی اخراجات بہم پہنچانے کی سعادت، بخشی نظام الدین کو نصیب ہوئی۔ حجاز پہنچتے ہی آپ نے مکہ معظمہ کے محدثین سے صحیح مسلم اور صحیح بخاری کا درس لینا شروع کیا۔ فریضہ حج سے فارغ ہوئے۔ اور پھر شیخ عبد الوہاب متقی کی خدمت میں حاضر ہوئے، جن کا احسان آپ کی علمی اور روحانی زندگی پر سب سے زیادہ ہے۔

شیخ عبد الوہاب متقی | ہم شیخ عبد الحق محدث کے ابتدائی وحدت الوجودی ماحول کا ذکر کر چکے ہیں۔ ان کے والد چچا اور والد

کے مرشد شیخ امان پانی پتی کا جو انداز خیال تھا، اگر اس کے زیر اثر وہ اسی رنگ میں رنگے جاتے تو کسی کو تعجب نہ ہوتا، لیکن خوش قسمتی سے حرمین میں انھیں ایک ایسا استاد میسر آیا، جو ابن العربی اور اس کے ہم مشرب بزرگوں کے خیالات پر کڑی نظر رکھتا تھا اور جس نے شیخ عبد الحق کے ابتدائی ماحول کی تلافی کر دی۔

شیخ عبد الوہاب متقی شاید (شیخ علی متقی کے علاوہ) پہلے با اثر ہندوستانی عالم ہیں، جنھوں نے وحدت الوجودیوں کی افراط و تفریط کے خلاف باقاعدہ آواز اٹھائی اور شیخ عبد الحق محدث اور شیخ محمد طاہر پٹنی جیسی ہستیوں پر اثر ڈالا۔ وہ اور ان کے استاد شیخ علی متقی ہماری مذہبی تاریخ میں بڑی باعزت جگہ کے مستحق ہیں۔

شیخ عبدالوہاب کی ولادت مالوہ کے دار الخلافہ مانڈو میں ہوئی۔ ان کے والد شیخ ولی اللہ امرائے سلطنت میں سے تھے۔ چند واقعات کی بنا پر انھیں مانڈو چھوڑ کر برہان پور آنا پڑا، لیکن محوڑا عرصہ بعد وہ اور شیخ عبدالوہاب کی والدہ انتقال کر گئے۔ اور شیخ صغیر سنی میں یتیم ہو گئے۔ ان پر پتا نہیں، ان حوادث کا اثر ہوا یا کوئی اور سبب تھا۔ انھوں نے وطن مالوہ چھوڑ کر سیاحت اختیار کی اور گجرات۔ دکن۔ لٹکا اور دوسرے ممالک کی سیر کی۔ جہاں کہیں جاتے، طلب علم اور صحبت اہل اللہ میں منہمک ہو جاتے۔ بلکہ عنفوان شباب میں ہی مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور شیخ علی متقی کی صحبت اختیار کی۔ مؤخر الذکر کے شیخ عبدالوہاب سے مراسم تھے۔ اور انھیں بھی والد نے وصیت کی تھی کہ اگر ہو سکے تو تم شیخ علی متقی کی صحبت اختیار کرنا اور شیخ غوث گوالیاری اور اس قسم کے لوگوں سے بچے رہنا! آخر کار شیخ عبدالوہاب متقی، شیخ علی متقی کے مرید ہوئے۔ اور بارہ سال تک ان سے فیض حاصل کیا۔

شیخ علی متقی | شیخ علی متقی، جن کا فیض شیخ عبدالحق کو شیخ عبدالوہاب کی وساطت سے پہنچا۔ خود ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور ایک خاص شان اور پایہ کے بزرگ تھے۔ ان کا آبائی وطن جو نپور تھا، لیکن وہ خود مانڈو میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ خاندان کے تھے۔ اس لیے عنفوان شباب امرار و اکابر کے درمیان گزرا۔ لیکن عین عالم شباب میں ایک جنبے کے تحت دنیوی دلچسپیاں ترک کر دیں۔ اور ملتان پہنچ کر شیخ حسام الدین متقی کی خدمت میں راہ سلوک طے کی اور تفسیر مہناوی اور عین العلم کا درس لیا۔ وہاں سے مانڈو اور احمد آباد کے قیام کے بعد حجاز روانہ ہوئے۔ اور مزید علمی اور روحانی سر بلندی کا سامان کیا۔

آپ کے اساتذہ میں سے شیخ ابوالحسن بکری۔ شیخ محمد سخاوی اور شیخ ابن حجر مکی جیسے بزرگ تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد درس و تصنیف میں مشغول ہو گئے اور بڑا درجہ حاصل کیا۔ حتیٰ کہ آپ کے استاد شیخ ابن حجر سلوک میں آپ کے مرید

ہو گئے اور خرقہ بخلافت حاصل کیا۔ ۱۵۴۶ء میں آپ مقوڑی دربار کے لیے احمد آباد آئے جہاں کے بادشاہوں نے آپ کی بڑی قدر کی، لیکن آپ جلد ہی مکہ معظمہ واپس چلے گئے اور اپنے شغل میں لگ گئے۔ سلطان روم نے آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ ۱۵۶۷ء میں بمقام مدینہ منورہ نوے برس کی عمر میں وفات پائی۔

شیخ علی متقی نے سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ آپ کی زیادہ دلچسپی علم حدیث اور تصوف سے تھی، لیکن آپ نے محاصرہ بے اعتدالیوں پر بھی بڑی توجہ دی۔ شیخ غوث گوالیاری کے رسالہ معراجیہ کی مخالفت کے علاوہ آپ نے ہمدی جوہر پوری کے خیالات کی بڑی مخالفت کی۔ اور نہ صرف اس مقصد کے لیے حکام وقت کی اعانت حاصل کی بلکہ ہمدویت کی تردید میں دو مبسوط رسائل لکھے اور ظہور ہمدی کے نشانات کی تفصیلات اور علمائے مکہ کے فتاویٰ درج کر کے ہمدی جوہر پوری کے دعاوی کی تردید کی۔ یہ آپ کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ گجرات میں جو ہمدویت کا مرکز بن گیا تھا۔ یہ تحریک بالآخر ناکام ہوئی اور اسے اپنا مرکز دکن میں منتقل کرنا پڑا۔ آپ کے شاگردوں میں دوسرے اکابر علما کے علاوہ شیخ محمد بن طاہر ٹٹنی تھے۔ جنہوں نے اپنے استاد کی متابعت میں مخالفت بدعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور بالآخر اسی کوشش میں شہید ہو گئے۔

شیخ عبدالوہاب کو اس طرح کے استاد ملے ہوں تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے اپنے خیالات کا کیا اسلوب ہوگا۔ شیخ علی کے علاوہ انہوں نے حرمین کے دوسرے اساتذہ سے بھی فیض حاصل کیا۔ اور جب شیخ عبدالحق مکہ معظمہ پہنچے تو اس وقت ان کا شمار وہاں کے بہترین علما میں سے ہوتا تھا۔ اور ہندوستانی طلباء کے لیے تو وہ خاص طور پر ایک آئینہ رحمت تھے۔

شیخ عبدالحق ان کی نسبت لکھتے ہیں۔ کہ دین زمان بدانش ایشان در علوم شرعیہ کمتر کسے خواہد بود۔ اور باوجودیکہ وہ فقہ حدیث اور لغت میں امام زمانہ تھے، وہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی طلب ہمیشہ جاری رکھتے۔ ان کا قول تھا: "علم بمنزلہ غذا"

است کہ ہمیشہ احتیاج بآں باقی است۔“ ذکر کو وہ بمنزلہ دوا سمجھتے جس کی کبھی کبھی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ بزرگان سلف کا قاعدہ تھا کہ وہ اعمال خیر تہذیب اخلاق اور نشر علوم کو باقی سب چیزوں کے مقابلے میں اہمیت دیتے اور یہی سلامتی کا راستا ہے۔ ایک فہم ان کی صحبت میں کسی نے مشائخ کا یہ قول دہرایا کہ طالب کو ہمیشہ ذکر میں مشغول رہنا چاہیے۔ آپ نے فرمایا کہ جو کوئی نیک کاموں میں مشغول ہے وہ فی الحقیقت ذکر ہی کر رہا ہے ”نماز گزار دن بھر است تلاوت قرآن ذکر است و درس علوم دینیہ ذکر است و ہر حیر عمل خیر است ذکر است“! آپ نے شیخ عبدالحق کو بڑی محبت سے تعلیم دی۔ اور علوم شریعت و طریقت میں طاق کر کے اپنا مجاز مطلق و خلیفہ کل بنایا۔ شیخ عبدالحق وطن کے ماحول سے بددل ہو کر حجاز گئے تھے۔ ان کا واپسی کو بالکل جی نہ چاہتا تھا۔ لیکن استاد نے سختی سے ہدایت کی کہ تمھاری بوڑھی والدہ اور تمھارے بچے منتظر ہیں۔ تمھیں واپس جانا چاہیے۔ شیخ نے پھر کہا کہ ابھی تو میرا دل ان مقامات شریفہ میں دیر تک رہنے کو چاہتا ہے پھر بغاوت جانے کی خواہش ہے کہ حضرت غوث اعظم کے مزار کی زیارت کروں، لیکن استاد نے منع کیا اور کہا کہ تم بغداد جا کر پھر رک جاؤ گے۔ اور وطن کی واپسی جواب تمھارے لیے شرعی قرضہ ہے اس کی بجائو دسی میں دیر ہوگی۔ شیخ نے اور دلیل دیں۔ لیکن استاد نے دلائل عقلی و شرعی سے لا جواب کر دیا۔ اور بالآخر انھیں مجبور ہو کر وطن کا رخ کرنا پڑا۔

شیخ محدث اور بدایونی | شیخ عبد الوہاب متقی کے متعلق متذکرہ بالا حالات شیخ عبدالحق کی اپنی تصانیف سے ماخوذ ہیں۔ لیکن ملا عبد القادر بدایونی کی تیغ زبان سے کوئی نہیں بچا۔ اس نے علما و فضلا کے ضمن میں ان کے متعلق چار صفحے لکھے ہیں۔ زیادہ جگہ دو خطوں نے لی ہے۔ ایک فیضی کا شیخ کے نام خط ہے جس سے اقتباسات ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔ دوسرا ایک ایسا خط ہے جس کی نسبت منتخب التواریخ حصہ سوم کے انگریز مترجم اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کا خیال ہے کہ یہ خط بدایونی نے لاہور سے شیخ محدث کو لکھا۔ پروفیسر صاحب اپنی مشہور کتاب حیات شیخ عبدالحق محدث

دہلوی میں لکھتے ہیں :-

شیخ محدث جب حجاز سے واپس آئے تو بدایونی نے دہلی میں ان سے ملاقات کی۔
یہ ملاقات سرسری سی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ بدایونی اس وقت لشکر کے ہمراہ جا رہے تھے۔
بدایونی کو اس کا بڑا افسوس رہا۔ اور لاہور سے شیخ محدث کے نام ایک خط میں لکھا۔
”در وقتیکہ ملازمان ایشان بدہلی تشریف آوردند۔ و مخلص خود را
ساعتی لطیف مشرف ساختند۔ آن ملاقات بجز تعطش و شوق بفرود
و چن داں چیز ناگفتہ و ناشنیدہ ماند“ [ص ۲۴۵/۲۴۶]

پروفیسر صاحب نے اس خط کا ایک اور اقتباس درج کتاب کیا ہے
اور شیخ محدث اور ملا بدایونی کی ”محبت و یگانگت“ پر زور دیا ہے، لیکن ان کا
یہ خیال کہ یہ اظہار شوق بدایونی نے کیا۔ صحیح نہیں۔ جس خط سے انھوں نے
اقتباسات دیے ہیں، وہ ملا بدایونی کا نہیں، شیخ محدث کا ہے۔ بدایونی کی
عبارت حسب ذیل ہے :-

در ایامیکہ [شیخ محدث] از مکہ معظمہ تشریف بدہلی آورد و فقیر بحسب
مطلب [طلب] با اضطراب تمام از بدایوں متوجہ اردوئے پادشاہی بودم
لحظہ خدش را دیدم و بعد از آنکہ بہ لاہور رسیدم، خطے نوشتہ فرستاد۔
نقل آن بجمت تمین و تذکار ثبت سے نماید۔۔۔۔۔

پروفیسر نظامی نے اس خط کا جو پہلا اقتباس اپنی کتاب میں دیا ہے۔ اور
جسے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں، اس سے بھی ظاہر ہے۔ کہ اس خط کا لکھنے
والا کوئی ایسا شخص ہے، جو دہلی میں مقیم ہے۔

بدایونی کا باقی اندراج غور سے پڑھیں تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ
سمی تعریفوں کے ساتھ ساتھ طنز و تشیع اور خردہ گیری کے اس
بادشاہ نے نہر میں بجھے ہوئے نشتر چلائے ہیں۔ شیخ محدث کا بلند
مقام علم حدیث کی وجہ سے ہے۔ اور عشق رسول نے انھیں امتیازی

رنگ دے دیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے ایک مستقل باب (ہشتم) مدینہ منورہ میں شیخ کی حاضری کے متعلق لکھا ہے۔ (بہ عنوان مدینۃ الرسول میں) اس میں لکھتے ہیں۔ ”شیخ عبدالحق دہلویؒ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک سے عشق تھا۔ دیار حبیب میں جب داخل ہوتے تو برہنہ پا ہو جاتے تھے۔“ (ص ۱۱۲)

اس سے پہلے بالوضاحت لکھتے ہیں۔ ”۲۳ ربیع الثانی ۹۹۷ھ کو شیخ عبدالوہاب کی اجازت سے مدینہ طیبہ میں حاضر ہوئے۔ اور آخر جب ۹۹۸ھ تک یہیں مقیم رہے“ (ص ۱۰۸)۔ لیکن بدایونی کہتا ہے۔ کہ شیخ محدث تو مدینہ منورہ جا ہی نہ سکے!

یہی نہیں، بلکہ اُس کا بیان ہے۔ کہ شیخ نے صرف چند روز (”روزے چند“) مکہ معظمہ میں ”شیخ عبدالوہاب ہندی“ کے سامنے بیٹھ کر حدیث کی اجازت لی تھی۔ اور یہ شیخ عبدالوہاب ہندی کون تھے؟ شیخ رحمت اللہ محدثؒ کے (جن سے خود بدایونی نے تیمناً حدیث کا سبق لیا تھا اور ان کے دست مبارک سے آب زمزم پیا تھا) ”خادم“!

”و [شیخ عبدالحق دہلوی] بحسن سعی مرزا نظام الدین احمد و مددگاری او و ہزار شمسۃ بسفر حجاز رفت و بجهت تیغ (؟) بعضے موانع طبیعیہ مدینہ سکینہ علی ساکنہا السلام والتحیات، نتوانست مشرف شد و روزے چند در مکہ معظمہ بیش شیخ عبدالوہاب ہندی خادم شیخ رحمت اللہ محدث علیہ الرحمۃ (کہ با حاجی گم اندرج باز گشتہ با گره آمد و حقیر از دست مبارک او آب زمزم نوشیدہ و سبق حدیث تیمناً گرفتہ بود) اجازت حدیث حاصل کردہ، بوطن مالوف رسیدہ“

(منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۱۳-۱۱۴)

اگر بدایونی کا بیان صحیح ہے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ مدینہ منورہ میں شیخ محدث کی جس حاضری کا پروفیسر خلیق احمد صاحب نے اس ولولے اور وضاحت سے

ذکر کیا ہے۔ اور شیخ عبدالوہاب کے فیوض اور علوم مرتبہ کی جو تفصیل انھوں (اور راقم السطور) نے گنتائی ہیں۔ ان کی صحت سے انکار لازم آتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ ہم دونوں کے اندراجات شیخ محدث کے اپنے بیانات پر مبنی ہیں!

اب ایک فرد کی تردید میں دوسرے فرد، بلکہ ایک مقدس ہستی کے مقابلے میں دوسری مشہور (اور بعض حلقوں میں بے انتہا مقبول) ہستی کے بیان کا مسئلہ ہے۔ ان میں سے کسے ترجیح دی جائے؟ ہمارا اپنا خیال ہے۔ کہ اصل حقیقت فقط اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ لیکن روایت و دراست کے اصولوں سے شیخ کے بیان کو ترجیح ہوگی۔ ان کا اپنا معاملہ تھا۔ انھیں حقیقت حال سے زیادہ خبر ہوگی۔ بدایونی کا اندراج سماعی معلومات پر مبنی ہے۔

بدایونی کو دانستہ غلط بیانی کا مکرم قرار دینا ضروری نہیں، لیکن اس کے بیان سے اتنا ظاہر ہے کہ ان مقدس ہستیوں کے معاملے میں بھی، جنھیں وہ ”مجموعہ کمالات و منبع فضائل“ کہتا تھا۔ اگر اُسے خردہ گیری کا موقع ملتا تو قلم کا شتر چلانے سے پہلے وہ تامل اور تصدیق واقعات کو کام میں نہ لاتا سواہ میاں بدایونی! واہ!!

۵۔ تاوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

ترپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

فیضی اور شیخ محدثؒ | شیخ عبدالحی محدثؒ اگست ۱۵۹۰ء میں مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے اور پانچ سال سے زیادہ کی غیر حاضری

کے بعد واپس پہنچے۔ جب وہ دارالسلطنت سے روانہ ہوئے تھے تو فیضی اور ان کے درمیان بڑی میل ملاقات تھی۔ واپسی پر فیضی نے چاہا کہ انھیں پھر اپنے حلقہ احباب میں شریک کرے۔ اور انھیں بلانے کے لیے بڑے پرجوش، شوق آمیز خط لکھے۔ ”اگر بال و پر ہے می داشتہ ہر روز بر بام آں حجرہ می نشستم و دانہ چین نکات محبت می شدم۔“

لیکن جو جذبہ روحانی شیخ کو بے قرار کر کے فتح پور سیکری سے باہر لے گیا تھا۔ وہ اب شیخ عبدالوہاب متقی کی صحبت میں اور حدیث نبویؐ کے مطالعہ سے اور قوی ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ شاید انھیں اس تفاوت کا بھی اندازہ نہ تھا، جو فتح پور سیکری والے فیضی اور تفسیر غیر منقوط والے فیضی میں واقع ہو گئی تھی۔ انھوں نے معذرت آمیز خط لکھے لیکن ملاقات کا قدیمی سلسلہ تازہ نہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فیضی کی عقیدت اس سے کم نہ ہوئی۔ اب اس کے خطوں میں وہ شوخی اور بے تکلفی نہ تھی جس کا اظہار اس نے شیخ کی روانگی حجاز پر کیا تھا، لیکن عقیدت و ارادت برقرار تھی۔ ایک خط میں شیخ کو ”ملک الاجبا“ کہا ہے۔ ایک اور خط میں انھیں لکھا ہے۔

”بمجبور مطلق قسم کہ ہرگز اس شوق و فلق کہ اس مخلص مشتاق را نسبت ایشان است بدگریمے نبوده و نیست۔“

زمین لے نگذشتم، بمنزلے نرسیدم کہ در دلم نگذشتی، بخاطرم نرسیدی والحق این ہمہ مہر و مہربانی و دوام ہم نشینی و ہمزبانی کہ در ایام قربت و غربت از ایشان و بالیشان متحقق بود۔ چرا این کس چہیں کشاکش شوق بے قرار نساورد۔“

بالآخر فیضی کو اس امر کا احساس ہو گیا کہ شیخ اس سے ملنا نہیں چاہتے۔ اس نے ”ملک الاجبا“ کے اس فیصلے پر بھی تسلیم خم کیا۔ لیکن عقیدت و ارادت اب بھی کم نہ ہوئی۔ بلکہ وہ تفسیر سواطح الالہام لکھنے میں مشغول ہوا تو شیخ سے ملنے، انھیں تفسیر دکھانے اور ان سے داد لینے کی خواہش اور بھی بے قرار کرتی۔ کئی خطوط میں اس آرزو کا بے تابانہ اظہار ہے۔

تو اسے کہو تر بام حرم چہ می دانی

طییدن دل مرغان رشتہ بر پارا

اشتیاق ملاقات گرامی و توجہ بہ جمعیت باطن آن روحانی موطن نہایتے ندارد۔ و دل بخش ایشان شاید حال پس کہ محبت روز افزوں است و ہمارہ چشم در راہ و پیغام می باشد۔ آن خود چوں گوید کہ در راہ مقدم شریعت دارد۔ کہ خود را تابع

رضا سے ایشاں داشتہ۔ از خود خواہی خود را گزرا نیدہ است۔ علی الخصوص نسبت
بایشاں و این بار بر خود پسندیدہ نظر دل اگر بار کشد بار بکارے بارے

خوش باش کہ ما خودے بھراں کر دیم
بر خود و شوار بر تو آساں کر دیم

چہ نوید کہ بر دل چہ می رود و در دل چہ می آید۔

شیخ سے بھی کبھی کبھار خط آجاتا، لیکن وہ ترک صحبت الاضداد والاغیار میں
ثابت قدم رہے۔ انھوں نے فیضی کو فتح پور سیکری کی ان محفلوں میں دیکھا تھا جب
اس کی بے راہ روی اور رعوت عروج پر تھی۔ اس زمانے میں ان کی اور فیضی کی کارٹھی
چھنتی تھی۔ لیکن شیخ نے ان محفلوں میں جو کچھ دیکھا، اس نے ان کا دل اس قدر
کھٹا کر دیا کہ اب وہ سواطح الالہام والے فیضی سے بھی نہیں ملنا چاہتے۔ حالانکہ اس
دوران میں فیضی کے انداز خیال میں جو تبدیلی ہوئی۔ اس پر مثنوی تل و من کی نعت یا
تفسیر سواطح الالہام ہی نہیں، شیخ کے نام فیضی کے خطوط بھی گواہی دیتے ہیں۔ شیخ
اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہے بلکہ انھوں نے تذکرۃ المصنفین دہلی میں فیضی کی
نسبت لکھا:-

فیضی اگرچہ در فصاحت و بلاغت و متانت و رصانت سخن ممتاز روزگار بود لیکن
حیف کہ بخت وقوع و ہیبت در ہادیہ کفر و ضلالت رقم انگار و ادبار بر ناصیہ احوال
خود کشیدہ۔ زبان اہل دین و ملت جناب نبوت را از بردن نام و سے و نام
جماعت شوم و سے پاک است۔

جج سے واپسی کے بعد شیخ عبدالحق نے دہلی میں قیام کیا اور اپنے آپ کو
درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لیے وقت کر دیا۔ آپ کی تصنیفی زندگی
سفر حجاز سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اخبار الاخبار کا نقش اول غالباً فتح پور سیکری میں
مکمل ہوا۔ آداب الصالحین جو امام غزالی کی تصنیف اجیاء العلوم کے چند ابواب کا
فارسی ترجمہ ہے اور بعض دوسرے رسالے اسی زمانے میں لکھے گئے، لیکن حجاز میں

تکمیل تعلیم اور اپنے طویل سفرِ حرمین میں متعدد بزرگوں سے تبادلہ خیال کے بعد اب شیخ محدث نے سلسلہ تصنیف و تالیف باقاعدگی سے شروع کیا۔ اور یہ سلسلہ اخیر عمر تک جاری رہا۔ آپ نے مدینہ منورہ کی تاریخ موسومہ جذب القلوب فی دیار المحبوب سفر حجاز میں شروع کی تھی، لیکن اس کی تکمیل دہلی پہنچ کر ہوئی۔ ان کے علاوہ آپ نے جو کتابیں لکھیں، ان کی تعداد چالیس پچاس کے قریب ہے۔ ہم ان میں سے بعض کا ذکر آئندہ صفحات میں کریں گے۔

شیخ عبدالحق محدث اب ایک مستند عالم تھے، لیکن سلوک و طریقت سے ان کی دلچسپی کم نہ ہوئی۔ ۱۵۹۹ء میں خواجہ محمد باقی باللہ نقشبندی قدس سرہ دہلی تشریف لائے تو شیخ نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی۔ اور ارشاد و ہدایت کی اجازت حاصل کی۔ حضرت خواجہ باقی باللہ سے آپ کے تعلقات بڑے گہرے اور مخلصانہ تھے۔ طبعیتیں بھی ملتی تھیں۔ ان کے نام آپ کے متعدد خطوط مجموعۃ المکاتیب الرسائل میں موجود ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث کو حضرت خواجہ باقی باللہ سے بڑی عقیدت تھی، لیکن ان کے نامور مرید حضرت مجدد الف ثانی سے آپ کو سخت اختلافات پیدا ہوئے۔ اور ان کے بعض بیانات کی تردید میں آپ نے ایک مستقل رسالہ لکھا۔ ہمارے فاضل دوست پروفیسر خلیق احمد نظامی نے یہ پورا رسالہ اپنی کتاب حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ساتھ شائع کر دیا ہے، لیکن افسوس کہ انھوں نے شیخ محدث کی چار سو صفحے کی مبسوط سوانحی میں نہ ان اختلافات کی، جو انھیں حضرت مجدد سے تھے۔ نہ ان اسباب کی، جن کی بنا پر بعضوں کے نزدیک یہ اختلافات رفع ہوئے، وضاحت کی ہے۔ بلکہ یہ لکھ کر کہ ”یہ اختلاف عارضی تھا اور بہت جلد دور ہو گیا“ ان اختلافات کے متعلق غلط فہمی کی گنجائش باقی رکھی ہے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ جب شیخ محدث نے حضرت مجدد کے بعض

”واقعات“ پر اعتراض کیے۔ اس وقت انھیں مجدد کے علوم مرتبہ کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ان اعتراضات کی توضیح میں شیخ نے جو رسالہ لکھا اس میں وہ حضرت مجدد کو صاف کہتے ہیں کہ جتنی محبت اور یک جہتی مجھے آپ سے ہے، شاید ہی کسی سے ہو۔ ”ظن فقیر شیخ جمیل است۔ اس مقدار کہ مراد شمسیت محبت و اتحاد است“ کم کسے را خواهد بود۔ انھوں نے یہ رسالہ ”نصیحت و خیر خواہی“ کے لیے لکھا اور پوری ذمہ داری کے ساتھ تحریر کیا۔ بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ یہ رسالہ کئی مجلسوں میں مکمل ہوا۔ ہر بار میں نے استخارہ کیا اور خدا سے دعا مانگی کہ وہ ”شرہ نفس“ اور غلط فہمیوں سے محفوظ رکھے۔ [حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۴۳]

شیخ محدث کو حضرت مجددؒ سے عزیز تھے اور ان کا طریقہ بھی عزیز تھا۔ لیکن رسول کی محبت سب سے بڑھ کر تھی۔ اس نے انھیں مجبور کیا کہ وہ حضرت مجددؒ کے بعض دعاوی کے خلاف آواز اٹھائیں۔ ”نزدایں فقیر شہاہم عزیزید و ہم طریقہ شما۔ آاسخناں کہ نسبت بہ حضرت کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میگوند۔ آنہار آتاب نادر و آنچه نسبت بہ مشائخ گفتہ اند۔ کرا و جبراً برداشتہ شد۔ آابرواشتہ این کلمات از طاقت حال این فقیر بیرونست“

اخبار الاخبار کے مجتہد ابی ایڈیشن کے آخر میں ناشر یا مرتب نے اپنی طرف سے حضرت مجددؒ کا ذکر بڑھا دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ آخر عمر میں شیخ محدث نے حضرت مجددؒ کے متعلق اپنے خیالات سے رجوع کر لیا تھا۔ (شیخ مصنف رحمت اللہ تعالیٰ علیہ در آخر عمر ان خیالات کہ نسبت بحضرت ایشان داشت رجوع فرمود) اور اس کی تائید میں شیخ محدث کا ذیل کا رقعہ خواجہ حسام الدین کے نام کا نقل کیا ہے۔

”درین آیام صفایے فقیر خدمت میں شیخ احمد علیہ الرحمۃ متجاوز است و اصلاً پر وہ بشریت و عنادہ جبلت بمیان نہ ماندہ قطع نظر از رعایت طریقہ و انصاف و حکم عقل کہ با این چنین عزیزان و بندهاں بد نباید بود و در باطن بطریق ذوق و وجدان و غلبہ چیز سے افتادہ کہ زبان از تقریر آن لال است۔ سبحان اللہ مقلب القلوب و مبذل الاحوال۔ شاید

ظاہر بنیاں استعلا کنند من نمی دانم کہ حال چیست و بچہ منوال است۔“
 یہ روایت مجددیہ سلسلے میں کافی پرانی ہے، لیکن معاصرانہ اور معتبر تذکروں یعنی زبدۃ المفاتیح
 اور حضرات القدس میں نہیں۔ اس کا سب سے قدیمی بیان جو ہماری نظر سے گزرا ہے،
 روضۃ القیومیہ میں (دفتر اول ص ۲۱۱) پر ہے، جہاں حضرت خواجہ کلاں (خلف ارشد
 حضرت خواجہ باقی باللہؒ) کی کلیات کے حوالے سے شیخ محدث کا ایک رقعہ خواجہ
 حسام الدین کے نام کا درج ہے۔ جس کا مضمون تتمہ اخبار الاخبار والے مندرجہ بالا رقعہ
 سے ایک حد تک ملتا ہے۔ چونکہ حضرت خواجہ کلاں نے خواجہ حسام الدین کی سوانح عمری
 لکھی تھی۔ اس لیے ان کی کلیات میں موصوف کے نام کے رقعات کا ہونا مستبعد نہیں
 (ممکن ہے کلیات خواجہ کلاں کا کوئی نسخہ دستیاب ہو جائے۔ اور حقیقت حال
 پر زیادہ روشنی پڑ سکے)۔ روضۃ القیومیہ میں مندرجہ رقعہ اور تتمہ اخبار الاخبار والے
 رقعہ میں صرف ایک حد تک اشتراک ہے۔ (شاید اختلاف مضمون کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے
 سامنے روضۃ القیومیہ کا صرف اردو ترجمہ ہے) لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ روضۃ القیومیہ
 میں یہ رقعہ کسی رجوع کی تائید میں نقل نہیں ہوا۔ بلکہ مصنف نے اس سے یہ نتیجہ نکالا
 ہے کہ شیخ محدثؒ ”آجناب (یعنی حضرت مجدد الف ثانی) کی تجدید اور قیومیت“ کے
 معترف تھے!

اس کے بعد ”رجوع“ کی روایت عام ہونی شروع ہوئی۔ اور شیخ عبدالحق محدث
 کے رقعہ بنام خواجہ حسام الدین کو اس روایت کی تائید میں پیش کیا گیا۔ تتمہ اخبار الاخبار
 (مجتبائی) میں لکھا ہے۔ ”رجوع شیخ مشہور و برالسبب وثقات مذکور۔“ مجتبائی پریس سے
 اخبار الاخبار ۱۳۳۲ھ (یعنی ۱۹۱۳ء) میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد عام طور پر اس روایت
 کو دہرایا جاتا ہے۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی تذکرہ میں اسی خیال کا اظہار کیا۔
 دور حاضر میں شیخ عبدالحق محدثؒ کے سوانح نگار پروفیسر خلیق احمد نظامی نے
 ایک نیا اور کسی قدر مشکل الفہم نقطہ نظر پیش کیا۔ انھوں نے شیخ محدثؒ کے بالبصرہ

لہ مناقب العارفین کا ذکر آگے آئے گا۔

اپنے خیالات یا اپنے رسالے کے مضامین سے ”رجوع“ کا تو غالباً کہیں ذکر نہیں کیا۔ لیکن ”شیخ محدث کی رائے“ کے بدل جانے، ”شکوک و شبہات رفع“ ہونے اور علامتی اختلافات دور ہونے کا ذکر کر کے ”رجوع“ کے نظریے کو تقویت دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے نہ صرف اپنے کتاب کے ضمیمہ کے طور پر وہ رسالہ چھاپ دیا، جو شیخ محدث نے حضرت مجدد کے بعض بیانات کے متعلق لکھا تھا بلکہ اس رسالے کی اہمیت پر زور دیا اور اس کے اندراجات پر ”سنجیدگی سے غور کرنے کی“ دعوت دی۔
 ”یہ مکتوب شیخ مجدد اور شیخ محدث کے تعلقات کو سمجھنے میں بے حد مدد دیتا ہے۔

شیخ محدث نے مجدد صاحب کے جن جن خیالات پر اعتراض کیا ہے، ان پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے“ [حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۱۲]

پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کی کتاب کی اشاعت اور ان کے شائع کردہ رسالے کے مطالعہ کے بعد ہم نے خیال ظاہر کیا کہ غالباً رجوع کی روایت صحیح نہیں۔ ہمارے اس خیال کی تفصیلی تردید ایک محترم بزرگ نے کی ہے۔ ان کے ارشادات کا خلاصہ ہے کہ (۱) جو رسالہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شائع کیا ہے۔ وہ ”شیخ محدث کے قلم سے کم اور دوسروں سے زیادہ تعلق رکھتا ہے“ چنانچہ انھوں نے رسالے میں سے کئی بے ربط جملے جمع کیے ہیں (۲) شیخ عبدالحق محدث کا جو خط خواجہ حسام الدین کے نام ہے، اسے پوری اہمیت دینی چاہیے (۳) ”ہمارا خیال ہے کہ ”رجوع“ یا ”صفائی“ ضرور ہو چکی تھی اور ان جیسے بلند پایہ بزرگوں کی شان کا تقاضا بھی یہی تھا۔“

محترم بزرگ نے رسالے کے بعض بے ربط اندراجات کے متعلق جو شکاوت کی ہے، وہ بجا ہے۔ پروفیسر نظامی نے یہ رسالہ عہد عالمگیری کی تالیف معارج الولاۃ (مرتبہ ۱۰۹۲ھ) سے لیا۔ اور بظاہر جو غلط سلط متن ملا، چند حواشی کے ساتھ چھاپ دیا۔ چنانچہ کئی اغلاط کتابت اور بے ربط جملے رہ گئے۔ جن میں سے بعض کی

۱۔ محترم بزرگ کے مضمون میں ”مرتبہ ۱۰۹۲ھ“ غالباً سہوِ ناقل ہے۔

تصحیح معارج الولاۃ کے دوسرے نسخوں سے ہو سکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت بھی پوری طرح تسلی بخش نہ ہوگی۔ رسالے کی اشاعت مناسب طریقے سے بھی ہوگی، جب اسے ثانوی ذریعہ سے نہیں، بلکہ اصل رسالے کے مخطوطوں کے مطابق مرتب کیا جائے۔ اور یہ ناممکن العمل نہیں۔ اصل رسالہ کا کوئی نہ کوئی نسخہ شیخ محدث کے خاندان سے مل جائے گا۔ (جب سلسلہ ۱۹۰۲ء میں شیخ محدث کی سوانح عمری مرآۃ الحقائق شائع ہوئی۔ اس وقت جواب بعض کلمات حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ایک نسخہ خان بہادر مولوی محمد انوار الحق کے کتب خانہ میں تھا) رام پور لائبریری میں اس رسالے کا ایک مخطوطہ ہے کراچی میں کرنل عبدالرشید صاحب کے کتب خانے میں بھی ایک نسخہ ہے۔ محترم بزرگ نے رسالے کے متن کی تصحیح پر جو زور دیا ہے، وہ بجا ہے، لیکن جیسا کہ انھوں نے اعتراف کیا ہے۔ ان کے نشان کردہ ”تمام اغلاط“ کاتب کے ذمے ”بھی قرار دیے جاسکتے ہیں۔ انھیں اس کے باوجود بھی خیال ہے۔ کہ کتاب میں اضافے ہیں۔ اس کی انھوں نے وضاحت نہیں کی۔ اور بہر کیف اس کا فیصلہ کتاب کے بہتر مخطوطوں کی مدد سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بنیادی طور پر اور بظاہر متعدد اغلاط کتابت کے باوجود پروفیسر نظامی کا شائع کردہ رسالہ وہی ہے، جو حضرت مجدد کے متعلق شیخ عبدالحق نے لکھا۔ اس کی تصدیق کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ متعدد حضرات مجددیہ (مثلاً حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ) نے اس رسالے کا رد لکھا ہے۔ اور اس سلسلے میں اس کی طویل عبارتیں نقل کی ہیں۔ پروفیسر نظامی کے شائع کردہ رسالے میں یہ سب عبارتیں موجود ہیں۔ اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ متعدد اغلاط کتابت کے باوجود شائع شدہ رسالہ وہی ہے، جو

پروفیسر نظامی نے جس نسخہ پر انحصار کیا ہے۔ اس کی تاریخ کتابت ۱۲۸۵ھ ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دو مخطوطے ہیں جن میں سے ایک (مجموعہ آذر کا شمارہ 25H اساتذہ تالیف کے سترہ سال بعد یعنی ۱۳۰۵ھ میں) لکھا گیا۔ یہ نسخہ نہایت ہی خوش خط اور پروفیسر نظامی کے نسخے سے زیادہ صحیح ہے۔

شیخ محدث نے لکھا۔ اس میں کسی فقرے ایسے ہیں، جن میں حضرت مجددؒ کی تعریف و تصدیق کی گئی ہے (مثلاً "حضرت خواجہ باقی باللہؒ) اثبات شما (حضرت مجددؒ) بسیار میکردند۔ و کسان واقف اند برآں و بیشتر از ہمہ این فقیر" وغیرہ) معارج الولاۃ کے مولف غلام معین الدین کو حضرت مجددؒ کے مخالفین میں سے سمجھنا چاہیے۔ لیکن بظاہر یہ نظر نہیں آتا۔ کہ اس نے عبارت میں تحریف کی ہو۔

جہاں تک خواجہ حسام الدین کے نام کا رقعہ ہے، روضۃ القیومیہ کی عبارت دیکھنے کے بعد یہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ جو رقعہ تتمہ اخبار الاخیار میں نقل کیا گیا اس سے ملتا جلتا کوئی رقعہ شیخ محدث نے کسی وقت خواجہ حسام الدین کے نام لکھا۔ یہ رقعہ ہم نقل کر چکے، لیکن اس رسالے سے "رجوع" اخذ نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ "صفائی" کا خیال ہو سکتا ہے۔ (اور محترم بزرگ کو بھی اس کا کسی قدر احساس ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ "رجوع" یا "صفائی" ضرور ہو چکی تھی)۔ شیخ محدث نے جس طرح کا رسالہ لکھا تھا اور مشہر کیا تھا۔ اگر اس کو وہ غلطی سمجھتے تھے تو اعتراف سہو بھی علانیہ ہونا چاہیے تھے۔ اس کے علاوہ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ رقعہ رسالے کی تالیف کے بعد لکھا گیا۔ شیخ عبدالحق محدث کے متعلق ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ان کا زیادہ تعلق خانقاہ باقویہ دہلی کی اس جماعت سے تھا، جن کے حضرت مجددؒ سے حضرت خواجہ کی وفات کے بعد اختلافات رونما ہو گئے تھے۔ خواجہ حسام الدین کے ساتھ ان کا یگانگت معنوی کا قومی رشتہ تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ خواجہ حسام الدین کے نام حضرت مجددؒ کے مکتوب (دفتر سوم۔ مکتوب ۱۲۱) میں جس "عزیز" (اندراج یافتہ بود کہ عزیز سے بر عبارت مکتوب ہے کہ در اجیر نوشتہ بودی) اعتراضہا وارد) کی طرف اشارہ ہے، وہ شیخ محدث تھے۔ خانقاہ باقویہ کے مکتوبوں سے (جیسا کہ خواجہ حسام الدین کے نام کے متعدد مکتوبات سے واضح ہے) حضرت مجددؒ کے تعلقات میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہا۔ اور بہت ممکن ہے کہ شیخ محدث کا رقعہ کسی ابتدائی غلط فہمی یا عدم واقفیت کے دور ہونے کے بعد یا فقط ان کی

عظمت کے زیادہ احساس پر لکھا گیا ہو۔ یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ مندرجہ بالا رقعہ شیخ محدث کے رسالے کی تحریر اور رفع اختلاف کے بعد لکھا گیا ہو۔ جس کی یہ ہے کہ جیسا کہ فاضل محترم نے لکھا ہے۔ ”مجتبائی ایڈیشن والے خط میں حضرت مجددؒ کے نام کے ساتھ ”سلمہ اللہ تعالیٰ“ کا دعائیہ فقرہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ صفائی یا رجوع ان کی زندگی ہی میں (یعنی ۱۳۲۷ھ سے پہلے) ہو چکا تھا۔ رسالے کی تاریخ تحریر معلوم نہیں، لیکن اس کے اندراجات سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رسالہ دفتر سوم کے مکتوب شماره ۱۲۱ کے بعد لکھا گیا۔ کیونکہ اس مکتوب کی عبارتیں رسالے میں درج ہیں۔ یہ امر قریب قریب یقینی ہے۔ کہ مکتوب ۱۲۱ اجمیر سے سرہند کو آخری واپسی کے بعد لکھا گیا۔ (۱) یہ مکتوب خواجہ حسام الدین کے ایک خط کے جواب میں لکھا گیا۔ جس میں ایک ابتدائی مکتوب (۸۷) کا اس طرح ذکر ہے۔ ”مکتوبے کہ در اجمیر نوشتہ بودی“ کہ خیال ہوتا ہے کہ خواجہ حسام الدین کے مکتوب الیہ (یعنی حضرت مجددؒ) اس وقت اجمیر میں نہ تھے۔ (۲) مکتوب ۱۲۱ سے پہلا خط یعنی مکتوب ۱۲۰ ”اختیار کر دکن عزلت“ کے متعلق ہے۔ اور معاصرانہ تذکرے گواہ ہیں کہ آپ نے اجمیر سے واپسی کے بعد گوشہ نشینی اختیار کی۔ اور اس کے بعد ”مدت قلیل“ (حضرات القدس ص ۱۷۷) میں رحلت فرمائی۔ بالعموم یہ مدت چھ ماہ کی بیان ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ خواجہ ہاشم کشمی کی دکن کو روانگی کے قریب سات ماہ بعد آپ کا انتقال ہوا۔ اس لیے سرہند کا آخری قیام آٹھ نو مہینے کا ہوگا (۳) مکتوب ۱۲۱ بالکل آخری مکاتیب میں سے ہے۔ دفتر سوم میں جو مکتوبات کی آخری جلد ہے، فقط تین مکاتیب اس کے بعد ہیں۔ مندرجہ بالا وجوہ سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مکتوب ۱۲۱ حضرت مجددؒ کے آخری سال میں تحریر ہوا۔ یہ مکتوب دہلی پہنچا۔ اس کے بعد شیخ عبدالحی محدث نے کافی غور و تحقیق کے بعد اور کئی مجلسوں میں اپنا رسالہ لکھا۔ کیا یہ قرین قیاس ہے کہ اس کے چند مہینے بعد ہی انھوں نے حضرت مجددؒ کے بیانات جن کی نسبت وہ سالہا سال ”سالہا است“ سے غیر مطمئن تھے، کے متعلق اپنا نقطہ نظر ترک کر دیا۔

اور اُس رسالے کے مضامین سے، جسے انھوں نے ہر بار استخارہ کر کے اور دعائیں مانگ کر لکھا تھا، رجوع کر لیا؟

فاضل محترم نے یہ بھی لکھا ہے کہ ”ان (حضرت مجدد اور شیخ محدث) جیسے بلند پایہ بزرگوں کی شان کا تقاضا ہی تھا کہ ”رجوع“ یا ”صفائی“ ہو جاتی۔ یہ صحیح ہے کہ دونوں بزرگوں کا پایہ بہت بلند تھا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان میں کسی معاملے پر اختلاف رائے نہیں ہو سکتا تھا۔ ثواب صدیق حسن تو اس اختلاف میں تقلید اور ردِ بدعت کا پر تو دیکھتے ہیں۔ لیکن وجہ اختلاف کی طرف شاہ غلام علی قدس سرہ نے اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ شیخ محدث نے اعتراضات بطریق علمائے ظاہر کیے تھے۔ حضرت مجدد کے متعلقہ بیانات بطور اہل باطن کے تھے۔ ان دونوں کے درمیان اختلاف رائے ناممکن نہ تھا۔

ابھی تک ”رجوع“ کے مسئلے پر جو کچھ مواد ہمیں ملا ہے اس کے مطالعہ سے ہمارے شبہات رفع نہیں ہوئے۔ اس کی چند وجوہات اوپر درج ہو چکیں۔ ایک اہم وجہ یہ ہے کہ سلسلہ مجددیہ کے بزرگ جس طریقے سے اس روایت کی تائید کرتے ہیں۔ اس سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ استنادی حوالوں میں کافی جہان بین یا غور و خوض کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ مثلاً حال ہی میں ایک بزرگ نے انوار احمدیہ کے ایک اندراج کا ذکر کیا ہے، جس میں مناقب العارفین کے حوالے سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ شیخ عبدالحق کی تردید حسن افغانی کی شراکت کا شاخسانہ تھا۔ جب شیخ پر حقیقت ظاہر ہوئی تو انھوں نے حضرت مجدد سے معذرت کی۔ انھوں نے متعلقہ عبارت نقل نہیں کی لیکن جن خاں افغانی کے مکتوبات میں ترمیم و تحریف کا قصہ بہت مشہور ہے۔ جو اہر مجددیہ میں بھی مناقب العارفین کے حوالے سے یہ واقعہ درج ہے۔ اگرچہ وہاں حضرت مجدد سے معذرت کا ذکر نہیں۔ خواجہ حسام الدین کے نام اخبار الاخیار والے رقعہ لکھے جانے کا بیان ہے، لیکن یہ امر بھی ملحوظ خاطر

۱۔ ملاحظہ ہو حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۳۲

رکھنا ضروری ہے کہ حسن خاں افغانی کی ترمیم و تحریف کا واقعہ اگر صحیح بھی ہو تب بھی اس سے شیخ محدث کے خیالات کی تبدیلی قرین قیاس نہیں۔ کیونکہ انھیں مکاتیب کی جن عبارتوں پر اعتراض تھا، ان سے کبھی انکار نہیں کیا گیا۔ اور وہ مطبوعہ مکاتیب کے تمام نسخوں میں موجود ہیں!

اختیار الاختیار (مجتبائی) والے رقعہ کی نسبت یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں حضرت مجدد سے جلتی ارادت کا ذکر ہے۔ اس سے زیادہ شیخ محدث رسالہ لکھتے وقت ظاہر کر چکے تھے، لیکن یہ ارادت رسالہ لکھنے میں مانع نہ ہوئی۔ اس خط میں بھی ”میاں احمد سرسندی“ کو مجدد نہیں کہا گیا۔ اور بہر کیف اگر کسی باطنی اشارے کی بنا پر حضرت مجدد سے شیخ کی عقیدت بڑھ گئی ہو۔ تب بھی رسالے میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے شیخ عبدالحق جیسا عاشق رسول ”رجوع“ کرے۔

ابھی تک جو مواد ہمیں ملا ہے۔ اس کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ شیخ عبدالحق نے رسالے کے مضامین سے رجوع نہیں کیا۔ بلکہ جس مقصد سے انھوں نے یہ رسالہ لکھا تھا، اسی کی تکمیل کے لیے اپنی ضخیم کتاب مدارج النبوۃ لکھی۔ اور فی الواقع یہ مقصد شیخ کی علمی زندگی میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کے ایک معاصر میر عبد الاول ان کی نسبت لکھتے ہیں:-

”جنت حفظ امن وعافیت و دفع مرض فتنہ اشتغال بہ علوم حدیث واجب دید

وضریرموم حوادث را بایں تریاق فاروق مندفع گردانید۔“

میر عبد الاول نے بڑے پتے کی بات کہہ دی ہے کہ شیخ عبدالحق نے اپنے زمانے کے فتنوں کا تریاق علم حدیث کی ترویج میں دیکھا۔ اور اسی میں مشغول رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ کے زمانے میں ہمدیت، قیومیت اور عقلیت کے طرفداروں نے عقائد و خیالات میں الجھنیں ڈال رکھی تھیں۔ شیخ نے ان سب کا علاج یہی سوچا کہ نبوت کی عظمت و حقیقت کو نمایاں کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے (جیسا کہ میر عبد الاول نے کہا ہے) علوم حدیث کی اشاعت کی، بلکہ ان کی علمی زندگی کا

اصل محور رسالت مآبؐ کی ذاتِ بابرکات تھی۔ آپؐ نے نہ صرف حدیث نبویؐ کا درس دیا اور اس علم میں متعدد کتابیں لکھیں، بلکہ رسول کریمؐ کی سیرت اور حقیقت نبوت پر بڑی تقطیع کی بارہ چودہ سو صفحے کی کتاب مدارج النبوت لکھی۔ انھوں نے تاریخ مدینہ کے متعلق ایک عربی کتاب کا جو ترجمہ کیا، اس کا عنوان "جذب القلوب فی دیار المحبوب" ہی اس عاشقِ رسولؐ کی قلبی کیفیتوں کا آئینہ دار ہے۔

شیخ عبدالحق محدثؒ نے حضرت مجددؒ کے بعض بیانات کے متعلق جو رسالہ لکھا، اس کا مقصد بھی ان خیالات کی تردید تھا، جو مجددیت اور نبوت کی شرکت کے متعلق ظاہر کیے گئے تھے۔ مدارج النبوت کے مقصد تحریر کی نسبت شیخ لکھتے ہیں:-

"چوں از فساد زماں انحراف در مزاج وقت بعض درویشان مغرور این روزگار راہ یافتہ
..... تنگی حوصلہ و ادراک پایہ ارفع و مقام اقدس محمدیؐ کہ بحکس را بدرک و دریافت
آن راہ نیست، نشاختہ۔ و تقصیرے در ادائے حق نموده و از جادہ دین و صراط مستقیم
بر افتادہ بودند۔ لازم حق مسلمانی آن نمود۔ کہ احوال و صفات قدسیہ... نگارش نماید
و این بے خبران را از حقیقت حال آگاہ گرداند"

پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنی کتاب میں یہ عبارت درج کرنے سے پہلے فرماتے ہیں:- "مدارج النبوت کی تصنیف سے شیخ کا مقصد یہ تھا کہ عہدِ اکبر کے فتنوں کا سد باب کیا جائے لیکن پتا نہیں کہ درویشان مغرور اس روزگار سے وہ اکبر اور اس کے درباری کیوں مراد لیتے ہیں جو مدارج النبوت کی تالیف سے بہت پہلے ختم ہو چکے تھے۔ اور بہر کیف کبھی بھی درویش نہ تھے اور اس کے واضح مفہوم کو محض درویشوں پر کیوں منطبق نہیں کرتے؟

مدارج النبوت میں ایک اور جگہ ہے:-

بعض کوتاہ بینان کہ شہود حق را از وساطت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مفارق میدانند
و بہر رخنہ و سے واقع نمی شوند۔ این معنی در رسالہ جدا آورده، بعضے از مدعا ہارا

۱۔ منقولہ در حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی (تالیف پروفیسر خلیق احمد نظامی) صفحہ ۲۹۷

مشرح ترازیں گفتہ ایم۔

چونکہ شیخ محدث نے مندرجہ بالا عبارت میں رسالے کا نام نہیں لیا۔ اس لیے یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ کس رسالے کی طرف اشارہ ہے۔ غلط فہمی کی گنجائش رہتی ہے، لیکن چونکہ شیخ محدث نے رسالے کا موضوع بیان کر دیا ہے۔ اس لیے عبارت کا مفہوم محدود ہو جاتا ہے۔ ہمارے ایک محترم بزرگ کا خیال ہے کہ اس میں ”حضرت شیخ (عبدالحق محدث) کے رسالہ فقر محمدی“ کی طرف اشارہ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ رسالہ فقر محمدی شیخ محدث کی تصنیف نہیں۔ یہ رسالہ عرب کے ایک عالم صوفی شیخ احمد بن ابراہیم الواسطی الحزرمی نے عرب میں تصنیف کیا۔ خواجہ باقی باللہ کے استفسار پر شیخ محدث نے ”بطریق اختصار“ اس کا ترجمہ کیا۔ ”تاپیدا گرد۔ کہ مقصود چیست۔ بے زیادت چیزے برآں۔“ اب قارئین ہی غور فرمائیں۔ کہ ایک دوسرے عالم کی تصنیف کے اس ملخص کو ”حضرت شیخ“ عبدالحق کا ”رسالہ“ کیسے کہا جاسکتا ہے۔ اور اس سے وہ رسالہ کیسے ملا دیا جاسکتا ہے جس کی نسبت شیخ محدث (جو انتخاب الفاظ میں اتنے محتاط اور باریک ہیں تھے) مدارج النبوت میں فرماتے ہیں۔ ”ابن معنی در رسالہ جدا آورده، بعضے از مدعا ہارا مشرح ترازیں گفتہ ایم“ یعنی جو ان کی اپنی تصنیف ہے!

رسالہ فقر محمدی کا یہ ملخص حضرت خواجہ باقی باللہ کے نام شیخ محدث کے پانچویں خط کی صورت میں اخبار الاخبار (مجتبائی) کے حاشیے پر ملتا ہے۔ محترم بزرگ نے بھی اس میں سے تفصیلی اقتباسات دیے ہیں۔ رسالت مآب کو اپنا شیخ طریقت سمجھنے اور طریقت محمدی کے قواعد و اشغال کا بیان ہے۔ لیکن اگر آپ کو ”شہود حق“ اور ”رباطت نبوی کو“ مفارق“ سمجھنے والوں کے متعلق ”مشرح تر“ اظہار خیال مطلوب ہے تو وہ یہاں نہیں ملتا۔ اس مسئلے پر واضح اور مفصل اظہار خیال شیخ عبدالحق محدث کے اس رسالے میں ہے جس کا نام ان کی قدیمی سوانح عمری مرآۃ الحقائق میں جواب بعض کلمات حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ دیا ہے۔ اور جسے اب پروفیسر

خلیق احمد نظامی نے حیاتِ شیخ عبدالحق محدث کے آخر میں شائع کیا ہے۔

جس رسالے کا مدارج النبوت میں ذکر ہے، کیا یہ رسالہ وہی تو نہیں، جو حضرت مجدد کے بعض بیانات کے متعلق لکھا گیا اور جس میں توسطِ نبوی کی ضرورت پر تفصیلی بحث کی گئی ہے؟ موجودہ اشاعت میں توضیح حال کے لیے ہم نے دو پراگرات بڑھا دیے ہیں اس سے پہلے مدارج النبوت کا اندراج نقل کرنے کے بعد فقط خط کشیدہ عبارت بھی تھی۔ اور اہل علم سے سوال کیا تھا کہ جس رسالے کا منقولہ اندراج میں ذکر ہے کیا وہی رسالہ تو نہیں جو شیخ محدث نے حضرت مجدد کے بعض بیانات کے متعلق لکھا؟

ہماری اس دوسطری عبارت پر ایک بزرگ نے بڑی برہمی کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے۔ ”حضرت مجددؒ پر فاضل محترم نے افتر اور بتان باندھا ہے۔ کہ انھوں نے شہودِ حق کے لیے اس (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی) وساطت کو مفارق سمجھا ہے“ دوسری جگہ اسی طرح کا اظہار کرتے ”ظلم اور سینہ زوری“ اور ”افتر پردازی“ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ (آپ ان الفاظ کی شدت پر نہ جائیے۔ یہ ہمارا اور بزرگ محترم کا معاملہ ہے۔ ہم نے انھیں نقل کر دیا ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کس چیز نے ہمیں مجبور کیا۔ کہ حقیقت کو وضاحت سے بیان کریں)۔

آپ مندرجہ بالا خط کشیدہ عبارت پر غور فرمائیں۔ ہم نے ہرگز ہرگز یہ نہیں کہا کہ ہمارے نزدیک حضرت مجددؒ علیہ الرحمۃ نے شہودِ حق کے لیے وساطتِ نبوی کو مفارق سمجھا ہے۔ سوال صرف شیخ محدث کے بیان کا ہے۔ ہم نے اشتراکِ مضمون کی بنا پر فقط اس امکان کا اظہار کیا ہے کہ جس رسالے کا مدارج النبوت میں ذکر ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ وہی رسالہ ہو جو شیخ محدث نے حضرت مجدد کے متعلق لکھا۔ اس چیز کو اس طرح پیش کرنا کہ جس بات کا شیخ محدث نے اظہار کیا۔ وہ ہمارا خیال ہے، شاید صحبتِ بیان سے کسی قدر دور ہے!

اب اصل سوال کو سمجھیں اور اس امر پر غور کیجیے کہ شیخ عبدالحق محدث کے کئی بیانات کی بنا پر بھی خیال ہوا کہ شاید مدارج النبوت میں اسی رسالے کی طرف اشارہ ہے جو

حضرت مجدد کے بعض بیانات کی نسبت لکھا گیا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اجمیر سے حضرت مجدد نے ایک مکتوب (دفتر دوم - شماره ۸۷) لکھا، جو شیخ عبدالحق کے ترویجی رسالے کا محرک ہوا۔ اس مکتوب کی چند سطریں (امرتسری ایڈیشن کے مطابق) درج ذیل ہیں :-

سلسلہ ارادت من یہ توسط بہ اللہ متصل است تھائے

وید من نائب مناب ید اللہ است -

ارادت من بہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بواسطہ کثیرہ است

وارادت من بہ اللہ قبول و ساطت نمی نماید - چنانکہ گزشتہ -

پس من ہم مرید محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و ہم پیرہ پس رواد -

برخوان این دولت ہر چند طفیلی ام، اما ناخواندہ نیامدہ ام

و ہر چند تابع ام، اما از اصالت بے بہرہ نیم

و ہر چند اکتتم، اما شریک دولتہم نہ شریکتے کہ ازاں دعوئے ہمہ سری نیز د کہ آن کفر است بلکہ

شرکت خادم است با محمد و م.....

مندرجہ بالا سطور سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مسئلہ زیر بحث کیا تھا۔ جب اس

مکتوب پر مشورہ و غوغا ہوئی (دفتر سوم - مکتوب ۱۲۱) - اور شیخ حسام الدین نے

حضرت مجدد کے نام شہادت اور اعتراضات ارسال کیے تو حضرت مجدد نے ایک

منفصل خط لکھا - (شماره ۱۲۱) - اس کے آخر میں رسول اللہ کی مدح و ثنا لکھی - اور

ان کے توسط و توسل کی ضرورت پر زور دیا - شیخ عبدالحق محدث نے تو ضیحی مکتوب

کے اس حصے پر بڑی خوشی ظاہر کی (جہاں راسیاب و دل را شاداب می گرداندا

لیکن پہلے خط (شماره ۸۷) اور بعد کے مکتوب کے ابتدائی حصے پر انہیں اعتراض ہوا -

۱۔ امرتسری ایڈیشن میں اس طرح ہے - شیخ عبدالحق محدث نے اس مکتوب کی توسل اپنے رسالے میں ہی ہے

اس کی کئی جگہ صبیحی ہے - و ہم ہمہ (ملاحظہ فرماتے شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۱۵)

توضیح مکتوب میں حضرت مجدد نے محمدی مشرب سالک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا۔
 ”مخدوم اصول فیوض مرسلات را بتوسط وحیولت خیر البشر علیہ و علی آلہ الصلوٰۃ والسلام
 نازمانے است۔ کہ حقیقت آن سالک کہ محمدی المشرّب است۔ بحقیقت محمدی
 منطبق نگشتہ است۔ و بآن متحد نشدہ و چوں بکمال متابعت بلکہ بحض فضل و مقامات
 عروج ایں حقیقت را بآن حقیقت اتحادے حاصل شدہ توسط برخاست۔“ شیخ محدث
 شکایتاً لکھتے ہیں۔ ”در عبارت ایشان اکثر متابعت بہ ذکر فضل الہی مقرونست۔“
 حضرت مجدد نے لکھا تھا کہ یہ شرکت خادم و مخدوم کی ہے۔ شیخ محدث کو اس پر بھی
 اعتراض تھا۔ جہاں تک تعجبت کا تعلق ہے، انھوں نے لکھا کہ یہ مقولہ تو بالکل ہمدردیہ فرقہ
 کے بیان کے مطابق ہے۔ ”می گفتند کہ ہر کمالے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 داشت۔ در سید محمد (جنپوری) نیز بود۔ فرق (این) است کہ آنجا بہ اصالت بود۔
 و ایں جا بہ تعجبت رسول بجائے رسیدہ کہ ہچواو شدہ۔ و ایں بجینہ مقول ایشان (مجدد)
 است۔“ جہاں تک خادمی و مخدومی کا تعلق ہے، شیخ محدث نے لکھا۔ ”تفرقہ و تفصیل
 باعتبار خادمی و مخدومی و اصلانہ و فرعتہ نیز باطل است و عاقل۔“ ایک اور جگہ کہتے ہیں۔
 ”ایں سخن خادمے و مخدومے در کلام ایشان بسیار واقع شدہ۔ در اجتماع کمالات ہر اہمی
 و محمدی نیز گفتہ اند۔ و ایں را گریز گاہ ساختہ اند۔ تا فائدہ ندارد۔“ لیکن رسالے میں زیادہ
 بحث خدا تک پہنچنے کے لیے وساطت نبوی کی ضرورت پر ہے۔ (شاہ غلام علی صاحب)
 نے جو رسالہ شیخ کی تردید میں لکھا۔ اس میں کہتے ہیں ”معظم اعتراضات حضرت شیخ رفع توسط
 است۔ و دریں باب اطانت کلام بسیار فرمودہ“ (ص ۲۶)۔ متحد و صفحوں پر ”توسط“
 ”عدم توسط“ ”وساطت“ ”وسائط“ ”واسطہ“ کا ذکر آتا ہے۔ ان سب کے حوالے دینا
 غیر ضروری ہے۔ لیکن ”شہود حق“ اور ”وساطت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم“ کی
 مفارقت کے متعلق رسالے کا مضمون ایک اندراج سے ہی واضح ہو جاتا ہے۔ شیخ
 محدث حضرت مجدد کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں :-

”شمارا عالم و فاضل و ماہر و دانشور و سخنور میدانیم۔ بلکہ عارف و مکاشف ہم گوئیم۔“

اماں راز کجا معلوم کنم کہ شما بسیر مرادی بمرتبه رسیدہ اند کہ وساطت حضرت سید المرسلین
وستید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم در میان شما و خدا سے عزوجل نماندہ است؟“ (ص ۳۲۱)
کیا ”شہود حق“ اور ”وساطت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم“ کی ”مفارقت“ کے متعلق
اس سے زیادہ واضح کوئی چیز ہو سکتی ہے؟

یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مجدد کے متعلق شیخ محدث کا خیال صحیح نہ تھا۔ اسی طرح
مدارج النبوت میں جس رسالے کا ذکر ہے، اس کے متعلق شاید قوی دلائل سے یہ
ثابت کیا جاسکے کہ اس کے متعلق ہم نے جس امکان کا ذکر کیا تھا، وہ قابل قبول نہیں۔
لیکن شیخ محدث نے اس رسالے میں جسے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شامل کتاب
کیا ہے، ”شہود حق“ اور ”وساطت“ سید المرسلین کی مفارقت کا جس طرح ذکر کیا ہے،
کیا اس کو دیکھتے ہوئے اس امکان کا ذکر کرنا (بلکہ اس امکان کے متعلق محض ایک
سوال اٹھانا) کہ مدارج النبوت کی خط کشیدہ عبارت میں جس رسالے کا ذکر ہے، کیا یہ
وہی رسالہ تو نہیں، جسے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شائع کیا، شاید اتنا بے بنیاد نہیں۔
کہ اس سوال پوچھنے والے کی دیانت پر شبہ ہو۔ اور ”افرا“ اور ”بہتان“ کے الفاظ
استعمال کیے جائیں۔

ہمیں رسالے سے ”رجوع“ کے متعلق شبہ ہے۔ اور اگر مدارج النبوت کی مندرجہ
عبارت میں واقعی اس رسالے کی طرف اشارہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ شیخ محدث اپنی بعض

لے ”رجوع“ کی روایت کے متعلق یہ امر قابل غور ہے کہ یہ روایت صرف مجددی حلقوں میں مشہور
ہے یا شیخ کی (بعد کی) کتابوں میں ملتی ہے؟ شیخ محدث کی کسی تصنیف میں اس کا ذکر نہیں۔ ان کے
خاندان میں بیسیوں صاحب علم، صاحب تصنیف گزرے ہیں۔ ان کے صاحبزادے شیخ نور الحق
ممتاز اہل قلم تھے۔ ان کی کسی تحریر کا حوالہ نہیں دیا جاتا۔ آج سناٹھ ہشت سال پہلے ان خاندان کے ایک
بزرگ نے شیخ محدث کی ایک مکتوبہ سوانحی مرآۃ الحقائق کے نام سے شائع کی۔ اس میں شیخ کی تصنیفات میں
رسالے کا اندراج بالوضاحت ہے۔ ”جواب بعض کلمات حضرت مجدد افغانی قدس سرہ“ (مر ۲۶-۲۷) لیکن ”رجوع“ کا
کہیں ذکر نہیں۔

دوسری تحریروں میں ان خیالات کی طرف اشارہ کرتے رہے جنہیں وہ رسالے میں ظاہر کر چکے تھے، لیکن ”رجوع“ کی روایت سے انکار سے یہ نہ سمجھا جائے کہ خدا نخواستہ یہیں رسالے کے اندراجات سے اتفاق ہے یا نہیں حضرت مجدد کی عظمت و بزرگی کا پورا اعتراف نہیں۔ حاشا وکلا۔ ایک عرصے تک تو ہم حیران تھے کہ توضیحی مکتوب (۱۲۱) کے بعد شیخ محدث کو یہ رسالہ کھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ پہلے خط (۳/۸) سے ان کی پریشانی تو بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن جب حضرت مجدد نے توضیحی مکتوب میں لکھ دیا کہ ان کے یہ اور اس قسم کے دوسرے بیانات کا سکر سے تعلق ہے۔ اور دوسرے مشائخ کبار (مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردی مصنف عوارف المعارف) کی مثالیں دیں، تو معاملہ کی نوعیت دوسری ہو جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس مکتوب کو جو حضرت مجدد کی قابلیت، قوت استدلال اور سلیقہ تحریر کا شاہکار ہے، حرف آخر سمجھ لینا چاہیے تھا، لیکن شیخ محدث نے اسے حرف آخر نہیں سمجھا۔ اس کی وجہ سوچ سوچ کر اور مزید مطالعہ سے ہی سمجھ میں آئی کہ اس مکتوب میں بھی ایک فقرہ ایسا تھا، جو انہیں قبول نہ تھا۔ اور جس سے ان کے خیال میں وساطت نبوی کی اہمیت میں ضعف آتا تھا۔ یہ فقرہ تھا۔ ”چوں بکمال متابعت بلکہ محض فضل در مقامات عروج اس حقیقت [یعنی حقیقت آل سالک کہ محمدی المشرق است] را با آن حقیقت [حقیقت محمدی] اتحادے حاصل شد، توسط برخاست۔“ یہ صحیح ہے کہ حضرت مجدد نے سالک کے اس اتحاد کو ”شُرکتِ خادم با مخدوم“ کہا تھا۔ لیکن شیخ محدث اس توضیح کو قبول نہ کرتے تھے۔ (باطل است و عاطل) اور اسے ”گر بنگاہ“ کہتے تھے۔ اس کے علاوہ سکر اور صحو کے متعلق حضرت مجدد نے جو کچھ توضیحی مکتوب کے متعلق لکھا، شیخ محدث اسے بھی تسلیم نہ کرتے تھے۔ حضرت مجدد نے اس موضوع پر تفصیلی اظہار خیال کیا تھا۔ چند متعلقہ فقرات حسب ذیل ہیں۔

”ہر کہ صحو دارد، گمان نکند کہ سکر ہمراہ اوست کہ آن عین قصور است۔ صحو خالص

نصیب عوام است۔ ہر کہ صحو را ترجیح دادہ است، مرادش غلبہ صحو است نہ صحو صرف۔“

شیخ نے بھی اس مسئلے پر تفصیل سے لکھا۔ ان کی رائے کا ماہر حاصل تھا۔ ”و در حقیقت سُکرو صحرانداں اند کہ جمع نمی شوند“ بہر کیف شیخ خود ”ارباب صحو“ میں سے تھے۔ اور انھوں نے حضرت مجدد کے بیانات پر تبصرہ بطور ایک اہل صحو کے ہی کیا ہے۔

شیخ محدث سلوک کی منزلوں سے واقف تھے۔ برہ کوچک کے ادب کا بہترین تذکرہ اخبار الاخبار انھی نے لکھا۔ زاد المتقین میں حضرت خواجہ باقی باللہ کی صحبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ”مدتے مشق نسبت خواجگان کردہ، طریقہ ذکر و مراقبہ رابطہ و حضور و یادداشت حاصل نمودہ“۔ رسالے میں بھی انھوں نے کی جگہ اہل معرفت کا انداز اختیار کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اہل شرع سے تھے۔ اور احتیاط کے باوجود کبھی کبھی متشدد نقطہ نظر بھی اختیار کر لیتے تھے۔ ان کے رسالے کو حضرت مجدد کے بیانات پر ”علمائے ظاہر“ کا محاکمہ سمجھنا چاہیے۔ شاہ غلام علیؒ نے ان کے جواب میں جو رسالہ لکھا۔ اس کے عنوان میں انھوں نے (یا مرثب نے) شیخ محدث کا ذکر ملا عبد الحق کہہ کر کیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بسا اوقات ان کی مولویت ان کے عرفان پر غالب آجاتی۔ ان کے رسالے کی اہمیت اس بات میں ہے۔ کہ یہ ایک بلند احوال شیخ کے بیانات پر ایک ممتاز عالم شرع کا تبصرہ ہے۔ اس سے ایک متوازن رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے، لیکن حضرت مجدد کا مقام اتنا بلند ہے۔ اور ان کے احسانات اتنے عظیم ہیں کہ شیخ محدث کے اختلاف کی وجہ سے یا ان کے بعض بیانات کو قابل تاویل سمجھ لینے سے بھی ان کے مرتبہ میں فرق نہیں آتا۔ انھیں شیخ کی تائید (یا بدایونی کی ہمنوائی) کی ضرورت نہیں۔ ع

آفتاب آمد دلیل آفتاب !

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے رسالے کے اندراجات کے متعلق لکھا ہے کہ ان پر ”سنجیدگی سے غور کی ضرورت ہے“۔ اس تجویز پر عمل تو اس وقت ہو سکتا ہے، جب جب رسالے کا صحیح ایڈیشن موجود ہو اور رسالے کے جواب میں حضرات مجددیہ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی اس کے ساتھ شامل ہوا۔ اور اس وقت بھی طالب حق

کے لیے ضروری ہے کہ صرف سنجیدگی یا ادب نہیں۔ بلکہ ایک حسن ظن کے ساتھ اور ان تمام اصولوں کو مد نظر رکھ کر جو حضرت مجددؒ نے مکتوب ۱۲۱ کے آخر میں درج فرمائے ہیں۔ بزرگان دین کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ ایک بڑا ذمہ داری کا کام ہے۔ لیکن اس وقت بھی شیخ محدث کی ایک شکایت پر غور ہو سکتا ہے جو انھوں نے بعض وابستگان سلسلہ کے متعلق حضرت مجددؒ کے نام کے رہنما لکھے ہیں کی۔ متعلق جو گھنٹے گھنٹے مریدان ایشیاں کہ در نقل اقوال و ذکر حکایات بصرہ و بے احتیاط۔

پروفیسر محمد فرمان نے تسلیم کیا ہے کہ حضرت مجددؒ کے بارے میں "متاخرین حضرات" نے واقعی غلو سے کام لیا ہے۔ لیکن جیسا کہ شیخ محدث کی مندرجہ بالا عبارت سے پتا چلتا ہے۔ یہ عمل اس سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اس عمل کی تکمیل تو روضۃ القیومیہ کے مصنف نے کی، لیکن زبدۃ المقامات بھی مشکوک روایات سے خالی نہیں ہے۔ اور ۱۸۰ھ میں غوثی منڈوی کو گلزار ابرار کے لیے حضرت خواجہ باقی باللہ کا جو تذکرہ خواجہ محمد صدیق بدخشی نے لکھ کر دیا۔ اور اب شامل کتاب ہے۔ اس کے بعض اندراجات بھی پوری احتیاط سے نہیں لکھے گئے۔ مثلاً سوانح عمری حضرت مجدد الف ثانی سرہندی میں علامہ ابو الفضل محمد احسان اللہ عباسی گورکھپوری نے لکھا ہے "حضرت خواجہ باقی باللہ بظاہر آپ کے پیر اور درپردہ مرید تھے" (توبہ توبہ) اس کی ہلکی سی بنیاد خواجہ محمد صدیق بدخشی کی تحریر میں نظر آتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ حضرت خواجہ حضرت مجددؒ کے بے حد معترف تھے، لیکن وہ ان کے پیر تھے۔ اور ان کے نزدیک (جیسا کہ مبداء و معاد کی متعلقہ عبارت سے نظر آتا ہے) پیر کامل۔ بعض مجددی تذکرہ نگار اس مسئلے پر جو کچھ لکھتے آئے ہیں، وہ نہ صرف انتہائی بے ادبی

۱۔ ناممکن نہیں کہ ایک آدھ فقرہ الحاقی ہو۔ زبدہ کا ایک "مصحح" (۲) نسخہ طباعت کے لیے ایک ثقہ بزرگ کے کتب خانہ سے ملا۔ مطبوعہ نسخوں سے بیسیوں صفحے مستزاد ہیں۔ کتب صوفیہ کی صحت کا مسئلہ (سوائے مکتوبات امام ربانی جیسی استغاثی صورتوں کے) بڑا پیچیدہ ہے۔

تصنیف زندگی میں بھی انھیں دخل تھا۔ مثلاً فتوح الغیب کی شرح انھی کے اصرار پر لکھی گئی۔ شرح مشکوٰۃ کی تالیف میں بھی ان کی تشویق و ترغیب کو دخل تھا۔ طرز تحریر کی نسبت بھی وہ مشورے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ شرح مشکوٰۃ کی نسبت انھوں نے لکھا کہ اس میں جا بجا اشعار درج ہونے چاہئیں تاکہ انداز بیان دلچسپ اور موثر ہو۔ فرمودندہ ترجمہ گا ہے بتقریب بعضے از کلمات قوم نیز در آورده باشند۔ چنانچہ ملاحضین در تفسیر خود می کنند۔ و فرمودند یگانہ ملتے مناسب مقام ہم می نوشته باشند۔

شاید ادبی مشوروں سے بھی اہم چیز روحانی راہنمائی اور دستگیری تھی۔ شیخ عبدالحق محدث کا ابتدائی ماحول صوفیانہ تھا۔ اور انھیں اس راستے سے گہری دلچسپی تھی۔ مثلاً ان کے عزیز دوست اور مرتبی نظام الدین بخشی ان کی نسبت لکھتے ہیں۔ ”امروز در دہلی است.... و در لباس صوفیہ می گزراند“ لیکن انھوں نے مشغلہ علما کا اختیار کیا ہوا تھا۔ انھوں نے ان دونوں میں تطبیق و ہم آہنگی کا راستہ نکالا، لیکن بسا اوقات اس کوشش میں شدید باطنی کشمکش اور انتہائی روحانی سرطندی سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بالخصوص حضرت مجدد کے دعاوی تو ان کے لیے بڑے خلیجان کا باعث ہوئے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات کے بعد وہ جس بزرگ سے اپنی روحانی مشکلات کے حل کے لیے رجوع کرتے وہ شاہ ابوالمعالی تھے۔ شاہ صاحب کے نام ان کے کئی خط ہیں جو ان تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن ان سے بھی زیادہ دلچسپ ایک خط اپنے فرزند ولید شیخ نورالحق کے نام ہے۔ ”طلب الخیر فی قصۃ السفر لاہور“ جس میں بتایا ہے کہ کس طرح شاہ ابوالمعالی ان کی تصانیف کی تعریف کر کے ان کا دل بٹھاتے۔ اور ساتھ ساتھ جلالی شان بھی دکھاتے۔ ”آفتاب سے ایں ستر نہو انیم کرد۔ و میگویند کہ اگر اظہار کردی و افشا نمودی۔ ترار سوا سے مرد و زن سازیم“ بسا اوقات وہ شیخ عبدالحق محدث کی نقل و حرکت پر بھی کڑی پابندیاں لگاتے۔ ان سے ملاقات کے لیے شیخ لاہور آنا چاہتے تو روک دیتے۔ یہاں آتے تو جلد دہلی واپس جانے پر اصرار کرتے۔

دہلی در فراق شہا بزبان حال می نالد۔ بروید بروید قیام دہلی میں بھی ایک زمانے میں ان کا حکم تھا۔ از زاویہ انزوایا سے بیرون نہ نهد۔ واندرویش و تو انگر و خوش و بیگانہ و مردہ و زندہ، سچ کس راتہ بندہ اصل میں شاہ ابوالمعالی چاہتے تھے کہ شیخ گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنا علمی کام کریں۔ شیخ ان سب ارشادات کی خوشی تعمیل کرتے اور جب کسی باطنی الجھن کا سامنا ہوتا تو اس کے حل کے لیے لاہور لکھتے۔ لاہور جاتے تو وہاں سے ہٹنے کو جی نہ چاہتا (گرفتاری ماہر این شہر لاہور کہ وطن گزاشتمہ اینجامی با شمیم سبب آن اینست کہ اینجا کسے ہست کہ گرفتار اویم) شیخ کی شاہ صاحب سے عقیدت کا باعث یہ تھا کہ اس زمانے میں انھی کو اپنا مونس و غمخوار سمجھتے تھے۔ ایک خط کے آخر میں لکھتے ہیں:-

اظہار این اگرچہ بے ادبی است۔ اما چونکہ طاقت طاق است۔ کجا رود و بکہ گردید

فریاد دل غمزدہ را اگر نکتی گوش

پس پیش کہ از دست تو فریاد تو راں کرد

شاہ ابوالمعالی نے ۱۶۱۵ء میں وفات پائی۔

غالباً قادیانہ سلسلے کے بزرگوں سے تعلق کا نتیجہ تھا کہ آخر عمر میں شیخ عبدالحق محدث کے داراشکوہ سے جو اسی سلسلے میں مرید تھا، تعلقات استوار ہو گئے۔ داراشکوہ کی فرمائش پر شیخ نے زبدۃ الآثار کا فارسی ترجمہ کیا۔ سکینۃ الاولیاء میں داراشکوہ نے شیخ اور جہانگیر کے تعلقات کے متعلق ایسی باتیں لکھی ہیں جو کسی اور تذکرے میں نہیں ملتی۔ وہ کہتا ہے کہ جس زمانے میں جہانگیر کشمیر میں تھا۔ کچھ لوگوں نے شیخ عبدالحق اور مرزا حسام الدین کے متعلق بادشاہ کے سخنان غیر واقعہ سے کان بھرے۔ بادشاہ نے دونوں کو کشمیر بلوا بھیجا۔ شیخ نورالحق کو حکم ہوا کہ کابل چلے جائیں۔ شیخ محدث کی عمر اس وقت پچیس برس سے زیادہ تھی۔ سخت پریشانی کی حالت میں لاہور پہنچے۔ حضرت میاں میر لاہوری نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ اس عمر میں وطن اور اولاد سے جدا ہونا بڑا تکلیف دہ ہے، لیکن شیخ ابھی کشمیر

پہنچے تھے کہ جہانگیر کا انتقال ہو گیا اور وہ شیخ نور الحق کے ساتھ دہلی واپس آ گئے۔
 جہانگیر نے تزک میں جس احترام سے شیخ عبدالحق کا ذکر کیا ہے، اس کے پیش نظر
 داراشکوہ کا بیان مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ ایک خیال ہے کہ شاید شیخ سے باز پرس میں
 جہانگیر کی شیعہ بیگم نور جہاں کی شکایتوں کو دخل ہو۔ لیکن شیعہ سُنی مسئلے پر شیخ عبدالحق محدث
 کی رائے معتدلانہ تھی۔ شیعہ مورخ خانی خان کی نسبت لکھتا ہے، ”صد کتاب از علوم
 عقلی و نقلی تالیف فرمودہ خصوص شرح مشکوٰۃ و تاریخ مدینہ کہ در آن ذکر حضرت آئمہ
 طاہرین و ظلم و تعدی مخالفین باظهار کمال حسن عقیدت نمودہ.... گویند بعد مراجعت
 از کتبہ اللہ اکثر بزبان صداقت بیان اس سخن جاری بود کہ تا بہ بیت اللہ رفتہ ملتے
 مقیم گشتہ صرف اوقات برائے تحقیقات احادیث نمودم نہ انستم کہ بیشتر احادیث
 مشہور وضعی است“ شیعہ سُنی اختلافات پر شیخ کا مسلک شاہ ولی اللہ کا تھا۔
 حضرت مجدد الف ثانی کا نہ تھا۔ اس کی بنا پر حکومت وقت سے حقیقی قرن قیاس
 نہیں۔ اگر داراشکوہ کا بیان صحیح ہے تو ممکن ہے کہ جہانگیر کے خلاف شاہ جہان
 نے جو بغاوت کی تھی اس میں دوسرے راسخ الاعتقاد مسلمانوں کی طرح آپ اور
 شیخ حسام الدین کی ہمدردیاں شاہ جہان کے ساتھ شریک ہوں۔ بہر کیف شاہ جہان
 کی تحت نشینی نے یہ الجھن ختم کر دی اور عہد شاہ جہانی میں آپ کی قدر و منزلت میں
 اور اضافہ ہو گیا۔

شیخ عبدالحق کی عمر عزیز میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت دی۔ ابراہیم جہانگیر وہ
 بادشاہوں کا پورا عہد حکومت آپ نے دیکھا۔ اور شاہ جہان کے سولہویں سال
 جلوس میں انتقال فرمایا۔ آپ کی وفات ۲۸-۲۹ جون ۱۶۲۲ء کی درمیانی رات کو
 پورانے سال دو مہینے کی عمر میں ہوئی۔ اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کے
 قریب حوض شمس کے کنارے ایک پرفضا زیارت گاہ میں دفن ہوئے۔
 معلوم ہوتا ہے شیخ محدث کی صحت میں اخیر عمر تک فرق نہیں آیا۔ چنانچہ جس
 وقت آپ کی عمر نوے برس کے قریب تھی۔ اس زمانے کی نسبت شاہ جہاں کا درباری

مورخ لکھتا ہے۔ ”بالکے عقود و زندگیش بہ تسحین پیوستہ۔ از سلامت قوی بالواع طافا و ریاضات و تعلیم و تالیف و تصحیح بسان آیام شباب می پردازد۔“

مورخین اس پر متفق ہیں کہ اگرچہ فن حدیث کے فاضل شیخ عبدالحق محدثؒ سے پہلے بھی

ہندوستان میں موجود تھے۔ لیکن اس علم کو پہلی دفعہ آپ ہی نے عام کیا۔ تذکرہ علمائے ہند میں لکھا ہے ”علم حدیث بہ محروسہ ہندوستان از و شیوع یافتہ۔“ میر غلام علی آزاد بلگرامی مائثر الکرام میں نقل کرتے ہیں:-

”بہ فشر علوم سیماء علم شریف حدیث پیداختہ بہ نہجی کہ در دیار عجم احد سے را ازہ علماء متقدمین و متاخرین دست ندادہ است۔ ممتاز و مستثنیٰ گردیدہ۔ و در فنون علمیہ خاصۃً فن حدیث کتب مستبرہ تصنیف کردہ۔ چنانکہ علماء زمان اعتنا بآں و رزیدہ دستور العمل خود دارند۔“

مولنا ابوالکلام آزاد ہندوستان میں علم حدیث کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:- ”مولنا جمال الدینؒ کے آخری عہد میں شیخ عبدالحق حجاز سے واپس آئے۔ اللہ نے ان کی عمر مبارک میں بڑی برکت دی۔ اور ان کے درس و تصنیف نے ایک پورا سلسلہ تعلیم ملک میں عام کیا۔“

شیخ محدثؒ نے نہ صرف درس و تدریس کے ذریعے علم حدیث کی اشاعت کی۔ بلکہ اس موعود پر کئی کتابیں لکھیں، جن کا علمی پایہ اب تک مسلم ہے۔ عربی میں ان کی مشہور کتاب لمعات ہے جو مشکوٰۃ کی شرح ہے اور جسے چھ سال کی محنت کے بعد انھوں نے ۱۶۱۶ھ میں مکمل کیا۔ اس کے دیباچے میں انھوں نے حدیث کی مختلف قسموں اور علم حدیث پر تبصرہ کیا ہے۔ اور طویل اقتباسات دے کر فقہ حنفی کو حدیث کے مطابق ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے حدیث کے

۱۔ شیخ عبدالحق نے حدیث کی اتنی اشاعت کی، لیکن ان کا طریق کار اس قدر معتدلانہ تھا کہ بعض اہل حدیث حضرات کو ان کی فقہ حنفی کی پاسداری کھٹکتی ہے۔ مثلاً نواب صدیق حسن خاں ان کی نسبت لکھتے (باقی اگلے صفحے پر)۔

اسناد اور اسماء الرجال پر بھی ایک کتاب لکھی ہے، لیکن شاید ان کتابوں سے بھی زیادہ مفید کتاب اشعة اللمعات تھی جو فارسی میں مشکوٰۃ کی شرح ہے اور لمعات سے زیادہ مفصل ہے۔ اس کتاب کا آغاز انھوں نے لمعات کے ساتھ سن ۱۱۷۱ھ میں کیا تھا، لیکن اس کی تکمیل میں دیر لگی۔ مولنا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں: ”حضرت شاہ عبدالحق محدث جس دورِ علم و تعلیم کے بانی ہوئے، اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو ملک کی عام زبان تھی، تصنیف و تراجم کی بنیاد ڈالی گئی۔ خود شاہ صاحب نے مشکوٰۃ وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ پھر ان صاحبزادے شیخ الاسلام نور الحق نے صحیح بخاری کا“

حدیث کے علاوہ شیخ عبدالحق نے سب سے زیادہ توجہ سیرت اور مدیۃ النبیؐ کی تاریخ پر (جسے سیرت کا مکملہ کہنا چاہیے) مبذول کی۔ مقصد ساری کوششوں کا یہ تھا کہ حدودِ یہ تحریک۔ بعض ”درویشانِ مغرور“ کے دعاوی اور مقامِ اقدسِ محمدیؐ کے عدم ادراک۔ نظریۂ انفی۔ دربارِ اکبری میں توحید بلکہ عقلیت کے مقابلے میں نبوت سے کم نگہی۔ رسولِ اکرمؐ کے صحیح واقعاتِ زندگی سے عام ناواقفیت۔ ان تمام اسباب کی بنا پر عوامِ جاوہِ محمدیؐ سے دور جا رہے تھے۔ اس کا سدباب ہو جائے۔ چنانچہ شیخ نے اسلامی ہندوستان کی پہلی مبسوط سیرت نبویؐ مدارج النبوت کے عنوان سے کوئی بارہ سو صفحات میں ترتیب دی، جو اب بھی مقبول ہے اور اصل فارسی اور اردو ترجمہ (منہاج النبوت) متعدد بار شائع ہو چکے ہیں۔

جذب القلوب فی دیار المحبوب مدیۃ النبیؐ کی تاریخ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ تاریخ مدینہ منورہ کے عنوان سے شائع ہوا ہے اور اصل فارسی بھی کسی مرتبہ

(بقیہ فٹ نوٹ ص ۳۸۴)

ہیں۔ ”فقیہ حنفی و علامہ دین حنفی است“ و اما محدث مشہور است۔ و دستگاہش در فقہ بیشتر از عبارت در علوم سنت سنیه است و لہذا جانب داری اہل الرائے جانب گرفتہ۔ معہذا جابا حمایت سنت صحیحہ نیز نمودہ طالب علم را باید کہ در تصانیف وے ”خذ ما صفا و ذر ما کدر“ پیش نظر دارد۔

بھی ہے۔

شیخ عبدالحق محدث کی دوسری دلچسپی قادریہ سلسلے کے بانی حضرت غوث اعظم عبد القادر جیلانیؒ سے تھی۔ آپ نے ان کی تصانیف کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ غنیۃ الطالبین کا ترجمہ کیا۔ فتوح الغیب کی شرح لکھی۔ غوث اعظم کی سوانح عمری اخبار الاخبار کے شروع میں تبرکاً درج کی۔ اور آخر عمر میں داراشکوہ کی فرمائش پر جو آپ کی طرح قادریہ سلسلے سے منسلک تھا، حضرت کی قدیمی اور مستند سوانح عمری بحجت الاسرار کا خلاصہ زبدۃ الآثار کے عنوان سے مرتب کیا۔ اس کا اردو ترجمہ محل الابصار کے نام سے شائع ہوا ہے۔

آپ کی ایک دلچسپ تصنیف زیاد المتقین الی طریق الیقین ہے۔ جس میں ان شیوخ و اساتذہ کے حالات لکھے ہیں جن سے آپ نے سفر حجاز میں فیض حاصل کیا۔ فہرست التالیف میں اپنی تصانیف کی مفصل فہرست دی ہے۔ شروع میں مصنفین ہلی کا تذکرہ ہے جس کا اردو ترجمہ حکیم سید شمس اللہ قادری نے حیدرآباد سے شائع کیا ہے۔ ایک دلچسپ رسالہ تورانیہ سلطانیہ ہے جس میں جہانگیر کے لیے آئین سلطنت اور قواعد حکمرانی کو ترتیب دیا ہے۔

شاید آپ کی سب سے زیادہ کامیاب تالیف اخبار الاخبار ہے۔ جس میں آپ نے ہندوستان کے اولیاء اور بزرگوں کے حالات تاریخی ترتیب سے لکھے ہیں شروع میں

لے اس کتاب اور شیخ محدث کے متعلق جہانگیر کی رائے دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ وہ چودھویں سال جلوس (آغاز مارچ ۱۶۱۹ء) کے واقعات میں لکھتا ہے ”شیخ عبدالحق دہلوی کہ از اہل فضل و ارباب سعادت است۔ دریں آمدن دولت ملازمت دریافت۔ کتابے تصنیف نمودہ بود مشتمل بر احوال مشائخ ہند (اخبار الاخبار) بہ نظر در آمد۔ خیکے رحمت کشیدہ مدت با ست کہ در گوشہ دہلی بوضع توکل و تجرید بسر برد۔ مرد گرامی است۔ جہانگیر نے شیخ محدث کو ایک گاؤں بطور جاگیر پیش کیا اور براہِ راست سے لینے پر آمادہ کیا۔

تبرکات حضرت غوث اعظمؒ کے حالات دیے ہیں۔ جن کے سلسلہ قادریہ میں آپ نے
 کئی بزرگوں سے بیعت کی تھی۔ پھر اولیاء کے تین طبقے ترتیب دیے ہیں۔ پہلے میں
 خواجہ بزرگ اجمیریؒ اور ان کے معاصرین اور مریدین کے حالات ہیں۔ دوسرے میں
 بابا فریدؒ اور ان کے ہم عصر بزرگوں اور مریدوں کے اور تیسرے طبقے میں حضرت
 چراغ دہلیؒ سے لے کر اپنے زمانے تک کے مشائخ کے حالات لکھے ہیں۔ آخر میں
 اپنے بزرگوں کا تذکرہ اور ۵۸۰ھ تک کے اپنے بعض حالات درج کیے ہیں۔ ہندوستان
 کی مذہبی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے یہ تذکرہ نہایت اہم ہے ایک
 آپ نے حتی الوسع مستند واقعات لکھے ہیں۔ دوسرے طرز ادب پاکیزہ اور بلخ و موثر ہے۔
 غیر ضروری جزئیات سے پرہیز کیا ہے، لیکن کام کی کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ غیر معروف
 سلسلوں اور دور افتادہ بزرگوں کے مستند حالات تلاش کرنے میں خاص محنت کی ہے۔
 اور بعد میں آنے والوں کو زیر بار احسان کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کی تکمیل
 میں آپ کو برسوں محنت کرنی پڑی۔ پہلے تلاش حالات میں اور پھر ترتیب مضامین
 اور اصلاح عبارت میں۔ شروع میں کوئی پندرہ ہزار سطریں تھیں۔ پھر بارہ ہزار اور
 آخری ترتیب میں آپ کے ایجاز و اختصار کی بدولت نو ہزار رہ گئیں۔ یہ کتاب
 آپ کی سب سے پہلی تصنیف ہے، لیکن برسوں کی تہذیب و اصلاح کی بدولت اس کا
 مرتبہ بہت بلند ہو گیا اور اب اسی کو آپ کا شاہکار سمجھنا چاہیے۔

آپ کی ایک اور قابل ذکر تاریخی تصنیف تاریخ حقہ یا ذکر ملوک ہے۔ جس میں
 سلطان محمد غوری سے اکبر کی تخت نشینی تک کے حالات ہیں۔ یہ کتاب غالباً قیام
 فتح پور سیکری میں شروع ہوئی اور حج سے واپسی کے تین چار سال بعد (سنہ ۱۵۸۷ھ)
 میں مکمل ہوئی۔ اگرچہ بعد میں بھی اضافے ہوتے رہے۔ اس کتاب میں اکبر کے خلاف
 کوئی ٹھوس چیز نہیں، بلکہ آخری باب میں اس ارادے کا اظہار ہے کہ بادشاہ کی فتوحات
 اور قواعد و ضوابط کو کسی اور وقت لکھیں گے۔ لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ معلوم ہوتا
 ہے کہ یہ کتاب کسی فراموشی کی تکمیل میں لکھی گئی، اپنی خوشی سے نہیں۔ اور کئی جگہ

شیخ نے دنیا داروں کی تاریخ لکھنے پر محذرت آمیز شعر لکھے ہیں مثلاً ۵
 حقی ز پئے قصہ و افسانہ شدی چوں مردم روزگار فرزانہ شدی
 درویشی، تر از ذکر شاہاں چہ غرض مفتون سخن گشتی و دیوانہ شدی

اور ۵

حقی تو ز تاریخ و حکایات گوئے در راہ تتبع روایات میوئے
 در زاویہ فقر نشستی، کارے جز ذکر خدا، نفی و اثبات مجوئے
 شیخ عبدالحق کی کل تصانیف کی تعداد سو سے زائد بتائی جاتی ہے۔ لیکن اس شمار
 میں وہ اٹھ سٹھ رسائل بھی ہیں جو المکاتیب والرسائل کے عنوان سے ایک جلد میں
 جمع ہیں۔ آپ شاعر بھی تھے اور حقی نخلص کرتے تھے۔ آپ کا مجموعہ کلام جس
 میں غزلیات، قصائد، قطعات و رباعیات اور مثنویاں غرض تمام اصنافِ سخن
 شامل تھیں۔ ”حسن الاشعار“ کے نام سے مرتب ہوا۔ غالباً یہی مختصر مجموعہ وہ دیوان
 تھا جو گزشتہ صدی کے آخر یا اس صدی کے شروع میں نواب علی حسن خاں مولف
 صبح گلشن نے دیکھا تھا۔ لیکن صبح گلشن میں جو اشعار منتخب ہوئے ہیں۔ وہ بیشتر
 رسمی، عاشقانہ قسم کے ہیں اور غالباً قیام فتح پور سیکری میں لکھے گئے۔ مثلاً ۵

شوخی چایک سوار من نگرید فتنہ روزگار من نگرید
 کوہ کن کوہ کند و من جاں را کار او نیز و کار من نگرید
 اے خوش آدم کہ با قیدیاں گفت حقی، خاکسار من نگرید

چوں من میرم چہ حاصل گریبت آرام جاں باشد
 من از حسرت بمیرم، اور بکام دیگران باشد
 بہر جور بچہ آں مہ می کند، از جا مرو حقی
 کہ بد خوئے مرا شاید کہ مقصود امتحاں باشد

بر رخ زلف پر شکن بینید سنبُل اُفتادہ بر سمن بینید
در گرفت از رخ بگل آتش آتش اُفتادہ در چمن بینید
تن او در برون پیرا ہن بچو جاں در درون تن بینید
نثر کی بعض تصانیف میں بھی شعر درج ہیں۔ مثلاً :-
حقّی از گوشہ دہلی نہ نہم پابروں خود گرفتیم کہ ملک گجرانم داند

حقاً بیانِ شوقِ بیایاں نمی رسد کوتاہ ساز قصہ دور و دراز را

خاندانِ حقّی | شیخِ محدّث کی اولادِ معنوی بہت تھی، لیکن اولادِ ظاہری میں بھی وہ خوش نصیب تھے۔ ان کے فرزندِ اکبر مولانا نور الحق عہدِ شاہجہانی میں محرزِ عہدوں (مثلاً قضاۃ اکبر آباد) پر ممتاز رہے۔ اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ کی سب سے مشہور تالیف شرح صحیح بخاری ہے جو چھ جلدوں میں مکمل ہوئی، اور نگِ زیب سے منسوب کی گئی۔ اس کے علاوہ آپ نے نواب مرتضیٰ خاں کے ایما پر ہندوستان کی تاریخ، زبدۃ التواریخ کے نام سے لکھی کتاب فی الحقیقت شیخ عبدالحق کی کتاب ذکر الملوک کا ترمیم شدہ نسخہ ہے، لیکن اس میں عہدِ اکبری کے حالات اضافہ کیے گئے ہیں۔ والد کی وفات کے بعد آپ سرکاری عہدوں سے علیحدہ ہو گئے۔ اور خاندانی مدرسے میں درسِ حدیث اور ارشاد و ہدایت کا کام شروع کیا۔ وفاتِ نوے برس کی عمر میں ۱۰۶۳ھ میں ہوئی۔

آپ کے تفصیلی حالات نہیں ملتے اور یہ پتا نہیں چلتا کہ آپ سے کس نے علمِ حدیث اخذ کیا۔ لیکن آپ کے شاگردوں میں "قطبِ المحدثین" مولانا سید مبارک حسین واسطی بگرامی (متوفی ۱۲۵۷ھ) کا نام لیا جاتا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ آپ کا فیض دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔

فرحت الناظرین میں آپ کی نسبت لکھا ہے :-
"فاضلِ محدّث و عالمِ متبحر بود۔ خلیفہ و جانشین پدر خود، عبدالحق دہلوی بہت

رحمۃ اللہ علیہ۔ و شیخ مذکور نسبت و ارادت بہ سلسلہ قادریہ ساد القیہ (شاذلیہ) داشت
و ادب برسی جزو، یہ صحیح بخاری شرحی واقعی داشت و مفصلات و مشکلات احادیث را
حل ساختہ و در تقویت مذہب امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ جہدِ بلیغ نمودہ، و احادیث
مخالفہ این مذہب را تا ویلاتِ نجستہ فرمودہ و بر عیندی و شرح مطالع و شرح ہدایہ
و حکمت و دیگر کتب متداولہ حاشی دار و در نظم و نثر و حید زباں بود۔ این رباعی از دست

از شیوہ ہمدان این دورِ خلاف گویم بہ مزے اگر نگیری بگزاف

چون شیشہ ساعت اندر پیوستہ بہم و لہا ہمہ پیغمبار و رو بہ ہمہ صاف

بارہا بہ ملازمت اقدس عالمگیر بادشاہ رسیدہ بعنایات بادشاہانہ ممتاز گردیدہ بود۔

آپ کا تخلص مشرقی تھا۔ اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھا ہے:-

”مشرقی تخلص شیخ نور الحق دہلوی بود۔ در بحر تحفۃ العراقین مثنوی دار و در دیوانش

قریب پنج ہزار بیت است۔ از دست ہ

با آنکہ مشرقی ہمہ تن دیدہ چون گل است

با ہیچ کس، چون چشمِ حجاب آشنا نبود

علمائے عصر

شیخ عبدالحق کا زمانہ علم و فضل میں بڑا خوش قسمت تھا۔ اس وقت کھمبایت اور سورت کی بندرگاہیں رونق پر تھیں اور حکومت دہلی کے تابع، بھارت کا سمندری راستہ پہلی مرتبہ شمالی ہندوستان والوں کے لیے کھلا تھا۔ جن لوگوں کی قسمت میں تھا انھوں نے وہاں جا کر علوم دینی حاصل کیے اور واپس آکر ہندوستان کو سیراب کیا۔ شیخ عبدالحق اس قافلے کے میرکارواں تھے۔ لیکن دوسرے علاقوں کے علما کا معیار بھی بلند تھا۔

ملا عبدالحکیم سیالکوٹی | ہندوستان میں اس وقت اسلامی علوم کے چھوٹے مرکز تھے۔ ایک دہلی، دوسرے پنجاب، تیسرے پوربہلی، چوتھے گجرات۔ پانچویں سندھ اور چھٹے برہماپور۔ دہلی میں خود شیخ عبدالحق علمی مجلس کے صدر نشین تھے۔ پنجاب میں ان دنوں حاکم سے ناراضگی کی بنا پر کشمیر سے ایک بزرگ ترک مکان کر کے سیالکوٹ آئے تھے۔ جنھوں نے پنجاب کی علمی شہرت کو ایک مرتبہ پھر فروغ دیا۔ یہ بزرگ ملاکمال الدین کشمیری (۱۰۸۰ھ) تھے۔ جن کے تلامذہ میں نواب سعد اللہ خاں، وزیر اعظم ہندوستان

۱۰ مولانا آزاد گلبرگی نے عظیم آباد کو بھی اسی علاقے میں گنا ہے اور پوربہلی کی بجا طور پر بڑی تعریف کی ہے۔ پوربہلی قصبہ شہروں کے برابر ہیں۔ کمینگران میں عمارات عالی اور شریفیوں و نجیبوں و مشائخ و عالموں مختلف اقسام و انواع اقسام کے پیشہ وروں کے مکانات اور مسجدیں و مدرسے و پرستش گاہیں موجود ہیں۔ اور مسجدیں وہاں کی جمعہ اور جماعت کی نمازوں سے آباد۔ اگر ان کو شہر کہا جائے تو بجا ہے۔ (مظہر اکرم ترجمہ سید الرحمان) ۱۱ برہماپور کی علمی تاریخ سے عام بے خبری ہے۔ لیکن سندھ ادبی بورڈ نے وہاں کے سندھی ادیبان کے جو حالات شائع کیے ہیں۔ ان سے بھی اس مرکز کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی اور ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کے نام لیے جاتے ہیں۔ ان کا علمی فیض علامہ عبد الحکیم نے جاری رکھا انھیں عہد شاہجہانی میں بڑا فروغ ہوا۔ دو مرتبہ بادشاہ نے انھیں سونے چاندی سے ٹکویا اور ان کے وزن کے مطابق چھ ہزار روپیہ نقد انعام دیا۔ آپ ایک زمانے میں اکبر آباد کے سرکاری مدرسہ میں جسے اکبر نے جاری کیا تھا مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اور یہاں مشہور شاعر قدسی کے ساتھ ایک ہی وقت میں فرائض درس و تدریس سرانجام دیتے رہے۔ آپ کی تصانیف کئی ہیں ایک سالہ در تہمینہ ہستی باری تعالیٰ کے ثبوت میں ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ آپ نے اسے دربار شاہجہان میں باریابی کے وقت پیش کیا۔ باقی تصانیف شرحیں اور حاشیے ہیں جنہیں آپ نے اپنے تلامذہ اور دوسرے اہل علم کی سہولت کے لیے مرتب کیا۔ مثلاً تفسیر بیضاوی۔ حاشیہ شرح عقائد نقازانی، حاشیہ شرح تسمیہ۔ مکملہ حاشیہ عبد الغفور اور حاشیہ خیالی جس کی نسبت ذیل کا شعر مشہور ہے ۵

خیالات خیالی بس عظیم است
برائے حل اد عبد الحکیم است

حافظ عبد الرحمن امرتسری اپنے سفر نامہ میں ملا عبد الحکیم کی نسبت لکھتے ہیں۔
”عراق، شام اور استنبول کی متعدد درس گاہوں میں مجھے آپ کی تصانیف داخل درس دیکھنے کا موقع ملا۔ ہندوستان سے باہر بلاد اسلامیہ میں علمی حیثیت سے جو شہرت مولوی عبد الحکیم صاحب کو حاصل ہوئی، اسے کوئی مصنف حاصل نہیں کر سکا۔“
ملا عبد الحکیم کی وفات ۱۰۵۶ھ میں ہوئی۔ مزار سیالکوٹ کے باہر شہابان روڈ پر ہے۔
ملا محمود جوہر پوری | بلاد مشرقی کے علما نے محقولات میں امتیاز حاصل کیا اور اس کی ابتدا بھی اس زمانے میں ہو گئی تھی۔ شیخ عبد الحق محدث کے ایک ہم عصر ملا محمود فاروقی جوہر پوری تھے جنہوں نے محقولات میں نام پایا اور علم حکمت میں ایک کتاب شمس باز غر تصنیف کی۔ جواب بھی مدراس میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ علم بلاغت میں ایک کتاب فرائد فی شرح الفوائد بھی ان سے یادگار ہے جو معانی و

بیان کی مشہور کتاب فوائد غیاثیہ کی شرح ہے۔ آپ نے ۱۵۲ھ میں زیادہ عمر پائی بغیر وفات پائی۔ ان کی نسبت تذکرہ علماء ہند کے مؤلف لکھتے ہیں۔ ”اگر بوجدیش

سرزمین جو پور بمز لوم شیراز قفا نرے جست برآوردے“

شیخ محمد بن طاہر بیہقی | گجرات میں سب سے زیادہ شہرت شیخ محمد بن طاہر بیہقی (وفات ۵۷۸ھ)

اور علامہ وجیہ الدین گجراتی ۵۹۰ھ نے پائی۔ شیخ محمد بن طاہر صرف عالم ہی نہ تھے بلکہ مبلغ اور قاطع بدعت بھی تھے اور انھوں نے رد بدعت کی کوششوں میں شہادت

پائی۔ وہ گجرات کے قدیم دار الخلافہ پٹن کے باشندے تھے۔ کتب متداولہ سے فارغ

ہونے کے بعد حرمین پہنچے۔ وہاں کے علماء کے بارے میں تو فیض حاصل کیا۔

اور علم حدیث میں متعدد بزرگوں سے سند لی۔ زیادہ عقیدت انھیں شیخ علی متقی

سے تھی جن کے وہ مرید بھی ہو گئے تھے۔ حجاز سے واپسی کے بعد وہ درس تدریس

اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوئے۔ مرشد کی ہدایات کے مطابق وہ طلبہ کی ضرورت

کے لیے ساتھ ساتھ سیاہی بنایا کرتے تھے۔ چنانچہ جس وقت وہ درس میں مشغول

ہوتے اُس وقت بھی یہ شغل ساتھ ساتھ جاری رہتا۔ ان کی تصانیف کئی ہیں جس کے

مشہور مجمع البحار ہے۔ جسے صحاح ستہ کی شرح سمجھنا چاہیے۔ ایک رسالہ تصحیح سما الرجا

میں ہے۔ دو کتابیں موضوع حدیثوں کے متعلق ہیں۔ تذکرۃ الموضوعات در بیان احادیث

موضوعہ اور قانون الموضوعات فی فکر الضعفا۔

وہ قوم کے بوجہ سے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ اپنی قوم سے تمام بدعتیں دور

کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے عہد کیا کہ جب تک میری قوم تمام بدعتوں اور ضلالتوں سے

بری نہ ہو جائے گی میں سر پہ عمامہ نہ باندھوں گا۔ وہ اپنی کوششوں میں مشغول تھے کہ

۱۔ بوجہوں کے دو فرقے ہیں شیعہ (جماعت خرو)۔ اہل سنت والجماعت (جماعت کلال) شیخ محمد طاہر درہمینی

وسید محمد جعفر وحید آباد دو عالم بزرگ بودند۔ بشارت نبویہ علیہ الصلوٰۃ والسلام، ہر دو فرقہ را از ہم جدا کرد

... و جماعت محمد از صوبہ گجرات برآمدہ در صوبہ مالوہ مقری شد۔ (اتحاف النبلا از ذاب صدیق حسن)

اکبر نے گجرات فتح کر لیا۔ اور بادشاہ کے سامنے دوسرے علماء کے ساتھ وہ بھی پیش ہوئے۔ بادشاہ نے برہنہ سر پہنے کی وجہ دریافت کی اور جب انھوں نے حقیقت حال بیان کی تو اکبر نے خود ان کے سر پر عمامہ باندھا اور کہا کہ دین کی حفاظت میرا فرض ہے۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں اور میں اس میں آپ کی پوری مدد کروں گا۔ چنانچہ خان اعظم گجرات کا گورنر مقرر ہوا اور چونکہ وہ راسخ العقیدہ سنی تھا اس نے اپنے آیام حکومت میں شیخ کی پوری مدد کی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد وہ تبدیل ہو گیا اور اس کی جگہ عبدالرحیم خان خاناں گورنر ہوا جس کے عہد حکومت میں شیعہ بوہرے پھردلیر ہو گئے۔ شیخ نے اپنا عمامہ پھر سر سے اتارا اور اگرے کا رخ کیا۔ تاکہ خود بادشاہ کے حضور میں عرض حال کریں۔ شیخ وجیہ الدین نے طریقے سے منع کیا، لیکن شیخ اپنے ارادے سے باز نہ آئے۔ (شیخ وجیہ الدین علوی ہر چند بہ طریق کناہ منع کرد و فرمود عالم منظر اسماء جمالی و جلالی است حفظ آثار و احکام ہر اسم صراطے است مستقیم سودمند نیفتاد) وہ ابھی راستے میں ہی تھے کہ اجین کے قریب چند مخالف پیچھے سے آپہنچے اور انھیں شہید کر دیا۔ ان کے ساتھی ان کی لاش کو پٹن واپس لے گئے اور بزرگوں کے قبرستان میں دفن کیا۔

شیخ وجیہ الدین احمد آبادی | شیخ وجیہ الدین پیدا تو مشرقی گجرات کے قدیمی شہر چانپانیر میں ہوئے، لیکن ان کے علم و فضل کا دریا احمد آباد میں بہتا رہا۔ انھوں نے کئی سال درس دیا اور ایک عالم کو سیراب کیا اور متعدد درسی کتب پر حاشیے اور شرحیں لکھیں۔ ان کی وفات ۱۰۹۰ھ میں ہوئی اور اپنے مدرسے کے وسط میں دفن ہیں۔ ان کے مزار کا چھپر کھٹ نواب مرتضیٰ خاں نے تیار کروایا جس پر پیپ کا نہایت اعلیٰ درجے کا کام ہوا ہے۔

تذکروں میں آپ کا نام اکثر شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری کے واقعہ تکفیر کی وجہ سے آجاتا ہے جن کی بعض تصنیفات کی بنا پر شیخ علی متقی نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا تھا۔ بادشاہ نے یہ فتویٰ آپ کے پاس بھیجا۔ لیکن آپ نے نہ صرف

اس فتویٰ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا، بلکہ اس قسم کی تکفیر کی سخت مخالفت کی۔ اور اس مسئلے پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا۔ جس میں ابتداءً فقہی کتابوں سے مسئلہ تکفیر پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر احادیث سے سنداً سب کو مشرح بیان کیا ہے۔ آخر میں صوفیائے کرام کے احوال سے بحث کی ہے کہ حالت سُکر میں جو کہہ جاتے ہیں۔ وہ قابلِ مواخذہ نہیں ہوتا۔ پھر سید محمد غوث گوالیاری کی کتاب اور ادغوشیہ پر لوگوں نے جو اعتراضات کیے تھے، ان کا جواب دیا ہے۔۔۔ آپ کا ارشاد یہ تھا کہ کسی شخص کی سو باتوں میں سے ایک بات بھی اسلام کی ہو تو اس کو مسلم سمجھو اور کسی کلمہ کو اہل قبلہ کو کافر نہ کہو۔

شاہ وجیہ الدین ایک جید عالم تھے۔ بدایونی لکھتا ہے کہ شاید ہی کوئی درسی کتاب چھوٹی یا بڑی ہوگی جس کی انھوں نے شرح یا حاشیہ نہ لکھا ہو، لیکن لوگ انھیں ایک ولی مانتے تھے۔ ”مخلوق را پیوستہ از انفاس متبرکہ اوفیض سے رسید۔“ و حق سبحانہ اسم الشافی را ظاہر و اورا منظر ساختہ بود۔ تا ہر روز جمعے لا تعداد لکھنی از بیمارل و محنت زدگان بہ ملازمت او آمدہ التماس دعا می نمودند و اثر آن زود می یافتند۔“ ان کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ موٹا کپڑا پہنتے اور عام لوگوں کی طرح رہتے جو کچھ آتا، وہ دوسروں پر خرچ کرتے۔ امیروں کے گھر پر بطور خود کھی نہ جاتے۔ ایک دو دفعہ حکام وقت کی طلب پر بہ مجبوری واکراہ جانا پڑا۔ ورنہ گھر اور مسجد کے احاطہ سے باہر قدم نہ نکالتے۔

مولانا سید صبغت اللہ ربیعی شطاری | شیخ وجیہ الدین خود شطاریہ سلسلے میں ہو گئے اور ان کے ایک شاگرد اور مرید سید صبغت اللہ ربیعی نے اس سلسلے کو حجاز میں عام کیا۔ سید صبغت اللہ ربیعی (بھڑوچ) کے رہنے والے تھے جو اب سُورت اور بڑودہ کے درمیان ایک ضلع کا صدر مقام ہے۔ آپ کی احمد نگر اور بیجاپور کے بادشاہوں نے بڑی قدر کی۔ لیکن بالآخر آپ نے مدینہ منورہ کے

قریب جبل احمد پر سکونت اختیار کی۔ وہاں ایک خانقاہ تعمیر کی اور تصنیف و تالیف اور ارشاد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ نے شیخ محمد غوث گوالیاری کی کتاب جو اہر خمسہ کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ جس پر آپ کے شاگرد شیخ احمد ثناوی نے حاشیہ لکھا۔ جن لوگوں نے سلسلہ شطاریہ میں آپ سے بیعت کر کے اسے حجاز میں پھیلایا۔ ان میں شیخ احمد ثناوی کے علاوہ مدینہ منورہ کے سید میر اور سید السعد تلخی بھی تھے۔ آپ نے عربی میں مسائل تصوف پر کسی کتاب تصنیف نہیں کی۔ گلزار ابرار اور مراۃ الاسرار میں لکھا ہے کہ آپ کی شہرت سن کر سلطان روم نے آپ کو بلایا لیکن آپ نہیں گئے۔ وفات مدینہ منورہ میں ۷۳۷ھ میں ہوئی۔ ایک عرصہ تک مزار زیارت گاہ خاص و عام بنارہا۔

مندرجہ بالا حالات سب سے المر جان میں میر غلام علی آزاد نے لسان الزمان (از احمد علی) کے حوالے سے لکھے ہیں۔ یاد آیام میں مولانا عبدالحی لکھتے ہیں۔ ”شیخ احمد بن عبد القدوس ثناوی، ابو بکر بن تحوالتسفی، محمد بن عمر بن محمد الحضرمی اور شیخ عبد العظیم الملکی جیسے نامور ان کے شاگرد ہوئے۔ انھوں نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا ہے جو بلا دروم تک پہنچا۔ اور علماء نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کے سوا ان کی اور بھی تصنیفات ہیں جو علماء عرب کی فرمائش سے لکھی ہیں۔ محمد بن فضل الشرحی نے خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر میں ان کا مضبوط ترجمہ (تذکرہ) لکھا ہے اور شیخ نجم الدین غزالی نے لطف الثمر وقطف الثمر میں ان کی بڑی مدح و ثنا کی ہے۔۔۔ جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔“

شیخ محمد بن فضل الشرحی بانی پوری | شاہ وجہ الدین کے ایک اور نامور شاگرد جن کا شہرہ دور دور تک پہنچا، اور جو اس عہد کے ایک بڑے علمی مرکز برہانپور کے نمائندہ تھے۔ شیخ محمد برہانپوری تھے۔ ان کے والد شاہ فضل الشرحی بانی پوری (وفات ۱۵۹۹ھ) اپنے زمانے کے مشہور صوفی اور عالم تھے۔ بلکہ نائب رسول اللہ کہلاتے تھے۔ شاہ جہان کہا کرتا تھا کہ اگر چہ کئی بزرگوں کی

خدمت میں حاضر ہوا ہوں، لیکن کامل شیخ فقط دو دیکھے ہیں۔ میاں میر لاہوری اور شیخ المشائخ فضل اللہ۔ شاہ صاحب کا وطن جو پور تھا، لیکن برہانپور میں مقیم ہو گئے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ فقط تفسیر اور حدیث کا درس دیتے تھے۔ اور صوفیانہ ارشاد و ہدایت سے باطنی راہنمائی اور تزکیہ نفس کا اہتمام کرتے۔

شیخ محمد بن فضل اللہ احمد آبادی ۱۰۵۰ھ کے قریب پیدا ہوئے۔ پھر حجاز چلے گئے۔ شیخ علی متقی کی صحبت پائی۔ پھر احمد آباد واپس آئے۔ شاہ وجیہ الدین سے تکمیل تعلیم کی۔ پھر شیخ ابوالاحمد جعفر کے پاس، جو آپ کے والد کے مرید تھے۔ اسیر (مالوہ) پہنچے اور بالآخر برہانپور میں توطن اختیار کر کے مدرسہ اور مسند ارشاد و ہدایت کو زینت دی۔ سچے عاشق رسول تھے۔ بالآخر آپ نے درس و تدریس چھوڑ کر یاد خدا اور خلق کی روحانی راہنمائی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا، لیکن تصنیف و تالیف کی دنیا میں بھی آپ کا نام بلند ہے۔ آپ کا اصل شاہکار التحفۃ المسلمۃ الی النبی ہے۔ لیکن اور کتابیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً التحفۃ المسلمۃ کی شرح آپ نے الحقیقت الموافق الشریعت کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس کی ایک نقل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں ہے۔ آپ نے ۶۲۰ھ میں وفات پائی۔ حضرت مجدد الف ثانی کے مخلص و محمد خلیفہ مکتوبات امام ربانی جلد ثالث کے مؤلف اور زیۃ المقام کے مصنف، خواجہ محمد ہاشم کشمیری ثم برہانپوری نے تاریخ لکھی۔

منظر اسمائے سیمی مصطفیٰ آنکہ از نامش زباں چوں گل شگفت

سینہ اش شوق آمد آخرا ز جہاں بس کہ باز عشق دروے می نہفت

ابن فضل اللہ بود و ہاتھے سال و نش ابن فضل اللہ گفت

غوثی جس نے گلزار ابرار اس زمانے میں تصنیف کی، جب آپ ابھی حیات تھے،

لکھتا ہے کہ آپ خاندیش کے بادشاہ محمد شاہ ابن مبارک شاہ فاروقی کے عہد حکومت

(۱۰۶۶ھ) میں گجرات سے خاندیش تشریف لائے۔ برہانپور میں مسجد اور خانقاہ تعمیر

کی۔ حدیث، تفسیر اور دوسرے دینی علوم کا درس دیتے تھے۔ اہل دل تھے، لیکن سماع اور سرود سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سچے عاشق رسولؐ تھے۔ ہر سال حجاز کے موسم میں دیوانہ وار وطن سے نکلتے اور سمندر کے کنارے پہنچ جاتے۔ اگر قسمت یادری کرتی تو حجاز پر سوار ہو کر حرمین شریفین میں پہنچتے اور روضہ نبویؐ کی زیارتِ دل کو تسکین دیتے۔ اس طرح آپؐ نے حجاز کے کئی سفر کیے۔ وطن میں بھی محبت رسولؐ میں مست رہتے۔ سال بھر میں اگر کوئی کوڑی پیسہ بچاتے تو اس لیے کہ سفر حجاز کا سامان ہو جائے۔ یاربیع الاول میں مجلس میلاد پورے اہتمام سے ہو۔ ربیع الاول کے پہلے بارہ روز مجلس میلاد قائم ہوتی۔ ہر رات ذاکرین احادیث نبویؐ اور نعمتیں آواز سوزناک سے پڑھتے۔ اور آپؐ اپنا سارا اندوختہ مجلس میں تبرکاتِ حلوسے اور عطریات تقسیم کرنے اور ذاکرین کی خدمت میں صرف کر دیتے۔ اگر کچھ زیادہ ہوتا تو حرمین کے فقرا میں تقسیم کرنے کے لیے بھیج دیتے۔

بارگاہِ الہی میں آپؐ کی محبت نبویؐ مقبول ہوئی۔ اور آپؐ کی التحفہ المسماة بالنبیؐ نے بڑی شہرت پائی۔ اس کی کم از کم تین شرحیں لکھی گئیں۔ اور انڈونیشیا میں اس کا بہت چرچا تھا۔ ملایائی زبان کے ایک اہل قلم نے نور الدین راینزی (رائنیری) نے اس کا ترجمہ ملایائی میں کیا۔ راینزی ہندی النسل تھا۔ لیکن جزائر شرقی میں بس گیا تھا اور اس نے کثرت سے ملایائی زبان میں کتابیں لکھیں۔ اس کی تاریخ وفات معلوم نہیں۔ لیکن اس کی کتابوں کا زمانہ تصنیف ۱۶۲۸ء سے شروع ہوتا ہے۔

اس وقت سمارٹا میں وحدت الوجود کے متعلق اسی طرح بحثیں ہو رہی تھیں۔

۱۰ غالباً انہی کی "رحیق المحمدیہ فی طریقۃ الصوفیہ" کا ذکر مولانا عبدالحی نے یاد آیام میں کیا ہے۔ اس میں تاریخ وفات ۱۶۲۸ء درج ہے۔

جس طرح ہندوستان میں، بلکہ مدینہ منورہ کے راستے یہاں کی بجائیں وہاں منتقل ہو رہی تھیں۔ سہارنپور کے قدیمی اہل قلم (مثلاً حمزہ) وحدت الوجود کے مسئلے میں ابن العربی اور عبد الکریم جلی کے قائل تھے۔ نور الدین راندیری اس نقطہ نظر کے سخت مخالف تھے، لیکن ایک اور مقامی عالم عبدالرؤف جو سولہ سال حجاز میں مقیم رہے اور شطاری سلسلے میں منسلک ہو گئے تھے، مولنا وجہ الدین کی طرح بین بین پے تھے۔ ان کے استاد دو ہندوستانی تھے۔ مولنا احمد قشاشی (وفات ۱۲۶۰ھ) اور ان کے جانشین ملا ابراہیم القرانی (وفات ۱۲۹۷ھ) مولنا الذکر نے عبدالرؤف کو شطاری سلسلے میں مرید کرنے کی اجازت دی۔ چنانچہ انھوں نے جزائر شرقی میں یہ سلسلہ جاری کیا۔ اور جلد ہی جاوا میں کثرت سے لوگ اس سلسلے میں شامل ہو گئے۔

مندرجہ بالا معلومات ہمیں ہالینڈ کے مستشرقین سے دستیاب ہوئیں شاہ ولی اللہ صاحب اپنی کتاب الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے جواہر خمسہ کی اجازت اپنے استاد شیخ ابوطاہر کردی سے حاصل کی تھی جن کے والد نے یہ اجازت شیخ احمد شناوی کے خلیفہ شیخ احمد قشاشی سے حاصل کی تھی۔ شاہ صاحب نے سفر حج کے سلسلے میں قیام لاہور کے دوران میں طریقہ شطاریہ میں حاجی شیخ محمد سعید لاہوری سے بھی دعائے سیفی اور اعمال جواہر خمسہ کی اجازت لی تھی۔ لیکن ان کی تصنیف سے اتنا تو پتا چلتا ہے کہ شیخ احمد قشاشی جن کے فیض یافتگان اندونیشیا میں تھے، شیخ صیغت اللہ بروجی کے مرید المرید تھے۔ اور ان سے شیخ ابراہیم کردی نے شطاریہ طریقہ اخذ کیا۔ یہ شیخ ابراہیم شاہ ولی اللہ کے محبوب استاد شیخ ابوطاہر الکردی المدنی کے والد اور مرشد تھے۔ اور شاہ ولی اللہ نے بھی اپنے استاد سے یہ طریقہ اخذ کیا۔

اس زمانے کا ایک اور علمی مرکز زیریں سندھ کا دار الخلافہ **علمائے سندھ** ٹھٹھہ تھا۔ مغربی پنجاب اور سندھ کی ثقافتی تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہوئی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملتان۔ اجپہ۔ منصورہ اور دیپل کے

لے شطاری بزرگوں کی نسبت ان کی عربی تصنیف سہل المجید دائرہ المعارف حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہے۔

قدیمی اثرات اور ایران سے قرب کی وجہ سے اس علاقے میں علوم اسلامی اور عربی فارسی ادب کا بہت بلند معیار تھا۔ اور ٹھٹھہ، بھکر، سیوستان، درہلیہ (نزد سیوستان) میں علم و ادب کے بڑے مرکز تھے۔ جب خاندان تغلق کے زوال کے بعد مرکزی حکومت کمزور ہو گئی اور سندھ خود مختار ہو گیا۔ اس وقت بھی علم و فضل کی سرپرستی جاری رہی اور اس علاقے میں بڑے اہل علم پیدا ہوئے۔ مغللیہ حکومت میں بھی کئی سندھی علماء نے نام پایا۔ متحدہ سندھی علماء (مثلاً سید نظام الدین ٹھٹھوی اور مولانا محمد ابوالخیر ٹھٹھوی) نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں مدد دی۔ قاضی ابراہیم ٹھٹھوی عہد شاہجہانی میں دار الخلافہ کا مفتی اور قاضی عساکر تھا۔ ملا محمد داعی ٹھٹھوی شاہجہان کے ایام شاہزادی میں اس کا پیش امام تھا۔ ٹھٹھہ کے قدیمی سربراہ اور وہ بزرگوں میں مخدوم میراں ٹھٹھوی (وفات ۱۵۲۳ء) مخدوم مشو ٹھٹھوی، جو علم حدیث کے استاد تھے۔ اور شرح ازجینی، شرح گیلانی اور دوسرے رسائل کے مصنف (وفات ۱۵۲۳ء) شیخ الاسلام میرک محمد سبزواری ٹھٹھوی (۱۵۵۵ء) اور میرک محمد ٹھٹھوی مولف فتاویٰ تورانی (۱۵۶۲ء) تھے۔ علم پرور سندھیوں نے وفات کے بعد ان میں سے اکثر کو کوہ مکی کے قبرستان میں جگہ دی ایک اور قابل ذکر ٹھٹھوی عالم قاضی محمود علامہ عباسی تھے جو مرزا عیسے ترخان اور مرزا جانی (معاصر اکبر) کے ہم عصر تھے اور متحدہ دکتب پر حواشی کے علاوہ ایک تذکرۃ الاولیاء کے مولف ہیں۔

قاضی نور اللہ شوستری | عہد جہانگیری میں مشہور شیعہ عالم قاضی نور اللہ شوستری کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ جس کے متعلق نجوم السہافی تراجم العلماء میں جو علماء شیعہ کی مستند تاریخ ہے ذیل کا اندراج ہے:- (ترجمہ)

”اور ان کی شہادت کا قصہ جو صاحب تذکرہ نے بعض ثقات سے نقل کیا ہے اس طرح ہے کہ سید صاحب مذکور ہمیشہ مخالفین کے درمیان تقیہ کرتے تھے۔ اور آپ مذہب کو ان سے مخفی رکھتے تھے۔ انھیں اہل سنت کے مذاہب ایچہ کے

فقہی مسائل پر یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اس لیے اکبر بادشاہ اور عام لوگ انھیں سنی المذہب سمجھتے۔ اور جب اکبر بادشاہ کو ان کے علم و فضل اور لیاقت سے آگہی ہوئی تو انھیں قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ جناب سید نے فرمایا کہ میں ایک شرط پر اس خدمت کو قبول کرتا ہوں کہ مذاہب اربعہ یعنی شافعی، حنفی، حنبلی اور مالکی طریقوں میں سے جس کے موافق میری رائے اور اجتہاد ہوگا۔ اسی کے مطابق مقدمات میں فتویٰ دوں گا۔ اور چونکہ غور و نظر اور استدلال کی قوت حاصل ہے۔ اس لیے تمام مسائل و احکام میں ایک فقہی مذہب کا پابند نہیں ہوں۔ لیکن اپنے اجتہاد میں (اہل سنت) چار فقہی مذاہب سے باہر نہیں جاتا۔ بادشاہ نے یہ بات مان لی۔ چنانچہ قاضی علیہ الرحمۃ نے تمام مسائل قضا و احکام میں امامیہ مذہب کے مطابق فتوے دینا شروع کیا۔ اگر کوئی اعتراض کرتا تو جناب قاضی ثابت فرما دیتے کہ میرا یہ فتوے اہل سنت کے چار فقہی مذاہب میں سے فلاں کے مطابق ہے۔ چنانچہ ان کے بعض فتوے مذہب شافعی، بعض حنفی، بعض مالکی اور بعض حنبلی مذہب کے مطابق ہوتے۔ قاضی تقیہ کی اس حالت میں شیعہ احکام کو جاری کرتے اور خفیہ طور پر تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے۔

جب اکبر بادشاہ نے وفات پائی اور جہانگیر تخت سلطنت پر بیٹھا تو قاضی بدستور اپنے عہدے پر قائم رہے۔ حتیٰ کہ علمائے مخالفین میں سے بعض کو تپا چل گیا کہ وہ شیعہ المذہب ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بادشاہ کے پاس شکایت کی کہ قاضی (نور اللہ) کا مذہب شیعہ ہے۔ اپنے فتوؤں میں کسی ایک فقہی مذہب کا پابند نہیں۔ اور ہر مسئلے کا فتویٰ اس فقہی مذہب کے مطابق دیتا ہے، جو اس معاملے میں مذہب امامیہ کے مطابق ہو۔ بادشاہ نے اس شکایت پر توجہ نہ دی اور کہا اس سے ان کا شیعہ مذہب ثابت نہیں ہوتا، بلکہ شروع ہی سے انھوں نے شرط کر لی تھی کہ مذاہب اربعہ میں سے جس کا تقاضا ان کی رائے کرے گی، اس کے مطابق فتویٰ دیا جائے گا۔

اب علمائے مخالفین اس گھات میں بیٹھے کہ کسی طرح قاضی کی شیعیت ثابت کر کے ان کے قتل کا حکم حاصل کریں۔ چنانچہ انھوں نے ایک شخص کو قاضی کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کر کے قاضی کی تصانیف حاصل کرے۔ وہ شخص قاضی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیعیت کا مدعی ہوا اور قاضی کی شاگردی اختیار کی۔ جب وقت گزرنے پر اسے جناب قاضی کا اعتبار حاصل ہو گیا اور اسے کتاب مجالس المؤمنین کے متعلق اطلاع ملی تو نہایت کوشش اور التجا سے اس نے وہ کتاب قاضی صاحب کے مستعار لی۔ اور گھر لے جا کر اس کی ایک نقل تیار کر کے اسے علمائے مذکور تک پہنچایا۔ علمائے اس کتاب کو قاضی نور اللہ کی شیعیت کے ثبوت میں بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ اور کہا کہ اس رافضی نے ایسی ایسی باتیں لکھی ہیں اور سزا کا مستحق ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ کیا سزا چاہیے۔ تو علمائے ان کے اتنی تعداد میں درہ خاں دارنگا نے چاہئیں۔ بادشاہ نے اجازت دے دی۔ چنانچہ ان لوگوں نے بہ عجلت تمام جناب پر یہ ظلم شروع کیا حتیٰ کہ وہ شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت آگرہ میں ہوئی اور ان کا مزار بھی اسی جگہ ہے اور وہاں اس کی زیارت سے لوگ سعادت اندوز ہوتے ہیں۔ (ترجمہ از نجوم السماء صفحہ ۱۵-۱۴) نجوم السماء جس سے ہم نے یہ اندراج نقل کیا ہے۔ شیعہ علماء کی سب سے مستند تاریخ ہے اور معاصرانہ حالات کے لیے پورے اعتماد کے لائق ہے۔ لیکن یہ روایت کہ قاضی صاحب کو عہد اکبری میں سنی سمجھا جاتا تھا صحیح نہیں۔ جاننے والے ان کے عقیدے سے بے خبر نہ تھے۔ لیکن ایک تو اکبر کے سامنے شیعہ سنی اختلافات کی کوئی

لہ لیکن یہ صحیح ہے کہ آپ مجالس المؤمنین کو مخالفوں اور نااہلوں سے چھپانا چاہتے تھے۔ کتاب میں جا بجا تنقید کو شیعہ مذہب کی ترویج کے لیے مضر ظاہر کیا ہے اور آغاز کتاب میں عبات لکھا ہے کہ حکومت صفویہ کی بنا اور اس دولت روز افزوں کی پشت پناہی نے "تنقید" سے پیوند اور قدم قلم کے "سند" دور کر دیے ہیں، لیکن کتاب کے اختتام تک حالت بدل چکی تھی۔ خاتمہ میں "اوقات جلال" کا ذکر ہے اور [باقی اگلے صفحے پر]

اہمیت نہ تھی۔ دوسرے قاضی صاحب کی علمیت، منصف مزاجی اور مستعدی اعلیٰ درجے کی تھی کہ مخالفین بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ بدایونی جس نے بعض شیعہ علماء کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح گندگی اچھالی ہے کہ تہذیب و متانت کو بھی نظر انداز کر دیا، قاضی صاحب کا بڑا انداز تھا۔ وہ یہ جانتے ہوئے کہ قاضی صاحب شیعہ مذہب کے تھے ان کی نسبت لکھتا ہے:-

قاضی نور اللہ شوستری اگرچہ شیعہ مذہب است۔ اما بسیار بہ صفت نصفت عدالت و نیک نفسی و حیاء تقویٰ و عفاف و صفات اشرف موصوف است و بہ علم و حلم و جودت فہم و جدت طبع و صفائے قریحہ و ذکا مشہور است۔ صاحب تصنیف لائقہ است توفیق بر تفسیر مہمل شیخ فیضی نوشتہ کہ از حیز تعریف و توصیف بیرون است۔ و طبع نظم و اشعار و نقاشی می گوید۔ بوسیله حکیم ابوالفتح بملازمت شاہی پیوست۔ در زمانیکہ کوہ منصور بہ لاہور رسید و شیخ معین قاضی لاہور را در وقت ملازمت از ضعف پیری و متور قومی سقطہ در دربار واقع شدہ۔ رحم بر ضعف او آوردہ فرمودند کہ شیخ از کار باز نہایں قاضی نور اللہ بآں عہدہ منسوب گردید۔

الحق کہ مفتیان مہم و محتسبان بد نفس لاہور کہ مجسم الملکوت سبق می دہند۔ خوش بہ ضبط در آوردہ و راہ رشوت را بر ایشان بستہ۔ و در پوست پستہ گنجائیدہ۔ چنانچہ فوق آن متصور نیست و می توان گفت کہ قائل باین بیت اورا منظور داشتہ و گفتہ:-

توئی آنکس کہ نکردی بہ ہمہ عمر قبول

در قضا ہیچ ز کس غیر شہادت ز گواہ

قاضی نور اللہ صاحب شوستریں ۱۲۵۹ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے بزرگوں سے

(بقیہ فٹ نوٹ ص ۴۵)

متصرح لکھا ہے۔ ”ویکہ آنکہ اس کتاب را از مخالفان و سائر نا اہلان مستور دارند کہ مبادا از آنجا بر حوالہ بلا و شیعہ و طوائف ایشان اطلاع یافتہ، یا حاد این فرقہ و محققہ کہ در دیار اغیار واقع شوند آزار مے رسانند یا تعرض بہ مزارات اسلاف ایشان نمایند۔“

اور پھر شہید میں تعلیم پائی ۱۵۸۷ء میں ہندوستان آئے اور تریسٹھ برس کی عمر میں شہید ہوئے۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ ہانگیر کو سب سے زیادہ طیش اس بات پر آیا کہ قاضی صاحب نے حضرت خواجہ اجیریؒ کی نسبت (جن کے اکبر اور جہانگیر بڑے معتقد تھے) درشت الفاظ کہے۔ اور ان سے ایک رسالہ بھی منسوب کیا گیا، جس میں شیخ سلیم چشتیؒ کی نسبت (جن کے نام پر بادشاہ کا نام سلیم رکھا گیا تھا) قرم ساق پدیرنگ نا تحقیق لکھا تھا۔ (ملاحظہ ہو تازہ اردو سوانح عمری موسومہ صحیفہ نور مولفہ سید صغیر حسین زیدی -)

قاضی صاحب کی شہادت ۱۶۱۷ء میں بمقام آگرہ ہوئی۔ اس کے ڈیڑھ ہونے دو سو سال بعد جب شمالی ہندوستان میں شیعیت کو فروغ ہوا تو ۱۲۴۷ء میں ان کی قبر پر ایک روضہ تعمیر ہوا۔ جس کے گرد ایک خوشنما باغ بھی لگایا گیا۔ یہ باغ تو اب ویران ہو گیا ہے، لیکن مزار کی زیارت کے لیے اب بھی معتقد آتے ہیں اور حضرات شیعہ قاضی صاحب کو شہید ثالث کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

قاضی صاحب کی متعدد تصانیف بتائی جاتی ہیں۔ ان میں مجالس المومنین اور حقائق الحق چھپ چکی ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب میں حکمت اشاعرہ کا اچھا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ لیکن آپ کا اصل شاہکار مجالس المومنین ہے۔ یہ کتاب شیعہ زعماء کا ایک مبسوط تبصرہ ہے۔ اور شیعہ مذہب کی تاریخ میں ایک خاص مرتبہ رکھتی ہے۔ اس میں ان امنگوں اور حوصلوں کا پرجوش اظہار ہے جو شیعہ صفوی حکومت کے قیام سے جو شیعہ شیعوں میں پیدا ہوئے۔ تصنیف کتاب کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی گئی کہ صفوی حکومت کی پشت پناہی کی وجہ سے اب تقیہ کی ضرورت نہیں رہی اور برملا میدان میں آنا چاہیے۔

شد آنکہ اہل نظر بر کنارہ سے رفتند ہزار گو نہ سخن در زبان و لب خاموش
بر صوت جنگ بگویم بس حکایت با کمر از نہفتن آن دیگ سینہ می زد جوش

یعنی علیٰ شیعہ میں سے شہید ثالث ان سے پہلے دو بزرگ مشن اور مسئول میں آ کر تیب لکھوا اور ۹۸۶ء میں شہید ہوئے۔

اسلامی ہندوستان میں جہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ ادر اہل بیت سے محبت اور عقیدت عام اہل سنت کا شعار ہے۔ (اور جہاں اقبال جیساراسخ الاعتقاد شتی منقبت میں بڑے زوردار شعر کہتا ہے) وہاں اس محبت و عقیدت کی بنا پر شیعیت (اور وہ بھی تبراہلی شیعیت) کا اقتساب مشکل ہی سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔

محاسن المؤمنین میں تمام دنیا کے شیعہ زعماء کے حالات ملتے ہیں، لیکن ضمنی طور پر کشمیر، بلوچستان، گجرات، دکن کے ان شیعہ اکابر پر بھی روشنی پڑتی ہے، جو اسلامی ہندوستان کی مذہبی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے خاص دلچسپی کا مرکز ہیں۔ تصوف کے بارے میں قاضی صاحب کا مسلک لکھنؤ کے شیعہ علماء سے بالکل مختلف تھا۔ اور آپ نے محاسن المؤمنین میں ایک مستقل باب تصوف کی تعریف و توضیح میں لکھا ہے لیکن علماء لکھنؤ اس اندراج کی اپنے خیالات کے مطابق تاویل کر لیتے ہیں۔

افغان مشائخ و علماء

شیخ عبداللہ نیازی سرمندی | عہدِ جاگیر کے سب سے زیادہ مشہور افغان بزرگ (شیخ آدم بنوری) کا ذکر ہم ان کے مشہد حضرت مجدد الف ثانی کے ساتھ کر چکے، لیکن ان کے علاوہ بھی اس زمانے میں کسی افغان بزرگ ہوئے ہیں۔ سرمندی کے قریب تو ان کی خاص طور پر کثرت تھی۔ مثلاً میاں عبداللہ نیازی جو ایک زمانے میں ہمدوی ہو گئے تھے اور شیر شاہ کے بیٹے اسلام شاہ سور کے زمانے میں مخدوم الملک کے حکم سے بڑی طرح پٹوائے گئے، بلکہ نیم جاں ہونے پر ہی چھوڑے گئے۔ خدا سے تعالیٰ نے ان کی عمر میں بڑی برکت دی اور وہ عہدِ جاگیر تک زندہ رہے۔ مخزن افغانی کا مصنف جس نے ان سے ملاقات کی تھی، لکھتا ہے کہ وفات کے وقت ان کی عمر ایک سو چالیس سال سے زیادہ تھی۔ انھوں نے ایک زمانہ دیکھا تھا اور بڑی سیروس یا حسرت کی تھی۔ (ابدالی) عمر ہی میں انھوں نے بارہ سال عرب و شام میں تحصیل علوم کی تھی۔ اس کے بعد

سات سال بخار میں علوم باطن حاصل کیے اور ریاضات شاقہ اختیار کیں اسلام شہر کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ یہاں یہ صورت پیش آئی۔ چنانچہ اب پھر سمندر کے راستے مکہ منظمہ چلے گئے۔ چند سال وہاں بسر کیے۔ عہد اکبری میں پھر ہندوستان آئے اور سرہند میں اقامت اختیار کی۔ اس دوران میں اکتب کے مزید مطالعہ اور تحقیق کے بعد (مرد و تربت سے توبہ کی۔ علماء کا طریقہ اختیار کیا اور متاہل ہو گئے۔ انھوں نے متعدد کتب تصنیف کیں۔ جن میں نوادر افغانی اور مرآۃ الصفا کے نام تذکروں میں ملتے ہیں۔

شیخ احمد سون قدس سرہ | ایک اور قابل ذکر بزرگ ہستی سید احمد سون کی تھی جس کے حالات زندگی میں حضرت مجدد الف ثانی سے اس طرح تطابق ہے کہ بادی النظر میں شبہ ہوتا ہے کہ شاید معتقدوں نے بعض حالات کو واقعات مجددیہ سے مستعار لیا ہے۔ لیکن گلزار ابرار اور مخزن افغانی کے مصنف دونوں سید احمد سون کی ملاقات سے شرفیاب ہوئے اور دونوں نے ان کے حالات ذاتی معلومات کی بنا پر لکھے ہیں جن میں شبہ کی گنجائش نہیں۔

شیخ احمد سون کے والد شیخ محمد بن الیاس سون غرغشتی تھے جو بھوارہ (علاقہ پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ والد کی وفات پر ۱۵۹۳ء میں شیخ احمد سجادہ نشین ہوئے۔ انھوں نے تعلیم اپنے والد اور شیخ الداد لاہوری سے حاصل کی تھی۔ جب جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد اس کے بیٹے خسرو نے بغاوت کی تو اگرچہ یہ بغاوت جلد فرو کر دی گئی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پنجاب میں خاصی ہچل پیدا ہو گئی۔ ایک تو تاج مغلیہ کا "اقبال اکبری" سے شروع ہو جانا ہی معمولی بات نہ تھا، دوسرے جہانگیری کے جھگڑے۔ باپ بیٹے کی کشمکش۔ چنانچہ محفل شاہی میں بھی سیاسی انقلابات پر تبصرے ہو کرتے تھے۔ گلزار ابرار کے مطابق "اس فتنہ انگیز سال میں ہر ایک تقریب سے شہنشاہ کی محفل میں باوجود کمال ارزائی کے اس قسم کی گفتگو کا رخ بڑھ گیا تھا" ایک روز ایک ندیم نے سادات صفویہ کا ذکر کیا، جنھوں نے

ابتدا تو مشائخ اور مذہبی سرگرمیوں کے طور پر کی تھی، لیکن بالآخر تخت ایران پر قابض ہو گئے۔ اس اثنائے میں ایک اور شخص بول اٹھا کہ اس زمانے میں بھی چند درویش صورت اشخاص ایسے ہیں جن کے حلقہ گوش معتقدین ایک ولایت کی فوج سے زیادہ ہیں۔ ان میں سے بزرگ ترین سید احمد افغان ہیں جو بخارا کے اطراف میں رہنے والے افغانوں کی شورش کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اور تمام جماعت میں سے کوئی ان کے فرمان سے سرتابی نہیں کرتا۔ بادشاہ نے علم دیا نہ انھیں دربار میں حاضر کیا جائے۔ چنانچہ وہ دارالسلطنت آگرہ میں بلائے گئے۔ لیکن دربار میں حاضر ہونے پر انھوں نے سجدہ دربار کرنے سے انکار کر دیا۔ گلزار ابرار کے ترجمان ابرار میں تو اتنا ہی لکھا ہے کہ ”آپ شاہی حضور میں پہنچے تو ملازمت شاہی کے آداب بجا نہیں لائے۔“ لیکن مخزن افغانی میں صراحت ہے:-

”دور روز ملاقات سجدہ تکریم و تحريم کہ در سلسلہ پختہ متعارف است۔ بجایاورد۔“
 بادشاہ نے حکم دیا کہ اس ”دیوانہ“ کو چند روز قلعہ گوالیار کے اردستان میں محفوظ رکھو۔
 سچے کہ حسن سلوک کے گلوبند میں اپنی گردن دینا گوارا کرے۔“ (اذکار ابرار)
 شیخ احمد سون میں سال تک گوالیار کے قلعہ میں قید رہے۔ نہایت کشادہ پیشانی سے یہ وقت عبادت الہی میں گزارا اور بڑے مراتب عالی حاصل کیے۔ اتفاق سے ۱۹۱۰ء میں خان جہاں لودھی (پیر خاں ابن دولت خاں لودھی) اکبر و بہ خاندیش دکن کی حکومت سپرد ہوئی۔ جب دکن کو جاتے ہوئے وہ گوالیار پہنچا اور شیخ احمد کے حالات سے آگاہ ہوا تو اس نے حضور شاہی میں عرضی بھیجی کہ شیخ کو اس مہم میں میرے ہمراہ کر دیا جائے۔ جہاگیر نے خان جہاں کے پاس خاطر سے یہ التماس قبول کر لی۔ چنانچہ شیخ احمد سون خان جہاں کے ساتھ دو سال دکن میں رہے۔ مخزن افغانی میں لکھا ہے کہ لڑائی کے وقت ان کی بڑی کوشش ہوتی کہ سبک پیش پیش رہیں۔ جو بڑیاں قید کے وقت ان کے پاؤں میں تھیں انھیں تمام عزت و احترام کے ساتھ اپنے پاس رکھتے۔ رات کو انھیں اپنے سر ہانے رکھ کر سوتے اور فراتے کہ یہ بڑیاں میرے لیے

مرشد راہِ حقیقت ہیں اور میں نے ان سے بڑے فائدے حاصل کیے ہیں۔
 جب خان جہاں خاندیش سے آگرو واپس جانے لگا۔ تو آپ بھی ساتھ تھے اور
 تین نومبر ۱۱۷۱ء کو جب آپ اٹنا سے میں مانڈو پہنچے تو گلزار ابرار کے مصنف غوثی
 منڈوی نے آپ سے ملاقات کی۔ اور ان دونوں بزرگوں کے درمیان صوفیانہ رموز پر
 باتیں ہوئیں۔

حضرت مجدد الف ثانی کی طرح شیخ احمد سون بھی تصوف میں شیخ علاء الدین سمنانی کے
 کے ہم خیال تھے جنھوں نے شیخ ابن العربی پر اعتراضات کیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ
 خان جہاں لودھی کو بھی صوفیانہ مسائل سے دلچسپی تھی۔ ایک روز وہ شیخ احمد کی
 کی خدمت میں شیخ علاء الدین سمنانی کی کتاب چہل مجلس لے کر پہنچا۔ جس میں شیخ
 بن العربی کا ایک متشابہ قول درج تھا۔ خان جہاں نے اس کی تشریح چاہی۔ شیخ
 نے اس مقصد کے لیے مسیح القلوب کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں ابن العربی
 کے بیان کی اس طرح تاویل و تعبیر کی کہ وہ شریعت اور عقل سمجھ کے قریب آجائے۔
 اس مسئلے پر غوثی کے مرشد شیخ عیسیٰ سندھی بڑے پوری سے آپ کی بحث بھی ہوئی
 تھی۔ چنانچہ غوثی نے اس کا خلاصہ آپ کی زبان سے سن کر گلزار ابرار میں درج کیا ہے۔
 بالآخر آپ اسے رخصت لے کر اپنے وطن مالوت تشریف لے گئے۔

مخزن افغانی میں یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کو سید احمد سون کہنے کی وجہ یہ ہے کہ
 ایک روز آپ کے والد کو خواب میں حضور رسالت مآب نے فرمایا کہ تمھارا بیٹا شیخ احمد
 میرے فرزندوں میں داخل ہے۔ اسے سید احمد کہنا۔ شیخ احمد ہرگز نہ کہنا۔ چنانچہ اس
 کے بعد ان کا لقب سید احمد ہوا۔

مخزن افغانی میں یہ بھی لکھا ہے کہ آپ شروع شروع میں جذبہ کی حالت میں
 رہتے۔ اکثر ایسا ہوا کہ مست و خراماں جنگل میں چلے جاتے اور کئی کئی روز جنگل میں
 گھومتے رہتے اور جنگلی جانوروں کی آواز سے رقص و جذبہ کی حالت میں آجاتے۔
 آپ کی درگاؤ کے افغان خادم آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بھرمرکان پر لے آتے، لیکن

آپ کے مکان کے متعلق مخزن کا بیان ملاحظہ ہو۔ ”محلات ایشاں بہ مثل محل بادشاہ
 بود کہ تمام در و دیوار و سقف را تحمل و زربفت پوشیده بود۔ و تخت ہاے دراز
 از چوب صندل بود و چوکیہا از صندل۔ و از چوب اگر دریاں مکان نصب کردہ بودند
 و از پیچہاے گلیمہاے نفیس دریاں بساط ہمیشہ موجود و طیار می بودند و خوشبوے غیر مکرر
 کہ لائق حال بادشاہاں باشد دریاں با خرج می شد۔“ غالباً آپ کے خلاف دربار شاہی
 میں جو شکایتیں ہوئیں ان کا ایک باعث آپ کے دیرے کا یہ شاہانہ ٹھاٹھ تھا۔
 جسے آپ کے محققوں نے قائم کر رکھا تھا۔

آپ کی نسبت اویسی تھی۔ کسی خاص خانوادے سے منسلک نہ تھے۔ شاید
 یہی وجہ ہے کہ اولیاء کے عام تذکروں میں آپ کے حالات بہت تھوڑے ہیں۔
 طبقات شاہجہانی میں آپ کی تاریخ وفات ۱۰۲۷ھ یعنی ۱۶۱۷ء لکھی ہے۔
 مخزن افغانی سے پتا چلتا ہے کہ آپ کی وفات انہی برس سے زیادہ کی عمر میں ہوئی۔
 اور بجوارہ کے قریب اپنے گاؤں میں دفن ہوئے۔ ع

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

معلوم ہوتا ہے کہ شاہانہ تزک و احتشام برقرار رکھنے کا طریقہ اس زمانے کے
 مشائخ میں عام تھا۔ مثلاً مخزن افغانی میں ایک اور افغان بزرگ شیخ ممقنی کا نسبی
 کا ذکر ہے جو اب قصبہ کٹھالہ (نزد گجرات) صوبہ پنجاب میں آرام فرما ہیں۔ وہ خود تو
 بیشتر روزہ سے رہتے اور راتوں کو جاگ جاگ کر عبادت کرتے، لیکن باورچی خانہ
 ہمیشہ گرم اور لنگر ہمیشہ جاری رہتا۔ جہاں ایک سے دس ہزار مہمان امیر اور غریب
 خواتین اور امرار جوگی اور ملنگ کھانا کھاتے تھے۔ ”وہمان خانہ ایشاں بہ نوسے
 مکلف بود کہ محفل این دنیا ہرگز باں لطافت و ظرافت آراستہ و پیراستہ نمی باشد۔
 سقف و جدار و ستون ہا ہمہ موافق یک دیگر بطرز و روش بہ مثل و شجر و زر گرفتہ بودند۔
 و فرش آن گلیم ہا و قالین ہا ولایتی قیمتی۔ و زوچہاے اعلیٰ گراں بہا و سایہ بان ہاے
 بادشاہانہ کشیدہ۔ تکیر ہاے بسیار باللطافت و نظافت و پینک ہاے نقرہ و جامہ ہا بہا

ظریف برآں گسترده و تخت پوش با و صندلی با سے اعلیٰ خاتم بندہ محاذی آں نہادہ کہ چشم فلک ندیدہ و گوش سموات نشنیدہ ہمیشہ شب و مہیا بود۔

قصور کے افغان مشائخ | افغان مشائخ کے جس مرکز کے متعلق سب سے زیادہ معلومات ملتی ہیں، وہ ضلع لاہور کا شہر قصور ہے۔

اس کے متعلق فارسی میں ایک مستقل کتاب شیخ عبدالقادر غوثیشکی نے اخبار الاولیا من لسان الاصفیا کے نام سے لکھی۔ جس میں عام افغان مشائخ اور ان کے نسب کے متعلق بھی طویل اندراجات ہیں، لیکن کتاب کا بجز وغالب غوثیشکی افغانوں اور مشائخ قصور کے متعلق ہے۔ اس کتاب کی ایک نقل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں ہے اور پنجاب کے بعض علمی ذخیروں میں بھی اس کی نقلیں ملتی ہیں۔

ان مشائخ کے مورث اعلیٰ پیر کیار شیخ و توتھے، جو حیثیت میں جا کر قدیم بزرگ خواجہ مودود چشتی کے مرید ہوئے۔ ان کی وفات ۱۵۵۷ھ میں ہوئی۔ قصور میں اس سلسلے کے پہلے بزرگ شیخ حاجی اویس و توزی تھے، جنہوں نے ۱۵۹۷ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے اپنے مورث اعلیٰ پیر کیار سے اویسی طریقہ سے فیض حاصل کیا اور حج کی سعادت حاصل کی۔ اکبر کے ہم عصر تھے۔ انہی کے زمانے میں اخوند سعید شوریانی اور شیخ رحمت شوریانی تھے، جو ان کی طرح پیر کیار کی روحانیت سے فیض یاب ہوئے۔ انہوں نے بالترتیب ۱۶۰۹ھ اور ۱۶۱۶ھ میں وفات پائی۔ اور قصور میں دفن ہوئے۔ دونوں صاحب باطن بزرگ تھے۔

اس سلسلے کے سب سے نامور بزرگ مولانا شیخ احمد شوریانی قصوری تھے وہ بھی حضرت پیر کیار کی اولاد میں سے تھے۔ علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل لاہور میں شیخ اسحاق ابن حضرت شاہ کا کوچیشی لاہوری سے کی، جو عہد اکبری میں ملک بزرگترین علماء میں سے تھے (ملاحظہ ہو بدایونی کی منتخب التواریخ) شیخ احمد اپنے قبیلہ میں پہلے بزرگ تھے، جنہوں نے کمالات باطنی کے ساتھ علم ظاہری کو جمع کیا۔

اور تمھارا کام نہیں بنا۔ تمھاری مشکل میں حل کر سکتا ہوں۔ حاجی نے تسلیم ختم کیا۔
اور اب یہ حال ہوا۔

بہ مئے سجادہ رنگیں کن گرت پیرمغاں گوید

کہ سالک بے خبر بود ذراہ در سہم منزلہا

پیر کی صحبت میں انھوں نے بھی ملامتی طریقہ اختیار کیا۔ زہد و تقویٰ اور پابندی شرع کو سلام کہا۔ چار ابرو کا صفایا کیا اور لباس میں فقط ستر عورت پر اکتفا کی۔ ہر وقت آگ روشن رکھتے۔ اگر کوئی چیز لاتا تو اسے بھی آگ میں ڈال دیتے۔ ان کی وفات ۱۲۳۶ء میں ہوئی۔

قصور کے ایک اور بزرگ شیخ بایزید تنک زنی تھے، جنھوں نے حضرت پیر کبار کے خلیفہ شیخ تنک کی روحانیت سے فیض حاصل کیا۔ وہ اپنے بھائیوں سے کسی بات پر خفا ہو کر خورجہ چلے گئے۔ اور وہاں مرجع خلافت ہوئے۔ ان کی وفات ۱۲۲۶ء میں ہوئی۔ ان کے علاوہ شیخ الہ داد و توزئی اور شیخ بھوگی افغان بھی قصور کے افغان مشائخ میں سے تھے۔ ان کی وفات بالترتیب ۱۲۳۹ء اور ۱۲۵۹ء میں ہوئی۔

خویشگی شوربانی مشائخ سلسلہ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ معرفت طریقت اور اشاعت علم و فضل کے علاوہ انھوں ادبی خدمات بھی کیں اور ان میں جاہ و جلال والے حضرات بھی ہوئے۔ جن میں مبارز الدولہ پیر ابراہیم خاں خویشگی قصویٰ خاص طور پر ممتاز ہیں۔

اخوند بابا درویش پشاور کی قدس سرہ

افغانوں کی مذہبی تاریخ میں سب سے اہم اور دلچسپ باب

ان ہستیوں کا تذکرہ ہے۔ جنھوں نے افغان علاقے میں

ارشاد و ہدایت اور صحیح اسلامی تعلیم کو وسعت دی۔ ان میں حضرت سید علی خواص المعروف

حضرت پیر بابا

حضرت پیر باباؒ کو بلحاظ قدامت اور بزرگی خاص مرتبہ حاصل ہے۔ وہ ساداتِ برہنہ میں سے تھے۔ جائے پیدائشِ قدس۔ ان کے دادا اہلِ باطن میں سے تھے، لیکن والد نے ہمالیوں کے لشکر میں منصب لے لیا تھا۔ وہ والد کے ساتھ ہندوستان آئے۔ لیکن ان پر فقیری رنگ غالب رہا۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے پانی پت، اجمیر وغیرہ کا سفر کیا۔ خرقہ خلافت انھیں طریقہ چشتیہ میں اجمیر کے شیخ سید سالار سے ملا۔ اور مرشد نے ہدایت کی کہ کوہستان کو اپنے کام کا مرکز بناؤ۔ ان کے دو گلیانی مستوفیوں نے انھیں آمادہ کیا کہ وہ افغان علاقہ میں مقیم ہوں۔

اس وقت اس علاقے کی جو مذہبی حالت تھی، اس کا بیان اخوند درویش نے حضرت پیر بابا کی زبانی بڑے دردناک طریقے سے بیان کیا ہے۔

”یعنی اس علاقے کے لوگوں کو میں نے انتہائی سادہ دل، ہر وقت دین کی طلب و تلاش کرنے والے اور خدا طلب پایا۔ جوان بوڑھوں سے زیادہ دین میں استوار، عورتیں مردوں سے زیادہ دین پر مضبوط، بچے بچپن ہی میں دین طلب کرنے والے اور تلاش کرنے والے اور ان کے ملازم بھی شریعت پر عامل پاتا ہوں۔ ان میں قبولیت حق کی صلاحیت تو موجود تھی مگر اس علاقے کے لوگوں میں نہ درس تھانہ مدرسہ۔ نہ علم تھا اور نہ ہی علماء اتقیا، اس لیے شریعت سے بے بہرہ مشائخ اور ایسے پیروں نے جو کہ مشائخ بھی نہیں رکھتے تھے ان لوگوں کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کو غلط راستے پر ڈال دیا“ (ترجمہ)

آپ نے اس علاقے میں قیام اور اس صورت حال کی اصلاح کا تہیہ کیا۔ اللہ کے فضل و کرم سے آپ کو بڑا قبول حاصل ہوا۔ جہاں کہیں کسی بے علم اور بے شرع پیر کے متعلق اطلاع پاتے۔ جا کر اس سے بحث مباحثہ کرتے۔ چنانچہ تذکرہ ابراہار والا شہر میں ایسے کسی مدعیانِ مذہب کے نام ہیں۔ آپ کے سب سے اہم سر کے فرقہ روشنیہ کے راہنما، پیر روشن سے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مساعی کو بڑی کامیابی دی۔

کیے۔ خزینۃ الاصفیاء میں اخوند[ؒ] کی نسبت لکھا ہے :-

”دفع زنادقہ و ملاحدہ و دفع بیاری کرشید و ہر جا کہ ملحدے یار افغنی شنیدے

نزد اور سیدے و باوند اگرہ کر دے و اور ملزم ساختے ۛ

اخوند درویشہ صاحب کے بزرگ علاقہ ننگر پارہ موجودہ جلال آباد مشرقی افغانستان میں مقیم تھے۔ جب ان کے دادا متعلوں اور یوسف زئیوں کی کشمکش میں شہید ہو گئے تو یہ خاندان ہمنندوں کے علاقے میں منتقل ہو گیا جہاں اخوند صاحب کی پرورش ہوئی۔ انھیں شروع سے زہد و ریاضت کا شوق تھا۔ لیکن آپ نے علوم ظاہری کو بھی پورے انہماک سے حاصل کیا۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا مصر احمد اور مولانا جمال الدین ہندوستانی کا نام لیا جاتا ہے۔ موخر الذکر کے پاس آپ سات برس رہے۔ لیکن آپ کی طبیعت کو تسکین حضرت پیر بابا کی خدمت میں پہنچنے کے بعد ہوئی۔

”دفع زنادقہ و ملاحدہ“ کا سبق آپ نے اپنے مرشد سے حاصل کیا تھا۔ جب میاں یازید نے ہشت نگر میں اقامت اختیار کی تو اس کے خیالات کی اصلاح کے لیے حضرت پیر بابا وہاں پہنچے۔ اخوند درویشہ بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ پھر اخوند صاحب علیحدہ بھی جانے لگے اور بحث و مباحثہ کرتے۔ وہ محزن الاسلام میں لکھتے ہیں :-

چمل حضرت پیر دستگیر اس فقیر شیخ المشائخ والادب سید السنت سید علی

ترندی در میانان افغانان یوسف زنی در موضع بونیر بودہ از یازید خبر یافتہ دفع

دعوتے اور ابر خود فرض دید۔ پس ایں فقیر ہم ہمراہ بر فتم۔ اور ادعوائے خجل و شرمسار ساختم کہ

سخن گفتن و دم زدن در حضور نتوانست۔ تا لقب اور اپر تار یک کردم و ہذا بکرات و مرات

گا ہے با حضرت پیر وفیلہ گا ہی و گا ہے بہ تنہائی خود حاضر می شدم و ایں ملحد را خجل ساختم۔

لیکن اخوند درویشہ کو پوری کامیابی نہ ہوتی تھی۔ ایک تو علاقے میں صحیح اسلامی حکومت نہ تھی کہ رفع شر کا انتظام ہوتا۔ دوسرے علوم اسلامی کی اس علاقے میں انتہائی کمی تھی۔ اخوند صاحب لکھتے ہیں کہ اگر ناواقف افغانوں میں سے ایک کو

ۛ تذکرہ علماء و مشائخ سرحد (از مولانا محمد امیر شاہ قادری پشاور) ص ۲۶

منع کرتا تو دوسرا میاں بایزید کے پاس جا پہنچتا۔ اخوند صاحب نے اندازہ لگایا کہ مسئلے کا اصل حل علوم اسلامی کی اشاعت ہے۔ چنانچہ انھوں نے کثرت سے پشتو اور فارسی میں کتابیں مرتب کیں۔ اپنی پشتو تصانیف کی نسبت اخوند صاحب لکھتے ہیں:-

افغاناں چوں در طلب مولیٰ محبت تمام دارند و دین را جوایا اند اما بہ سبب نادانی و جاہلی کہ از علوم دینی محروم اند۔ حق را از باطل نمی دانند۔۔۔ پس این فقیری خواہد کہ متن عقائد بہ لفظ افغانی بیارد۔ تا ہر کہ آن را دریابد۔ و باورد و ہرگز گمراہ نگردد۔

اس سلسلے میں آپ کی سب سے مشہور پشتو تالیف مخزن الاسلام ہے جس میں عقائد و عبادات کے اہم مسائل مشہور عربی و فارسی کتب سے اخذ کر کے درج کیے ہیں اور اس امر پر زور دیا ہے کہ جو کوئی سنت نبوی پر نہ چلے۔ اور علم تفسیر و حدیث و فقہ سے آگاہ نہ ہو، اُسے پیرو پیشوا ہرگز نہ بنانا چاہیے۔

مخزن الاسلام کا بیشتر حصہ اخوند درویش صاحب کا اپنا لکھا ہوا اور احکام شریعت کا تمام تذکرہ ان کے اپنے قلم سے ہے، لیکن ان کے صاحبزادے مولانا عبدالکریم نے بھی دو باب حقائق و معارف کے متعلق شامل کتاب کیے ہیں۔ اخوند درویش صاحب نے بھی اس امر کا قوی احساس تھا کہ میاں بایزید کی بے راہ روی طریقت کی غلط ترجمانی اور شریعت پر طریقت کی ترجیح سے پیدا ہوئی ("دریں ایام ہر کہ از افغاناں در بلائے در آمدہ است۔ از پیری و مریدی در آمدہ است") اس لیے انھوں نے مرقعہ پیری مریدی اور طریق تصوف کی اصلاح کی بڑی کوشش کی۔ مخزن الاسلام میں بھی یہ کوشش مسلسل نظر آتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ان کی سب سے جامع اور مشہور کتاب ارشاد الطالبین فارسی میں لکھی گئی۔ اس کے شروع میں یہ عاشق اسلام اپنے در و دل کا اظہار یوں کرتا ہے:-

"اما بعد یکے از مریدان کثرینہ حضرت شیخ الاسلام و المسلمین وارث علوم انبیاء و المرسلین شیخ علی ترمذی یعنی اضعف عباد اللہ الباری جمی گوید کہ۔۔۔ چوں انواع اہل الحاد و تغلب نمودہ اند۔ پس۔۔۔ معقدان و معتقدان مذہب سنت و جماعت

بل عالمان و عاقلان مشرب شریعت را غریب الغر بادیدم... از شدت تعصب دینی
روز بروز در سوز و گداز در آیدم۔ انا از روی تحقیق نظر کردم کہ سبب تفرق امت بہ
ہفتاد و سہ گروہ چہ می باشد؟ جز از شیوخ مت مردودہ مبتدعہ چیزے دیگر نیافتم زیرا کہ
تمامی افعال و اقوال و احوال شیوخ ابن ایام را مخالف قرآن و حدیث و مخالف روایات
اکثر و مخالف حالات شیوخ سلف دیدم۔“

اخوند درویش کے نزدیک امت کے اختلافات اور عوام کی گمراہی کا اصل باعث
یہ شیوخ مت مردودہ، مبتدعہ یعنی مشلخ و اکابر کے دعوے اور بدعتی طور طریقے تھے۔
اور ان کا علاج قرآن و حدیث اور اکثر و شیوخ سلف کی پیروی تھا، جس پر سب اتفاق
کر سکتے تھے۔ اخوند صاحب نے روحانی مطلق العنانی کی سخت مخالفت کی۔ ان کی
تصانیف میں یہ شعر جو میاں بایزید پر بظاہر صادق آتا ہے، بار بار درج ہوا ہے۔
خیالات نادان خلوت گزیں بہم برزند عاقبت کفر و دیں

افغان عوام کو صراطِ مستقیم پر لانے کے لیے اخوند صاحب نے تو سلیح علم پر
زور دیا۔ خود اس کے لیے بڑی جدوجہد کی اور علم کی قدر و قیمت نوانے کی بڑی
کوشش کی۔ انھوں نے ان لوگوں پر نکتہ چینی کی، جو علم کو ”حجابِ ابر“ کہتے تھے۔
اور کہا کہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نبی کریم کیوں ذی ذیٰ علیہا کا نعرہ لگاتے۔

مخزن الاسلام اور ارشاد الطالبین کئی بار چھپ چکی ہیں۔ ان کے علاوہ اخوندیاب
کی اور کئی تصانیف ہیں۔ مثلاً تلقین المریدین تذکرۃ الابرار والاشرار دو مرتبہ چھپی ہے۔
اخوند درویش شاعر بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں ان کے پشتو اشعار آجاتے
ہیں۔ اور میر احمد شاہ رضوانی مرحوم نے اپنی کتاب بہارستان میں صبر کی فضیلت
پر ان کی ایک پشتو مثنوی درج کی ہے۔

اخوند درویش ایک زبردست اہل قلم تھے۔ لیکن ان کا اصل مرتبہ ایک مصلح
اور مجدد کا ہے۔ انھوں نے صرف میاں بایزید کی روحانی مطلق العنانی ہی کا اپنی
حمیت اسلامی اور مٹھوس علمی خدمات سے مقابلہ نہیں کیا، بلکہ اسلام کے بنیادی

عقائد کے خلاف انھیں جہاں کہیں بھی کوئی چیز ملتی وہ اس کی مخالفت کرتے اخبار الاولیاء میں روشنیہ فرقہ کے علاوہ ایک اور گروہ کا ذکر ہے جس کی آپ نے مخالفت کی۔ افسوس کہ اخبار الاولیاء کی جو نقل ہماری نظر سے گزری۔ اس میں اس گروہ کا نام عطیک طرح سے پڑھا نہیں جاتا۔ غالباً "قذایان" ہے اور ان اسماعیلیوں کے متعلق ہے جو نواح چترال میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ اخبار الاولیاء میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایک روایت کے مطابق اس گروہ کے سردار نے آپ کو مسموم تر بوز کھلا دیا جس سے آپ کی وفات واقع ہوئی۔

لیکن شاید حضرت اخوند درویش کے اصلاحی جوش کا اس سے بھی زیادہ واضح ثبوت یہ ہے کہ آپ نے اپنے پیرو مرشد کو جن کا آپ کو اتنا احترام تھا غیر شرعی باتوں پر روکا۔ شیخ علی ترمذی چشتیہ سلسلے سے منسلک تھے۔ اور اس سلسلے کے رواج کے مطابق سماع کے قائل تھے۔ حضرت اخوند صاحب نے اس پر اعتراض کیا۔ شیخ علی نے فرمایا کہ میں کبھی کبھی سماع اس لیے سنتا ہوں کہ اس حالت میں مجھ پر بعض اسرار منکشف ہوتے ہیں، لیکن معترضوں کے پاس خاطر سے میں اسے ترک کرنے کھیلے تیار ہوں۔ چنانچہ اخبار الاولیاء میں لکھا ہے کہ اس کے بعد شیخ علی نے پھر سماع نہیں سنا۔ حضرت اخوند درویش کو احکام شرعی کا بڑا خیال رہتا تھا، لیکن وہ اہل حال وادیش بھی تھے۔ اور بسا اوقات اپنی دھن میں ایسے مستغرق ہوتے کہ تن بدن کی ہوش نہ رہتی۔ اخبار الاولیاء میں لکھا ہے کہ ایک روز ایک عورت سر پر تیل کا بھرا ہوا ٹمکا لیے جا رہی تھی۔ مولانا کو پیاس لگی تھی۔ عورت سے کہنے لگے کہ بیٹی! پانی پلاؤ تو ثواب ملے گا۔ اس عورت نے حیا اور ادب کے مارے کچھ نہ کہا اور ٹمکا اخوند صاحب کے سامنے رکھ دیا۔

۱۰ خوشگئی افغانوں اور نواح قصور کے دوسرے بزرگوں کا تذکرہ ہے۔ لیکن ایک طویل باب (جو زیادہ تر مخزن افغانی سے ماخوذ ہے) افغان مشائخ کے متعلق ہے۔ اس کی ایک نقل پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔

انھوں نے اپنی دھن میں پینا شروع کیا اور مٹکا خالی کر دیا۔ تب جا کر احساس ہوا۔ اور مزہ وہن سے پتا چلا کہ پانی نہ تھا۔ تیل تھا !

اخوند صاحب سماع کے علاوہ تھے لیکن چشتیہ سلسلے میں منسلک تھے اور اس سلسلے سے بڑی حقیقت رکھتے تھے۔ ان سے پہلے (توفیقی بزرگوں کے علاوہ) افغانوں میں چشتی تھوڑے تھے۔ زیادہ افغان اہل طریقت کا سلسلہ شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی سے جا کر ملتا تھا۔ حضرت اخوند درویش اور ان کے مرشد سے افغان علاقے میں چشتیہ سلسلے کو فروغ ہوا اور انھوں نے تلقین المریدین میں بالتفصیل سہروردیہ سلسلے پر چشتیہ سلسلے کی فوقیت بیان کی ہے۔

اخوند درویش نے ۱۰۴۸ھ (مطابق ۱۶۳۸ء) میں عہد شاہجہانی میں وفات پائی۔ مزار شریف پشاور میں موضع ہزار خانی کے قریب ہے اور مرجع خلایق ہے۔

اخوند درویش کے والد ایک صاحب علم بزرگ تھے۔ ادبیات سرحد میں ان کا نام انوں گدا لکھا ہے، لیکن اخوند صاحب کے صاحبزادے مولانا عبدالکریم تو علمی اور باطنی مراتب میں اپنے دادا سے بہت بڑھ گئے۔ خلاصۃ البحر میں انھیں محقق افغانستان کا خطاب دیا گیا ہے اور مخزن الاسلام کے جواب انھوں نے لکھے ہیں ان سے آپ کا ذوق و شوق اور روحانی مرتبہ ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے والد سے ظاہری اور باطنی تعلیم پائی۔ پھر ان کی طرح میر سید علی خواص سے خلافت حاصل کی۔ والد کی طرح وہ جامع شریعت و حقیقت تھے۔ اور انھیں کی طرح شعر بھی کہتے تھے۔ اشعار میں انھوں نے اخوند کریمہ کا لقب اختیار کیا ہے اور بسا اوقات وہ اسی لقب سے یاد کیے جاتے۔

اخوند کریمہ کی وفات ۱۰۶۲ھ (مطابق ۱۶۵۱-۵۲ء) میں ہوئی اور یوسف زئی

علاقے میں مدفون ہوئے (خزینۃ الاصفیا)

اخوند درویش اور اخوند کریمہ سے بھی بے شمار لوگوں نے فیض حاصل کیا۔ ان میں ایک برگزیدہ بزرگ شیخ نچو پشاور سی تھے۔ وہ اہل حال درویش تھے۔ لیکن اخوند درویش کے اسلوب خیال کے دوسرے بزرگوں کی طرح لوگوں کو حصول علم کی بڑی ترغیب دیتے۔

ان کے متحد و مرید تھے۔ ”مولانا چالاک میانہ و شیخ شاہ شاہماں پوری و شیخ علی وغیرہ۔“ دہر کہ
بہ صحبت او پیوست۔ فضیلتے از علوم دینی یافت“ ان کی زبان پشتو تھی، لیکن فارسی اشعار
بھی کہتے اور ہندوستانی زبان میں بھی گفتگو کرتے ان کی وفات ۱۰۷۳ھ مطابق ۱۶۶۳ء
میں ہوئی۔ مزار شریف پشاور میں ہے۔

انھوں نے علم و فضل اور معارف و حقائق کی جو شمعیں روشن کیں انھوں
نے نام نہاد و دشمنیہ فرقہ کی کہر اور تاریکی کو دور کر دیا۔ افغانوں میں صحیح اسلامی تعلیمات
کی روشنی پھیلی۔ اور سرحد میں حبشیہ طریقے کی اشاعت سے افغانوں کا روحانی رشتہ
باقی قوم سے استوار ہوا۔ اس کے علاوہ حضرت مجدد الف ثانی (جو خود اصلًا کابلی
تھے) کے خلفا بالخصوص شیخ آدم بنوری اور خواجہ محمد معصوم کے متعدد افغان خلفا تھے،
جنھوں نے افغان علاقے میں شریعت کو فروغ دیا۔ شیخ آدم بنوری خود افغان تھے۔
ان کے ایک مشہور خلیفہ شیخ سعدی لاہوری تھے۔ ان کے معتقدین میں سرحد کے کئی
مشائخ کبار تھے۔ مثلاً حضرت میاں محمد عرصا صاحب چمکنی اور حضرت یحییٰ المتوکل حضرت جی۔
روشنیہ فرقہ کے خلاف ان بزرگوں کی کوششیں جس طرح کامیاب ہوئیں۔
اس کا اندازہ مرزا خاں انصاری کے واقعات زندگی کے مطالعہ سے ہوتا ہے، جو
روشنیہ فرقہ کے بانی میاں بایزید (پیر روشن یا پیر دغاں) کا پوتا اور پشتو کا پہلا
صاحب دیوان شاعر تھا۔ ایک زمانے میں وہ کہتا تھا کہ میرے اشعار کی شیرینی
پیر دغاں کی برکت سے ہے، لیکن (بقول ریلوئی) ایک زمانہ آیا کہ اس نے روشنیہ
طریقے کو نظر انداز کر دیا اور ہر اس بات سے توبہ کی جو اس نے شرع کے خلاف کی
تھی یا کہی تھی۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ بعد کے پشتو نامور شعرا (مثلاً رحمان بابا یا خوشحال خاں
خنک) کے کلام میں روشنیہ طریقے سے عقیدت کا کوئی سراغ نہیں ملتا بلکہ خوشحال خاں
خنک نے تو پیر دغاں اور اس کی کتاب خیر البیان کی مذمت کی۔

لے خوشحال خاں خنک (از دوست محمد خاں کاکل، صفحہ ۲۲۰-۲۲۱)

اخوند صاحب کی تحریک کا دوسرا فائدہ ادبی تھا۔ انھوں نے اور دان کے مریدوں نے پشتو زبان میں علوم اسلامی کے متعلق کتابیں لکھیں۔ پشتو نظم میں دینی علوم کی اشاعت کی اور پشتو کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ ادبیات سرحد کے مصنف اخوند درویش اور پیر روشن کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”پیر و خاں کے ساتھ اُن کی شدید مخالفت تھی۔ تحریری مناظرے رہتے اور جذبہ مسابقت میں دونوں طرف سے تصنیف و تالیف کی تخلیق ہوئی۔ اس سے اگرچہ مذہبی طور پر اس عہد میں دو بڑے گروہ ظہور میں آکر متصادم ہوئے اور ایک دوسرے کو کافر بتاتے رہے، لیکن اس جھگڑا نے پشتو ادب میں تصنیف و تالیف کا ایک گراں قدر مجموعہ چھوڑا، جس نے پشتو کا دامن بھر دیا۔ اور آج پیر و خاں اور اخوند درویش بابا مسیح پشتو ادب کے دو بڑے رکن سمجھے جاتے ہیں۔“

(ادبیات سرحد ص ۱۵۳)

عہدِ شاہجہانی

قادریہ سلسلے کا فروغ

شاہجہاں

حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دونوں کا ستارہ پہلی تہذیب
عہدِ جاہانگیری میں چمکا اور ان کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے عہدِ جاہانگیری
کے مذہبی حالات اس زمانے کی مشہور شخصیتوں اور خود بادشاہ کے خیالات کا ذکر کیا ہے۔
جب جاہانگیر نے وفات پائی تو شاہجہاں تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں وہ ردِ عمل جو
اکبری طریق کار کے خلاف جاہانگیر کے عہدِ حکومت میں شروع ہوا تھا اور بھی قوی ہو گیا اور
اسلام اور شعائرِ اسلامی پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ جاہانگیر کے زمانے میں عام لوگوں
کے لیے درباری سجدہ برقرار تھا۔ شاہجہاں نے اسے موقوف کر دیا۔ وہ شرع کے
مطابق مقدمات فیصل کرتا اور علما و فضلا کا بھی بڑا قدر دان تھا۔ نماز روزے کا پابند تھا۔
بلکہ اگر درباری موخر غول کے پُرجوش اندراجات پر اعتماد کیا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ
شاہجہاں کو نہ صرف نیک پابندِ شریعت مسلمانوں بلکہ مجددِ دین ملت میں سے شمار کرتا
چاہیے! بادشاہ نامہ میں لکھا ہے:-

سنتِ سننیہ الہی براں جاری است کہ ہر گاہ کاہِ دین رو بہ اندر اس نہد و شعائر
اسلام رخ بہ انظار اس۔ بتائید ایزدی کیے از بندگان سعادت اندوزیدے کار آید تا
بہ آبیاری مساعی جمیلہ گرد و فتور از مساحت اسلام فرو نشاند و بدست یاری دین پروری
و دیانت داری اساس شریعت را مشید گردانند و چوں معابد اسلام رو بہ اندام
نہادہ بود و مبنائی شریعت رخ بہ اندام۔ از دیو کار ساز این بادشاہ اسلام نواز کفر
گذر را از بنگ آراے اقبال گردانید۔ بنیاد اسلام را چنان محکم و مرموص ساخت
کہ تا روز نشور گرد و فتور بر دامن دوام نہ نشیند۔

اکبر اور جہانگیر کے مقابلے میں شاہجہاں کو امورِ اسلامی کا زیادہ خیال تھا، لیکن اس نے نہ سمجھتا چاہیے کہ تمام ملک سے مذہبی بے قاعدگیاں دُور ہو گئی تھیں۔ ہم جہانگیر کی نسبت لکھ چکے ہیں کہ اس نے راجپوتوں (کشمیر) کے مسلمان راجپوتوں کی خلافِ اسلام رسمیں بند کرنی چاہیں لیکن عہدِ شاہجہاں کے واقعات پڑھیں تو پتا چلتا ہے کہ شاہی احکام کے باوجود یہ بھی بے قاعدگیاں برقرار تھیں۔ بادشاہ نامہ میں ۱۶۳۳ء کے واقعات میں لکھا ہے۔ (ترجمہ)

”اسی دوران میں خدمتِ شاہی میں عرض ہوا کہ علاقہ بھنبہر کے مسلمان اپنی جہات کی بنا پر ہندو کو بیٹیاں دیتے اور ان سے بیٹیاں لیتے ہیں اور یہ طے کر لیا ہے کہ جو ہندو لڑکی مسلمان سسرال میں مرے، وہ دفن کی جائے اور جو مسلمان لڑکی ہندوؤں کے گھر فوت ہو وہ جلائی جائے۔ دربارِ شاہی سے حکم ہوا کہ جس ہندو کے گھر میں مسلمان عورت ہو۔ اگر وہ مسلمان ہو جائے تو عورت سے اس کا نکاح دوسری بار پڑھا جائے ورنہ مسلمان عورت کو اس سے جدا کیا جائے۔ چنانچہ جو کوزمیتدار جس سے یہ فعل سرزد اپنے تمام قبیلے کے ساتھ مسلمان ہوا اور راجا دوتمند کے خطاب سے سرفراز ہوا.... جب بادشاہ کی سواری پنجاب کے قصبہ گجرات میں پہنچی تو وہاں کے سادات و مشائخ نے عرض کیا کہ وہاں کے بعض ہندوؤں نے مسلمان عورتیں گھروں میں ڈال رکھی ہیں۔ (حرائر و امائے مومنہ در تصرف دارند) اور ان میں سے بعض نے تو مسجدوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس پر شیخ محمد گجراتی کو جو علومِ رسمی سے واقف تھا اور نو مسلموں کا داروغہ مقرر ہوا تھا، حکم ملا کہ ثبوت کے بعد مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضہ سے نکالے۔ اور مسجدوں اور غیر مسلموں کی عمارتوں کو علیحدہ علیحدہ کرے۔ چنانچہ شیخ نے نہ مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضے سے نکالا۔ اور جہاں جہاں مسجدوں پر ہندوؤں نے بیجا تصرف کر لیا تھا۔ تحقیق کے بعد انھیں واکزار کر دیا اور غیر مسلموں سے جرمانہ لینے کے بعد مسجدوں کو بحال کیا۔“

لہ علاقہ آزاد کشمیر میں ہے۔ اور گجرات سے بہت دُور نہیں۔

لیکن مذہبی بے قاعدگیاں بہت غیر مسلموں کے متعلق نہ تھیں۔ ملک کے دور دراز
جنتوں میں مسلمانوں میں بھی عجیب و غریب اعتقادات رواج پا رہے تھے۔ خانی خاں
۱۶۲۹ء کے ضمن میں لکھتا ہے (ترجمہ)

’صوبہ کابل کی خبروں اور وہاں کے گورنر لشکر خاں کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ
افغان آئین شرعی کی بالکل پیروی نہیں کرتے۔ بلکہ انھوں نے ایک گمراہ پیر کے احکام
کو آیت و حدیث کا درجہ دے کر لحدِ دن کے طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ وہ بیویوں سے
شرعی طور پر نکاح نہیں کرتے بلکہ ایک گائے یا بیل کو ذبح کر کے اپنے ہم مشربوں کی
صیافت کرتے ہیں اور اس کے بعد بغیر کسی عقد و نکاح کے تعلقات ازدواجی شروع
کر دیتے ہیں۔ طلاق کے لیے وہ تین سنگریزے عورت کے ہاتھ دے دیتے ہیں اور
اسے گھر سے باہر نکال دیتے ہیں۔ بیوہ عورتیں ان کے رواج کے مطابق ترکے میں
داخل ہیں اور میت کے وارث کو حق ہوتا ہے خواہ وہ ان سے نکاح کرے یا کسی کے
پاس نہ آیا فروخت کر دے۔ جو بد نصیب مسافر اس سرزمین میں جا پہنچتا ہے اسے
یہ لوگ شکارِ حلال سمجھتے ہیں اور اسے بیچ کر آمدنی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ یہ لوگ میت کے
ورثہ میں سے بیٹیوں کو کوئی حصہ نہیں دیتے اور قتل و انتقام اور رابزنی میں ایک دوسرے
سے بازی لے جانے کو بڑی خوبی سمجھتے ہیں۔“

اس پر حکم ہوا کہ ”احکام تورہ و شریعت“ کے مطابق ان لوگوں کو زجر و تنبیہ کی جائے
چنانچہ بڑی تاکید کے بعد جس میں کسی دفعہ فساد و بلبوے کی نوبت آئی۔ آہستہ آہستہ ان
لوگوں کی بدعتیں کم ہوئیں۔ لیکن بالکل رفع بھی نہ ہوئیں اور خانی خاں ۱۵ سال کے
بعد لکھتا ہے ”اب بھی ان بدعتوں کے آثار اس قوم میں باقی ہیں۔“

خانی خاں نے تو یہ اندراج آج سے تقریباً ڈھائی تین سو سال پہلے لکھا تھا، لیکن
عجب نہیں کہ اب بھی تحقیق و تفتیش سے کام لیا جائے تو شاید ان بدعتوں کے آثار
صرف اسی قوم میں نہیں بلکہ اسلامی ہندوستان کے بعض اور جنتوں میں بھی نظر آجائیں۔
ان ظاہری خرابیوں کے علاوہ ایک گہری بیماری توحید و جود کی ذریعے

راہ پارہی تھی۔ حضرت مجدد الف ثانی نے عہدِ جہانگیری میں لکھا تھا:-
 ”اکثر اہل اے اس وقت بعضے بہ تقلید و بعضے بحج و علم و بعضے دیگر بہ علم مترج بہ
 ذوق و بعضے بہ الحاد و زندقہ دست بدامن این توحید و جود و زودہ اند و ہمہ را از حق
 مے دانند و گردنہاے خود را از رقبہ شرعی بہ جیلہ مے کشائند و مدائیات و احکام
 شرعیہ مے نمایند و بایں معاملہ خوش وقت و خورسند اند و اتیاں اوامر شرعیہ اگر
 اعتراف دارند۔ طفیلے میدانشند۔ مقصود اصلی و راے شریعت خیال مے کنند۔
 حاشا و کلاً نعوذ باللہ سبحانہ من ہذا الاعتقاد السوء“

حضرت مجدد نے جس روحانی بد نظمی کا ذکر کیا تھا وہ عہدِ شاہجہانی میں بڑھ گئی اور جیساکہ
 ناظرین آئندہ صفحات میں دیکھیں گے نہ صرف مشائخ کے حلقے بلکہ اہل علم کی مجلسیں و شاہزادوں
 کے دربار و حدیث الوجود کی صداؤں سے گونج اٹھے۔

حضرت شیخ میاں میر قادری | حضرت شیخ عبدالحق محدث نے ابتدائے
 سلوک میں اُچ کے ایک قادری بزرگ
 سے فیض حاصل کیا تھا، لیکن تقویٰ و پرہیزگاری اور شریعت کی کشش نے انھیں آہستہ
 آہستہ ایسے سلسلے کی طرف کھینچ لیا جس میں اتباع شریعت پر قادریہ سلسلے سے زیادہ
 زور دیا جاتا ہے۔ وہ حضرت خواجہ باقی باللہ کے عزیز دوستوں میں سے تھے اور طبقات
 شاہجہانی کا مصنف لکھتا ہے کہ انھوں نے خواب میں خود حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی
 کا اشارہ پا کر حضرت خواجہ باقی باللہ سے نقشبندیہ سلسلے میں بیعت کی تھی۔

جس عمل سے شیخ عبدالحق متاثر ہوئے، اس کا اثر عہدِ جہانگیری میں دور دور
 پہنچا اور حضرت مجدد الف ثانی کی عالمگیر شخصیت نے اس زمانے میں نقشبندیہ سلسلے
 کو بے حد مقبول بنا دیا۔ لیکن ان کی زندگی میں ہی لاہور کے قرب میں ایک ایسا شیخ
 سلوک کی منزلیں طے کر رہا تھا، جس کے اثر سے پھر ایک بار قادریہ سلسلہ جھپک اٹھا۔
 یہ بزرگ شیخ میاں میر تھے، جنھوں نے قادریہ سلسلے کے ہندوستانی مرکز اُچ سے نہیں
 بلکہ اس طریقے کی ایک اور شاخ سے فیض حاصل کیا اور جن کو نہ صرف عوام الناس میں

بلکہ علمی اور درباری حلقوں میں اس قدر مقبولیت ہوئی کہ ان کے سامنے دوسروں کے چراغ مدھم پڑ گئے۔ آپ حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادے خواجہ محمد مصوم کے ہم عصر تھے، لیکن عہد شاہجہانی کی عام ملکی تاریخیں دیکھیں تو حضرت میاں میر کے متعلق طویل اندراجات ملیں گے اور خواجہ محمد مصوم کی نسبت کہیں ایک آدھ سطر بلکہ اس زمانے کی بعض مشہور تاریخیں (مثلاً عمل صالح - بادشاہ نامہ - منتخب اللباب) تو خواجہ صاحب کے ذکر سے یکسر عاری ہیں اور اس کی وجہ یہی خیال میں آتی ہے کہ خاص خاص حلقوں سے قطع نظر جو رنگ عہد شاہجہانی میں مقبول تھا، وہ قادری تھا۔ نقشبندی نہ تھا اور اس زمانے کے سب سے بااثر شیخ حضرت میاں میر ہی تھے۔

حضرت شیخ میاں میر بالا پیر قدس سرہ کا اصل نام میر محمد تھا۔ وہ سندھ کے قدیم شہر سہوان میں پیدا ہوئے۔ قاضیوں کے خاندان سے تھے، جس میں علم و فضل کا بڑا چرچا تھا۔ سات سال کے تھے کہ شفقت پدیری سے محروم ہو گئے، لیکن علوم دینی آپ نے اچھی طرح حاصل کیے اور آپ کی والدہ ماجدہ نے خود آپ کو سلسلہ قادریہ میں تعلیم دی۔ اس کے بعد علائق دنیا سے منہ موڑ کر آپ شیخ حضرت سید ستانی کے مرید ہو گئے جو سہوان کے باہر ایک پہاڑ پر قیام فرما تھے۔ پچیس سال کی عمر میں لاہور آئے اور یہاں ریاضت و عبادت اور تلقین و ہدایت شروع کی۔

آپ قدیم طرز کے صوفی بزرگوں میں سے تھے جو فانی اللہ ہوتے ہیں اور شرع کی ترویج پر اس قدر زور نہیں دیتے۔ جس قدر عبادت و ریاضت پر۔ آپ عبادت الہی میں اس طرح منہمک رہتے تھے کہ زاویہ خمول سے باہر نہ نکلتے اور چالیس سال تک اہل لاہور کو بتا بھی نہ ہوا کہ اس پائے کا ایک بزرگ ان کے درمیان موجود ہے آپ وحدت الوجودی فلسفے سے خاص محبت تھی۔ چنانچہ عمل صالح میں لکھا ہے "و اکثر عبارات فتوحات کی شیخ الموحیدین ابن عربی بخاطر داشتند و صفحہ صفحہ شرح فصوص الحکم حضرت مولوی جاتی را از برے خواندند" آپ نے تمام عمر شادی نہیں کی۔

آپ کی وفات ۱۶۳۵-۳۶ء میں ہوئی۔ مزار لاہور سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک

گافوں میں ہے جو اس مزار کی بنا پر میاں میر کہلاتا ہے۔ داراشکوہ جس نے آپ کے اور آپ کے ممتاز خلفائے تفصیلی حالات سکینۃ الاولیاء میں لکھے ہیں آپ کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے مزار کے لیے مسالہ جمع کیا۔ لیکن تعمیر کی نوبت نہ آئی تھی کہ قضا و قدر نے اس کا تختہ الٹ دیا۔ مزار کچھ عرصہ نامکمل رہا۔ پھر چند سال بعد اور رنگ زیب خود مزار پر آیا اور اس کی تکمیل کا حکم دیا۔ مزار کے قریب ایک شکستہ بارہ دری ہے جس میں داراشکوہ کی رفیق حیات نادرہ کی قبر ہے۔

حضرت میاں میر کو اپنے زمانے میں بڑا فروغ حاصل ہوا تھا۔ جہانگیر ان کی نسبت تزک جہانگیری میں لکھتا ہے۔

”چوں بجز رسید کہ در لاہور شیخ محمد میر نام درویشے است ہندی الاصل بغایت قاضی و متراض و مبارک نفس صاحب حال در گوشہ توکل و عزلت منزوی گشتہ از فقر غنی و از دنیا مستغنی شستہ است۔ بنا بریں خاطر حق طلب لیے ملاقات ایشان قرار نگیرد و بدینک ایشان رغبت افزود۔ چوں یہ لاہور رفتن متعذر بود رقعہ بخدمت ایشان نوشتہ: شوق باطن را ظاہر مانحتم و آن عزیز باوجود کبر و عنف بیہ تصدیع کشیدہ تشریف آورد و مدت ممتد تنہا با ایشان شستہ صحبت مستونی داشتہ شد۔ الحق ذات شریف است و دریں عہد بغایت غنیمت و عزیز الوجود ہیں نیازمند از خود برآمد با ایشان صحبت داشت و بسا سخنان بلند از حقائق و محارف استماع افتاد۔ ہر چند خواستم نیاز سے بگذرانم۔ چوں پایہ ہمت ایشان را از ان عالی تر یافتم۔ خاطر باظہار این مطلب زحمت نداد۔ پوست آہر سفید بخت جلسے نماز با ایشان گزرا نیدم۔“

اس کے بعد حضرت لاہور واپس چلے گئے۔ لیکن جہانگیر نے ان سے خط و کتابت جاری رکھی اور اس کے دو خط سکینۃ الاولیاء میں نقل ہوئے ہیں۔

شاہجہان بھی حضرت کا بڑا معتقد تھا۔ وہ دو دفعہ حضرت سے ملا۔ بادشاہ نامہ میں ایک ملاقات کی نسبت لکھا ہے۔ (۲۸ دسمبر ۱۶۳۴ء)

خدیو خدا آگاہ، بکاشانہ رفیع، آشیانہ پیشوا سے ارباب صفوت و صفائے اصحاب
محرف و تقی۔ قد وہ حق شناسان صافی ضمیر میاں میر کہ پیشتر نیز قدم سعادت لزوم
مہبط انوار گشتہ بود تشریف فرمود و بگذارش بساد قائل حقائق و خواص معارف
باعث انشراح صدور و انبساط قلب آن زاویہ نشین تجرد گزین گشتند۔

معلوم ہوتا ہے۔ شاہجہاں آپ کا بڑا قائل ہو گیا تھا۔ عمل صالح میں لکھا ہے۔
حضرت بادشاہ حقائق آگاہ بہ نحوے شیفۃ صحبت آن مقتدے اصحاب عرفاں
شدند کہ مزید سے برآں متصور نہ باشد۔ چنانچہ بارہا اطوار محمودہ و احوال ستودہ ایشان
ستودہ می فرمودند کہ از مشائخ متصوفہ ایں کشور میاں میر را کامل تر یافتہ۔ و
از ایشان گزشتہ شیخ المشائخ شیخ فضل اللہ۔

داراشکوہ کا بیان ہے کہ بیس سال کی عمر میں میں اس طرح بیمار ہوا کہ اطباء میرے علاج
سے عاجز آگئے۔ بادشاہ مجھے لے کر حضرت کے گھر گیا اور کہا کہ یہ میرا بڑا لڑکا ہے۔
معالج اس کا علاج نہیں کر سکے۔ آپ ہی اس پر توجہ کیجیے۔ حضرت نے پانی کا ایک پیالہ
منگوا یا اور اس پر دم کر کے داراشکوہ کو پینے کے لیے دیا۔ داراشکوہ کہتا ہے کہ اسی ہفتے
مجھے صحت ہو گئی اور میری بیماری بالکل جاتی رہی۔

داراشکوہ نے حضرت میاں میر اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی (جو حضرت مجدد کے
مُرید تھے) ایک گفتگو کا ذکر کیا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ حضرت میاں میر اور
مجدد یہ طریقہ کے بزرگوں میں اختلاف نمودار ہو رہے تھے۔ اس گفتگو کے وقت بادشاہ بھی
موجود تھا اور حضرت میاں میر اسے خدا تک پہنچنے کے طریقے بتا رہے تھے۔ اس ضمن میں
انھوں نے کہا کہ جب سالک پر عالم ملکوت کشف ہو جاتا ہے تو ہم اسے جنگلوں میں بھیج
دیتے ہیں تاکہ وہ تنہائی میں یاد الہی کرے۔ اس پر ملا عبدالحکیم نے اعتراض کیا کہ اس طرح تو
نماز باجماعت فوت ہو جاتی ہے۔ حضرت میاں میر نے اس کا مناسب جواب دیا۔
لیکن اس اعتراض اور جواب سے بھی خیال ہوتا ہے کہ شرع کی غیر مکمل پابندی کی نسبت
جو اعتراض مجددیوں کو قادریوں پر تھے اور جنھوں نے آگے چل کر داراشکوہ اور عالمگیر

کی مخالفت کو چکا دیا وہ حضرت میاں میر کے زمانے میں ہی رونما ہو رہے تھے۔

ملاشاہ قادری | داراشکوہ حضرت میاں میر پر فریفتہ تھا اور انھوں نے اس کے روحانی ذوق و شوق کو ترقی دی، لیکن جس وقت داراشکوہ نے بیعت کا ارادہ کیا (۹۷۰ھ) اس وقت حضرت میاں میر وفات پا چکے تھے اور اس نے بیعت اُن سے نہیں، بلکہ اُن کے خلیفہ شاہ محمد المعروف ملاشاہ قادری سے کی جو علاقہ بدخشاں کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، لیکن ابتدائے شباب میں ہی کشمیر آگئے اور وہاں سے لاہور آکر حضرت میاں میر کے مُردہ ہوئے۔ چونکہ لاہور کی گرمی آپ کے ناز و نیاز جسم کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس لیے آپ مُرشد کی اجازت سے موسم گرما میں کشمیر تشریف لے جاتے، جہاں داراشکوہ اور جہاں آرا نے آپ کے لیے دامن کوہ ایک شاندار خانقاہ تعمیر کرا دی تھی۔ اور موسم سرما میں (جب تک مُرشد زندہ رہے) لاہور آجاتے۔ تذکرہ نگار آپ کی ریاضتوں اور مجاہدوں کا اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ حیرانی نہوتی ہے۔ داراشکوہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ شروع میں آپ نے سات سال تک عشاء کی نماز کے بعد سے صبح تک مجلس نفس سے ذکرِ خفی کیا ہے۔ ایک اور جگہ کہتا ہے۔ (ترجمہ) آپ کی ریاضتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اب ۱۵۷۰ھ تک تیس سال سے کچھ اُوپر آپ نے ایک لمحہ اور ایک لمحہ بھی نیند نہیں کی۔

ان غیر معمولی ریاضتوں کے وجہ سے آپ کی شخصیت میں بڑی کشمکش اور بات میں بڑی تاثیر پیدا ہو گئی تھی۔ بن دنوں آپ کشمیر میں تھے، وہاں شیعہ سُنی اختلافات پورے برپا تھے۔ آپ ہر مجلس چاروں خلفاء کی تعریف کرتے۔ مخالفین بحث و مناظرہ کے لیے آتے، لیکن آپ اس خوش اسلوبی سے پیش آتے اور آپ کی بات میں اتنی تاثیر تھی کہ وہ قائل ہو جاتے۔ کہتے ہیں کہ کئی ہزار مخالف آپ کی وجہ سے اہل سنت ہو گئے۔ تصوف میں آپ کا طریقہ وحدت الوجود کا تھا۔ دوسرے مذاہب کے ہم مشرب لوگوں سے ملنے سے آپ کو احتراز نہ تھا اور بسا اوقات ان پر نیک اثر ڈالتے۔ چنانچہ ایک

کائنات کی نسبت جو ولی رام کے نام سے مشہور ہوا کہتے ہیں کہ وہ پہلے مغلیہ حکومت کے تابع ایک برہمن اقتدار امیر تھا۔ داراشکوہ اور ملاشاہ کے فیض صحبت سے عشق الہی و امنگیر ہوا اور سب جاہ و مال ترک کر کے شیخ ملاشاہ کے ہاتھ پر بیوی و بچہ و دولت میں اس کی نسبت لکھتا ہے۔ در کشمیر خدمت ملاشاہ بدخشی رسیدہ کامیاب شناخت گشت و بخت عناصہ الصوفی لاندہرب نہ بقید ہیچ دین و آئین باز نہ لیستہ۔ بابت بیت خانہ آشناست و از مسجد بریگانہ نیست۔ اسی کتاب میں ولی رام کے بعض شعر درج ہیں۔

مانہ آن خودیم، آن توایم	بے نشانی تو مان نشان توایم
این نشانها نشان ذات تواند	منظر جلوه صفات تواند
پاکی از فکر و از قیاس	اے تو پیدا دریں لباس
منظر ذات تو ہمہ اشیا	بے تو و ما توئی، و خود تو و ما
ذات تو در صفات تو پیدا	صفت عین ذات اے مولا
ما ہمہ ہیچ، ہر چہ ہست توئی	اے منزہ ز فہم و درہم دوئی
ما ہمہ موج بحر ذات توایم	منظر مجمل صفات توایم

داراشکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں ملاشاہ کے کلام سے جو انتخاب دیا ہے اس میں بھی وہی وحدت الوجودی رنگ جھلکتا ہے جو ولی رام کے اشعار میں ہے۔ ملاشاہ کی ایک غزل کے چند اشعار ہیں۔

حرف دیوانگی است در دل ما	چہ زندہ سر و ازین گل ما
وہ تماشاں فرضہا ہمہ رفت	چیت پر سیدن از نوافل ما
رؤئے او در مقابل مرآت	رؤئے ما بود در مقابل ما
در رہ عشق آنکہ مارا گشت	خیر ما کس نبود قاتل ما
وصل داد این خبر کہ غیر کے	نیت موصول ما واصل ما
از سر اتھاو این برخاست	میل ما دوست دوست ما
ما کہ جز حق نہ ایم از عرفاں	پس چہ پرسی ز حق و باطل ما

ایک اور جگہ کہتے ہیں :-

بُردِ دیم بسرِ نزو و لا بد را رفتیم تمام رہ بود و شد را
شد تا مطلب مقابل آئینہ دل دیدیم در آئینہ جمال خود را

ایک اور رباعی ہے :-

آزما کہ بجاست بر سرِ پیاں جنگ او مومن و ایمان من اور اصدنگ
مومن نشود تا کہ برابر نشود بابانگ نماز بانگ ناقوسِ فرنگ

آخری شعر میں ملا شاہ نے جس خیال کا اظہار کیا ہے۔ اسی پر داراشکوہ نے عمل کیا اور دوسرے مذاہب بالخصوص ہندو ویدانتیوں کی کتابوں میں حقیقت کی اس طرح تلاش کی کہ گویا وہ اس کے اپنے طریقے کی کتابیں ہیں اور اسلامی تصوف اور ویدانت میں ہم آہنگی ثابت کی۔

بعض دفعہ تو ملا شاہ کی وارستہ گوئی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اعتراض کی زبانیں بے محابا کھل جاتیں۔ ایک دفعہ اس نے ایک شعر لکھا (نقل کفر کفر نباشد) :-

پنجرہ در پنجرہ خدا دارم
من چہ پر وائے مصطفیٰ دارم

اس پر علمائے کشمیر نے ملا شاہ کے کافر اور واجب القتل ہونے کا فتویٰ دے کر شاہجہاں سے استعفا کی کہ وہ اس کے خلاف حد شرعی جاری کرے شاہجہاں نے علمائے اتفاق کیا اور کشمیر کے گورنر ظفر خاں کے نام فرمان لکھا جا چکا تھا مگر داراشکوہ نے سفارش کی کہ اس معاملے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے اور کسی اور بزرگ مثلاً حضرت میاں میر سے استصواب کیا جائے۔ بادشاہ نے یہ بات قبول کر لی اور حضرت میاں میر سے ملا شاہ کے بارے میں دریافت کیا حضرت میاں میر نے فرمایا کہ احوال کے تابع ملا شاہ ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جن سے پرہیز واجب ہے، لیکن اُسے ان کی بنا پر قتل کرنا نامناسب اور ناموزوں ہوگا۔ بادشاہ نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور ملا شاہ کے خلاف قدم نہ اٹھایا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد جب ۱۶۳۹ء میں شاہجہاں کشمیر آیا تو اس نے ملا شاہ کو بلایا

اور دیر تک اس سے صوفیانہ مسائل کی نسبت گفتگو رہی۔ بادشاہ نامہ میں حکم
جمادی الثانی ۱۰۵۰ھ روز سہ شنبہ کے بیان میں لکھا ہے :-

”در تاریخ مذکور خواص تجہ توحید ملاشاہ بدخشی کہ میں خلیفہ مصباح سبل ہدایت
مفتاح البواب ولایت میاں میر قادری است و در نزہت گاہ کشمیر برسم انزوا
بسرے برزہ حسب الطلب بادشاہ درویش نواز بشرف حضور محفل فیض منزل کہ وسیلہ
دریافت مآرب دینی و ذریعہ ادراک مطالب معنوی است رسید و بسا نکات بلند
دران صحبت فیض منقبت گزارش یافت۔ پادشاہ حق آئمہ و باقسام تلمظ مہربانی
آں ایندہ پرست را منبسط ساختہ مرخص گردانید۔“

اسی سال داراشکوہ اور اس کی بہن جہاں آرا ملاشاہ کے حلقہ بیعت میں آئے۔
ملاشاہ اپنے شاہی مرید کے ذوق و شوق سے بڑے خوش تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ
عزیز قادریہ سلسلے کو فروغ دے گا۔

کچھ عرصہ بعد حالات نے پٹا لکھایا اور داراشکوہ کو شکست دے کر ۱۰۵۸ء میں
تخت شاہی پر اورنگ زیب متمکن ہوا۔ اب علمائے پھر ملاشاہ کے خلاف آواز اٹھائی
چنانچہ دارالخلافہ سے ملاشاہ کی طلبی کا پروانہ جاری ہوا، لیکن ملاشاہ ان دنوں کمزور
اور بیمار تھا۔ اس لیے کشمیر کے گورنر نے لکھا کہ اس وقت شیخ سفر کے ناقابل ہے۔
بحالی صحت پر حاضر ہوگا۔ اس طرح کچھ وقت گزر گیا اور اس دوران میں ملاشاہ کے
مندرجہ ذیل اشعار جو اس نے اورنگ زیب کی تخت نشینی پر لکھے تھے اورنگ زیب
پہنچے۔ وہ اشعار حسب ذیل ہیں :-

صحن دل من چوں گل خورشید شگفت کا مد حق و غبار باطل رفت
تاریخ جلوس شاہ حق اگر را ظل الحق گفت الحق این را حق گفت

اس کے بعد اورنگ زیب نے اپنا پہلا حکم منسوخ کر دیا اور فقط یہی لکھا کہ ملاشاہ بجائے
کشمیر کے لاہور میں قیام کرے۔ چنانچہ ۱۰۶۰ء کے موسم سرما میں شیخ نے نقل مکان کیا اور
لاہور میں سکونت اختیار کی۔ اب اس کی عمر بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ

نئے حالات کی بنا پر اس نے گوشہ نشینی اختیار کی اور آمد و رفت کا دروازہ خلعت سلیے بند کر دیا۔ فقط چند مخلص معتقد اور مرید گاہے گاہے ملتے اور شیخ ان کے ساتھ اپنے رفعتی تجربات کا بیان کرتے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے حاشیہ نشینوں کو شاہی معتقدوں کے خواب ابھی نہ بھولے تھے۔ ایک دفعہ اس کے ایک دوست کابل خاں نے کہا۔ قدیم زمانے میں اورنگ زیب تصوف کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ اور مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں اس کی خدمت میں مثنوی مولانا روم پڑھا کرتا تھا تو وہ بعض بند سن کر آنسو بہا یا کرتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ جب وہ لاہور آئے گا تو آپ سے ملنے کی خواہش کرے گا۔ لیکن شیخ نے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ ”اورنگ زیب کی اور میری ملاقات کبھی نہ ہوگی۔“ اس کے کچھ عرصہ بعد شیخ عارضہ بخار میں مبتلا ہوا اور اگرچہ اس وقت صحت ہو گئی، لیکن چند روز بعد مرض کا پھر حملہ ہوا اور ۱۶۹۱ء میں ۱۰ اکتوبر کو شیخ نے انتقال کیا۔

اس زمانے کی ایک دلچسپ ہستی سرد ہے جسے اوائل عہد عالمگیری میں **سرد** سزاے موت دی گئی۔ مذہبی تاریخ کا ایک دلچسپ موضوع ہونے کے علاوہ وہ ہندوستان کی ادبی تاریخ میں بھی ایک باعزت جگہ کا مستحق ہے۔ اس کی رباعیات بڑی پُر لطف ہیں اور جب اُس کے با اثر اور پُر خلوص اشعار کا متاخرین کے کلام سے مقابلہ کرتے ہیں جو محض آفرینی اور نازک خیالی کی بھول بھلیاں میں گرفتار تھے تو خیال ہوتا ہے کہ اگرچہ اسے غنی اور ناصر علی سرہندی کی ادبی شہرت حاصل نہیں ہوئی، لیکن اس کا مختصر مجموعہ کلام اس زمانے کے دوسرے شعرا کے کلام سے زیادہ شیریں اور صحیح شاعرانہ نقطہ نظر سے زیادہ باوقوت ہے۔

سرد کے حالات پر مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور مولانا محمد حسین آزاد نے بھی نگارستان فارس میں چند صفحے اس کے لیے وقف رکھے ہیں۔ دونوں نے تذکرہ نگاروں کی کم نویسی کی شکایت کی ہے۔ شمس العلماء آزاد لکھتے ہیں۔ ”نام اس کا کسی کتاب سے معلوم نہیں ہوتا۔“ مولانا آزاد بھی کہتے ہیں ”خانلانی نام کا پتا

نہیں چلتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبول اسلام کے بعد کیا نام رکھا۔ لیکن وہ اس خیال سے کہ بعض تذکروں میں سرمد کے حالات سعیدائے سرمد کے عنوان سے درج ہیں، قیاس کرتے ہیں کہ اسلامی نام کا ایک جزو شاید لفظ سعید ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دبستان مذاہب کا اندراج ہر دو مصنفین کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس کتاب کا مصنف سرمد کا معاصر اور عزیز دوست تھا اور دونوں آزاد خیالوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو شہزادہ داراشکوہ کے گرد جمع ہو گیا تھا۔ چنانچہ دبستان میں سرمد کے حالات کسی قدر تفصیل سے درج ہیں۔

دبستان میں لکھا ہے کہ سرمد اصل میں یہودی تھا اور یہودیوں کے اس معزز طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ جنہیں ربی کہتے ہیں۔ یہودی عقائد اور تورات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وہ مسلمان ہو گیا اور ایران کے مشہور فضلاء مثلاً صدر اور میراوا القاسم اندرکی کی خدمت میں حاضر ہو کر حکمت و فلسفہ کی تکمیل کی۔ اس کے بعد تجارت کی غرض سے ہندوستان کو روانہ ہوا۔ سندھ کے مشہور مقام ٹھٹھہ میں پہنچا تھا کہ وہاں ابھے چند نام ایک ہندو بچے کو دیکھا اور مال و متاع کے ساتھ سب حکمت و فلسفہ بلکہ عقل و تمیز کھو بیٹھا اور ترک لباس کر کے سنیا سیلوں کی طرح محشوق کے در پر دھونی رانی۔ جب ابھے چند کے والد نے دیکھا کہ سرمد کی محبت پاکہ۔ اور خیالات جسمانی سے منزہ ہے تو اس نے سرمد اور اپنے بیٹے کے تعلقات میں روڑے نہ اٹکائے۔ ابھے چند نے سرمد سے تورات اور انجیل اور دوسری مذہبی کتابیں پڑھیں اور فارسی شعر گوئی بھی شروع کر دی۔ چنانچہ یہ شعر جو اس زمانے کے روحانی رجحانات کا آئینہ ہے۔ اسی کا ہے ۵

ہم مطیع فرقا تم ہم کشیش و رہبانم
ربی یہودانم، کافر مملکت نام

۵۔ عام طور پر محسن فانی دبستان مذاہب کا مصنف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن تاثر الامر کے مطابق یہ کتاب ذوالفقار خاں اردستانی کی تصنیف ہے۔ (مقالات شبلی)

اس کے بعد کے واقعات دبستان میں تسلسل سے درج نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سرمد نے کچھ عرصہ حیدر آباد دکن میں بھی گزارا اور دبستان کے مصنف سے اس کی پہلی ملاقات ۱۸۶۲ء میں وہیں ہوئی۔

جس وقت دبستان مذاہب لکھی گئی۔ سرمد بقید حیات تھا۔ اور سرمد کے آخری ایام کے حالات اس کتاب میں نہیں ملتے، لیکن مصنف نے سرمد کے کئی اشعار اپنی کتاب میں درج کیے ہیں۔ رباعی

سرمد کہ زجام عشق مستش کردند خواندند سر فرازش و پشتش کردند
مے خواست خدا پرستی و شکاری مستش کردند و بت پرستش کردند
نعت رسول میں کہا ہے رباعی

اے از رخ تو شکستہ خاطر گل سرخ باطن ہمہ خون دل و ظاہر گل سرخ
زاں دیر بر آمدی زیوسف کہ بباغ اقل گل زرد آمد و آخر گل سرخ

فرد
در کعبہ و بیتخانہ سنگ نشد و چوب نشد یکجا حجر الاسود یکجا بت ہند و شد
ابھے چند نے جس کی وجہ سے سرمد نے ترک لباس کیا تھا۔ سرمد کی رفاقت اختیار کر لی تھی اور اس کے ساتھ حیدر آباد میں موجود تھا۔ چنانچہ جب دبستان کے مصنف نے اپنی کتاب کے لیے یہودی عقائد کی تفصیل چاہی تو ابھے چند نے تورات کے ایک باب (کتاب پیدائش Genesis) کے ابتدائی حصے کا فارسی میں ترجمہ کیا جو سرمد کی تصحیح اور نظر ثانی کے بعد درج کتاب ہوا۔

اس کے بعد سرمد شاہجہاں آباد آیا۔ یہاں داراشکوہ کو تصوف سے دلچسپی اور دیوانہ مزاج لوگوں سے خاص عقیدت تھی۔ چنانچہ سرمد نے اس کی مصاحبت اختیار کی اور بالآخر یہی صحبت اس کی موت کا باعث ہوئی۔ اس زمانے میں شاہجہاں تخت دہلی پر جلوہ افروز تھا۔ سرمد کی ولایت کا شہرہ سن کر اس نے عنایت خان آشنا کو بھیجا کہ سرمد سے ملے اور اس کی کشف و کرامات کا حال معلوم کرے۔ عنایت خان نے وہاں رہنگی کے سوا

کچھ نہ دیکھا اور واپس آکر یہ شعر پڑھا۔

بر سر مدبر ہمنہ کرامات تہمت بہت

کشف کہ ظاہر است از کشف عورت بہت

۱۶۵۸ء میں عالمگیر اورنگ نشین ہوا اور معاملات ملکی کو شرع کے قواعد پر ترتیب دینا شروع کیا۔ اس کے نزدیک سرمد کی برہنگی خلاف شرع اور لائق تعزیر تھی چنانچہ اس نے ملا عبد القوی کو بھیجا کہ سرمد کو کپڑے پہننے کی تاکید کرے۔ ملا نے سرمد کو بلا بھیجا اور پوچھا کہ تم برہنہ و عریاں کیوں رہتے ہو۔ سرمد پتا نہیں اس وقت کس لہر میں تھا۔ پکار اٹھا۔ کیا کروں شیطان قوی است اور ساتھ ہی رباعی پڑھی۔

خوش بالاسے کردہ چنیں پست مرا چشمے بزد و جام بردہ از دست مرا

اور در بغل من است و من در طلبش دزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا

ملا قوی کو شیطان قوی است کا فقرہ خاص طور پر کڑوا معلوم ہوا ہوگا، لیکن فقط برہنگی وجہ قتل نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے سرمد کی فرد جرم میں اور بھی اضافہ کیا گیا۔ قتل کا ایک بہانہ ذیل کی رباعی تھی جس کے متعلق کہا گیا کہ اس سے معراج کا انکار ثابت ہوتا ہے رباعی

آں کس کہ سر حقیقتش باور شد خود بہن تراز سپہر ہینا ور شد

ملا گوید کہ بر فلک شد احمد سرمد گوید فلک بہ احمد شد

معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کی محتاط طبیعت نے اسے بھی کافی نہ سمجھا اور علما سے کہا کہ سرمد سے کہا جائے کہ کلمہ طیبہ پڑھے۔ اسے معلوم تھا کہ سرمد کی عادت ہے کہ جب وہ کلمہ طیبہ پڑھتا ہے تو لا الہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ چنانچہ جب علما نے سرمد سے کلمہ طیبہ پڑھنے کے لیے کہا تو اس نے لا الہ سے زیادہ نہ پڑھا کہ کلمہ نفی ہے اس پر علما نے اعتراض شروع کیا تو سرمد نے کہا کہ ابھی تک نفی میں مستغرق ہوں۔ مرتبہ اثبات

نے دبستان مذاہب میں لکھا ہے کہ سرمد کہتا تھا کہ یہودی مذہب میں برہنگی عیب نہیں اور حضرت اشعیا بھی اخیر عمر میں برہنہ رہتے تھے۔

نہیں پہنچا۔ جب پہنچوں گا تو اللہ بھی کہوں گا۔ علمائے فتوے دیا کہ فقط لا الہ الا کہنا کفر ہے۔ اگر سرد تو بہ کرے تو ٹھیک ورنہ واجب القتل۔ سرد نے تو بہ نہ کی۔ چنانچہ دوسرے روز سرد کو قتل کے لیے جامع مسجد کے سامنے لے گئے۔ کہتے ہیں کہ قتل کے وقت سرد بڑا ہشاش بشاش تھا۔ جلد سامنے آیا تو اسے مسکرا کر کہا۔ ”فدائے تو شوم، بیابا کہ بہر صورتے کہ مے آئی۔ من ترا خوب مے شناسم“ یہ کہا اور ذیل کا شعر پڑھ کر تلوار کے نیچے گردن رکھ دی ۵

شورے شد وار خواب عدم دیدہ کشودیم
دیدیم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم
ماثر الامرا میں سرد کے اسباب قتل کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ اگر سچ پوچھا جائے تو قتل کا اصل سبب داراشکوہ کی مصاحبت تھی۔ ورنہ سرد جیسے برہنہ مجذوب اور آزادانہ گفتگو کرنے والے ہر گلی کوچہ میں پھرتے ہیں اور کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ اس دور کا ایک اور تذکرہ نگار لکھتا ہے۔

گویند کہ اوباداراشکوہ نیز سرے داشت و اکثر اوقات نیز بہائم عالمگیر مشغوف بود۔ لہذا بقتل رسید۔ واللہ اعلم بحقیقۃ حال۔

مولانا ابوالکلام آزاد بھی اسی خیال کی تائید کر کے لکھتے ہیں:-

”ایشیا میں ہمیشہ سے پالیٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے اور ہزاروں خونریزیاں جو پولیٹکس

اسباب سے ہوئی ہیں۔ انھیں مذہب کی چادر اڑھا کر چھپا یا گیا ہے۔“

سرخوش اپنے تذکرے میں لکھتا ہے کہ ایک دن میں اور ناصر علی سرہندی اور مرزا عبدالقادر بتیل جامع مسجد دہلی میں حوض کے کنارے بیٹھ کر شعر خوانی کر رہے تھے کہ سرد آیا ہمیں دیکھ کر مسکرایا اور یہ شعر پڑھا ۵

عمریست کہ افسانہ منصور کہن شد

من از سر نو جلوہ دہم دار در سن را

چنانچہ اس کے جلد ہی بعد قتل ہوا!

سرمند کی کئی پُر لطف رباعیات مختلف تذکروں میں ملتی ہیں۔

رباعی

سرمند غم عشق بوالہوس رانہ دہند سوزِ دل پروانہ نگس رانہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بکبتار ایں دولت سرمند ہمہ کس رانہ دہند

رباعی

سرمند گلہ اختصار مے باید کرد یک کار ازیں دو کار مے باید کرد
یاتن برضائے یار مے باید داد یا قطع نظر ز یار مے باید کرد

رباعی

سرمند تو حدیثِ کعبہ و دیر ممکن در کوچہ رشک چو گمراں سیر ممکن
رو را ہروی ز شیطاں آموز یک قبلہ گزریں و سجدہ غیر ممکن

دبستان مذاہب | دبستان مذاہب جس پر ہم نے سرمند والے مضمون کی بنیاد رکھی ہے۔ اس زمانے کی ایک محرکۃ الآراء تصنیف ہے۔ اس کے

مصنف کے بہت کم حالات معلوم ہیں یقین سے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کون تھا۔ کب پیدا ہوا اور کب اس دار فانی سے چل بسا، لیکن اس کی تصنیف سے اس کے خیالات اور رجحان طبع کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ مذہبی معاملات میں صلح کل اور آزاد خیال تھا اور اسے دوسروں کے عقائد و اطوار جاننے کا غیر معمولی اشتیاق تھا۔

اس نے دبستان مذاہب میں ایشیا کے تمام مشہور مذاہب کے خیالات اور عقائد جمع کیے ہیں، لیکن البرونی کی طرح کوشش کی ہے کہ کوئی ایسی بات نہ لکھی جائے جس کی مذہب متعلقہ کے ماننے والے خود تصدیق نہ کریں۔ نصف کے قریب کتاب پارسی مذہب عقائد اور مختلف پارسی فرقوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ قریباً ایک چوتھائی کتاب میں مختلف ہندو فرقوں کے حالات ہیں۔ ایک نہایت دلچسپ باب نانک پنچھیوں یعنی سکھوں کے حالات کے متعلق ہے۔ کتاب کا مصنف گوروہر گوبند کے جاننے والوں میں سے تھا۔ اس لیے اس نے ذاتی واقفیت کی بنیاد پر ایسے واقعات درج کیے ہیں جو

محاصرانہ تواریخی کتب میں عنقاہیں اور جن سے سکھوں کی ابتدائی تنظیمی کوششوں پر خوب روشنی پڑتی ہے۔

ایک باب میں ایسے متفرق فرقوں کے حالات درج ہیں جن کا نہ ہندو مذہب اور نہ اسلام سے کوئی خاص تعلق تھا اور جن کے عقائد دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ عوام بالخصوص خوش اعتقاد اور صوفی نما عوام کے خیالات میں اس وقت کھلبلی مچی ہوئی تھی جس کے عبرت آموز باب ہیراگیوں کے متعلق ہے۔ دبستان میں لکھا ہے کہ ان میں مسلمان بھی داخل تھے اور وہ دشمنوں کی پرستش کرتے تھے۔ ”از ہندو مسلم وغیرہم ہر کس خواہد بہ کیش ایشاں در آید۔ مانع نشوند۔ در پندیرند و گویند مسلمانان نیز بشن رائے پرستند۔ چہ بسم اللہ اس معنی وارے یعنی بشن و بسیم بشن را گویند۔ جو مسلمان ہیراگیوں میں شامل ہوئے تھے وہ محض جاہل، عوام الناس نہ تھے۔ ”جمعے کثیر از مسلمانان یکیش ایشاں در رفتہ اند۔ مانند مرزا صالح و مرزا حیدر کہ از نجائے مسلمانند و ہیراگی شدند۔“

کتاب کے رُبع آخر میں اختصار سے عیسائی، یہودی، بودھ مذہب اور مختلف مسلمان فرقوں (مثلاً سنی، شیعہ، صادقہ، پیروانِ مسلمانہ کذاب) کا حدیدہ۔ روشنیہ۔ (پیروانِ دین الہی) کے خیالات درج کیے ہیں۔ دین الہی کے متعلق جو واقعات لکھے ہیں وہ زیادہ تر بدالوئی سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں مختلف مذہبوں اور فرقوں کے درمیان ایک مباحثہ درج کیا ہے جو خیالی ہے اور مصنف کے اپنے دماغ کی تخلیق اس مباحثے کے دوران میں شیعہ، سنی، یہودی، نصرانی، اور ہندو عقائد پر بہت کڑے اعتراضات ہوتے ہیں اور سب مذاہب متداول کے ترجمان لاجواب ہو جاتے ہیں۔ اور حکیم فلسفی جو حضرت عقل علیہ السلام کا محقق ہے۔ سب پر غالب آجاتا ہے۔ اس بحث سے خیال ہوتا ہے کہ مصنف کسی مذہب کے وابستہ نہ تھا اور ایک آزاد خیال صوفی تھا۔ ایک مستقل باب میں اس نے ارشادات قرآنی اور اہم احادیث کی تاویل کیے انھیں عقائد حکما کے مطابق ثابت کیا ہے۔

آخری باب میں چند ایسے بزرگوں کے حالات ہیں جن سے مصنف کی ملاقات

ہوئی تھی۔ سب سے پہلے داراشکوہ کے مُرشد حضرت ملاشاہ بخشی کا ذکر ہے اور اس سلسلے میں داراشکوہ کو حضرت محی الدین محمدؒ خداوندِ مَکان و مَکس و صاحبِ زبان و زبیں کا خطاب دیا ہے۔ جہاں آرا بیگم کا ذکر بھی بڑے احترام سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ حضرت ملاشاہ کی غائبانہ مرید تھی۔ ”و دیگر مریم روزگار۔ فاطمہ زماں و اعصارِ عفت عنصر۔ عصمت پیکر۔ جہاں آرا بیگم بنت ابوالنظر شہاب الدین محمد صاحبِ قرآن ثانی امیر المسلمین شاہ جہاں بادشاہ غازی غائبانہ بفرمانِ حضرت ملاشاہ بحضورِ دل و رُسلوک آورده و کامیاب شناخت نام گشت“ اپنی نسبت ایک جگہ لکھتا ہے۔ بریں فقیر از برکت شیخ خود غوث الافاق، استاد اہل اللہ، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ (ملاشاہ) سلمہ اللہ و ابقاہ، ہچو آفتاب روشن گشتہ۔“ اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ بھی ملاشاہ کا مرید تھا اور آزاد خیال صوفیوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو داراشکوہ اور اس کے مُرشد ملاشاہ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

شیخ محبوب اللہ آبادی | اب تک ہم نے اس باب میں جن بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ باقاعدہ قادریہ سلسلے سے وابستہ تھے لیکن ان سے باہر بھی کئی بزرگ تھے جو شاید اس سلسلے میں مُتسلک نہ تھے، لیکن جن کے خیالات میں ملاشاہ اور داراشکوہ کی آزاد خیالی اور وسعتِ مشرب کی جھلک ملتی ہے۔ ان میں سے ایک خاص رنگ اور شان کے بزرگ شیخ محبوب اللہ آبادی تھے جو علومِ ظاہری و باطنی کے جامع تھے اور جن کی نسبت تذکرہ علماء ہند میں یہاں تک لکھا ہے کہ ”تحقیقات و تدقیقات در علم تصوف بدرجہ اجتہاد رسیدہ بلکہ مے رسد کہ شیخ محی الدین ابن العربی را شیخ اکبر و دوسے را شیخ کبیر گویند“ داراشکوہ آپ کا بڑا مداح تھا۔ بلکہ وہ ایک خط میں آپ کو لکھتا ہے کہ اللہ آبادی کی گورنری سے مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ سے ربط ضبط ہو سکے گا۔

ایک مرتبہ داراشکوہ نے آپ سے اُس مسئلے پر استفسار کیا جو عہدِ اکبری سے ہندوستان میں اسلامی سیاسیات کا ایک اہم مسئلہ بن گیا تھا۔ یعنی آیا حکومت کو

تمام رعایا کا مساوی خیال رکھنا چاہیے یا مومن اور کافر میں تمیز کرنی چاہیے۔ اس کا اپنے جواب لکھا، اس سے آپ کے طبعی رجحانات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور یہ وہی جواب تھا جس سے ابوالفضل کے رقعات اور اکبر کے فرامین پڑھنے والے بخوبی واقف ہیں فرماتے ہیں:-

”حق آنست کہ اندیشہ بر فہمست خلق دامن گیر خاطر حکام باشد چہ مومن و چہ کافر کہ خلق خدا پیدائش خداست و سید این مقام کہ صاحب آن مقام بہر کسے از صالح و فاجر و مومن و کافر رحم کند۔ رسول خداست صلی اللہ علیہ وسلم۔ چنانکہ بیان یافتہ در فتوحات و واردات در قرآن و ما اَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ بر سبیل عموم است۔ مثل رب العالمین غائباً افاضہ رحمت بہ ہر کسے بحسب مرتبہ آن باشد۔“

آپ کی تصانیف زیادہ تر علم تصوف میں یا خواص کے عقائد کے متعلق ہیں۔ شرح فصوص (عربی) شرح فصوص (فارسی) مغالطہ عامہ۔ سرالخواص۔ عبادت الخواص طرق الخواص۔ عبادت اشخاص الخواص۔ رسالہ وجود مطلق۔ ان کے علاوہ انھوں نے رسالہ تسویر کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھی ہے جس پر عہد عالمگیری میں ایک بڑا ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے وحی کی نسبت ایسے خیالات کا اظہار کیا تھا جو سرسید کے ہم خیالوں کو تو عجیب معلوم نہ ہوں، لیکن عام اسلامی اعتقاد کے ضریح پر خلاف ہیں۔ اس پر علمائے اعتراض کیا اور عہد عالمگیری میں جب مصنف کی وفات ہو چکی تھی۔ بادشاہ سے استدعا کی کہ اس رسالے کی تمام نقلیں جلادی جائیں اور جو لوگ اس کے قائل ہوں ان پر حد شرعی نافذ کی جائے۔ چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ ممالک محروسہ کے تمام درویش حاضر کیے جائیں (کہ درویشان قلم و پادشاہ اور محکمہ سلطانی احضار نمایند) اور رسالے کی تلاش شروع ہوئی۔ بالآخر پہلا حکم تو نسوخ ہوا لیکن رسالے کی جو نقلیں دستیاب ہوئیں انھیں تلف کر دیا گیا۔

شیخ محب اللہ آبادی کی وفات ۱۰۶۸ھ میں ہوئی۔ ان کے تلامذہ و خلفا میں قاضی گھاسی کا نام زیادہ مشہور ہے، جن سے علمائے فرنگی محل لکھنؤ کے مورث اعلیٰ

ملا قطب الدین شہید سہالوی نے فیض حاصل کیا جسے ان کے بیٹوں نے تمام ہندوستان میں غام کیا۔

شہزادہ داراشکوہ قادری | عہد شاہجہانی میں آزاد خیال صوفیوں کا جو جھگڑا ہو گیا تھا اس میں بعض بڑی دلچسپ ہستیاں شامل تھیں، لیکن ان میں جو کشش ایک مورخ کے لیے داراشکوہ میں ہے، کسی اور میں نہیں۔ اور وہ صرف اس لیے نہیں کہ دارا بادشاہ وقت کا بیٹا تھا اور اس کا انجام بڑا عبرتناک ہوا، بلکہ اس لیے بھی کہ اس کا علمی مرتبہ خاصہ بلند تھا۔ اور اس کی تصانیف میں جو وضاحت اور باقاعدگی ہے وہ عام صوفیانہ ادب کی بھول بھلتیاں میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔

داراشکوہ شاہجہان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ ایک مدت تک شاہجہان کے ہاں بیٹیاں ہی بیٹیاں پیدا ہوتی رہیں اور اسے اولاد ترسیتہ کی بڑی خواہش تھی چنانچہ اس نے خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی درگاہ عالیہ پر حاضر ہو کر دعا کی اور نذر و نیاز مانی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ۳ مارچ ۱۶۱۵ء کو داراشکوہ بمقام اجمیر پیدا ہوا۔

جو اولاد بڑی خواہش کے بعد حاصل ہوا اس سے خاص لگاؤ ہو جاتا ہے کچھ اس وجہ سے اور شاید کچھ اس لیے کہ بڑے بیٹے کو واضح ترجیح دینے سے تخت و تاج کی وراثت بغیر کسی خانہ جنگی کے طے پاسکے، شاہجہان "مہین پور خلافت" کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا تھا۔ اُسے "شاہ بلند اقبال" کا خطاب دے رکھا تھا۔ اس کے مراتب و مناصب بھی اپنے بھائیوں سے بدرجہا بلند تھے اور شاہجہان اسے در دراز صوبوں میں بھیجنے کی بجائے زیادہ تر اپنے پاس دار الخلافہ میں ہی رکھتا۔

شاہجہان کی یہ کورانہ محبت داراشکوہ کو دنیوی لحاظ سے بہت جنگی بڑی کیونکہ ایک تو اس لاڈ پیار سے وہ زیادہ خود سر اور ضدی ہو گیا اور دوسرے اسے علمی نظم و نسق کا وہ سلیقہ حاصل نہ ہوا جو اورنگ زیب نے گجرات، دکن اور دوسرے علاقوں کی سربراہی میں حاصل کیا۔ لیکن علمی اور روحانی دلچسپیوں کے لیے اسے دار الخلافہ میں بہت وقت

مٹا رہا۔ اور اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

اس کی روحانی نشوونما کی بسم اللہ شاید اس دن ہوئی۔ جب ۲۵ فروری ۱۹۳۴ء کو شاہجہاں اسے لے کر حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے التجا کی کہ وہ اس کی صحت کے لیے دعا کریں۔ اس وقت دارا کی عمر انیس سال کی تھی اور اگرچہ اس کے عقائد اور تاثرات کا اس وقت کوئی ذکر نہیں ملتا، لیکن قرین قیاس ہے کہ صحت پا جانے پر جسے وہ حضرت کی کرامات پر محمول کرتا ہے، اس کی عقیدت اہل اللہ سے ضرور بڑھ گئی ہوگی۔ اس کے دس مہینے بعد جب ۲۳ مارچ کو شاہجہاں حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوا تو داراشکوہ اس کے ہمراہ تھا اور اس وقت دارا کی عقیدت مندی کی یہ حالت تھی کہ وہ حضرت کے مکان کی دوسری منزل میں جہاں حضرت کا قیام تھا، برہنہ پا گیا۔ اور جو لوگ وہ چبا چبا کر پھینکتے جاتے تھے۔ انھیں اٹھا کر کھاتا رہا۔ اس کے بعد جب بادشاہ چلا گیا تو داراشکوہ تنہا شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ وہ بھی دیر تک اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے اور اس کے حق میں دعا کی۔

اس کے اگلے سال حضرت میاں میر کی تو وفيات ہو گئی، لیکن جو چنگاری دارا کے دل میں جا لگی تھی، وہ برابر سلگتی رہی۔ وہ کہتا ہے کہ حضرت کی وفات کے بعد انھوں نے غائبانہ طور پر مجھے مشاہدہ اور مراقبہ سکھایا اور ان کی وجہ سے مجھے لیثۃ القدر کی زیارت ہوئی۔

داراشکوہ کی پہلی تالیف سفینۃ الاولیاء ہے۔ جسے خاتمہ کتاب کے مطابق اس نے ۲۱ جنوری ۱۹۳۴ء کو یعنی پچیس سال کی عمر میں ختم کیا۔ غالباً اس تاریخ کے بعد بھی کتاب میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ کیونکہ حضرت میاں میر کے ذکر میں وہ یہاں کہتا ہے: ”چوں پیش ازین رسالہ مسخ بہ سکنۃ الاولیاء در احوال و اوضاع آنحضرت پیرو مریدان ایشان مفصل نوشتہ بود۔ دریں کتاب بہیں قدر اکتفا نمود“ سفینۃ الاولیاء میں دنیا سے اسلام کے ۴۱۱ بزرگان دین کے مختصر حالات ہیں۔ یہ تذکرہ نجات اللہ اور دوسرے قدیمی تذکروں سے ماخوذ ہے اور عام طور پر اسے کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں، لیکن کہیں کہیں داراشکوہ نے اپنے

تأثرات بھی درج کیے ہیں اور وہ دلچسپ ہیں۔ اس کتاب کے شروع میں دارا نے اپنے آپ کو "حقّی قادری" لکھا ہے اور صوفی سلسلوں کا ذکر کرتے ہوئے قادریہ سلسلے کو پہلی جگہ دی ہے، لیکن یہ کتاب صحیح اسلامی وسیع القلبی کے ساتھ لکھی گئی ہے اور یہ امر قابل ذکر ہے کہ اگرچہ قلت صفحات کی بنا پر مولف نے بہت تھوڑے ہندوستانی مشائخ کا ذکر کیا ہے، لیکن حضرت مجدد الف ثانی (حضرت احمد کابلی و سرہندی قدس سرہ) کا ذکر اہتمام سے کیا ہے اور ان کے مخالف ان کی نسبت جو الزام لگاتے تھے۔ ان کی بالتفصیل تردید کی ہے۔

جس سال سفینۃ الاولیاء ختم ہوئی۔ اسی سال ۱۲۱۱ھ اپریل کو داراشکوہ نے ملا شاہ بدخشی کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس کے تین سال بعد سکینۃ الاولیاء لکھی۔ جس میں حضرت میاں میر۔ ملا شاہ بدخشی اور حضرت میاں میر کے دوسرے خلفاء کے حالات ہیں۔ اس دوران میں داراشکوہ نے شاعری شروع کر دی تھی اور قادری تخلص اختیار کیا۔ چنانچہ جب اس نے ۱۲۲۶ھ میں ایک مختصر صوفیانہ رسالہ حق نما کے نام سے لکھا تو اس کے خاتمے میں کہا ہے

ایں رسالہ حق نما باشد تمام در ہزار و پنچ و شش شد تمام
ہست از قادر مدلاں از قادری آنچه ما گفتیم فافهم والسلام
معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لوگوں نے دارا کے بعض اقوال پر اعتراض شروع کر دیے تھے۔ چنانچہ دارا نے ان کا جواب دینے کے لیے اور اس امر کی تائید میں کہ جو الفاظ حالت جذب میں کہے جائیں وہ قابل گرفت نہیں ہوتے۔ رسول کریم اور اصحاب کے بعض صحیح اور موضوع اقوال اور اپنے زمانے اور پہلے کے مشہور مشائخ کے ایسے فقرے جو حالت جذب میں کہے گئے تھے شرطیات یا حسنات العارفین (۱۰۶۲ھ) میں جمع کیے۔ اس میں وہ حمد و نعت کے بعد لکھتا ہے :-

بے غم و اندوہ محمد داراشکوہ کہ اب ہجری کا ایک ہزار باسٹھ اور فقیر کی پیدائش کا
از تیسواں سال ہے۔ دل بالکل اہل سلوک اور طریقت کی کتابوں سے پھر گیا تھا اور

سوائے محض توحید کے کچھ اور منظور نہ تھا اور وجد اور ذوق کی دوسے اکثر کلمات بلند حقائق و معارف نکلتے تھے اور پست فطرت کم ہمت والے زاہد خشک بے حلاوت کوتاہ بینی سے طعن اور تکفیر اور انکار کے درپے رہتے تھے۔ اس واسطے اس فقیر کے دل میں آیا کہ جو کچھ بڑے بڑے موجدوں اور عارفوں سے کہ جو کچھ اس وقت کی مخلوقات سے سب سے بہتر ہیں اور معاملات میں راست باز ہیں اور ان سے سخن بلندہ صادر ہوتے ہیں، جن کو تشابہات اور تشبیحات کہتے ہیں اور اس قوم کے رسالوں اور کتابوں میں متفرق موجود ہیں۔ یاد وہ باتیں جو آج کل کے شخصوں سے خود سُنی ہیں۔ جمع کرے تاکہ حجت قاطعہ ہو۔ ان لوگوں پر اور دلیل بلند ہو ان شخصوں پر جو عیسائی نفس دجال اور موشے صفت فرعون اور محمدی مشرب ابو جہل ہیں۔ [ترجمہ]

اس دوران میں دارالکے روحانی تجسس نے ایک اور کروٹ لی۔ اب تک اس کی تلاش و تحقیق مسلمان صوفیہ تک محدود تھی، لیکن ملا شاہ اور دوسرے مسلمان مشائخ جن کا طریقہ دارا نے اختیار کیا تھا، ان کے وحدت الوجودی مشرب اور ہندو ویدانت میں کوئی بُعد نہ تھا اور فلسفہ وحدت الوجود سے وحدت ادیان کے تصور تک پہنچنے میں کوئی ناقابل عبور مشکل نہ تھی۔ چنانچہ دارا نے دوسرے مذاہب بالخصوص ہندو ویدانت میں جھان بین شروع کی جس کا پہلا نتیجہ مجمع البحرین کی صورت میں ۱۶۵۴ء میں نمودار ہوا اس میں وہ لکھتا ہے:-

”میگوید فقیر بے اندوہ محمد دارا شکوہ کہ بعد از دریافت حقیقت الحقائق و تحقیق رموز و دقائق مذہب حق صوفیہ و فائز گشتن بایں عطیہ عظمیٰ در آن شد کہ در کتب کہ نہ مشرب موجدان ہند و محققان این قوم قدیم نماید۔ با بعضی از کمالان ایشان کہ بہ نہایت رصانت و ادراک و فہمیدگی و غایت تصوف و خدایابی و سنجیدگی رسیدہ بودند مکرر صحبت ہاداشتہ و گفتگو نموده جز اختلافات لفظی دریافت و شناخت تفاوتی ندیدہ۔ ازین جہت سخنان فریقین را بہم تطبیق دادہ و بعضی سخنان کہ طالبین حق را دانستن ناگزیر و سودمند است، فراہم آورده۔“

چونکہ یہ کتاب مسلمان صوفیوں اور ہندو یوگیوں کے عقائد کا مجموعہ ہے۔ اس لیے اس کا نام مجمع البحرین رکھا گیا۔ ایک مختصر سا رسالہ ہے جس میں عناصر حواس صفات الہی۔ نبوت۔ ولایت اور عالم برزخ وغیرہ کے متعلق تصوف اور یوگ کے خیالات جمع کیے ہیں اور انھیں ایک دوسرے کے مطابق ثابت کیا ہے۔ عہد عالمگیری میں غالباً اسی رسالے کی تالیف پر ”کفر و اسلام برابر توام خواندہ“ دارا کو ملحد اور واجب القتل قرار دیا گیا، لیکن دارا کے علاوہ دوسرے کئی صوفیوں نے وقتاً فوقتاً تصوف اور یوگ کی اہم آہنگی کے متعلق خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اب دارا نے ویدانتیوں اور ”ہندو موحدین“ کے خیالات کو زیادہ محنت سے فارسی زبان میں منتقل کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں ایک مختصر سا رسالہ ”مرکالمہ دارا شکوہ بابالال“ کے نام سے دارا شکوہ کے میرمنشی چندربھان نے مرتب کیا، جس میں دارا کے سوالات اور بابالال کے جوابات جمع ہیں۔ پھر ۱۰۶۶ھ میں دارا کے ایما پر جوگ بشت کا آسان فارسی میں ترجمہ ہوا۔ اس میں شری رام چندر جی کے گورو بشت کے ارشادات جمع ہیں۔ ان دونوں سے بھی اہم کتاب ستر اکبر ہے۔ جس میں دارا شکوہ نے بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے اپنشدوں کے قریباً پچاس ابواب کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ دارا شکوہ نے بھاگوت گیتا کا بھی فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔

اس زمانے میں دارا شکوہ مسلمان صوفیوں اور ہندو یوگیوں کی اس جماعت کا سرگروہ ہو گیا تھا جو تصوف اور ویدانت میں دونوں قوموں کے لیے ایک مشترک روحانی مطمح نظر تلاش کر رہی تھی۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ سکندر لودھی کے زمانے میں ہندوؤں نے فارسی سیکھنی شروع کی۔ مغلہ حکومت کے تابع یہ سلسلہ وسیع ہو گیا۔ ادھر اکبر کے عہد حکومت میں بھاگوت گیتا اور سنسکرت کی کئی دوسری کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا اور مسلمانوں کو ہندو عالموں اور اہل فکر سے ربط و ضبط کے زیادہ مواقع پیش آئے۔ ان سب اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو ویدانتی دیکھنے لگے کہ مثنوی مولنا روم اور اسلامی تصوف کی

کتابوں میں کئی ایسی باتیں ہیں جنہیں وہ اپنا کہہ سکتے ہیں اور بعض مسلمان بھی سمجھنے لگے کہ ہندوؤں میں فقط بُت پرست اور دیوتاؤں سے انسانی اوصاف اور عام بشری خصائص منسوب کرنے والے لوگ نہیں، بلکہ کئی پاکیزہ خیال، بے حرص اور بے دیا تارکانِ دُنیا بھی ہیں۔ جہانگیر کے زمانے میں اکبر کی مذہبی بدعتوں میں کا خاتمہ ہو گیا تھا، لیکن اس روحانی مفاہمت کا سلسلہ بند نہ ہوا۔ جہانگیر نے کئی موقعوں پر اسلامی نقطہ نظر کی جرات و استقلال سے پیروی کی، لیکن وہ بھی ہندو جوگیوں کا معتقد تھا۔ اور گسائیں جلدوب سے اس کی ملاقاتوں کا حال تزکِ جہانگیری میں کئی جگہ درج ہے۔

شاہجہاں جہانگیر کی طرح ہندو سنیا سنیوں کا قائل نہ تھا، لیکن اس کے عہدِ حکومت میں یہ رجحانات ختم نہ ہوئے اور اس کے آخری ایام میں تودار کی شرکت سے انہیں بڑی تقویت ملی۔ مسلمانوں میں اس روحانی مفاہمت کے ترجمان خود داراشکوہ۔ ملاشاہ۔ سرمد۔ دبستانِ مذہب کا مصنف اور دوسرے کئی آزاد خیال تھے، جو داراشکوہ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی کئی مسلمان تھے، جو ہندو سادھوؤں کی روحانیت سے متاثر ہوتے تھے۔ دبستان میں مشہور فارسی شاعر ملاشیدا کی رائے ایک گیانی کی نسبت درج ہے :-

ملاشید اسے ہندی کہ از شعراے نامدار و فصحاے عصر بود، نو بستے بار اقم بخانہ گیانی زین
رفت و با ایشان صحبت داشت۔ مریدانِ اودید۔ و وضع اہل خانہ را مشاہدہ نمودہ بہ شگفتی
فرماندہ گفت۔ تمام عمر من در خدمت وارسنگاں گزشت۔ چشم من جنینِ آزادے ندیدہ۔
و گو شمع چیزے از انساں وارسہ نشنود۔

ہندوؤں میں بھی اس روحانی آمیزش کو ترقی دینے والے کئی تھے۔ ایک چند جہاں برہمن تھا، جو داراشکوہ کا منشی اور فارسی میں پہلا صاحبِ دیوان ہندو شاعر تھا، اس کا لے داراشکوہ کی وفات کے بعد اس کے رفقاے کار نے جس طرح اپنے تئیں اور رنگ زیب سے وابستہ کرنا چاہا۔ وہ تاریخ کا ایک جہرناک باب ہے۔ ہم ملاشاہ کی وہ رباعی نقل کر چکے ہیں جو اس نے اورنگ زیب کی تخت نشینی پر لکھی۔ برہمن نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ وہ امیرِ رنگ [باقی اگلے صفحے پر]

یہ شعر کئی تذکروں میں نقل ہوا ہے ۵

مراد لے است بکفر آشنا کہ چندیں بار
بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم
عمل صالح میں جو عہد شاہجہانی کی مستند تاریخ ہے، اس کی نسبت لکھا ہے ”ہر چند
بصورت ہندو است، لیکن دم در اسلام سے زندہ“ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ایک محققانہ مضمون
میں اس کے کلام کی نسبت لکھتے ہیں :-

دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ برہمن فارسی و اسلامی تخیل میں ڈوبا ہوا
ہے۔ عشق کی کیفیات، محبت کی صعوبتیں، تصوف کی منزلیں، وحدت الوجود کے مراحل
برہمن کے کلام میں اسی طرح پائے جاتے ہیں۔ جس طرح باقی (مسلمان؟) شعرا
کے کلام میں۔“

اسی زمانے کا ایک اور ہندو شاعر تھا۔ بھوپت رائے نام، بیختم تخلص، بیراگی لقب،
شاعری میں خوشگو کا شاگرد اور طریقت میں شیخ الشیوخ محمد صادق اور نارائن بیراگی کا مرید
تھا۔ اس کی نسبت سید عبداللہ لکھتے ہیں: ”بیختم کی وفات ۱۳۲۲ھ میں واقع ہوئی
تھی۔ اس لیے یہ امر قرین قیاس ہے کہ بیختم نے ملا شاہ اور داراشکوہ کے زمانے کی کچھ
جھلک ضرور پائی ہوگی۔ داراشکوہ کا ماحول کچھ اس قدر صوفیانہ اور فلسفیانہ معلوم ہوتا
ہے کہ اس کے ہندو منشویں سے یہ امر ثابت ہے کہ انھوں نے ترک دنیا کو احساں
وجود اور علت زندگی کی مصیبت کے ختم کرنے کا واحد ذریعہ سمجھا۔ منشی چندر بھان
برہمن نے داراشکوہ کی وفات کے بعد عزت گزینی اختیار کر لی۔ منشی ولی رام ولی
نے بھی یہی راستا اختیار کیا اور کلفت حیات کو ترک آرزو سے منایا۔ اگرچہ بیختم بیراگی کا

[بقیہ زٹ صفحہ گزشتہ]

اورنگ زیب کا ملازم رہا اور اس نے اورنگ زیب کی تعریف میں بعض بڑے پرزور اشعار لکھے مثلاً ۵

شام عالم مطیع فرمان تو باد
لبریز ادا سے شکر احسان تو باد

چوں ذات تو خلق را نگہبان شد
ہر جا باشی خدا نگہبان تو باد

داراشکوہ کے دربار سے کوئی خاص تعلق معلوم نہیں ہوتا تاہم نارائن چند کی محبت میں وہ بھی از خود رفتہ ہو گیا اور پھر اس نگری کی راہ لی، جہاں داراشکوہ کا مقام تھا۔ نارائن بیرا کی اور شیخ محمد صادق کے دو گونہ مواعظ سے اس کا قلب مجمع البحرین بن گیا تھا۔ چنانچہ مثنوی میں جا بجا ان دورنگی موحیوں کا سراغ ملتا ہے، جن کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں اسلامی اور ہندو تصوف کا رنگ علیحدہ علیحدہ نظر آئے گا۔ اس زمانے میں ملا شاہ (المتوفی ۸۰۲ھ) بہت بڑے صوفی اور عالم تھے۔ یہ میاں شاہ میرلاہوری کے شاگرد تھے اور انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ مثنوی بیہیم میں مصنف نے خود حضرت ملا شاہ کا ذکر کیا ہے۔

وہ چہ خوش فرمود ملا شاہ ما شاہ ما آں عارف آگاہ ما
سین انساں گرنہ بوسے درمیاں اول و آخر نہ بود سے غیراں
بیہیم کی مثنوی کی نسبت سید محمد عبداللہ لکھتے ہیں: مثنوی بیہیم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مولوی رومی بیہیم بیرا کی کے روحانی استاد تھے۔ مثنوی بیہیم مولانا سے روم کے خیالات کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ کتاب کی ترتیب، خیالات کی نوعیت، تصوف کے ساتھ فلسفہ کی جھلک سب باتیں اس حقیقت نفس لامری کو عالم آشکارا کر رہی ہیں کہ اگرچہ ہم نے ملا شاہ، نارائن بیرا کی اور شیخ صادق قدس سرہ کی تصانیف اور فیوض صحبت کا اثر بیہیم پر ثابت کیا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیہیم کا اصلی سرچشمہ فیض اور سب سے بڑا منبع عرفان رومی تھا۔ اپنے دعوے کو طویل اقتباسات سے استوار کرنے کے بعد سید صاحب لکھتے ہیں: مثنوی بیہیم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے اس میں ویدانت اور اسلامی تصوف کو تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان ہر دو روحانی سلسلوں کے اتصالی مقامات کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ مثلاً تصویر استخراق، بے ثباتی عالم، دنیا کا ایک وہم اور افسانہ ہونا و حد الوجود وغیرہ مسائل اسلامی اور ہندو تصوف میں مشترک ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے اپنے مضمون میں مثنوی بیہیم کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل

بحث کی ہے اور اس سے طویل اقتباسات نقل کیے ہیں۔ ہم ان میں سے فقط دو اندراجاً نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین دیکھ سکیں کہ اس روحانی تحریک کے دوران میں اسلامی خیالات اور زبان و بیان کس طرح ایک ہندو کے دل و دماغ کو رنگ رہے تھے۔ بیچم ایک جگہ دہر کے متعلق کہتا ہے:-

دہر اسم اعظم اللہ ہست	جلوہ انوارِ مہر و ماہ ہست
عارفان و عاقلان و عالماں	ساجد دہر اند جملہ بے گماں
جامع اسماست پُول اسمِ الہ	پس چیرمی پرسی زمین لے دادخواہ
نغمہ ام درگوش کن لے مردِ راہ	لا تسب الدہر بر خواں رمز شاہ
خود انال دہرت بگفتا در کلام	پس چیرمی پرسی زمین لے تمام
من جو غیر از حق ندیدم در جہاں	پس چہ خواتم دہر را لے نور جہاں

ایک اور جگہ شیخ شبلیؒ اور جنیدؒ کے درمیان ایک مکالمہ نظم کیا ہے۔ شبلی پوچھتے ہیں اصل علوم کیا ہے؟ جنیدؒ جواب دیتے ہیں ۵

ذات اللہ ہست اصل ہر علوم نیست صرف و نحو نے طب و نجوم
اصل جملہ علمہا ذات خداست کنز فروغش روشن این رقص و سیماس

گفت دیگر چیست گفتا غیر ازین

نیست چیزے در زماں و در زمین

ہندوؤں اور مسلمانوں کی روحانی آمیزش کی یہ کوششیں صرف فارسی زبان میں ہی فروغ نہ پا رہی تھیں، بلکہ دہراشکوہ کے ہندو دوستوں نے سنسکرت میں بھی انھیں منتقل کیا۔ چنانچہ مجمع البحرین کا سمودر سنگم کے نام سے اسی زمانے میں ترجمہ ہوا اور کئی دوسری صوفیانہ کتب بھی اس زبان میں منتقل ہوئیں۔

علمی نقطہ نظر سے دارا اور اس کے ہم خیال ہندو اور مسلمان صوفیہ کی کوششیں بڑی دلچسپ تھیں اور جو مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ پورا اسلامی مذہب نہ ہی، لیکن کم از کم اس کے بنیادی اصول ہی دوسرے مذہبوں میں اخذ ہو جائیں اور ان کی اسلام سے

بھڑک دُور ہو۔ وہ بھی ان کوششوں کو پسند کرتے ہوں گے، لیکن شخصی حکومتوں میں جو غلامانہ ذہنیت عوام میں داخل ہو جاتی ہے، اس کا نتیجہ اُن کوششوں کے حق میں جو بادشاہ یا کسی وائٹ تاج و تخت کے زیر سایہ شروع ہوں، بڑا بُرا ہوتا ہے۔ لوگ بادشاہ یا شہزادہ کی ہر حدت کی تعریف کرنے لگتے ہیں۔ جتنی کہ انھیں اپنی بوجھبیسوں کا احساس نہیں رہتا۔ خوشامدی درباریوں کے زیر اثر اکبر جن قباحتوں کا مرتکب ہوا تھا، ان کا ذکر ہم کہ چکے ہیں۔ دارا اکبر سے کہیں زیادہ با علم تھا اور اس کے ہاتھ میں اختیار بھی کم تھا۔ اس لیے وہ ان انتہائی حماقتوں کا مرتکب نہیں ہوا جو بدایونی اکبر سے منسوب کرتا ہے، لیکن وہ بھی سادہ لوح اور زود الاعتقاد تھا اور کشفی واقعات پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرتا۔ اپنی علمی اور روحانی کوششوں میں وہ گاہ گاہ جن عجیب و غریب نتائج پر پہنچ جاتا تھا۔ اس کا اندازہ اُس نظریے سے ہو سکتا ہے جس کے مطابق کلام مجید اپنشدوں سے ماخوذ ہے !!

دارا شکوہ کی تصنیفات میں تلاش و تفتیش کے باوجود کوئی ایسا اندراج نظر نہیں آتا، جس سے اس کا الحاد ثابت ہو سکے، لیکن ایسے بیانات کہی ہیں جن کے نمونے آزاد صوفیائے کبار کی تصانیف میں ہی مل سکتے ہیں اور جن کا اظہار ایک تاج و تخت کے طالب مسلمان کے لیے ضرور خلاف مصلحت ہے۔ مثلاً وہ ایک خط میں حضرت شاہ ولیا کو لکھتا ہے: ”الحمد للہ! الحمد للہ! کہ از برکت صحبت ایں طائفہ شریفہ مکرمہ معظمہ از دل ایں فقیر اسلام مجازی برخاست و کفر حقیقی رونمود و معنی ایں رباعی عارف نامی مولنا عبدالرحمن جامی ظاہر گشت“

در دیدہ عیاں تو بودہ من غافل	در سینہ نہاں تو بودہ من غافل
از جملہ جہاں نشان تو بودہ من غافل	خود جملہ جہاں تو بودہ من غافل
اکنوں قدر کفر حقیقی دانستم۔ ز تار پوش و بُت پرست	بلکہ خود پرست و دیر نشین گشتم۔
مسلمان گردانستم کہ بُت حلیت	بدانستم کہ دین در بُت پرستی است
درون ہر جگہ جانیت پنہاں	بزییر کفر ایک نیست پنہاں

اس کے اشعار میں بھی آزاد خیالی اور وحدت الوجودی مسلک صاف طور پر جھلکتا ہے۔

ہر خم و پیچے کہ شد از تاب زلف یار شد
دم شد تسبیح شد زنجیر شد ز تار شد
رباعی

مردم شد م تا کہ بقراں گشتم عارف شد م و ز خویش عریاں گشتم
پیدا کردی مرا و لیکن من ہم پیدا کردم ترا و قریاں گشتم
ابیات

تا دوست رسیدیم چو از خویش بریدیم از خویش گزشتن چہ مبارک سفرے بود

سلطنت سہل است خود را آتش فتن کن قطرہ تا دریا تواند شد چرا گوہر نشود
دارا کی کوششوں کو اس وجہ سے بھی ضعف پہنچا کہ وہ حضرت اجمیریؒ حضرت
سلطان المشائخ اور قدیمی صوفیہ کے زمانے میں شروع نہ ہوئیں بلکہ ان کا آغاز اُس وقت
ہوا۔ جب تصوف کی شرع کے مطابق تطبیق ہو رہی تھی۔ ہم نے حضرت سلطان المشائخ
کی وفات کے ضمن میں کہا تھا کہ اس کے ساتھ ہی دہلی میں صوفیہ کا عہد زریں ختم ہو گیا۔
اس کے بعد تصوف کو شرع کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ عہد مغلیہ میں جوں جوں علوم
اسلامی کو فروغ ہوا یہ تحریک زور پکڑ گئی اور شیخ عبدالوہاب متقیؒ شیخ عبدالحی محدثؒ
حضرت مجدد الف ثانیؒ جس طرح تصوف کو تمام غیر اسلامی اور غیر شرعی عناصر سے
پاک کرنے کی کوشش کر رہے تھے ان کا تذکرہ ان صفحات میں ہو چکا ہے حضرت
مجددؒ نے جس طرح ہر دے رام نامی ایک ہندو کو رام اور رحیم کے ایک کہنے پر
دھتکار دیا تھا۔ اس کا بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندو مذہب کے
احیا کی تحریک آثار اسلامی اور مسلمانوں کے خلاف جو جارحانہ صورتیں اختیار کر رہی
تھیں ان کے سامنے دارا شکوہ کی اتحاد پرور کوششیں کامیاب نہ ہو سکتی تھیں۔

ان سب اثرات کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان علما اور اہل فکر کی ایک بااثر جماعت تصوف میں کوئی غیر اسلامی عنصر دیکھنا پسند نہ کرتی تھی۔ داراشکوہ کی مساعی ان رجحانات کی صریح مخالف تھیں۔ اس لیے ان کا منتشر اور محتاط مسلمانوں کی نظروں میں ناپسند ہونا لابد تھا۔

داراشکوہ کو شخصی اور اتفاقی واقعات سے بھی نقصان پہنچا۔ وہ تاج و تخت کا دعویٰ دار تھا۔ مراد۔ شجاع۔ اورنگ زیب اس کے حریف تھے اور وہ سب چاہتے تھے کہ دارا کو عیوب اور نقائص کا مجموعہ ثابت کریں۔ اورنگ زیب کو تو دارا سے اسوئی اختلافات تھے، لیکن اب مراد جیسے رنگیلے انسان جو ہر وقت شراب میں سرشار رہتے تھے، دارا پر مذہبی الزام لگانے لگے اور اپنے خطوط میں اُس کی نسبت ”ملحد“۔ ”بے دین“۔ ”دشمن دین متین“ کے الفاظ استعمال کرنے لگے۔

داراشکوہ کے ہم خیال تو اسے ”محی الدین و ملت“ کہتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کو اس کی ہندو یوگیوں اور سادھوؤں سے صحبت ضرور ناپسند ہوگی۔ بھائیوں کی مخالفت کو شش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان امرا اور علما بھی دارا کو ملحد سمجھنے لگے اور انھیں یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ اگر داراشکوہ بادشاہ ہوا تو اکبر کی سی مذہبی بے قاعدگیاں ہندوستان میں پھر عام ہو جائیں گی۔

داراشکوہ بعض علما کے ساتھ اپنے اختلافات کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے: ”در ہندوستان وحدت نشان گفتگوے توحید بسیار است و علمائے ظاہری و باطنی طائفہ قدیم ہند را از وحدت انکارے و بر موجدان گفتارے نیست۔ بلکہ پایہ اعتبار است۔ برخلاف جہلاے ایں وقت کہ خود را علما قرار دادہ اند و در بے قتل و آزار و انکار خدا شناسان و موجدان افتادہ۔ جمیع کتاب توحید را کہ از فرقان مجید و احادیث صحیحہ نبوی صریح ظاہر است ردے نمایند و بنا ہنزان راہ خدا بندے“ (سیر اکبر دیباچہ)

عہدِ عالمگیری

فقہ اور شریعت کا عروج

عالمگیر | اورنگ زیب شاہجہان کا تیسرا بیٹا تھا۔ داراشکوہ اور شجاع دونوں عمر میں اس سے بڑے تھے، لیکن قابلیت اور کٹر کی پختگی میں ان سے کہیں بڑھا ہوا تھا۔ وہ محنتی، دُراندیش اور منتظمانہ نقطہ نظر سے بڑا قابل تھا۔ اس نے ملک کے دُور دراز حصوں میں صوبیداری کر کے انتظامی تجربہ حاصل کیا تھا اور اس دُور میں بطور ایک باتدبیر حرنیل اور بہادر سپاہی کے نام پیدا کیا تھا۔ اس کے لیے شہزادگی پھولوں کی سیج نہ تھی اور اپنا اثر و اقتدار قائم رکھنے کے لیے اسے شروع سے ہی بڑے سیاستدانوں کی سب چالیں سیکھنی پڑیں۔ وہ طبیعت کا بڑا ٹھنڈا اور محتاط تھا ضرورت کے وقت اپنے جذبات کو خوب قابو میں رکھتا اور ایسی سب تدبیریں تیزی سے سوچ لیتا جو اسے حصول مقصد میں کام آسکتی تھیں۔

شاہجہان جب اپنے بیٹوں پر نظر ڈالتا تو اسے بھی عالمگیر کے عزم و ہزم اور اس کی دماغی قابلیت کا قائل ہوتا پڑتا۔ اس کی اپنے بیٹوں کی نسبت جو رائے تھی، اسے اورنگ زیب نے ایک خط میں نقل کیا ہے۔

”مارا بعضے اوقات بہ خاطر راہ مے باید کہ مہین پور (دارا) عدوئے نیکو کاران واقع شدہ و مراد بخش بکار تشریب دل بستگی دارد۔ محمد شجاع جزو شیر خشی وصفے ندارد۔ مگر عزم و شعور اورنگ زیب ابقصا مے کند کہ متحمل این امر خطیر مے تواند شد اما رکاکت نقص عظیم در نوع انسانی اوست۔“

شاہجہان اورنگ زیب کے ”عزم و شعور“ سے خوب واقف تھا، لیکن اپنی حکومت کے

آخری پندرہ بیس سالوں میں اس نے اورنگ زیب سے کوئی قدر دانی کا برتاؤ نہیں کیا۔ شاہجہاں کے اس زمانے کے خطوط و احکام پڑھیں تو نظر آتا ہے کہ نہ صرف اورنگ زیب کی نسبت اس کا رویہ پیرانہ شفقت و محبت سے عاری تھا، بلکہ بعض اوقات تو اس کا طرزِ عمل کیسے معاندانہ ہو جاتا۔ اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر اورنگ زیب سے باز پرس کی ہے۔ اس کے لائقِ فخر کارناموں کی کوئی تعریف نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات ان کو ششوں میں جو اورنگ زیب مغلہ حکومت کی توسیع کے لیے (مثلاً گولکنڈہ اور بیجاپور میں) باپ کے زیرِ فرمان شروع کرتا ہے۔ روڑے اٹکائے جاتے ہیں اور اُسے دُکھوں کی نظر میں ذلیل کیا جاتا ہے۔

شاید شاہجہاں چاہتا تھا کہ اس کے بعد داراشکوہ بغیر کسی کشمکش کے وارثِ تخت و تاج ہو جائے اور اس لیے وہ اس کے سب سے قوی حریف کو دبا کے رکھنا چاہتا تھا یا ممکن ہے کہ وہ سمجھتا ہو کہ اورنگ زیب کی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر نظر رکھنے کی عادت (رکاکت) اور خشک، فقیہانہ طبیعت مستقبل کے لیے ایک خطرہ ہے اور اس وجہ سے وہ بار بار ایسی باتیں کہتا ہو جو آج ہمیں بے ضرر نظر آتی ہیں۔

شاہجہاں اور اورنگ زیب کے جو اختلافات تھے وہ تو بھرپور دی اور ضمنی تھے، لیکن اورنگ زیب اور داراشکوہ کی مخالفت بنیادی تھی۔ ایک تو وہ دونوں تختِ تاج کے دعویدار تھے۔ جس کا مغلہ خاندان کی قاموس میں یہ مطلب ہے کہ اگرچہ وہ دونوں بھائی بھائی تھے، لیکن ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور پھر ان کے درمیان فقط ذاتی مقاصد و خواہشات ہی کی دیوار حائل نہ تھی، بلکہ ان کے خیالات ان کے عقائد ان کے طور طریقوں اور ان کی طبیعتوں میں بڑا فرق تھا۔ داراشکوہ اور اورنگ زیب دونوں مذہب میں دلچسپی لیتے تھے، لیکن ان کے مذہب میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ داراشکوہ آزاد خیال صوفیوں کا پیرو تھا اور اورنگ زیب متشدد علماء کا۔ دارا کی وسعتِ مشرب کا تو یہ عالم تھا کہ وہ ہندو موحدین کی مجلس میں اسی ذوق و شوق سے شریک ہوتا، جس طرح مسلمان صوفیہ کی محفل میں۔ اور اورنگ زیب کا

یہ حال تھا کہ اس کے نزدیک شیعہ مسلمان بھی زندیق تھے۔

عالمگیر اور دارادو مختلف زاویہ ہا سے نگاہ کے ترجمان تھے اور جس طرح قابل اور جواں ہمت طرفداروں کی مدد سے بالآخر ایک عقیدے اور طریقے کی فتح ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مغلوں کے عہد میں ہوا۔ اس سے کوئی اٹنی سال پہلے دین الہی اور شرع کے جھگڑوں میں اکبر اور محمد حکیم مرزا کا مقابلہ ہوا، لیکن حکیم مرزا کی اکبر کے مقابلے میں کوئی ہستی نہ تھی۔ چنانچہ اکبر کامیاب رہا اور اس کی کامیابی سے اہل شرع کو بُرے دن دیکھنے نصیب ہوئے۔ اب شریعت اور طریقت کا مقابلہ تھا۔ اور ان کے نمایندے عالمگیر اور داراشکوہ تھے۔ لیکن عالمگیر دارا کی یہ نسبت کہیں زیادہ باتدبیر اور بہادر تھا۔ چنانچہ وہی کامیاب ہوا اور طریقت کا طرفدار ناکام رہا۔ روضۃ القیومیہ میں تو اورنگ زیب کی وجہ خواجہ محمد معصوم کی دُعا لکھی ہے، لیکن مورخین کو اس سے بھی زیادہ واضح وجہ نظر آئیں گے۔ ایک تو اورنگ زیب نے تدبیر سے کام لیا اور دارا کے خلاف باقی سب بھائیوں کو اکٹھا کر لیا۔ دوسرے بہادری میں دارا، اورنگ زیب کی گرد کو بھی نہ پہنچتا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی بہادری اور بے غمی کا پہلا ثبوت چودہ برس کی عمر میں دیا تھا۔ جب وہ ایک مست ہاتھی کے سامنے کھلے میدان میں ٹٹ گیا۔ دوسرا قابل ذکر واقعہ ۱۶۲۶ء کو پیش آیا۔ جب بلخ کی مہم پر اورنگ زیب عبدالعزیز بلخی کے خلاف محرکہ آرا تھا۔ دونوں لشکر آپس میں ٹٹ رہے تھے کہ نمازِ ظہر کا وقت آگیا۔ ”در عین گرمی ہنگامہ پیکار وقت نمازِ ظہر در رسید۔ و آنحضرت با وجود التماس و امتناع بندہ ہائے ظاہر میں از مرکوبِ خاص فرود آمدہ صف آراء جماعت شدہ فرضِ وقت و نوافل را... (ابہ) کمال حضور و اطمینان ادا کردند“ عبدالعزیز خاں پر اورنگ زیب کی اس

لئے بعد میں یہ رنگ ہلکا ہو گیا۔ لیکن شروع میں جو اورنگ زیب کا حال تھا اس کا اندازہ ایک خط سے ہوتا ہے جو اس نے آیام شہزادگی میں شاہجہان کو لکھا اور جس میں والی گوگندہ کی نسبت کہا ہے۔ ”مرفض و سب اصحاب کبار را کہ محض کفر و زندقہ است در قلم و خوشنشان شالغ گردانیدہ“۔

جرات کا اتنا اثر پڑا کہ اس نے کہا۔ ”باچنیں کسے در افتادن بر افتادن است۔“ اور اورنگ زیب سے صلح کا خواستگار ہوا!

اورنگ زیب اور دارا کی قابلیت اور بہادری کا بہترین امتحان جنگ تخت نشینی کے دوران میں ہوا۔ سموگر ٹھہ کے میدان میں دونوں فوجیں لڑ رہی تھیں۔ دارا کے ہاتھی پر حملہ ہوتا شروع ہوا تو دارا ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو بیٹھا۔ فوج نے سمجھا کہ شہزادہ مارا گیا اور تتر بتر ہو گئی۔ اورنگ زیب کو بھی کھجورہ کے مقام پر یہی صورت پیش آئی۔ وہ ایک ہاتھی پر بیٹھا شجاع کے خلاف لڑ رہا تھا کہ ایک مست جنگی ہاتھی نے اس کے ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ اس موقع پر اگر بادشاہ کا ہاتھی بھاگ جاتا تو ساری فوج تتر بتر ہو جاتی، لیکن اورنگ زیب کی جرات اور قوت حوصلہ کام آئی۔ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہونا تو ایک طرف، اُس نے اپنے ہاتھی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوادیں کہ کہیں گھبرا کے بھاگنا نہ شروع کر دے!

دارا اور اورنگ زیب کے اوصاف میں جب یہ بین فرق تھا تو ظاہر ہے کہ کامیاب کون ہوتا۔ چنانچہ سنت الہی کے مطابق زیادہ قابل آدمی کامیاب رہا اور اورنگ زیب تختِ دہلی کا مالک بنا۔

اورنگ زیب کی تخت نشینی کے زمانے کی اخلاقی اور اجتماعی حالت کے متعلق ڈاکٹر سنٹر ایک مضمون میں

اصلاحاتِ عالمگیری

لکھتے ہیں:- ”لیکن نہ اکبر کا بیٹا اور نہ اس کا پوتا شاہجہاں بد چلنی اور بد اخلاقی کے اس طوفان کا مقابلہ کر سکا جو الحاد و تشکک کی تین نسلوں کے درمیان بڑھتا چلا آتا تھا۔ اکبر کے ایک بیٹے نے اپنے آپ کو شراب پی پی کے ہلاک کر دیا تھا۔ اور جب اس کی شراب بند کی گئی تو بندوق کی نالی میں چوری سے شراب منگوا لیا کرتا تھا۔ دہلی کا وہ محلہ جسے شیطان پورہ کہتے ہیں، اکبر کے زمانے کی یادگار ہے۔ بد چلنی لے سیلاب کے ساتھ توہم پرستی بھی آگئی تھی۔ جادو گروں، رتالوں اور کرامت کے دعوے داروں سے دار الخلافہ بھرا پڑا تھا۔ مغل دربار کا ایک فرانسیسی طبیب

لکھتا ہے یہاں دو پیسے لے کر ایک آدمی کی قسمت بتائی جاتی ہے اور اس جگہ ایک کونے میں ایک پرنگیز نجومی دوسروں کے ساتھ دری پر بیٹھا رمل و نجوم کی باتیں لوگوں کو بتاتا ہے اور اپنی انجیل کی تصویروں کو نجوم کے بُرج بنا کر اور اپنا قطب نما استعمال کر کے اپنا اُلوسیدھا کرتا ہے۔ بد اخلاقی تو ہم پرستی اور الحاد کی یہ دُنیا تھی۔ جس میں نوجوان، زاہد خشک اور نگ زیب نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ چنانچہ جب وہ بادشاہ ہوا تو اُس نے اپنی ساری کوششیں ان خرابیوں کا قلع مٹھ کرنے میں صرف کر دیں۔ تخت نشین ہونے کے بعد ہی اُس نے بھنگ وغیرہ کاشت کرنے کی ممانعت کر دی۔ شراب نوشی ممنوع قرار دی۔ جو ابند کر دیا۔ بدکاری کے خلاف پوری کوشش کی۔ بازاری عورتوں کو حکم دیا کہ یا تو وہ شادی کر لیں یا ملک چھوڑ دیں۔ ان احکام کی تعمیل کرانے کے لیے محتسب مقرر کیے۔ ۱۶۶۲ء میں اس نے ”ستی“ کی ممانعت کی اور بچوں کو بطور غلام یا خواجہ سرا بیچنے کے خلاف احکام جاری کیے۔ اس کے علاوہ اس نے خود اپنی پرہیزگاری اور سادگی سے اپنی رعایا کے لیے نیک مثال قائم کی۔ بادشاہ کے درشن کو موقوف کیا۔ اگرچہ وہ خود موسیقی کا ماہر تھا، لیکن اس نے گانے والوں اور گانے والیوں کو دربار سے ہٹا دیا۔ اس کی سالگرہ پر جو اسراف ہوتا تھا، اسے ترک کر دیا۔ اور شاہجہاں کی ضیافتوں اور فضول خرچیوں کی وجہ سے رعیت پر جو ٹیکسوں کا بوجھ پڑا ہوا تھا، اسے ہلکا کر دیا۔ اس نے تقریباً اسی ٹیکس معاف کیے۔ وہ عالموں اور بزرگوں کی قدر کرتا۔ اس نے ملک کا انتظام شرع کے اصولوں پر قائم کیا تھا اور عدل و انصاف کا محکمہ علما کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت اسلامی قوانین کے متعلق کوئی مستند اور جامع کتاب نہ تھی۔ اُس نے تمام ملک کے قابل علما کو جمع کر کے فتاویٰ عالمگیری کے نام سے حنفی فقہ کی ضخیم کتاب مرتب کروائی جو اب تک بڑی اہم اور مستند سمجھی جاتی ہے۔

وہ خود بڑی سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ بیت المال کے پیسے کو ہاتھ نہ لگاتا۔ اپنی روزی ثوبیاں بنا کر اور قرآن شریف لکھ کر کماتا۔ اُس نے ۱۶۶۷ء کو

بروز جمعہ نوے سال کی عمر میں بمقام احمد نگر وفات پائی اور اورنگ آباد سے بارہ کلوں کے فاصلے پر روضہ خلد آباد میں دفن ہوا۔ مرتے وقت اس نے وصیت کی تھی کہ چار روپے دو آنے جو میں نے ٹوپیاں بنا کر کمائے ہیں میرے کفن پر خرچ ہوں اور تین سو پانچ روپے جو میں نے قرآن شریف لکھ کر کمائے ہیں، مساکین میں تقسیم کیے جائیں۔ حسب وصیت اس کی تدفین نہایت سادہ ہوئی اور اس کی قبر پر کوئی عالیشان عمارت نہیں۔

ارباب ظاہر | اورنگ زیب کی زندگی ایک لحاظ سے اتباع و ترویج شریعت کی ایک نہایت روشن مثال ہے، لیکن جہاں اس کے عہد حکومت میں اتباع شریعت کی کوششیں بد اخلاقی، شراب خوری، جوئے اور بد چلنی وغیرہ کی بھنگنی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ وہاں بعض ارباب شریعت کی تنگ نظری کی بھی مثالیں موجود ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اہل ظاہر کی ایک اہم خصوصیت پر اپنے شاہکار تذکرہ میں تبصرہ کیا ہے۔

”افسوس جزئیات مزعومہ عقائد کے غرور باطل نے مسلمانوں کو جس قدر نقصان پہنچایا، کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ عمل صالح کی اہمیت بالکل جاتی رہی اور سارا دار و مدار چند مزعومہ عقائد پر آکر رہ گیا۔ ساری جستجو اور کاوش صرف اس کی ہوتی ہے کہ فلاں شخص کے عقائد کیسے ہیں۔ یعنی چند مزعومہ جزئیات غیر متعلقہ میں اس کے عقیدے کا کیا حال ہے؟ اس کوئی نہیں دیکھتا کہ اس کا عمل کیسا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں اتفاق جان و مال کا کیا حال ہے؟ تقویٰ و طہارت نفس کے لحاظ سے کیسی زندگی بسر کرتا ہے؟ بندہ کے ساتھ اس کا کیا سلوک ہے؟ اور خدا کے خوف سے دل خالی رکھتا ہے یا بھر لیا؟ معاملات میں کیا حال ہے۔ لین دین میں سچائی اور دیانت ہے یا نہیں؟ ایک شفیق باپ۔ رفیق بھائی۔ وفادار شوہر اور رحیم و غمگسار ہمسایہ ہے یا ایک بے رحم و جود۔ بے حس پھڑ اور مودی و مہلک مخلوق؟ ان ساری باتوں میں (جن کے الگ کر دینے کے بعد اسلام میں کوئی چیز باقی نہیں رہتی) اس کا حال خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر چند

اختلافی جزئیات میں ہمارا ہم آہنگ ہے تو ہمارے نزدیک اس سے افضل ہستی
روئے زمین پر کوئی نہیں ۛ

مولانا ابوالکلام آزاد نے اعمالِ حسنہ پر عقائد کو ترجیح دینے اور جزوی اختلافات کیلئے
تکفیر و تدلیل کرنے کی جس غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ آج کے ظاہر بینوں کی خصوصیت
نہیں بلکہ اہل ظاہر کا پُرانا شیوہ ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اس کی سینکڑوں مثالیں موجود
ہیں اور چونکہ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں اہل شرع کو زیادہ اختیارات حاصل تھے
اس لیے اس زمانے میں ایسے واقعات بھی زیادہ ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے انگریزی لیکچروں میں ایک جگہ کہا ہے کہ ”فقہ اسلامی آخری
ایام میں اسلام کے بہترین دماغوں کے ہاتھ میں نہیں رہی۔“ اور اگر ہندوستان کے بعض
قاضیوں اور مفتیوں کے حالات پڑھے جائیں تو اس خیال کی تائید ہوگی۔ ہندوستان
میں جو قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلام ہوئے ہیں اور جن کے احکام کو صاحبِ ایمان و
خوش عقیدہ بادشاہوں نے اس طرح نافذ کیا ہے کہ گویا بہشت و دوزخ کی کنجی ہی
ان بندگوں کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے حالات دیکھیں تو حیرانی ہوتی ہے کہ ان بزرگوں
کی زندگیوں کو کس طرح مسلمانوں کے لیے نمونہ سمجھا جائے۔

اورنگ زیب کے قاضی القضاۃ گجرات کے قاضی عبدالوہاب تھے جن سے متعلق
منوچی لکھتا ہے: ”اورنگ زیب نے ایک دن کہا کہ ہندوستان میں صرف دو آدمی ہیں جو
شراب نوشی سے بالکل مبرا ہیں۔ ایک میں اور ایک قاضی عبدالوہاب، لیکن عبدالوہاب
کے متعلق وہ دھوکے میں تھا۔ کیونکہ میں (منوچی) اُسے خود ہر روز شراب بھیجا کرتا تھا۔“
ہمارے خیال میں یہ قصہ جسے زمانہ سچاں کے اکثر مورخین نے صحیح تسلیم کر لیا ہے، محض
بہتان ہے اور ہم منوچی کو قابلِ اعتماد راوی نہیں سمجھتے۔ البتہ اس بات سے انکار
نہیں ہو سکتا کہ جب قاضی عبدالوہاب ۶۷۵ھ میں فوت ہوئے تو انھوں نے ایک
لاکھ اشرفیاں اور پانچ لاکھ روپیہ نقد علاوہ جواہرات اور اثاث البیت کے چھوڑے۔

ۛ ”یادِ ایام“ از مولانا عبدالحی (صفحہ ۶۸)

جمع اموال میں بھی اکبری عہد کے مخدوم الملک سے پیچھے نہیں رہے۔
 مورخین ان کی زراعت و زری بلکہ بددیانتی کی صاف شکایت کرتے ہیں۔ مآثر الامرا
 میں ان کے متعلق لکھا ہے :-

”قاضی حضور (کہ بڑھوتدین خود را و نمودہ در تمشیت امور جزوی و کلی لوے انا و
 لاغیری سے افراشت) امرے عمدہ از حساب بر میداشتند و از حد چوں کباب می خورد
 و بایں ہمہ میگویند کہ قاضی در احد و جریطوئے داشت۔ وزیر ہائے کثیر انداختہ بود۔
 اسی سلسلے میں ایک لطیفہ لکھا ہے۔ مہابت خاں لہر اسپ اورنگ زیب کا ایک
 امیر تھا۔ اسے حکم ہوا کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ دکن جائے اور وہ اس کے لیے تیار بھی ہوا۔
 ابھی دار الخلافہ کے گرد و نواح میں ہی تھا کہ اُسے پتا چلا کہ قاضی (عبدالوہاب) تین چار
 لاکھ روپے کی چیزیں کشمیر اور آگرے سے خرید کر تاجروں کے مال کے ساتھ احمد آباد بھیج
 رہے ہیں۔ اُس کی اور قاضی کی نہ بنتی تھی۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سب کچھ بلا منگوایا
 اور اپنی سپاہ میں تقسیم کر دیا۔ بادشاہ کے پاس شکایت ہوئی تو مہابت خاں نے کہہ دیا
 کہ مجھے فوج کے اخراجات کے لیے روپے کی سخت ضرورت تھی۔ سو اگر وہ اسے بطور
 قرض کے لیا ہے۔ منافع کے ساتھ واپس کر دوں گا۔ اب قاضی اس امر کا اظہار نہ کر سکتا تھا
 کہ اتنا مال متاع سب میرا ہے۔ چنانچہ اسے لہو کے گھونٹ پی کر خاموش رہنا پڑا۔
 قاضی عبدالوہاب کے صاحبزادے قاضی شیخ الاسلام کی نسبت لکھا ہے،
 ”اور بخلاف پدر دیانت واقعی داشت و ورع و صلاح او منسوب بر ریاست بود۔“ قاضی
 شیخ الاسلام کا نام اس اندھیری رات میں چراغ کی طرح چمکتا ہے۔ وہ واقعی پرہیزگار
 اور دیانتدار تھے۔ انھوں نے اپنے باپ کے ورثہ سے ایک پانی نہ لی اور جب اور گریب
 نے بجاویر پر حملہ کرنے کے متعلق ان سے استصواب کیا تو انھوں نے صاف صاف
 کہہ دیا کہ ایک مسلمان بادشاہ سے اس طرح جنگ شروع کرنی ناجائز ہے، لیکن ان کا دل
 قضا میں نہ لگتا تھا۔ چند سال خدمت کرنے کے بعد انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور
 باوجودیکہ بادشاہ بڑا زور دیتا تھا کہ وہ یہ کام سنبھالے رکھیں، لیکن انھوں نے طریقے سے

ٹال دیا۔ پہلے حج کو چلے گئے۔ پھر زیارتِ مقابرِ بزرگاں و ملاقات عیال و اطفال کے لیے رخصت لی اور اپنے آپ کو اس سلسلے میں الجھنے نہ دیا۔ اپنی قضاۃ کے زمانے میں بھی ان کا اصول تھا کہ گواہ بالعموم جھوٹ بولتے ہیں۔ ان کے بیان پر فیصلہ نہیں دینا چاہیے۔ منظرِ فسادِ زمانہ (کہ مزاجِ پاکذب و زورِ آشنا شدہ) انفصالِ قضا یا برہنہ و شواہد کے نمود۔ ان کے باقی سارے خاندان میں ان جیسا کوئی نہ تھا۔ ان کا اپنا بیٹا شیخ سراج الدین برار کا دیوان تھا۔ سرکاری روپیہ غبن کر کے خرچہ درویشی پہن لیا تاکہ کوئی باز پرس نہ ہو ان کے بھتیجے یعنی قاضی عبدالوہاب کے پوتے محمد معالی خان کی نسبت لکھا ہے ”خوگر شراب و شیفتہ لڑاکا بود“۔

مآثر الامرا میں اس زمانے کے قاضیوں کی بڑی شکایت کی گئی ہے :-
 ”ایں امر جلیل القدر را دین بدینا فروشان سخت آساں گرفتہ اند۔ زربا بر رشوت خراج
 مے کنند کہ تا با بطلان حقوق مردم صد چندان ستانند۔ نکاحانہ و مہرانہ را چلیل تر از شیر
 مادر میدانند۔ از قضات ارتقی قصبات چہ تو اں گفت کہ مس علم ایشان نصیب اعداست
 و گفتہ دلیسپاندیہ وز مینداریں کتاب و شرع آہناست ہر گاہ در شان قضات با علم و عمل
 حدیثے وارد شدہ (کہ از سہ قاضی یکے بہشتی است)۔ (و خواجہ محمد پارسا قدس سرہ) فصل
 الخطاب گوید کہ آن قاضی بہشتی ہم مگر قاضی بہشت باشد! اندازہ گمراہی و ضلالت
 ایں قوم کہ کمتر از جہال اند۔ کہ تو اند گرفت۔“

جب شرع کی تدوین و ترویج اور اہل شرع کی تنظیم قاضی عبدالوہاب اور ان جیسے بزرگوں کے ہاتھ میں رہی ہو تو ہمیں اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ اسلامی حکومت کی سات آٹھ صدیوں میں ایک بھی صاحبِ اجتہاد فقہ ہندوستان میں پیدا نہ ہوا۔ جو بزرگ شیخ عبدالحق کی طرح قابلِ سمجھ دار اور اسلامی مذہب و شریعت کی گہرائیاں سمجھنے والے تھے یا مجدد الف ثانی کی طرح اسلام کا درد اور اعلیٰ درجے کی اخلاقی جرأت رکھتے تھے وہ قاضی یا مفتی بننے سے کوسوں بھاگتے تھے۔ شریعت کی عام ترویج جن لوگوں کے ہاتھ میں رہی وہ زیادہ سے زیادہ اسی کے اہل تھے کہ فقہ کی کتابیں دیکھ کر

حرام حلال کے مسئلے بتادیں۔ کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ ملکی ضروریات کا خیال کر کے اور قوم کی بہبودی کو مد نظر رکھتے ہوئے شرع اور فقہ کی تدوین ان اصولوں پر کیے جن سے اسلامی حکومت دیر پا اور محکم ہو۔ جن لوگوں میں شریعت رائج ہے ان کے آرام و فلاح کا انتظام ہو۔ قوم کی اصلاح اور ترقی اس طرح ہو کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں سے آگے بڑھی رہے۔

سندھ میں عربوں کی آمد پر محمد بن قاسم اور دمشق کے مفتیوں نے فتنہ ہجرات میں اجتہاد سے کام لیا اور بت پرست ہنود کو وہ حقوق دیے گئے جو اہل کتاب کے لیے مخصوص تھے، لیکن اس کے پانچ سو سال بعد جب دہلی میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو باب اجتہاد بند ہو چکا تھا۔ اب علماء و فقہاء کی نظر کتابوں سے آگے نہ جاتی تھی اور ان کی ترجمانی میں بھی مغز کو چھوڑ کر استخوان کے تیچھے پڑتے۔ آج بھی کئی اسلامی ممالک ایسے ہیں جن میں تمباکو پینے پر تو دُرے لگائے جاتے ہیں اور اگر کوئی شخص شرعی حیلوں سے شارع کا تمام مقصد ضائع کر دے تو اس سے کوئی پرسش نہیں ہوتی۔ ایک شخص کا پا جامہ ٹخنوں سے نیچے آجائے تو وہ مستوجب سزا ہے، لیکن اگر وہی شخص تلواروں سے یکے بعد دیگرے اس طرح شادی کرے کہ ایک وقت میں چار سے زیادہ عورتیں اس کے نکاح میں نہ ہوں تو خواہ وہ نفس پرستی اور ہوس رانی میں اپنی زندگی گزار دے۔ اپنی اور دوسروں کی زندگی کو دوزخ کا نمونہ بنا دے، وہ قابل الزام نہیں۔ بعض ارباب شریعت کی اسی ظاہر پرستی پر اہل طریقت کو اعتراض رہا ہے اور اسی وجہ سے شریعت اور طریقت کا اختلاف بڑھا۔ اگر دونوں فریق افراط و تفریط کو ترک کر دیں۔ میانہ روی کا راستا اختیار کریں جو قرآن کریم کا صحیح طریقہ ہے اور جس پر رسول اکرمؐ عامل تھے تو یہ اختلاف مٹ جائے اور اس کے مٹ جانے سے اسلام کی روحانی اور اجتماعی زندگی کی ایک بڑی مشکل دور ہو۔

اسلامی مدارس اور ان کا نصاب تعلیم | اونٹنگ زیب ایک متدین بادشاہ تھا۔ اس نے شرع کے احکام پر اپنا نظام حکومت ترتیب دیا اور ان کی پوری پوری

پیروی کی، لیکن وہ کوئی تنگ نظر اور سادہ دل بادشاہ نہ تھا۔ اس کو اپنے زمانے کے علما اور مددگاروں کے تقاضے سے پوری آگاہی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک استاد کے سامنے اس زمانے کے طرزِ تعلیم پر جو تنقید کی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اُس زمانے کے طریقہ تعلیم کی کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھا۔

برنیر لکھتا ہے کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد جب اس کا ایک استاد کسی منصب کی ہوس میں اس کے دربار میں آیا اور درباری اُمرا سے جوڑ توڑ کر کے ایک بلند پایہ منصب لینے کے درپے ہوا تو اورنگ زیب نے ایک دن اُسے تھلیے میں بلا کر ایک طویل تقریر کی اور کہا:-

”مولانا! آپ کی کیا خواہش ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو دربار کے اقل درجہ کے اُمرا میں داخل کروں؟ میں جانتا ہوں کہ آپ کا مجھ پر حق ہوتا۔ اگر آپ مجھے کوئی کام کی تعلیم دیتے۔ لیکن آپ نے مجھے کیا پڑھایا؟ آپ نے مجھے بتایا کہ فرنگستان ایک معمولی سا جزیرہ ہے جہاں سب بڑا بادشاہ پچھلے پرنگال کا حاکم تھا۔ پھر الینڈ کا بادشاہ ہوا۔ اور اب شاہ انگلستان ہے۔ فرانس اور اندلس کے حکمرانوں کے متعلق آپ نے مجھے بتایا کہ وہ ہمارے معمولی راجاؤں کی طرح ہیں اور شاہنشاہان ہندوستان ان سب حکمرانوں سے بڑے ہیں۔ انھی میں ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر اور شاہجہاں ہوتے ہیں جو شاہانِ عظیم فاتحانِ جہاں اور بادشاہانِ عالم ہیں۔ آپ نے مجھے بتایا کہ ایران کا شہر تاتار۔ یگیو۔ سیام اور چین کے حاکم شاہ ہند کا نام سن کر کانپتے ہیں۔ سبحان اللہ! آپ کے علمِ جغرافیہ و تاریخ دانی کا کیا کہنا! کیا آپ کا فرض نہ تھا کہ آپ مجھے دنیا کی تمام قوموں کی خصوصیات آگاہ کر کے یہ بتاتے کہ ان ملکوں کی پیداوار اور ان کی جنگی طاقت کا کیا حال ہے۔ یہ لوگ کس کس کس ڈھب سے ہیں۔ ان کے رسم و رواج اور مذہب و حکومت کے طریقے کیسے ہیں؟ ان کی پوشیدہ پالیسیاں کیا ہیں؟ آپ کا فرض تھا کہ مجھے تاریخ کی باقاعدہ تعلیم دے کر حکومتوں کے آغاز اور ان کی ترقی و منزل کے اسباب بتاتے۔ ان واقعات، حادثات اور غلطیوں کے آگاہ کرتے۔ جن کی وجہ سے بڑے بڑے انقلابات ظہور میں آتے ہیں۔ خیر دنیا کی تاریخ

سے پوری اور گہری واقفیت دلانا تو درکنار آپ نے مجھے میرے آباؤ اجداد کے نام بھی پوری طرح نہیں بتائے۔

آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ ایک شہزادے کی تعلیم کے لیے کون سے مضامین درکار ہیں۔ یہی سمجھا کہ مجھے بس صرف ونحو کی بڑی ہمارت چاہیے اور مجھے وہ علم حاصل کرنا چاہیے جس کی ضرورت ایک قاضی یا نقیہ کو ہوتی ہے۔ اس طرح آپ نے میری جوانی کا قیمتی زمانہ لفظوں کے سیکھنے کی خشک بے فائدہ اور لامتناہی کوشش میں صرف کر دیا۔

آپ نے میرے والد ماجد سے کہا کہ ہم نے اسے فلسفہ پڑھایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کے کئی برس تک میرے دماغ کو ان فضول اور احمقانہ مسائل سے پریشان کیا۔ جن کا زندگی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔ بیشک آپ نے میری زندگی کے بہترین سال اپنے دلپسند لیکن خیالی مسائل کی بحث میں صرف کر دیے۔ جب میری تعلیم ختم ہوئی تو مجھے علم و فن سے سوائے اس کے کوئی واقفیت نہ تھی کہ میں چند ایسی دقیق اور مشکل اصطلاحیں استعمال کر سکتا تھا۔ جن سے روشن سے روشن دماغ والے انسان گھبرا جاتے ہیں اور جن سے فلسفے کے دعویدار اپنی جہالت اور ناواقفیت پر پردے ڈالتے ہیں!

اگر آپ مجھے وہ علم سکھاتے جو عقل اور سمجھ کے اصولوں پر دماغ کی تربیت کرتا ہے اور اسے صحیح اور وزنی دلائل کا طلبگار بناتا ہے یا مجھے وہ باتیں بتاتے جن سے حوادثِ زمانہ کے مقابلے میں انسان اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ نہ مصائب اسے پریشان کرتی ہیں اور نہ خوشی اور کامیابی سے اس کا دماغ بگڑتا ہے۔ یا اگر آپ مجھے انسانی فطرت کے رموز واقف کر دیتے یا مجھے دنیا کا اس کے مختلف حصوں کا اور اس کے نظام کا پورا پورا حال بتا دیتے تو مجھ پر آپ کے احسانات سکندر اعظم پر اسطو کے احسانات سے بڑھ کر ہوتے اور میں پوری طرح آپ کی قدر افزائی کرتا۔

یہ اندراج ہم نے برنیر کے سفر نامے سے لیا ہے جو عہدِ عالمگیری میں دیر تک اس ملک میں مقیم رہا اور بعض امرا سے دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اب بعض اہل تحقیق کہتے ہیں کہ یہ تقریر برنیر کے نہانخانہ دماغ کی تخلیق ہے۔ عالمگیر کے خیالات کا اظہار نہیں۔

ممکن ہے کہ یہ شبہ جائز ہو، لیکن اس سے اصل بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو اعتراضات اس میں درج ہیں وہ فی نفسہ اس قدر وزنی ہیں کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور کیا یہ امر قابل افسوس نہیں کہ جو کوتاہیاں ایک طرف ہیں اجنبی کو حقوڑے ہی قیام کے بعد نظر آگئیں، ان سے ہمارے اربابِ حل و عقد اتنی صدیاں غافل رہے؟

اورنگ زیب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس نے غیر مسلموں کو دسہم برہم کر دیا۔ مولانا شبلی نے ایک زوردار اور رسالے میں اور مسٹر فاروقی نے ایک مبسوط انگریزی کتاب میں اس اعتراض کی تردید کی ہے۔ لیکن پروفیسر جادوناٹھ سرکار نے سالوں کی محنت اور تحقیق و تفتیش کے بعد اورنگ زیب کے خلاف جو مواد جمع کیا ہے اور جس چالاک سے اسے عالمگیر کے خلاف استعمال کیا ہے۔ اس کا تملک ان کتابوں میں ہوتا۔ اس کے لیے ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جو اس زمانے کے ایک ایک واقعہ سے پوری طرح واقف ہو، کوئی محاصرہ تصنیف اس کے مطالعہ سے باہر نہ رہی ہو اور پھر وہ پروفیسر سرکار جتنی قابلیت اور ان سے زیادہ انصاف پسندی کے ساتھ ان کے زہر کے لیے تریاق تیار کرے۔ ظاہر ہے کہ ہماری مختصر کتاب میں اس مسئلے پر طویل بحث کی گنجائش نہیں، لیکن ہم اس سلسلے میں دو ایک باتوں کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں پہلی تو یہ طلب بات یہ ہے کہ جو غیر مسلم مورخین اورنگ زیب کے احکام سے اسلام کے متعلق نتائج اخذ کرتے ہیں یا جو مسلمان سمجھتے ہیں کہ اورنگ زیب فرشتہ ثابت نہ ہوا تو اسلام مطعون ہوگا۔ وہ

تغاسب امور کا خیال نہیں رکھتے۔ اسلام کی بنیاد احکام عالمگیری بلکہ فتاویٰ عالمگیری پر نہیں۔ ”کتاب الہدیٰ“ پر ہے اور اسی کے مطابق یہ مذہب پرکھا جاسکتا ہے۔ اگر عالمگیر یا کوئی دوسرا مسلمان اس کے سمجھنے میں غلطی کرے تو اس سے سارا مذہب مطعون نہیں ہو سکتا۔ اسلام کے حسن و قبح کا اندازہ تو قرآن کریم ہی سے ہو سکتا ہے جو ہماری طواری کے معاملے میں بہت واضح ہے۔ لا اکلہ فی الدین۔

اس کے علاوہ بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پھیلانی جاتی ہے کہ اورنگ زیب کے طرزِ عمل سے

ہندو گزشتہ ہو گئے تھے اور اس سے مغلہ حکومت کو زوال ہوا۔ اس کے متعلق ڈاکٹر تارا چند کی رائے پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ فرماتے ہیں :-

”بعض لوگوں کے نزدیک اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی اس کی ناکامیابی کا سبب تھی۔ بالعموم یہ خیال غلط ہے۔ ہندوؤں کی بغاوتیں ناکام رہیں اور ان کا کوئی مذہبی یا سیاسی مقصد نہ تھا۔ اورنگ زیب نے انھیں ہندوؤں ہی کی مدد سے فرو کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرہٹوں کے خلاف جنگ مغلہ سلطنت کے لیے ایک بار عظیم ثابت ہوئی، لیکن ان کی بغاوت نہ ملکی تھی نہ مذہبی۔ فقط ایک قبیلے کی بغاوت تھی اور دوسرے قبائل کی بغاوت سے بہت مختلف نہ تھی۔ راجپوت، ہندیکے اور شیواجی کے اپنے رشتہ دار اورنگ زیب کی خاطر شیواجی اور اس کے جانشینوں کے خلاف لڑے اور پھر مرہٹوں نے ہندوؤں کے خلاف بھی حملے کیے اور ان کے لشکروں میں مسلمان بھی موجود تھے۔“

سری۔ سی رائے نے بھی اپنی تقریر میں ایک اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ”جو لوگ شیواجی کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا مقصد ہندو دھرم کا احیا تھا اور وہ مغلوں کے خلاف قومی جدوجہد کا رہنما تھا، وہ غلطی پر ہیں۔“

مرہٹہ تاریخ کے ضمن میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ شیواجی کا دادا مسلمان پیروں کا بڑا معتقد تھا اور حضرت شاہ شریف کا مرید تھا، جو احمد نگر میں مدفون ہیں۔ اپنے مرشد کے نام پر اس نے اپنے بیٹوں کے نام شاہ جی اور شریف جی رکھے، جو فی الحقیقت مسلمانوں کے نام ہیں۔

مرہٹوں کے علاوہ اورنگ زیب کے صوبیداروں کو گورو گوبند سنگھ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کشمکش میں بعض افسوسناک واقعات ظور پذیر ہوئے، لیکن غیر مسلم مورخین یہ امر بھول جاتے ہیں کہ اپنی وفات سے پہلے گورو گوبند سنگھ جی مغل فوج میں ایک عہدے پر مقرر ہو گئے تھے اور جب انھیں کسی پٹھان نے ذاتی عداوت کی بنا پر زخمی کیا۔ تو اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ نے اپنا خاص طبیب ان کے معالجے کے لیے بھیجا۔

خوشحال خاں خطک

اورنگ زیب کے مخالفین میں صرف مرہٹے اور سکھ نہ تھے، بلکہ اسے افغان قبائل کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔

افغان بغاوت کا راہنما خوشحال خاں خطک تھا، جو پشتو شعر کا سرتاج ہے۔ وہ بیک وقت صاحب السیف و القلم تھا اور اس کے اشعار میں جوش، آزادی، افغانوں کی فوقیت اور مغلوں کی مخالفت کی آگ اس طرح بھری ہوئی ہے کہ ایک زمانہ گزرنے پر بھی ان کے افسردہ دل گرم ہو جاتے ہیں۔ وہ قبیلہ خطک کا سردار تھا۔ شاہجہان نے اس کا حق سرداری قبول کر لیا اور شاہجہاں کا ذکر اس نے ہمیشہ تعریف سے کیا، لیکن اورنگ زیب نے چند ایک شکوک کی بنا پر اسے گرفتار کر لیا اور رنجنپور کے قلعے میں کئی سال قید رکھا۔ اس قید و بند نے خوشحال کو ہمیشہ کے لیے عالمگیر بلکہ تمام مغلوں کا دشمن بنا دیا اور جب اسے وفاداری کے وعدے پر آزادی ملی تو اس نے اس وعدے کا ایفا ضروری نہ سمجھا اور کچھ دیر بعد جب سرحد پر آفریدیوں نے بغاوت کی تو اس نے اپنے پُراثر اشعار سے اس آگ کو اور بھڑکایا اور کئی سال تک بغاوت کی تائید کی۔ حتیٰ کہ خود اورنگ زیب کو اٹک کے قریب دو سال تک ڈیرے ڈالنے پڑے۔ یوسف زئی افغانوں کی مدد اور زر و مال کی تقسیم سے (جس سے سرحد کے اکثر مسائل حل ہوتے ہیں) اورنگ زیب نے بالآخر اس شورش کو فرو کیا اور خوشحال خاں کا اپنا بیٹا بہرام باپ کے خلاف مغلوں سے مل گیا، لیکن خوشحال خاں کی آتش انتقام فرو نہ ہوئی۔ اس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور جب ساتھیوں کی ترک رفاقت کے لیے ہو گیا تو اشعار میں اپنے دل کا بخار نکالا۔

ظلم سے اکبر بہتوں کے چپے رہنا چاہیے

اور کچھ نہ بن پڑے تو شعر کہنا چاہیے

پاکستانی ادبیات میں خوشحال خاں کی شخصیت اس قدر دلچسپ ہے کہ فقط اس کی تصنیفات پر تبصرہ کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ یہاں ہم لے متعام شکر سے کہ دوست محترم خاں صاحب کا ایل ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے اپنی بڑی کتاب (خوشحال خاں خطک) لکھ کر یہ کام پورا کر دیا۔

اس کے چند اشعار کا ترجمہ درج کرتے ہیں جن سے پتا چلے گا کہ اس جوشیلے مکرشف ہیں افغان کے دل میں اورنگ زیب اور مخلوں کی نسبت کیا خیالات گزر رہے تھے۔ اورنگ زیب کی نسبت اس کی رائے غیر جانبدارانہ نہیں، لیکن اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اورنگ زیب کے دشمن اس کی نسبت کیا کہتے تھے۔ خوشحال مغل بادشاہ کے متعلق ایک نظم میں لکھتا ہے (ترجمہ)

”میں اورنگ زیب کے عدل و انصاف کو خوب جانتا ہوں!
اور اس کے دین و مذہب اور نفس کشی اور روزہ داری سے بھی واقف ہوں!
کیا اس کے سب بھائی ایک ایک کر کے اس کی تلوار کے شکار نہیں ہوئے؟
اور اس کے باپ کو شکست کھا کر قید خانہ کی مصیبتیں نہیں بھیلنی پڑیں؟
خواہ کوئی شخص دن میں ہزار بار سجدے کرے اور زمین پر سر مارے۔
اور روزوں کی کثرت سے اس کی نافت ریڑھ کی ہڈی سے مل جائے۔
جب تک اس کے دل میں نیکی نہ ہو۔

اس کی سب عبادتیں اور طہارتیں مکروہ یا ہیں۔
اورنگ زیب کی زبان کچھ اور کہتی ہے اور اس کا دل کچھ اور ہی سوچتا ہے۔
خدا کرے کہ اس کے دل اور گردے مجروح ہو جائیں اور وہ تیغ و تفتک کا شکار ہو۔
لیکن خوشحال کو فقط اورنگ زیب سے عداوت نہ تھی۔ آہستہ آہستہ اس عدالت نے ایک قومی رنگ اختیار کر لیا اور اس نے تلقین شروع کی کہ افغان پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کر لیں۔ اس نے کئی نظموں میں قدیم افغان بادشاہوں اور بہادروں کا ذکر کر کے افغانوں کو ابھارا ہے۔ ایک قصیدہ میں مغل فوج کے خلاف اپنی فتوحات گنا کر اور اورنگ زیب کی گھبراہٹ کا ذکر کر کے لکھتا ہے۔ (ترجمہ)

جب صورتِ حالات یہ ہو تو دوسری باتیں ہو سکتی ہیں۔
کر یا تو مغل دنیا سے نیست و نابود ہو جائیں یا افغان تباہ ہو جائیں۔
اگر جو کچھ ہم دیکھتے ہیں یہی نیرنگی روزگار کا تقاضا ہے۔

اور یہی خدا کی مرضی ہے تو پھر یہ کچھ ہو کے رہے گا۔

زمانہ ہمیشہ ایک ہی روش پر نہیں چلتا۔

آج یہ پھول پر مہربان ہے تو کل کانٹے پر۔

سوائے تلوار کے کسی اور چیز سے نجات نہیں ملتی۔

جو افغان اس کے سوا کچھ اور سوتیلا ہے وہ گمراہ ہے۔

افغان تیغ زنی میں مغلوں سے کہیں بڑھ کے ہیں۔

کاش کہ عقل اور سمجھ میں بھی وہ زیادہ محتاط و ہوشیار ہوں۔

اگر جدا جدا قبیلے سب ایک دوسرے کی مدد کریں۔

تو بادشاہوں کو بھی ان کے سامنے سر جھکانا پڑے۔

ایک نظم میں افغان بادشاہوں کا ذکر کر کے افغانوں کی ہمت افزائی کی ہے۔ (ترجمہ)

بہلول کی شہرت اور شیر شاہ کی۔ میرے کانوں میں آتی ہے۔

جو ہندوستان کے افغان بادشاہ تھے۔ بڑے بہادر اور منتظم۔

انہوں نے چھ سات قسملوں تک اس عقل سمجھ سے حکومت کی

کہ ساری دنیا ان کی تعریف سے گونجتی تھی۔

خوشحال نے ہندوستان میں ایک عرصہ گزارا تھا اور جانتا تھا کہ مغلوں کا عسکری

نظام کھوکھلا ہو چکا ہے۔ وہ ایک غزل میں کہتا ہے (ترجمہ)

مغل جو اب میری آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں۔ پہلوں کی طرح نہیں۔

اب ان کی تیغ و تفتک کا زمانہ گزر گیا اور فقط قلم ان کے پاس ہے۔

وہ افغانوں کو زرو مال سے خریدتے ہیں اور مکرو فن سے انہیں پھنساتے ہیں۔

مغلوں سے افغان عداوت کے آثار صرف خوشحال کی شاعری میں ہی نہیں ملتے

اس زمانے کے دوسرے افغان شعرا کے کلام میں بھی اس کا اظہار ہے۔ حمید کا ایک

پشتو شعر ہے۔ (ترجمہ)

مغل جس گھر میں پیچھے پتھروں کی طرح

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا دنیا میں بے انصافی کی وجہ سے آگ لگ گئی۔

ایک اور مشہور شاعر خواجہ محمد کا شعر ہے۔ (ترجمہ)

اورنگ زیب کی بادشاہی میں انصاف نہیں ملے گا۔

میں، خواجہ محمد، نکل جاؤں گا کسی اور طرف کو۔

اس کے اظہار سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان لوگوں کو اسلام سے دلچسپی نہ تھی یا یہ کہ وہ افغان عصبیت کا شکار تھے۔ انھیں تو اصل میں مغلوں اور ان کے کارندوں کی بے انصافی سے شکایت تھی۔ خوشحال خاں نے قلعہ زن پور کی قید میں جہاں کابل اور پشاور کو یاد کیا ہے وہاں لاہور کو فراموش نہیں کیا ہے وہ ہوا جو کابل کی طرف سے اٹھ کر آتی ہے۔

مجھ پر غبر چھڑکتی ہے۔

جب کوئی کابل کا نام لیتا ہے۔

میرے سینے میں جوش اٹھتا ہے۔

اگر کوئی پشاور کا ذکر کرتا ہے۔

تو میرا دل روشن ہو جاتا ہے۔

جو کوئی لاہور کا نام لیتا ہے۔

تو اس سے بھی میرے دل کو دلاسہ ہوتا ہے۔

کابل و پنجاب کے خواہ آدمی ہوں یا گئے۔

جو نہی مجھے دکھائی دیتے ہیں۔

میرا دل بے اختیار ان پر گر پڑتا ہے۔

ابھی تک اسلامی قومیت اور ملی یک جہتی کے زیر اثر افغانوں اور مغلوں کے قبائلی

اختلافات رفع نہ ہوئے تھے، لیکن اسلام سے خوشحال خاں خطک کو بھی اسی طرح محبت

تھی جس طرح اورنگ زیب کو۔ اور اس کی نظموں میں مذہبی رنگ جھلکتا ہے ایک

نظم کے چند اشعار ہیں۔ (ترجمہ)

تمام تیراہ میں مؤذن کی آواز نہیں سنائی دیتی۔
 سوائے اُس بانگ کے جو مرغِ سحر کے گلے سے نکلتی ہے۔
 اور بارگِ زنی وہ بھی راہِ ہدایت سے دُور جا پڑے ہیں۔
 اور آفریدی تو ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔
 نہ وہ نماز پڑھتے ہیں اور نہ ہی ان کے ہاں کوئی مُلا ہے۔
 نہ وہ زکوٰۃ صدقہ دیتے ہیں اور نہ ہی ان کے دلوں میں خدا کا خوف ہے۔
 نیک وہی ہے جو نبی کے احکام اور شرع کی پیروی کرتا ہے۔
 اور بد بخت وہ ہے جو ان کی بجائے اور ہی میں ٹال مٹول کرے۔
 معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کی مروجہ صورت سے خوشحال کو بڑی شکایت تھی۔
 اس نظم میں آگے چل کر لکھتا ہے۔ (ترجمہ)
 صوفیہ کے قائل اور ملحد سبھی ایک سے ہیں۔
 کیونکہ دونوں شرع اور احکامِ نبوی سے پہلو بچاتے ہیں۔
 گاہے گاہے کبھی کبھار وہ کہہ لیتے ہیں۔
 (ان میں سے چند ایک) لا الہ الا ہُو۔

لیکن وہ ہمیشہ گناہوں میں شر اور رہتے ہیں اور تائب نہیں ہوتے۔
 خدا بچائے ان لوگوں سے، یہی خوشحال کی دُعا ہے!
 خوشحال خاں خطک کی شاعری میں ایک آگ ہے، لیکن وہ اپنے مقاصد میں
 کامیاب نہ ہوا۔ مغلوں کی حکومت ایک قوم یا قبیلہ کی حکومت نہ تھی، بلکہ اس وسیع
 سائبان کے نیچے تمام مسلمانوں کے لیے آگے بڑھنے کا موقع تھا۔ خوشحال خاں خطک
 کے اپنے خاندان نے ان موقعوں سے فائدے اٹھائے، بلکہ جب دکن میں مرہٹوں کے ساتھ

۱۔ خوشحال خاں کو روہ کے ایک بڑے ولی اللہ شیخ رحیمکار سے تعلق خاطر تھا اور ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کی
 صحبت اور شاہ ادیس صدیقی ملتانی کے درس سے بھی اس نے فیض حاصل کیا تھا۔

متعلوٰں کی طویل کشمکش شروع ہوئی تو اورنگ زیب کا بڑا بہادر وزیر خاں اور دوسرے افغان
جرنیل تھے۔ مغلیہ حکومت کے زوال سے اسلامی ہندوستان کے متعلق افغانوں کی
ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں۔ اس دور ابتلا میں امام الہند شاہ ولی اللہ جیسے بزرگوں کی
کسی طرف نظر اٹھتی تھی تو وہ احمد شاہ ابدالی تھا اور اس مرد مجاہد نے بھی اسلامی
ہندوستان کی پاسبانی اور بالخصوص سنی علما و زعماء کی حمایت میں کبھی کوتاہی نہ کی۔

علوم و فنون | اکبر کی وفات ۱۶۰۵ء میں ہوئی اور اس کی جگہ جہانگیر تخت نشین
ہوا۔ وہ شراب اور عیش کا دلدادہ لیکن سمجھ دار اور معاملہ فہم
بادشاہ تھا۔ توڑک جہانگیری سے اُس کی قوت مشاہدہ اور ذہانت کا اندازہ ہو سکتا
ہے۔ اسی اکبر کی مذہبی بوالعجبیوں کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن باقی باتوں میں اکبر کی پیروی کی۔
اور اس کے زمانے میں فنون لطیفہ کو بڑا فروغ ہوا۔ وہ شعرا کا قدردان تھا۔ دربار کا ملک الشعرا
طالب آملی تھا جس کے کئی اشعار پر لطف ہیں۔ فن تعمیر میں بھی عہد جہانگیری کے کئی
نمونے موجود ہیں، لیکن اس زمانے میں سب سے زیادہ فروغ مصوری کو ہوا۔ جس کا جاگیر
ایک اچھا نقاد تھا۔ عہد جہانگیری کے بہترین مصور چار تھے۔ ابوالحسن جسے "نادر الزمان"
کا خطاب ملا تھا اور منصور جسے "نادر العصر" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ
بشن داس اور فرخ بیگ بھی مشہور تھے۔ مورخین کئی تھے۔ اس عہد کے علما و صلحا
کا ذکر شیخ عبدالحق کے تذکرے کے ضمن میں ہر جگہ ہے۔

۱۶۲۶ء میں شاہجہاں تخت نشین ہوا۔ اس کا زمانہ خاندان مغلیہ کا سب سے زیادہ
شاندار اور پر شکوہ عہد حکومت ہے۔ فارسی کا مشہور شاعر صائب اسی زمانے میں
ہندوستان آیا، لیکن ملک الشعرا سے دربارِ کلیم تھا، جس کا مد مقابل قدسی سمجھا جاتا
تھا۔ علما و فضلا میں عبدالحکیم سیالکوٹی، سعد اللہ خاں وزیر اعظم اور ملا محمد جوہر
مشہور تھے۔ مورخین کئی تھے۔ جن میں محمد امین فزوی، عبدالمجید لاہوری اور
راجا بہاری مل قابل ذکر ہیں۔ مصور بھی بہت تھے۔ شاہجہان کے زمانے میں
ہندوستانی مصور ایرانی اور ولایتی مصوروں سے فن مصوری سیکھ کر خود اپنے کامل

ہوئے تھے کہ وہ ایرانی مصوروں کا بخوبی مقابلہ کر سکتے تھے۔ اور اس عہد کے مشہور مصوروں میں زیادہ تر ہندوستانی بلکہ ہندو ہیں۔ مصوری سے زیادہ جن بات میں شاہجہان کا زمانہ ممتاز تھا وہ اسلامی فن تعمیر کا عروج ہے۔ اس زمانے میں تاج محل۔ لال قلعہ جامع مسجد دہلی۔ جہانگیر کا مقبرہ اور دوسری عمارتیں تعمیر ہوئیں جنہیں دیکھ کر عقل و نگ رہ جاتی ہے اور جن سے بہتر فن تعمیر کے نمونے شاید ہی دنیا میں کہیں ہوں۔ اور نگ زیب کے زمانے میں موسیقی اور مصوری پر زوال آگیا۔ وہ خود شعر کا صحیح نقاد تھا اور اس نے کم از کم ایک نہایت پُر اثر اور بلیغ شعر خود لکھا ہے۔

غم عالم فراوان است و من یک غنچہ دل دارم
چسپاں در شیشہ ساعت کنم نگیناں را

لیکن اس۔ ملک الشعرا کا عہدہ موقوف کر دیا۔ مرزا بیدل فطرت۔ ناصر علی سرہندی اور نعمت خاں عالی اس کے زمانے کے شعرا ہیں، لیکن کفایت شعرا اور گزینے ان کی کوئی قدر نہ کی، بلکہ دس سال کی وقائع نویسی کے بعد درباری مورخ کا عہدہ بھی موقوف کر دیا اور تاریخ نویسی کی ممانعت کر دی۔ اس کے باوجود اس کے زمانے میں کئی مورخین ہوئے۔ اور نگ زیب نے اپنی توجہ زیادہ تر رعیت کی خوشحالی۔ ٹیکسوں اور محصولوں کی کمی اور تعلیم کی اشاعت پر مبذول رکھی۔ اس کا زمانہ فنون لطیفہ کے لیے سازگار نہ تھا۔ البتہ شریعت اور علوم اسلامی کی اشاعت خوب ہوئی۔ اس نے اشاعت علم کو بڑی ترقی دی۔ مدرسوں کے لیے زمینیں وقف کیں اور اساتذہ کے مشاہرے اور طلباء کے لیے شاہی خزانے سے وظائف مقرر کیے۔

اور نگ زیب کے عہد حکومت میں علوم اسلامی کی بڑی قدر ہوئی۔ لیکن قدرت کی نیزنگیاں دیکھیے کہ پچاس سال کے طویل عرصے میں نہ تو شیخ عبدالحی محدث الہند شاہ ولی اللہ جیسا کوئی جید عالم اور نہ ہی حضرت سلطان المشائخ یا حضرت مجدد الف ثانی جیسا کوئی زبردست شیخ نظر آتا ہے۔ البتہ مدرس اور فقیہ کثرت تھے اور بعض خاصے تھے۔ ان میں سے ایک قابل ذکر مہر میر محمد زاہد ہروی کی تھی جو کلام و حکمت میں

اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ ان کے والد قاضی محمد اسلم ہرات کے رہنے والے تھے لیکن بودرباش کابل میں اختیار کر لی تھی۔ قاضی محمد اسلم نے لاہور میں شیخ بہلول سے تعلیم پائی اور عہدِ چانگیری و شاہجہانی میں محضرِ عہدوں پر مامور رہے۔ پہلے کابل میں قاضی تھے۔ پھر قاضی عسکر ہو گئے۔ شاہجہاں نے ایک مرتبہ ان کا وزن کر کے وزن کے برابر روپے انعام دیے۔ قاضی محمد اسلم کی وفات ۱۰۵۱ھ میں ہوئی اور لاہور میں دفن ہوئے (سبحۃ المرحان)۔ ان کے صاحبزادے میر محمد زاہد ہندوستان میں پیدا ہوئے اور شاہجہان نے انھیں کابل میں واقعہ نویسی پر مامور کر رکھا تھا۔ عہدِ عالمگیری میں وہ پہلے محتسب لشکر اور بعد میں صدارت کابل پر مامور ہوئے۔ اس تقریب سے انھیں دلجمعی سے اپنے وطن میں بلٹھے کر تالیف و تصنیف کا موقع ملا۔ انھوں نے کئی ایک درسی کتب مثلاً شرح مواقف۔ شرح تہذیب دوآنی اور رسالہ تصور و تصدیق مصنفہ ملا قطب رازی پر حاشیے لکھے جو اب بھی رائج ہیں۔ ان کی وفات ۱۰۹۹ھ میں ہوئی۔ جن لوگوں نے ان سے دار الخلافہ میں براہ راست استفادہ کیا۔ ان میں شاہ ولی اللہ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم کا نام بھی شامل ہے۔ ہندوستان میں اس وقت سب سے زیادہ فروغِ علمائے پورب کو حاصل تھا۔ شیخ عبدالحق محدث کی جلالی ہوئی شخصیں دہلی میں مقیم ہو چکی تھیں۔ پنجاب میں ملا عبدالحمید کا فیض ان کے صاحبزادے ملا عبداللہ نے جاری رکھا۔ لیکن وہ گوشہ نشینی کی طرف زیادہ مائل تھے۔ اگرچہ گجرات میں اب بھی درس و تدریس کا معیار بلند تھا اور آخر عہدِ عالمگیری میں وہاں مولانا نور الدین احمد آبادی جیسے علما ہوئے، لیکن جو امتیازی شان اس وقت بلادِ مشرق کے علما کو حاصل تھی وہ کسی دوسرے صوبے کو تین نہ ہوئی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کی مخصوص خوبیوں کے باوجود عہدِ عالمگیری سے لے کر مغلیہ سلطنت کے خاتمے تک عام دنیوی درس و تدریس میں دہلی اور باقی حصص ملک کی نسبت لکھنؤ اور دوسرے اضلاع شرقی کی درسگاہیں زیادہ رونق پر تھیں۔ اس وقت بھی ان علاقوں میں ایسے علما تھے جن کے سامنے دوسروں کے چراغ مٹنے لگے ایک بزرگ شیخ احمد

المعروف ملا جیون ایٹھوی تھے (وفات ۱۷۱۷ء) جو لکھنؤ کے قریب قصبہ ایٹھی کے رہنے والے تھے۔ عالمگیر خود ان کا شاگرد تھا۔ ان کی تصانیف میں سے ایک تفسیر احمدی ہے۔ جس میں ان آیات کی تفسیر ہے جن سے مسائل فقہ مستنبط ہوتے ہیں۔ ان کی نور الانوار اصول فقہ میں متنازع کی شرح ہے۔ ایک اور بزرگ حافظ امان اللہ بنارس تھے (وفات ۱۷۲۱ء) جو لکھنؤ میں عہدہ صدارت پر متعین تھے۔ انھوں نے علم فقہ اور علم کلام پر کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ علمائے فرنگی محل لکھنؤ کے مورث اعلیٰ ملا قطب الدین سہالوی بھی اسی زمانے میں شہادت پائی تھے (۱۷۹۲ء) ان کے علاوہ شیخ غلام نقشبند لکھنوی بھی جنھوں نے علم تفسیر اور فن تصوف میں متعدد کتابیں لکھیں ذکر کے قابل ہیں۔ ان کی وفات ۱۷۱۲ء میں ہوئی۔ سید عبد الجلیل بلگرامی (وفات ۱۷۳۲ء) جو حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی کے نانا اور خود ایک پرگو شاعر اور کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ طریقت میں شیخ غلام نقشبند کے مرید تھے، لیکن ان سب سے زیادہ اس زمانے کے جس بزرگ نے علمی حلقوں میں نام پایا اور محققات کو درسیات میں بڑی ممتاز جگہ دے دی۔ قاضی محبوب اللہ بہاری تھے۔ وہ لکھنؤ اور حیدر آباد دکن میں قاضی رہے۔ پھر اورنگ زیب جانشین بہادر شاہ کے بیٹے شہزادہ رفیع القدر کے آلیق مقرر ہوئے اور عالمگیری کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تمام ہندوستان کی صدارت پر مامور رہے۔ ۱۷۱۷ء کے اواخر میں وفات پائی۔ آپ نے فقہ اور منطق کی بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن میں سے بعض آج بھی مستعمل ہیں۔ مسلم الثبوت فقہ اور اصول فقہ کے متعلق آپ کی ایک بلند پایہ کتاب ہے اور علامہ بحر العلوم اور دوسرے علماء نے اس پر حاشیے لکھے ہیں منطق میں آپ کی مشہور کتاب سلم العلوم ہے۔ ان کے علاوہ اقادات جوہر فرد اور دوسرے رسائل آپ کی یادگار ہیں۔

عہد عالمگیری میں شیخ عبدالحق محدث اور شاہ ولی اللہ کے پایہ کا کوئی عالم نظر نہیں آتا۔ لیکن اب بادشاہ کی علم نوازی اور قدردانی علماء سے علم و فضل کو بے حد فروغ دیا۔ اور درس علوم اسلامی نے بڑی وسعت اختیار کی۔ درس نظامیہ عالمگیری کی

وفات کے کئی سال بعد مدون ہوا، لیکن ملا نظام الدین کو جن کے نام پر یہ طریق تدریس نظامیہ کہلاتا ہے، عالمگیری نے ہی فرنگی محل لکھنؤ کی عالیشان عمارت مدرسہ کے لیے عطا کی۔ اس طریق تعلیم میں جو کتابیں برصغیر کی رائج ہیں ان کا اکثر حصہ عہد عالمگیری میں لکھا گیا۔ اور وہ بھی بادشاہ کے منظور نظر علما (مثلاً میرزا ہد۔ ملا محب اللہ بہاری) کے قلم سے۔ یہ کہنا بیجا نہیں کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں علوم اسلامی نے جو فروغ پایا۔ اور دین کا جو احیا ہوا، اس کی بنیاد عہد عالمگیری میں رکھی گئی۔

فتاویٰ عالمگیری | عہد عالمگیری کی دو تین کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک ملا محسن (متوفی ۱۰۷۰ھ) کی رد شیعہ ہے جس

میں انھوں نے دلائل و براہین سے شیعوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ دوسری بحم الفرقان ہے۔ جسے مولانا محمد مصطفیٰ بن محمد سعید نے اورنگ زیب کے نام معنون کیا۔ یہ فلوکل کی کتاب کی طرح کلام مجید کے الفاظ کا اندکس ہے۔ تیسری کتاب

عہد عالمگیری کی سب سے اہم تصنیف فتاویٰ عالمگیری ہے جسے ہندوستان کے حنفی علما ہادیہ کے بعد بہترین فقہی کتاب سمجھتے ہیں۔ فقہ کے متعلق اس وقت کئی کتابیں موجود تھیں۔

لیکن کوئی مبسوط اور مکمل کتاب نہ تھی۔ جب اورنگ زیب باقاعدگی سے شروع راج کی تو اس نے محسوس کیا کہ کئی باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق صحیح شرعی فیصلے پر پہنچنے میں

دقت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے ہندوستان کے ممتاز علما کی ایک جماعت کو حکم دیا کہ فقہ کی تمام کتب سے ”مفتی بہا مسائل“ منتخب کر کے ایک کتاب تیار کی جائے جو فقہ

کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ اس جماعت کے صدر شیخ نظام تھے۔ علما کے لیے وظائف مقرر ہوئے اور آٹھ سال کی محنت کے بعد کتاب تیار ہوئی۔ اس کی تیاری

میں دو لاکھ روپے صرف ہوئے۔ معاصرانہ تذکروں سے خیال ہوتا ہے کہ بادشاہ اس کی تدوین و تالیف میں خود شریک تھا۔ وہ کتاب کا ایک صفحہ و ذرا نہ ملا نظام سے

بڑھوا کر سناتا تھا اور اس پر جرح قدح کرتا تھا۔ فتاویٰ عالمگیری کے متعلق معارف کے ایک مضمون نگار لکھتے ہیں ”حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب نے علماء اور طلباء کو فقہ کی

تمام کتابوں سے بے نیاز کر دیا۔

مرآۃ العالم میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے نامور فاضل ملا عبداللہ رومی چلی کو حکم دیا کہ وہ اور اُن کے شاگرد فناوے عالمگیری کا فارسی میں ترجمہ کریں، لیکن اس ترجمے کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ غالباً وہ تکمیل کو نہیں پہنچا۔ حال میں نو لکھنؤ پریس نے ایک اردو ترجمہ فناوی ہندیہ کے نام سے شائع کیا ہے۔ کوئی پانچ ہزار صفحے کی کتاب ہے۔ دس جلدوں میں۔ شروع میں دوسو سے زیادہ صفحے کا مقدمہ ہے جس میں ان علما و فقہاء کے مختصر حالات ہیں جن کی تصانیف و آراء سے مدد لی گئی۔ ابتدا کی دو جلدیں زیادہ تر ارکان مذہب مثلاً نماز، حج، روزہ، زکوٰۃ کے متعلق ہیں۔ جلد سوم ایمان، حدود، سرقہ اور اس قسم کے اہم مسائل کے متعلق ہے۔ چالیس صفحے باب ارتداد کے لیے وقف ہیں۔ چوتھی جلد میں زیادہ تر کاروباری مسائل ہیں۔ مثلاً شرکت، بیوع، وقف، پانچویں جلد بیشتر عدالتی امور کے متعلق ہے۔ بعض عنوانات ہیں۔ ادب القاضی، کتاب الشهادات، کتاب الوکالت۔ چھٹی ساتویں اور آٹھویں جلدوں میں قانونی مسائل ہیں۔ جن کا بڑا حصہ فوجداری امور کے متعلق ہے۔ جلد نہم کا سب سے اہم باب ذمیوں کے متعلق ہے اور جلد دہم میں ستر سے زائد صفحوں کا باب الجیل ہے۔ کتاب کا طریق کار یہ ہے کہ اہم مسائل فقہ کی مشہور اور مستند کتابوں کے اقتباسات مآخذ کے حوالوں کے ساتھ جمع کر دیے گئے ہیں اور یہ انتخاب اور ترتیب اس محنت اور احتیاط کے ساتھ کی گئی ہے کہ جو مسائل قاضی یا مفتی کو پیش آسکتے ہیں، ان کے متعلق مشہور فقہاء کی رائے بغیر کسی دشواری کے دستیاب ہو سکتی ہے۔

عالمگیر اور بزرگانِ سرہند | پروفیسر محمد فرمان اپنی کتاب حیات مجدد میں

اے مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں ان فقہاء کی مذمت کی ہے جو فقہی کتب میں باب الجیل کو شامل کرتے ہیں لیکن جس قانونی نظام میں سزائیں کڑی اور صریح ہوں اور سزا دینے والے کو اس کا اختیار نہ ہو کہ جرم کی معمولی صورتوں میں سزائیں مؤخر تخفیف کر سکے۔ وہاں بے انصافی اور جرم سے بچنے کے لیے باب الجیل ناگزیر ہے۔

لکھتے ہیں :-

”بھانگیر شاہ جہاں اور اورنگ زیب بھی شہنشاہ پہلے تھے۔ اور اس کے بعد ان کے دلوں میں اسلام کی محبت اور شریعت کی ترویج کا خیال تھا؟“ (ص ۵۸)

بنیادی طور پر تو یہ خیال صحیح ہے کہ یہ تینوں بادشاہ ملکی مصلحتوں کا خیال رکھتے تھے۔ اور اس میں فقط ان کی شخصی یا خاندانی خود غرضی نہ تھی۔ اگر ہم اس تباہی کا خیال کریں جو حکومت کے زوال سے اسلامی مرکزوں (مثلاً سرسند) پر آئی تو مسلمان بادشاہوں کی اپنی (یعنی مسلمانوں کی) حکمرانی برقرار رکھنے کی کوشش معیوب نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن عالمگیر کے متعلق تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اس نے اپنی ”شہنشاہت“ کو ”اسلام کی محبت اور شریعت کی ترویج“ پر مقدم رکھا۔ یہ درست ہے کہ (اکابر سلسلہ مجددیہ سے بڑی موانست اور احترام کے باوجود) اس نے مکاتیب امام ربانی کی نسبت ایسے احکام جاری کیے جو بزرگان سرسند کو ناگوار تھے، لیکن ان احکام کے پس پشت بھی شریعت کے بے اعتنائی نہ تھی بلکہ ان کا مقصد بھی فتاوے علما کی پیروی اور شرع کی ترویج تھا۔

حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادگان گرامی، خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد مصطفیٰ کے ذمہ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان بزرگوں کے مجموعہ کے مکاتیب میں متعدد خطوط اورنگ زیب کے نام ہیں۔ اور عالمگیر نامہ کے وہ اندراجات بھی نقل کر چکے ہیں جن کے ان بزرگوں اور عالمگیر کے روابط پر روشنی پڑتی ہے۔

مکتوبات سعیدیہ میں کل سو مکاتیب ہیں۔ ان میں سے نو عالمگیر کے نام ہیں ایک خط خاص طور پر اہم ہے۔ اس کا اقتباس ملاحظہ ہو :-

”الحمد للہ کہ بطلوع آفتاب ہدایت، ظلمات کفر و ضلالت رو با نعدام آورد۔ و بیخ الحاد و بدعت از با افتاد و زیات عدل و انصاف باقی اعلیٰ رسید۔۔۔ معہذا اگر از راہ عنایت و دین پروری مابقی من الفواحش و المنکرات و منع بر خے از منہیات و مسکرات بمقتدایان خدمات اسلام تاکید اہتمام رو و نور علی نور است و در باب تعمیر ساجد مندر و مدارس مسئلہ و ترفیہ علما و فضلا و تکریم زہاد و صلحا احکام واجب الاستعلام شرعاً و

یابد۔ موجب اعلائے ارکان شریعت بریضا و تمکین دولت عظمیٰ بطریق اتم باشد۔

زیادہ برائے جرأت از حد ادب و راست۔ (۳۷)

خواجہ محمد معصومؒ کے اہم مکاتیب اس زمانے کے ہیں۔ جب انھوں نے اپنے صاحبزادے شیخ سیف الدین کو دار الخلافہ میں بھیجا تھا۔ اس سلسلے میں پہلا خط شیخ سیف الدین کے نام ہے۔

آنچہ در احوال پادشاہ دین پناہ سلمہ اللہ مرقوم نموده بودند از سر بیان ذکر در لطافت و حصول سلطان ذکر و رابطہ و قلت خطرات و قبول کلمہ حق و دفع بعض منکرات و ظہور لوازم طلب ہمہ بوضوح پیوست۔ شکر خداوند جل شانہ بجا آورد۔ در طبقہ سلاطین اس نوع امور حکم عقلے مغرب دار و (ج ۱)

اگلا خط پادشاہ کے نام اور پادشاہ کے ایک خط کے جواب میں ہے۔ فرمان عالیشان کہ از کمال عنایت و مہربانی مرقوم قلم عنبریں رقم گشتہ بود خواجہ محمد شریف بخاری در اعزاز مندر رسانید و فقرائے مینوار ابرہہ تشریفات عالیہ بنواخت۔۔۔ الحمد للہ و المنۃ کہ فقیر زادہ منظور نظر قبول گشتہ و اثر صحبت بھجول انجامید و از معروف و نہی منکر کہ شیعہ فقیر زادہ است، اظہار تشکر و رضامندی نموده است۔ شکر خداوندی جل شانہ بریں عطیہ بجا آورد (ج ۲) ایک اور خط میں عالمگیر کو لکھتے ہیں:-

”کیفیت سعی باطن را در کتابت فقیر زادہ پیش نوشتہ است، بنظر عالی در آمدہ باشد۔ استمداد توجہ غائبانہ ازین شکستہ فرمودہ اند۔ ہر چند از راہ دعا گوئی قدیم سابقا ہم اکثر بدعا و توجہ آنحضرت مشغول بودہ، درینولا کہ ایں قسم مہربانیا و خصوصیت در میان آمدہ، خود بجمع ہمت بطریق معمود ایں سلسلہ علیہ در ترقی باطن و از دیار کیفیت اک و استقامت

لے یہ سب ذکر سوم میں ہیں، جو ایک مرتبہ امر تیسریں چھپا تھا۔ لیکن اب عنفا کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے ہم نے تمام اہم متعلقہ اندراجات نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ تینوں دفاتر کا ایک کار آمد شخص (اردو میں) مولانا نسیم احمد امروہی نے مکتوبات خواجہ محمد معصوم ہر مندی کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں ہم خطوط کے اقتباسات کے ترجمے ہیں۔

ظاہر نیز مقتید است و بیچ و بیہ توقیر رضا ندارد“ (۳/۲۲۲)

ایک خط میں شیخ سیف الدینؒ کو لکھتے ہیں :-

نوشتہ بودند کہ در مجالس سلطانی طرفہ اسرار لازم الاستتار جلوہ میدہند۔ و بجز
دخول بآن محافل بعروج و نزول خاص ممتاز می سازند۔ بلے اہل کمال از ہر بقعہ
فیوض و اسرار مناسبتہ آن بقعہ اخذ می نمایند۔ و از ہر زمین کمال مناسبت آن زمین
میگیرند۔ در احوال بندگان حضرت بزرگاشہ بودند کہ از وسعت لطیفہ اخفی
و مناسبت تام بآن خبر میدہند از مطالعہ آن ذوقہا کرد۔ لطیفہ اخفی اعلا سے لطائف
است و ولایت آن فوق سائر لطائف است و این لطیفہ را خصوصیتے ست خاص
بہ سرور کائنات و مفر موجودات علیہ و علی آلہ الصلوٰات و التسلیمات و البرکات
فقیر نیز ایشان را مناسبت بہ لطیفہ اخفی در سے یابد (۳/۲۳۲)

شیخ سیف الدین کے نام کے ایک اور خط میں بادشاہ کا ذکر ہے :-

آنچہ از احوال پادشاہ دین پناہ مرقوم نمودہ بودند۔ ہمہ بوضوح انجامید۔ در طبقہ سلطین
ظہور این نوع امور از غرائب روزگار است۔ نوشتہ بودند کہ مبداء تعین خود را
صفت علم یافتہ اند و لے فرمایند کہ باین صفت مبارک بیشتر مناسبت یافتہ میشود
از مطالعہ آن خطہا نمود۔ نزدیک بود کہ رقص کند۔ حق سبحانہ از برکات این صفت
بزرگ بہرہ تام عطا فرماید (۳/۲۴۲)

ان اقتباسات سے پتا چلتا ہے کہ اگرچہ عالمگیر نے حضرت خواجہ محمد معصومؒ سے
بیعت نہ کی تھی (ورنہ اس اہم امر کی صراحت ہوتی) لیکن اس نے ان کے صاحبزادے
شیخ سیف الدینؒ سے بعض اشغال نقشبندیہ سیکھے۔ اور خود حضرت خواجہؒ سے ”توسیع غائبانہ“
کی آرزو کی۔

مکتوب معصومیہ (دفتر سوم) میں دو اور دلچسپ خطوط ہیں۔ ایک کامگار خاں کے نام
جو وزیر سابق جعفر خاں کا بیٹا اور خود ایک منصبدار تھا۔ دوسرا بنجا اور خاں کے نام جسے

لہ بنجا اور خاں سے خواجہ نقشبند ثانی کے تعلقات اور بھی گہرے تھے۔ جیسا کہ ان کے مکتوب ۶۹ سے ظاہر ہے۔

مرآۃ العالم، اس کی ترمیم شدہ صورت مرآۃ جہاں نما اور ریاض الاولیاء کا مصنف کہا جاتا ہے۔ وہ عالمگیر کا ایک محترم اور عزیز عہدیدار تھا۔ علما و مشائخ کا قدر دان تھا۔ اور ان کے بادشاہ سے روابط کا ایک ذریعہ تھا۔

مندرجہ بالا اقتباسات اور حوالوں سے بزرگانِ سرہند اور عالمگیر کے قریبی روابط کا پتا چلتا ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک زمانے میں عالمگیر نے مکتوباتِ امام ربانی پڑھائے جانے کی ممانعت کا حکم جاری کیا تھا۔ معارج الولاۃ میں ۲۵ شوال ۱۰۹۰ھ کا ایک خط درج ہے، جو عالمگیر کے ایما پر قاضی شیخ الاسلام (جو اپنے والد کی جگہ قاضی القضاۃ ہوئے) کی مہر سے قاضی اورنگ آباد کے نام لکھا گیا۔ (۔۔۔) حسبِ الحکم بادشاہ اسلام بھر قاضی شیخ الاسلام بجانب قاضی اورنگ آباد رسید ایہ حکم حسبِ ذیل تھا:-

از قرار تاریخ بیت و ہفتم شہر شوال سنہ یک ہزار و نو و ہجری، آنکہ شریعت پناہ فضائل و کمالات دستگاہ، فقہیت انتباہ قاضی ہدایت اللہ بعافیت باشندہ درینہ بعض مقدس محلے رسید کہ بعضے مواضع مکتوبات شیخ احمد سرہندی ظاہر و مخفی

۱۰ ان تینوں کتابوں کا اصل مصنف شیخ محمد بقا سہارنپوری کو سمجھنا چاہیے۔ انہوں نے حدیث کی سند شیخ نور الحق محدث دہلوی سے لی۔ باقی علوم سرہند میں جا کر شیخ عبداللہ المعروف حضرت میاں سے پڑھے۔ اور خواجہ محمد معصوم کے مریدوں میں داخل ہوئے (ملاحظہ ہو خاتمہ مرآۃ جہاں نما) چنانچہ ان تینوں کتابوں میں بزرگانِ سرہند کے متعلق کافی معلومات مل جاتی ہیں۔ اور ان کا نقطہ نظر بھی ”سرہندی“ ہے۔ مآثر عالمگیری کا مصنف ساقی مستعد خاں پہلے بختاورد خاں کا منشی اور دیوان تھا۔ غالباً بختاورد خاں اور اس کے رفقاء سے کار کو بزرگانِ سرہند سے خاص لگاؤ تھا۔ مآثر عالمگیری میں حضراتِ سرہند کے متعلق کئی اندراجات ہیں۔ اور ہندو مسلم معاملات (مثلاً تمام ممالک مجربہ میں غیر اسلامی معابد اور پرستش گاہوں کے ”خاتمہ“) کے متعلق ان کے بیانات بڑے جوشیلے ہیں۔ بلکہ عالمگیر کے معترض اکثر اس کتاب کے حوالے دیتے ہیں۔

عقائد اہل سنت و جماعت است۔ و معتقدان شیخ مذکور کہ در بلدہ اورنگ آباد
نچستہ بنیاد سکونت دارند۔ ترویج آل بیشتر دہند و تدیس سے نمایند۔ اعتقاد حقیقت
باطلہ مذکورہ دارند۔ حکم والا شرف صدور یافت۔ کہ ایں خادم شریعت با شریعت پناہ
بنویسد۔ کہ آئینہ از رشد و درس آل منع کند۔ کسے کہ معلوم شود۔ کہ معتقد عقائد باطلہ
مذکور است اور ایسے شرعی رسانند۔ لہذا نگارش سے باید۔ کہ بر طبق حکم مطاع
واجب الاتباع بہ عمل آرند و حقیقت بر نگارند۔

۹۰۴

[معارف الولاہت مخطوطہ شملہ ۱۲۸۱ کتابخانہ و نشاۃ پنجاہ ورق]

یہ خط ۲۵ شوال سنہ ۱۲۹۰ (مطابق ۳ نومبر ۱۸۷۹ء) کا ہے۔ اور قاضی اورنگ آباد
کے نام ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تین چار سال بعد دار الخلافہ میں بھی مکتوبات
امام ربانی کے خلاف ایک ہنگامہ ہوا۔ روضۃ القیومیہ میں قیوم ثالث (خواجہ محمد نقشبند)
کی قیومیت کے سال پانزدہم کا سارا باب اسی کے متعلق ہے۔ چونکہ روضۃ القیومیہ کے
مطابق قیوم ثالث کی قیومیت کا آغاز ۱۱ ربیع الاول ۱۲۹۰ء کو ہوا۔ اس لیے یہ واقعات
سنہ ۱۲۹۰ء کے متعلق ہی ہو سکتے ہیں۔ روضۃ القیومیہ کے اندراج کا خلاصہ یہ ہے کہ جب
”طریقہ احمدیہ مصومیہ“ نے بڑا فروغ پایا تو دشمنوں نے حسد سے طریقہ کی مخالفت شروع کی۔
ستین خط بادشاہ کی طرف سے جلی لکھ کر سر بند بھیجے۔ جن کی بادشاہ کو مطلق خبر نہ تھی۔
ایک حضرت قیوم ثالث رضی اللہ عنہ کے نام۔ دوسرا شیخ سیف الدین کے نام اور
تیسرا مولوی فرخ شاہ صاحب کی طرف۔ جن کا مضمون یہ تھا۔ کہ حضرت مجدد الف ثانی
رضی اللہ عنہ کے مکتوبات کی بعض عبارتیں بظاہر مخالف شرع ہیں۔ اور تمام علمائے
متفق ہو کر اس بات کا فتوے دیا ہے کہ مکتوبات کا پڑھنا پڑھانا بند کر دیا جائے۔ اس بابے
میں ایک مختصر یہ تمام علما کے دستخط کر کے سارے مخالف اکٹھے ہو کر دار الخلافہ میں
آئے۔ اور اس طریقہ کے خلفا کو پیغام بھیجا۔ کہ تمہارے شیخ کے کلام کے بعض حصے
شرعیہ کے موافق نہیں۔ تم اگر اس کا جواب دو جو شرع کے مطابق ہو۔ روضۃ القیومیہ

۱۵ روضۃ القیومیہ رکن سوم ص ۴۳ - ۴۴

بیان کے مطابق "احمدی اور معصومی تمام خلفاء دار الخلافہ میں جمع ہوئے۔ مخالفوں نے جو سوال کیے۔ ان کے ثنائی اور شریعت کے مطابق جواب دیے کہ مخالفوں کو اعتراض کی گنجائش نہ رہی۔۔۔ پھر بادشاہ نے انھیں اپنے پاس بلایا۔۔۔ مناظرہ ہونے لگا۔ جس میں مخالفین نے نیچا دیکھا۔ بادشاہ نے انھیں بہت شرمندہ کیا۔"

روضۃ القیومیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ مخالفین کے جواب میں بہت سے رسالے لکھے گئے فقط حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد نے بہتر رسالے لکھے اور خلفاء کے مکاتیب و رسائل کو ملا کر سب کی تعداد تین سو ساٹھ تھی۔ مولوی فرخ شاہ صاحب یہ رسائل لے کر بادشاہ کے پاس آئے تو اس نے ان کی بڑی عزت کی اور یقین دلایا کہ جو خطوط مشائخ سہروردیہ کے نام میری طرف سے لکھے گئے ان کی مجھے خبر نہیں۔ ہم روضۃ القیومیہ کے متعلق لکھ چکے ہیں کہ یہ ایک خاص نقطہ نظر سے لکھی گئی۔ اور بغیر مزید تصدیق کے اس کے اندراجات پر اعتماد نہ کرنا چاہیے۔ واقعات کو رنگ لگا کر بلکہ موڑ توڑ کر اور ڈرامائی انداز سے پیش کرنا مصنف کا دلپسند طریق کار ہے، لیکن معارج الولاۃ میں بھی استفادہ کے تحت کئی صفحوں پر مخالفین کے فتوے درج ہیں اس لیے بعید از قیاس نہیں کہ فریقین میں کوئی بحث و مناظرہ ہوا ہو۔

معارج الولاۃ میں قاضی شیخ الاسلام کا جو خط درج ہے، وہ تاریخی نقطہ نظر سے معلومات افزا اور غور و فکر کا مستحق ہے۔ اور خواجہ محمد نقشبندؒ کے مکاتیب سے بھی نفس مضمون (یعنی مکاتیب امام ربانی کے بعض اندراجات کے متعلق اور رنگ زیب اپنے شبہات) کی کسی حد تک تائید ہوتی ہے۔ لیکن مکتوبات کے پڑھنے پڑھانے کی اس میں جو ممانعت ہے اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ عالمگیر کے متعلق یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس نے دیوان حافظ کے پڑھنے پڑھانے کی ممانعت

لے غالباً یہ بھی رسالہ استفادہ ہے جس کا ذکر خواجہ محمد نقشبندؒ کے مکتوبات میں ہے قاضی شیخ الاسلام کے نام کے مکتوب (۲۲) میں بھی انہی بحثوں کی طرف اشارہ ہے۔

کر دی تھی۔ اگرچہ یہ کتاب اُس کو بے حد عزیز تھی۔ اور بقول ایک تذکرہ نگار کے اس کے سر ہانے رہتی تھی۔ دوسری قابل ذکر حقیقت یہ ہے کہ اس امر کے قومی شواہد موجود ہیں کہ معارج اللہ اور روضۃ القیومیہ میں بیان کردہ بحثوں کے بعد بھی عالمگیری کے دل میں بزرگان سرہند کی ٹہنی قدر رہی۔ اور ان کے ساتھ اس کے روابط بڑے گہرے تھے۔ خواجہ محمد معصوم کے صاحبزادے خواجہ محمد نقشبند، جنہیں قیوم ثالث کہا جاتا ہے، کے مکاتیب کا ایک حصہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب نے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو جو مخطوطہ ملا۔ وہ ”کسی نہایت بدخط اور غلط نویس کا تب کا لکھا ہوا تھا۔“ انھوں نے کسی بزدلوں کو تصحیح کی زحمت دی، ”لیکن پھر بھی غلطیاں رہ گئیں۔“ یہ غلطیاں اتنی فاش ہیں کہ بعض جگہ تو مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ اور ایک آدھ طویل خط کے متعلق

مثلاً اس اہم خط کو لکھیے، جو مکتوبات امام ربانی کے متعلق معاصرانہ رسالہ استفتا کے بارے میں ہم معلوم کا حامل ہے۔ متعلق عبارت ملاحظہ ہو۔ ”تجربہ نمودہ اند۔“ [کہ جواب] از رسالہ استفتا [نہ نمودہ حقیقت حال] آن کہ دریں [باب] بادشاہ دین پناہ۔ شیخ [؟] بالمشافہ بعضے حقائق از رسالہ موصولہ ایشان بہ ایں فقیر بیان نمودند۔ و چیز بابہ زبان نیز فرمودہ اند کہ نقل تفصیل آن طوے دارد۔ چوں دریاں وقت فقیر از حقیقت حال واقع نہ بود۔ از راہ علم و دانائی ایشان تعجب و استیفاءے آن (۹) نمود۔ بعد ازاں [بادشاہ بہ] شیخ عبد اللہ فرمودند کہ آن رسالہ را پیش ایشان [خواجہ محمد نقشبند] خواہی بُرد تا مطالعہ نمایند۔ و بر حقائق آن واقع شوند۔ و ہر چند گفتہ شد۔ شیخ مذکور نیاورد۔ کوچ ہم در میان بود۔ دریاں فرصت قلیل اطلاق بر حقائق و توجیہ آن بعید نمود۔ [مکتوب ۱۱۸] خط کے باقی حصے میں مکتوبات امام ربانی کے متعلق توجیہ و تاویل سے کام لیا ہے۔ اور اصلاح حال کے لیے [مکتوب امیر] سے لکھا ہے کہ ”متصدیان دربار مثل قاضی القضاۃ و عبد الرحیم خاں وغیرہاں کہ از دوستان و معتقدان این سلسلہ علیہ اند“ کو اس بارے میں لکھا جائے۔

مندرجہ بالا اقتباسات میں بین القوسین عبارت ہماری ہے جو قیاس پر مبنی ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارا قیاس غلط ہو، لیکن ظاہر ہے کہ جن صورت میں یہ عبارت درج ہے اسے بغیر کسی قیاسی اضافہ کے باقی اگلے صفحہ پر آ

تو خیال آتا ہے کہ شاید اصل ناقل کو منتشر اور اراق ملے۔ اور نقل کرتے وقت صفحات کی ترتیب ہی بدل گئی، لیکن اس کے باوجود مجموعہ بے حد اہم ہے۔ خواجہ محمد نقشبند قریباً عہد عالمگیری کے پینتیس سال تک مسند ارشاد و ہدایت پر متمکن تھے۔ اس لیے عالمگیر اور حضرات مجددیہ کے تعلقات جاننے کا سب سے مستند ذریعہ یہ مجموعہ ہے۔ اس میں ایک مکتوب ہے جو یقیناً اس زمانے کا ہے، جب عالمگیر نے گولکنڈہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ یا اسے ابھی فتح کیا تھا۔ اس میں ایک اہم خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:-

و دیگر فقیر بہ قصد زیارت حرمین الشریفین از وطن برآمدہ بود۔ در اثناء راہ فرمان پادشاہ دین پناہ بہ دستخط خاص مشتمل بر کمال اشتیاق و اختصاص رسید۔ بموجب مہربانیہائے آن حضرت خود را بہ خدمت ایشان رسانید۔ عنایات بے غایات فرمودند و دریں موسم رخصت نہ نمودند۔ و بادشاہ زادہ محمد کام بخش را در حضور خود طلبیدہ بہ ایں فقیر سپردند۔ کہ من ہم در صحبت بزرگان ایشان ایں طریقہ علیا خطہا یافتہ ام۔ شما ہم از ایشان استفادہ نمائید۔ و بخدمت ایشان مشغول شوید۔ حسب الامر فقیر بادشاہ زادہ را مشغول ساختہ معظوظ گشتند۔ روز دیگر بحکم بادشاہ دین پناہ بہ فقیر خانہ نیز رسیدند۔ خود (عالمگیر) ہم چند نوبت مکرر آمد و رفت نمودند۔ [مکتوب ۱۶۹]

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ محاصرہ کے وقت عالمگیر نے مسند کے اہم ترین شیخ کے ساتھ خاص ارتباط کا اظہار کیا۔ اور اپنے چاہیتے بیٹے کام بخش کو اسی طرح توجہ

[بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۶۹]

پوری طرح سمجھنا ناممکن ہے۔ البتہ قیاسی اضافوں کے بغیر بھی یہ امر واضح ہے کہ اس میں رسالہ استفادہ کا ذکر ہے، جو بادشاہ کو ملا تھا۔ [اور جو بعد کی عبارت سے مکتوبات امام ربانی کے متعلق معلوم ہوتا ہے۔] بادشاہ نے خواجہ نقشبند سے اس کے متعلق ذکر کیا۔ اور بعض باتیں کہیں جنہیں انھوں نے نقل کیا۔ [چیز باب زبان نیز فرمودند کہ نقل تفصیل اُن طویل دارد] خواجہ صاحب یہ رسالہ نہیں دیکھا تھا اس لیے انھوں نے ان بیانات پر فقط تعجب کا اظہار کیا۔ خواجہ نقشبند ثانی کے مکتوبات کی بڑی تاریخی اہمیت ہے۔ اگر وہ سارے کے سارے پوری صحت کے ساتھ شائع ہو گئے۔ تو عہد عالمگیری کے متعلق ہماری معلومات میں بڑا اضافہ ہوگا۔

دلانی۔ جس طرح اُس نے خود خواجہ محمد معصوم کی زندگی میں حاصل کی تھی۔
فتح بجاپور و گولکنڈہ کے زمانے میں خواجہ محمد نقشبند سے بادشاہ کے جو خاص روابط تھے
ان کا ثبوت محاصرہ کتب تواریخ سے ملتا ہے۔ مآثر عالمگیری (ترجمہ شائع کردہ شمارہ نویری)
کے صفحہ ۱۹۶ پر شیخ محمد نقشبندی [نقشبند] سرہندی کی بادشاہ سے ملاقات اور
گفتگو کا بیان ہے۔ اسی کتاب کے صفحہ ۲۱۹ پر ان کے بیٹے شیخ محمد عمر سے تانا شاہ والی
گولکنڈہ کی بیٹی بیاہ جانے کا ذکر ہے۔ جب یہ خیال کیا جائے کہ والی گولکنڈہ کی
دوسری دو بیٹیاں وزیر سلطنت اسد خاں اور سابق والی بجاپور کے بیٹوں سے بیاہی
گئیں، تو اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ محمد نقشبند کو بادشاہ کی نظروں میں کس قدر وقعت
و احترام تھا۔

مآثر عالمگیری کے اور کئی اندراجات ہیں جن سے شیوخ سرہند اور عالمگیری کے
روابط پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً جلوس کے سال یا زوہم کے ضمن میں ذکر ہے کہ جب
شاہزادہ محمد اعظم کی شادی ہوئی۔ تو دو گواہوں میں سے ایک شیخ (سیف الدین) سرہندی
تھے۔ اسی طرح بارہویں سال جلوس کے ضمن میں لکھا ہے :-

قبلہ عالم تیرہ محرم کو ایک گھڑی رات گزرنے کے بعد باغ حیات بخش کے راستے سے
شیخ سیف اللہ (سیف الدین) سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر تشریف لے گئے
اور دیر تک حقائق و معارف کی گفتگو فرما کر دولت خانہ پر آگئے۔

شیخ سیف الدین کے متعلق یہ بیانات تو ابتدائی عہد عالمگیری کے ہیں، لیکن درکن
والے تمام اندراجات ۸۹-۹۸ھ کے متعلق یعنی مکتوبات کے متعلق قاضی شیخ الاسلام
کے خط کے بہت بعد کے ہیں۔ اس زمانے کا ایک اور معمولی واقعہ ہے جس سے سرہندی
سلسلے سے بادشاہ کے اختصاص کا اظہار ہوتا ہے۔ ۹۹ھ کے آغاز میں جب ابھی

خواجہ نقشبند ثانی کا وقار و احترام اور طریقہ کار فی انفس کی نظر میں جس طرح کھٹکتا تھا اس کی ایک جھلک فتح خاں
عالی کے وقائع میں نظر آتی ہے جس کے کئی صفحے مشیخان سرہندی وطن کی ہجو سے پُر ہیں۔

راپچور فتح ہوا تھا۔ ایک آدمی آیا۔ اور کہنے لگا کہ میں بادشاہ کا مرید ہونے کی خاطر دور دراز ملک بنگالہ سے آیا ہوں۔ بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو اُس نے مسکرا کر جیب سے کچھ نقدی نکالی۔ اور ملازمین کو دے کر کہا کہ یہ شخص ہمارے فضل سے جس چیز کا امیدوار ہے، وہ یہی ہے۔ یہ اسے دے دو۔ لیکن اس شخص نے عطیہ کو پھینک دیا اور خود فرط مالوسی سے دریامیں جس کے قریب خیام شاہی نصب تھے۔ کود پڑا۔ پیرا کوں نے نکالا۔ تو بادشاہ نے ہندی کا ایک شعر پڑھ کر کہا کہ اس شخص کو مہیاں محمد نافع سرہندی کے پاس لیجا کر کہو کہ اسے مرید کر کے سرہندی لوپی اس کے سر پر رکھیں (ماثر عالمگیری ص ۲۳۳-۲۳۴) اس زمانے میں سرہندی سلسلے سے یہ اختصاص خواجہ نقشبند ثانی کے غیر معمولی احترام اور شہزادہ کام بخش کی مریدی سے ہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ سلسلہ بادشاہ کو بڑا عزیز تھا۔ اور مکتوبات کے متعلق اس کے شبہات رفع ہو چکے تھے۔ خواجہ محمد نقشبند ثانی نے مکتوبات کی توضیح و توجیہ کے لیے جو کوششیں کیں، ان میں سے ایک یہ تھی۔ کہ ”رفع اتہام“ کے لیے انھوں نے قاضی القضاۃ شیخ الاسلام کو جو خط لکھا، اس کے ساتھ ایک علیحدہ کاغذ میں حضرت مجدد الف ثانی کے بعض ارشادات [مثلاً دفتر سوم، مکتوب ۱۲۱ سے] درج کیے، جو خواجہ صاحب کے مطبوعہ مکتوبات کے ساتھ شائع نہیں ہوئے۔ ان کے متعلق انھوں نے قاضی شیخ الاسلام کو لکھا۔

ایں فقیر فقرات بسیار ہمگی اوار از کلام جد بزرگوار در کاغذ علیحدہ نوشہ بخدمت شریف

فرستادہ است۔ حسنبہ اللہ اں را مطالعہ نمایند و قیاس فرمایند و یہ نظر بندگان

حضرت در آزند۔

پتا نہیں۔ کہ ان اقتباسات سے بادشاہ کی تسلی ہو گئی یا کوئی اور سبب تھا۔ اتنا یقینی ہے کہ مکتوبات والے واقعہ کے کئی سال بعد بھی اورنگ زیب کی طرف سے سلسلہ مجددیہ کے بزرگوں کا پہلے جیسا، بلکہ اس سے زیادہ احترام و اختصاص نظر آتا ہے۔ اور یہ نتیجہ اخذ کرنا بیجا نہیں۔ کہ مکتوبات کے متعلق اس کے شبہات رفع ہو چکے تھے۔

عالمگیر کے دل میں بزرگانِ سرہند کے لیے ایک خاص جگہ تھی، لیکن یہ امر نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ اس کی طرف سے کئی دوسرے سلسلوں کے اولیاء کے احترام کی بھی شہادتیں ملتی ہیں۔ مآثرِ عالمگیری میں لکھا ہے۔ ”قبلہ عالم کو اولیاء کبار کے ساتھ جو عقیدت و خلوص ہے، ظاہر ہے۔ اور ان برگزیدہ نفوس کے اسلاف و اخلاف تمام افرادِ جہاںِ شاہ کی نگاہ میں بے حد معزز و مکرم رہے ہیں۔“ (ص ۲۲۷) ان میں سے بعض مجددیہ سلسلے کے مخالفین بھی تھے۔ مثلاً عالمگیر کے رقیات کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی میں اُس کے اپنے قلم سے بزرگانِ سرہند کا کوئی ذکر ہماری نظر سے نہیں گزرا، لیکن رقیاتِ عالمگیری کا جو مختصر مجموعہ عام طور پر ملتا ہے، اس میں بھی شیخ عبداللطیف برہانپوریؒ کی بادشاہ نے جس طرح تعریف کی ہے، وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اور مرآۃ جہاں نما میں بخاورد خاں (یا محمد بقا سہارنپوری) بھی شیخ کی نسبت لکھتا ہے۔ ”خدیو حق جو در آوانِ بادشاہزادگی شہزائے جمعہ بمنزلِ آلِ عزت گزیں تشریف بردہ صحبہا معنوی میداشتند۔ و شیخ بزرگوار ہم برے انجام امور دینی پیش حضرت دوسر بار آمدہ۔“ یہ شیخ عبداللطیف سلسلہ مجددیہ کے سخت مخالف تھے۔ مثلاً معارج الولاۃ میں جو عبدالمگیری کی تالیف ہے، ان کی نسبت لکھا ہے۔ ”و کلمات تصوف را نگفتے۔ [و کہے کہ گفتمے] اور ابہ الحاد و زندہ نسبت کر دے۔ خصوصاً کہ راکہ بہ شیخ احمد کابلی و شیخ آدم بنوری نسبت داشتے۔ اور الحمد و زندیق گفتمے۔ و فرمودے کہ نماز عقب ایشاں جائز نیست۔“

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اورنگ زیب کو شرع کا ترجمان بنانے میں فقط بزرگانِ سرہند کو دخل نہ تھا۔ اس میں کئی دوسرے اثرات بھی شامل تھے۔ مثلاً شیخ عبداللطیف برہانپوریؒ کی نسبت جن سے مرآۃ جہاں نما کے بیان کے مطابق عالمگیر کے آیام شاہزادگی کے دوران جب وہ دکن کا ایک مدت تک صوبیدار تھا، گہرے روابط قائم ہوئے۔ معارج الولاۃ میں لکھا ہے۔

مردِ متقی و متشرع و فدا و متوکل بود۔ ہر کہ بخداست او پیوستے۔ با حکام شرع اورا

وصیت کر دے۔ دگفتے فقیر آن است کہ متشرع است۔ و بہر کہ متشرع نیست، فقیر نیست۔ و کتب فقر بسیار مطالعہ کر دے۔“

سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں اہل قلم حضرات کی کثرت ہے۔ (واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلے کو شروع سے علم کے ساتھ اختصاص رہا ہے) ان بزرگوں کی تالیفات کی اشاعت بھی دوسرے سلسلوں کی تصانیف سے زیادہ ہوئی ہے، لیکن دوسرے سلسلوں کے قلمی مخطوطے اور دیگر معاصرانہ ادبی اور تاریخی مآخذ غور سے پڑھیں تو خیال ہوتا ہے کہ عالمگیر کو فقط سلسلہ مجددیہ سے تعلق خاطر نہ تھا، بلکہ وہ بڑا بلند نظر اور وسیع المطالعہ بادشاہ تھا۔ وہ نیکی، دیانتداری اور محبت دینی، خواہ وہ کسی خیال کے بزرگوں سے ظہور پذیر ہو، قدر کرتا تھا۔ مثلاً ذکر جمیع اولیائے دہلی (قلمی) میں ایک مولوی محمد یعقوب صاحب کا ذکر ہے، جو عہد عالمگیری میں میر عدل تھے۔ اور شاہزادگان سلطان محمد و محمد معظم کو پڑھاتے تھے۔ وہ بیس سال تک ”مدتس مدرسہ بادشاہی عقب مسجد جہاں نما“ رہے۔ بادشاہ ان کا اس حد تک معترف تھا کہ جب وہ ایک مرتبہ کسی وجہ سے قاضی عبدالوہاب کی بکبیدگی خاطر ہوا تو اس نے مولوی صاحب سے اس کی جگہ عہدہ قضا قبول کرنے کے لیے کہا، لیکن انھوں نے اپنی نسبت تو یہ کہا: ”من لیاقت قضا ندارم“ اور قاضی سے بادشاہ کی بکبیدگی خاطر دور کرانے کی کامیاب کوشش کی۔ یہ مولوی محمد یعقوب وہی بزرگ تھے، جنھوں نے بادشاہ کے

لہ اس سلسلے میں خواجہ محمد معصوم کے خلیفہ خواجہ محمد باقر کا بیان بڑا دلچسپ ہے۔ وہ کنز الہدایت میں لکھتے ہیں: ”حضرت پیر دستگیر (خواجہ محمد معصوم) کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا تو حضرت نے فقیر سے دریافت کیا۔ کہ تم کچھ پڑھنے پڑھانے کا شغل رکھتے ہو۔ فقیر نے عرض کیا کہ شغل باطنی کے زمانے سے تعلیم ظاہری کا اتنا سلسلہ باقی نہیں رہا۔“

دوسرے سفر میں بھی خلوت کے وقت حضرت نے دوبارہ دریافت کیا میں نے عرض کیا کہ مطالعہ علم ظاہر کی مصروفیت کے وقت انتخاب سے تو جبراً باقی نہیں رہتی ہے۔ اور تو یہ مطالعہ دونوں امور کا جمع کرنا ممکن نہیں حضرت نے فرمایا کہ بلا سوچے سمجھے کہہ رہے ہو۔ علم ظاہر کی مصروفیت ہماری نسبت کو بڑھاتی ہے۔ اس زمانے سے فقیر کو مطالعہ علمی کی توفیق بھی حاصل ہو گئی ہے۔“ (ص ۸-۹)

اصرار، بلکہ عتاب کے باوجود داراشکوہ کے محضر الحاد پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔
 ”... مدتے بداروغلی عدالت وکالت شرعی ظل سبحانی امتیاز داشت۔ محضر کیہ علم برالحاد
 داراشکوہ ساختند۔ مولانا برآں مہر کرد۔ ہر چند بادشاہ خطاب پر عتاب نمود کہ اس ہمہ اہل
 فضل مہر کردند۔ وجہ مہر نہ کردن شما چیست۔ عرض نمود کہ سانیکہ کردہ اند [علم برالحاد
 داراشکوہ دارند مرا] علم بہ الحاد اونست [ذکر جمیع اولیائے دہلی]۔

عالمگیر کی دلپسند کتب مطالعہ کی فہرست بڑی دلچسپ ہے۔ اس میں مکتوبات
 امام ربانی یا سلسلہ نقشبندیہ کی کسی اہم کتاب کا کہیں نام نہیں ملتا۔ لیکن امام غزالی کی
 تصانیف کے متعلق متعدد شہادتیں ہیں۔ مآثر عالمگیری کا متعلقہ اندراج حسب ذیل ہے۔
 قبلہ عالم کے کمالات کسبہ کا عظیم الشان کارنامہ علوم دینیہ یعنی فقہ و تفسیر و حدیث کی تحصیل
 ہے۔ جہاں پناہ کو حضرت امام غزالی کی تصنیفات اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات
 اور شیخ زین الدین و قطب محی الدین (قطب الدین؟) شیرازی کے رسائل کا خاص شوق
 ہے۔ اور یہ کتابیں اکثر مطالعہ میں رہتی تھیں۔

امام غزالی کی تصانیف سے عالمگیر کی دلچسپی کی شہادت عمل صالح سے بھی ملتی ہے۔
 اس کے مصنف میر سید محمد کی نسبت جن کا شاہجہاں بھی بڑا قدر دان تھا، لکھتے ہیں:-
 والیوم در خدمت فیض مہربت حضرت خلافت مرتب محمد اورنگ زیب بادشاہ عالمگیر
 مذکور احیائے علوم و کیمیا سے سعادت درمیاں دارد۔ [عمل صالح دفتر سوم ص ۲۷۹]
 مرآۃ جہاں نما سے پتا چلتا ہے کہ عالمگیر نے دانشمند خاں سے امام غزالی کی اکثر
 کتابیں پڑھی تھیں:-

و خدیو زبان بعض کتب رائد و خان سعادت نشان [دانشمند خاں] تکرار فرمودہ اند۔ و
 مصنفات حجۃ الاسلام امام محمد غزالی قدس سرہ، خصوص کتاب افادہ آیات احیاء العلم
 رائد اقل تا آخر تمذ نمودہ۔

دانشمند خاں [مولانا شفیعیائے یزدی] اس عہد کا مشہور فاضل اور فاضل نواز
 تھا۔ اس نے ایک مدت تک فرانسیسی جہاں گرد ستیاج ڈاکٹر بریئر کو اپنا مہمان رکھا۔

اور اس سے متاخرین حکماءے فرنگ کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ برنیر نے اپنے سفرنامہ میں ”دانشمند خاں کی (جسے وہ ”ایشیا کا سب سے بڑا عالم“ کہتا ہے) اور وزیر سلطنت فاضل خاں (علا الملک تونی) کی علم و حکمت سے محبت کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔

اگر مآثر عالمگیری کے مندرجہ بالا اندراج کی نسبت ہمارا قیاس صحیح ہے۔ کہ قطب محی الدین شیرازی غالباً (علامہ) قطب الدین شیرازی کی تحریف ہے، تو یہ خیال بجا نہیں کہ عالمگیر کو محقولات سے بھی لگاؤ تھا۔ کم از کم جس استاد کی نسبت وہ کہتا تھا کہ میں نے جو کچھ سیکھا، اس سے سیکھا۔ (چیزیکہ خواندہ ایم، از خواندہ ایم) وہ (ملا عبد اللطیف بہار پوری) امام محقولات، حکیم فتح اللہ شیرازی کا شاگرد تھا۔ (مراۃ جہاں نما وغیرہ)

غرضیکہ عالمگیر کے بزرگان سرسند سے گہرے روابط تھے، لیکن اس کا نقطہ نظر بڑا وسیع تھا۔ اور شرع کے معاملے میں وہ کسی کی رودعائت نہ کرتا تھا۔

بنگال میں اسلام

عہدِ مغلیہ میں دہلی۔ لاہور۔ کشمیر۔ بلادِ پُرب، دکن۔ گجرات کے متعلق تو تاریخ و تذکرہوں کا ایک انبار ہے، لیکن جو علاقے اب پاکستان ہیں، یعنی بنگال۔ مغربی پنجاب۔ سندھ۔ سرحد۔ اور بلوچستان۔ ان کے متعلق معلومات کی بڑی کمی ہے۔ بالخصوص بنگال کی مذہبی اور تہذیبی تاریخ پر ناواقفیت کی ایک دبیز کڑھچائی ہوئی ہے۔ تاریخ کے صفحات پر مٹنا بھی کوئی نام آجاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندھیری رات میں کوئی جگنو چمک گیا اور اس کی روشنی میں راستے کی تلاش ہوتی ہے۔ ان حالات میں نہ صرف تواریخ کے صفحات بنگال کے متعلق تفصیلات سے بالعموم عاری ہیں بلکہ مستند معلومات کی کمی کی وجہ سے بسا اوقات غلط رائیں مسلمات کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔

چیتنہ کی وشنو تحریک | مثلاً بنگال کی اس عہد آفرین وشنو تحریک کو لیا جائے۔ جس کی چیتنہ نے رہنمائی کی اور جس کا صرف

ہندو مذہب یا بنگالی زبان اور ادب ہی پر نہیں۔ اس علاقے میں اشاعتِ اسلام اور عامۃ المسلمین کی مذہبی حالت پر بڑا اثر پڑا۔ اس کی نسبت عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ تحریک کبیر یا بابائنا تک کی تعلیمات کی طرح ہندو مذہب اور اسلام کو ملانے کی ایک کوشش تھی۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس تحریک کا مقصد کبیریت یا ابتدائی سکھ مذہب کی طرح ہنود اور مسلمانوں کو ملانا نہیں تھا بلکہ ہندو مذہب کا احیا تھا اور اس مقصد میں یہ تحریک اس حد تک کامیاب ہوئی کہ نہ صرف بنگال میں اشاعتِ اسلام رک گئی بلکہ بعض مسلمانوں نے وشنو مذہب اختیار کیا اور مسلمان اور ہندو وسطی اور شمالی بنگال کے ان پڑھ اور غریب مسلمانوں کے عقاید و اطوار میں ہندو طریقے داخل ہو گئے۔

چیتنہ وسطی بنگال کے شہر ندیا میں جو پہلے ہندو راجاؤں کا دار الحکومت تھا۔ اور مسلمانوں کی فتح بنگالہ (اور لکھنؤ) کے حاکم نشین شہر بن جانے کے بعد ہندوؤں کا علمی اور مذہبی مرکز بن گیا تھا۔ ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوا۔ اس نے بعد میں مسلمان پیروں سے مسئلہ توحید پر بحث و مباحثہ کیا اور وہ مسلمان عقائد اور نقطہ نظر سے بے خبر نہ تھا۔ اس کے طریقے میں کئی چیزیں ایسی ہیں جن میں شاید صوفیہ کے طریق کار کو دخل تھا۔ اس کے قریبی اور بااثر ساتھیوں میں کم از کم ایسے تھے جو فارسی اور عربی کے ماہر اور بنگال کے مسلمان بادشاہ کے دربار میں دو بڑی باعزت اسامیوں پر مامور تھے۔ روپ اور ستان دوہمن بھائی تھے۔ جن کا مورث اعلیٰ کرناٹک میں کسی ریاست کا حاکم ہو گیا۔ ۱۸۱۴ء میں اس کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا جانشین ہوا۔ اس کی وفات ۱۸۱۶ء میں ہوئی، لیکن مرنے سے پہلے گورکے کسی مسلمان حاکم سے اس کی دوستی ہو گئی جو ان دنوں جنوبی ہندوستان میں سفر کر رہا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی ہوئی اور ان میں سے ایک نے گورکے میں اپنے باپ کے مسلمان دوست کے پاس پناہ لی اور ایک محرز عہدے (وزارت) پر مامور ہو گیا۔ ۱۸۳۳ء میں اس کی وفات ہوئی اور اس کا بیٹا جانشین ہوا۔ روپ اور ستان کا باپ پدمادا کا پوتا تھا۔ ان دو کے اصلی نام سننوش اور امر تھے۔ اسے بہادر و شمش چندر سین کے بیان کے مطابق جس سے ہم نے یہ تفصیلات نقل کی ہیں، دونوں بھائی مسلمان ہو گئے تھے۔ انھوں نے عربی فارسی کی تعلیم ساٹگاؤں کے مشہور عالم سید فخر الدین سے حاصل کی اور شاہی ملازمت میں داخل ہوئے۔ ستان شاہ بنگالہ کا دبیر خاص تھا۔ اور روپ جسے شاکر ملک کا خطاب ملا تھا دبیر تھا۔ دونوں نے سنسکرت میں بھی اپنی دلچسپی برقرار رکھی تھی اور اپنے گاؤں میں (جو گورکے نواح میں تھا) کرناٹک کے کئی برہمنوں کو بلا کر آباد کیا۔ ۱۵۱۶ء میں چیتنہ سے ملے اور دشمنیت اختیار کیا۔ چیتنہ نے ہی انھیں نئے نام دیے جن سے وہ مشہور ہوئے۔ دونوں نے شاہی ملازمت کو ترک کر کے سادھوؤں کی طرح اپنے آپ کو نئے طریقے کی اشاعت کے لیے وقف کر دیا۔ چیتنہ نے انھیں بندر ابن جاکر پُرانے تیرتھوں کا کھوج نکالنے کے لیے

کہا۔ چنانچہ سناتن اور روپ اپنے ایک بھتیجے اور چلیتینیہ کے بعض دوسرے با اثر مریدوں کے ساتھ بندرا بن میں آکر مقیم ہوئے اور وہ عمل شروع ہوا۔ جو متھرا اور بندرا بن کو شمالی ہند میں ہندو مذہب کے احیا کا بڑا مرکز بنادینے والا تھا۔

ویشنو متذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ان دو بھائیوں کی شہرت اکبر تک پہنچی اور اس نے ۱۵۷۳ء میں متھرا آکر ان سے ملاقات کی۔ اکبر کی روپ اور سناتن سے ملاقات کی روایت صحیح ہو یا غلط، لیکن اتنا یقینی ہے کہ بنگالہ کا مغل صوبیدار مان سنگھ ان کا بڑا معتقد تھا۔ اور سر جاوہر ناتھ سرکار کہتے ہیں کہ چلیتینیہ کی تحریک کو جسے پور کے راجپوت خاندان سے بڑی مدد ملی۔ بندرا بن میں اس زمانے میں جو سر بنگلہ مندر تعمیر ہوئے، ان میں سب پر شکوہ (گو بندجی کا مندر) مان سنگھ نے ایک کروڑ روپے کی لاگت سے تعمیر کرایا اور مندر کے ایک سسکرت کتے سے پتا چلتا ہے کہ یہ مندر ۱۵۷۹ء میں ”ہمارا جاپر بھقوی راج کی نسل کے“ راجا مان سنگھ نے اپنے گرو روپ اور سناتن کی زیر ہدایت تعمیر کرایا۔

متھرا کے قرب و جوار میں تعمیر منادر کا یہ وسیع سلسلہ ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک تو سلطان محمود غزنوی کی متھرا میں وسیع بیت شکنی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمان دارالحکومت (آگرہ) کے قریب نئے مندر کثرت سے اور بڑے طعراق سے تعمیر ہو رہے تھے۔ دوسرے اکبر کے دربار میں جس واقعہ نے علما کے اختیارات کا مسئلہ سخت تازک صورت میں پیش کیا اور محضری ترتیب اور اکبر کے امام عادل بننے کا پیش خیمہ ہوا۔ وہ متھرا بندرا بن کی انھی عمارتی سرگرمیوں کا شاخسانہ تھا۔ ہم اکبری عہد کے سلسلے میں ذکر کر چکے ہیں کہ ۱۵۷۹ء میں صدر الصدور کے سامنے متھرا کے ایک ایسے برہمن کا مقدمہ پیش ہوا، جس نے مسجد کے مسائل کو ایک مندر کی تعمیر میں صرف کیا۔ اور جب اس سے باز پرس ہوئی تو بانی اسلام کے متعلق امانت آمیز کلمات کہے۔ بالآخر شیخ عبداللہ بنی صدر الصدور نے اس برہمن کو قتل کر دیا تو اکبر کی راجپوت رانیوں نے جن میں مان سنگھ کی بیوی بھی تھی، سخت شکایت کی اور آخر کار اکبر نے محض لکھو اگر اختلافی امور میں تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں

لے لیے۔ اس زمانے میں مسٹر ابندرا بن میں اس کثرت سے مندر تعمیر ہو رہے تھے کہ وثوق سے اس واقعہ کو کسی خاص مندر سے متعلق کرنا ممکن نہیں، لیکن بہر کیف اسلامی ہند کی مذہبی تاریخ کا یہ بحران و ششومت کی اس احوالی تحریک کا بلاواسطہ نتیجہ تھا، جو تعمیر مندر اور دوسری صورتوں میں اظہارِ پارہی تھی۔

بنگال میں ویشنو تحریک کے اثرات

چیتنہ کی وفات ۱۵۳۲ء میں ہوئی۔ اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی زندگی اور بیانات میں مخالف اسلام عناصر نمایاں نہیں (اگرچہ اس نے اسلام کے ترجمانوں سے بحثیں کیں اور ویشنو تذکرہ نگاروں کے مطابق ان میں سے بعض کو اپنے طریقے کا پیروکار بنایا) یہ صحیح ہے کہ چیتنہ پر کرشن بھگتی والہانہ طور پر غالب تھا، لیکن اس کا روپ اور سناٹن کو پُرانے تیرتھوں کا کھوج نکالنے کے لیے مسٹر ابھینا ہی ایک احوالی تحریک کا آغاز تھا اور اس کے جانشینوں کے ہاتھ میں تو اس تحریک نے بالکل ایک جارحانہ صورت اختیار کر لی۔

چیتنہ کی تحریک کا جو اثر بنگالہ کے باہر ہوا۔ اس سے کہیں زیادہ بنگالہ کے اندر تھا۔ اس علاقے میں اس نے اشاعتِ اسلام کا سلسلہ روک دیا۔ اسلام کی کامیابی کا ایک بڑا راز یہ تھا کہ آبادی کا بہت بڑا حصہ اچھوت سمجھا جاتا تھا اور ان لوگوں کے لیے ہندو سوسائٹی میں محرز جگہ نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے اسلام کا خیر مقدم کیا۔ لیکن ویشنو تحریک نے ان لوگوں کے لیے ہندو سوسائٹی میں ہی باعزت جگہ بنا دی۔ اور یہ تعلیم دی کہ جو کوئی کرشن کا سچا بھگت ہوگا۔ اسی کی مکتبی ہوگی۔ خواہ وہ چنڈال ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس تحریک اور اس کے مختلف مظاہر نے ہندو جہلی میں نئی زندگی پیدا کر دی۔ اس نے اسلامی مبلغین کی کامیابی ناممکن بنا دی۔ چنانچہ جس علاقے میں یہ تحریک کامیاب ہوئی وہاں مسلمانوں کی تعداد بھڑکی ہے۔ وہی قبیلے اور ذاتیں جن کے بھائی ہندو مشرقی بنگال میں مسلمان ہو گئے ہیں مغربی بنگال میں ہندو رہے اور اس کا بڑا سبب ویشنو اثرات تھے۔

ویشنو تحریک کا کام فقط دفاعی نہیں جارحانہ تھا۔ اس نے فقط ہندوؤں کو مسلمان ہونے سے نہیں بچایا، بلکہ مسلمانوں میں وشنومت کی اشاعت کی۔ اور اس میں اسے خاصی کامیابی ہوئی۔ چیتنید نے خود بعض مسلمانوں کو ارتداد کا راستا دکھایا۔ اُس کے ایک قریبی ساتھی ہری داس پہلے مسلمان تھا اور قاضیوں کے خاندان کا تھا۔ اسی طرح بجلی خاں ایک افغان سورما اس کے ہاتھ پر ویشنو ہوا۔ شیاماند نے کثرت سے مسلمانوں میں پرچار کیا اور کامیاب رہا۔ اس نے اس مقصد کے لیے اقتصادی حربے بھی استعمال کیے اور راجا نارائن گڑھ سے کہا کہ مسلمان ضرور جنگ اپنا مذہب ترک نہ کریں انھیں کام نہ دیا جائے۔ پجلی ذاتوں میں یہ سلسلہ بہت وسیع تھا۔ مسلمانوں کو پورا ویشنو بنانے کے علاوہ ویشنو طریقے کی کئی شاخیں اسی شروع ہوئیں جن کا مقصد مسلمانوں کو ویشنو سلسلے سے منسلک کرنا تھا۔ ایک فرقہ درویشی تھا جو ستان سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ایک نہایت وسیع سلسلہ باؤل فقیروں کا تھا جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ فرقہ تھا۔ لیکن چیتنید مت کے متعلق ڈاکٹر کینیدی اپنی کتاب میں صاف صاف کہتے ہیں کہ یہ بنگالی ویشنوؤں کا ایک گروہ ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے لیکن انھوں نے بھی ان لوگوں کے رہنماؤں کے جو نام دیے ہیں وہ زیادہ تر ہندو ہیں اور سب ندیکے ضلع سے متعلق ہیں۔ راسخ الاعتقاد مسلمان انھیں غیر مسلم سمجھتے ہیں اور اس خیال کی تائید میں فتوے بھی شائع ہوئے۔

ویشنو تحریک نے ادب کے ذریعے بھی بنگالی مسلمانوں کو متاثر کیا۔ ایک تو اس جاندار وسیع تحریک نے بنگالی ہندوؤں میں نشاۃ ثانیہ کی کیفیت پیدا کر دی اور اب زندگی کے ہر شعبے میں انھوں نے بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ دوسرے کرشن بھگتی کی شدید جذباتی کیفیت نے کثرت سے با اثر اشعار کا جامہ اختیار کیا۔ اس کا اثر مسلمانوں پر دو طرح ہوا۔ ایک تو اس نئے ادب نے بنگالی زبان اور ادب کو ایک خاص رنگ دے دیا جس نے بنگالی بولنے اور سمجھنے والے مسلمانوں کو متاثر کیا۔ دوسرے کرشن بھگتی کے اشعار اس طرح

مقبول ہو گئے کہ کئی مسلمانوں نے جو دیشنوندہ تھے، ان مضامین پر نظمیں لکھیں۔ بالآخر حالت یہاں تک پہنچی کہ چشتی پیروں کی مجالس سماع میں بشن پد (دیشنوگیت) گائے جاتے اور ان پر اہل حال وجد کرتے۔ اس زمانے کی ایک دلچسپ تصنیف مسائل المشائخ ہے، جو حضرت نور قطب عالم کے سلسلہ کے ایک بزرگ شاہ قطب الدین حقانی نے نویں صدی ہجری کے آخر میں مرتب کی۔ اس کتاب میں حضرت نور قطب عالم سے ایک روایت منسوب کی گئی ہے کہ جب ان کی محفل میں بشن پد دوسری نعتوں وغیرہ کے ساتھ گائے گئے اور کسی نے کرشن۔ رادھا اور اس طرح ہندو ناموں پر اعتراض کیا تو جواب یہ دیا گیا کہ قرآن مجید میں بھی فرعون، نمرود کے نام ہیں۔ حضرت نور قطب عالم سے اس روایت کا انتساب تو غالباً بشن پد کے جواز کے لیے ایک مستند اور مشہور بزرگ کے ارشاد دھونڈنے کا نتیجہ ہے، اتنا قرین قیاس ہے کہ جن بزرگوں نے یہ روایت اپنی کتاب میں درج کی ہے ان کی مجلس میں یا کم از کم اس زمانے کی صوفیہ مجالس میں بشن پد نعتوں اور قوالیوں کے ساتھ ساتھ پڑھے جاتے تھے!

ہنگالی مسلمانوں کا ردِ عمل

دیشنومت اور دوسری ہندو احمیائی تحریکوں اور اس کے ساتھ ساتھ باہر سے مسلمان مبلغوں کی آمد بند ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال کے نچلے طبقے میں جو فارسی دان حکام اور علما کے اثر سے دور تھا۔ عقائد اور اعمال کے بارے میں بڑی کھلی بھیل گئی۔ ہندو اور مسلمان عقائد خلط ملط ہو گئے۔ باطل طریقہ اور ستیہ پر ماننے والے بڑھ گئے۔ اور عوام الناس کے دین کو مقامی اور ہندو خیالات نے مسخ کر دیا۔ اس صورتِ حالات کی تلافی انیسویں صدی سے شروع ہوئی۔ جب حاجی شریعت اللہ مولانا شاہ امام الدین اور مولانا کرامت علی جیسے بزرگوں نے اصلاح عقائد کا بیڑا اٹھایا، لیکن عوام الناس کے عقائد اور منفی غیر مسلم اثرات کے بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ خدا نخواستہ اس سرزمین میں اسلام کی قدر و منزلت نہ تھی۔ یا مقامی اہل فکر نے اصلاحِ حالت کی کوئی کوشش نہ کی۔

مثلاً بنگال کے جن حسین شاہی مسلمان بادشاہوں نے اسلحہ کے مقابلے میں، بنگالی ادب کی سرپرستی کی اور رامائن - مہابھارت اور دوسری کتابوں کے بنگالی ترجمے کرائے۔ وہ بڑے راسخ العقیدہ مسلمان اور اسلام اور علوم اسلامی پر جان دینے والے تھے۔ اس خاندان کا مورث اعلیٰ علاء الدین حسین شاہ خود عرب تھا۔ اس نے کثرت سے مساجد اور مدرسے تعمیر کرائے۔ ان کے لیے اور بزرگوں کے مزارات کی نگہداشت کے لیے ہزاروں بیگھے زمین وقف کی۔ حضرت نور قطب عالم کے مزار کی زیارت کے لیے ہر سال اپنے دار الخلافہ سے پنڈوہ جاتا تھا۔ جمعہ کی نماز باقاعدہ جامع مسجد میں جا کر پڑھتا۔ یہی سلسلہ اس کے بیٹے نصرت شاہ اور اس خاندان کے دوسرے بادشاہوں نے جاری رکھا۔ افسوس کہ اس عہد کی فارسی تصانیف ایک دو کے سوا جمع نہیں ہوئیں۔ مسلمان ابھی تک غالباً بنگالی میں علمی کتابیں لکھتے ہچکچاتے تھے، لیکن اس زمانے کی کئی معمارتیں اور متعدد کتب محفوظ ہیں۔ ان سے حسین شاہی خاندان کی دینداری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ جب ولایتِ نومت کا ادب اور رامائن - مہابھارت کے بنگالی ترجمے مسلمانوں میں عام ہونے شروع ہوئے تو خود بنگالہ میں کئی اہل دل مسلمان اٹھئے، جنہوں نے اسلامی موضوعات پر بنگلہ میں نظمیں اور کتابیں لکھ کر بنگالی مسلمانوں کے لیے صالح دماغی اور روحانی غذا احتیاج کی۔ اس تحریک کا پیش رو سید سلطان تھا، جس نے ۱۵۴۰ء (یعنی اکبر کی تخت نشینی کے زمانے میں) وفات پائی۔ لکھی۔ جس کے شروع میں اس نے کہا کہ چونکہ بنگالی مسلمان عربی فارسی نہیں جانتے اور بنگالی میں اسلامی موضوعات پر کتابیں نہیں، اس لیے ناچار مسلمان بھی رامائن - مہابھارت پڑھتے ہیں۔ اس صورتِ حالات کی اصلاح کے لیے میں اپنی کتابیں لکھ رہا ہوں۔ علماء اسے ناپسند کرتے ہیں اور مجھے منافق کہتے ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ میرا فرض کیا ہے! سید سلطان کی وفات رسول شائع ہو گئی ہے۔ اس کے ابتدائی صفحات صورتِ حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس میں سید سلطان فرماتے ہیں (ترجمہ) سب بنگالی عربی نہیں جانتے۔

کوئی اپنے دین کی باتیں نہیں سمجھتا۔

ہر کوئی کتھا کہانیوں سے دل بہلاتا ہے۔

میں گنہگار اور راندہ مخلوق ان لوگوں کے درمیان ہوں۔

مجھے معلوم نہیں کہ روزِ جزا مجھ سے باری تعالیٰ کیا پوچھے گا۔

لیکن اگر اس نے پوچھا کہ ان لوگوں کے درمیان رہ کر ان کو دین کی باتیں نہیں بتائیں۔

اور مجھے اس قصور کے لیے ملزم قرار دیا تو میں کیا جواب دوں گا؟

یہی سوچ کر میں نے نبی دمسار (خاندان نبوی کی تاریخ) لکھی ہے۔

اور اس لیے اتنے لوگ کہتے ہیں کہ میں نے دین کی کتاب کو ناپاک کر دیا۔

اگر پڑھے لکھے لوگ عربی میں کتابیں پڑھیں اور ان کا ہندوستانی (بنگالی) ترجمہ نہ کریں

تو لوگوں کو یہ چیزیں کس طرح سمجھ آئیں گی؟

جس زبان (کے خطے) میں خدا نے کسی کو پیدا کیا ہے۔ وہی اس کا بڑا خزانہ ہے۔

یہ غور طلب امر ہے کہ ان سطور میں سید سلطان نے بنگالی کو ہندوستانی کہا ہے

اور اگرچہ ان کی کتاب کی زبان بنگلہ ہے، لیکن اس میں سنسکرت کے الفاظ نہیں اور

ہندوستانی اور بنگالی کے اتنے مشترک الفاظ ہیں کہ جدید بنگالی نہ جاننے والے کے لیے

بھی عبارت کا بھنادشوار نہیں۔ آگے چل کر سید سلطان اپنا نقطہ نظر اور وضاحت

سے بیان کرتے ہیں :- (ترجمہ)

اگر پڑھے لکھے عام لوگوں کو تعلیم نہ دیں گے تو وہ بچارے ضرور دوزخ میں جائیں گے۔

اور اگر عام لوگ نفاق و اقصیت کی درجہ سے گناہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ اہل علم کو اس کا ذمہ اڑے گا۔

چونکہ میں بھی ان میں سے ہوں۔ اس لیے میں اہل علم سے صاف صاف کہتا ہوں۔

(روزِ قیامت) خدا کہے گا۔ تم لوگ اہل علم تھے۔ تم نے گناہ سے لوگوں کو کیوں نہ روکا؟

پس اہل علم روزِ قیامت اپنا فرض ادا نہ کرنے کے مجرم ٹھہریں گے۔

جب باری تعالیٰ لوگوں کے نیک بد کا حساب کرے گا تو وہ کہیں گے۔

ہمیں ایک اہل علم ملا تھا۔ لیکن اس نے ہمیں سکھایا نہیں۔

تو خدا ہم اہل علم کو اور بھی طرز قرار دے گا۔
 اس دوسرے اور نبی کی عظمت کا خیال کر کے میں تمہیں بتاتا ہوں تاکہ تم گناہوں میں نہ پڑو۔
 اللہ نے مجھے کتاب شریف کا علم دیا ہے تاکہ لوگوں کو بتاؤں۔
 اس لیے میں نے یہ بچا پی تصنیف کی۔
 علما مجھے منافع کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ہندو وانی زبان میں لکھ کر دین کو ناپاک کر دیا۔
 لیکن خدا کا ارشاد ہے۔ میں نے نبی بھیجا۔ اس ملک کی زبان میں تعلیم دینے کے لیے
 جس میں وہ پیدا ہوا۔

سید سلطان اہل علم میں سے تھے، لیکن ان کی کتابوں میں بھی مقامی اثرات
 کافی ہیں۔ انھوں نے رسول اکرم کے جو واقعات لکھے ہیں ان میں بعض ایسے قصے بھی
 درج ہیں جو کوشش اور دشمنوں کے متعلق ہیں، بلکہ انھوں نے تو نبی کریم کو اوتار کہا ہے۔
 یا تو یہ مقامی اثرات کا نتیجہ ہو گا یا سید سلطان نے عوام کے ساتھ اس پیرائے میں کلام
 کرنے کی کوشش کی ہو۔ جس کے وہ عادی ہو چکے تھے، لیکن ان کی تحریر سے یہ بھی اندازہ
 ہوتا ہے کہ بنگالی مسلمانوں کے خیالات اور رجحانات کی عقلی سر زمین کو سمجھنے کے لیے
 یہاں کے مقامی اثرات کا کھلے دل سے مطالعہ کرنا ہو گا۔

سید سلطان کی تحریروں سے خیال ہوتا ہے کہ ۹۹۲ھ (۱۵۸۶ء) یا ایک اور
 مسودے کے مطابق ۹۶۲ھ (یعنی ۱۵۵۲ء) تک کسی نے بنگالی میں خدا اور رسول کی
 نسبت نہیں لکھا۔ سید سلطان کی تصانیف دو قسم کی تھیں۔ ایک تو وہ جن میں انھوں نے
 قصص الانبیاء اور سیرت نبوی کی روایات بنگالی میں منتقل کیں۔ دوسرے وہ جن میں
 اسلامی فلسفہ یا تصوف اور شریعت کے مسائل کو بنگالی زبان میں لکھا۔ دوسری قسم کی
 اہم کتاب گیان پردیپ (یعنی نور عرفان) ہے جس میں سلطان نے صوفیانہ خیالات
 کو تہتر کی یوگ کی زبان میں بیان کیا ہے۔ ان کے جانشینوں نے ان کوششوں کو بڑی
 وسعت دی۔ اور ج۔ روزہ۔ نماز۔ زکوٰۃ اور دوسرے احکام اسلامی پر کثرت سے
 ستریں اور اٹھارھویں صدی میں کتابیں لکھی گئیں۔ ان تصانیف میں نصرت خاں کا

فطرت نامہ خاص شہرت رکھتا ہے، لیکن مغلیہ دور کے سب سے مشہور بنگالی شاعر علاؤل نے بھی ان مضامین کی توضیح کے لیے تحفہ لکھا۔

اسلامی خیالات کو بنگالی میں منتقل کرنے والوں کا اگلا قدم عربی اور فارسی قصص اور ان زبانوں کی ادبی تصانیف کا بنگالی ترجمہ تھا۔ ان میں داستان امیر حمزہ - یوسف زلیخا - سکندر نامہ - ہفت پیکر کے ترجمے خاص شہرت رکھتے ہیں جن میں بعض علاؤل کے قلم سے ہیں۔

سید سلطان کی بعض تصانیف کے نام یہ ہیں:-

- ۱۔ شرب محراج ۲۔ رسول وجے ۳۔ وفات رسول ۴۔ ابلیس نامہ -
- ۵۔ معرفتی گان ۶۔ گیان پردیپ -

سید سلطان کی تاریخ وفات و پیدائش اور جائے رہائش کے متعلق اختلاف ہے۔ وہ اکبر اور جہانگیر کے ہم عصر تھے۔ بعض انھیں ضلع سلہٹ کا باشندہ کہتے ہیں، لیکن ڈاکٹر انعام الحق کی تحقیق کے مطابق وہ ضلع چٹاگانگ کے رہنے والے تھے۔ بنگال کے قدیم مسلمان ادیبوں کی تصانیف پر ابھی تک اتنی تھوڑی تحقیق و تفتیش ہوئی ہے (ان میں سے اکثر) بیشتر ابھی قلمی مسودوں کی حالت میں ہیں، کہ ان کے زمانہ حیات کے متعلق شدید اختلافات ہیں۔ ڈاکٹر انعام الحق متعدد ایسے بنگالی ادیبوں کے نام گناتے ہیں جنہوں نے سید سلطان سے پہلے اسلامی موضوعات پر بنگالی کتابیں تصنیف کیں، لیکن دوسرے اہل الرائے ان سے متفق نہیں۔ اور وفات رسول سے جو طویل اقتباسات ہم نے دیے ہیں، ان سے بھی خیال ہوتا ہے کہ سید سلطان نے اس میدان میں پہل کی۔ سید سلطان پیری مریدی بھی کیا کرتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وفات رسول میں خلفائے راشدین اور واقعہ کربلا کا ذکر کریں، لیکن وہ اپنا ارادہ پورا نہ کر سکے۔ اس لیے انھوں نے اپنے مرید محمد خاں سے تکمیل کا کہہ کر کہا اور محمد خاں نے اس ارشاد کی تعمیل میں صحابہ کا کھانا یا صحابہ نامہ مقتول حسین اور قیامت نامہ لکھیں۔ ان میں مقتول حسین کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ محرم کے موقع پر ان کے انتخاب مجالس میں اب بھی پڑھے جاتے ہیں اور کتاب کا ادبی درجہ بھی بلند ہے۔

اصلاح حالت کی یہ کوشش صرف اہل علم بنگالی مسلمانوں نے نہیں کی، بلکہ عوام میں بھی ہندو ادبی اثرات کے خلاف ردِ عمل پیدا ہوا۔ اس کا اندازہ اس عوامی ادب سے ہو سکتا ہے جو قصوں، کہانیوں اور جنگ ناموں کی صورت میں کثرت سے ”مسلمانی بنگالی“ میں لکھا گیا اور جس کا بسا اوقات موضوع تھا کہ مسلمان پیروں اور ”غازی“ کس طرح ہندو دیوتاؤں پر غالب آگئے!!

بنگالی میں مذہبی کتب لکھنے کے متعلق سید سلطان کا طرزِ عمل محدث امیر تھا۔ لیکن پچاس ساٹھ سال بعد اس بحث نے تلخ صورت اختیار کی۔ عہدِ عالمگیر میں جو مذہبی کتابیں بنگالی میں تصنیف ہوئیں۔ ان میں ایک جزیرہ سندیب (ضلع چٹاگانگ) کے ایک شاعر عبد الحکیم کی کتاب نور نامہ ہے۔ اس میں وہ لکھتا ہے:-

میں بنگالی میں لکھ رہا ہوں۔

تاکہ ہر ایک کو اپنی محنت سے خوش کر سکوں۔

میں عربی اور فارسی کو حقارت سے نہیں دیکھتا۔

لیکن لوگ اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں۔

ایک مضمون چاہے عربی فارسی یا ہندی میں ہو بدل نہیں جاتا۔

اگر کوئی شخص خدا اور نبی کے اوصاف بیان کرے۔

خدا لوگوں کی زبان سمجھ لیتا ہے۔

وہ ہندوؤں کی زبان سمجھتا ہے۔

اور بنگالیوں کی زبان سمجھتا ہے۔

مجھے ان لوگوں کی اصل کا پتا نہیں۔

جو پیدا تو بنگال میں ہوئے ہیں، لیکن بنگالی زبان سے متنفر ہیں۔

تو کیوں یہ جگہ چھوڑ کر وہ دوسری جگہ نہیں چلے جاتے؟

عبد الحکیم نے نور نامہ کے علاوہ یوسف زلیخا۔ شاہ نامہ۔ نصیحت نامہ۔ لیلِ مثنیٰ

سلیف الملوک اور شہاب الدین نامہ تالیف کیں۔ آخری کتاب شاعر نے اپنے

پیر و مرشد شہاب الدین کے نام مضمون کی -

بہرام سقاہر دوانی

۱۳۶۵ھ

عہد اسلامی میں عام دیہاتی مسلمانوں کی زبان بنگالی تھی۔ لیکن دفتری اور درباری زبان فارسی تھی۔ مرحوم منشی عبدالکریم کی کوششوں سے بنگالی تصانیف کے سونے

تو ایک حد تک جمع ہو گئے ہیں، لیکن فارسی تصانیف کے متعلق کوئی ایسی کوشش نہیں ہوئی۔ اس وقت جو اکابر بنگالہ کی سرزمین میں دفن ہیں ان میں سب سے قدیمی صاحب دیوان شاعر حاجی پیر بہرام سقاہر ہیں جن کا مزار بروان کی مشہور زیارت گاہ ہے۔ وہ بخارا کے پختائی ترک تھے۔ شاعر تھے۔ مسافروں، زائرین اور حاجیوں کو مفت پانی پلاتے اور آزاد مجذوبانہ زندگی بسر کرتے۔ عبدالکبری کے مورخین لکھتے ہیں کہ اکبر کے ختنہ پر جب ہمالیوں نے مارچ ۱۵۶۵ء میں قندھار میں جشن کیا تو اس کے دوران میں آپ پر جذبہ طاری ہوا۔ ہمالیوں کی دوسری بادشاہت کے دوران میں ہندوستان آئے۔ عبدالکبری میں اگرہ میں تھے۔ دارالسلطنت کے ادبی و مذہبی مشاغل میں حصہ لیا۔ بدایونی کہتا ہے کہ آپ اپنے چند شاگردوں اور مریدوں کے ساتھ مفت پانی تقسیم کیا کرتے تھے اور ساتھ ساتھ آبدار و دلگذاڑہ کرکے۔ جب اکبر کے ابتدائی ایام میں بیرم خاں کے سیاسی مخالفوں (اور پھر مخدوم الملک نے) شیعہ سنی سوال اٹھایا تو آپ پر بھی رخص کا الزام لگایا گیا۔ آپ نے اس الزام کی تردید میں ایک ترکیب بند لکھا جس میں رخص کو برا بھلا کہا لیکن آپ کے اشعار سے خیال ہوتا ہے کہ آپ انتہائی طور پر آزاد خیال بلکہ وارستہ مزاج تھے۔ اشعار میں نور بخشی خیالات کی بھی جھلک ہے۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت کی شان میں بھی کثرت سے اشعار ہیں۔ مورخین لکھتے ہیں کہ آپ ان بھٹوں سے برگشتہ ہو کر اکبر آباد سے چل دیے۔ بدایونی لکھتا ہے کہ آپ لنکا کے سفر پر یا پیادہ چلے اور راستے میں وفات پا گئے۔ لیکن یا تو یہ اطلاع غلط تھی یا آپ کا ارادہ سات گاؤں بندر سے جہاز پر سوار ہونے کا تھا۔ ۱۵۹۷ء میں آپ بروان پہنچے اور مقامی روایات کے مطابق تین روز کے بعد ہی وفات پا گئے لیکن اس دوران میں آپ نے ایک ہندو جوگی کو زیر کیا اور اس کی دی

ہوئی زمین پر آپ کا مزار ہے۔

بہرام سقا کے مزار پر سال وفات ۹۷۰ھ درج ہے۔ اس زمانے میں بنگالہ بھی افغانوں کے قبضے میں تھا۔ کوئی گیارہ بارہ سال بعد ۱۵۶۲ء میں اکبر کے جرنیلوں نے داود خاں حاکم بنگالہ کو شکست دی اور فتح بنگالہ کے دوران میں بردوان پر قبضہ کر لیا۔ مسلمان مؤرخوں کی کتابوں میں پہلی دفعہ اس شہر کا نام اس سال آیا، لیکن اس کے بعد اس شہر کی تاریخی اہمیت بہت بڑھ گئی اور اس تاریخی دلچسپی کا عمارتی مرکز پیر بہرام سقا کا روضہ ہے جس کے احاطہ میں دو قبریں دکھائی جاتی ہیں۔ ایک نود جہاں کے پہلے خاوند شیر افغن کی جو بردوان کی عملداری میں جہانگیر کے کوہ اور بنگالہ کے گورنر قطب الدین کوکلتاش کے ساتھیوں کے ہاتھ ہلاک ہوا۔ دوسری قطب الدین کی جس کا شیر افغن نے کام تمام کیا۔ بردوان کے ریلوے اسٹیشن سے ایک میل کے فاصلہ پر صوفی بانیہ کا مزار ہے جنھوں نے فرخ سیر کو بادشاہت کی نوید دی تھی اور جن کے مزار کے قریب فرخ سیر نے بادشاہت حاصل کرنے کے بعد مسجد تعمیر کرائی تھی۔

سقا کی اپنی ادبی اہمیت بہت ہے۔ ان کے دیوان کے متعدد نسخے بنگالہ میں ملتے ہیں۔ دو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں ہیں۔ ایک بانکے پور میں خدا بخش لائبریری میں ہے۔ ہمارے تذکرہ نگار جو عرفی، نظیری اور ظہوری کے درباری و صدارانہ، پرتکلف طرز شاعری پر فریفتہ ہیں۔ سقا سے بالکل بیگانہ ہیں۔ اور اس کے کلام کا کوئی تفصیلی مطالعہ نہیں ہوا۔ ورنہ ایک منفرد حساس، متجسس شخصیت کے اظہار کے علاوہ محاصرانہ طور طریقوں پر روشنی پڑتی۔ بدایونی لکھتا ہے کہ سقا نے بہت سے دیوان جمع کیے۔ جب جذب غالب آتا تو انھیں دھونا شروع کر دیتے لیکن پھر بھی جو کچھ بچ گیا ہے۔ ایک ”دیوان بزرگ“ سے کم نہیں۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو

آمد خبیثہ ز مدارس برائے بحث بنیاد کرد با من مسکین بنائے بحث
گفت از کدام کشوری و نہر بی نظیریت با طمطراق بواجبی از برائے بحث
گفتم کہ لامکانم و عشقت ندیم دارد فراغتے ولم از باجرائے بحث

با آب دیدہ ماورق بحث شستہ ایم بنوشتہ ایم حرف خموشی بجائے بحث
 بگذر بہ بحث عمر مدہ در جہاں بہ باد مرغ دل تو تانیر و در ہوائے بحث
 را ہے لبوئے فقر معنی نبردہ زان آیت و حدیث کہ خواندی برائے بحث
 سقا برول ز مدرسہ و ہر شو کہ ہست
 خود ای مکان مسوئہ غافل از بے بحث

ایک عام رنگ کی غزل ہے ۔
 بے خود و مستم از محبت و سے
 میدہد یار بادہ زان مے ناب
 درہنم را مہو و تلخ مگو
 بگذر از شیوہ دل آزادی
 خوش بود ہائے دیوئے مستان ہم
 زاہد و حافظان خوش آواز
 محتسب حلیت این ہمہ ہے ہے
 با اسیران خویش پیہ در پیہ
 بتو بوی نمی رسد زان مے
 پیہ ہجر و جفا شدن تاکہ
 نیم شبہا بہ یارب و ربائے
 باد در دی کشاں و نالہ و نئے

نزد ستاق سفال فقر خوش است

کے کشد جام او بہ منت کے

بہرام ستاق سیلابی مزاج اور صاف گو تھے ۔ وہ مروجہ خیال بندی اور لفظ پرستی کے
 قائل نہ تھے ۔ جو دل پر گزرتی سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر دیتے ۔ کئی قطعات
 میں شخصی تجربات کا بیان ہے ۔

در مردم ہند طرفہ حالیت کس را بکسے سر سخن نیست
 مستغرق حیرت اندکیر چند آنکہ مجال دم زدن نیست
 سرمست ز بادہ غوراند کس را خبرے ز خوشین نیست
 گفتم کہ سقاوہ بسازم در شہر کسے ممد من نیست
 سقا چہ کند حسن درین کار
 این از فلک است از حسن نیست

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی حکام لاہور (لاہر) کی سخت گیری مشہور تھی ۵
 ہر کہ در لاہر بنائے خیر ساز و بیدار
 خون سے در گردش باد بگویم حالِ شہر
 نامراد سے ساخت سقاخانہ و ہم مسجد
 رسیاں در گردش سے افگند کو تو الِ شہر
 طمطراقِ شحہ بازار و شیعہ شہر
 میکشد سقاخوردہ یک درم ز نالِ شہر
 بہرام سقاہندوستان زانہ تھے، لیکن طبیعت آزاد و قلندرانہ اور نو پسند تھی۔ ریختہ
 میں بھی طرح آزمائی کی اور ان کی ابتدائی عہد اکبری کی لکھی ہوئی غزلیں سب سے قدیمی ریختوں
 میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ لہجہ بھی دلائی ہے ۵

باز ہند و بچہ آہ دلم دھرتے ہے
 کوچہ (کچہ) تاہی جاتوں ازیں خستہ کیا کرتے ہے
 جہیں برابر وزدہ بر بستہ کنارہ بیدیاں
 چل چل لے دل منگر توچہ کنی اور مرتے ہے
 چشم او طرفہ غزالیست کہ در بارغ جناں
 ہمہ ریحان و گل و سنبل تر چرتے ہے
 ہات ہندی لایا دست فرو بردہ بخوں
 کہ بسے کشتہ زدستان غمش مرتے ہے
 بت سرو سہی شرم ندارد در قدش
 خوشنق را بہ چہ روا نیمہ او برتے ہے
 آنکہ مردم کش او دمدم از خون جگر
 قدح چشم مرا از غم خود بھرتے ہے
 چپ کر لے دلشدہ سقا ز غم یار منال
 گر بھارت بجان تو میا کرتے ہے
 بردوان بڑی دیر تک مغلیہ تہذیب و تمدن کا ایک اہم مرکز رہا۔ عالمگیری وفات
 کے بعد یہاں موجودہ ہندو ہمارا جا کی گئی قائم ہوئی، لیکن قدیم تہذیب و تمدن سے تعلق
 برقرار رہا۔ انیسویں صدی میں شمس العلماء مولانا لطف الرحمن بردوانی نے نام پایا جن کی
 مذہبی مسائل پر کئی تصانیف ہیں۔ اسی زمانے کے ایک بردوانی شاعر تھے۔ منشی محمدی
 خادم حضرت شاہ بہرام سقا کی درگاہ کے خادم تھے اور بردوان کے ہمارا جانتا ہے
 بہادر کے فارسی شاعری میں استاد۔ ان کا فارسی دیوان چھپ چکا ہے۔

عہد مغلیہ میں بردوان اور مرشد آباد کے
 درمیان کا سارا علاقہ بالخصوص وہ حصہ
 جو شرفا کی آبادی کی بنا پر شریف آباد کہلاتا

مولانا حمید دانشمند منگلکونی
 وفات ۱۳۵۷ھ

تھا اور چھپس پرگنوں پر مشتمل ایک پوری سرکار (سرکار شریف آباد) کی وسعت رکھتا تھا۔ مسلمان علما اور مشائخ کی وجہ سے ممتاز تھا۔ ان میں سے بعض خاندان ایسے تھے جو گورکھ کی تباہی کے بعد یہاں آئے اور علیحدہ دیہات کو آباد کر کے اسلامی عمل دخل اور علم و ہدایت کا مرکز بن گئے۔ مثلاً سالار۔ بنودیہ۔ منصور پور جہانکے اخوند کارکن صدیقی جو اپنا سلسلہ نسب سلطان غیاث الدین کے قاضی القضاۃ شیخ سراج الدین اور سلسلہ طریقت حضرت نور قطب عالم سے ملاتے ہیں۔ بنگالہ کی علمی اور روحانی تاریخ مرتب کرنے کے لیے ان تاریخی دیہات میں تلاش کی ضرورت ہے، لیکن سرکار شریف آباد میں جو قصبہ اشاعت علمی کے لیے عہدِ مغلیہ میں سب سے مشہور تھا۔ منگل کوٹ تھا جو ضلع بردوان کے شمال میں اب ایک معمولی گاؤں کی حیثیت رکھتا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے پرگنہ منگل کوٹ کی نوے فیصدی آبادی مسلمان تھی اور اس میں قدیمی مسجدیں اور مزار ہیں۔ ایک مزار مخدوم شاہ محمود غزنوی المعروف راہی پیر کا ہے جو مقامی روایا کے مطابق اس پرگنہ کی فتح کے باعث ہوئے۔ ایک مزار مخدوم شاہ عبداللہ گجراتی کا ہے۔ کئی پُرانی مسجدوں کے آثار ہیں۔ ایک شکستہ مسجد جس کا سال تعمیر ۱۵۷۵ء ہے، علاء الدین حسین فرمانروا کے گورنر نے تعمیر کرائی تھی۔ دوسری اس کے بیٹے اور جانشین نصرت شاہ نے ۱۶۳۳ء میں۔ ان مسجدوں کے کتبوں سے پتا چلتا ہے کہ عہدِ مغلیہ سے پہلے بھی یہ قصبہ رونق پر تھا۔ عہدِ مغلیہ میں اس کی اہمیت مولانا حمید دانشمند کی وجہ سے بڑھ گئی جو حضرت مجدد الف ثانی کے چاہیتے مرید تھے۔ اور جن کا قہر دان شاہجہاں بتایا جاتا ہے۔

مولانا شیخ حمید دانشمند منگل کوٹ کے قاضیوں کے مشہور خاندان سے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ قاضی ضیاء الدین (المعروف احمد سالار) بنگال میں شاہ صفی الدین کے ساتھ جن کا مزار پٹوہ (ضلع ہنگلی) میں زیارت گاہ خاص و عام ہے اور جن کی وفات تیرھویں صدی عیسوی کے آخری سالوں میں ہوئی، تشریف لائے۔ مولانا حمید کو تعلیم کے لیے لاہور بھیج دیا گیا۔ جہاں انھوں نے علوم ظاہری کا پوری طرح مطالعہ کیا۔

ان علوم کا ان پر ایسا اثر ہوا کہ وہ صوفیہ کے مخالفت ہو گئے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اس زمانے میں لاہور میں تھے، لیکن صوفیہ سے مخالفت کی بنا پر مولانا حمید نے ان سے فیض حاصل نہ کیا۔ تکمیل تعلیم کے بعد آپ دہلی آئے اور مفتی و عسکر کے مکان پر مقیم ہوئے۔ یہاں اتفاقاً حضرت مجددؒ سے ملاقات ہو گئی۔ کچھ بحثا بحثی بھی ہوئی، لیکن آپ حضرت مجددؒ سے اس طرح متاثر ہوئے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان کے پیچھے ہو لیے۔ تعلیم باطنی کے کوئی ایک سال بعد حضرت مجددؒ نے انھیں خلافت عطا کی اور یہ مرشد کی کھڑاویں لے کر انھیں اپنی دستار میں لپیٹ کر وطن کو روانہ ہوئے اور باقی وقت منگل کوٹ میں ارشاد و ہدایت میں صرف کیا۔

کہا جاتا ہے کہ شاہجہاں آپ کا بڑا معتقد تھا۔ وہ منگل کوٹ آیا۔ آپ سے اخذ فیض کیا اور مسجد مدرسہ اور خانقاہ کے لیے انہی ہزار سالانہ آمدنی کی وسیع اراضی کا فرمان دیتا گیا۔ ان بیانات کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں کہ شاہجہاں جب اپنے والد کے خلاف بغاوت کر کے بنگالہ میں مقیم تھا اور بالخصوص جب ۱۶۲۲ء میں اس نے برہمن فتح کیا۔ اس وقت اسے مولانا حمید دانشمند کے کاموں سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا ہو۔ مولانا حمید کے شکستہ مزار کے قریب ایک مسجد تھی جس کی نسبت مشہور ہے کہ وہ شاہجہاں کی مالی مدد سے تعمیر ہوئی تھی۔ مولانا کا مقبرہ تو اب شکستہ حالت میں ہے اور شاہجہاںی مسجد کے طلبہ سے اہل قصبہ نے ایک نئی مسجد تعمیر کی ہے، لیکن اب بھی اس شہر میں علمی اثرات موجود ہیں۔ تقسیم ہند کے وقت تک یہاں ایک مدرسہ تھا جس کا کتب خانہ اب مدرسہ عالیہ ڈھاکہ کے کتب خانہ کا حصہ ہے!

مولانا حمید کا پورا نام مولانا حمید الدین تھا۔ ان کے نام حضرت مجددؒ کے کسی خط

لے یہ تفصیل مولانا بد الدین سرسندی نے حضرت مجددؒ کی سوانحوی حضرت اقدس میں دی ہیں۔ اس وقت حضرت اقدس ہمارے سامنے نہیں۔ ہم نے اس کے اندراج کا خلاصہ خان صاحب مولوی عبدالولی صاحب مضمون متعلقہ معطل کوٹ: بہار۔ اریسیر ریسرچ سوسائٹی جرنل سال ۱۹۷۷ء سے اخذ کیا ہے۔

ہیں۔ جلد اول میں ایک اہم طویل خط (مکتوب ۲۲) صوفیوں کی بعض غلط فہمیوں اور مقامات روحانی کے متعلق غلط فہمیوں کے بارے میں ہے۔ جلد ثانی میں چھ صفحے کا ایک خط (۲۶) کمالات نبوت اور کمالات ولایت کے متعلق ہے۔ مُرشد کو اپنے دُور اُفتادہ مُريد کا خاص خیال تھا۔ ایک خط (۸۴) میں شکایت کی ہے کہ مولانا حمید الدین کی طرف سے بہت کم خط آتے ہیں اور فرماتے ہیں :-

”انہی ارشدی میاں شیخ حمید عجب از و اختیار نمودند کہ سلام و پیام را ہم آنجا گنجائش کمتر است۔ دریں ہفت و ہشت سال یک کتابت از جانب شمار سید انہم ناتمام و بے سرانجام۔ کتابت ہا کہ از این جانب سے بود معلوم نیست کہ بشمارے رسد یا نہ۔“
آگے چل کر لکھا ہے کہ میں شیخ عبدالحی کو جو پانچ سال میرے ساتھ رہے۔ آپ کے پاس بھیج رہا ہوں تاکہ آپ کے احوال سے آگہی حاصل کریں اور آئندہ کے لیے مناسب مشورے دیں۔

مولانا حمید و اشمند کے متعلق زیادہ تفصیل نہیں ملتیں اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی بدولت مجددیہ سلسلہ کس حد تک بنگال میں اشاعت پذیر ہوا۔ حضرت مجدد کے جانشین خواجہ محمد معصوم کے مطبوعہ مکتوبات (کانپور ایڈیشن) میں ایک خط شیخ فیض اللہ بنگالی کے نام ہے اور وہ خطوط شاہ نعمت اللہ قادری کے نام ہیں۔ قلمی مکتوبات (بانکے پور لاہوری) میں شیخ عبدالحق کے نام خطوط ہیں۔ لیکن وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کون بزرگ تھے۔ بنگال میں نقشبندیہ مجددیہ طریقے کے ماننے والے کئی ہیں۔ لیکن بظاہر اس علاقے میں اس طریقے کی زیادہ اشاعت اُنیسویں اور بیسویں صدی میں ہوئی۔
مشرقی پاکستان کے جس سب سے قدیمی مجددی بزرگ کا پتا چلا ہے وہ ڈھاکہ کے شاہ عبد الرحیم صاحب شہید تھے۔ آپ

بزرگان ڈھاکہ

کشمیری الاصل تھے۔ پہلے مُرشد آباد آئے۔ وہاں سے ڈھاکہ تشریف لائے۔ تین واسطوں سے آپ کا سلسلہ خواجہ محمد معصوم تک اور چار واسطوں سے حضرت مجدد الف ثانی تک جا پہنچتا ہے۔ آپ صوفی ہدایت الشرف صوفی حسن کے

خلیفہ تھے۔ وہ صوفی عبداللہ کے اور صوفی عبداللہ حضرت خواجہ محمد معصوم کے آپ
۱۶۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ غالباً عبداللہ عالمگیری کے اواخر میں ڈھاکہ تشریف لائے۔
چوراسی برس کی عمر میں ایک دیوانے کے ہاتھ سے چار ستمبر ۱۶۵۲ء کو زخمی ہوئے۔ اس کے
بعد ایک مہینہ تین دن زندہ رہے اور بالآخر ۹ رمضان المبارک ۱۰۸۵ھ کو وفات پائی۔
اگلے روز دفن ہوئے۔ کسی ہمعصر شاعر نے تاریخ لکھی ہے

مزارِ شاہِ دیں عبدالرحیم بہت پُر از فیضِ خداوندِ کریم است
زہے روشنِ دلِ صاحبِ کینہ اثرِ مے داشت از سینہ بہ سینہ
زاوصافش کرامتِ منجلی بُود چراپنہاں کنم بیشک ولی بُود
سن تدفین از روئے وفائے دہم رمضان بود آمد مدائے

شاہ عبدالرحیم شہید کی عمر میں خدا تعالیٰ نے برکت دی اور آپ کی بدولت
مجددیہ نقشبندیہ طریقے کی اشاعت اس علاقے میں خوب ہوئی۔ چٹاگانگ کے مشہور
صاحب خانقاہ بزرگ صوفی شاہ امانت اللہ صاحب آپ ہی کے خلیفہ تھے اور ڈھاکہ
میں بھی آپ کا فیض جاری ہے۔ آپ کو اپنے زمانے میں میاں صاحب کہا جاتا تھا۔
اس لیے ڈھاکہ کے جس علاقے میں آپ کا قیام تھا اور اب مزار ہے، محلہ میدان میاں صاحب
کہلاتا ہے۔

ڈھاکہ کی ایک اور مشہور خانقاہ جس کا فیض ابھی جاری ہے اور جس کے بعض ارکان نے
مجددیہ طریقہ اختیار کر لیا تھا، دائرہ عظیم پورہ کی درگاہ ہے۔ جس کا آغاز اسی زمانے میں ہوا۔
اس خاندان کے سب سے قدیمی بزرگ صوفی سید محمد داکم صاحب چٹاگانگ کے رہنے والے
تھے اور حضرت سید بختیار ماہی سوار کی اولاد سے تھے جو قریباً پانچ سو سال ہوئے،
چٹاگانگ تشریف لائے۔ صوفی صاحب نے اپنے وطن میں شاہ امانت اللہ صاحب سے
بیعت کی جو چٹاگانگ میں شاہ عبدالرحیم شہید کے مشہور صاحب خانقاہ خلیفہ تھے۔ جب
وہاں کشودکار نہ ہوا، تو آپ پیر کی اجازت سے ڈھاکہ آئے اور حضرت شاہ عبدالرحیم
کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے ارشاد کیا کہ تمہارا حصہ پینے کے شاہ منعم پاکباز

کے یہاں ہے۔ چنانچہ وہ پٹنہ گئے اور حضرت منعم پاکباز قدس سرہ سے حصول فیض کے بعد ڈھاکہ تشریف لائے۔ اور محکمہ عظیم پورہ میں حضور ہو گئے۔ آپ کے جانشین بھی سوائے حج کے دائرہ سے کبھی باہر نہیں نکلتے اور ہمیشہ دائرہ میں حضور رہتے ہیں۔

حضرت صوفی محمد دائم کو خدا نے بڑی مقبولیت دی اور دور دور سے لوگ آپ کے پاس فیض حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ تاریخ ڈھاکہ میں لکھا ہے کہ چار گام مکرا اور نواکھالی کے اکثر اشخاص آپ کے مُردِ حق تھے۔ آپ بڑے پابندِ شرع تھے۔ سماع المزامیر کبھی نہیں کرتے تھے۔ صرف قال اللہ و قال رسول سے دائرہ گونجا کرتا تھا۔ خانقاہ میں کثرت سے طالب علم رہتے تھے جن کی تعلیم و تدریس کے لیے علما مقرر تھے اور کھانا کپڑا خانقاہ کے لشکر سے ملتا تھا۔ آپ کا وصال ۹۹۹ھ میں ہوا۔ آپ کا فیض آپ کے جانشینوں نے جاری رکھا اور اب بھی جاری ہے۔ لیکن روحانی امور اور تزکیہ نفس سے اس زمانے میں جو دلچسپی کم ہو گئی ہے۔ اس سے یہ خانقاہ بھی متاثر ہوئی ہے۔ مثلاً آپ کے ایک جانشین صوفی سید شاہ خلیل صاحب نے حکیم حبیب الرحمن سے فرمایا۔ ”میاں، چالیس برس ہو گئے۔ باپ دادا کی گدی پر بیٹھا ہوں۔ مگر اللہ کا راسخا پر پھنے لوگ کم ہی آتے ہیں۔ جو آتا ہے، جھار، پھونک، تحوید، طومار کے لیے آتا ہے۔“ آپ کے پوتے صوفی شاہ وجہ اللہ صاحب نے مجددی طریقہ اختیار کر لیا تھا اور وحدت الوجود کی تردید اور وحدت الشہود کی تائید میں ایک رسالہ بھی لکھا، لیکن باقی حضرات نے اپنے بزرگوں کا طریقہ جاری رکھا۔ دائرہ کی ایک خصوصیت یہاں کا علمی ماحول ہے۔ ایک کتب خانہ بھی ہے۔ اور تصنیف و تالیف کا جو سلسلہ شاہ وجہ اللہ صاحب سے شروع ہوا برابر برقرار ہے۔

منگل کوٹ اور ڈھاکہ کے علاوہ اس
زمانے میں علم و ہدایت کا ایک سرچشمہ
مدرسہ باگھا۔ ضلع راج شاہی |
قصبہ باگھا تھا۔ تصدیق الزہاد میں خان بہادر انوند کار فضل ربی لکھتے ہیں۔ کہ حضرت

نور قطب عالم کے خلیفہ شیخ بدرالاسلام جنھیں راجا گنیش کی تعظیم نہ کرنے پر شہید کیا گیا، باگھا کے عباسی اخوندکاروں کے مورث اعلیٰ تھے۔ یہاں بہت سے بزرگوں کے مزار ہیں۔ اور ایٹ بنگال ریلوے ٹائم ٹیبل کے مطابق یہ مقام "پیروں کا مسکن" سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کی جامع مسجد نصرت شاہ نے ۱۲۳۵ھ میں تعمیر کرائی۔

مشہور ہے کہ ۱۵۱۹ھ میں یہاں بغداد سے مولانا شاہ معظم و الشہداء (المعروف شاہ دو) تشریف لائے اور انھوں نے مخدوم پور کے شاہی جاگیردار الحاجزادہ شکر کی صاحبزادی زینب النساء سے شادی کی اور خاندانی مدرسے کا آغاز کیا۔ ان کے بیٹے نے تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھا اور پوتے شاہ عبدالوہاب کو شاہجہاں کی طرف سے بیالیس گاؤں، جن کی آمدنی کا اندازہ اس زمانے میں آٹھ ہزار کیا جاتا تھا، انعام میں ملے۔ غالباً یہ ارضی اس زمانے میں ملی ہوگی، جب شاہجہاں بنگالہ میں مقیم تھا اور بعد میں اس کی توثیق ہو گئی ہوگی۔ ۱۶۲۷ھ میں شاہ عبدالوہاب کے بیٹے شاہ محمد رفیع نے نصف جائیداد کو وقف میں منتقل کر دیا۔ اور باقی نصف اپنے بھائی نور العارفین کی اولاد کے پاس رہنے دی۔ اس وقت سے یہ وقف برقرار اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ قائم ہے۔ متولی مدرسہ، مسجد، مزار اور مسافروں کی نگہداشت کا انتظام کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں جب مسٹر آڈم نے بنگال بہار کے تعلیمی اداروں کا دورہ کیا اور اپنی مشہور تعلیمی رپورٹ مرتب کی تو اس وقت اس مدرسہ میں عربی فارسی کی پڑھائی کا باقاعدہ انتظام تھا۔ اور مسٹر آڈم نے اپنی رپورٹ میں قصبہ باگھا کے مدرسہ کے متعلق کئی صفحات لکھے ہیں۔ وقف کی آمدنی کے متعلق اس زمانے کے کلکٹر کا اندازہ تین ہزار تھا۔

بنگال میں قادریہ سلسلے کے جس بزرگ کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے وہ گوڑ (فیروز آباد) کے

شاہ نعمت اللہ قادری تھے جو ناول میں پیدا ہوئے اور سیر و سفر کے دورہ ان

لے غالباً یہ روایت صحیح نہیں۔

راج محل آئے جو شاہ شجاع کے زمانے میں بنگالہ کا حاکم نشین شہر تھا۔ شاہ شجاع نے آپ کی بڑی قدر کی۔ آخری ایام میں آپ گوڑ کے نواحی قصبہ فیروز آباد تشریف لے گئے اور وہیں ۱۶۶۲ء میں وفات پائی۔ آپ بڑے صاحبِ سطوت بزرگ تھے کئی بزرگوں سے آپ کے مراسم تھے اور علمی حلقوں میں بھی آپ کا نام ادب سے لیا جاتا تھا۔ آپ متعدد کتب کے مصنف تھے۔

اسی دار الخلافہ گوڑ کا بہت تھوڑا حصہ پاکستان میں شامل ہے۔ اس میں شاہ نعمت اللہ صاحب کی درگاہ بھی ہے۔

عہدِ آخر کے مشائخِ قادریہ | شاید موجودہ زمانے میں بنگالہ کی سب سے اہم قادری خانقاہ کلکتہ میں ہے۔ اس خاندان کا سلسلہ مغلیہ خاندان کے عہدِ زوال میں، بلکہ پلاسی کی لڑائی کے بعد شروع ہوا، لیکن بزرگوں کے فیض سے اس سلسلے نے بڑی اہمیت حاصل کر لی اور چونکہ اس خاندان سے اہل علم اور اہل تصنیف بزرگوں کا تعلق رہا ہے اس لیے اس خاندان سے متعلق معلومات بھی کافی مل سکتی ہیں۔

۱۶۶۲ء میں حضرت غوثِ اعظم قدس سرہ کی اولاد میں سے ایک بزرگ سیدنا حضرت ذاکر علیؒ اپنے والد بزرگوار اور بعض دوسرے عزیزوں کے ساتھ ایک اشارہ غلی کے تحت بنگالہ تشریف لائے اور منگل کوٹ ضلع بردوان میں جو ان دنوں خوب آباد اور علمی اور مذہبی سرگرمیوں کا بڑا مرکز تھا، بس گئے۔ آپ کے والد ماجد اور بعض دوسرے اقربا تو بعد میں بغداد واپس چلے گئے۔ لیکن سیدنا شیخ ذاکر علی ان کے بھائی سیدنا روشن علی صاحب صوبہ بہار کے ضلع پورینہ میں تشریف لے گئے اور وہاں قریب سلسلے کی اشاعت کا مرکز بنے۔ سیدنا ذاکر علی نے اپنے بھتیجے کے ساتھ منگل کوٹ کو ارشاد و ہدایت کا مرکز بنایا۔ ایک مختصر سی خانقاہ تعمیر کی۔ آپ کی وفات کیانی برس کی عمر میں ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ آپ کے جانشین آپ کے بھتیجے اور داماد سیدنا شاہ طفیل علی قادری تھے۔ پہلی اہلیہ محترمہ کی وفات کے بعد انھوں نے دوسری شادی

مدناپور کے مشہور بزرگ اور مولنا شہباز بھاگل پوری کے ممتاز خلیفہ دیوان سید رحیمی (مشتہور بہ چندن شہید) کے خاندان میں کی۔ شادی کے بعد آپ کا بہت سا وقت مدناپور میں گزرا۔ بلکہ ایک لحاظ سے آپ نے وہاں سکونت اختیار کر لی، لیکن وفات سے پہلے اپنے پیر و مرشد کے قریب جگہ حاصل کرنے کے لیے آپ بیماری کی حالت میں منگلکوٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہی وصال ہو گیا۔ (۱۸۳۶ء) نعش مبارک آپ کی خواہش کے مطابق منگلکوٹ میں دفن ہے۔ آپ کے جانشین آپ کے دوسرے صاحبزادے حضرت ہر علی قادری (معروف بہ حضرت اعلیٰ حضور) تھے۔ وہ مدناپور میں ۱۸۰۸ء میں پیدا ہوئے اور وہیں قیام فرمایا۔ آپ نے مدناپور میں ایک مدرسہ اولہ ایک خانقاہ کا آغاز کیا، لیکن اردگرد کے اضلاع (یعنی بردوان، مرشد آباد، بیر بھوم، ہنگلی، بانکورا اور اطراف مدناپور) میں دورہ کرتے اور لوگوں کو ہدایت فرماتے۔ آپ کی وفات ۱۸۶۸ء میں ہوئی۔ آپ کے جانشین حضرت شاہ علی عبدالقادر شمس القادر مرشد علی القادری تھے، جو ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے اور سولہ برس کی عمر میں اپنے والد بزرگوار کے جانشین ہوئے۔ آپ نے قریباً تینتالیس سال تک مسند ارشاد و ہدایت کو زینت دی۔ بالآخر آپ نے کلکتہ میں قیام اختیار کیا، لیکن مزار مبارک مدناپور میں ہے۔ آپ آخری ایام کے مشاہیر بزرگوں میں سے تھے۔ مولنا عبدالرحمن قادری پیر و مہیر سینٹ زیور کالج کلکتہ نے دو جلدوں میں آپ کے سوانح حیات و ارشادات تکرر الموائے کے نام سے جمع کیے ہیں۔ آپ سے بہت سی کرامات منسوب کی جاتی ہیں۔ شمس العلما مولنا ولایت حسین آپ کے بڑے محقق تھے۔ آپ نے ان کے بیٹے ہدایت حسین کے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے افسر اعلیٰ ہونے کی پیشگوئی اس وقت کی تھی، جب وہ ابھی گیارہ سال کے تھے اور یہ عہدہ انگریزوں کے لیے مخصوص تھا۔ آپ کی وفات فروری ۱۹۰۸ء میں ہوئی اور جانشین حضرت سید شاہ ارشاد علی قادری المعروف سیدنا حضور مولانا ہوئے۔ وہ ۱۸۸۳ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں وفات پا گئے۔ قادریہ سلسلے کی اشاعت اور تبلیغ اسلام کے علاوہ اس خانوادے نے اشاعتِ علم

میں بھی حصہ لیا۔ خانقاہ لین کلکتہ میں ایک وسیع کتب خانہ قادریہ لائبریری کے نام سے ہے۔ اس کے علاوہ اس خاندان کے بزرگوں نے تصنیف و تالیف پر بھی توجہ دی۔ ہم تذکرۃ المولائے کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اس خاندان کے حالات میں فارسی میں مذاکرۃ قطب العالمین اور انگریزی میں حبش مسٹر محبوب مرشد کی گلستان قادری (انگریزی) شائع ہو چکی ہیں۔ ہم نے مندرجہ بالا حالات گلستان قادری سے ہی اخذ کیے ہیں۔ حبش محبوب مرشد کے والد اور سابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سید عبدالسالک صاحب کی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی کتاب *Early Heroes of Islam* کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور انھوں نے حضرت غوث اعظم کی ایک انگریزی سوانح عمری بھی لکھی ہے۔

غیر شرعی طریقے | نقش بندیہ اور قادریہ سلسلوں اور باگھ جیسے علمی مرکزوں کی بدولت بنگال میں قرآن و سنت اور متشرع طریقت کی روشنی بھیلتی ہوئی، لیکن قرائن سے خیال ہوتا ہے کہ عہدِ مغل میں یہاں غیر شرعی طریقے زوروں پر تھے اور انیسویں صدی کے آغاز تک عوام میں سب سے زیادہ زور انھی کا تھا۔ مثلاً مسائل المشائخ میں جو نویں یا دسویں صدی ہجری کی تالیف ہے۔ کثرت سے شطاری درویشوں کا ذکر آتا ہے۔ اسی طرح بے شرع مدار یہ فرقہ کی نسبت حکیم حبیب الرحمان لکھتے ہیں۔ ”بنگال کے قریب ہر ضلع میں مدار گنج۔ مدار کا دائرہ۔ مداری پور نام کی بستیاں ملتی ہیں۔ اسی دھاکہ میں مدار جھنڈا کی گلی اب بھی موجود ہے۔“ ڈاکٹر انعام الحق کا خیال ہے کہ اس فرقے کے بانی شاہ مدار (جن کی پیدائش انھوں نے ۱۲۱۵ھ اور تاریخ وفات ۱۲۳۶ھ لکھی ہے) بنگال میں آئے تھے اور یہاں ان کا بڑا اثر تھا۔ بنگال کے کسی گاؤں اور شہر (مثلاً ضلع قریہ پور میں مداری پور اور ضلع چٹاگانگ میں مدار بادی اور مدار شاہ) ان کے نام پر آباد ہیں۔ یہ رائے تو قیاس پر مبنی ہے، لیکن مرآۃ مدار یہ اور فصول مسعودیہ کے مطابق شاہ مدار کے ایک مشہور خلیفہ حضرت شاہ الاکبر میں آئے اور وہیں وفات پائی۔ مجذوب تھے۔ برہنہ رہتے تھے۔ حضرت نور قطب عالم کے ہم عصر تھے۔

گزار ابراہار میں آپ کی نسبت لکھا ہے۔ اس سلسلے کے بعض فصیح اللسان لوگ آپ کو شیخ اعلیٰ بھی کہتے ہیں، لیکن عوام کے نزدیک آپ شیخ الہ کے نام سے ہی نامزد ہیں۔ آپ بھی انھیں مجذوبوں میں سے ہیں جو مشہور دنیا ہیں۔ آپ کی گورگور میں ہے۔ ضلع دیناج پور کا موضع بلیا دیھی (مقتانہ ہمت آباد) میں عہد شاہجہانی سے آزاد قلندروں اور غیر شرعی فقیروں کا ایک مرکز ہے جنھوں نے ہندو لوگ اسلامی تصوف اور اخلاقی آزادی کی ایک عجیب کچھڑی بنا رکھی ہے۔ یہ لوگ سوائے ایک لنگوٹی کے کوئی کپڑا نہیں پہنتے۔ برہمنہ کہلاتے ہیں۔ سر کے بال نہیں کٹواتے۔ پاؤں میں بعض سا دھوؤں کی طرح بھیریاں پہنتے ہیں۔ ان کے عقائد و اعمال کئی امور میں غیر اسلامی ہیں۔ ان کے مورث اعلیٰ شاہ سلطان حسنی ماریہ برہمنہ تھے جنھوں نے ایک ہندو راجا بلیا کو بھاگا کر اس جگہ پھنس کر لیا۔ شاہ شجاع نے جس نے ڈاکٹر باٹن سے خوش ہو کر انگریز کمپنی کو وہ بے پناہ مراعات دی تھیں۔ جن کا نتیجہ عالمگیر اور کمپنی کی کشمکش اور ساٹھ ستر سال بعد پلاسی کی لڑائی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ شاہ سلطان حسن کو بھی خاص مراعات دے رکھی تھیں۔ اس زمانے کی ایک سند محرزہ ۱۰۵۹ھ راج شاہی کے سرکاری دفتر میں موجود ہے۔ جس میں شاہ شجاع نے شاہ سلطان حسن کو اختیار دیا تھا۔

دفعہ اول۔ تم جب کبھی لوگوں کی ہدایت یا سیروسیاحت کے لیے شہروں، دیہات، اضلاع اور جہاں کہیں اپنی خوشی کے مطابق جانا چاہو تمھیں اختیار ہے کہ جلوس کا سارا ساز و سامان مثلاً علم، بھندے، پھریے، بانس، عصا، باجے، باہی مراتب اپنے ساتھ لے جاؤ۔

دفعہ چہارم۔ جب تم ملک کے کسی حصے میں جاؤ تو مالکان دیہہ اور کاشتکار تمھیں اشیائے خوردنی مہیا کرنے کا بندوبست کریں گے۔

شاہ شجاع نے جو مراعات دی تھیں، اس کا سلطان حسن کے جانشینوں نے پورا قائدہ اٹھایا۔ اٹھارہویں صدی میں جب حکومت کا نظم و نسق کمزور ہو گیا تو ملک میں نیم برہمنہ قلندروں اور ہندو بیراگیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ پھرتے تھے جو

دیہات اور قصبات سے بظاہر خیرات کے طور پر، لیکن فی الحقیقت جبر اور دباؤ سے
 نذرانے وصول کرتے تھے۔ بعض دفعہ تو ان کی تعداد ہزار بارہ سو تک جا پہنچتی۔ کمپنی کے
 افسروں کو بنگال - بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کرنے کے بعد کئی دفعہ ان کے خلاف
 فوج کشی کرنی پڑی، لیکن برسوں تک یہ سلسلہ ختم نہ ہوا۔ مثلاً اکتوبر ۱۷۸۱ء میں پانچ سو فقیروں کا
 ایک لشکر بنگال سے بہار میں داخل ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم مدار یہ فرقہ سے متعلق ہیں۔ اور
 والدہ کے قریب ایک درگاہ (غالباً شاہ مدار کے خلیفہ شاہ الاکا مزار ہوگا) اور ضلع بوگرہ میں
 ہستان (جہاں حضرت ماہی سوار علی کا مزار ہے) کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ کئی مہینے
 وہ شمالی بنگال کے مختلف اضلاع اور ضلع ڈھاکہ میں چکر لگاتے رہے۔ ان کا سرگروہ شاہ
 مجنوں مجذوب تھا۔ جو مداریوں کے مرکزی مقام مکن پور (یو۔ پی) کا رہنے والا تھا۔
 بعض رپورٹوں میں اسے مداری اور بعض میں (سلطان حسن کے سلسلہ کا) برہمنہ فقیر لکھا
 ہے۔ برہمنہ فقیروں کے مرکز بلیادگی میں بھی اس کا مکان تھا۔ وہ خوش خرام گھوڑے پر
 سوار ہو کر اپنے ہمراہیوں کی قیادت کرتا تھا۔ انگریز افسروں نے فوج کے کئی دستے ان
 فقیروں کے خلاف بھیجے۔ لیکن وہ دیہات میں بکھر جاتے تھے اور عوام ان کی سرپرستی
 کرتے تھے اس لیے کوئی فیصلہ کن محرم نہ ہوا اور مجنوں شاہ اور ان کے ساتھی اپنی وصولیاں
 کر کے واپس چلے گئے۔ ۱۷۸۲ء میں وہ پھر آئے اور ناٹور کی رائی بھوانی کو ایک عرصہ تک
 پیش کی کہ انگریز ان کی قدیمی مسلمہ مراعات میں مخل ہو رہے ہیں، انھیں بجایا جائے۔
 اس کے بعد وہ ہر دوسرے سال آتے رہے۔ کمپنی نے کئی چھاؤنیاں ان مسلح فقیروں
 اور سنیا سیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قائم کیں۔ لیکن ان کا سلسلہ برقرار رہا۔ حتیٰ کہ
 ۱۷۸۶ء میں مجنوں شاہ مکن پور میں وفات پا گیا۔ اس کے بعد بھی مجنوں شاہ کے بھائی
 موسے شاہ اور متنبی چراغ علی اور دوسرے جیلوں نے کئی سال تک یہ سلسلہ برقرار رکھا۔
 کمپنی کے سپاہیوں اور فقیروں سنیا سیوں کی یہ کشمکش تھی جسے بنکم چندر چٹرجی نے
 اپنے ناول انڈیا میں منظر بنایا۔

مرتنی شاہی فقیر | اسی طرح مرتضیٰ شاہیوں کا فرقہ تھا۔ جن کے بانی

شاہ مرتضیٰ مجذوب یا سید مرتضیٰ اندھ تھے۔ ان سے کئی بنگالی کتب منسوب کی جاتی ہیں۔ ایک پداولی یعنی بنگالی ویشنوی گیتوں کی کتاب ہے۔ دوسری یوگ قلندر جو اس قسم اور اس نام کی کتابوں میں بہترین سمجھی جاتی ہے۔ یوگ قلندر داراشکوہ کے مجمع البحرین کی طرح اسلامی تصوف اور ہندو یوگ کی ہم آہنگی کا اظہار ہے۔ ایسی کتابیں اٹھارہویں صدی میں کثرت سے لکھی گئیں اور ان میں تصوف کے خیالات یوگ کی زبان میں ادا کیے گئے، لیکن ان میں یوگ کا عنصر اس قدر زیادہ ہے کہ ڈاکٹر انعام الحق ان کتابوں کو مسلم یوگ ٹریچر کہتے ہیں۔ سید مرتضیٰ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔

خاں صاحب عبدالولی خاں مرحوم جنہوں نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے جنرل میں مسلمانان بنگالہ کی قدیمی عمارتوں اور شخصیتوں کے متعلق بیش بہا مضامین لکھے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں ذیل کی غزل سید مرتضیٰ سے منسوب کرتے ہیں ۵

فارغ از سود و بیغم از ضرر	دو جہاں را بہ نیم بخور نہ خرم
از فریب جہاں خبر دارم	تا نگوئی کہ مرد بے خبرم
قانعم سپہو شیر در بیشہ	نہ چو نسگ بہر جیفہ در بدم
سرخ رویم چو بل رانی	ز رازاں دوست زرد در نظرم
گزراں است مرتضیٰ دنیا	بہتر آن است تیر تر گزرم

سید مرتضیٰ بریلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام سید حسن تھا۔ اور مرشد کا نام سید عبدالرزاق۔ سید حسن ترک وطن کر کے مرشد آباد چلے آئے اور سید مرتضیٰ اس ضلع کے تھانہ جنگی پور کے ایک گاؤں بلیا گھٹا میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے متعلق تذکرے خاموش ہیں، لیکن چونکہ وہ شاہ نعمت اللہ ولی قادری فیروز آبادی (متوفی ۱۲۶۲ھ) کے ہم عصر تھے۔ اس لیے ڈاکٹر انعام الحق کا قیاس ہے کہ وہ سنہ ۱۵۹ھ کے قریب پیدا ہوئے ہوں گے اور اس کے ستر بہتر سال بعد آپ کی وفات ہوئی ہوگی۔ شاہ نعمت اللہ صاحب آپ کی خلاف شرع باتوں کے خلاف معترض تھے، لیکن کہا جاتا ہے کہ بعد میں انھوں نے یہ انداز مخالفت ترک کر دیا۔

اور اب سید مرتضیٰ کے سالانہ عرس کے بعد مرتضیٰ شاہی فقیروں کا سرگروہ شاہ نعمت اللہ کے مزار پر جاتا ہے اور ان کے عرس تک وہیں قیام کرتا ہے۔

مفتی غلام سرور نے خزانۃ الاصفیاء میں آپ کے کچھ حالات معارج الولاہیت سے نقل کیے ہیں۔ ان کے مطابق آپ راج محل میں جو شاہ شجاع کے زمانے میں بنگالے کا صدر مقام تھا رہا کرتے تھے اور یوگیوں کی طرح نشے کی حالت میں رہتے اور سماع اور موسیقی کے بڑے دلدادہ تھے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے اندر مرتضیٰ یا مرتضیٰ اند کہلانے کا سبب یہی خوش باشی ہو، لیکن عوام الناس میں مشہور ہے کہ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ ایک برہمن دہن اند مایا دیوی اپنا گھر بار چھوڑ کر آپ کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھی اور اس قربانی سے خوش ہو کر آپ نے کہا تھا کہ تمہارا نام میرے نام کے ساتھ وابستہ رہے گا۔

سید مرتضیٰ کی زندگی لاہور کے مادھو لال حسین کی طرح تھی۔ ان سے بہت سی کرامات منسوب کی جاتی ہیں۔ مزار پر اب بھی ہر سال عرس ہوتا ہے۔ آپ کے رشتہ کے فقیروں کو مرتضیٰ شاہی کہا جاتا ہے، لیکن خان صاحب عبدالولی کا جنھوں نے آپ کے حالات آپ کے خاندان کے ایک بزرگ مولوی سید ابوالفضل سے جمع کیے۔ خیال ہے کہ آپ کے (اور بعد کے بے شرع) طریقوں میں شیو شکتی کے ہندو بجا ریوں کی بہت سی چیزیں جمع ہو گئیں جن میں وحدت وجود کو عیاشی اور من مانی باتیں کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔

بنگال میں اسلام | غیر شرعی طریقوں کے رواج، گورکھ وجے اور یوگ قلندر جی کی کتابوں کی مسلمانوں کے قلم سے تحریر ستیہ پر اور ماتک پیر

جیسے غیر اسلامی عناصر کی تعظیم و تکریم سے بھی زیادہ اہم چیز یہ تھی کہ عام مسلمانوں کی زندگی اعمال و عقائد میں کثرت سے ہندوانہ چیزیں داخل ہو گئیں۔ فی الحقیقت یہ عمل بنگال کے ساتھ مخصوص نہیں ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس کی کارروائی نظر آتی ہے، لیکن ایک فرق تو قلت اور کثرت کا ہے۔ بنگال میں یہ اثرات دوسری

جگہوں سے بہت زیادہ وسیع ہیں۔ دوسرے باقی حصہ ملک میں تو ہندو اثرات پیش اس منظر کا بقیہ ہیں جو نو مسلم آبادی کو اپنے آبا و اجداد سے ملا۔ لیکن بنگال میں ہندو مذہب کی نئی زندگی اور ہندو زمینداروں کے بڑھتے ہوئے اثر کے ساتھ عام مسلمانوں میں وہ چیزیں آگئیں جو پہلے نہ تھیں۔ مثلاً صوفیوں کی مجالس میں بشن پد گائے جانے لگے۔ مسلمان شاعروں نے بشن پد لکھے۔ اسی طرح شیو مت کے ماننے والوں نے جو تترک طریقے اختیار کیے تھے وہ ماراویں اور شاید شطاریوں نے اختیار کر لیے۔ شاید ان سے بھی اہم وہ عقیدہ مندانہ طرز عمل تھا جو ہندو رسم و رواج اور طور طریقوں کے متعلق عام ہو گیا اور اس وقت بھی بعض علاقوں سے بالکل زائل نہیں ہوا، بالخصوص مشرقی پاکستان کے راج شاہی ڈوئرن جس میں زیادہ تر وہ علاقے شامل ہیں جہاں ہندو زمینداریاں کثرت سے تھیں اور ہندوؤں کے علمی، مذہبی اور تہذیبی مرکز تھے، یہ رجحان کثرت سے نظر آتا ہے۔ اس ڈوئرن میں ایک ضلع ضلع ہے کشتیہ جس کا زیادہ حصہ پہلے (موجودہ مغربی بنگال کے) ضلع ندیا میں شامل تھا۔ یہاں کے ایک علی افسر نے راقم الحروف کو ۱۹۵۵ء میں بتایا کہ وہاں اب بھی قریباً پانچ فیصدی مسلمانوں کے نام ہندوانہ ہیں۔ یعنی گول چند وغیرہ۔ صرف نام سے پہلے وہ شیخ لگا لیتے ہیں۔ یعنی ہندو کا نام تو ہو گا گول چند اور مسلمان کا شیخ گول چند۔ دیہات میں مسلمان عورتوں کا لباس ہندوانہ ہے۔ راج شاہی کے گزٹریں میں نچلے طبقے کے مسلمانوں کے متعلق بعض معلومات جمع کی گئی ہیں، جو اس لیے اہم ہیں کہ ان کے ماخذ ایک مسلمان افسر، مولوی عبدالغفار (نساخ؟) ڈپٹی مجسٹریٹ راجشاہی تھے۔ ان میں ترہ فقیر یا گور و صفا کے نام تھاد مسلمان پیروؤں کے طریقے تو بہت قبیح ہیں اور یقیناً ہندو و ام مار کی طریقوں سے ماخوذ ہیں، لیکن عام ان پڑھ دیہاتی مسلمانوں کی نسبت بھی انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ہندو اثرات نمایاں ہیں۔ مثلاً اگر تہجہ بیمار ہو تو پید پاپوران پڑھا جاتا ہے۔ اور اگر مویشی بیمار ہو تو گھوڑا کھیر لارو گایا جاتا ہے۔ شادی کے دوران میں مشکل چاندی جسے کی (پوچا سے ملتی جلتی) ایک رسم ہوتی ہے جس میں فرش پر دودھ کیلے اور سینہ دھور رکھا جاتا ہے۔ دیواروں پر نقشے اور تصویریں بنتی

ہیں۔ عود جلا یا جاتا ہے اور عورتیں تمام رات شام سے صبح تک گاتی ہیں۔ عام اعتقاد ہے کہ اس رسم کی بجائے اور می سے دوا لہاؤ لہن کو مشکل یعنی خوش قسمتی نصیب ہوتی ہے۔ ایک اور عمل آشن کار اس وقت بجایا جاتا ہے۔ جب کوئی قیمتی چیز گم ہو گئی ہو یا کوئی شخص بیمار ہو یا بالخصوص جوڑوں کے درمیں یا کسی مقدمہ میں کامیابی مقصود ہو جو شخص یہ عمل کرتا ہے اسے برہماد تیا فقیر کہتے ہیں۔ وہ گھنٹیاں بجاتا ہے۔ منتر پڑھتا ہے۔ دودھ اور کیلے پیش ہوتے ہیں اور برہماد تیا یعنی برہمن کی روح کی مدد لی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دیہات تعلیمی اور طبی مرکزوں سے بہت دور ہیں۔ دریاؤں، نالوں اور دلدلوں کی وجہ سے آمد و رفت بہت مشکل ہے۔ اس لیے اس طرح کی جھاڑ پھونک پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ بعض جگہ (مثلاً سندھ بن) میں گھنے جنگلات ہیں۔ کئی آدمی شیر کا شکار ہوتے ہیں۔ سانپوں سے ڈسے جانے کی وارداتیں تو لاتعداد ہیں۔ ان مصائب سے عہدہ براہونے کے مہذب اور معقول ذرائع ابھی تک عام نہیں ہوئے۔ غریب ان پڑھ دیہاتی جادو ٹوٹے اور منتروں کے ذریعے ان کا علاج کرتے ہیں جو شخص یہ جادو ٹوٹے کرتے ہیں ان کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان آسان نہیں۔ سانپ کا منتر کرنے والے جنہیں اور جھا کہا جاتا ہے، بالعموم مسلمان ہوتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جادو منتر اسلام سے جائز نہیں رکھا۔

بیاہ شادی کی نسبت بھی راج شاہی گزٹریں میں بعض دھڑپ باتیں لکھی ہیں۔ ”نکاح

ایک عربی لفظ ہے۔ جس کا مطلب ہے بیاہ اور شادی خوشی کے اس اظہار کو کہتے ہیں جو اس موقع پر کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے اکثر حصوں میں نکاح اور شادی کے الفاظ ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں، لیکن راج شاہی میں باقی بنگال کی طرح ان دو الفاظ سے دو مختلف قسم کے بیاہ مراد لیے جاتے ہیں۔ نکاح اس بیاہ کو کہتے ہیں جو ایک بیوہ کے ساتھ ہو اور شادی فقط ایک کنواری کے ساتھ ہوتی ہے۔ لیکن وہ شخص جس کی بیوی مر گئی ہو۔ نکاح اور بیاہ دونوں کہہ سکتا ہے۔ نچلے طبقوں میں نکاح ایک دم ورجے کا بیاہ ہوتا ہے جو ایک لونڈی (Concubinage) سے منظور اہی مختلف ہوتا ہے۔

مثلاً اگر ایک شخص اپنی نکاح شدہ بیوی سے بدسلوکی کرے یا اس کے گزارے کا انتظام نہ کرے تو نہ صرف وہ اس سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہے بلکہ بغیر کسی طرح کی طلاق لیے دوسرے سے نکاح کر سکتی ہے۔ یہ دوسرا نکاح مذہبی رسوم و قواعد کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور پہلا خاوند ذرا بھی اس کا برا نہیں مانتا۔ ”میں تمہارا بھات نہیں کساؤں گی۔“ یا میں تمہیں بھات نہیں دوں گا۔“ اس طرح کے جملے کہہ دینے سے علیحدگی ہو جاتی ہے۔

راج شاہی کے نچلے طبقے میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی ہے جن کے ہاں بغیر کسی نکاح کے بیاہ مکمل ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ دیہات میں ادا نئے کام کرتے ہیں۔ بالعموم جہلموں میں بھر کر تمباکو دیتے ہیں۔ ان کے ہاں کے ایک بیاہ کی چشم دید روئداد یہ تھی کہ دلہن گھر کے اندر بیٹھی تھی اور دولہا باہر تھا۔ دلہن کا بھائی جو غالباً اس کا ولی تھا، باہر آیا۔ اور دولہا سے کہا۔ ”تمہارا بیاہ ہو گیا تمہارا بیاہ ہو گیا۔“ اس کے علاوہ اور کوئی رسم نہ ہوئی۔ نہ کوئی مولوی یا قاضی بلایا گیا اور نہ ہی اسلامی طریقے کے مطابق کچھ پڑھا گیا یا دعا مانگی گئی۔

راج شاہی وسطی بنگال کے اُس حصہ میں واقع ہے جہاں ہندو اثرات زور وں پچھے اور اصل میں بیاہ شادی کے معاملے میں غریب طبقے کی بے تکلفی ان اخراجات کے خلاف ردِ عمل ہے جو ان تقریبات پر ضروری سمجھے جاتے ہیں اور شاید بنگال سے باہر بھی ان پڑھ غریب عوام میں اس طرح کی بے قاعدگیاں مل جائیں۔ لیکن بنگال کی عام مسلم سوسائٹی کی بعض باتیں ایسی ہیں جو ملک کے دوسرے حصوں میں رائج نہیں۔ ناموں کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں کہ وسطی بنگال کے بعض حصوں میں کئی مسلمانوں کے ہندو نام ہیں۔ لیکن مسلمان ناموں کے ساتھ ساتھ مقامی عرف (Nickname) رکھنے کی رسم تو بنگال کے ان لوگوں اور علاقوں میں بھی ہے جہاں مذہب اسلام سے بڑا شغف ہے، مخفیانہ عرف دوسری جگہ بھی ہوتے ہیں، لیکن وہاں ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ رسمی اور باقاعدہ طور پر بھی مکملی کے جوان ہو جانے کے بعد بھی یہ پیار کے عرف نام کا کام دیں اور تحریر میں بھی وہی استعمال ہوں۔ مثلاً حاجی شریعت اللہ سے بڑھ کر قاطع بدعت کون ہوگا۔ لیکن ان کے مشہور صاحبزادے کو عام لوگ صرف دو دو میاں کے عرف جانتے ہیں۔

ان کا نام محمد محسن شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ اسی طرح مسلم لیگ کے سابق اور متحدہ محاذ کے موجودہ با اثر لیڈر مومن میاں اور ان کے بھائی لال میاں ہیں۔ جو فرید پور کے رہنے والے تھے اور ایک راسخ الاعتقاد مسلمان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مقامی عرف کے علاوہ بسا اوقات اسلامی نام کو تحفیف یا تغیر و تبدل سے مقامی رنگ دیا جاتا ہے مثلاً بسا اوقات میمونہ کو مینا، چمن آرا کو چمپا۔ لطیفہ کو لتا۔ میجر کو ماللا اور کلثوم کو کسم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ غالباً ناموں کا یہ تغیر و تبدل اور مقامی عرفوں کا استعمال لسانی مشکلات کی وجہ سے ہے۔ بنگالی لب و لہجہ عرب اور ایران تو ایک طرف رہے۔ کئی اہم امور میں شمالی ہندوستان کے لوگوں سے بھی مختلف ہوتا ہے۔ نام رکھنے والے مولوی یا خوش عقیدہ بزرگ نو مولود بچوں کے نہایت ثقہ نام رکھتے ہیں، لیکن چونکہ ان ناموں کا ادا کرنا آسان نہیں ہوتا اس لیے تحریف و تحفیف سے کام لیا جاتا ہے۔ اس طرح کا مقحور بہت عمل دوسری جگہ بھی ہوتا ہے مثلاً پنجابی عوام معراج الدین کو مہاجا اور غلام محمد کو گاماں کہتے ہیں۔ لیکن (سوائے خاص صورتوں کے جن کی توجہ یہ کی جاسکتی ہے) یہ محف اور محرف نام بالعموم تحریر میں استعمال نہیں ہوتے اور پنجابی اور اردو رسم الخط ہی ان کی غراست کو نمایاں کر دیتا ہے۔

بعض دوسری باتوں میں ہندو اثر صاف ظاہر ہے۔ مثلاً بزرگوں کی تعظیم و تکریم کے موقع پر ہندوؤں کی طرح ان کے پاؤں چھوئے جاتے ہیں۔ چونکہ پاکستان کے آغاز کے بعد باہر سے آئے ہوئے مسلمان اس طریق تعلیم پر اپنی کراہت کا اظہار کرتے تھے۔ اس لیے اب پبلک میں اس کا مظاہرہ کم ہوتا ہے۔ لیکن گھروں پر یہ طریق تعظیم اب بھی رائج ہے اور ان خاندانوں میں بھی موجود ہے جو پڑھے لکھے ہی نہیں بلکہ مخلص اور بیجوش مسلمان ہیں۔ لسانی اختلافات اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر غیر بنگالی خواتین کو بنگالی گھروں کے بالکل اندر جانے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ (سوائے ان گھروں کے جہاں انگریزی رسم و رواج جاری ہے اور جو مقامی طریق کار کی نمائندگی نہیں کرتے) لیکن جن خواتین کو ایسا موقع ملتا ہے ان کا کہنا ہے کہ گھروں کی زیبائش

آرائشوں اور تصاویر میں ہندوانہ فضا کا کافی عنصر ہوتا ہے۔ بچپن کو جو کہانیاں سنائی جاتی ہیں اور عوامی ادب میں اسلامی قصے بھی ہیں، لیکن ہندوانہ کہانیوں کا حصہ بھی اہم ہے۔ اب بھی رات کے وقت مسلمان بچے اپنی ماؤں اور دادیوں سے کنچن مالا، مڑھو مالا، ملنج مالا اور اس طرح کی دوسری دلکش اور ناقابل فراموش کہانیاں سنتے ہیں۔

ان جزوی امور کے علاوہ اصل اہم چیز وہ موانست و عقیدت ہے جو درپردہ ضلع اور بعض حلقوں سے قطع نظر پڑھے لکھے بنگالی مسلمانوں کو ہندو خیالات اور زعماء سے ہے۔ اس کا ایک سبب تو کسان کی کجی ہے جو خیالات پر بڑا اثر ڈالتی ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ذمہ دار ہندوؤں نے بھی اپنے طرز عمل سے اس رجحان کو تقویت دی ہے۔ یوں تو بنگال کی پہلی تقسیم کے بعد ہی بنگالی ہندوؤں کا ایک با اثر طبقہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کو کم کرنے اور ایک متحدہ بنگالی قوم کا نقشہ پیش کرنے کے درپے رہا ہے۔ (اب اس کی پشت پر ابندرناتھ ٹیگور اور ان کی وٹا بھارتی یونیورسٹی ہے) لیکن بنگالی ادب نے جو ترقی کی ہے اور نامور بنگالی ہندوؤں (مثلاً ٹیگور، جے سی بوس، سی آر داس، سبھاش چندر بوس) نے دنیا کی نظروں میں جو اہمیت حاصل کی ہے، اس کا اثر بنگالی مسلمانوں پر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بالعموم ہندوؤں نے عملی طور پر زیادہ قربانی اور بادی النظر میں بہتر اخلاقی عظمت کے نمونے پیش کیے ہیں۔ راکرشن مشن کی طرف سے غریبوں اور مرصیوں کی خدمت کے لیے جو کوششیں ہوتی ہیں اور پڑھے لکھے ہندو خدمتِ خلق کے لیے جس طرح اپنا عیش و آرام قربان کرتے ہیں۔ اس سے بنگالی مسلمانوں کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ دیہات میں بھی دکھایا جاتا ہے کہ جن یونین بورڈوں (بچائتوں) کے صدر ہندو تھے۔ وہاں جھگڑے کم تھے۔ کام باقاعدگی سے ہوتا تھا۔ گاؤں کی سڑکیں اور کنوئیں بہتر حالت میں تھیں۔ ہندوؤں میں صبر اور احتیاط کی جو خصلتیں ہیں، انھوں نے بھی اس طرز عمل کی کامیابی آسان کر دی ہے۔ کلچرل نقطہ نظر سے بھی بنگالی مسلمانوں کو ہندوؤں کے دھیمے دھم طریقے باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں کے شور و غل اور سینہ زوری سے زیادہ سچا نہیں

بالخصوص جب باہر والے مقامی نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہ کریں اور اپنی تہذیبی اور مذہبی فوقیت کے نشے میں سرشار رہیں۔

ان عام رجحانات کے علاوہ مقامی اثرات بھی ہیں۔ وسطی بنگال (یعنی مشرقی پاکستان کے موجودہ راج شاہی ڈویژن) میں اسلامی اثرات کمزور تھے۔ انیسویں صدی میں اسلامی احیاء کی تحریک کا اثر زیادہ تر نواکھالی۔ چٹاگانگ۔ فرید پور۔ ڈھاکہ کمرلاتک رہا۔ (سلہٹ بھی حضرت شاہ جلال اور ان کے ساتھیوں کی برکت سے اور علاء الدین حسین شاہ کے اس عمل کی بدولت کہ اس نے اس سرحد پر کئی ممتاز مسلمان خاندان آباد کیے تھے۔ اسلامی تہذیب کا ایک مرکز رہا ہے) لیکن ایک تو اصلاحی اور احیائی تحریک کا بعض علاقوں میں بہت تھوڑا اثر ہوا ہے۔ دوسرے فارسی عربی کی سرو بازاری، جدید بنگالی ادب اور اس کے متعلقہ اثرات کے فروغ اور پڑھے لکھے طبقوں کی مذہب سے بڑھتی ہوئی عدم دلچسپی نے منفی رجحانات کو بہت تقویت دی ہے۔ مدرسوں کے فارغ التحصیل طلباء نے جنوب اور جنوب مشرق میں مذہبی حالت بگڑنے نہیں دی، لیکن وہ بھی ضرورت سے زیادہ قدامت پسند ہیں اور نئی نسل کی ضروریات کا جواب دینے سے قاصر۔

ہمارے سامنے ایک ایسے بنگالی اسکالر کا ایک مقالہ ہے جو اس وقت مشرقی پاکستان کے محکمہ تعلیم میں بڑا ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں، لکھتے ہیں۔ تمام بنگالی مسلمان نہایت تھوڑی مستثنیات کے سوا فکر اور عمل میں بنگالی ہی ہیں۔ ان میں بنگال کا اصلی دل حرکت کرتا ہے اور ان کی زندگی کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ بنگالی مسلمانوں کے ناموں، عرفوں، ان کی عوامی کہانیوں اور عوامی ادب کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ اسلامی افکار و خیالات اور اخلاق و رسوم کا طویل اور مسلسل نفوذ بنگالی مسلمانوں کی بنگالی ذہنیت کو کسی قابل لحاظ طور پر بدلنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ (ترجمہ از انگریزی)

ہم فاضل مقالہ نگار کی رائے اور نقطہ نظر سے متفق نہیں۔ ہمارے خیال میں

انھوں نے اس ٹھیکے اسلامی عنصر کا پورا اندازہ نہیں کیا، جو بنگالہ کے بیشتر مسلمانوں کی ذہنیت کا قیمتی اور عزیز جزو ہے، لیکن ان کی رائے اور اندازہ نگاہ سے ان خیالات کا اندازہ ہوگا، جو بنگالی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ با اثر طبقے میں عام ہیں اور ہماری بھی یہ رائے ہے کہ جو لوگ اپنی نگاہ ڈھاکہ اور چند دوسری جگہوں کے قدیمی سربراہ اور وہ خاندانوں تک محدود رکھتے ہیں اور مقامی رجحانات اور پس منظر کا ٹھنڈے دل اور غور اور وسیع النظری سے مطالعہ نہیں کرتے۔ وہ مشرقی پاکستان کی صورت حالات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ

۱۷۰۳ء | اٹھارھویں صدی عیسوی کے تیسرے سال کی ابتدا ہے۔ اسلامی
ہندوستان کا آخری جلیل القدر بادشاہ عالمگیر دکن میں مخالفوں کے برسرِ پیکار
ہے۔ اس کی عمر پچاسی سال کی ہو رہی ہے۔ بڑھاپے کے بوجھ سے کمر جھک گئی ہے
لیکن اس کمزور اور نحیف جسم کے اندر ابھی وہی آہنی دل ہے جس کے بل بوتے پر عالمگیر
چودہ برس کی عمر میں ایک مست ہاتھی کے سامنے یکہ و تنہا ڈٹ گیا تھا۔ اس کی دماغی
محنت اور استعداد میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ فوج کی کمان بذاتِ خود کر رہا ہے مختلف
حصوں کے نقشے خود سوچتا ہے اور قلعوں پر حملے کے وقت اپنے جرنیلوں کی خود رہنمائی
کرتا ہے۔

اسے اپنے مقاصد میں کافی کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اس نے مرہٹوں کا شیرازہ
اگر اس کا دار و مدار کسی ایک شخص یا کسی ایک مرکز پر تھا، منتشر کر دیا ہے، لیکن اس کا
دل جانتا ہے کہ وہ اپنے اصل مقصد میں ناکام رہا ہے۔ اس نے مرہٹوں کے بڑے
بڑے قلعے فتح کر لیے ہیں، لیکن اب ہر مرہٹے کا گھر قلعہ ہے جس میں بادشاہ کے
خلافت ساز شیش ہوتی ہیں۔ بیشک اب سب بڑے بڑے علم برداران بغاوت مٹ
گئے ہیں یا مٹا دیے گئے ہیں، لیکن اس سے دکن میں سناٹا نہیں ہوا۔ اب ہر مرہٹے کا شنگار
سپاہی ہے۔ جو کبھی شیواجی کے کسی خرد سال جانشین کی زیرِ قیادت اور کبھی کسی من جلی
رانی کی متابعت میں مغلوں کے لیے غلاب جان بنا ہوا ہے۔

مولانا شبلی کا بیان ہے کہ اب مرہٹے محض "اڑتے ہوئے ڈرے" رہ گئے تھے۔ یہ
تشبیہ گمراہ کن ہے، لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس وقت مرہٹوں کی مرکزیت تباہ ہوئی
تھی تو سوچنا چاہیے کہ اس کے لیے حکومت دہلی کو کیا قیمت ادا کرنی پڑی؟ بیجا پور اور

گو لکنڈہ کی وسیع خود مختار ریاستیں تو ایک ایک سال کے اندر مغلیہ مقبوضات میں داخل ہو گئیں، لیکن مرہٹوں کو سرکسے میں اورنگ زیب نے پچیس سال صرف کیے اور اس تمام تنگ و دوکانہ نتیجہ پر تھا کہ جونہی اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوئیں، یہ اڑتے ہوئے قتلے بگولے بن گئے۔ اور خیام شاہی کو اپنی سُدر فزاری کے ساتھ لے اڑے۔

واقعہ یہ ہے کہ مرہٹوں کے خلاف اورنگ زیب کو اس کی ذاتی خوبیوں کے باوجود حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی کئی وجہیں تھیں، لیکن سب سے اہم وجہ جس میں اسلامی حکومت کے زوال کا راز پناہ ہے، مغل امرا اور مغل لشکریوں کی عسکری کمزوری تھی۔ بادشاہ کی بیدار مغزی بہت محنت اور استقلال میں کلام نہیں، لیکن اس سب سے سالاروں اور سپاہیوں میں آرام طلبی۔ غدارمی۔ فرض ناشناسی اور خود غرضی جیسی قبیح خصلتیں گھر کر چکی تھیں اور اخلاقی حالت میں وہ اپنے مرہٹے مخالفوں سے پست درجے پر تھے۔ مرہٹوں میں ابھی ابھی پندھروپر کی مذہبی تحریک نے نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ اب ایک زندہ قوم بن رہے تھے۔ اس نئی تحریک کے زیر اثر ان کی شخصی اور خاندانی نزاعیں بڑی حد تک دب گئی تھیں اور ان کا ہر فرد مغلوں کے مقابلے میں قلمے درمے، سٹخنے جس طرح بھی ہو سکتا تھا، برسر کار تھا۔ دوسری طرف وہ مغل امرا اور لشکری تھے، جنہیں عہدِ جاگیر کی اور عہدِ شاہجہانی کے عیش و عشرت نے بگاڑ رکھا تھا۔ ان کے لیے اتنی بُدلت تک شمالی ہندوستان سے دُور دکن کی لڑائیوں میں مبتلا رہنا ہی ایک ایسی مصیبتِ عظمیٰ تھی کہ شاید وہ مرہٹوں کے ہاتھ شکست کھانے کو بھی اس پر ترجیح دیتے۔ ان کے دل میں اس وقت جو گز رہا تھا اس کی ترجمانی نعمت خاں عالی کرتا ہے۔

سخن را بود در تقارب قبول! فو لُج - فو لُج - فو لُج فو لُج

الہ است اللہ و رحمان خدا مگر او کست در رحم بر فوج شاہ

رحیم است و غفار و آمرزگار ندانم چہ شد حصّہ ایں سپاہ

لیکن مغل فوج میں صرف آرام طلبی اور محنت سے جی چرانے کا مرض ہی نہ تھا بلکہ ان پر غدار اور نمک حرام بہت تھے۔ جس کثرت سے مغل سپہ سالار مرہٹوں سے مل جاتے تھے،

اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ اور تو اور مغل شہزادے اور اورنگ زیب کے بیٹے اس سے بالاتر نہ تھے۔ جنگی کے محاصرے کے وقت شہزادہ کام بخش نے جو ذوالفقار خاں کے ساتھ فوج کا سپہ سالار تھا، راجا رام کے ساتھ اپنے باپ کے خلاف ساز باز کرنا شروع کیا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ مرہٹوں سے ملنے والا ہی تھا کہ ذوالفقار خاں اور اس کے باپ اسد خاں کو پتہ لگ گیا اور انھوں نے اسے گرفتار کر کے زیرِ حراست اورنگ زیب کے پاس بھیج دیا۔ ستارہ میں مرہٹوں نے شہزادہ محمد اعظم کو رشتہ نہیں دے کر یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ان کی رسدِ رسانی میں مغل نہ ہوگا۔ چنانچہ وہ قلعہ جس میں محاصرہ کے وقت فقط دو ماہ کی رسد تھی چھ ماہ تک فتح نہ ہوا!

جو کیفیت سپہ سالاروں کی تھی۔ وہی حالت قلعہ داروں، منصبداروں، محاسبوں اور معمولی سپاہیوں اور امیروں و زیروں کی تھی۔ اور جن قلعوں کی فتح میں مہینے صرف ہوئے تھے، وہ ان کی نالائقی یا نمک حرامی سے دنوں میں دشمن کو بغیر کسی کشت و خون کے واپس مل جاتے۔ جب سلاطین میں اورنگ زیب جنوبی دکن کو چھوڑ کر واکن کھیرہ کی طرف متوجہ ہوا تو محصور ہی عرصے میں اس طرح ستارہ۔ پر نالہ اور پاؤ گڑھ کے قلعے مغلوں کے ہاتھ سے نکل گئے!

دشمنوں سے ساز باز کرنے اور اپنی نالائقی اور غفلت شعاری سے ان کا ہاتھ پٹانے کے علاوہ مغلوں نے اب ایک نئی بات یہ سیکھی تھی کہ لڑنے سے جی چراتے اور اگر انھیں کہیں خطرات کا سامنا کرنا پڑتا تو بجائے ان کا مروانہ وار مقابلہ کرنے کے براہِ فرار اختیار کرتے اور لطف یہ ہے کہ اس ”فنِ کشف“ میں بادشاہ کے بھائی ”بند توری“ ”بد مذہب“ ایرانیوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ اورنگ زیب ایک توری امیر میر محمد اسین نے شکایت کی کہ فوج کے اعلیٰ عہدے ”بد مذہب“ اور ”دیوسیرت“ ایرانیوں کو مل رہے ہیں۔ تو بادشاہ نے لکھا:-

”جماعتِ توریان، کہ برادرانِ ہمشہری بزرگانِ ماند... بہ مضمون ولا تلقوا اباید کیو
الی التہلک، یعنی میندازید خود را بدستہائے خود در ہلاکت، در عین گیر و دارِ راجت“

معیوب نہ داند۔ اگر در آوردن کسے ایں حالت رودید۔ چندان مضائقہ ندارد۔
لیکن در عین کارزار سخت مشکل است۔ اگر عیاذاً باشد از ہمارہ بیان حضور ایں صورت واقع
شود۔ در یک لحظہ مقدمہ تمام حکایت بانجام برسد۔

اگر در ایں امر مجرب و آزمودہ انکار سے داشتہ باشد۔ مفصل معروض دارد۔ و
جماعت ایرانیان، خواہ ولایت زرا، خواہ ہندوستان زرا، کہ بجل مرکب مشہور اند بعد از
ازیں حرکت دوراندہ

انصاف بدہ کہ جل آں مردم زشت

بہتر ز ہزار عقل رو باہ سرشت

اور نگ زیب اپنے ہمراہیوں کی اخلاقی کمزوریوں سے خوب واقف تھا۔ وہ
بار بار اپنے رقعات میں دیانتدار، کار دان ملازموں کی کمی پر آنسو بہاتا ہے۔ ایک جگہ
لکھتا ہے۔ ”آدم ہوشیار، امانتدار، خدا ترس، آبادان کار، کمیاب“

آنچہ بر جہتیم و کم دیدیم و بسیارست و نیست

نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیارست و نیست

ایک اور جگہ لکھتا ہے۔ ”حال ایک کس برائے دیوانی بنگالہ کہ بہ حلیہ راستی و کاروانی آرائند
باشند مے خواہم یافتہ نہ شود۔ از نایابی آدم کار آہ۔ آہ۔“

پوچھنے والے پوچھیں گے کہ عجب معاملہ ہے کہ اسلامی ہندوستان کا سب سے زیادہ
مذہب پرست بادشاہ برسر اقتدار ہے۔ ہر طرف اہل شرع کا بول بالا ہے۔ لیکن وہی
انسانی خوبیاں جن کے لیے مذہب مفید بتایا جاتا ہے۔ مفقود ہو گئی ہیں اور بادشاہ خود
کہتا ہے کہ راستی، خدا ترسی، امانت داری، کمیاب بلکہ نایاب ہے!! وجہ اس کی یہ ہے کہ
شرع اور فقہ کی گرم بازاری سے باطنی بُرائیوں کا علاج نہیں ہوتا۔ ان کی نظر ظاہر پر
ہوتی ہے۔ (مختص راور وین خانہ چہ کار؟) ان کا کام شعائر اسلامی کی حفاظت ہے
قمار بازی کا سد باب، شراب کی بندش۔ جزیے کا نفاذ۔ نئے بستی خانوں کی ممانعت۔
صغار و کبار پر سزا دہی۔ ان پر فقیہ زور دیتے ہیں، لیکن روحانی اور باطنی کوتاہیوں کا

ان سے مدد و انہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ چیزیں ہی فقہاء کے حیطہ اختیار سے باہر ہیں۔
 سرہند سے بیشک ایک تحریک اُبھٹی تھی، جس نے کئی مخلص اور سمجھدار مسٹیوں کو متاثر
 کیا۔ لیکن یہ تحریک تجدیدی تھی۔ اصلاحی نہ تھی۔ اس کی بنیاد اپنی فوقیت کے احساس اور
 اغیار سے نفرت اور عداوت پر تھی۔ اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنا اس کا مقصد نہ تھا اور پھر
 اس تحریک میں مفید ہونے کی جتنی صلاحیت تھی، اس کا راستا واقعات نے بتا کر دیا۔
 مشائخت روحانیت پر غالب آگئی اور تجدیدی تحریک قومیت کے سراب میں
 گم ہو گئی۔ جب خواجہ محمد معصوم کی وفات ہوئی تو ان کے وارثوں میں سے ہر ایک
 نام نہاد قومیت کا دعویدار تھا۔ سبھی آپس میں لڑ رہے ہیں کہ قوم نہیں ہوں اور دنیا میرے
 سر پر قائم ہے! حضرت خواجہ محمد معصوم نے اپنے بیٹے شیخ سیف الدین کو اورنگ زیب
 پاس امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے بھیجا تھا، لیکن جس انداز سے وہ رہتے تھے،
 اس کا بیان ایک محقق کی زبان سے سنیے:-

حضرت شیخ صاحب کے لیے سرہند میں دیبا کا ایک خیمہ جواہرات اور مروارید سے
 ڈکا ہوا نصب ہوتا۔ جس کی چوبوں پر باقوت جڑے ہوئے تھے۔ اس خیمہ کے اندر ایک
 جڑاؤ گرسی رکھی جاتی، جس پر آئینہ جلوہ افروز ہوتے اور جس کے گرد اگر نقیب اور
 چوہدار ہاتھوں میں سنہری اور روپئی عصا لیے ہوئے کھڑے ہوتے۔ بادشاہ شاہزادے
 اور اہل مراعات خدمت ہو کر کھڑے رہتے۔ جب تک حکم نہ ہوتا۔ نہ بیٹھے۔

یہ تھے حالات، جب دہلی کے ایک نامور عالم کے گھرا خیر عمر میں ایک فرزند ارجمند
 تولد ہوا، جس کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ ان حالات کی اصلاح میں ہاتھ پاؤں مارے
 اور اس اخلاقی اور روحانی انحطاط کا سد باب کرے۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مردِ گرامی حالات کی پورے طور پر اصلاح کر سکا اور
 جس سیلاب کو عالمگیر جیاد و راندیش اور مستعد ملتظم نہ روک سکا، اس کا فوری سد باب
 ایک مذہبی عالم سے کس طرح ہو سکتا تھا لیکن اس بزرگ کی کوششوں سے اتنا ہوا کہ

لے روضۃ القیومیہ۔ رکن دوم ص ۱۴۲

جب اس سیلاب کے بند ٹوٹے تو جہاں مغلوں کا تخت و تاج اس سیلاب میں بہ گیا۔ وہاں تبلیغ و سجادہ تو سلامت رہے اور سیاسی زوال کے ساتھ قوم کا دینی انحطاط نہ شروع ہو گیا۔

اس بزرگ نے ایک تو قوم کو قرآن فہمی کی نعمت عظمیٰ عطا کی اور دوسرے اُس نے اور اس کی اولاد نے ایک ایسا نظام قائم کر دیا جو انیسویں صدی کی مذہبی کشمکش میں ہماری سب سے بڑی ڈھال رہا ہے۔ یہ اس خاندان کا ہی فیض تھا کہ جب ہندوستان میں اسلام پر مشنریوں اور مادہ پرستوں کے حملے ہوئے، تو لوگ مذہب اسلام سے واقف تھے۔ اس میں دلچسپی لیتے تھے اور مخالفوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ فرنگی محل اور اضلاع پورب کی دوسری درسگاہوں سے فقہ اور منطق کا جو سیلاب آ رہا تھا، وہ اس مذہبی کشمکش میں مفید نہ تھا۔ اس کے لیے روحانی اور اخلاقی قوت کی ضرورت تھی جو فقہ اور منطق سے نہیں، بلکہ قرآن اور حدیث سے حاصل ہوتی تھی۔ اور انھیں اس خاندان نے جس طرح عام کیا، اس پر تاریخ گواہ ہے۔

اخلاقی حیثیت سے اس خاندان نے جس طرح قوم میں نئی روح پھونک دی تھی، اس کا اندازہ مولانا سید احمد رائے بریلوی کی تحریک جہاد سے ہوتا ہے۔ مغلوں کی وسیع سلطنت جاتی رہی، لیکن ان راحت طلبوں نے کروٹ نہ لی۔ مرہٹے، روسیہ، انگریز جو کوئی بھی آیا، اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ لیکن ولی اللہی تحریک کا اثر تھا کہ لوگ اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دور بالاکوٹ کی پہاڑیوں میں پروانہ وار اپنی جان پر کھیلتے تھے۔ یہ کوشش ناکام رہی، لیکن کیا ان لوگوں کے ایشارہ مذہبی غیرت اور اخلاقی جرات میں کوئی شک ہے؟

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہن

بازی اگر چہ پانہ سکا، سر تو کھوسکا

اس بزرگ نے نہ صرف قوم کو ایک نئی روحانی اور اخلاقی زندگی عطا کی، بلکہ جیسا کہ ہم آگے چل کر تفصیل سے بتائیں گے۔ عقائد و خیالات کا ایک ایسا نظام مرتب کر دیا

جو اسلامی ہندوستان کے خاص حالات کے لحاظ سے سب سے زیادہ موزوں تھا اور فی الحقیقت قوم کی نئی تنظیم کے لیے روحانی اساس ثابت ہوا۔

شاہ ولی اللہ ۱۲ فروری ۱۷۳۰ء کو یعنی اورنگ زیب کی وفات سے چار سال پہلے پیدا ہوئے۔ یہ زمانہ سیاسی

خاندانی حالات

حیثیت سے اسلام کا عہد زوال ہے، لیکن مذہبی اور علمی طور پر اصلاح اور تجدید کا زمانہ بھی ہی تھا۔ چنانچہ جس سال شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے اُنسی کے قریب اسلام کے دورِ جدید کا دوسرا بڑا مصلح اور مجددِ ریگستان نجد میں ظہور پذیر ہوا۔

شاہ صاحب کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے حضرت عمرؓ اور والدہ کی طرف سے امام موسیٰ کاظمؑ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے ایک بزرگ شیخ شمس الدین مفتی اسلامی حکمرانوں کے آغاز میں ہندوستان آئے اور بمقام رہنما مقیم ہوئے۔ پہلے آپ کا خاندان علم و فضل میں ممتاز تھا، لیکن ایک بزرگ شیخ محمود نے منصب قضا کو ترک کر کے سپاہیانہ زندگی شروع کر دی۔ اس کے بعد یہ خاندان عرصے تک بہادری اور دلیری کے لیے نامور رہا۔ شاہ صاحب کے دادا شیخ وجہ الدین صاحب السیف والقلم تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب کے والد نے قرآن مجید انھی سے پڑھا۔ لیکن وجہ الدین کی شہرت بطور ایک بہادر شیخ آزما کے ہے اور ان کی بہادری کے قصے شاہ عبدالرحیم اپنے گھر والوں کو سنایا کرتے تھے تاکہ انھیں بھی اخلاقِ فاضلہ حاصل کرنے کا شوق ہو۔ وہ اورنگ زیب کے لشکر میں سردار تھے۔ اور جب کچھوہ کے مقام پر اورنگ زیب اور شجاع کے درمیان معرکہ ہوا تو ان چند باہمت اور وفادار سرداروں میں سے تھے، جو اس وقت بھی ثابت قدم رہے۔ جب شجاع کے مست ہاتھیوں نے اوچھم چار کھاٹھا اور تمام لشکرِ تربتہ ہورہا تھا۔ وہ اخیر عمر میں دکن کے سفر کے لیے نکلے تھے۔ جہاں مسلمانوں کو اس وقت بڑی مشکلیں درپیش تھیں۔ لیکن برہان پور کے قریب انھیں بہت سے لیٹروں نے آن گھیرا۔ آپ ان کا بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے اور مالوہ کی خاک میں ہی دفن ہیں۔

شاہ عبدالرحیم رح | شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم تھے۔ انھوں نے تلوار چھوڑ کر کتاب سنبھالی۔ آپ ۵۳۵ھ (۱۶۲۲ء) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کچھ گھر پر پائی۔ کچھ آگرے میں جہاں شاہ وجیہ الدین سلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ میر محمد زاہد ہروی سے محققات اور علم کلام کی کتابیں پڑھیں اور پھر کچھ عرصے کے لیے خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ خرد سے فیض حاصل کیا جو خواجہ حسام الدین کے خلیفہ اور اس زمانے میں نقشبندیہ باقریہ طریقے کے ترجمان تھے۔

آپ کا خاندان قصبہ پہلت میں مقیم ہو گیا تھا۔ لیکن آپ نے اکبر آباد میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی میں "مہندلوں" کے محلے کے نزدیک مدرسہ رحیمیہ قائم کر کے وہاں درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ آپ کا شمار اپنے زمانے کے اہل دل علما میں سے ہوتا تھا۔ آپ عام طور پر عہد عالمگیری کے درباری علماء سے الگ تھلک رہے۔ اورنگ زیب کی دعوت کے باوجود آپ اس کے دربار میں نہیں گئے اور اس زمانے کا فقہی ماحول اور علما کا دنیا دارانہ رنگ آپ کو ناپسند تھا، لیکن آپ کے تعلقات ارحلانیہ کی اکثر علمی شخصیتوں سے تھے۔ شاہ ولی اللہ آپ کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جو عام علوم میں عموماً اور فقہ و حدیث میں خصوصاً ان کی طرح تبحر رکھتا ہو۔ وفات آپ کی ۷۷ سال کی عمر میں جب شاہ ولی اللہ ابھی ستہ سال کے تھے ۱۱۳۱ھ میں ہوئی۔

شاہ عبدالرحیم کو وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جو ان کے نامور فرزند کے حصے میں آئی ہے اور فی الحقیقت علمی اور دینی خدمات میں بیٹا باپ سے بازی لے گیا۔ لیکن شاہ عبدالرحیم خود بڑے سمجھدار اور بلند پایہ عالم اور صاحب فہم صوفی تھے۔ اور شاہ ولی اللہ کی علمی ترقیوں اور طبعی نشوونما میں ان کی تربیت اور تعلیم کو بڑا دخل تھا۔ ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ شاہ ولی اللہ کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی "جامعیت" ہے یعنی وہ اختلافی مسائل میں ایسا راستہ ڈھونڈتے ہیں اور اپنی علمی وسعت اور ذہانت

۱۔ پہلت ضلع مظفرنگر میں ایک قصبہ ہے۔ میرٹھ سے تھمنا بیس کو شمال کی جانب [مقالات طریقت ص ۷۷]

کی مدد سے اکثر ایسا راستا تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس پر فریقین متفق ہو سکیں۔ لیکن ایک حد تک یہ خصوصیت شاہ عبدالرحیم میں بھی موجود تھی۔ مولانا عبد اللہ سندھی ان کی اور ان کے دوسرے فاضل بھائی کی نسبت لکھتے ہیں :-

”ہر دو بھائیوں کے خاص نظریات کا ماحصل ایک ایسا راستہ بنانے کی سعی ہے۔

جس پر مسلمان فلاسفین (صوفیہ و متکلمین) اور فقہاء ساتھ ساتھ چل سکیں۔“

شاہ عبدالرحیم ایک کامل صوفی تھے۔ انھیں خدا رسیدہ بزرگوار کی تلاش رہتی۔ اور ان کی صحبت میں وہ بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ ابن العربی کے وہ مداح تھے۔ اگرچہ عوام کے سامنے وحدت الوجود کے مسائل اس لیے بیان نہ کرتے تھے کہ مبارک لوگ انھیں صحیح طور پر نہ سمجھیں اور الحاد و زندقہ میں گرفتار ہو جائیں۔ لیکن تصوف سے اس قدر شغف کے ساتھ ساتھ وہ فقہ اور علوم ظاہری سے بھی واقف تھے۔ الفلاس العارفین سے پتا چلتا ہے کہ وہ فقہ کی سب سے مفصل کتاب فتاویٰ عالمگیری کی تصحیح میں بھی کچھ عرصہ کے لیے شریک رہے اور اس زمانے کے سب مشہور علما و فقہاء سے ان کے روابط رہے۔ اس جامعیت کا یہ اثر ہوا کہ ان کا فرزند عالی مرتبہ نہ فقہ سے متنفر تھا۔ نہ تصوف کا مخالف بلکہ دونوں کے اختلافات دور کرنے کی طرف مائل تھا۔

اس اعتدال پسندی اور ہمہ گیری کے علاوہ ایک خصوصیت جو شاہ عبدالرحیم اور ان کے خاندان کو دوسرے علما سے ممتاز کرتی ہے، ان کی عملی سوجھ بوجھ ہے۔ عام علما و کتابوں میں ہر وقت محصور رہتے ہیں اور بالعموم مسائل کے نظری اور خیالی پہلوؤں پر زیادہ توجہ رکھتے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم اور شاہ ولی اللہ بھی ارباب عمل نہ تھے۔ اہل علم تھے اور وہ نظر کی بختگی اور حقیقت پسندی جو زمانے کے تھپیڑے کھانے اور اہم امور و معاملات کا انتظام کرنے سے آجاتی ہے، انھیں ہر بات میں حاصل نہ تھی۔ لیکن عام علما سے وہ اس معاملے میں بدرجہا ممتاز تھے اور انھیں کم از کم اس امر کا قوی احساس تھا کہ مسائل کا ایک عملی پہلو بھی ہے جو نظری پہلوؤں سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ شاہ عبدالرحیم

اس پر بہت زیادہ زور دیا۔ شاہ ولی اللہ ان کی نسبت لکھتے ہیں:-

”حضرت ایشاں با اخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت و فراست و کفایت و غیرت بوجہ اتم موصوف بودند و عقل محاش مثل عقل معاد کامل و وافر داشتند و در مجلس صحبت حکمت عملی و آداب معاملہ بسیار فی آموختند۔“

شاہ ولی اللہ نے اس سلسلے میں ان کی جو نصیحتیں انفاس العارفین میں نقل کی ہیں، وہ سب عملی سوجھ بوجھ کا نمونہ ہیں اور ان میں دو ایک تو اس طرح دنیا داری سے بھری ہوئی ہیں کہ شاید انھیں بعض لوگ ایک مذہبی عالم اور خدا رسیدہ بزرگ کے شایانِ شان نہ سمجھیں۔ مثلاً:

”مے فرزند اگر از تو شجاعتے یا سخاوتے یا فتوتے بظہور آید۔ باید کہ ابنائے روزگار از تو آں را بنیند و دانشد عیادت مقصود اعظم از آں رضا مندی مرضی است نہ محض اطلاع بر کیفیت مزاج و سے۔ مخپس تعزیت و مخپس سپارش و امثال آں پس کسے کہ ایں جملہ بجا آورد و صاحب معاملہ را بر وقت خود مطلع نہ ساخت محنت خود را ضائع ساخت۔“

ان نصیحتوں میں کئی پتے کی باتیں ہیں۔ ایک دفعہ فرمایا:-

”از صلت احمقان است کہ بہ چیز سے از لباس و عادت نشان مند شوند۔ یا تکیہ کلام مقرر کنند۔ یا طعاعے مقرر کنند کہ از آن متفر شوند و مردم بسبب آں مزاج کنند۔“

ایک اور جگہ ارشاد ہے:-

”در سخن گفتن و راہ رفتن و نشستن و برخاستن برسم اقربا و عادت ایشاں کار کن اگرچہ ضعیف باشی و اگر عیب یا خجستہ یا بخلے بنا گاہ از تو صادر شود در کتمان و انخاستن باید کوشید و از آن مستحی باید بود۔ و خود را بہ تکلف بصفت مقابل فرا باید نمود تا نفس عیان غلّی نہ گیرد۔“

یعنی بقول اقبالؔ

گر فتم ایں کہ غریبی ورہ شناس نہ
ز کوئے دوست باندازہ محرمانہ گز نہ

شاہ عبدالرحیم نے حضرت خواجہ خرد سے ایک مدت تک فیض حاصل کیا۔ جو شیخ احمد سرمدی اور شیخ الہ داد اور خواجہ حسام الدین کی صحبت میں رہے اور تینوں خواجہ باقی باللہ کی صحبت میں رہے۔ جب شاہ صاحب نے حضرت خواجہ خرد سے بیعت کی درخواست کی تو انھوں نے حضرت مجدد کے فرزند ارجمند خواجہ محمد محضوم کی بیعت کا نہیں بلکہ شیخ آدم بنوری کے کسی خلیفہ کی بیعت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ آپ سید عبداللہ اکبر آبادی کے مرید ہوئے جو شیخ آدم بنوری کے ممتاز خلیفہ تھے۔

واقعہ یہ ہے۔ (اور شاہ ولی اللہ نے اس کی تصریح کر دی ہے) کہ شاہ عبدالرحیم سلسلہ "نقشبندیہ مجددیہ" نہیں بلکہ "طریقہ نقشبندیہ باقویہ" کے بزرگ تھے۔ ان کا اصل طریقہ حضرت مجدد الف ثانی کا نہ تھا بلکہ حضرت خواجہ باقی باللہ کا تھا۔ وہ حضرت مجدد کے ارادت مند اور معترف تھے۔ لیکن مجددی سلسلے کی کئی باتوں کا ان کے ہاں سراغ نہیں ملتا۔

اس کے علاوہ ان کے خاندان میں ہر سلسلے سے فیض حاصل کرنے کا رواج تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ نقشبندیہ سلسلے سے عقیدت کے باوجود وہ اس سے پوری طرح مطمئن نہ تھے۔ مثلاً شاہ ولی اللہ کے جانشین شاہ عبدالعزیز کی نسبت شاہ غلام علی کے قلمی ملفوظات میں لکھا ہے :-

حضرت ایشاں (شاہ غلام علی) فرمودند کہ روزے حضرت مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب دمن دریک مجلس بودیم۔ ناگاہ تذکرہ نقشبندیہ آمد۔ مولوی صاحب فرمودند کہ نسبت ایں طریقہ نقشبندیہ بے نمک است۔

حضرت مجدد الف ثانی کے ایک پوتے شیخ عبدالاحد المعروف شاہ گل متخلص بہ وحدت ایک صاحب علم اور صاحب ذوق بزرگ تھے۔ شاہ عبدالرحیم سے ان کا گہرا یارانہ تھا۔ ان کے ایک دوسرے کے نام کی خطوط ملتے ہیں اور چونکہ دونوں بزرگ دہلی میں تھے اس لیے اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ جن میں علمی اور روحانی مسائل پر باتیں ہوتیں۔ ان ملاقاتوں کی جو روایت شاہ ولی اللہ نے لکھی ہے اس سے اس لطیف لیکن

انفاس الحارین میں شاہ ولی اللہ نے اپنے والد بزرگوار کے جو حالات ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ بڑے دیدہ ویر صاحب نظر بزرگ تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ امر کے گھر قطعاً نہ جاتے تھے، لیکن اگر امر میں سے کوئی آپ کی زیارت کے لیے آتا تو اس کا بہت پاس کرتے اور پیار محبت سے اسے نصیحت کرتے۔ بعض مجذوبوں کی طرح بدخلقی سے پیش نہ آتے۔ آپ اپنی معاشرت اور لباس اور وضع قطع میں معتدل مزاج تھے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔ ”در ہر امر توسط دوست میداشتند۔ نہ چنناں در تنسک و تعمق فرورفتہ بودند کہ برہانیت کشد۔ و نہ چنناں ترک تعقید آداب مترسل بودند کہ بہ بہا و ن میل کنند۔“

آپ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے آپ کی ایک رباعی نقل کی ہے جو آپ نے فی البدیہہ کہی اور اپنے فرزند ارجمند کو بطور وصیت کے لکھوائی۔ رباعی

گر تو راہ حق بخوابی اے پسر

خاطر کس را مرغ جان الحذر

در طریقت کن عظم رحمت است

ایں چنین فرمود آں خیر البشر

حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے خاندان کی نسبت عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ تصوف میں نقشبندی مجددی طریقے پر عامل تھے۔ حضرت حکیم الامت کے طریق کار پر ہم آئندہ صفحات میں روشنی ڈالیں گے، لیکن اس بار سے میں شاہ عبدالرحیم کا طریقہ بھی وہی تھا جو ان کے وسیع الخیال فرزند کا۔ یعنی وہ ہر سلسلے سے فیض حاصل کرتے۔

القول الجلیل میں شاہ ولی اللہ نے اپنے والد کے متعدد مرشدوں کے نام گنائے ہیں۔ ان میں سے ایک سید عظمت اللہ اکبر آبادی تھے جو چشتیہ سلسلے کے بزرگ تھے۔ ایک خلیفہ ابوالقاسم اکبر آبادی جنہیں زیادہ تعلق خاطر قادریہ سلسلے سے تھا۔ ان کے علاوہ انھوں نے نقشبندیہ سلسلے کے بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ بزرگ مجددی سلسلے کی بڑی شاخ (یعنی حضرت مجدد الف ثانی کے اپنے خاندان) سے متعلق نہ تھے۔ وہ حضرت مجدد کے ارادت مند تھے، لیکن انھوں نے بیعت حضرت مجدد کے بیٹوں اور پوتوں سے نہیں کی تھی، بلکہ نقشبندیہ سلسلے کے دوسرے بزرگوں سے۔

گہرے فرق کا اندازہ ہوتا ہے جو شاہ ولی اللہ خاندان کو مجددی بزرگوں سے تھا۔ مثلاً ایک مسئلہ یہ ہے کہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کے مسئلہ پر اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اپنے طریقے کے مطابق نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں۔ اس مسئلے پر۔

شیخ عبدالاحد قدس سرہ نے اپنے اسلاف کی ایک متواتر نقل بایں مضمون پیش کی۔ کہ نماز جماعت بالکل اس درباری جماعت کے مشابہ ہے جو ایک الو العزم اور پرشکوہ بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر عرض احوال کرے۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ بادشاہ کا درباری ادب اسی امر کا متقاضی ہے کہ تمام لوگ ایک زبان ہو کر اپنی حاجتیں عرض کریں نہ یہ کہ کوئی کچھ کہے اور کوئی کچھ کہے۔

شیخ عبدالرحیم صاحب نے فرمایا کہ آپ نے حنفی مذہب کی تائید میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے محض قیاس ہے اور قیاس بھی مع الفارق کیونکہ حقیقت میں دعا اور خضوع کے ساتھ مناجات کرنا اور نفس کو تہذیب و تزکیہ سے آراستہ کرنا نماز ہے۔ جیسا کہ حدیث نبوی لَا صَلَوةَ لِمَنْ مَالٍ قَلْبًا بِأَمِّ الْكُتُبِ اس دعویٰ پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے اور یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ خدا نے تعالیٰ سمیع ہے۔ اگر تمام دنیا کے لوگ ایک میدان میں صف آرا ہوں اور ہر شخص ایک جگہ اُخت اور سننے الفاظ میں مناجات کرے تو وہ ہر شخص کی علیحدہ علیحدہ مناجات سن سکتا ہے اور ایک شخص کی مناجات دوسرے کی مناجات میں خلل انداز نہیں ہو سکتی۔

اس اختلافی مسئلے کے حق میں اور اس کے خلاف بہت سی دلائل دی جا سکتی ہیں اور اس کی صحت سے یہاں بحث نہیں، لیکن شیخ عبدالاحد اور شیخ عبدالرحیم نے اس مسئلے پر جس طرح اپنے خیالات پیش کیے اس میں سمجھنے والوں کے لیے بڑا غور و فکر کا سامان ہے اور اس لطیف فرق کو نمایاں کرتا ہے جو ہمارے دو ممتاز ترین خانوادوں کے طریق کار میں تھا۔ ایک نماز میں سب زیادہ اہمیت تہذیب نفس کو دیتا ہے۔ دوسرا اُسے جماعت بندی اور ظاہری آداب کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ ایک

جزوی امور میں انفرادی رنگ کی اجازت دینا فرد کی روحانی نشوونما کے لیے مفید سمجھتا ہے۔ دوسرا جماعت بندی کے اصول سے یہ آزادی نہیں دینا چاہتا۔ ایک باطن پر نظر رکھتا ہے۔ دوسرا ظاہر پر ایک جمع بین الفرقین کے اصول پر چلتا ہے۔ دوسرا ایک طریقے پر اصرار کرتا ہے۔ ایک وحدت الوجودی ہے۔ دوسرا وحدت الشہودی!

شیعہ سنی مسکے پر بھی شاہ عبدالرحیم کا طریق کار اسی طرح اعتدال اور محالہ فہم کا تھا جس طرح دوسرے امور میں وہ غلو اور تعصب سے پرہیز کرتے۔ اور یہ امر قابل ذکر ہے کہ جب وہ ایران و روم سے آئے ہوئے ایک فاضل (عبداللہ حلبی) سے شیعہ سنی مسائل پر مباحثہ کرنے گئے تو انھوں نے اپنا مذہب سنی نہیں بلکہ خذ ما صفا ودع ما کذب بتایا۔

روضۃ القیومیہ میں شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا کو براہ راست حضرت مجدد الف ثانی کے مشہور خلیفہ شیخ آدم بنوری کا مرید لکھا ہے۔

”شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا دونوں شیخ آدم کے محتر خفا سے ہیں۔ نہایت مستقیم الاحوال تھے۔ صاحب کرامت و خوارق تھے۔ اپنے وقت کے مشہور مشائخ خیال کیسے جاتے تھے حضرت قیوم رابع رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی ان کی تعریف کی ہے۔ اب ان کا سلسلہ بہت جاری ہے۔ ان کے مرید ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ ان کی اولاد کا سلسلہ دو جگہ پر ہے۔ ایک پُرانی دلی میں۔ دوسرا شاہجہاں آباد کے قریب پہلت نام قصبہ میں (رکن اول ص ۳۵۲) جب روضۃ القیومیہ لکھی گئی اس وقت شاہ ولی اللہ کا عالم شباب تھا مصنف نے شیخ عبدالرحیم اور شیخ محمد رضا کے ذکر سے ساتھ ان کے متعلق بھی ایک سطر لکھی ہے۔

”شیخ ولی اللہ۔ آپ شیخ عبدالرحیم کے فرزند ہیں۔ ظاہری اور باطنی علوم کے جامع اور شریعت اور طریقت کے سخت پابند میں عموماً پہلت میں رہتے ہیں۔ (رکن اول ص ۳۵۵)

شاہ ولی اللہ کی تعلیم و تربیت | شاہ ولی اللہ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پانچ برس کی عمر میں آپ نے مکتب جانا شروع کر دیا۔ دو سال میں کلام مجید پڑھ لیا اور سالوں سال سے نماز اور روزہ کی پابندی شروع کی۔

پھر فارسی کتابیں اور عربی رسالے پڑھے۔ دس سال کی عمر میں شرح جامی شروع کی اور پھر مقولات ختم کر کے منقولات تک جا پہنچے۔ فقہ۔ منطق۔ حدیث۔ کلام کے علاوہ آپ نے اپنے والد سے طب، معانی اور ہندسہ و حساب کی کتابیں پڑھیں۔

آپ کے بچپن کے متعلق بہت کم واقعات ملتے ہیں، لیکن آپ کے مکتوبات کا ایک مختصر مجموعہ مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک واقعہ درج ہے جس سے آپ کی ذہانت اور رنگ طبیعت پر روشنی پڑتی ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں ابھی طفل مکتب تھا کہ شیخ فیروز شاہ جو مشاہیر عصر میں سے تھے اور سلسلہ شیخ آدم بنوریؒ سے پیوند رکھتے تھے۔ میرے والد کی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ آپ اس دنیا میں انھی آنکھوں سے رویت حق سبحانہ کے قابل تھے اور اس مسئلے پر والد ماجد سے بحث کرنے لگے۔ میں بھی باوجود طفولیت کے بیچ میں بول اٹھا کہ باصرہ اپنی ناتوانی یا کسی اور کمی کے باعث اس چیز کو بھی جو ہمارے پیچھے بلکہ ہمارے سر پہ ہو نہیں سکتی۔ اس سے قریب ہمارا نفس ہے۔ اسے نہیں دیکھ سکتی۔ پھر اس کی ان کمزوریوں کے باوجود کس طرح اس سے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ ایک ایسی ذات کو جو ہر لطیف شے سے زیادہ لطیف ہے، معائنہ کر سکے گی!

جب میں نے مثالیں دے کر یہ بات واضح کی تو بحث ختم ہو گئی اور سب لوگ میری تعریف کرنے لگے۔

۵ سال کی عمر میں شاہ عبدالرحیم نے آپ کو وصیت کیا۔ اس کے دو سال بعد والد کا انتقال ہو گیا تو سترہ سال کی عمر میں آپ کو مسند تدریس سنبھالنی پڑی اور قریباً بارہ برس تک آپ نے اپنے والد ماجد کے مدرسہ میں علوم دینی و عقلی کی تعلیم دی۔ اپنے والد کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "بعد از وفات حضرت ایشاں دوازده سال کمابیش بدریں کتب دینیہ و عقلیہ نموده و در ہر علمے غرض واقع شد۔"

اس کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور آپ عرب

سفر حرمین | تشریف لے گئے۔ دو مرتبہ فریضہ حج ادا کیا۔ اور حدیث شریف

جسے ہندوستان میں آپ نے مولانا محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھا تھا۔ اس کی سند
 شیخ ابوطاہر بن ابراہیم مدنی سے لی۔ شیخ ابوطاہر آپ کے فہم کے بڑے مداح تھے اور
 کہا کرتے تھے کہ ولی اللہ مجھ سے الفاظ کی سند لیتے ہیں اور میں اُن سے معافی کی۔

شاہ صاحب نے ابوطاہر کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے خیال ہوتا ہے کہ
 شیخ اسلامی دنیا کے بہترین اساتذہ میں سے تھے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں ”بالجملہ
 متصف بود بصفات سلف صالح از ورع واجتہاد و طاعت و اشتغال بعلم و انصاف
 در مذاکرہ۔ در ادنیٰ مراجعت تا تامل وانی نکردے و تتبع کتب نہ نمودے، جواب ندائے“
 اختلافی نظریوں کو تطبیق دینے کا جو اصول شاہ ولی اللہ کے والد نے اختیار کیا، ان پر
 شیخ بھی عامل تھے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ ”در اشنا سے قراءۃ صحیح بخاری بخیر اختلاف
 روایات احادیث و فقہ افتاد۔ شیخ ابوطاہر گفتند اینہم از ان ست کہ حقیقت آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم در نہایت جمیعت است و از فرط جمیعت اضداد را راجع میتوان کرد“
 انفس الحارثین میں شاہ صاحب نے اپنے والد اور چچا کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے
 یہ امر قریب قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان پر وحدت الوجودی رنگ غالب تھا۔
 شاید شاہ صاحب بھی اپنے خاندانی رجحانات سے متاثر ہوئے تھے اور ان اثرات
 کی کسی حد تک اصلاح مدینہ منورہ میں ہوئی۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب اسی زمانے کے قریب مدینہ منورہ میں بطور طالب علم
 وارد تھے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ شاہ صاحب سے اُن کی ملاقات ہوئی، لیکن یہ امر
 قرین قیاس ہے کہ کئی ایسے بزرگ ہوں گے جنہیں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے دونوں
 راستہ سمجھتے ہوں گے اور ممکن ہے کہ دونوں کے بعض اساتذہ مشترک ہوں۔
 قیام مکہ معظمہ کے زمانے میں حضرت حکیم الامت نے ایک خواب دیکھا جس کے
 دوران میں خود رسول کریمؐ نے آپ کو اس بشارت سے مفتخر فرمایا کہ (ترجمہ)
 ”تمہارے متعلق ارادہ ہو چکا ہے کہ اُمت مرحومہ کے جہنموں میں سے کسی جہنمی
 تنظیم تمہارے ذریعے کی جائے۔“

جن دنوں آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے، ہندوستان میں مرہٹہ گردی کی وجہ
 دُور کی بُری حالت تھی۔ اور آپ کو ہندوستان سے اس امر کا مشورہ بھی دیا گیا کہ آپ
 عرب میں ہی اقامت پذیر ہو جائیں، لیکن جس ہستی سے خدائے تعالیٰ نے اس ملک
 میں بے شمار خد متیں لینی تھیں اسے بھلا اپنے آرام و سہولت کے لیے یہ مشورہ کیونکر قبول
 ہوتا۔ چنانچہ آپ نے مشورہ دینے والوں کو لکھا کہ مجھے ہندوستان واپس آنے سے
 نہ روکو اور واپس آگئے۔

جب آپ نے واپسی کی تیاری کی تو آپ شیخ ابوطاہر کے پاس گئے اور رخصتی
 سلام عرض کیا۔ اس وقت شفیق استاد اور ارادت مند شاگرد کے درمیان جو گزری اس کا
 ذکر شاہ ولی اللہ نے ایک خط میں کیا ہے۔

میں اس وقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ جب میرے کوچ کا زمانہ قریب ہوا اور جلالی
 کی گھڑی سر پر آٹھری ہوئی اور رخصتانہ ملاقات کے دوران میں مزاج پررسی کے بعد
 میں نے یہ شعر پڑھا:-

لَسِيْتُ كُلَّ طَرِيقٍ كُنْتُ اَعْرِفُهُ اِلَّا طَرِيقًا يُؤَدِّيْنِي اِلَى رَجْعِكُمْ

یعنی میں ہر اس رستے کے جو مجھے تمہاری زمین تک پہنچا دے ان تمام رستوں کو
 بھول گیا، جن سے میں اس سے پیشتر واقف تھا، تو شیخ کی پریم آنکھوں سے آنسوؤں
 کی ندیاں بہنے لگیں اور دونوں رخسارے مُرخ ہو گئے۔ یہاں تک کہ دُور گریہ سے آپ کا
 گلاندہ ہو گیا۔ زراں بعد آپ نے نہایت خلوص کے ساتھ اس عاجز کے حق میں دعا کی۔

استاد کو الوداع کہہ کر شاہ ولی اللہ نے ہندوستان
 کا رخ کیا اور ۹ جولائی ۱۷۳۲ء کو اپنے وطن بالوف

دہلی میں وارد ہوئے۔ لیکن اس وقت وطن پر دیس سے بدتر تھا۔ اسلامی حکومت
 پر زوال و ادبار کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ہر طرف سے اعدا اور ان سے بدتر
 دوست نماد شمنوں کا ہجوم تھا۔ مرہٹے، سکھ، سادات بابریہ، نادر شاہ، ملک و
 مخلوقات الہی کے لیے ایک قہر عظیم بنے ہوئے تھے۔ ان حالات کے ملاحظہ

شاہ ولی اللہ پر جو گزرتی ہوگی اسے نگاہِ تصورِ آسانی دیکھ سکتی ہے۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان علما و مشائخ کے اس طبقے کا ہم خیال نہ تھا جو عالمانہ یا صوفیانہ مشاغل میں اس طرح مستغرق ہو جاتے ہیں کہ دنیوی ماحول ان کے لیے کوئی ہستی نہیں رکھتا۔ اس خاندان کو علم و عرفان کی قوی کشش کے باوجود واقعات سے بڑا لگاؤ رہا ہے اور وہ قوم کے دکھ درد میں برابر شریک رہے ہیں۔

اس سے پہلے جب اورنگ زیب کی وفات کے بعد ابھی زوالِ حکومت کا آغاز تھا تو شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم کی نگاہِ انتخاب نے امرا و اراکینِ سلطنت کی بھیڑ میں سے اس مردِ صاحبِ نظر کو چننا، جو حکومتِ اسلامی کی بربادی میں سے جو کچھ بچ سکتا تھا، اسے بچا لینے کا اہل تھا اور اسے نیک کام کی تلقین کی۔ شاہ عبدالرحیم نے آصفیہ خاندان کے بانی نظام الملک آصف جاہ کو اورنگ زیب کی وفات کے دس بارہ سال بعد جو خط لکھا، وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے:-

وزیر الممالک، آصف جاہ کی طرف جہاد کا شوق دلانے کے لیے لکھا گیا.....

بہ جانب وزیر الممالک، آصف جاہ در تہیں جہاد تحریر یافت.....

اس فقیر کی خاطر عاظر پر یہ منکشف ہو کہ عالم ملکوت میں یہ امر طے شدہ ہے کہ کفار ذلیل و خوار ہوں اور کچھ زمانے میں باغی رسوا و خراب ہوں۔ اب اگر شوکت مآب (آصف جاہ) ان گمراہوں کی مخالفت میں کمر تہمت باندھیں تو یہ سارے کائناتے ان سے منسوب ہوں گے۔ تمام عالم ان کا مستخر ہوگا اور کایم و ارج ملت اور ان کی دولت کے استحکام کا باعث ہوگا۔

بر خاطر عاظر این فقیر واضح شد کہ ملکوت مقرر شدہ کہ کفار ذلیل و خوار شوند و بعد از ان بہ چند مدت باغیان رسوا و خراب گردند۔ و اگر آں شوکت و شہامت مآب بریں ملا عین کمر تہمت بہ بندید۔ ایں ہمہ منصوب بایشان شود و تمام عالم مستخر ایشان گردد و سبب رواج ملت و استقامت دولت ایشان باشد۔

نہ اس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں لیکن چونکہ اورنگ زیب کی وفات کے تیرہ سال بعد شاہ عبدالرحیم انتقال کر گئے اس لیے یہ خط اس سے پہلے کسی وقت کا ہے اور غالباً محمد شاہی دور کی ابتدا میں لکھا گیا۔

سعی قلیل خواہد بود۔ و فوائد جلیل۔ و
اگر سعی نکنند۔ این جملہ خود بخود بہ حوادث سماویہ
ہلاک و مضحک گردند۔ دریں صورت این معنی
بایشان منسوب نہ گردد۔

کار زلف تست مشک افشانی و اما عاشقان
مصلحت راستہ بر آہوئے چہیں بستہ اند
چوں این معنی منفع (۹) و موکد معلوم است
لہذا بآں عزیزہ القدر بے اختیار نوشتہ می شود
وقت را غنیمت دانند و در جہاد اعدائے اللہ
تقاعد و تغافل کار فرمائشوند۔ بعد چندین کار و امح
نخواہد شد۔ چوں اظہار اتم مطلوب نبود و دوستی
و خیر خواہی دامنگیر از مبالغہ احتراز برفت و سخنے
ازیں فاش تر تصور نمی شد۔

گوئے توفیق و کرامت در میاں افگندہ اند
کس بمیداں در نمی آید سواراں را چہ شد!
سخنے کہ با مخرمان خود در پردہ اداسے کروم
این جا بے پردہ نوشتہ شد تا عذر نہ ماند
والسلام والا کرام۔

شاہ ولی اللہ نے بھی اپنے والد کی روش جاری رکھی۔ اسلامی حکومت کی تحفین
سے کشمکش کے دوران میں جو کوئی کار نمایاں کرتا شاہ صاحب اس کے لیے دعا کرتے
اور تحریر و تقریر سے اس کا دل بڑھاتے۔ اس سلسلے میں ان کے دو خطوط قابل ذکر ہیں۔
ایک پابندہ خاں روہیلہ کے نام ہے۔ درہنگام فتح نواح جبال شرقیہ ہندوستان کی کنٹن
کفار و منصوری اہل اسلام۔

(اس معاملے میں) سعی قلیل۔ یہ بھی فائدہ جلیل ہوگا
اور اگر آپ کو شش نہ کریں گے۔ تب بھی کفار حوادث
سماوی سے ہلاک اور مضحک ہو جائیں گے۔ لیکن اس
صورت میں کارنامے ان کے گنہ نہ جائیں گے۔
کار زلف تست مشک افشانی و اما عاشقان
مصلحت راستہ بر آہوئے چہیں بستہ اند
چونکہ یہ امر کی طرح معلوم تھا اس لیے بے اختیار
اس عزیز کو لکھا گیا۔ وقت کو غنیمت سمجھیں اور
جہاد کے معاملے میں سستی یا دیر نہ کریں تھوڑی
دیر کے بعد سب چیزیں واضح ہو جائیں گی۔ چونکہ
ایک چیز کا اظہار مطلوب تھا۔ اور وقتی اور خیر خواہی مانگ کر
اس لیے مبالغہ سے پرہیز کیا گیا اور اس سے زیادہ فاش
لکھا نہیں جاسکتا۔

گوئے توفیق و کرامت در میاں افگندہ اند
کس بمیداں در نمی آید سواراں را چہ شد!
وہ باتیں جو محرموں سے بھی پردے میں کہی جاتی
تھیں، یہاں بے پردہ لکھی گئی ہیں۔ تاکہ
کوئی عذر نہ رہے۔

عزیز القدر۔ رفعت مآب المجاہد فی سبیل اللہ۔ الرفع الکلمہ اللہ پائندہ خاں سلمہ اللہ تعالیٰ...
 از فقیر ولی اللہ عفی عنہ سلام محبت التیام مطالعہ فرمائند۔ آنچہ شفیقہ میشود از سعی ایشان
 در جہاد کوہستان موجب فرح و خوشی و سبب دعا بہ منظر الخیب مے شود۔ اللہم انصر
 من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ

دوسرا خط سہارنپور کے فوجدار خاں زمان خاں کے نام ہے :-

اللہ تبارک و تعالیٰ مجدد قانون شجاعت و
 دلاوری خاں عوالی مرتبت خاں زمان خاں جیورا
 مدت مدید در رد مکاید طاغیان کفر از مضیہ اہل
 اسلام منصور و مظفر وارد۔

از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد از سلام سنت
 اسلام واضح آنکہ خطوط بزرگان پہلست در بیان
 دلجوئی و عاطفت آن رفیع القدر بنشستہ...

در برابر آن فقیر ارباب اللہ بالحاج و قضرع دعائے حسن
 خاتمہ با کمال آبروئے دینی و آخرت ادا کردند۔
 خدائے تعالیٰ بہ کمال فضل خود بہ اجابت مقرون
 گرداناد۔ زیادہ اعمال خیر کرامت کناد۔ والسلام

شاہ صاحب کے یہ تین خطوط کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے ایک قلمی مجموعے سے
 ہمیں ملے تھے اور ہم نے انھیں رود کوثر کے گزشتہ ایڈیشن میں درج کر دیا۔ اس بجا پر فیض
 خلیق احمد نظامی نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکاتیب نام کی ایک مستقل کتاب میں ان سے بھی ہم

لے یہ تینوں خطوط ابھی شائع نہیں ہوئے۔ اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کے ایک قلمی مجموعے میں ہیں حکیم الامت
 شاہ ولی اللہ کے تمام خطوط کو جمع اور شائع کرنے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔

مکاتیب شائع کیے ہیں اور رائے ظاہر کی ہے کہ مرہٹوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کو بلائے اور نجیب الدولہ کو اس کا شریک کرنے میں شاہ صاحب کا ہاتھ تھا۔ پانی پت کا میدان کارزار حقیقت میں شاہ ولی اللہ صاحب کا سجایا ہوا تھا۔

شاہ ولی اللہ ان تمام کوششوں میں دلچسپی لیتے، جو حکومت اسلامی کو تباہی اور خلق خدا کو بربادی سے بچانے کے لیے کی جاتیں۔ شاید کسی وقت انہیں یہ خیال بھی گدگداتا ہو کہ (اپنے معاصر شیخ عبدالوہاب کی طرح؟) وہ مخلص اور اہل دل مجاہدین اسلام کا ایک جتھہ بنا کر زوال حکومت کے روکنے میں مدد دیں۔ لیکن اس کے لیے حالات سازگار نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کوشش ان کے نواسے شاہ اسماعیل کی قسمت میں لکھ دی تھی۔ شاہ صاحب نے ایک عملی اور ہوشمند انسان کی طرح مادی اور عسکری کوششوں کے لیے ان لوگوں کو شوق دلایا، جن کا یہ کام تھا اور اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کیا، جس کے لیے وہ زیادہ موزوں تھے اور جو اہمیت میں اس سے کسی طرح کم نہ تھا۔

آج سیاسیات کی گرم بازاری سے بعض حلقوں میں یہ خیال عام **خلافت باطنی** ہو گیا ہے کہ دینی، مذہبی اور علمی کام کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہماری ذہنی تشکیل میں بڑا ہاتھ ان بزرگوں کا رہا ہے، جن کی زندگیاں بطور جبریل کے یا اسی طرح کے کسی دوسرے دنیوی صیغے میں شروع ہوئیں۔ طبیعت کے لگاؤ سے یا کسی مصلحت کی خاطر انہوں نے مذہبی معاملات میں بھی ہاتھ مارا۔ لیکن ان کی اصل دلچسپیاں

لے افسوس کہ پروفیسر صاحب نے ان خطوط کے ماخذ کی تصریح نہیں کی۔ خدا نخواستہ ان پر شبہ کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن جب ایک مشہور بزرگ کا نام کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں، ایک مستقل سوانح عمری آج سے بہت پہلے چھپ چکی ہے، ایک ایسا نادر ذخیرہ جس کا کہیں ذکر نہیں، شائع کیا جائے تو اصول فن کے مطابق جائے حصول کی بھی نشان دہی کرنی چاہیے۔

[پروفیسر صاحب نے زبانی فرمایا کہ اس نادر ذخیرہ میں شاہ صاحب کے پانچ سو کے قریب خطوط ہیں۔ وہ افشاں شادابی کو بھی شائع کریں گے۔ اور اس وقت متعلقہ امور کی وضاحت کریں گے۔]

دنیوی اور مادی تھیں۔ ظاہر ہے کہ انھیں روحانی اور علمی معاملات کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن شاہ ولی اللہ اس معاملے میں بھی نہایت صائب اور جامع نقطہ نظر رکھتے تھے۔ انھیں مادی اور دنیوی چیزوں کی اہمیت کا احساس بھی تھا اور ساتھ ہی مذہبی اور دینی کاموں کی بھی دلی قدر تھی۔ اس بات کو انھوں نے فیوض الحریں میں نہایت وسعت سے واضح کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم کا کام جاری رکھنے والوں کے لیے دو راستے ہیں۔ (خلافت ظاہری اور خلافت باطنی) اور دونوں اپنی اپنی جگہ مفید اور ضروری ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی میں امت مرحومہ کے لیے نیک نمونہ ہے۔ مثلاً خلافت ظاہری والوں کے لیے جو شرعی حدود اور جہاد کے سائر دسامان کی تہاری اور سرحدی علاقوں کی ناکہ بندی و حفاظت اور وفود کو اکرام و انعام دینے کی خدمت اور صدقات، محضول، مالگزاری وغیرہ کی وصولی۔ ارباب استحقاق پر ان کی تقسیم و مقدمات فیصلوں۔ یتیموں کی نگرانی۔ مسلمانوں کے اوقاف کا انتظام۔ راستوں۔ سڑکوں اور مساجد وغیرہ کی تعمیر اور اسی قسم کے اور کاموں کے لیے مقرر ہیں۔ مسلمانوں میں جو ان خدمات اور مشاغل میں مصروف ہیں ان کو میں خلافت ظاہری والوں کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔

جو لوگ باطنی خلافت والے ہیں یعنی جو اس کام پر مقرر ہیں کہ شرائع اور قوانین اسلامی قرآن اور سنن و آثار کی تعلیم دیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔ وہ لوگ جن کے کلام سے دین کی تائید ہوتی ہے خواہ وہ وہ مناظرہ و مباحثہ کی راہ سے جیسا کہ متکلمین اسلام کا حال ہے۔ یا وعظ و پند کے طریقے سے جیسا کہ اسلام کے مقررین اور خطباء جس خدمت کو انجام دیتے ہیں یا وہ لوگ جو اپنی صحبت اور توجہ و تہمت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ جیسا کہ مشائخ صوفیہ کا حال ہے۔ اسی طرح جو نمازیں قائم کرتے ہیں۔ حج کراتے ہیں اور جو انسان (دوام حضور) کے حصول کی راہ لوگوں کو بتاتے ہیں اور زہد و تقویٰ کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں ان کو ہم خلفاء باطنی کے نام سے

موسوم کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے اپنے تئیں رسول اکرمؐ کی خلافت باطنیہ کی تکمیل کے لیے وقف رکھا۔ خلافت ظاہری کے لیے جو لوگ زیادہ موزوں ہوئے، وہ ان کی ہمت افزائی کرتے اور قوم کی مادی مشکلات کبھی ان کی نظر سے اوجھل نہ ہوئیں لیکن ان کا اپنا راستہ دوسرا تھا۔ انھوں نے نہ صرف کلام مجید کا فارسی ترجمہ اور درس و تالیف کتب حدیث سے کتاب و سنت کی وسیع اشاعت کا سامان کیا اور علوم اسلامی کی ترتیب و تنظیم سے ہمارے لیے ایک بیش بہا علمی خزانہ یادگار چھوڑا بلکہ اختلافی محاملات میں ایک ایسا راستہ اختیار کر کے جس پر صوفی اور ملا، شیعہ اور سنی، حنفی اور حنبلی، مجددی اور وحدت الوجودی، معتزلہ اور اشاعہ متفق ہو سکیں۔ اسلامی ہندوستان کو ایک ایسا دینی اور علمی نظام عطا کیا جو اس ملک میں شعار قومی کی حیثیت حاصل کر سکتا تھا اور جس کے مروج و مقبول ہونے کا نتیجہ ہو کہ ایک متفق علیہ مذہبی نظام کی بنیادوں پر ایک قوم کی تعمیر ہو سکی اور جدید اسلامی ہندوستان کا آغاز ہووا۔

مکہ معظمہ جانے سے پہلے حکیم لاہوت کا اصل کام درس و تدریس تھا۔ واپسی پر آپ نے یہ شغل کم کر دیا۔ بلکہ ہر ایک فن کے لیے ایک ایک قابل شخص کی تربیت کی۔ اور پھر ان فنون کی تعلیم ان کے سپرد کر دی۔ خود فقط حدیث پڑھاتے اور باقی وقت محاورت گوئی اور تصنیف و تالیف میں بسر ہوتا۔ خدائے تعالیٰ نے آپ کو صحت بھی اچھی عطا کی تھی اور آپ کے اعتدال اور باقاعدگی سے حفظ صحت میں آسانی ہوتی ہوگی۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں: ”مریض ہم کم مے شد“ اور اپنے کام میں اس انہماک سے مشغول ہوتے کہ اشراق کے بعد جو بیٹھ جاتے تو دوپہر تک نہ زانو بدلتے نہ کھجلا تے اور نہ دہن مبارک سے محسوس ہونے لگتا۔ ”مقالات طریقت کے مصنف لکھتے ہیں: ”مہول تھا کہ آپ سبقت پڑھاتے وقت رُوبہ قبلہ روزانہ مؤدب بیٹھتے تھے۔ اور ہر روز عادت تھی کہ صبح کو غسل کر کے نیا یا دھریا ہوا لباس پہنتے تھے۔ نظافت کو بہت دوست رکھتے تھے۔ مزاج میں ضبط اس طور تھا کہ آپ کو مدت تک عارش کی شکایت تھی، لیکن آپ شب کو سونے کے وقت ہم

کھلاتے تھے۔ اور کوئی وقت کسی نے آپ کو کھلاتے نہیں دیکھا۔ آپ کا حافظہ بھی غضب کا تھا۔ شاہ عبدالعزیز کا بیان ہے۔ ”مثل والد ماجد حافظہ ندیدہ ام“ اور اس محنت، حسن تدبیر اور ذہنی صلاحیتوں کی بدولت آپ نے چند سالوں میں ہی اتنا کام کر لیا کہ دوسروں سے اس کا عشر عشر بھی مکمل نہیں ہوتا۔ آپ کی وفات ۱۲۶۲ھ میں بمقام دہلی ہوئی۔ تاریخ وفات ہے۔ اور بود امام اعظم دیں

۴۶ ۱۱ ھ

مولانا شبلیؒ ”تاریخ علم الکلام“ میں لکھتے ہیں۔ ”ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انہی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا۔ اس کے لحاظ سے یہ اُمید نہ رہی تھی کہ پھر کوئی صاحبِ دل و دماغ پیدا ہوگا۔ لیکن قدسیت کو اپنی نینگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانے میں جبکہ اسلام کا نفسِ بارسبیں تھا۔ شاہ ولی اللہ حبیباً شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی۔ رازی۔ ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔“

نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں۔ ”اگر وجود اور صدرِ اقل و در زمانہ ماہی می بود امام الاممہ و تاج المجتہدین شمر وہ سے شد۔“ یعنی آپ پہلے زمانے میں پیدا ہوئے تو آپ کو اماموں کا امام سمجھا جاتا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم شاہ صاحب کو محض اپنی کم ہمتی اور تقلید پسندی سے امام نہیں کہتے۔ ورنہ جہاں تک علمی تجربہ و داعی قابلیت۔ مجتہدانہ نظر۔ سلیم الخیالی اور اشاعت کتاب و سنت کے سلسلے میں عظیم الشان قومی اور مذہبی خدمات کا تعلق ہے۔ ”دنیا سے اسلام میں بہت ہی کم بزرگ ہوں گے جن سے آپ پیچھے رہے ہیں۔ آپ نے بیسیوں کتابیں لکھیں۔ تفسیر حدیث قصوف فقہ۔ تاریخ۔ علم الکلام غرضیکہ علوم اسلامی کی کوئی شاخ نہیں جسے آپ نے سیراب نہ کیا ہو اور اللہ کا فضل ایسا شامل حال تھا کہ جس چیز کو لامحدد لگاتے گندن ہو جاتی۔“

آپ کا سب سے اہم کام قرآن اور علوم قرآنی کی اشاعت ہے اور اس سلسلے میں **قرآن** آپ کا بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں بہت کم لوگ عربی جانتے تھے۔ دفترِ تعلیمی زبان فارسی تھی۔ لیکن اس زبان میں قرآن مجید کا

کوئی ترجمہ رائج نہ تھا۔ چنانچہ عام تعلیم یافتہ مسلمان گلستان، بوستان، سکندر نامہ اور شاہنامہ تو پڑھتے اور سمجھتے، لیکن قرآن مجید سے جو ہدایات کا سرچشمہ ہے، ناواقف رہتے۔ پُرانے علما اور خواص میں سے قرآن مجید اگر کسی نے پڑھا تو ناظرانہ۔ یعنی مفہوم و معانی سمجھنے اور اس کی روح و تعلیمات سے فیضیاب ہونے کے بغیر۔ اکبر کے دربار میں جب مسلمان علما اور پرتگیز مشنریوں میں مباحثے ہوئے اور مشنریوں نے (جو کلام مجید کے لاطینی ترجمے کی وجہ سے اس کے اندراجات سے خوب واقف تھے) کلام مجید کے بعض حصوں پر اعتراض کیے تو اس وقت پتا چلا کہ جن مسلمانوں نے عربی میں قرآن پڑھا بھی تھا۔ انھیں بھی اس کے مضامین اور اندراجات سے پوری طرح واقفیت نہ تھی۔ بسا اوقات یہ ہوتا کہ پادری کلام مجید کے کسی بیان پر اعتراض کرتے اور مسلمان کہہ دیتے کہ یہ تو قرآن میں ہے ہی نہیں اور پھر جب کلام مجید کھول کے دیکھا جاتا تو وہ حوالے نکلتے۔ شاہ صاحب کو اس بوجہ عجیب کا احساس ہوا اور حج سے واپس آنے کے پانچ سال بعد ۱۰۳۷ھ میں آپ نے فارسی زبان میں کلام مجید کا ترجمہ کیا۔ جب علما کو اس کا پتا چلا تو تلواریں کھینچ کر آگئے کہ یہ کلام مجید کی انتہائی بے ادبی ہے۔ بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اس مخالفت کی وجہ سے شاہ صاحب کی جان اس طرح خطرے میں پڑ گئی کہ انھیں کچھ عرصہ کے لیے دہلی سے چلے جانا پڑا۔ لیکن بالآخر شاہ صاحب کی جرات اور فرض شناسی کامیاب ہوئی انھوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ اس لیے نہیں آیا کہ اسے ریشمی جزدانوں میں پیٹ کر طاق پر تبر کار کھا جائے یا جس طرح دوسری قومیں منتر پڑھا کرتی ہیں، ہم اسے طوطے کی طرح بغیر سمجھے پڑھ دیں۔ یہ کتاب انسانی زندگی کے متعلق اہم ترین

۱۔ شیخ سعدیؒ کا ایک ترجمہ بھی اب بازار میں ملتا ہے، لیکن شیخ سعدی سے اس کی نسبت مشتبہ ہے اور یقیناً یہ ترجمہ بھی رائج نہیں ہوا۔ شاہ صاحب پہلے ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے سلاطین جوہر کے زمانے میں ایک تفسیر بحر مواج لکھی تھی، جس میں ہر آیت کی تشریح و تفسیر سے پہلے اس کا ترجمہ دیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے اس ترجمے کی حیثیت محض ضمنی اور جزوی تھی اور اسے بھی عام مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔

حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کے نازل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے پڑھیں اور ان حقائق کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں اور اس کے لیے رائج الوقت زبانوں میں اس کا ترجمہ ضروری ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ معترضین کی مخالفت کم ہوئی اور نہ صرف شاہ صاحب کے ترجمے نے رواج پایا، بلکہ اردو اور دوسری زبانوں کے ترجموں کی راہ پیدا ہو گئی۔

قرآن مجید کا محض ترجمہ کر دینا ہی اس قدر اہم کام تھا کہ اگر شاہ صاحب فقط اسی کا رخیہ پر اکتفا کرتے اور وہ ابتدائی دُشواریاں دور کر دیتے جو عام علما کی فرض ناشکیا اور کورانہ تقلید کی وجہ سے اُن کے راستے میں حائل تھیں، تب بھی اسلامی تاریخ میں ان کا نام درخشاں ستارے کی طرح چمکتا، لیکن ان کا ترجمہ بطور خود بلند پایہ اور قابل قدر عظمت ہے۔ ترجمے کی مخالفت بیشتر تو تقلید اور امور مذہب میں مخزن کو چھوڑ کر استخوان کے پیچھے دوڑنے کی وجہ سے تھی، لیکن اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کے ترجمے میں ہزاروں وقتیں ہیں۔ ترجمے میں لفظی صحت کو برقرار رکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن کے مبلغ معانی اور اس کی ادبی شان کو اس پر قربان نہ ہونے دینا اس قدر مشکل ہے کہ آج، جبکہ ہمیں قرآن مجید کے ترجموں میں دو سو سال کی مشق ہے اور قوم کے بہترین علما و ادبا نے اس قومی خدمت پر توجہ کی ہے۔ ایک بھی ترجمہ ایسا نہیں جسے قسطنطین بخش کہا جاسکے یا جس سے اصل کے زورِ بیان فصاحت و بلاغت اور روحانی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ شاہ ولی اللہ کے ترجمے کے متعلق یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا اور اصل میں ضرورت یہ ہے کہ مُستند اور بلند پایہ ترجمے کے لیے علما اور اہل قلم کی ایک پوری جماعت یہ فرض ادا کرے، لیکن اکثر باتوں میں وہ موجودہ اردو ترجموں سے کہیں بہتر ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے والے میں جن خصوصیتوں کی ضرورت ہے وہ شاہ صاحب سے بڑھ کر آج تک کسی مترجم میں جمع نہیں ہوئیں، لہذا نذیر احمد کہتے ہیں: "فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لیے جتنی باتیں درکار تھیں،"

ترجمے سے ثابت ہوتا ہے وہ سب مولانا شاہ ولی اللہ میں علی وجہ الکمال پائی جاتی تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا صاحب کی نظر قفا سیر اور احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بس انہیں کا حصہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب ان کے پیش نظر ہیں اور وہ ان میں جس کو واضح پاتے ہیں اُسے اختیار کرتے ہیں۔“

شاہ صاحب نے نہ صرف قرآن مجید کا ترجمہ کیا، بلکہ اس مسئلے کے علمی پہلوؤں پر بھی ایک رسالہ لکھا اور مقدمہ فی ترجمۃ القرآن مجید میں قرآن مجید کے مترجموں کی رہنمائی کے لیے کار آمد ہدایتیں درج کیں۔

شاہ صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔ ”اس بندہ مضیف پر خداوند تعالیٰ کی کئی بے شمار نعمتیں ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ عظیم الشان نعمت یہ ہے کہ اس نے مجھ کو قرآن مجید سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی اور حضرت رسالت مآب کے احسانات اس کمترین اُمت پر بہت ہیں، جن میں سب سے بڑا احسان قرآن مجید کی تبلیغ ہے۔“

قرآن مجید کی تبلیغ شاہ صاحب نے فقط ترجمہ کر کے ہی نہیں کی، بلکہ علم تفسیر کے متعلق کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں الفوز الکبیر فی اصول التفسیر خاص طور پر قابل ذکر ہے اس کتاب کے چار باب ہیں جن میں علوم قرآنی اور مطالعہ قرآن کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے۔ دوسرے باب میں آپ نے مسئلہ نسخ پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالی ہے اور وہ آیات منسوخہ جن کی تعداد بعض لوگوں کے نزدیک پانچ سو کے قریب تھی اور جن کی تعداد علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی بیس مقرر کی تھی۔ چار سے زیادہ تسلیم نہیں کیں۔

فوز الکبیر کے بعض اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ شاہ صاحب قرآنی ارشادات کو وسیع سے وسیع مفہوم دینا چاہتے تھے۔ وہ مختلف آیتوں اور سورتوں کے متعلق اسباب نزول کا خیال رکھتے ہیں، لیکن اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے کلام مجید کے اصلی مقصد پر پردہ نہ پڑ جائے۔ چنانچہ باب اول میں لکھتے ہیں۔ (ترجمہ)

”عام مفسرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو یا احکام کی، ایک حصے کے ساتھ

رابطہ دیا ہے اور اس قصے کو اس آیت کے لیے سبب نزول مانا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ نزول قرآنی سے مقصود اصلی نفوس بشریہ کی تہذیب اور ان کے باطل عقاید اور فاسد اعمال کی تردید ہے۔ اس لیے آیات مناظرہ کے نزول کے لیے متکلمین میں عقاید باطلہ کا وجود اور آیات احکام کے لیے ان میں اعمال فاسد اور مظالم کا شیوع اور آیات تذکیر کے نزول کے لیے ان کا بغیر ذکر اللہ وایام اللہ اور موت وواقعات بعد الموت کے بیدار نہ ہونا، اصلی سبب ہوا۔ خاص واقعات کو جن کے بیان کرنے کی زحمت اٹھانی گئی ہے۔ اسباب نزول میں چنداں دخل نہیں مگر سوائے چند آیات کے جن میں کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو رسول اللہ کے زمانے میں یا اس سے پیشتر واقع ہوا ہو۔

فوز الکبیر کی دوسری خصوصیت شاہ صاحب کی انصاف پسندی اور اخلاقی جرأت ہے۔ مثلاً عام طور پر مسلمان زمانہ جاہلیت کے عربوں سے فقط بُرائیاں اور عیب ہی منسوب کرتے ہیں، لیکن شاہ صاحب نے اس معاملے میں بھی ”انصاف بالائے طاعت“ کے اصول کو ملحوظ رکھا اور تصویر کے دونوں پہلو پیش کیے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کا خیال ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی اصل مذہبی کتابوں کو بدل ڈالا ہے، لیکن شاہ ولی اللہ اس کے قائل نہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں: ”یہودی تحریف لفظی، تو راسخ ترجمے وغیرہ میں کیا کرتے تھے نہ کہ اصل کتاب میں کیونکہ فقیر کے نزدیک ایسا ہی محقق ہوا ہے اور ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔“

بعض مفسرین نے اہل کتاب سے قصے لے کر انہیں قرآنی تفاسیر اور علوم اسلامی کا جزو بنادیا ہے۔ اس کے خلاف شاہ صاحب نے جابجا آواز بلند کی ہے مثلاً فوز الکبیر میں لکھا ہے: ”یہاں پر یہ جان لینا مناسب ہے کہ حضرات انبیاء باقرین کے قصے احادیث میں کم مذکور ہیں اور ان کے وہ لمبے چوڑے تذکرے جن کے بیان کرنے کی تکلیف عام مفسرین بیان کرتے ہیں وہ سب الا ماشاء اللہ علمائے اہل کتاب سے منقول ہیں۔ اسی کتاب میں آگے چل کر بھی لکھتے ہیں: ”اسری روایات کا

نقل کرنا ایک ایسی بلا ہے جو ہمارے دین میں داخل ہو گئی ہے۔ حالانکہ صحیح اصول یہ ہے کہ ان کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب۔ مفسرین کے بعض قصے جھپٹیں عوام اسلام کا ضروری جزو سمجھنے لگ گئے ہیں، شاہ صاحب کو بہت ناپسند تھے۔ فرماتے تھے۔ ”اور محمد بن اسحق واقدی کلبی نے قصہ آفرینی میں جس قدر افراط کی ہے (یعنی وہ ہر ایک آیت کے تحت میں ایک قصہ لائے ہیں) محدثین کے نزدیک ان کا اکثر حصہ صحیح نہیں اور ان کے اسناد میں خامیاں ہیں۔ ان لوگوں کی اس افراط کو علم تفسیر کے لیے شرط سمجھنا صریح غلطی ہے اور اس کے حفظ پر فہم کتاب اللہ کو موقوف کرنا اور اصل کتاب اللہ سے اپنا حصہ کھونا ہے۔“

مفسرین کی یہی تولیدہ نویسی تھی جس کی وجہ سے شاہ صاحب نے اپنے وصیت نامے میں بھی لکھا کہ قرآن اور اس کا ترجمہ تفسیر کے بغیر ختم کرنا چاہیے۔ اور پھر اس کے بعد تفسیر اور وہ بھی تفسیر جلالین (بقدر درس) پڑھائی جائے۔ (جو نہایت مختصر ہے اور جس کے الفاظ قرآن کے الفاظ جتنے ہیں) وہ لکھتے ہیں۔ ”قرآن عظیم اس طرح پڑھاویں کہ صرف (قرآن اور) ترجمہ بغیر تفسیر کے (پڑھا جائے) مگر جہاں شان نزول یا قاعدہ نحو مشکل ہو وہاں مٹھر جائیں اور بحث کریں بعد اس کے تفسیر جلالین بقدر درس پڑھاویں۔ (ترجمہ)“

نظام الدین اور ان کے معاصرین کے حالات سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں اسلامی مدارس جن باتوں پر زور دیتے تھے، وہ صرف فروع

حدیث

یا منطق اور فقہ کی کتابیں تھیں۔ اس میں کچھ تو لکھنا اور وہاں کے علماء کے مذاق کو دخل تھا اور کچھ یہ وجہ بھی تھی کہ حکومت اسلامی کا زمانہ تھا۔ شرع حکومت کا قانون تھی جس طرح آج کل بیج یا منصف یا مجسٹریٹ ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس زمانے میں قاضی اور مفتی اور محتسب ہوتے تھے۔ ان لوگوں کو اپنے فیصلوں کے لیے فقہ کی واقفیت ہر کار تھی منطق بھی فقہی فیصلوں میں مفید تھی اور صرف و نحو عربی جاننے کے لیے ضروری تھی۔ چنانچہ جب تک اسلامی حکومت کا اقتدار رہا۔ انہی علوم نے فروغ پایا۔ شیخ عبدالحی نے حدیث کی اشاعت شروع کی، لیکن فقہ و منطق کے فروغ نے حدیث کو چمکنے نہ دیا۔

ان کے جانشینوں نے اس علم پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن شاہجہاں اور عالمگیر کی علم پروری انہیں قضا اور افتا کی مسندوں پر لے گئی۔ وہ درس حدیث کا سلسلہ پوری طرح جاری نہ رکھ سکے اور ملک میں بہت سے علما ایسے نہ پیدا ہوئے جو طالبین کو درس حدیث دے سکتے۔ اس کی تلافی شاہ ولی اللہ صاحب نے کی۔ ایک تو اورنگ زیب کے بعد مفتیوں اور قاضیوں کی پہلی سی قدر نہ رہی اور فقہ کی کشش کچھ کم ہو گئی۔ دوسرے شیخ عبدالحق محدث کی طرح شاہ ولی اللہ بھی فنا فی العلم تھے۔ "قاضی القضاۃ" اور "شیخ الاسلام" بننے کی خواہش ان کے دل میں نہ تھی۔ انھوں نے اپنی کوشش اس علم کی ترویج کے لیے وقف رکھی۔ جس کی بادشاہوں کے درباروں میں تو قدر نہ تھی۔ لیکن جو عام مسلمین کی اخلاقی اور روحانی اصلاح کے لیے ضروری تھا۔ علم الحدیث پر انھوں نے کئی کتابیں لکھیں، لیکن اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ ایسے علما کی تربیت کر گئے۔ جنھوں نے درس حدیث کا سلسلہ ان کے بعد جاری رکھا اور یہ فیض ملک میں عام ہو گیا۔ حدیث میں ان کی کئی کتابیں ہیں۔ امام مالک کے مرتب کردہ اور مسند قدیمی مجموعہ حدیث "موطاء" کے وہ بڑے مداح تھے۔ چنانچہ وصیت نامے میں لکھتے ہیں۔ "جب عربی زبان کی قدرت ہو جائے۔ موطاء بروایت یحییٰ بن یحییٰ صمودی پڑھاویں۔ اسے ہرگز نہ چھوڑیں کہ علم حدیث کی اصل ہے۔ اور اس کے پڑھنے میں بہت فیض ہیں۔" علم حدیث میں شاہ صاحب کا یہ اجتہاد سمجھنا چاہیے کہ وہ موطاء کو صحیح بخاری پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں مولانا عبید اللہ سندھی کا یہ بیان بڑا پر معنی ہے کہ موطاء میں وہ تمام مشکل حدیثیں نہیں پائی جاتیں جن کا سمجھنا کالجوں کے طلباء کے لیے مشکل ہے۔ شاہ صاحب نے موطاء کی شرح فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں لکھی۔ عربی شرح کا نام "المسوی" اور فارسی کا "المصطفیٰ" ہے۔

یہ کتابیں تو علما کے لیے تھیں، لیکن شاہ صاحب نے عوام کے لیے بھی مختصر احادیث کی کتابیں مرتب کیں۔ ایک کتاب "جمل حدیث" ہے۔ النوادر من الحدیث میں عجیب اور غیر معمولی حدیثیں جمع کی ہیں۔ الدر الثمیں فی مبشرات النبی کریم میں ایسی چالیس حدیثیں جمع

کی ہیں جو خواب میں انھیں بتائی گئیں۔ شرح تراجم ابواب بخاری میں صحیح بخاری کے ابواب کی سرخیوں کی تشریح کی ہے۔ اسی طرح اور کئی مختصر رسالے میں حجۃ اللہ البالغہ جو اسرار شریعت میں آپ کی ضخیم اور مشہور کتاب ہے۔ اس کے مضامین بھی بیشتر احادیث پر مبنی ہیں اور اس سے بھی علم حدیث سے آپ کی عمیق واقفیت کا پتا چلتا ہے۔

اصول فقہ | شاہ صاحب کو فقہ سے بہت دلچسپی نہ تھی۔ ان کے فتوے یافتہ کے پیچیدہ مسائل کے متعلق بہت سے رسائل نہیں ملتے لیکن وہ تمام علوم اسلامی کے ماہر تھے۔ وقتی ضروریات کے متعلق انھوں نے فقہی فتوے بہت نہیں دیے، لیکن علم فقہ کو صحیح علمی اور مٹھوس بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے انھوں نے بڑی کوشش کی اور ایسی کتابیں لکھیں جو اہل بصیرت و دانش کو ہدایہ اور فائدہ عالمگیری سے اور فقہ اور شریعت کے اصلی سرشتہ تک پہنچا دیتی ہیں اور جن کی وجہ سے ایک مبتدی کے لیے بھی ممکن ہے کہ وہ ان حالات کا اندازہ کر لے جن کے ماتحت شرع اور فقہ کی تدوین ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کی بہترین کتاب ایک مختصر رسالہ انصاف فی بیان سبب الاختلاف ہے۔ اس کتاب کو اگر تاریخ فقہ و علم الحدیث کہا جائے تو بجا ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت یہ کتاب عہد سعادت سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک فقہ کی تدوین کتب احادیث کی فراہمی اور مختلف مذاہب فقہی کے آغاز کی ایک نہایت دلچسپ منصفانہ اور پر از معلومات تاریخ ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے۔ اب عربی اصل اور سلیس اردو ترجمہ مولانا محمد احسن نانوتوی نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کو شاہ صاحب کی وسیع معلومات اور ذہنی قوت استخراج کا اعجاز سمجھنا چاہیے۔ عام طور پر مسلمان علما کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ علمی مسائل کے متعلق تاریخی نقطہ نظر نہیں رکھتے۔ یعنی جو عالم حدیث کا درس دیتے ہیں وہ جس کتاب کا درس دیں اس کے مضامین سے تو پوری طرح واقف ہوں گے لیکن حدیث کی تاریخ سے انھیں کامل واقفیت نہ ہوگی اور عہد نبوی سے لے کر اب تک محدثین کے مختلف ادوار

جمع احادیث کے طریقے، احادیث کے متعلق مختلف لوگوں کے خیالات، ان باتوں کے متعلق انھیں مسلسل صحیح اور نقادانہ واقفیت کم ہوتی ہے۔ اسی طرح فقہاء ہیں جو فتوے تو دے لیں گے اور جو مسائل انھیں پیش کیے جائیں، ان کے متعلق اپنے اساتذہ یا مشہور مصنفین کی تصانیف دیکھ کر فیصلے تو کر سکیں گے، لیکن علم فقہ کی تدوین، عہد بعد کی ترقیاں اور تبدیلیاں، مختلف صورتیں جو مسائل نے مختلف زمانوں میں اختیار کیں۔ ان سے انھیں پوری واقفیت نہیں۔ عام ہندوستانی علماء کے متعلق یہ اعتراض بہت حد تک صحیح ہے، لیکن شاہ ولی اللہ کے اس مختصر رسالے کو بھی دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ انھیں اسلام کی علمی تاریخ سے کتنی واقفیت تھی۔ اردو میں یہ رسالہ پچاس صفحے سے زیادہ کا نہیں۔ لیکن اس میں نہایت وضاحت اور انصاف پسندی سے قریباً ان سب اہم بنیادی مسائل کا ذکر آگیا ہے، جن پر علماء میں اختلافات ہوئے۔ ان اختلافات کی توضیح کی ہے۔ ساتھ ساتھ مذاہب اربعہ یعنی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی طریقوں کی خصوصیات اور ان کی جداگانہ تشکیل کی نہایت عالمانہ تلبیح لکھی ہے۔ جمع احادیث اور محدثین مثلاً بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی کے مجموعوں کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اجتہاد اور تقلید کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے اور ان وجوہات کا ذکر کیا ہے جن کی بنا پر مسلمانوں میں تقلید کا رواج ہو گیا۔ ہم اس کتاب میں سے طویل اندراجات نہیں دینا چاہتے۔ کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ ہر شخص جسے علوم اسلامی کی تاریخ سے ذرا بھی دلچسپی ہے اسے خود پڑھے گا اور حوزہ جہاں بنائے گا۔ لیکن تقلید کے متعلق تاثر نے جو غلو کیا ہے، اس پر شاہ صاحب کا فیصلہ بہت دلچسپ ہے۔ اسے نقل کرنا بیجا نہ ہوگا۔ کتاب کے اخیر میں لکھتے ہیں:-

پھر ان لوگوں کے بعد بہت سے قرن بڑے تقلید پر پیدا ہوئے کہ نہ حق کو باطل سے جدا کرتے، نہ جمل کو استنباط سے۔ تو فقہ ان وقت وہی تھا جو بہت بکے۔ مرنے بجھنے ہو کر فقہ کے قوی اور ضعیف اقوال کو بدولت تیز کے یاد کرے اور ان کو باچیس چیر چیر کر بیان کرے اور محدث وہ تھا جو صحیح اور مستقیم حدیثوں کو شمار کرے

اور اپنی کلمہ زوری سے ان کو کہانیوں کی طرح بکتا چلا جائے..... اور اس کے بعد جو قرن ہو اور وہ فتنے اور تقلید میں اور بھی بڑھ گیا اور لوگوں کے دلوں سے دیانتداری جاتی رہی۔ یہاں تک کہ دین کے معاملے میں غور نہ کرتے پر مطمئن ہو گئے اور یہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک دین پر پایا اور ہم انھی کے قدم کے نشانوں پر ان کی پیروی کرتے ہیں۔

اس کتاب کے علاوہ آپ نے تقلید اور اجتہاد کے مسئلے پر ایک بڑی مفید کتاب عقد الجید فی احکام الاجتہاد و تقلید

کے نام سے لکھی ہے۔ اس کتاب کے چار باب ہیں جن میں اجتہاد کی قسموں اور مجتہد کی خصوصیات کے علاوہ اس قسم کے مسائل پر بحث کی ہے کہ ایک عامی فقہاء کے اختلاف کی صورت میں کیا کرے اور آیا ایک عامی مختلف فقہی مذاہب کی مختلف باتیں اختیار کر سکتا ہے؟ انھوں نے جماعت کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ مجتہدین اور عامی مجتہدین کے تین مدارج ہیں۔ (۱) مجتہدین مطلق یعنی ائمہ اربعہ۔ (ب) مجتہد فی المذہب اور (ج) مجتہد فی الفتویٰ۔ اجتہاد کی تعریف انھوں نے یہ کی ہے۔ ”خوب محنت کرنا دریافت کرنے میں، شریعت کے احکام فرعی کو، ان کی تفصیلی دلیلوں سے جن کی کلیات کا مال چار قسم پر ہے۔ یعنی کتاب اور سنت اور اجماع اور قیاس پر۔“

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب باب اجتہاد کے بند ہونے کے قائل نہ تھے۔ وہ عوام کو حق اجتہاد قطعاً نہیں دیتے۔ مجتہدوں کے بھی انھوں نے مدارج مقرر کیے۔ اجتہاد کے لیے جو مناسب شرطیں درکار ہیں۔ وہ بیان کیں، لیکن وہ کہیں یہ نہیں کہتے کہ اب اجتہاد کی گنجائش نہیں رہی۔ بلکہ انھوں نے اس خیال کی جابجا تردید کی ہے۔ وہ آغاز کتاب ہی میں فرماتے ہیں:-

”پھر اب جو گمان کیا جاوے ایسے شخص عالم کے حق میں جو اکثر مسائل میں اپنا نام کے

عقد الجید کا ترجمہ مولانا حسن نانوتوی نے کیا ہے۔ ہمارے اقتباسات اسی سے ہیں۔

موافق ہو، لیکن اس کے ساتھ ہی ہر حکم کی دلیل چاہتا ہو کہ وہ مجتہد نہیں ہے تو یہ گمان اس شخص کے حق میں گمانِ فاسد ہے۔ اور اس طرح پر جو یہ گمان کرے کہ مجتہد اس زمانے میں نہیں پایا جاتا۔ بلحاظ اعتماد کرنے کے گمانِ اول پر تو یہ گمان بنا رہا فاسد بر فاسد ہے۔“

شاہ صاحب نے اس کتاب میں ارشاداتِ نبوی کی ایک نہایت اہم خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے ”اور جو کوئی شارع علیہ السلام کے حکموں اور فتوؤں کو خوب جستجو کرے گا تو اس کو ایک کلیہ قاعدہ مل جائے گا کہ شارع علیہ السلام نے نیکی کی سب اقسام کو طرح طرح سے ضبط فرمایا۔ پھر بھی ان ارکان وغیرہ کی تعریفوں میں جامع اور مانع سے بہت بحث نہیں کی۔“ چنانچہ کئی مثالیں دے کر جن میں رسول اکرم نے کڑی شرطیں نہیں لگائیں۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ ”تو ان امور کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے ایسی باتیں انہی لوگوں کی رائے پر حوالہ کر رکھی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر فتوؤں کا حال ایسا ہی ہے، جیسا کہ منصف عاقل پر پوشیدہ نہیں اور ہم نے آپ کے احکام کی تلاش سے یہ سمجھا کہ آپ نے نہ تو کی باتیں چھوڑنے اور اقسام ضبط کو زیادہ بیان نہ کرنے میں ایک بڑی مصلحت ملحوظ فرمائی ہے۔“ چنانچہ شاہ صاحب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو دھیان میں رکھ کے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جزئیات کے معاملے میں تشدد نہیں کرنا چاہیے۔ اور معمولی اختلافات سے شارع کا مقصود فوت نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔ ”تو جو کوئی اس مسئلے کی ماہیت بخوں کی قول جان لے گا۔ اس کو یہ امور معلوم ہو جائیں گے۔ اول یہ کہ اجتہاد کی اکثر صورتوں میں امر حق اختلاف کے دونوں جانب کے اندر دائر رہتا ہے۔ دوم یہ کہ دین کے معاملے میں وسعت ہے، تنگی نہیں۔ سوم یہ کہ ایک چیز پر جم جانا اور مخالفت کی نفی کا یقین کرنا کچھ بات نہیں۔“

فقہ کا ایک بڑا اختلافی مسئلہ تقلید اور عدم تقلید کا ہے۔ اس معاملے میں حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی، ہر چار مکاتب فکر کے متبعین معتقد یعنی تقلیدِ ائمہ کے قائل ہیں۔

اہل حدیث جماعت تقلید کی قائل نہیں۔ دوسرا مسئلہ لزوم مذہب معینہ کا ہے۔ یعنی آیا ایک مسلمان کو جو تقلید کا قائل ہے، فقہ کے چار مذاہب میں سے کسی ایک کی تقلید لازم ہے یا وہ مختلف معاملات میں مختلف مذاہب (شافعی، حنفی، مالکی، حنبلی) کی پیروی کر سکتا ہے۔ اس مسئلے پر علما میں بڑا اختلاف ہے۔ شاہ صاحب نے اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ چونکہ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی باریکی سے کیا ہے۔ اس لیے یہ رائے بہت واضح اور یک طرفہ نہیں رہی۔ لیکن ان کی تصانیف کے مطالعہ سے خیال ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ ایک عامی کے لیے ”لزوم مذہب معینہ“ کے قائل ہیں، لیکن علماء و مجتہدین کے لیے وہ ایسی پابندی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب کے صفحہ ۷۲ پر لکھتے ہیں ”اور علما کو درست ہے کہ ہمارے آئمہ میں سے ایک کا قول کسی مصلحت وقت پر عمل کرنے کی وجہ سے اختیار کریں۔“ اسی طرح انھوں نے کتاب کے اخیر میں لکھا ہے :-

”یعنی اگر انسان کسی مجتہد کے جس کو اجتہاد جائز ہو۔ ایسے قول کی جستجو کرے جو

اس کے نفس پر سہل ہو تو ہم کو معلوم نہیں کہ شرع نے اس عمل پر اس کی بُرائی کی تو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جو باتیں آپ کی امت پر سہولت کی ہوں

انہی کو دوست رکھتے تھے۔“

اس کے علاوہ حیاتِ ولی میں مولانا رحیم بخش لکھتے ہیں: ”آپ کو مذہبی تفریق کے

خانہ براندازہ جھگڑوں سے چنداں بحث نہ تھی۔ نہ اُن مشہور مذاہب اربعہ میں سے کسی خاص

مذہب کے پابند تھے کہ خواہ مخواہ اُسی کے مطابق عمل درآمد کریں۔“ چنانچہ اس مسئلے کے متعلق

خواجہ محمد امین کے سوال کے جواب میں جو کچھ آپ نے لکھا۔ اس سے آپ کا مسلک پوری

طرح واضح ہو جاتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں: ”سوال سوم آنکہ عمل تو در مسائل فقہیہ بکدام

مذہب است۔ غنیم بقدر امکان جمع مے کنم در مذاہب مشہور مثلاً صوم و صلاۃ و وضو

و غسل و حج بوضع واقعہ مے شود کہ ہمہ اہل مذاہب صحیح دانند و عند اخذ الجمع باقوی

مذاہب از روی دلیل و موافقت صریح حدیث عمل می نمایم۔“

شاہ ولی اللہ حامی کو مجتہدین کا مقلد رکھنے کے حق میں تھے اور ظاہر ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو جس ملک میں شرع رائج ہے۔ اس کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ غامی کی تقلید حقیقتاً قوانین رائج کی تعمیل ہے جو تمام مہذب ممالک پوری طرح کرواتے ہیں۔ لیکن شاہ صاحب تقلید کو حد سے زیادہ بڑھانے کے مخالف تھے۔ انھوں نے ایک باب تقلید میں اعتدال رکھنے کے بارے میں لکھا ہے اور تقلید کی ایک قسم لکھی ہے جسے قطعاً حرام قرار دیا ہے۔ یعنی تقلید کی وہ صورت جس میں دانستہ یا غیر دانستہ مقلد صریح احادیث پر بھی مغیبتوں اور فقیہوں کے اقوال کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں ”اور تقلید حرام کی یہ صورت ہے کہ کسی فقیہ کو گمان کرے کہ وہ علم میں نہایت کو پہنچ گیا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ وہ خطا کرے تو ایسے مقلد کو جب کوئی حدیث صحیح اور صحیح پہنچتی ہے کہ مخالف اس فقیہ کے قول کے ہو تو اس کے قول کو نہیں چھوڑتا۔“

تصوّف | تصوّف کا مسئلہ بڑا پیڑھا ہے۔ ایک تو اسے بعض ریاکاروں نے دنیا طلبی اور ابلہ فریبی کا ذریعہ بنا رکھا ہے، لیکن اگر انھیں یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے کہ ریاکار لوگ کس مشرب میں نہیں ہوتے؟ تب بھی اسلام کی تاریخ میں ایسے مخلص، نگر وادستہ مزاج کثرت سے ملیں گے جنھیں تصوّف نے رہبانیت شرع سے آزادی اور پریشان روی کا راستہ دکھایا۔ بلکہ ہوتا یہ رہا ہے کہ جس کثرت سے شرع کی قیدیں بڑھیں اور اصولی باتوں کو چھوڑ کر فقیہوں اور محدثوں نے روزمرہ کی معمولی اور بے ضرر باتوں میں بھی لوگوں کو اپنے خیالات اور اپنی کتابوں کے مطابق جکڑ بند کرنا چاہا۔ اسی قدر اہل تصوّف کی وارستگی بڑھ گئی۔

یہی وجہ تھی کہ بعض مذہبی حلقوں میں تصوّف کی مروجہ صورتیں شروع سے ہی مشتبہ تھیں۔ آج کچھ دہائی اثرات کچھ اقبال کی مخالفت اور بڑی حد تک مغربی مادیت کی فتح سے تصوّف اور بھی بدنام ہو گیا ہے اور مذہبی اعتراضات کے قطع نظر اسے بعض سہل انگار، قومی زوال کا بڑا سبب قرار دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تصوّف بالخصوص عجمی تصوّف نے بسا اوقات ان زمانوں میں فروغ پایا، جب دنیوی نقطہ نظر سے قوم روبرو وال

تھی۔ لیکن ان زمانوں میں تصوف کی مقبولیت قومی زوال اور دنیوی پریشاں حالی کا نتیجہ تھی۔ سبب نہ تھی اور ان دونوں کا باعث قوم اور افراد کی عسکری، اخلاقی اور علمی کمزوریاں تھیں۔

لیکن اگر تصوف میں کمی کوتاہیاں ہوں، تب بھی ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اسے جوڑے اکھیر پھینکنا آسان نہیں۔ ہمارا ادب، فلسفہ، مذہب، تصوف کی گود میں یرلا ہے اور اگر ہم تصوف کا قلع قمع کریں تو بہت سی قیمتی چیزیں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اور اس کے علاوہ تصوف کی اسلامی صورت یعنی احسان یا اخلاص فی العمل کی ضرورت قوم کو ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی۔ شاید بعض نوجوان خیال کرتے ہوں کہ غلام قادر روہیلہ کی خودی اور میر جعفر کی خود غرضی سے قوم کو فائدہ پہنچا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر ان بزرگوں پر تصوف اور مناسب نفی خودی (ایشار) کے چند پھینٹے پڑ جاتے تو غالباً ان کا عمل دگر ہوتا۔ تصوف کی ضرورت صرف خود پرستوں کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے نہیں۔ بلکہ جو لوگ قومی راہ میں انتہائی قربانی کرنا چاہتے ہیں، انھیں بھی یہ عمل مفید پڑتا ہے کہ وہ سیدھی سادی صوفیانہ ریاضتوں اور ذکر و شغل کی مدد سے جن کا شروع سے کوئی تضاد نہیں، بلکہ جو شرعی فرائض کی تکمیل کے بعد شروع ہوتے ہیں، اپنی روحانی اصلاح کریں اور شخصی ہوا و ہوس، حسد، غصہ، خواہش، انتقام اور ان علاقوں و نیوی کو جو ذاتی قربانیوں کی راہ میں حارج ہوتے ہیں، مٹا دیں اور اس طرح فرشتہ نش انسان بن کر اپنے تئیں بنی نوع آدم کے لیے وقف کریں۔

حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ ان روحانی ضرورتوں کی اہمیت سمجھتے ہوں گے اس کے علاوہ انھوں نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہاں تصوف سے لگاؤ ہو جانا لازمی تھا۔ ان کے والد اور چچا اہل طریقت تھے اور محاصرہ تذکروں (مثلاً روضۃ القیومیہ) میں ان کا ذکر مشائخ کے ضمن میں ہوا ہے۔ علما کے ضمن میں نہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب کو بھی تصوف سے گہری دلچسپی ہو گئی اور ان کی اصلاحی تحریک اور شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک میں ایک وجہ امتیازیہ تھی کہ اگرچہ یہ دونوں بزرگ دنیوی

کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں اور شاہ صاحب بھی تصوف کی اصلاح کے خواہاں ہیں، لیکن وہابی مصلحین کی طرح وہ اس کے مخالف نہیں۔

شاہ صاحب نے علم تصوف میں کئی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب لمعات ہے جس کا اردو ترجمہ نفحات کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ایک رسالہ وحدت الوجود و اشہود لکھا ہے جس میں شیخ اکبر کے نظریۂ وحدت الوجود کی تاویل کر کے اسے شیخ مجدد کے مطابق ثابت کیا ہے۔ القول الجلیل میں بیعت کے طریقہ اور فائدے کا دریہ، چشتیہ، نقشبندیہ سلسلوں کے اذکار اور صاحب بیعت کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ آخر میں دو نہایت دلچسپ اور کارآمد باب عالم ربانی کے خصائص اور آداب تذکیر و معظمت کے متعلق ہیں۔ القول الجلیل کا ترجمہ شفا العلیل کے نام سے شائع ہوا ہے۔ تفہیمات الہیہ جس کا کچھ حصہ عربی میں ہے اور کچھ فارسی میں، بیشتر تصوف کے مسائل سے متعلق ہے۔ ان کے علاوہ الطاف القدس، خیر کثیر وغیرہ میں علم تصوف کا بیان ہے۔ انفاس العارفین میں بھی تصوف کے بہت سے مسائل ضمناً آگئے ہیں۔

شاہ صاحب کو تصوف سے بڑی دلچسپی تھی، لیکن انھیں متصوفین کی قابل اعتراض باتوں کا پورا احساس تھا۔ ان کی تیسری وصیت ہے۔ ”وصیت دیگر آنست کہ دست و دست مشائخ این زمان کہ بالواع بدعت مبتلا هستند۔ ہرگز نباید داد و بیعت ایشان نباید کرد۔ و غلو عام مخور و نباید بود۔ و نہ بکرامات۔ زیرا کہ اکثر غلو عام بسبب رسم است و امور رسمیرا بحقیقت اعتبار سے نیست و کرامات فروشان این زمانہ ہمہ الا ماشاء اللہ طلسمات و نیزنگیات را کرامات دانستہ اند۔۔۔“

اس کے علاوہ شاہ صاحب نہ صرف مشائخ کے نقائص پر معترض تھے، بلکہ انتہائی

لے اس موضوع پر مولوی غلام محی نے کلمات الحق لکھی۔ جس کا جواب شاہ رفیع الدین صاحب نے دفع الباطل میں دیا۔ مولوی صاحب نے شاہ ولی اللہ سے اختلاف کیا تھا، لیکن ان کے مرشد مرزا مظہر جانجانا نے لکھا۔ (ترجمہ) ”لیکن مسئلہ تطبیق سے تعزین کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ توفیق بین المکشوفین اگرچہ تکلف سے خالی نہیں۔ لیکن اس میں ایک عمدہ مصلحت پائی جاتی ہے۔“

نفی خودی کے مخالف تھے اور اقبال کی طرح اسے ملت اسلامیہ کے لیے سخت مضر سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس مسئلے پر فریقین کے خیالات تفصیل سے لکھ کر آپ فرماتے ہیں۔
 ”بالجملہ اقراط ورمقدمات انسلاخ استہلاک و مشغول شدن ہر کس و ناکس باں و اعضاء (مرض شدید) است در ملت مصطفویہ خدا رحمت کنا و کسے را کہ سعی اعمال آنها کند۔“
 ہم شاہ عبدالرحیم کی نسبت لکھ چکے ہیں کہ وہ تصوف میں ہر سلسلے کے بزرگوں سے فیض حاصل کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ بھی اسی طریق کار پر عامل تھے۔ جس طرح آپ مذاہب اربعہ مشہورہ میں سے کسی خاص مذہب کے تقلد و پیرو نہ تھے۔ اسی طرح اہل سلوک کے طرق میں سے کسی ایک طریقہ کے پابند نہ تھے۔ بلکہ ہر مذہب و طریقہ میں جو بات کتاب و سنت کے زیادہ موافق اور انسان کی روحانی اور دنیوی فلاح کے لیے زیادہ مفید دیکھتے، اس کو اختیار کرتے۔

شاہ ولی اللہ کو (اپنے والد شاہ عبدالرحیم کی طرح) اصل تعلق خاطر سلسلہ باقریہ نقشبندیہ سے تھا۔ لیکن وہ دوسرے مشہور صوفی سلسلوں سے بھی متسلک تھے اور تذکروں میں لکھا ہے کہ آپ بیعت کے وقت چاروں خانوادوں (یعنی نقشبندیہ چشتیہ۔ سہروردیہ۔ قادریہ سلسلوں) کے بزرگوں کے نام لیتے۔ تاکہ سب فیض حاصل کر سکیں۔ ان سلسلوں میں شطاری سلسلہ نہ تھا، لیکن آپ کی اپنی تصانیف سے پتا چلتا ہے کہ آپ اس سلسلے کے بعض اشغال اپنے محترم استاد (شیخ ابوطاہر مدنی) اور لاہور کے ایک مشہور بزرگ حاجی محمد سعید لاہوری سے سیکھے تھے۔ شطاری طور طریقے بعض متقی بزرگوں پسند نہیں۔ مثلاً شیخ عبدالحق کے استاد شیخ عبدالوہاب متقی کو ان کے والد نے نصیحت کی کہ شیخ غوث گوالیاری شطاری کی صحبت سے دور رہنا۔ اس سلسلے میں شرع کی پابندی پر اتنا زور نہیں اور کہا جاتا ہے کہ شطاری اشغال میں ہندو لوگ کا اثر بھی

۱۔ حیات ولی ص ۲۷۲

۲۔ ایک زبردست عالم سیاح اور صاحب باطن بزرگ تھے۔ احمد شاہ ابدالی آپ کا بڑا مددگار تھا۔ بلکہ آپ کی درخواست پر اس نے اپنے قریبی محلے میں لاہور کی ٹوٹ مار بند کر دی۔ (تذکرۃ العلماء مشائخ از فوق کشمیری)

آگیا ہے، لیکن شاہ ولی اللہ اور ان کے اُستاد کے اس سلسلے سے انتساب نظر آتا ہے کہ اگرچہ ظاہر ہے کہ شطاری سلسلے کا عاظم طویر طریقہ انھوں نے نہ اختیار کیا اور شرع کی پوری پابندی کی، لیکن فیض کے معاملے میں وہ دونوں وسعت اور آزادی کی طرف مائل تھے۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب کی ابتدائی صوفیانہ تحریروں میں جو خارق عادت واقعات آجاتے ہیں اور بعض جگہ ایسی غیر معمولی فضا ہلتی ہے جو ان جیسے تیز بین اور ضاف میں بزرگ کی تصانیف میں عجیب معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے وہ شطاری نسبت کا نتیجہ ہو!

حجۃ اللہ البالغہ | شاہ صاحب کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور کتاب **حجۃ اللہ البالغہ** ہے۔ اس کے متعلق نواب صدیق حسنی صاحب مرحوم لکھتے ہیں:-

”اس کتاب اگرچہ در علم حدیث نیست اما احادیث بسیار در دل و دل و حکم اسرار بیان نمود تا آنکہ در فن خود مبسوط علیہ واقع شدہ و مثل آن دریں دوازده صد سال بجزی ایچ یکے از علمائے عرب و عجم تصنیفے موجود نیامدہ۔“
مولانا شبلیؒ اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

”حجۃ اللہ البالغہ جس میں انھوں (شاہ صاحب) نے شریعت کے حقائق و اسرار بیان کیے ہیں، در حقیقت علم کلام کی روح و رواں ہے۔ علم کلام در حقیقت اس کا نام ہے کہ مذہب اسلام کی نسبت ثابت کیا جائے کہ وہ منزل من اللہ ہے۔ مذہب دو چیزوں سے مرکب ہے۔ عقائد و احکام۔ شاہ صاحب کے زمانے تک جس قدر تصنیفات لکھی جا چکی تھیں، صرف پہلے حصے کے متعلق تھیں۔ دوسرے حصے کو کسی نے مس نہیں کیا تھا۔ شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس موضوع پر کتاب لکھی۔“

۱۔ اس کی عالمگیر شہرت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حکومت سوڈان نے اسے گارڈن کالج خرطوم کے نصاب میں داخل کیا اور سر شریعتہ تعلیم نے اس کے پڑھانے کی سفارش کی (الذودہ دسمبر ۱۹۰۷ء)۔

یہ کتاب جس کا اردو ترجمہ چھ سو بیس صفحات پر محیط ہے۔ شاہ صاحب نے اپنے ایک بزرگ بھائی اور گرامی دوست مولانا محمد عاشق کے ایما پر لکھی۔ کتاب کے شروع میں شاہ صاحب نے ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں کتاب کی غرض و غایت واضح کی ہے۔ آپ نے یہ کتاب اسرارِ علم دین کے متعلق لکھی۔ مقدمے میں بتایا ہے کہ محدثین کے مختلف طبقے اور علم حدیث کے مختلف پہلو کون سے ہیں۔ بعض علما ایسے ہیں جو احادیث کی صحت، ضعف، شہرت اور غرابت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دوسرے علما کی توجہ غریب احادیث کے معانی اور مشکل احادیث کی شرح پر ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ ایک گروہ فقہاء اور محدثین کا ہوا ہے جو احادیث کے شرعی معنی بیان کرتے ہیں اور ان سے فقہی احکام اخذ کرتے ہیں۔ اس طرح علم حدیث کی اور کئی قسمیں ہیں، لیکن شاہ صاحب کے نزدیک علوم حدیث میں سب سے زیادہ دقیق فن جس کی جڑ نہایت عمیق ہے اور جس کا معیار نہایت بلند ہے۔ اور جو ان کی نظر میں تمام علوم شرعیہ سے زیادہ بلند مرتبہ اور عالی قدر ہے، وہ اسرارِ دین کا علم ہے جس میں تمام احکام دین کی حکمت اور لم اور ایک ایک عمل کے راز اور نکات بیان کیے ہیں۔ ”حجۃ اللہ الباقیہ علم اسرارِ دین کی کتاب ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مذہب اسلام کے جو عقاید یا احکام ہیں۔ ان میں کیا کیا مصلحتیں ہیں۔ شاہ صاحب خود اسی سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:-

”بعض لوگ خیال کیا کرتے ہیں کہ شریعت کے احکام میں کوئی مصلحت نہیں ہو سکتی اور اعمال اور ان کی جزا میں جو منجانب اللہ مقرر ہے کوئی مناسبت نہیں ہے اور احکام شریعت تکلیف کرنا بعینہ ایسا ہے جیسے کوئی آقا اپنے ملازم کی فرمانبرداری کی آزمائش کرنے کو کسی پتھر کے اٹھانے یا کسی درخت کے چھوٹنے کا حکم دے۔ جس میں بجز آزمائش کے اور کوئی فائدہ نہیں۔ پس اگر اس کی اطاعت کرے جزا پاوے اور سرکشی کرے تو سزا دی جائے۔“ یہ گمان بالکل فاسد ہے۔ حدیث اور ان زمانوں کے اجماع جن کی خوبی اور برکت پر خود شرع نے شہادت دی ہے۔ اس خیال کی تکذیب کرتے ہیں۔“

۱۔ حال میں ایک توضیحی ترجمہ شائع ہوا ہے۔ اس کے پندرہ سو صفحے ہیں۔

اس کے بعد تفصیل سے ارکان اسلام مثلاً نماز، حج، زکوٰۃ اور روزہ کی مصلحتیں بیان کی ہیں۔ شاہ صاحب نے کتاب کے دو حصے کیے ہیں۔ پہلا حصہ جو اردو ترجمے میں مقدمہ کے بعد ۲۴۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان عام اصولوں اور کلیہ قاعدوں کے متعلق ہے۔ جن پر شریعتوں اور مذہبوں کی مصلحتوں کا مدار ہے۔

سلا دوسرے حصے میں پہلے حصے کے قاعدوں اور اصولوں کی کسوٹی پر مذہب اسلام کے مختلف فروعی احکام کو پرکھا ہے۔ ایک تو احادیث کے مطابق ان احکام کی توضیح کی ہے۔ دوسرے ان احکام کی مصلحتیں بیان کی ہیں۔ اس حصے میں طہارت، عبادت اور اور ارکان اسلامی کے علاوہ ذیل کے مسئلوں پر روشنی ڈالی گئی ہے:-

(۱) ابواب احسان (۲) ابواب معاملات (۳) ابواب تربیت منزل (۴) ابواب سیاست مدن (۵) ابواب معیشت (۶) چند ابواب مختلف۔

شائع نے شریعت اسلام کو مرتب کرتے وقت جن مقاصد کو پیش نظر رکھا۔ وہ شاہ صاحب کے نزدیک تین ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:-

”جن مصلحت پر شارع نے مستند کیا ہے اور جن خرابی سے باز رکھا ہے۔

اس کی انتہا تین اصولوں میں سے ایک نہ ایک پر ہوتی ہے:-

(۱) ان چار اوصاف میں سے جو مواد میں مفید ہیں یا ان تمام مصلحتوں میں سے جو دنیا

میں سود مند ہیں کوئی نہ کوئی وصف نفس میں پیدا لکھنا اور ان کو شائستہ اور مذہب

بنانا ہے (۲) کلمہ الہی اور سچے مذہب کو غالب کرنا۔ شرائع کو خوب مستحکم کرنا

ان کی اشاعت میں کوشش کرنا ہوتا ہے (۳) عامہ خلافت کی حالت کو منظم کرنا

ان کے امور نافع اور تدابیر مفیدہ کی درستی کرنا اور ان کی رسموں کو مذہب و رت میں لانا۔

حجۃ اللہ بالآخر کی اہمیت کا صحیح اندازہ اس کے مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے، لیکن

مندرجہ بالا اقتباسات سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ شاہ صاحب کا نقطہ نظر عقل اور

سمجھ کے کس قدر قریب تھا۔ ان کی ساری کتاب کی غرض و غایت ہی اس خیال کی تائید

تھی کہ جو لوگ دُرُودِ صبح کا احکام شرعی کی تعمیل کراتے ہیں، وہ دین کو صحیح طور پر نہیں

سمجھتے۔ اسلام کے تمام احکام کسی نہ کسی دنیوی یا روحانی مصلحت پر مبنی ہیں۔
چونکہ ان مصلحتوں کی توضیح ہی اسلام کی حقانیت اور صداقت کے حق میں بہترین دلیل
و حجت ہے۔ اس لیے اس کتاب کا نام انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ رکھا۔

شاہ صاحب کی کتاب پر تبصرہ ختم کرنے سے پہلے ہم ضمناً ایک مسئلے کی طرف
توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ بعض حلقوں میں کہا جاتا ہے کہ زمانہ روز بروز خراب آ رہا ہے
اور ماضی کی نسبت حال اور مستقبل دونوں زمانے بُرے ہیں۔ یہ نقطہ نظر جس نے
قوم میں ایک بے ہمتی اور مایوسی پیدا کر رکھی ہے۔ فی الحقیقت مواعید قرآنی اور
ارشادات نبوی کے صریحاً خلاف ہے اور اسے وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو ماضی
کی ہر ایک بات کو خوش اعتقادی کی عینک سے اور حال کی ہر ایک چیز کو شک اور
وہم اور خوف کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب ازمنہ ماضیہ کی خوبیاں
اور خامیوں سے پوری طرح واقف تھے اور سنت الہیہ پر بھی ان کی پوری نظر تھی۔
انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ کے اخیر میں عہد سعادت کی اہمیت اور خوبیوں کا ذکر کرتے
ہوئے عام نقطہ نظر کی پوری طرح تردید کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سؤل اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کی چند اہم احادیث نقل کی ہیں۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
ہے:۔ (ترجمہ) کہ میری امت کی صفت بارش کی سی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ پہلا
میعنہ اچھا ہے یا اخیر کا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ (ترجمہ) تم
میرے صحابہ ہو اور میرے بھائی وہ ہیں جو میرے بعد آئیں گے۔ اس کی وجہ یہی
ہے کہ مختلف اعتبارات اور مختلف وجہیں ہر زمانے میں موجود ہوا کرتی ہیں۔

اس کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں ”اور یہ بھی ممکن نہیں کہ عہدہ اور بزرگ
زمانے کے ہر شخص کو دوسرے مفضول زمانے پر فوقیت اور فضیلت ہو۔ یہ کیسے
ہو سکتا ہے؟ جو قرون بالاتفاق عمدہ اور بزرگ تھے۔ ان میں بعض لوگ فاسق اور
منافق بھی تھے۔ انہی زمانوں میں حجاج، یزید بن معاویہ مختار ہیں۔“

دیگر تصانیف | شاہ صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن کتابوں کا

ہم ذکر کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی کئی اور کتابیں ملتی ہیں۔ ان میں ایک کتاب البحر العظیم آپ کی نہایت مختصر سوانح عمری ہے جس کا ترجمہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جنرل بابت ۱۹۱۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے حالات میں ایک رسالہ لکھا ہے انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ جو اردو ترجمے کے ساتھ شائع ہو چکی ہے تصوف کے متعلق ہے۔ اسی طرح ایک کتاب قصص الانبیاء جس کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ آپ سے منسوب کی جاتی ہے۔ آپ کے ایک سوانح نگار نے آپ کی سینتیس تصنیفات کے نام لکھے ہیں۔ جن میں سے اکثر شائع ہو چکی ہیں۔ اگرچہ بہت سی اب کیاب ہیں۔ آپ کی ایک نہایت دلچسپ کتاب المقدمة السنیہ ہے جس میں حضرت مجدد الف ثانی کے ایک کمیاب فارسی رسالے کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کی سوانح عمری لکھی ہے اور انھوں نے شریعت اور تصوف کی تطبیق کی جو کوشش کی تھی اس کا حال لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اکبری دور کے عقائد کا ذکر کر کے اس زمانے کے الحاد پر نکتہ چینی کی ہے۔ اگرچہ مذہبی نقطہ نظر سے شاہ صاحب اس زمانے کے خیالات کو ناپسند کرتے تھے، لیکن وہ اس بات کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں کہ اس زمانے میں علماء و صلحا کی کوئی کمی نہ تھی۔ چنانچہ ان کی فہرست بھی دی ہے۔

اصلاح معاشرت | اس کتاب کی گنجائش کے مطابق ہم نے شاہ صاحب کی تصانیف کا ذکر تفصیل سے کر دیا ہے، لیکن وہ

اس زمانے کے باقی علماء کی طرح فقط کتابیں پڑھنا اور پڑھانا ہی اپنا فرض نہ سمجھتے تھے۔ قوم کی معاشرتی بیماریوں پر بھی آپ کی نظر تھی اور اپنی تصنیفات میں انھوں نے ان خرابیوں کو جا بجا بے نقاب کیا۔ اس موضوع پر ان کا بہترین اظہار خیال تفہیمات الہیہ کے ایک باب میں ہے جو سارے کا سارا پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، لیکن آپ کے مختصر وصیت نامے سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرتی اصلاح کا جو درخت مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید کے ہاتھوں پھلا پھولا اس کا بیج آپ ہی نے بویا تھا۔ وصیت نامہ میں آپ نے ہدایت کی ہے۔ بقدر امکان عادات و رسوم عرب اول کہ منشار آنحضرت

است صلی اللہ علیہ وسلم از دست ندیمیم۔ و رسم عجم و عادات ہنود را از درمیان خود نگزایم۔
 اس کے بعد حضرت عمرؓ کے ان احکام کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے عربوں کو عجمی عیش و عشرت
 سے بچانے کے لیے نافذ کیے تھے۔ ”یعنی چوں عرب ہمارے جہاد باطراف عجم منتشر شدہ۔
 حضرت عمر رضی اللہ عنہ ترسیدند کہ رسم عجم را اختیار کنند و رسم عرب را ترک نمایند پس
 بدیشیاں نامہ نوشتند کہ از اربندید و چادر پوشید و نعل پوشید و بزارید و موزہا و بزارید و شلوار را
 و لازم گیرید لباس پدر خود اسمعیل را و خود را دور وارید از تنعم و مہیت عجم و لازم گیرید
 نشستن در آفتاب۔ ہر آئینہ آفتاب حمام عرب است و برسم قوم محد باشند و
 درشت لباس باشند و سخت گزراں باشند و کمر پوشی نیکند۔“

اس کے بعد ان معاشرتی خرابیوں کا ذکر کیا ہے جو ہندوؤں کی وجہ سے مسلمانوں
 آگئی ہیں اور جن کی اصلاح کو شمش آج ہندو قوم خود کر رہی ہے۔ سب سے پہلے نکاح بیوگان
 کا ذکر کیا ہے۔

(۱) ”کیے از عادت شنیعہ ہنود آنست کہ چوں شوہر زنی بمیرد۔ نگذارند کہ آن زن شہر
 دیگر کند و اس عادت اصلاً در عرب نبود۔“ اس کی مذمت کی ہے۔ اور کہا ہے کہ خدائے
 تعالیٰ رحمت کناد برآں کس کہ اس عادت شنیعہ را متلاشی (برطوت) سازد۔
 (۲) دوسری بُری رسم بڑے بڑے مہربان دھنا ہے جو سنت نبوی کے خلاف اور
 خانہ بربادیوں کا سبب ہے۔

(۳) تیسری عادت شنیعہ خوشی غمی کے موقع پر اسراف کی ہے۔ جن کی وجہ سے
 قوم غریب ہو رہی ہے (دیگر از عادات شنیعہ ما مردم اسراف است در ماتمہا و رسوم
 چلم و ششماہی و فاتحہ سالینہ و اس ہمہ را در عرب اول وجود نبود)۔
 یہی چار بڑی خرابیاں ہیں۔ جن کی اصلاح کے لیے مولانا سید احمد بریلوی اور
 مولانا اسمعیل شہید کو کوشش کرنی پڑی۔ اور جن کی اصلاح آج بھی مختلف صورتوں میں
 قوم کے لیے ضروری ہے۔ شاہ ولی اللہ کی سمجھ اور قابلیت قابلِ داد ہے کہ انھوں نے
 سات صفحے کے ایک مختصر سے وصیت نامے میں اپنے تجربے کا پتھر دے دیا۔ قوم

کے فائدے کی تمام اہم باتوں کا ذکر کر دیا اور ان ضروری معاشرتی اصلاحوں پر نظر کر کے جن کی طرف نہ قاضی کی نظر جاتی تھی نہ فقیر کی وہ بھیج بوردیا جسے شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسماعیل شہید کے زمانے میں پھولنا پھلنا تھا۔

اشعار اور مکاتیب | شاہ ولی اللہ صاحب کی زندگی اور تصانیف کے مختلف پہلوؤں پر ہم نے تبصرہ کر دیا ہے، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ شاہ صاحب شاعر بھی تھے اور فارسی غزلوں اور رباعیوں کا ایک محقول ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ آپ امین تخلص کیا کرتے تھے۔ آپ کی اکثر غزلوں اور رباعیوں میں تصوف اور معرفت کے مضامین ادا ہوئے ہیں، لیکن اشعار میں رسمی عاشقانہ خیالات بھی ہیں۔ ہم آپ کے کلام میں سے دو فارسی رباعیات اور ایک فارسی غزل کے چند اشعار کا انتخاب تبرکاً درج کرتے ہیں۔

رباعیات

علی کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃ نبی است واللہ کہ سیرابی ازاں تشنہ لبی است
جائے کہ بود جلوہ حق حاکم وقت تابع شدن حکم خرد بوالہبی است

قوم بکتابتِ احواف موصوف جمعے بتلاوتِ اسماء محروف
شخصے کہ ازین قوم قدم بیش نہاد گشت است باین صورت فہمی مشغوف

ابیات

تا بکے محنتِ مجوری و دوری بکشم تا زین و طعمِ سوئے وطن باز دروم
تا بکے ہمدی سنگ بود شیوہ من گوہرے از عدم سوئے عدل باز دروم
تا بکے بستہ زنجیر تعلق باشم آہوئے از ختم سوئے مفتح باز دروم
بوئے جلال میرسد از باو مین در و جلی شاہ ملکیت مینم سوئے مین باز دروم
شاہ صاحب نے مستقل تصانیف کے علاوہ عربی اور فارسی خطوط کا ایک محقول ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔ بعض خطوط ذاتی اور نجی ہیں۔

لیکن کئی خطوں میں مختلف علمی مسائل کی توضیح ہے۔ ان خطوط میں بھی شاہ صاحب کی علمی وسعت مجتہدانہ نظر اور انصاف پسندی پوری طرح نمایاں ہے۔ ایک عربی خط کا ترجمہ ہم نمونے کے طور پر درج کرتے ہیں جسے انھوں نے بعض دوستوں کے نام لکھا۔ فرماتے ہیں:-

”زمانے کا رنگ بالکل بدل گیا ہے اور مذہب کا چشمہ نہایت مکدر ہو گیا ہے اور ہر پوشش جو مسلمانوں کو ظاہر آدنی دے رہی ہے حقیقت میں اسلامی نہیں ہے۔۔۔ تم پانچ طرح کے لوگوں سے اپنے تئیں بچاؤ جو حقیقت میں انہیں کے منزلہ میں ہیں۔ ایک۔ بے حیاصوفی سے جو رفع تکلیف کے لیے حیلہ کرتا ہے اور اپنے مجازی امور میں توقف نہیں کرتا۔

دوسرا۔ جھگڑا و معقولی جو شکوک و اوہام کے فتنے پھیلاتا ہے۔ اور خدا کا منقاد و مطیع نہیں ہوتا۔

تیسرا۔ شیخی خور فقیہ جو مردہ اقوال پر خوش ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لیے جن باتوں کی توضیح کی ہے ان کی پیروی نہیں کرتا۔

چوتھا۔ خشک زاہد جو دین میں اس درجہ سختی اور تشدد کرتا ہے کہ گویا اسے کسی بارے میں اجازت ہی حاصل نہیں۔

پانچواں۔ سرکش مالدار جو تکلف اور بناوٹ کے ساتھ عجمیوں کی ہیبت اختیار کرتا اور ان کے ہم نوالہ وہم پیالہ ہونے کو دوست رکھتا ہے۔ والسلام“

حکیم الامت کون ہے؟

اسلامی ہندوستان کی مذہبی زندگی میں شاہ ولی اللہ کی عظمت اور اہمیت زیادہ تر تو ان کی علمی اور دینی خدمات کی وجہ سے ہے لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ علما یا متصوفین کے کسی خاص گروہ کی ترجیحی نہیں کرتے بلکہ اپنے وسیع علم اور تیز قوت اور آگ کی مدد سے مختلف فریقین کے نقطہ نظر کو سمجھ کر ان کو باہم تطبیق دیتے ہیں اور

ہندوستان میں اشاعت اسلام کے حالات کچھ ایسے تھے کہ یہاں اس کی بڑی ضرورت ہے۔
 شیعہ سُنی خیالات کی تطبیق :- ہندوستان کے مسلمان بیشتر سُنی ہیں، لیکن ان پر شیعہ
 اثرات بھی کثرت سے کار فرما رہے۔ اسلامی ہندوستان کی دفتری اور ادبی زبان فارسی رہی
 ہے اور ایران میں شیعہ مذہب اختیار ہونے کے بعد وہاں سے متعدد شیعہ علما، شعرا،
 فلسفی ہندوستان آتے رہے اور بعد میں خود ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ جن کا اثر
 ان کی تعداد کے تناسب سے بہت زیادہ ہے۔ اب اگر شیعہ سُنی مسئلے میں کوئی عالم اسی
 طرح غلو کرے۔ جس طرح نجد یا اوراء النہر میں کیا جاتا ہے۔ اور دوسرے فرقہ کا نقطہ نظر
 سمجھے بغیر ایک فرقہ کے خیالات پر شدت سے مصر ہو تو وہ قوم میں اختلافات بڑھائے
 گا اور ہندوستان میں اسلام کی نشوونما تاریخی اتفاقات کی وجہ سے جن اصولوں پر ہوئی
 ہے، ان کے سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ خوش قسمتی سے شاہ ولی اللہ نے اس معاملے میں
 ایک احسن طریق عمل اختیار کیا، جو دونوں طبقوں کے نقطہ نظر اور اس بحث پر تمام
 تاریخی مواد اور نبوی احکام مطالعہ کرنے کے بعد مدقن ہوا ہے اور جس کو خواہ دونوں
 فرقوں کے غالی طرفدار پسند نہ کریں، لیکن اہل انصاف اس کی ضرورت قدر کرتے ہیں۔
 شاہ ولی اللہ نے ان مسائل پر جن کی وجہ سے شیعہ سُنی اختلافات پیدا ہوئے،
 کئی سیر حاصل کتابیں لکھیں۔ ازالۃ الخفا میں انھوں نے بالتفصیل مختلف خلفاء کے
 خصائل اور ان کے حق خلافت پر تبصرہ کیا اور اپنی رائے یہ ظاہر کی کہ رسول کریم کے
 قطعی اشاروں کے مطابق خلفاء کی ترتیب وہی ہونی چاہیے تھی جو فی الواقع ہوئی۔
 لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فضائل گننے میں آپ کسی شیعہ سے پیچھے نہیں رہے
 بلکہ فیوض الحرمین میں کہتے ہیں (ترجمہ) ”میری طبیعت اور میرے فکر کو جب اپنے حال پر
 چھوڑ دیا جائے تو دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فضیلت دیں اور دونوں کو حضرت
 شریف محبت ہے۔“ اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ تفصیل شیخین (یعنی حضرت
 ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ فاروق کی خلافت کے معاملے میں اولیت) کا عقیدہ ”ایک ایسی چیز
 ہے کہ میرے ذاتی میلانات کے خلاف مجھے اس کے ماننے کا حکم ہوا۔ افسوس ہے کہ

مجھ میں اس طرح کی متناقض اور متضاد باتیں ہیں، لیکن مجھ میں جو شدید جامعیت (یعنی تمام باتوں کو دھیان میں رکھنے کی خاصیت) ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔

”جامعیت“ کے علاوہ شاہ صاحب کے معتدلانہ نقطہ نظر کا باعث ان کا متوازن دل و دماغ ہے، جس کی وجہ سے قوم کے ذہنی نظام میں انھیں مرکزی حاصل ہے۔ اس معاملے میں جس دوسرے بزرگ کا نام لیا جاسکتا ہے، وہ سرکارِ سرمد حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ ہیں۔ جن کے احسانات سے اسلامی ہندوستان کبھی عمدہ برا نہیں ہو سکتا۔ اور جن کا مرتبہ کسی اہم امور میں شاہ صاحب کے بہت بلند تھا، لیکن وقت و وقت کے تقاضے ہوتے ہیں۔ ایک نے کشتِ ملت کو دشمنوں کے تغلب سے بچایا۔ دینی اور ملی تحفظ کے لیے تیغ و تفنگ کا کام دیا۔ دوسرے نے کشتِ ملت میں ہل چلایا اور تخمِ ریزی کی۔ دونوں کے حالات اور مزاج مختلف تھے۔ اس لیے ان کے طریق کار اور انداز خیال میں بھی فرق تھا۔ حضرت مجدد کی امتیازی خصوصیت ان کی ”رگِ فاروقیم“ یعنی شدید اسلامی احساس ہے۔ وہ بار بار اپنے مکتوبات میں اس ترکیب کو دہراتے ہیں۔ سامانہ کے خطیب نے خلفائے راشدین کا نام خطبہ میں نہ لیا تو حضرت کی رگِ فاروقی حرکت میں آئی اور انھوں نے اکابرِ شہر کو لکھا کہ آپ لوگ کیوں اس خطیب کے ساتھ ”شدت و غلظت“ کے ساتھ پیش نہ آئے۔ اس طرح کے اور موقعے کئی تھے۔ یہ رگِ فاروقی ایک بڑی خوبی ہے اور جس وقت فی الحقیقت اسلام خطرے میں ہو، اس سے بڑھ کر کوئی خوبی نہیں۔ جب حضرت مجدد الف ثانیؒ کے زمانے میں ہندو اجماعیت نے اسلام کے لیے زبردست خطرہ پیدا کر دیا تو انھوں نے اس کا ترکیبی جواب دے کر اور اجماعیت اسلام کی تحریک چلا کر برصغیر میں اسلام کو ایک نئی زندگی تو انائی دی۔ لیکن شدتِ احساس میں واقعات کو صاف اور ان کی صحیح صورت میں دیکھنا مشکل ہوتا ہے اور غیر معمولی حالات میں جو طریق کار ضروری ہو، عام حالات میں اس پر عمل پیرا ہونے سے بسا اوقات دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً شیعوں کی نسبت حضرت مجددؒ کی رائے (علمائے ماوراءالنہر کی طرح)

انتہا پسندانہ تھی۔ وہ انھیں کافر سمجھتے تھے اور ان کے صاحبزادے خواجہ محمد مصحوم نے تو
اورنگ زیب کے نام ایک خط میں شیعوں کو واجب القتل ٹھہرایا ہے!

حضرت مجدد الف ثانی کے علم و عرفان، خلوص و جرأت اور عظیم احسانات میں شک
نہیں۔ جن حالات سے انھیں سابقہ پڑا۔ انھیں دھیان میں رکھتے ہوئے ان کا نقطہ نظر
آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کئی اہم باتوں میں اسے قومی پالیسی کی
اساس نہیں بنایا جاسکتا اور اگر آج شیعوں کو کافر اور گردن زدنی قرار دیا جائے تو پتا نہیں
قوم کو کتنے ممتاز اہل قلم، خادمانِ قوم اور قائدانِ اعظم سے ہاتھ دھونا پڑے!!

شاہ صاحب کی سب سے نمایاں خوبی ”عدل“ و اعتدال ہے، جو کوئی ان کے فلسفہ
اور رجحانات پر تبصرہ کرتا ہے۔ اسے ”متوازن دل و دماغ“ ”معتدل مزاج“ ”ہمگیر
فطرت“ ”جامعیت“ ”توازنِ صادق“ ”اعتدالِ صحیح“ یا اس طرح کے الفاظ استعمال
کرنے پڑتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت ہر امر میں طبعی توازن (Balance) برقرار رکھنے کی ضرورت

۱۔ رسالہ رد وائل میں حضرت مجدد نے بھی یہی نقطہ نظر اختیار کیا ہے اور علمائے ماوراء النہر کے خیالی
ملکہ ملک نقطہ نظر کے خلاف علمائے مشہد نے جو کچھ لکھا تھا اس کی بالوضاحت تردید کی ہے۔
۲۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کو اس بات کا بڑا احساس تھا کہ حالات کے مطابق طریق کار
بدل جاتا ہے۔ اور انھوں نے بار بار اس کا اظہار اپنے مکتوبات میں کیا۔ دفتر اول کے مکتوب ۱۲ میں
فرماتے ہیں: ”ہر چیزِ رامو کے خاص و وقت کہ آں چیز درں موسم موزوں و زیبا ہے باشد۔ و بموسم
دیگر قبیح و صاحبِ بنیش کے رابر و گیسے قیاس نئے کند۔“ اسی طرح دفتر دوم کے ایک مکتوب میں
ہے: ”اس وقت متقدمین اور متاخرین کا فتوے جاری نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہر وقت کے احکام
جدا ہیں۔“ (۱۲) اس بنیادی نکتہ کو ان کے سلسلے کے قدیمی بزرگ خوب سمجھتے تھے۔ اور یار
محض آغا قی نہیں۔ کہ جب ہندو اچاریت اور اکبر کی ذہنی مطلق العنانی ختم ہو گئی تو ہندوؤں کے
ساتھ مصالحت سے رہنمائی کے واضح طریق کار مرزا مظہر جانجانا نے بتایا۔

خوب سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس صفت کو عدل یا عدالت کا نام دیا ہے اور حجۃ اللہ البالغہ ہمعات اور دوسری تصانیف میں اس پر بڑا زور دیا ہے۔ اجتماعی نظام برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے اسے ”اصل“ یا ”معیار“ مانا ہے اور اس کی بہت سی شاخیں گنائی ہیں۔ ہمعات میں اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

”خصالت چارم عدالت است و آن خصالت ہست کہ صدور اقامت نظام عادل و سیاست کلی ازو سے باشد۔ و وے را شعب بسیار است۔ مثل ادب و کفایت و حریت و سیاست مدنیہ و حسن معاشرت و بالجملہ اس ہمہ یک اصل دارند۔

ایک اور جگہ اس کی توضیح کی ہے (ترجمہ)

عدالت ہی ایک ایسی اساس ہے کہ جب انسانی اطوار زندگی مثلاً نشست و برخاست، خواب و بیداری، رفتار و گفتار و شکل و لباس وغیرہ میں اس کا لحاظ کیا جائے تو اس کو آداب کہتے ہیں اور جب مالی حیثیت یعنی جمع خرچ سے متعلق امور میں اس کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کا نام کفایت ہے اور اگر تدبیر منزل میں اس کا صحیح استعمال کیا جائے تو وہ آزادی کہلاتی ہے اور اگر تدبیر مملکت میں اس کو بنیاد بنایا جائے تو اس کو سیاست کہتے ہیں اور اگر اس کو باہمی اخوت و محبت اور تعلقات میں اساس بنایا جائے تو اس عدل کو حسن معاشرت کا نام دیا جاتا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ ص ۲۹)

شیعہ سنی مسئلے پر اہل سنت کے نقطہ نظر کی وضاحت اور تائید کے لیے شاہ صاحب نے بہت کچھ لکھا، لیکن اس معاملے میں بھی ان کی رائے اس طرح انتہا پسندی سے دور تھی کہ جب ایک انتہا پسند سنی نے آپ سے پوچھا کہ کیا شیعوں کو کافر سمجھا جائے تو آپ نے یہ نہ مانا اور کہا کہ اس معاملے میں حنفی علما میں اختلاف ہے۔ وہ برہم ہو گیا اور کہنے لگا کہ یہ تو شیعہ ہے! یہ روایت خود شاہ عبدالعزیز کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ”شخصے از والد ماجد مسئلہ تکفیر شیعہ پر سید۔ آنحضرت اختلاف حنفیہ کہ وہیں باب است بیان کردند و چون مکرر پرسید، ہماں شنید۔ شنیدم کہ مے گفت شیعہ است۔“ یہ واقعہ تو شاہ ولی اللہ کے ساتھ ہوا۔ شاہ عبدالعزیز نے دوسری باتوں کی طرح اس معاملے میں بھی اپنے والد کی پیروی

کی تھی۔ ان کے ساتھ بھی اس طرح کا واقعہ ہوا۔ ان کا ایک پٹھان شاگرد تھا۔ حافظ اقلاب نام۔ ہمیشہ حاضر درس ہوتا تھا۔ ایک دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ذکر ہو رہا تھا اور شاہ صاحب نے ان کے ”بجان و دل فضائل و مناقب بیان“ کیے تو وہ اتنا بگڑا کہ شاہ صاحب کو شیعہ سمجھا۔ اور ان کے درس میں شریک ہونا بند کر دیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی اس مسئلے پر شاہ صاحب کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”ہندوستان میں پہلے تو لاتی سستی۔ پھر ایرانی شیعہ اور آخر میں متشد و سستی زروہیوں کی شکل میں داخل ہوئے۔ ان تینوں عناصر کے امتزاج سے تہذیب و تشیع کے سلسلے میں بھی بڑا کام کیا۔ بڑی محنت سے ہزار ہا ہزار صفحات کو پڑھ کر آپ نے چاروں خلفاء کے واقعی حالات از رائے الخلفاء میں ایسے دل نشین طریقے سے مرتب فرمائے کہ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد اگر شیعوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے تو اسی کے ساتھ ان غالی سنیوں کی تشدد و تیزی میں بھی کمی پیدا ہوتی ہے، جو محض اس لیے کہ شاہ عبدالحزیز نے تنہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مناقب کیوں بیان کیے۔ یا شاہ ولی اللہ نے شیعوں کی تکفیر میں فقہا حنفیہ کے اختلاف کو کیوں بیان کیا۔ ان پر بھی شیعیت کا فتوے صادر کر دیتے ہیں اور اس لیے بجائے مناظرے اور مجادلے کے شاہ صاحب نے ایک ایسی راہ دریافت فرمائی۔ جس سے بہت سے فتنوں کا سد باب ہو گیا۔“

شرعیات اور طریقت۔ اسی طرح صوفی اور فقہ یا صوفی اور ملا کے اختلاف کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں کچھ تو مقامی اثرات سے اور کچھ اس وجہ سے کہ ہندوستان میں اسلام صوفیہ کے ذریعے اشاعت پذیر ہوا۔ اور شاید اس لیے بھی کہ سوہن سے نئے ملا اسلام کے اس قدر ظاہری پہلوؤں پر زور دیتے ہیں کہ اصلاح باطن کے لیے بلکہ مذہب حق سے کوئی فیض حاصل کرنے کے لیے تصوف کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ ہندوستان میں تصوف نے بڑا فروغ حاصل کیا، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض صوفیہ کی اسلامی احکام کی پابندی نہیں کرتے یا جیسا کہ خوشامدل شیعہ

یا اب اقبال نے بتایا ہے۔ اصفوی باتوں (مثلاً مسئلہ استہلاک یا فنا) میں کبھی کبھی اتنا غلو کرتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر یا قومی اور انفرادی فلاح کے اصولوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے تصوف اور فقہ کے درمیان اختلاف کا دروازہ کھلا جو اس وقت شروع ہوا۔ جب حضرت خواجہ محمد حسین الدین چشتیؒ کے نائب ہلی خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور شہر ہلی کے قاضی میں اختلاف بلکہ مخالفت کی نوبت آئی اور اس وقت سے آج تک جاری ہے۔ آج تصوف کے انحطاط اور بعض وقتی اثرات سے تصوف کا پانسہ بہت ہلکا ہو گیا ہے۔ لیکن پچھلی صدی تک کسی ہندوستانی مسلمان کو یہ خیال بھی نہ آسکتا تھا کہ کسی صوفی سلسلے میں منسلک ہوئے سوا اور کسی مُرشدِ کامل کے بغیر اسلام کی روحانی زندگی سے کوئی حصہ لیا جاسکتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے زمانے میں تصوف زوروں پر تھا۔ ضرورت تھی کہ اس کی اصلاح کی جائے اور اس کے ان اجزاء کو جو شرع اور فقہ کے خلاف ہیں علیحدہ کیا جائے تاکہ عوام و خواص کی روحانی اصلاح کے سلسلے بھی منقطع نہ ہوں اور شرع کی مخالفت بھی جاتی رہے۔ شاہ ولی اللہ اس کام کے لیے بے حد موزوں تھے۔ وہ اسلامی فقہ کی تاریخ سے پوری طرح باخبر اور فقہ کے زبردست عالم تھے۔ اس کے علاوہ وہ باقاعدہ صوفی تھے۔ انھوں نے بیعت کر رکھی تھی اور خود اپنے صوفیانہ مشاہدات اور واقعات کا حال انھوں نے اس طرح لکھا ہے کہ محدود روحانی تجربے والوں کو ان کا یقین بھی نہیں آسکتا۔ انھوں نے اپنے اس علم اور اپنے ذاتی تجربات کو تصوف اور فقہ کے اختلاف مٹانے کے لیے استعمال کیا۔ ان سے پہلے ان کے والد اور ان کے چچا کا بھی یہی طریقہ تھا۔ مولانا عبد اللہ سندھی ان دونوں بزرگوں کی نسبت لکھتے ہیں: ”ہر دو بھائیوں کے نظریوں کا ماحصل ایک ایسی شاہراہ بنائے گی جس پر مسلمان فلاسفر (صوفیہ اور متکلمین) اور فقہا ساتھ ساتھ چل سکیں۔“ ان کو ششوں کو شاہ ولی اللہ نے وسعت دی اور تصوف کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھیں۔ جن کے متعلق مولانا مناظر احسن گیلانی کہتے ہیں: ”ان کتابوں سے ملا اور صوفی کے جھگڑوں کا بشرطیکہ انصاف سے کام لیا جائے خاتمہ ہو جاتا ہے۔“ شاہ

ولی اللہ نے تصوف کے مسائل کو خالص اسلامی تعبیر میں پیش کر کے مولویوں کی اس بھڑک کو مٹا دیا ہے جو ان بے چاروں میں صوفی و صوفیت کے متعلق پائی جاتی ہے۔ تصوف اور شرع کے معاملے میں شاہ ولی اللہ کے طرز عمل کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسہ دیوبند میں جہاں شاہ صاحب کے اصولوں کی حقوڑی بہت پیروی ہو رہی ہے فقط علوم ظاہری کی تعلیم نہیں ہوتی، بلکہ تلامذہ کی روحانی اصلاح کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ اساتذہ میں سے اکثر صحیح تصوف اور تزکیہ نفس کی ضرورت سمجھتے ہیں اور حال میں مدرسے کے سرپرست مولانا اشرف علی تھانوی نے تصوف کے متعلق جو تفصیلی کتاب لکھی ہے، وہ بھی فی الحقیقت شاہ ولی اللہ کے نقطہ نظر کا اظہار ہے۔

شاہ ولی اللہ نے نہ صرف صوفیہ اور فقہاء کے اختلافات مٹانے کی کوشش کی، بلکہ صوفیہ کے اپنے درمیان جو اختلافات تھے، انھیں بھی کم کرنے میں سعی ہوئے۔ اس کی ایک نمایاں مثال ان کا مکتوب مدنی ہے۔ جس میں انھوں نے ابن العربی کی "وحدت وجود" اور امام ربانی کی "وحدت شہود" کو ایک دوسرے کے مطابق ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے روحانی اختلافات مٹانے کے لیے یہ بھی کیا کہ اگرچہ آپ کو زیادہ تعلق خاطر طریقہ نقشبندیہ باقوتیہ سے تھا، لیکن بیعت کے وقت آپ چاروں خانوادوں کے نام لیتے۔ تذکرۃ الرشید میں مولانا رشید احمد گنگوہی کا ارشاد درج ہے: "ہم اے حضرات بیعت کے وقت چاروں مشائخ کا نام لیتے ہیں تاکہ سب برابر عقیدت رہے اور سب بزرگوں کے فیض سے مستفیض ہوں۔ اور چاروں خانوادوں کے نام لینے کا طریقہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانے سے نکلا ہے۔"

اختلاف بین المذہب :- اس کے علاوہ فقہی مذاہب یعنی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی طریقوں کے اختلاف کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں تو اس مسئلے نے بہت پیچیدہ صورت اختیار نہیں کی، لیکن ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک میں اس پر سخت اختلافات رونما ہوئے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کا بیان ہے کہ چند سال ہوئے وہ اسپین ہوئے ہوئے اپنی مراکش میں بھی بغرض سیر و سیاحت چلے گئے۔ ایک مسجد میں گئے تو امام نے

پوچھا۔ ”کیفَ مَذْہَبُکُمْ“ تمہارا مذہب کیا ہے۔ ان بچاروں نے مذہب کا مطلب مندرجہ ذیل
 محاورہ کے مطابق دین لیا اور کہا کہ مسلمان ہوں۔ امام صاحب نے پھر اپنا سوال دہرایا
 اور بالآخر ایک اور سنا بھی کو ترجمانی کرنی پڑی۔ انھوں نے اپنا فقہی مذہب حنفی بتایا تو
 امام صاحب اتنے مایوس ہوئے کہ شاید ان صاحب کے یہودی ہونے سے بھی نہ ہوتے!
 شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے میں بھی انصاف اور اعتدال اور سلیم الطبعی سے کام لیا ہے۔ وہ
 خواجہ محمد امین کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ ”سوم سوال آنکہ عمل تو در مسائل
 فقہیہ بر کدام مذہب است۔ گفتم بقدر امکان جمع می کنم در مذہب مشہورہ“ یعنی مختلف
 مذاہب کو ایک دوسرے پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم حنفی
 طریقے پر ہوئی تھی۔ ان کے والد اور چچا دونوں حنفی تھے، لیکن ان کے چاہیئے استاد
 شیخ ابو الطاہر مدنی شافعی تھے۔ شاہ صاحب نے دونوں سے فیض حاصل کیا۔ اور
 وہ دونوں طریقوں کی خوبیوں اور ان کے اختلاف کی وجہ سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ
 ان اختلافات کو نمایاں کرنے کی نہ کوئی ضرورت ہے نہ اس میں کوئی مصلحت ہے۔
 شاہ صاحب کا بس چلتا تو وہ چار مذاہب فقہی یا کم از کم دو مشہور طریقوں کو ملا کر
 ایک کر دیتے۔ تفہیمات میں لکھتے ہیں۔ ”میرے دل میں ایک خیال ڈالا گیا ہے کہ امام
 ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے مذہب اہمیت میں سب زیادہ مشہور ہیں۔ سب زیادہ پیروی
 ان دو کے پائے جاتے ہیں اور تصنیفات بھی انہی مذاہب کی زیادہ ہیں۔۔۔۔۔ اس وقت جو
 امر حق ملا، اعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ دونوں کو ایک مذہب
 کی طرح کر دیا جائے۔ دونوں کے مسائل کو حدیث نبوی کے مجموعوں سے مقابلہ کر کے
 دیکھا جائے۔ جو کچھ ان کے موافق ہو اس کو رکھا جائے اور جس کی کچھ اصل نہ ہو اس کو
 ساقط کر دیا جائے۔ پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں، اگر وہ دونوں میں متفق علیہ
 ہوں تو مسئلہ میں دونوں قول تسلیم کیے جائیں۔“
 جدید علم الکلام کی ابتدا۔ یہی حال علم الکلام کے متعلق ہے۔ آپ عام معجزین اور
 متکلمین کے مخالف تھے اور کئی جگہ ان کے خلاف زور سے اظہار رائے کیا ہے۔

مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں :-

”وہ علوم شرعیہ پسینیاں چیز یا آوردند کہ مقصود و معلوم پیشینیاں نہ بود بلکہ در سلف امت از ان اثر سے یافتہ نمے شود۔ مجموع کثیرہ فلسفہ و حکمت یونانیاں را با علم شریعت اسمیتند و اصل اصول کتاب را از دست داده تا آنکہ ظاہر شریعت بنا بر کثرت ایراد و اصراف و تخلیط چیز سے دیگر شدہ۔ علوم اصول دیں را کہ افضل علوم است۔ بہرہیں کہ متکلمین در آن چہ صنائع آفریدند۔ و در وادی جدل و تمقّق تا بجا رسیدند؛ حالانکہ سلف امت نیکو عظیم داشتند بریں جنس کلام و آن را خارج از شریعت پیدا نشدند۔“

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک لحاظ سے آپ اسلامی ہندوستان کے سب سے پہلے متکلم ہیں ابعیاسیہ دور میں علم کلام اس لیے وجود میں آیا کہ اسلامی خیالات کو یونانی فلسفہ کے مطابق ثابت کیے اور دور جدید میں سرسید اور ان کے رفقاء کی کوشش تھی کہ وہ اسلامی مذہب و فلسفہ کو جدید سائنس اور نیچر سے ہم آہنگ قرار دیں۔ شاہ صاحب اس قسم کے متکلمین میں سے نہیں لیکن اسلامی تعلیمات کو انسانی دنیا کے بنیادی واقعات اور اصولوں سے ہم آہنگ ثابت کرنے کی کوشش ضرور ان کی تصانیف میں ہے۔ ان کی مشہور تصنیف حجۃ اللہ بالآخرہ میں یہ کوشش خاص طور پر نمایاں ہے۔ اس میں انھوں نے اسلامی احکام کی مصلحتیں بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ احکام فلاح انسانی کے لیے بے حد مفید ہیں۔ اور ان کی غرض و غایت ہی انسانی اصلاح و تہذیب ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب اور دوسری تصانیف میں کئی ایسی باتیں کہی ہیں جن سے متکلمین کی تہماتی ہوتی ہے۔ تقلید کے خلاف انھوں نے بڑی سختی سے اظہار رائے کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں (ترجمہ) ”تقلید سے میری جبلت اور مشرت انکار کرتی ہے اور بالکلیہ اس سے بھڑکتی ہے۔“ ایک اور جگہ عام علما و مقلدین پر بالواسطہ طنز کرتے ہیں۔ ”جیسے کہ سرمایہ علم ایشان شرح وقایہ و ہدایہ باشد۔ کجا اور اک اس سر دقیق تو اندکرو۔“ اس کے علاوہ حجۃ اللہ بالآخرہ کے دیباچے میں شاہ صاحب کا یہ مشہور فقرہ (ترجمہ)

”مصلحوی شریعت کے لیے وقت آگیا ہے کہ برطان اور دلیل کے پیرا منوں میں

مبوس کر کے اسے میدان میں لایا جائے۔“

ایک نئے علم الکلام کا پیغام نہیں تو کیا ہے؟

شاہ ولی اللہ کے دیدہ و رسا صریح بھی سمجھتے تھے کہ انھوں نے ایک نئے طریق کار کا آغاز کیا تھا خاتم الاولیا شاہ غلام علیؒ ان کی نسبت کہتے تھے۔ ”ایشاں بسیار بزرگ بودند۔ و طریق نو آوردہ اند (ملفوظات) حکیم الامت کے علمی کارنامے | ان احسانات اور انداز خیال کی خوبیوں کے علاوہ اصل چیز شاہ ولی اللہ کا علمی پایہ ہے۔ وہ نہ صرف ہندوستانی علماء کے صدق نشین ہیں بلکہ اسلامی دنیا کی اہم ترین مستشرقین مثلاً امام غزالی یا علامہ ابن تیمیہ کے پہلو پہلو بیٹھنے کے مستحق ہیں ان کا ترجمہ القرآن ہی ایک ایسا کارنامہ ہے کہ اگر وہ اور کچھ نہ کرتے تب بھی انھیں ہمارے علمی محسنوں کی صفِ اول میں جگہ ملتی لیکن انھوں نے اس پر کتنا نہیں کی انھوں نے علوم اسلامی کی تاریخ مثلاً حدیث تفسیر تاریخ فقہ اسرار دین تعارف کو لیا اور ان میں بلند پایہ اور بنیادی کتابیں تصنیف کر کے ان علوم کی ایک مستقل لائبریری یا لکچر ہاؤس مولانا مودودی ایک مضمون میں شاہ ولی اللہ کی نسبت لکھتے ہیں۔

”انھوں نے اسلام کے پورے فکری۔ اخلاقی۔ شرعی اور تمدنی نظام کو مرتب صورت

میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس میں وہ اپنے تمام پیشروں سے

بازی لے گئے ہیں۔ اگرچہ ابتدائی تین چار صدیوں میں بکثرت ایسے آئمہ گزرے ہیں

جن کے کام کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اسلام کے نظام

حیات کا مکمل تصور رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح بعد کی صدیوں میں بھی ایسے محققین ملتے

ہیں جن کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس تصور سے خالی تھے، لیکن ان میں سے

کسی نے بھی جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ اسلامی نظام کو بحیثیت ایک نظام کے

مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ شرف شاہ ولی اللہ ہی کے لیے مقدر ہو چکا تھا کہ

اس راہ میں پیش قدمی کریں۔“

مولانا مودودی شاہ صاحب کے مرتب کردہ نظام اسلامی کی تفصیلات دے کر

لکھتے ہیں:-

”پھر وہ نظام شریعت۔ عبادات۔ احکام اور قوانین کو پیش کرتے ہیں اور ہر ایک چیز کی

حکمتیں سمجھاتے چلے جاتے ہیں۔ اس خاص مضمون پر جو کام انھوں نے کیا ہے وہ اسی

نوحیت کا ہے جو ان سے پہلے امام غزالی نے کیا تھا اور قدرتی بات ہے کہ وہ اس راہ میں امام موصوف سے آگے بڑھ گئے ہیں۔

ہماری قومی زندگی میں شاہ ولی اللہ کا مرتبہ: شاہ ولی اللہ قومی زندگی کے ایک بڑے نازک دور میں پیدا ہوئے۔ ان کا ظہور اس زمانے میں ہوا جب اسلامی حکومت کی بنیادیں اکھڑ رہی تھیں۔ اور اس ملک میں صدیوں جاہ و جلال سے حکومت کرنے کے بعد مسلمان اس قدر آرام طلب اور کمزور ہو گئے تھے کہ وہ مرہٹوں اور سکھوں کے مقابلے میں تساہل اختیار کرتے تھے۔ شاہ صاحب کو اس صورت حالات کا افسوس ہوتا ہوگا، لیکن جو شخص عملی کام کرنا چاہے اسے اپنا دائرہ عمل محدود اور محسوس کرنا پڑتا ہے۔ شاہ صاحب اپنے آپ کو اس امر کے لیے موزوں نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عملی زندگی میں دخل انداز ہو کر واقعات کی زور و کسب لیں جس کام کے لیے وہ موزوں تھے اور جو کچھ کم ضروری نہ تھا (یعنی رسول اکرم کی خلافت باطنیہ) اس کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ وہ ان عیوب اور کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھے جو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں گھر کر گئی تھیں اور جن کی وجہ سے انھیں یہ روز بد دیکھنا نصیب ہو رہا تھا۔ شاہ صاحب نے انھیں پوری طرح بے نقاب کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کا ازالہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے ذہنی اور روحانی اختلافات مٹانا ضروری ہے تاکہ وہ صحیح معنوں میں ایک جماعت بن جائیں اور اپنے

لے جن زیرہ شکن حالات شاہ ولی اللہ کو سابقہ پڑا ہندوستان میں حکومت اسلامی کے آغاز کے بعد بھی رونما نہ ہوئے تھے۔ شاہ صاحب پر جو گزرتی ہوئی اس کا تصور کرنا مشکل نہیں۔ لیکن ٹھوس روحانی تربیت اور بلندی موصلاً اور سلیم الطبعی کا فیض ہے کہ ان حالات کی ایک جھلک ان کی تصانیف میں نہیں۔ کوئی شکایت نہیں کوئی رونا نہیں کہ دوسروں کی ہمتیں بھی کمزور ہوں اور واقعہ یہ ہے کہ جن کی صلاحیتیں تمام تر تعمیری ہوں۔ ان کے پاس آنسو بہانے کے لیے وقت کہاں؟ نتیجہ یہ کہ اپنی خاموش محنت سے قوم کے گرد و نواحی دیوار تعمیر کر کے بخش پر زمانے کے تعمیراتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔

والی مصیبتوں کا مل کر مقابلہ کر سکیں۔ ان کی تمام کوششیں اس پر منحصر رہی ہیں۔ اور اگرچہ بہ تعاضدے فطرت انسانی تھوڑے بہت اختلافات ہمیشہ رہیں گے، لیکن شاہ صاحب نے قرآن، حدیث، فقہ، تصوف میں سالہا سال کی محنت کے بعد ایک ایسا دستور العمل مرتب کر دیا، جس سے اختلافات کی گنجائش تھوڑی ہی ہے اور جس پر آج ہندوستان کے سمجھنے والے اور سوچنے والے علما، صوفیہ، فقہاء اور عام مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد متفق ہے۔

خوش قسمتی سے اسلام میں ملک ملک کے لیے علیحدہ مذہبی نظام (National Church) نہیں ہوتا۔ لیکن تاریخی، نسلی، لسانی، اثرات پھر بھی کار فرما رہتے ہیں اور مختلف ممالک میں مختلف طریقے برسر کار آتے ہیں۔ ایران میں شیعیت نے عروج پایا۔ نجد میں ہابیت نے۔ کسی ملک میں شافعی فقہ رائج ہے۔ کسی میں حنفی اور کسی میں حنبلی۔ اگر اس نقطہ نظر سے ہندوستانی مسلمانوں کے عقائد، فقہی روایات اور مذہبی میلانات دیکھے جائیں تو یہ نظر آئے گا کہ جو مذہبی نظام اسلامی ہندوستان میں سب سے زیادہ عام ہے، جسے بنگال میں مولوی کرامت علی جوہر پوری، بہار میں صادق پوری، خاندان، اور شمالی ہندوستان میں شاہ عبدالعزیز، مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید نے رائج کیا۔ اور جو آج دارالعلوم دیوبند کی بدولت خواص سے گہر کر عوام کو متاثر کر رہا ہے۔ اسے شاہ ولی اللہ نے ترتیب دیا اور اگر کسی کو صحیح معنوں میں امام الہند یعنی اسلامی ہندوستان کے خاص مذہبی نظام کا مرتب کہا جاسکتا ہے تو وہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات ہے۔

۱۔ اس بیان سے پروفیسر محمد فرمان نے خیال کیا ہے کہ اس سے شاہ صاحب کی حضرت مجدد پر فوقیت متصور ہوتی ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ تمام عالم اسلام کے مجدد و اہل ثلثی کا مرتبہ ایک خطہ کی خاص ضروریات پوری کرنے والے سے بلند ہونا چاہیے۔ ہمارا مقصد شاہ صاحب کے طریق کار اور ان کے خاص مقام کی وضاحت ہے۔ ان کی فوقیت ثابت کرنا نہیں۔

حکیم الامت کو بھی اپنے کام کی اہمیت اور علم و مرتبہ کا احساس تھا۔ الجزء اللطیف میں کہتے ہیں :-

کہ باوردار و این حرف از فقیر خاکسار من کہ ظل عالم قدس است انکار و قبول او
ندارد باطنش از خویش آئینہ صفت رنگے طلسم حیرت آلود است تمکین و فضول او
شعلہ آفتاب از راہ این رفیق ہی یزد بجز این نکتہ نتواں بہت مضمون و صول او

حکیم الامت کے فرزند ان ارجمند

شاہ ولی اللہ صاحب نے کسی بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑیں، لیکن جس طرح وہ اولاد معنوی میں خوش قسمت تھے، اسی طرح اولادِ صلبی میں بھی خوش نصیب تھے۔ اُن کے چار بیٹے علم و فضل میں ممتاز ہوئے۔ اور انھوں نے اپنے والد ماجد کے کام کو جاری رکھا شاہ صاحب کی دودفعہ شادی ہوئی۔ پہلی مرتبہ اپنے ماموں کی صاحبزادی سے شادی کی، جن سے مولوی شیخ محمد صاحب پیدا ہوئے۔ جو اولاد فوت ہوئے۔ زوجہ اول کے انتقال کے بعد آپ کی شادی سوتی پت کے سید ثنا اللہ صاحب کی دختر نیک اختر بی بی اودہ (کنام سے ہوئی۔ ان سے پانچ بچے ہوئے۔ ایک صاحبزادی بی بی امۃ العزیزہ (جن کا سلسلہ مقالاتِ طریقت کی تصنیف ۲۹۲ لکھ تک قائم تھا) اور چار فرزند ان گرامی کے

شاہ عبد العزیزؒ | دوسری شادی سے جو اولاد ہوئی، اس میں شاہ عبد العزیزؒ آپ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ وہ ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) میں پیدا ہوئے اور اپنے والد اور ان کے ایک ممتاز شاگرد سے علم حاصل کر کے تترہ نہیں کی عمر میں والد کی وفات پر ان کے جانشین ہوئے۔ آپ نے ساٹھ سال تک درس دیا اور علم حدیث سے جسے شاہ ولی اللہ نے از سر نو ہندوستان میں رائج کیا تھا۔ اُس کا

۱۵ یہ معلومات مقالاتِ طریقت سے اخذ کی گئی ہیں۔

فیض ملک میں عام کیا۔ ہندوستان کے اکثر محدثین کا سلسلہ اسناد آپ تک اور آپ کے ذریعے شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے۔ ”تذکرہ علماء ہند میں لکھا ہے۔ ”بالجملہ فی جامع علوم بلکہ آیتے از آیات الہی بود“ اور حقیقت یہ ہے کہ آج ہم آپ کی عظمت کا اندازہ آپ کی تصانیف سے صحیح طور پر نہیں کر سکتے۔ آپ درس و تدریس اور ارشاد و ہدایت میں ہمہ تن مشغول رہے۔ اس لیے آپ کو تصنیف و تالیف کا بہت وقت نہیں ملا۔ لیکن آپ کی عظمت کا اندازہ کچھ تو آپ کے تلامذہ کی تعداد اور برگزیدگی سے ہو سکتا ہے اور کچھ محاصرانہ تذکروں اور تاریخی کتابوں سے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اپنے زمانے میں آپ کی کس قدر عزت تھی۔ آپ کو کلکتہ میں کمپنی کے مدرسے کے لیے علامہ تفضل حسین کی وساطت سے بلایا گیا۔ دہلی میں آپ کے روزگار کا کوئی مستقل سلسلہ نہ تھا۔ لیکن پھر بھی آپ نے سادہ زندگی اور علوم اسلامی کی اشاعت زیادہ عزیز سمجھی۔ آپ کے شاگرد بے شمار تھے۔ ذیل میں چند نام درج کیے جاتے ہیں جن میں ہر ایک صاحب علم و فضل تھا اور آپ سے علم حاصل کر کے خود فیض کا سر شمع بنا۔ شاہ رفیع الدین۔ شاہ محمد اسحق صاحب۔ مفتی صدر الدین دہلوی۔ شاہ غلام علی صاحب۔ مولوی مخصوص اللہ صاحب۔ مولوی عبدالحی صاحب۔ مولانا میر محبوب علی صاحب۔ مفتی الہی بخش صاحب کاندھلوی۔ مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی۔ مولانا سید احمد بریلوی۔

آپ کی معلومات بے حد وسیع تھیں اور اسلامی علوم تک محدود نہ تھیں۔ آپ خود فرماتے تھے کہ جو علوم میں نے مطالعہ کیے ہیں اور اپنی استعداد کے مطابق مجھے یاد بھی ہیں ان کی تعداد ایک سو پچاس ہے۔ ان میں سے نصف کے قریب ایسے علوم تھے جو امت اسلامی کی تخلیق تھے اور باقی نصف دوسری امتوں کے۔

اور تو اور آپ کو فن موسیقی کے علمی پہلوؤں سے بھی واقفیت تھی اور مختلف گوتوں اور راگوں کو پہچانتے تھے۔ آپ کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ نہ صرف امور مذہبی اور حدیث و تفسیر اور فقہ میں آپ کی رائے کو بڑی وقعت سے دیکھا جاتا

تھا، بلکہ ادبی معاملات میں بھی آپ کی رائے کی بڑی اہمیت تھی۔ چنانچہ ناظرین آپ کی حیات کو یاد ہوگا کہ جب شاہ نصیر دہلوی نے ذوق کی غزل درست کرنے سے انکار کر دیا تو ذوق دہلی کے سب اساتذہ کو چھوڑ کر آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور جب آپ نے اس کی غزل کے متعلق تسلی کر دی تو ذوق نے کسی سے اصلاح لیے بغیر بے دھڑک اس غزل کو مشاعرے میں پڑھا۔

اس کے علاوہ سید ناصر ندیر فراق نے لال قلعہ کی ایک جھلک میں لکھا ہے :-
 ”کون نہیں جانتا کہ حضرت شاہ نصیر صاحب دہلوی، اکبر شاہ ثانی اور ابو ظفر بہادر شاہ اور شیخ ابراہیم ذوق کے استاد تھے۔ جب شاہ نصیر صاحب کا ذوق سے دل کھٹا ہو گیا اور اصلاح موقوف ہوئی تو ذوق ہر جمعہ کو مولانا عبدالعزیز صاحب کے وعظ میں جانے لگے اور وعظ بہت غور سے سننے لگے۔ کسی دوست نے اس کا سبب پوچھا تو ذوق نے کہا۔ استاد مجھ گنہگار سے ناخوش ہو گئے شعر و سخن میں اصلاح ملتی نہیں۔ اس کا بدل میں نے یہ نکالا ہے۔ کیونکہ مولانا عبدالعزیز صاحب اردو زبان دانی میں شاہ نصیر سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کے بیان اور گفتگو کو سنتا ہوں اور اردو کے محاورے روزمرہ یاد کرتا ہوں۔ اس لیے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے والد ماجد کے حکم کے بموجب اردو زبان سیکھنے کے لیے خواجہ میر درد صاحب کی خدمت میں پچھپن سے حاضر ہوتے تھے اور چپ چاپ بیٹھے ہوئے آپ کی تقریر کو سناتے تھے اور محاورات کو دل ہی دل میں چٹا کرتے تھے۔ مولانا ولی اللہ صاحب اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے۔ جس طرح اصول حدیث اور اصول فقہ فن ہے اسی طرح اصول زبان بھی فن ہے اور اردو زبان کے موجد اور مجتہد خواجہ میر درد صاحب ہیں آپ کی صحبت کو اس فن کے واسطے سے خیمت سمجھو کیونکہ خواجہ صاحب پکتے پان ہیں چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب خاص طور پر میر درد صاحب کے شاگرد تھے۔“

معتقدوں کی فطرتوں میں تو مولوی صاحب فقط ایک حلیم الطبع، مرغباں مرغ اور مسکین عالم تھے، جنہیں تعبیر خواب میں اور چن مچھوٹوں کے نکالنے میں خاص ملکہ تھا۔ لیکن آپ کے ملفوظات دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ آپ بڑے زندہ دل

اور حاضر جواب تھے۔ آپ کے زمانے میں شیعہ سُنی مباحثے زوروں پر تھیں اور عیسائیوں اور مسلمانوں کے مباحثے شروع ہو گئے تھے۔ آپ کے پاس بھی لوگ اپنے اعتراض اور سوال لے کر آجاتے، جنہیں آپ بعض اوقات ٹھوس اور متین دلائل سے رد کرنے کی بجائے اس طرح چٹکیوں میں اڑا دیتے کہ معترض قائل بھی ہو جاتے اور لا جواب بھی۔ چند ایک نمونے ملاحظہ ہوں:-

لطیفہ:- ایک دفعہ ایک پادری صاحب شاہ صاحب کی خدمت میں آئے اور سوال کیا کہ کیا آپ کے پیغمبر صیب اللہ ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں، وہ کہنے لگا، تو پھر انھوں نے بوقت قتل امام حسین فریاد کی۔ یا یہ فریاد سُنی نہ گئی؟ شاہ صاحب نے کہا کہ نبی صاحب نے فریاد تو کی، لیکن انھیں جواب آیا کہ تمھارے نواسے کو قوم نے ظلم سے شہید کیا ہے لیکن ہمیں اس وقت اپنے بیٹے عیسیٰ کا صلیب پر چڑھنا یاد آ رہا ہے۔

لطیفہ:- ایک شخص آپ کے پاس کسی مصور کی کھینچی ہوئی ایک تصویر لایا اور کہنے لگا کہ یہ تصویر جناب رسالت مآب کی ہے۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ آپ نے کہا کہ حضرت پیغمبر صاحب باقاعدہ غسل کرتے تھے۔ اس تصویر کو بھی غسل دے کر دھو ڈالو۔

لطیفہ:- ایک دفعہ ایک ہندو گاریبان آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہنے لگا کہ میری ایک بات بتلاؤ کہ خدا ہندو ہے یا مسلمان؟ آپ نے فرمایا کہ جو میں کہوں اُسے خوب سوچ لینا۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر خدا ہندو ہوتا، تو گنوہتیا کبھی نہ ہوتی۔

لطیفہ:- ایک شخص نے آپ سے مسئلہ پوچھا کہ مولوی صاحب، یہ طوائف یعنی کسی عورتیں مرنے ہیں تو ان کے جنازے کی نماز پڑھتی درست ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ جو مردان کے آشتا ہیں، ان کی نماز جنازہ پڑھتے ہو یا نہیں؟ اس نے عرض کیا کہ

۱۔ مقالات طریقت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ مزاج میں نہایت خوش طبعی اور ہر بات کا مذاق تھا۔ آپ کی بدنی حالت کی نسبت، اس کتاب میں لکھا ہے: "موراز قد۔ لا غرام دام۔ گندم رنگ۔ کلاں شیم۔ صاف جسم تھے۔" لیکن بعض سخت بیماریوں سے سابقہ پڑا۔ اور بینائی جاتی رہی۔

ہاں پڑھتے ہیں۔ حضرت نے کہا تو پھر ان کی بھی پڑھ لیا کرو!!
 ہندو کے راہنماؤں کی فسیت، مرزا مظہر جانجانا کے خیالات ہم آگے چل کر درج کریں گے
 لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب نے سری کرشن کے متعلق جو رائے ظاہر کرے۔ اس سے خیال
 ہوتا ہے کہ اس معاملے میں وہ بھی مرزا صاحب کے ہم خیال تھے۔ آپ سے ایک شخص
 نے دریافت کیا کہ حضور کنہیا جی کے حق میں کیا فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بہتر تو یہ
 ہے کہ ان کے حق میں چُپ ہی رہا جائے، لیکن بھاگوت گیتا سے جو ہندوؤں کی ایک
 معتبر کتاب ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کنہیا جی اولیا میں سے تھے۔

مذہبی معاملات میں کئی اہم امور پر آپ کے فتوے یادگار ہیں مثلاً جب ایسٹ
 انڈیا کمپنی نے دہلی کالج قائم کیا اور لوگ وہاں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق متاثر تھے
 تو آپ نے ان سب کے شبہات کو رفع کیا اور علی گڑھ کالج قائم ہونے سے پچاس سال
 پہلے انگریزی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کا فتوے دیا۔ اسی طرح اور کئی محرکۃ الآراء
 فتوے ہیں جن میں انگریزوں بلکہ تمام غیر مسلموں کی مناسب نوکری اور دارالحرب میں حربی
 کافروں سے سود لینے کے جواز کے فتوے ہیں۔ آپ کے زمانے میں شیعہ، سُنی اختلافات
 زوروں پر تھے۔ آپ نے ان مسائل پر عربی فارسی میں کتابیں لکھیں۔ ان میں سے
 تحفۂ اثنا عشریہ ایک مناظرانہ کتاب ہے، لیکن مخالفین بھی اس کی متانت تہذیب
 اور شائستگی کے مداح ہیں۔ ان کے علاوہ تفسیر عزیزی میں آپ نے قرآن مجید کے
 پہلے سواپارے اور آخری دو پاروں کی تفسیر فارسی میں لکھی ہے۔ اصول حدیث میں
 حوالہ ناقصہ اور تاریخ حدیث میں بستان المحدثین اور چند حواشی اور شرح کی کتابیں آپ
 یادگار ہیں۔ آپ کے فتووں کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔

تاریخی حیثیت سے آپ کی سب سے اہم کتاب تحفۂ اثنا عشریہ
 ہے۔ اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا۔

جب شیعہ علماء کے حالات پڑھے اور دیکھا کہ کس کثرت سے انھوں نے اس کی تردید
 میں قوت بیان صرف کی ہے۔ جنگ آزادی کے بعد سے پہلے اکابر شیعہ علماء کے

سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس کتاب کے اثر کو زائل کرنا تھا اور اس میں بہتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ علمائے لکھنؤ میں سب سے ممتاز نام مولوی دلدار علی مجتہد اول کا ہے۔ انھوں نے چھ کتابیں اور رسالے شاہ عبدالعزیز کی تحریروں کی تردید میں لکھے۔ صوارم الالہیات، حسام الاسلام، احیاء السنہ میں تحفہ اثنا عشریہ کے ان ابواب کا جواب ہے جو بالترتیب الہیات، نبوت اور معاد و حجت کے متعلق ہیں۔ رسالہ ذوالفقار تحفہ کے باب دوازدهم کے جواب میں ہے۔ خاتمہ کتاب صوارم میں اثبات امامت کا ذکر ہے اور رسالہ غیبت میں شاہ صاحب کے اقوال دربارہ غیبت کا رد ہے۔ علامہ حکیم مزارچہ دہلوی نے تحفہ کے جواب میں نہ صرف نزہت اثنا عشریہ لکھی، بلکہ ان مباحث سے عہدہ ہونے کے لیے جو تحفہ کی اشاعت سے پیدا ہوئے تھے، انھوں نے اپنی عمر صرف کر دی۔ اسی طرح ہم مفتی محمد قلی خاں کنٹوری کا ذکر مولوی دلدار علی کے تلامذہ کے ضمن میں کریں گے۔ وہ ایک ملت تک میرٹھ میں مفتی عدالت رہے۔ پھر ملازمت ترک کر کے لکھنؤ میں جا مقیم ہوئے اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ ان کا وظیفہ حیات تحفہ اثنا عشریہ کی تردید معلوم ہوتا ہے تحفہ کے باب ہشتم کا جواب انھوں نے تشنید المطالبین و کشف الضغائن میں دیا۔ ”وآں کتاب بیت نہایت مبسوط و رد و مجلد کبیر“ سیف نامہ میں باب اول کا جواب ہے۔ تعلیب الکامد میں باب دوم کا بیان سعادت میں باب ہفتم کا۔ (کوئی تیس ہزار سطروں کی کتاب ہوگی) اور صوارم الافہام میں باب یازدہم کا تین چار مشہور شیعہ علماء کی کوششوں کے متعلق یہ معلومات نجوم السماء سے حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ اور کئی کتابیں تھیں جو تحفہ کی تردید میں لکھی گئیں مثلاً مولوی دلدار علی صاحب جانشین سلطان العلماء سید محمد صاحب کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ انھوں نے تحفہ اثنا عشریہ کی تردید میں رسالے لکھے۔ ان مباحث کی گونج دور دور تک پہنچی۔ مثلاً آسودگان دہاکہ میں حکیم حبیب الرحمان دہاکہ کے ایک مشہور رئیس میر اشرف علی کی نسبت لکھتے ہیں کہ جب کتاب تحفہ اثنا عشریہ یہاں پہنچی تو میر اشرف علی نے دس ہزار روپیہ تحفہ کا جواب لکھنے کے لیے عراق بھیجا تھا۔ یہ میر اشرف علی

فارسی کے مشہور شاعر سید محمد آزاد جہانگیری اور اردو کے مشہور ادیب سید محمد کے پر واد اچھے، لیکن حکیم حبیب الرحمن کے بیان کے مطابق یہ دونوں صاحبان سستی ہو گئے تھے۔

تحفہ اثنا عشریہ فی الحقیقت ایک محرکۃ الاراء کتاب تھی اور شاہ عبدالعزیز نے اس کی تالیف میں بے حد محنت اور جانفشانی سے کام لیا۔ اس سے پہلے مختلف شیعہ سنی مسائل پر کتابیں تصنیف ہوئیں۔ خود شاہ ولی اللہ صاحب نے قرۃ العین فی تفصیل الشیخین۔ ازالۃ الخفا اور بعض رسائل میں ان مسائل سے بحث کی تھی، لیکن ایسی جامع اور مانع کتاب کوئی نہ تھی۔ فی الحقیقت تحفہ اثنا عشریہ شیعہ سنی مسائل کا ایک انسائیکلو پیڈیا ہے۔ کتاب کا مطبوعہ نو لکھنوی ایڈیشن بڑی قطیع کے تقریباً ساڑھے چھ سو صفحات پر محیط ہے۔ لیکن چونکہ بیان میں بڑے ایجاز و اختصار سے کام لیا گیا ہے اس لیے مطالب و معانی اور دلائل و حوالے بے شمار آگئے ہیں۔ کتاب کے جامع و مانع ہونے کے علاوہ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ روایات و بیانات کے انتخاب میں اصول حق کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ شیعہ مذہب اور خیالات کے بیان میں فقط مستند اور معتبر شیعہ کتب پر انحصار کیا گیا ہے اور تواریخ و تفسیر میں سے فقط انہی چیزوں کو چنا ہے۔ جن پر شیعہ سنی دونوں فرق متفق ہیں۔ کتاب کی زبان اور طرز بیان بھی متین اور ہمدانہ ہے۔

کتاب کے بارہ باب ہیں۔ پہلا باب شیعہ مذہب کی ابتدا اور اس کے مختلف فرقوں کے آغاز کے متعلق ہے۔ دوسرے طویل باب میں ان طریقوں اور حیلوں کو گنایا گیا ہے۔ جن سے دوسروں کو گمراہ کیا جاتا ہے اور اپنے خیالات کی ترویج و ترقی کا انتظام ہوتا ہے۔ باب سوم میں اسلاف شیعہ و علماء کتب ایشاں کا بیان ہے۔ ابواب پنجم، ششم اور ہفتم بالترتیب۔ الہیات۔ نبوت اور امامت کے متعلق ہیں۔ باب دوم میں خلفائے ثلاثہ اور دوسرے صحابہ کے خلاف الزامات کا بیان ہے۔ باب یازدہم میں شیعہ فرقے کے خیالات اور خصوصیات کا تجزیہ ہے۔ آخری باب تو لا اور تبرا کے متعلق ہے۔

شروع میں شاہ صاحب نے کتاب کی وجہ تالیف بتائی ہے اور لکھا ہے کہ ہمارے زمانے اور ہمارے شہروں میں شیعہ مذہب کی اشاعت کی اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ شاید ہی کوئی گھر ہوگا جس میں ایک دو آدمی اس مذہب کے قائل اور شیعہ خیالات کے متاثر نہ ہوں (شاہ صاحب کے اپنے گھر میں ان کے قریبی عزیز اور مشہور فارسی شاعر میر قمر الدین مرتضیٰ نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا) لیکن چونکہ یہ صورت حالات ناواقفیت اور غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اس کتاب میں اس کے تدارک کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ مناظرہ کے وقت آسانی ہو۔

نجوم السما میں حکیم مرزا محمد کمال کا یہ بیان نقل ہوا ہے کہ تحفہ اثنا عشریہ فی الحقیقت خواجہ نصر اللہ کابلی کی کتاب صواعق کا ترجمہ ہے۔ افسوس ہم اس کی تصدیق نہ کر سکے۔ لیکن نجوم السما کے بیان کے مطابق تحفہ اثنا عشریہ اپنے مقاصد میں کامیاب رہا۔ اس میں حکیم مرزا کے متعلق ایک رسالے کے حوالے سے لکھا ہے ”چوں فاضل عزیز تحفہ خود را... ظاہر نمود و عنایات شیوع گرفت و مردم جہال و ناحق ہیں بطرف آن گردیدند“

امیر الروایات میں جو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے ایک خادم امیر خاں کی بیان کردہ روایات پر مبنی ہے۔ لکھا ہے کہ نجف خاں نے تحفہ کی تصنیف پر شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کے خاندان کی بڑی اہانت کی اور انھیں سخت ایذا میں پہنچائیں۔ یہ بیانات مشتبہ ہیں لیکن شیعہ ذرائع سے بھی پتا چلتا ہے کہ تحفہ اثنا عشریہ کی تدوین و اشاعت فقط علمی محنت کا کارنامہ نہ تھا، بلکہ بڑی اخلاقی جرأت کا کام تھا۔ ہم تحفہ اثنا عشریہ کے شروع میں اور سرورق پر مصنف کا نام ”حافظ غلام حلیم ابن شیخ محمد قطب الدین احمد ابن شیخ ابوالفیض دہلوی“ پڑھا کرتے تھے اور حیران ہوا کرتے تھے لیکن نجوم السما کے مطالعہ سے یہ حیرت رفع ہو گئی۔ ”فاضل عزیز تحفہ خود را کہ ترجمہ کتاب صواعق خواجہ نصر اللہ کابلی است بہجت خوف نواب نجف خاں مرحوم کہ سرآمد علمائے آن روزگار و از شیعہ بیان ائمہ اہل ہار بود آن را بطرف خود نسبت کردہ، بلکہ اسے فرضی غلام حلیم برائے آن تراشیدہ...“ نجف خاں کی نسبت مشہور ہے کہ مرزا جانجاناں کی شہادت میں بھی

اس کی پشت پناہی کو دخل تھا۔ غالباً وہ واقعہ فوری جوش کا نتیجہ تھا۔ نجف خاں کو اس میں دخل نہ تھا، لیکن اس کی عام شہرت کے پیش نظر اس کے زمانہ اقتدار میں تحفہ اثنا عشریہ کی تصنیف ایک دل لگی نہ تھی۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے تحفہ اثنا عشریہ سنہ ۱۲۰۵ھ یعنی نومبر ۱۷۸۵ء کے بعد شائع کی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس زمانے کی تلخ بحثیں اب ختم ہو گئیں، لیکن شاید ندوی تاریخ کا طالب علم یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہے کہ اٹھارھویں صدی میں شیعہ مذہب کا جو فروغ شروع ہوا تھا۔ اسے روکنے میں تحفہ اثنا عشریہ کا بڑا دخل تھا۔

علمی وسعت اور محققانہ نظر کے علاوہ شاہ عبدالعزیز صاحب کو عربی انشا پر ازی اور شاعری میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ آپ نے کئی عربی نظمیں لکھی ہیں۔ ایک منظوم عربی خط میں جو آپ نے اپنے عم بزرگوار شاہ اہل اللہ صاحب کو لکھا۔ آپ نے اپنے زمانے کے حالات اور مرثیہ اور سیکھ حملہ آوروں کے طریقے بڑی خوبی سے نظم کیے ہیں۔ ایک نہایت دلچسپ نظم دہلی کی تعریف میں ہے۔ ایک قصیدے میں آپ نے سوڈان کے حالات و واقعات کا نقشہ کھینچا ہے۔

شاہ عبدالعزیز کی اولاد نرسینہ کوئی نہ تھی۔ فقط تین بیٹیاں تھیں۔ ایک مولانا عبدالحی سے بیاہی گئیں۔ دوسری مولانا شاہ رفیع الدین کے بڑے فرزند مولوی عیسیٰ صاحب سے اور تیسری شیخ محمد افضل سے۔ ان کے دو صاحبزادے تھے۔ مولانا محمد اسحق صاحب مہاجر اور مولوی محمد یعقوب صاحب۔ شاہ صاحب کی وفات پر لوگوں نے مولانا محمد اسحق صاحب کو آپ کا جانشین منتخب کیا۔ انھوں نے چند سال کے بعد سنہ ۱۲۰۷ھ میں تمام قبائل کو لے کر مکہ معظمہ کی طرف ہجرت کی اور وہیں سنہ ۱۲۰۷ھ میں انتقال فرمایا۔

شاہ عبدالعزیز کی وفات ۷۹ سال کی عمر میں ۷ شوال ۱۲۰۸ھ بمطابق ۷ جولائی ۱۷۹۳ء کو ہوئی۔ مومن نے جو اپنے اصلی نام حبیب اللہ سے نہیں، بلکہ شاہ صاحب کے دیے ہوئے نام مومن خاں سے زیادہ مشہور ہے، تاریخ لکھی ہے۔

دست بیدار اجل سے ابے سرویا ہو گئے فقر و دین فضل و ہنر لطف و کرم علم و عدل

شاہ رفیع الدین | شاہ ولی اللہ کے دوسرے بیٹے مولوی شاہ رفیع الدین تھے۔ آپ ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۵ء) میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کی

آغوشِ عاطفت میں علومِ مروجہ حاصل کیے اور حدیث شریف کی سند بھی اسی صاحبِ کمال کے دستِ شفقت سے حاصل کی اور زہد و تقویٰ میں اپنے باپ اور بھائی کے قدم قدم تھے۔ جب آپ کے بڑے بھائی شاہ عبدالحزیز صاحبِ کبریا کی کثرتِ امراض و ضعف مزاج کی وجہ سے دماغی محنت اور تعلیم و تدریس کے متحمل نہ ہو سکے تو زیادہ تر یہ کام شاہ رفیع الدین صاحب ہی کے سپرد کیا گیا۔ آپ سے چند نظمیں اور کچھ نثر بھی یادگار ہے، لیکن آپ کا سب سے اہم کام کلامِ مجید کا تحت اللفظ اردو ترجمہ ہے جو آج تک مقبولِ انام ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کی کئی تصنیفات ہیں۔ مثلاً راہِ نجات اور دمنخ الباطل۔ آخر عمر تک آپ خدمتِ دین میں منہمک رہے اور ستر برس کی عمر میں ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) میں انتقال کیا اور اپنے والد بزرگوار کے قریب پائیں کی طرف دفن ہوئے۔

شاہ عبدالقادر صاحب | شاہ ولی اللہ صاحبِ قدس سرہ کے تیسرے صاحبِ جزاے مولوی شاہ عبدالقادر صاحب تھے۔ آپ ۱۲۳۰ھ میں

شمعِ افروزِ بزمِ جہاں ہوئے اور اپنے وجودِ باجود سے عالم کو روشن کیا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والدِ مکرم کے سایہِ عاطفت میں پائی اور علمِ فقہ و حدیث و تفسیر میں نام پیدا کیا۔ تحصیلِ علم سے فراغت پا کر اکبر آبادی مسجد کے حجرے میں تمام عمر بسر کر دی۔ گوشہ نشینی پسند خاطر تھی۔ اس سبب تصنیف و تالیف کی طرف چنداں توجہ نہ کی۔ لیکن قرآن شریف کا جامع اور ترجمہ یا موضعِ قرآن (۱۲۰۵ھ) آپ سے یادگار ہے۔ بیّن بلامبالغہ ہزاروں کتابیں شار ہیں۔ یہ ترجمہ کثرت سے رائج ہے اور بہت مقبول ہے۔ آپ نے ۱۲۳۰ھ میں ترسیخِ سال کی عمر میں وفات پائی اور اپنے جدِ امجد عبدالرحیم صاحب کے پائیں مدفون ہوئے۔

شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۱ء) میں مکمل ہوا۔ موضعِ قرآن اس کا تاریخی نام ہے۔ شاہ رفیع الدین کے ترجمے کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس سے پہلے ہوا

یا بعد میں۔ مقبولیت اور محاورے کی صحت کے لحاظ سے موضع قرآن دوسرے ترجمے سے بہتر ہے۔ اس کی دو برہمی خوبیاں ہیں۔ ایک تو اس میں شاہ رفیع الدین کے ترجمے کی طرح اردو عبارت میں عربی جملوں کی ترکیب و ساخت کی نقل نہیں کی گئی۔ صحت مفہوم کے ساتھ ساتھ اردو محاورے کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ دوسرے ترجمے میں کم سے کم لفظوں میں صحیح مفہوم ادا کیا ہے۔ شاہ رفیع الدین کے ترجمے میں عربی نحوی ترکیب کی پابندی کی گئی ہے اور کسی جگہ کانوں کو عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے ترجمے میں بعض لفظوں اور ترکیبوں کا ترجمہ شاہ عبدالقادر کے ترجمے سے بہتر اور زیادہ صحیح ہے۔ آج ان دونوں ترجموں سے بہتر ترجمے مرتب ہو رہے ہیں، لیکن جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ ترجمے اُس زمانے میں ہوئے جب اردو و نشر کی کتابیں انگلیوں پر گنی جاسکتی تھیں اور لوگ اس زبان میں تصنیف و تالیف کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے تو ان بزرگوں کی سمجھ اور فرض شناسی کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ اپنے باپ کے نقش قدم پر چلے اور مذہب کی اشاعت اور وقتی ضرورتوں کا پورا خیال رکھا۔

شاہ عبدالغنی | شاہ ولی اللہ کے چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی تھے۔ ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں، لیکن اگر وہ باقی بھائیوں کی طرح مشہور نہیں ہوئے تو ان کی کمی ان کے صاحبزادے شاہ اسماعیل شہید نے پوری کر دی، جنہوں نے شاہ عبدالعزیز سے شاہ ولی اللہ کا علم و فضل سیکھ کر جمہور میں عام کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کر دیا۔ اس نئے دور کا مطالعہ ہم اپنی تیسری کتاب موج کوثر میں کریں گے۔

علمائے متاخرین

زوالِ حکومت

۱۷۰۸-۱۸۵۷ء

اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء میں ہوئی اور اس کے بہت جلد بعد مغلہ حکومت کا زوال نمایاں ہو گیا اورنگ زیب ۹۰ سال کی عمر میں فوت ہوا۔ جب اُس کا بیٹا تخت نشین ہوا

تو وہ خود بوڑھا تھا اور اُسے پانچ سال سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع نہ ملا۔ اُس کے زمانے میں پہلے راجپوتوں نے اور پھر سکھوں کے سرگروہ بندہ نے مغلوں کے علاقے کو لوٹا۔ راجپوتوں کی بغاوت تو اُس نے خود دفع کر دی، لیکن بندہ کا قلع قمع فرخ سیر نے کیا، جو ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک حکمران رہا۔ کئی لحاظ سے وہ سمجھ دار اور قابل حکمران تھا، لیکن اس کے زمانے میں مسلمان اُمرا کے دو فرقے ہو چکے تھے۔ ایرانی اور توراتی (شیعہ اور سنی) ان کے اختلافات نے اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ان قبائلی اور فرقہ وارانہ اختلافات کے علاوہ حکومت کو ضعف اس لیے بھی پہنچا کہ فرخ سیر کو تخت سید برادران (امیرالامرا سید حسین علی اور قطب الملک سید عبداللہ) کی مدد سے ملا تھا۔ وہ بادشاہ کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ سید عبداللہ وزیر سلطنت اور حسین علی دکن کا بااقتدار صوبیدار تھا۔ جب فرخ سیر نے سید برادران کا اقتدار کم کرنا چاہا تو حسین علی نے مرہٹوں کو اپنے ساتھ لایا۔ ان سے وعدہ کیا کہ بادشاہ سے تمہیں چوتھا اور سردیش مکھی کا فرمان لے دوں گا۔ چنانچہ وہ ان کا لشکر لے کر دہلی کی طرف چلا۔ فرخ سیر معزول کر دیا گیا اور مرہٹوں کو دکن میں چوتھا اور سردیش مکھی کی اجازت مل گئی۔ خاندانِ مغلہ کے زوال کی سب سے پہلی منزل یہ تھی۔

اس کے بعد سید برادران نے بادشاہ گری کا سلسلہ شروع کیا اور ۱۸ فروری ۱۷۱۹ء سے ۴ اگست ۱۷۱۹ء تک تین بادشاہ ہوئے۔ جب توراتی امرانے ان بھائیوں کے

مظالم دیکھے تو انھیں قتل کر دیا۔ کئی دور و زہ بادشاہوں کے بعد محمد شاہ تخت نشین ہوا جو ۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء تک حکمران رہا۔ اس کے زمانے میں نظام الملک آصف جاہ نے امور سلطنت کی اصلاح کی کوشش کی، لیکن جب ”رنگیلے بادشاہ“ نے یہ گوارا نہ کیا تو نظام الملک مایوس ہو کر ۱۷۲۲ء میں دکن چلا گیا۔ وہاں حکومت آصفیہ کی بنیاد ڈالی اور اسلامی حکومت کی تباہی و بربادی میں سے جو کچھ بچ سکتا تھا، اسے محفوظ کر لیا۔ اس کے بعد حکومت دہلی کا وقار و اقتدار بتدریج کم ہوتا گیا۔ مرہٹوں کے علاوہ روپوں اور جاٹوں نے بغاوتیں کیں اور بڑا ظلم یہ ہوا کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ آگیا۔ اس نے دل کھول کر دہلی کو لوٹا اور قتل عام کیا اور دہلی کا خزانہ خالی اور فرج منتشر کر کے واپس چلا گیا۔ اس کے بعد شاہ دہلی میں اتنی سکت باقی نہ رہی کہ خود مختار صوبیداروں اور دوسرے دشمنوں کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ بنگال میں علی ویردی خاں، دکن میں نظام الملک اور وہ میں برہان الملک سوات خاں عملی طور پر خود مختار ہو گئے۔

محمد شاہ کی وفات ۱۷۴۸ء میں ہوئی۔ اس کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا، جس کے زمانے میں ایرانی اور تورانی اختلافات پھر بڑھ گئے۔ ایرانیوں کا سرگروہ برہان الملک جانشین صفدر جنگ تھا اور تورانیوں کا سرگروہ نظام الملک کا پوتا شہاب الدین، جس نے مرہٹوں کو اپنے ساتھ گانٹھ کر طرح طرح کے مظالم شروع کیے۔ ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ کو اندھا کیا اور اس کی جگہ عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھایا۔ پانچ سال بعد اسے بھی مروا دیا۔ اور ایک اور شہزادے کو تخت نشین کیا۔ ایرانی اور افغان امرانے احمد شاہ ابدالی سے شہاب الدین اور اس کے مرہٹے ساتھیوں کی شکایت کی۔ احمد شاہ لاہور پر قابض ہو گیا تھا، لیکن مرہٹوں نے اس کے گورنر کو لاہور سے نکال دیا تھا۔ اب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس کے حامی ایرانیوں کے سرگروہ شجاع الدولہ ابن سعادت علی خاں اور افغانوں کے سرگروہ نجیب الدولہ تھے۔ مرہٹوں کے ساتھ کوج مل جاٹ۔ ابراہیم گاروی اور دوسرے لوگ تھے۔ ۱۷۶۱ء میں پانی کے میدان میں بڑا معرکہ ہوا۔ جس میں مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی

ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کر سکتا تھا، لیکن وہ شاہ عالم کی بادشاہت تسلیم کر کے اپنی چلا گیا اور شاہ عالم عنانِ حکومت سنبھالنے کے قابل نہ تھا۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کا معرکہ ہوا تھا اور بنگال انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ اس کے چند سال بعد آ رہ کے مقام پر مشرقی صوبوں کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو مل گئی، لیکن شمالی ہندوستان میں زیادہ اقتدار مرہٹوں کا تھا۔ پانی پت کی شکست کے بعد وہ اس قابل نہ رہے تھے کہ انگریزوں کا اچھی طرح مقابلہ کر سکیں، لیکن اس قابل ضرور تھے کہ دہلی کے شاہ شجاع کو اپنے قابو میں رکھیں شروع شروع میں ان کا اقتدار بہت مؤثر نہ تھا۔ لیکن جب ریسلوں کی بغاوت ہوئی اور غلام قادر ریسلے نے بادشاہ کو اندھا کر کے تخت سے اتار دیا اور اس کے بعد مرہٹوں نے غلام قادر ریسلے کو شکست دی اور اُسے قتل کر کے ۱۷۸۸ء میں شاہ عالم کو پھر تخت پر بٹھا دیا۔ تو وہ ۱۸۰۶ء تک بادشاہ رہا۔ لیکن اُس کی حالت ”مردہ بدست زندہ“ سے بہتر نہ تھی۔ ۱۸۰۵ء میں لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا اور شاہ عالم کو تخت نشین رہنے دیا۔ اس کے بعد ۱۸۰۶ء سے ۱۸۱۷ء تک اکبر شاہ ثانی اور ۱۸۱۷ء سے ۱۸۵۷ء تک بہادر شاہ تخت دہلی پر مقیم رہے، لیکن ان کی حیثیت بھی شاہ شجاع سے زیادہ نہ تھی۔ درحقیقت دہلی کی اسلامی حکومت ۱۷۸۸ء ہی میں ختم ہو چکی تھی، جب غلام قادر ریسلے نے شاہ عالم کو اندھا کیا تھا اور وہ مرہٹوں کی مہربانی سے دوبارہ تخت نشین ہوا تھا۔

اس دوران میں مشرق کی طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت وسیع ہو رہی تھی۔ پنجاب میں احمد شاہ ابدالی کا پوتا شاہ زمان راجا رنجیت سنگھ کو لاہور کی گدی دے گیا تھا۔ وہ خود مختار ہو گیا ۱۸۱۷ء کے قریب اس نے کشمیر اور پشاور فتح کر لیے۔ چنانچہ ۱۸۱۹ء تک یہ علاقے سکھوں کے ہاتھ میں رہے۔ شمالی ہندوستان میں شاہانِ اودھ مقابلہ زیادہ دیر تک محفوظ رہے اور ۱۸۵۶ء تک جب یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت نہ آ گیا، شجاع الدولہ کی اولاد یہاں حکمران رہی۔ سندھ کے امیروں کا خاتمہ ۱۸۴۳ء میں ہوا۔ جنوب میں سلطان حیدر علی نے میسور میں ایک نئی حکومت قائم کی تھی، لیکن ۱۷۹۹ء میں

ایسٹ انڈیا کمپنی۔ مرہٹوں اور نظام کی متحدہ افواج نے ٹیپو کو شکست دی اور اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ ان ہنگاموں میں فقط نظام دکن کا تاج و تخت سلامت رہا۔ ۱۷۸۹ء تک ریاست حیدر آباد مغللیہ حکومت اور تہذیب کی آخری یادگار سمجھی جاتی تھی، جس پر اب انڈین یونین نے قبضہ کر لیا ہے۔

زوالِ حکومت کے اسباب | زوالِ حکومت کے بیان کے ساتھ اس سانحہ کے اسباب کا فکر بھی متوقع ہے، لیکن یہاں ان کی تفصیل دینے کی ضرورت نہیں۔ بنیادی طور پر زوالِ حکومت

کا اصل باعث وہ علمی، ذہنی اور عسکری کوتاہیاں تھیں، جنہیں ہم نے عہدِ اکبری کی محدود ترقیاں“ والے باب میں وضاحت سے بیان کر دیا۔ ان امور میں مغلوں کی جو روز افزوں کمزوریاں تھیں، ان کا قدرتی نتیجہ تھا کہ کسی نہ کسی وقت وہ ایک ایسی طاقت سے مغلوب ہو جائیں، جو ان باتوں میں ان پر فوقیت رکھتی تھی۔ عہدِ اکبری کے بعد ایک اور مہلک خرابی رونمائی ہوئی، یعنی دربار اور امر کی فضول خرچیاں، نمود و نمائش اور عیش کوشتیاں۔ بنیادی طور پر تو اس کی وجہ فتوحات سلطنت کی وجہ سے دولت و ثروت کی فراوانی تھی۔ لیکن اکبر ایک شاہانہ نظام قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ طبیعت کا سادہ اور کفایت شعار تھا۔ جہانگیر کا مزاج دوسرا تھا۔ اور نور جہاں تو خیر نور علی نور۔ اس کے علاوہ فرنگستان سے آنے والے سامان زیب و نمائش نے نمود و نمائش کے نئے دروازے کھل دیے تھے۔ ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغل امر نے نہایت اونچا معیار زندگی قائم رکھنا شروع کیا اور دولت و ثروت کی نمائش اور اخراجات کی فراوانی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر قدم مارنے لگے۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہوتا تھا۔ یعنی فضول خرچی، تعیش کوشتی اور اسے نبھانے کے لیے رعایا اور زیر دستوں پر سختی اور رشوت ستانی اور اخلاقی انحطاط۔ اس سلسلے میں عالمگیر نے صورتِ حالات سدھارنے کی کوشش کی، لیکن جو مزاج کئی پشتوں سے بگڑے ہوئے تھے، وہ درست نہ ہوئے۔ بلکہ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی حالات

لے اس سلسلے میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ والے باب کا پہلا اندراج (صفحہ ۱) ملاحظہ ہو۔

پہلے سے بھی بدتر ہو گئے۔ اس کی وفات کے پانچ سال بعد تختِ دہلی پر اس کا پوتا معز الدین جہاندار اورنگ نشین ہوا۔ جس نے لال کنور کے ساتھ اس طرح رنگ لیاں منائیں اور اس کے اقارب کو اتنے بڑے عہدے دیے کہ بادشاہت اور امارت کا وقار ختم ہو گیا۔ فرخ سیر کے زمانے میں حالات ذرا سنبھلے، لیکن یہ سنبھالا عارضی تھا۔ اس کی وفات کے ایک سال بعد محمد شاہ تخت نشین ہوا، جو تاریخ میں محمد شاہ رنگیلا کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے جہاندار شاہ کی طرح بدعنوانیاں نہیں کیں اور اس کے عہدِ حکومت کے بعض روشن پہلو بھی ہیں (مثلاً اردو شاعری کی نشوونما، شاہ ولی اللہ کی تحریک کا آغاز وغیرہ) لیکن اب عیش کوشی اور اخلاقی انحطاط معاشرے کا جزو ہو گیا تھا۔ یہ کمزوریاں برقرار رہیں۔ رہی سہی کسر مرہٹوں اور نادار شاہ کے حملوں نے پوری کر دی۔ اور بادشاہت کا فقط ایک کھوکھلا ڈھانچہ باقی رہ گیا۔

شاید اسبابِ زوال کے متعلق آخری شاہانِ دہلی کے ایک ممتاز عہدہ دار کا تجزیہ دلچسپی سے پڑھا جائے، جسے اردو کی ایک قدیمی کتاب میں حکیم مومن خاں مومن کے ایک شاگرد نے درج کیا ہے اور جو اٹھارویں صدی کے طور طریقوں کی ایک دلائلِ تصویر پیش کرتا ہے۔

نتائج المعانی میں آغا محمود بیگ راحت لکھتے ہیں:-

ایک روز ابونصر محمد اکبر شاہ ثانی کے دربار میں ذکرِ زوالِ سلطنت آگیا۔ بخشی محمود خاں نے عرض کی۔ چار آدمیوں نے مملکت کو تباہ کر دیا۔ اول حکیموں نے فرمانروایانِ بیدار مغز کو وہ مقویات کھلائیں کہ تابِ تحمل نہ ہو سکی۔ مزاجِ عشرت طلب ہو گیا۔ دوسرے کلاوتوں نے ان کے گھر میں جو فحش ہوئی، اس کو پیش کیا۔ اور اس میں اپنا افتخار پیدا کیا۔ سلاطین کو قص و سرود میں مائل رکھا۔ ڈوم ڈھارٹی مدارِ المہام ہو گئے۔ انتظامِ فرمانروائی میں خلل واقع ہوا۔ دشمنوں نے سراٹھایا۔ بدخواہوں نے پیر پھیلانے۔ جا بجا خود سر ہو گئے۔ شرفا کو دربار میں داخلت نہ ہوئی۔ ان کی بات کسی نے نہ سنی۔ وقت پران لوگوں نے طرح دی غنیم کی بنائی۔ تیسرے کثرتِ عیال نے ادھر از واج کی کثرت ہوئی۔ ادھر اولاد کی ترستی ہوئی۔ نزاع خانگی

سے غلش ہوئی۔

چوتھے مشلخ و پیرزادوں نے جب کبھی حاضر ہوئے اور کچھ ذکر سلطنت آیا۔ اپنے تئیں عرش پر پہنچایا۔ مسائل تصوف بیان کرنے لگے۔ کنج عزالت کی خوبیاں عرض کرنے لگے۔ خون بند گالی خدا سے ڈرانے لگے۔ جب شیخ جی ریشی گجھار چکے۔ پھر اپنی کرامت بتانے لگے۔ ہم دعا کرتے ہیں۔ دعاؤں کا شکر حضور کی فتح و نصرت کو کافی ہے۔ دشمن ادھر مرنے بھی نہیں کرنے کا۔ خود پاپاں سم سمندان شکر دعا سے دولت و اقبال ہوگا۔ فرمانروا ان کے دم میں آگئے۔ پیر جی کی دعا پر تکیہ کیا۔ چار بالشِ عنفرت پر تکیہ نشین ہوئے۔ اراکین گوشہ گزیں ہوئے۔ غنیم نے قابو پایا، اقلیم پر زور لایا۔ دعا کی فوج آتی رہی، حکومت جاتی رہی۔ لیکن زوالِ حکومتِ علومِ اسلامی کی اشاعت میں ضعف آیا۔ بلکہ ان کا زیادہ فروغ ہوا (صفحہ ۱۷۴)۔

علومِ اسلامی کا فروغ

سید سلیمان ندوی ایک مضمون میں لکھتے ہیں:-

فرنگی محل

”..... اکبر کے زمانے میں حکیم فتح اللہ شیرازی نے یہاں محقولات کو فروغ دیا۔ شاہجہان اور عالمگیر کے زمانے میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور میرزا ہادی نے منطق اور فلسفے کا درس عوام کیا اور انھیں کے تلامذہ سے شاہ ولی اللہ، فرنگی محل اور خیر آباد کی درگاہوں میں متاخرین کے محقولات اور شروح، حاشی کی بہار آئی۔ حکیم فتح اللہ شیرازی المتوفی ۹۹۷ھ کے شاگرد عبد السلام لاہوری اور ان کے شاگرد ملا عبد السلام اودھی۔ ان سے ملا قطب الدین سہالوی۔ ان سے ملا قطب الدین صاحب قلمس آبادی، ملا امان اللہ بناری اور قاضی محمد عبد بہاری نے اور ملا قطب الدین سہالوی کے صاحبزادہ ملا نظام الدین نے ملا امان اللہ بناری سے

۱۷۰۰ھ ”شاگرد میر فتح اللہ شیرازی فقیہ و مفسر تود۔ از شاگردان دوسے ملا عبد السلام ساکن دیوبہ مضاف لکھنؤ مشہور است بر تفسیر بیضاوی حاشیہ برجستہ دارو۔ بسال ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۲ء) وفات یافت۔“
۱۷۰۰ھ عبد شاہجہان کے ایک استگوار دانش فاضل تھے۔ پہلے اپنے استاد کی جگہ مدرسہ لاہوری میں مدرس اعلیٰ رہے پھر بادشاہی لشکر میں بھی ہوئے۔ ان کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری

پڑھا۔ مگر نظام الدین کے وارث ملا بھرا العلوم ہوئے۔ بحر العلوم سے خیر آباد کا علمی خاندان چلا۔ میرزا ہد کا فیض شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی کو اور ان سے شاہ ولی اللہ صاحب کو۔ ان سے شاہ عبدالعزیز صاحب کو پہنچا اور ان سے ملک میں عام ہوا۔

مولانا نے جو سلسلہ ترتیب دیا ہے۔ اس میں کئی بحث طلب امور ہیں، لیکن ان کے باوجود مولانا سلیمان ندوی کا مرتب کردہ سلسلہ تاریخ علوم اسلامی دلچسپ اور مفید ہے اور علوم اسلامی کی تاریخ میں فرنگی محل کے بزرگوں کی اہمیت اس سے بخوبی معلوم ہو سکتی ہے۔ فرنگی محل لکھنؤ کا ایک محلہ ہے۔ شروع میں وہاں ایک فرانسیسی تاجر مقیم تھا جس کے تعلق کی وجہ سے یہ علاقہ فرنگی محل کہلاتا تھا۔ جب وہ تاجر اپنے وطن کو واپس چلا گیا تو یہ زمین ”نزول“ یعنی سرکاری ہو گئی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں ملا قطب الدین نے فروغ حاصل کیا۔ وہ قصبہ سہاکی میں رہتے تھے، جہاں انصاریوں اور عثمانیوں میں زمینداری پر کچھ جھگڑا تھا۔ ملا قطب الدین انصاری تھے۔ ۱۰۳۰ھ (۱۶۹۱ء) کی ایک رات کو چند عثمانی ان کے گھر پر چڑھ آئے اور ملا کو شہید کر کے ان کا گھر جلا دیا۔ ان کے صاحبزادے ملا محمد سعید سہالوی نے عالمگیری کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی تو فرنگی محل کا علاقہ انھیں معافی میں دیا گیا۔ ملا قطب الدین نے ملا عبدالسلام دیوبند کے شاگرد و ملا دانیال اوریخ صاحب اللہ آبادی کے شاگرد قاضی گھاسی سے علم حاصل کیا تھا۔ آپ کی تصانیف میں سے ایک شرح عقائد علامہ دوانی پر حاشیہ تھا جو آپ کے گھر کی تباہی میں تلف ہو گیا۔

اولاد کے معاملے میں آپ بڑے خوش قسمت تھے۔ آپ کے چار بیٹے تھے۔ ایک سے ایک بڑھ کر اور انھیں کی وجہ سے ہندوستان میں آپ کا فیض جاری رہا۔ تذکرہ علمائے ہند میں لکھا ہے ”عمر عزیزین مشغل درس بسر برد۔ کوئی ریاست علمی بجوار لکھنؤ برو ختم شد و سلسلہ تلمذ اکثر علمائے ہند برو منتهی می شود“ ملا قطب الدین کے بیٹوں میں سے سب برگزیدہ ملا نظام الدین تھے۔ جن کے نام پر درس نظامی مشہور ہے۔ تعلیم آپ نے اپنے والد حافظ امان اللہ بناری اور

اس عہد کے ایک اور مشہور اور قابل ذکر استاد مولوی غلام نقشبند لکھنوی سے حاصل کی تھی۔ تصانیف آپ کی کئی ہیں۔ جن میں حاشیہ شرح ہدایت الحکمت۔ شرح مسلم ثبوت۔ حاشیہ تمس بازغہ۔ حاشیہ شرح عقائد دوانی بہت مشہور ہیں۔ آپ شاہ عبدالرزاق بانسوی کے مرید تھے۔ ان کے ملفوظات بھی آپ نے مرتب کیے۔ آپ کی وفات ۱۲۸۸ھ میں یعنی نادر شاہ کے حملے سے تھوڑی دیر بعد ہوئی۔ آپ کی زیادہ شہرت بطور مدرس کے تھی۔ تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ آپ کے درس و تدریس کے مقابلے میں باقی سب علما کے درس بے رونق ہو گئے اور ہندوستان میں شاید ہی کوئی ہوگا جس کی شاگردی کا سلسلہ آپ کے شاگردوں یا فرزندوں میں سے کسی تک نہ پہنچتا ہو۔

درس نظامی | درس نظامی میں جو ان کے نام سے مشہور ہے۔ مندرجہ ذیل کتب اور علوم کی تعلیم ہوتی تھی:-

(۱) صرف :- میزان - منشعب - صرف میر - پنج گنج - زبدہ - فصول الکبری - شافیہ -

(۲) نحو :- نحو میر - شرح مائتہ عامل - ہدایتہ النحو - کافیہ - شرح جامی -

(۳) منطق :- صغری - کبری - ایساغوجی - تہذیب - شرح تہذیب - قطبی مع میر سلم العلوم -

(۴) حکمت :- مہندی - صدر - شمس بازغہ -

(۵) ریاضی :- خلاصۃ الحساب - تحریر اقلیدس مقالہ اول - تشریح الافلاک - رسالہ قوشجیر - شرح چمنی باب اول -

(۶) بلاغت :- مختصر معانی - مطول تاما اتاقلت -

(۷) فقہ :- شرح وقایہ اولین - ہدایہ آخرین -

(۸) اصول فقہ :- نور الانوار - توضیح تلویح مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ)

(۹) کلام :- شرح عقائد نسفی - شرح عقاید جلالی - میر زاہد - شرح مواقف -

(۱۰) تفسیر :- جلالین - بیضاوی -

(۱۱) حدیث - مشکوٰۃ المصابیح -

مولوی ابوالحسنات ندوی اس نصاب کو درج کر کے لکھتے ہیں۔ "اس کے بانی ملا نظام الدین تھے۔ انھوں نے اس کی بنیاد ایسے زبردست ہاتھوں سے رکھی کہ باوجود استبدادِ زمانہ آج تک اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ درسِ نظامی کی پابندی کی وجہ اس کی خوبیوں سے زیادہ کچھ تو علمائے فرنگی محل کا اثر و اقتدار تھا اور کچھ علمائے متاخرین کی عقیدت مندانہ روش۔ ظاہر ہے کہ جس نظام کے ماتحت علمائے خود تعلیم پائی ہو۔ اس سے انھیں انس ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ علمائے کوئی ایسا مجتہد ابھی تک پیدا نہیں کیا تھا جو پرانے عربی مدرسوں کے نصاب میں مناسب تبدیلیاں کر کے اُسے تبدیل شدہ حالات کے مطابق مفید بنا دے۔

شاہ سلیمان سجادہ نشین پھلواری شریف کا تو خیال ہے کہ درسِ نظامی ایک خود رو نظامِ تعلیم ہے جس کا ہیولی ملا فتح اللہ شیرازی نے ترتیب دیا اور جس پر بعد میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ اس موضوع پر الندوہ کے ایک نمبر میں لکھتے ہیں:-

اور اس درس موجودہ کو حضرت قبلہ ملا نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا درس کہنا سراسر گستاخی و بے ادبی ہے۔ حضرت ملا صاحب (قدس سرہ) نے نہ یہ موجودہ کتابیں پڑھائیں اور نہ اکثر کتابیں ان کے وقت میں تالیف ہوئی تھیں۔ نہ ان کتابوں کی جنابِ مزا دست تھی۔ اس درس کو خود رو درس کہنا نازیبا نہیں۔ کچھ تو بعض استادوں نے اپنے مذاق کے موافق کتابیں پڑھائیں اور کچھ طالب علموں کے مذاق اور کہنے نے اضافہ کیا۔ حضرت ملا صاحب علیہ الرحمۃ کا دامن اس سے پاک ہے۔ ہاں اگر ملا فتح اللہ شیرازی اس درس کا بانی کہا جائے تو بیجا نہیں۔۔۔۔۔ حضرت ملا صاحب (نظام الدین) قدس سرہ صوفی صافی عالی مشرب تھے۔ اگر وہ اس نظامِ درس کو درست فرماتے تو تصوف یا اخلاق کی کوئی کتاب اس میں ضرور داخل کرتے۔ حالانکہ اس درس نظامی میں تصوف و اخلاق کی کوئی ایک کتاب نہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اس درس سے فلیغ ہو کر نکلتے ہیں وہ تصوف و اخلاق سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ ہاں اگر کسی درویش صوفی کی

صحبت اختیار کی اور اس کے معتقد ہوئے تو کچھ تصوف و اخلاق کا اثر ان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس اب تو درویش و مشائخ بھی اقل و قلیل نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متھوڑے دنوں سے غیر مقلدین اور وہابیوں کی تعداد مولویوں کی جماعت میں زیادہ ہو گئی ہے۔ کاش اگر تصوف کی کوئی کتاب بھی ابتدا میں انھیں پڑھائی جاتی تو یہ خیالات فاسدہ ان کے دلوں میں پیدا نہ ہوتے۔

درس نظامی کی نسبت مولانا نیاز فتح پوری لکھتے ہیں۔ "اس میں سب سے بڑا نقص ایک تو یہ ہے کہ صرف و نحو کی تعلیم میں بہت فضول وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ادب و لغت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کے ساتھ منطق و الہیات کی جتنی کتابیں اس میں شامل ہیں وہ بھی اس تعلیم پر سید سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس لیے میری رائے میں صرف و نحو کی کتابوں کو کم کر کے زبانی خطبات کے ذریعے سمجھانا چاہیے اور مخصوص طور پر ایسی کتابیں لکھنا چاہئیں کہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کے اندر قواعد پر عبور ہو جائے اور ایسی کتابیں محصر میں رائج ہیں۔ اسی طرح منطق و الہیات کی بھی بقدر ضرورت تعلیم دینی چاہیے۔ فقہ و اصول فقہ حدیث و اصول حدیث بے شک نہایت ضروری ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان فنون کے متعلق جو کتابیں رائج ہیں وہ موجودہ حالات کے لحاظ سے ناکافی ہیں۔ ان میں بھی رد و بدل ضروری ہے۔ معانی و بیان اور لغت و ادب کے لیے کتابوں کا معقول اضافہ کرنا چاہیے اور ہندسہ و ہیئت کے ساتھ علم الکیمیا۔ طبیعیات۔ طبقات الارض۔ تاریخ اقتصادیات و سیاسیات کی تعلیم ضروری ہے۔"

دینی نقطہ نظر سے درس نظامی کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں تفسیر و حدیث پر پوری توجہ نہیں اور منطق حکمت۔ صرف و نحو پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ فی الحقیقت درس نظامی مذہبی اور روحانی تعلیم کا نظام نہ تھا، بلکہ دنیوی نظام تعلیم تھا، جس میں فقہ وغیرہ پر اس لیے توجہ ہو گئی تھی کہ اس کی طلباء کو اسلامی حکومت کے دوران میں قاضی، مفتی اور محتسب بننے کے لیے ضرورت تھی۔ ورنہ زیادہ توجہ

منطق۔ گرامر اور فلسفہ پر تھی اور نظام تعلیم کا مقصد طلباء کی عام عقلی تربیت اور ذہنی ترقی تھا۔

نام نہاد معقولات پر ضرورت سے زیادہ توجہ علما سے پُورب کا پُرانا مرض ہے اور اس کے اثرات درس نظامی میں بھی نمایاں ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے طریق تعلیم میں معقولات کی نسبت جو طرز عمل ہے اس کا اندازہ دار العلوم دیوبند کے سابق سرپرست مولانا رشید گنگوہی کی رائے سے ہو سکتا ہے۔ تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے: ”اسی طرح منطق و فلسفہ کے ساتھ آپ کا تنفر عداوت کے درجہ پر پہنچا ہوا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میرا جو مُردِ اور شاگرد فلسفہ کا شغل رکھے گا، وہ میرا مُردِ اور شاگرد نہیں۔“ حضرت امام ربانی بار بار فرمایا کرتے تھے کہ اس منطق و فلسفہ سے تو انگریزی بہتر کہ اس سے دنیا کے نفع کی امید تو ہے۔“

فلسفہ اور معقولات کی اسلام کے کئی دوسرے اہل نظر بزرگوں نے بھی مذمت کی ہے شیخ عطار لکھتے ہیں:

فلے کفر این جا بہ حق المعرفة دوست تروارم ز فالے فلسفہ
گرازاں حکمت دے افروختے کے چناں فاروق برہم سوختے
حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بھی مختلف علوم کے مدارج معین کرتے ہوئے اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

”اُستادِ علمِ کلام وفقہ اولے است از اُستادِ علمِ نحو و صرف۔ و اُستادِ نحو و صرف اولے است از اُستادِ علومِ فلسفی۔ با آنکہ علومِ فلسفی داخلِ علومِ معنویست۔ اکثر اُن مسائلِ لطائف است و بے حاصل و اقل مسائلِ آنکہ از کتبِ اسلامیہ اخذ نموده اند و تصرفات در آن کردہ از جہلِ مرکبِ خالی نیستند۔“

لیکن اصلاحِ نصابِ تعلیم کے مسئلے پر سب سے تلخ تبصرہ مولانا محمد اسلم جیرا چوری کا ہے، جو مقالاتِ اسلم میں لکھتے ہیں:

دوسری یہ کہ نہ صرف عقائد و اصول وفقہ بلکہ منطق و فلسفہ و ہیئت وغیرہ پر بھی جو غیر شرعی

علوم ہیں۔ قدامت کے تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا گیا ہے اور جو کچھ بھی کتابوں میں لکھا جا چکا ہے اساتذہ کی نگاہوں میں آخری الفاظ بلکہ مسلمات ہیں۔۔۔۔

اب اگر پوچھیے تو ایک مدت تک غور و فکر کرنے اور نتائج کو دیکھنے کے بعد ان درسی علوم کی نسبت جو مشرقی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مُردہ علوم کی لاشیں ہیں، جن کو ہمارے اساتذہ صدیوں سے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں اور جن کی عفونت سے عقل اور دین کو مسموم بھاگتے ہیں۔

میں اس میں کسی تبدیلی یا ترمیم کا قائل نہیں ہوں بلکہ کلی انقلاب چاہتا ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ طلباء و لو عربی زبان پختہ طور پر پڑھا کر خالص قرآن و سنت متواتر یعنی عمل بالقرآن کی تعلیم دینی چاہیے اور بس۔ اس کے بعد ان کو زندہ دنیاوی علوم سکھانے چاہئیں۔ جن سے وہ روزی پیدا کر سکیں اور دین کو دنیا کا مانے اور ملک میں تفرقہ ڈالنے کا ذریعہ نہ بنائیں۔“

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ایک مرتبہ اندوہ میں اسی طرح زور دار الفاظ میں نصاب تعلیم کی شکایت کی تھی۔

”آج صدیوں سے مسلمانوں کی مذہبی ترقی کو جس چیز نے روک رکھا ہے، اس کا ذمہ دار صرف نصاب تعلیم اور طرز تعلیم ہے۔“

ایک قوم کے بنانے اور بگاڑنے میں تعلیمی نصاب کو جو دخل ہو سکتا ہے، وہ محتاج بیان نہیں، لیکن ہمارے تعلیمی مصلحین بھی محض بنیادی باتیں نظر انداز کر دیتے ہیں (۱) کوئی نصاب تعلیم دوا می نہیں ہو سکتا (۲) مختلف مقاصد کے لیے مختلف نصاب ہوں گے۔ ایک انجینئر کو اور طرح کی ضرورت ہے۔ ایک مذہبی عالم کی ضرورت اس سے بالکل مختلف ہیں۔ ہمارے قدیمی مدارس کی قومی نظام میں ایک باعزت جگہ ہے اور ہمارا مذہبی نظام اور قدیم تہذیب برقرار رکھنے میں انھوں نے مفید کام کیا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ قدیمی نصاب سے چپٹے رہنے کی وجہ سے وہ ہماری مذہبی ضروریات بھی کما حقہ پوری نہیں کر سکتے۔ کئی علوم مثلاً اسلامی تاریخ، کا دروازہ انھوں نے اپنے لیے

بند کر رکھا ہے۔ فقہ، حدیث، عربی، ادب اور منطق کے لیے کتابیں وہ رائج ہیں جن سے مہینوں کا کام سالوں میں ہوتا ہے۔ ان باتوں میں کچھ وسعت اور لچک آجائے تو اپنے مقاصد کو یہ مدرسے بہتر طریقے سے پورا کر سکیں۔

علمائے متاخرین

علامہ بحر العلوم: درس نظامی کے بانی ملا نظام الدین کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت ملا عبدالحی بحر العلوم لکھنوی نے پائی۔ وہ سترہ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد انھیں ایک سانحہ پیش آیا جس کی وجہ سے وہ لکھنؤ چھوڑ کر پہلے شاہ جہان پور گئے اور پھر وہاں سے رام پور اور بنگال ہوتے ہوئے مدرسہ اس پنچے کرناٹک کے رئیس نواب محمد علی خاں نے ان کی بڑی قدر کی۔ بحر العلوم کا خطاب دیا۔ درس کے لیے ایک بڑا مدرسہ تعمیر کیا، جہاں وہ اپنی وفات یعنی ۱۲۳۵ھ (۱۸۱۹ء) تک درس دیتے رہے۔ ان کی کئی تصانیف ہیں۔ ارکان اربعہ در اصول فقہ۔ شرح فتاویٰ مولانا روم۔ شرح فقہ اکبر اور رسالہ توحید وغیرہ۔ مولانا سلیمان ندوی نے ایک مضمون میں انھیں ابن خلدون اور حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے ساتھ اس طبقے میں گنا ہے جنھوں نے متاخرین کے دور تقلید میں بھی مجتہدانہ انداز برقرار رکھا ہے۔ مولانا کی رائے بڑے احترام کی مستحق ہے، لیکن بعض باتوں سے خیال ہوتا ہے کہ علامہ بحر العلوم کی اصل جگہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی۔ علامہ وجیہ الدین گجراتی اور شیخ نور الدین احمد آبادی کے ساتھ ہے۔ جنھوں نے علوم درسی میں کمال حاصل کیا اور ان کی خوب اشاعت کی، لیکن جنھیں ابن خلدون یا شاہ ولی اللہ کا ہم پایہ نہیں سمجھا جاسکتا۔

ملا بحر العلوم فرنگی محل چھوڑ کر چلے گئے، لیکن ان کے بعد بھی یہ جگہ اسلامی علوم کا مرکز بنی رہی۔ ملا صاحب کے اپنے صاحبزادے مولوی عبدالباقی کچھ دیر مدرسہ ٹھہرا اور پیشہ حاصل کر کے لکھنؤ آگئے۔ ان کے علاوہ یہاں سینکڑوں علماء تحصیل علم و فضل سے فارغ ہوئے۔ گزشتہ صدی میں یہاں کے سربراہ اور وہ عالم مولانا عبدالحی تھے۔ جنھوں نے

عربی میں متحد و کتابیں لکھیں اور جن کے کسی شاگرد نامور عالم ہوئے۔ حال میں مولانا عبدالباری نے نام پیدا کیا۔ انھوں نے خلافت کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا اور مولانا محمد علی مرحوم نے ان سے طریقہ قادریہ میں بیعت بھی کی تھی۔

آزاد بلگرامی۔ لکھنؤ کے قریب بلگرام کا مروجہ خیر خطہ ہے، جہاں سید عبدالجلیل اور ان کے بعد ان کے صاحبزادے سید محمد قابل ذکر علما تھے، لیکن شاید ان سے بھی زیادہ عزت و احترام کے مستحق سید غلام علی آزاد بلگرامی تھے، جنھیں حسان الہند بھی کہا جاتا ہے۔ وہ بلگرام میں ۱۳۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے ہمصر تھے۔ سید محمد بلگرامی اور سید طفیل محمد بلگرامی سے تعلیم حاصل کی۔ پندرہ سال کی عمر میں حج کو گئے اور مدینہ منورہ میں شیخ محمد حیات سندھی سے ”صحیح بخاری“ پڑھی اور ”صحیح سنہ“ کا اجازہ حاصل کیا۔ پھر ہندوستان واپس آئے اور اورنگ آباد چلے گئے۔ نواب نظام الملک آصف جاہ کے صاحبزادے نواب نظام الدولہ ناصر جنگ نے ان کی بڑی قدر کی اور اپنے پاس رکھا یہاں انھوں نے اپنا وقت تصنیف و تالیف میں گزرا۔ ۱۳۸۵ء میں وفات پائی۔ آپ کی تصانیف کئی ہیں۔ عربی میں ایک کتاب ”صحیح بخاری“ کے چند ابواب کی شرح میں ہے اور ایک اہم کتاب سحیحہ المرجان فی آثار ہندوستان ہے۔ فارسی میں انھوں نے سرو آزاد خزانہ عامرہ روضۃ الاولیاء اور آثار الکرام لکھیں۔ ان میں سے پہلی کتابوں میں شعرا اور روضۃ الاولیاء میں روضۃ (خلد آباد) کے اولیاء کے حالات ہیں۔ آثار الکرام بلگرام کے اولیاء اور فضلاء و شعرا کے متعلق ہے اور ضمناً بلگرام سے باہر کے کئی بزرگوں کے حالات بھی آگئے ہیں۔ آپ کا طرز تحریر سلجھا ہوا۔ محققانہ۔ تقاضی اور اغراق سے پاک ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر آپ یہ کتابیں نہ لکھ جاتے تو مورخین کو اسلامی ہند کی ذہنی، ادبی اور مذہبی تاریخ مرتب کرنے میں بہت زیادہ دشواریاں ہوتیں، بلکہ سحیحہ المرجان کے شروع میں مولانا آزاد بلگرامی نے اس امر پر بجا فخر کیا ہے کہ ہندوستانی علما و فضلاء کے حالات کو انھوں نے پہلی مرتبہ منضبط کیا۔ ہندوستان میں اولیاء کے تذکرے بہت تھے۔ علماء کا کوئی نہ تھا۔ سحیحہ المرجان اور آثار الکرام میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش ہوئی۔

سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی۔ جس وقت مولانا آزاد مآثر الکرام میں بزرگانِ بلگرام کا تذکرہ لکھ رہے تھے۔ اس وقت اس کاں جو اہر کا ایک محل بے بہا، یمن میں جا کر چمکنا شروع ہوا تھا اور اس کی تابانی اور درخشانی نے عالم اسلام کو اس طرح مسخر کر لیا کہ شاید کسی ہندی نژاد نے کیا ہوا

یہ فخر ہندوستان بزرگ، علامہ مرتضیٰ تھتے، جو یمن کے تعلیمی مرکز زبیدی میں اتنی دیر تک مقیم رہے کہ وہ بلادِ عرب میں زبیدی مشہور ہیں اور مصر و عرب میں بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ یمنی نہیں، ہندوستانی تھے۔ سید مرتضیٰ بلگرام میں پیدا ہوئے (۱۲۵۵ھ) ابتدائی تعلیم کے بعد الہ آباد آگئے۔ اور ملاحِ خزانہ آبادی سے کچھ دیر فیض حاصل کیا پھر دلی پہنچے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ اس کے بعد عنقوانِ شباب میں ہی حج کے لیے مکہ معظمہ گئے اور وہاں سے زبید کا رخ کیا۔ جہاں انھوں نے مختلف بزرگوں سے تعلیم حاصل کی۔ قیامِ عرب کے دوران میں ان کی ملاقات سید عبدالرحمن بن مصطفیٰ عیدروسی سے ہوئی، جنھوں نے انھیں سلسلہ عیدوسیہ میں داخل کیا اور اب علامہ کے علمی سار کے ساتھ روحانی سوز شامل ہوا۔ مرشد کے زیرِ ہدایت انھوں نے مصر کا رخ کیا۔ اور تالیف و تصنیف کو اپنا شغل قرار دیا۔ ان کی وفات ۱۲۵۵ھ (۱۹۰۷ء) میں بعارضۃ طاعون ہوئی۔

علامہ مرتضیٰ نے بیسیوں کتابیں لکھی ہیں۔ جداگانہ علوم و فنون میں، لیکن ہر ایک اپنی اپنی جگہ بے نظیر ہے۔ ان کی ایک کتاب قاموس کی شرح تاج العروس ہے جو چودہ سال میں لکھی گئی اور بہت بڑی تقطیع کے چار پانچ ہزار صفحات کا محیط ہے، لیکن فن لغت سے بھی زیادہ شہرت آپ کو علم حدیث میں حاصل ہوئی۔ اس علم میں دوسرے سینکڑوں طالبوں کے علاوہ خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید اول اور ترکی کے صدرِ اعظم علامہ راغب پاشا نے آپ سے سندیں اور اجازت نامے حاصل کیے۔ تصوف میں بھی آپ کا بڑا درجہ تھا اور نہ صرف بہت سے لوگ آپ سے فیض یاب ہوئے، بلکہ آپ نے امام غزالیؒ کی احیائے علوم الدین کی ایسی بلند پایہ شرح لکھی کہ مصر اور بلادِ عرب میں اصل کتاب کو

نئے سرے سے مقبولیت حاصل ہو گئی۔ ڈی۔ بی۔ میکڈانلڈ جس نے اسلامی دینیات کی تاریخ لکھی ہے اور اس میں اپنی واقفیت کے مطابق ایک ہندوستانی عالم کا ذکر نہیں کیا! اہمہ حاضر کے مذہبی اور روحانی رجحانات کا تذکرہ کرتا ہوا لکھتا ہے۔ ”دوسری تحریک غزالی کے اثر کا احیا ہے۔ یہ اثر کسی وقت بھی قطعی طور پر مردہ نہ ہوا تھا اور یمن میں تو شاید خاص طور پر کار فرما رہا۔ اسلامی دنیا کے اس کونے میں صوفیہ کی کئی نسلیں پلا مزاحمت اپنا کام کرتی رہیں اور یہ اس ملک کا ایک باشندہ سید مرتضیٰ زبیدی تھا۔ جس نے احیائے علوم الدین پر ایک محرکہ الآراء شرح لکھ کر دورِ حاضر میں اس کتاب کو نئے سرے سے مطالعہ کرنے کی بنا ڈالی۔ یہ شرح بڑی قطع پر پس جلدوں میں بھیپی ہے اور اس کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔“

چونکہ سید مرتضیٰ کے علمی کمالات پر ہندوستان سے باہر نکل کر بہار آئی۔ اس لیے یہاں اکثر لوگ ان کے علمی پایہ سے ناواقف ہیں لیکن اہل نظر ان کی قدر و قیمت خوب پہچانتے ہیں۔ مولوی عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقی اردو و ماثر الکرام کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: ”خاکِ بلگرام میں ایک اور ایسا جید عالم ہو کر رہا ہے جسے فخرِ علماء ہند کہنا بجا ہوگا۔ علماء ہند کے حالات میں کوئی کتاب اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتی جب تک اس میں علامہ سید مرتضیٰ صاحب تاج العروس کا تذکرہ نہ ہو۔“ مولانا مناظر حسن جنھوں نے علامہ کی ایک تصنیف نفخۂ قدسیہ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کی نسبت فرماتے ہیں۔ ”وہ مصر میں ہی نہیں بلکہ اپنے زمانہ میں دنیا کے اسلام کے سب سے بڑے محدث، سب سے بڑے ادیب، سب سے بڑے لغوی اور آخر میں ایک مترادف، صاحبِ باطن و لی الشریعہ“ تذکرہ علماء ہند میں جہاں علامہ کی چھپا سٹھ کتابوں کے نام درج ہیں۔ مولوی رحمان علی خاں لکھتے ہیں۔ ”بالجملہ بوفور علم و نشر علوم بتوسط تلامذہ و تصانیف کتب کہ بہ حیثیت و سہ اکناف عالم را در گرفتہ۔ اگر و سہ لا عجز و صدی سیر و ہم گویند و است۔“

سید مرتضیٰ سے پہلے اور بعد میں کئی ہندوستانی علماء نے عربی زبان میں تصنیف

وتالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن افسوس کہ ان کو حقیقی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ نہ ہی ان کی تصانیف کی عرب اور مصر کے علمائے قدرانی کی اور ہندوستانی مسلمانوں کا بھی معتد بہ حصہ ان علما کے خیالات سے فیضیاب ہونے سے محروم ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے عام علما، بلکہ ہمارے ادبی اداروں کے بلاو اسلامی کے علمی حلقوں سے اس قدر مختصر روابط ہیں اور عام طور پر ہمارے علما کو جن کی زندگیاں ہندوستان میں گزریں، عربی زبان میں وہ مہارت حاصل کرنا جو اہل زبان کا حصہ ہے۔ اس قدر مشکل ہے کہ ہمیں اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ سولہ چھ صدیوں کے ہمارے بہترین علما کی عربی تصانیف اپنے مقصد میں کامیاب نہیں رہیں اور عام طور پر ان کا اثر دنیا سے اسلام کی علمی زندگی پر بہت تھوڑا ہوا ہے۔ [حجۃ اللہ البالغہ اب انہر میں شامل درس ہو گئی ہے، لیکن جن مصری طلباء سے ہمیں قیام انگلستان میں ملنے کا اتفاق ہوا وہ سید امیر علی کی سپرٹ آف اسلام سے تو بخوبی واقف تھے، لیکن حجۃ اللہ البالغہ کا انھوں نے نام بھی نہ سنا تھا۔] لیکن سید مرتضیٰ نے ثابت کر دیا کہ ذہن ہندی تو ایسا ہے کہ جن ہندوستانیوں کو اہل زبان میں رہ کر عربی زبان حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اور وہ ان کے درمیان تصنیف و تالیف کرتے ہیں، وہ اہل زبان سے بھی باندی لے جاتے ہیں اور عربی زبان میں ایسی

لے شاید ہمارے ہاں عربی کی تعلیم میں بھی کچھ ترمیم کی ضرورت ہے۔ عام طور پر پاک و ہند میں جو عربی پڑھائی جاتی ہے۔ وہ کتابی ہے اور قدیم اور ایک زندہ زبان میں بہت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہم سے پروفیسر گب نے ایک مرتبہ بیان کیا کہ مستشرقین کی ایک کانفرنس میں ہندوستان کے ایک صاحب اپنا مضمون عربی میں لکھ کر لائے ہوئے تھے اور انھوں نے اسی زبان میں پڑھا۔ لیکن مصر شام اور دوسرے عرب ممالک کے نمائندوں نے بعد میں کہا کہ وہ اس مضمون کے سمجھنے سے قطعاً قاصر رہے۔ پروفیسر موصوف نے فرمایا کہ چونکہ مجھے اور میرے بعض انگریز ساتھیوں کو ہندوستانی طلبہ کے پڑھانے کا تجربہ تھا اور ان کے لب و لہجہ اور لسانی خصوصیات سے واقفیت تھی۔ اس لیے ہم تو بھی مضمون کو کسی حد تک سمجھ سکے، لیکن مسلمان عرب علما اس سے یکسر محروم رہے۔

دسترس حاصل کر لیتے ہیں کہ بلگرامی کو خود اہل زبان مبنی سمجھنے لگتے ہیں !

شیخ محمد حیات سندھی | عربی زبان میں تصنیف و تالیف میں جو شہرت علامہ

زبیدی نے حاصل کی وہ غالباً کسی دوسرے ہندوستانی کو زمانہ حال میں نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن ایسے ہندوستانی علما کی تعداد بہت ہے۔

جنہوں نے مدینہ منورہ یا عرب کے دوسرے شہروں میں درس و تدریس کی محفلیں جمائیں اور ایک عالم کو سیراب کیا۔ افسوس کہ ایسے علما کا جہاں تذکرہ مرتب نہیں ہوا۔ ورنہ

ان علمی اثرات کا پورا اندازہ ہوتا جو ہندوستانی علما نے عرب اور دوسرے اسلامی ممالک پر ڈالے، لیکن اس فہرست میں بڑے بڑے برگزیدہ نام شامل ہیں خوش قسمتی

سے ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ ہم علما میں سے شیخ علی متقی اور شیخ عبدالوہاب متقی کا ذکر کر چکے ہیں اور صوفیہ میں شیخ تاج الدین سنبھلی (خلیفہ خواجہ باقی باللہ) اور شیخ

صبغت اللہ بروہی کے کارنامے گنا چکے ہیں جنہوں نے حجاز کو اور حجاز کے راستے باقی عالم کو نقشبندی اور شطاری سلسلوں سے روشناس کیا۔ اس وقت بھی یہ سلسلہ

جاری تھا جو علما تکمیل تعلیم کے بعد حجاز مقیم ہو گئے تھے اور اپنی قابلیت اور شغف علمی کی بدولت وہاں مرجع خاص و عام بن گئے۔ ان میں سندھ کے کئی فاضل تھے جن میں

مولانا محمد حیات سندھی مدنی سب سے ممتاز تھے۔ وہ عادل پور (سندھ) کے قریب پیدا ہوئے۔ عنقریب ان شباب ہی میں حج کے لیے گئے اور حج کے بعد مدینہ منورہ میں مقیم

ہو گئے۔ مولانا ابوالحسن سندھی مقیم مدینہ اور مولانا عبداللہ بن سالم بصری سے تکمیل تعلیم کی اور اپنے آپ کو درس حدیث کے لیے وقت کر دیا۔ آپ کا شمار اپنے زمانے

کے سب سے نامور محدثوں میں ہوتا تھا۔ آپ مسجد نبوی میں صبح کی نماز سے قبل وعظ کہتے اور ایک حجم غفیر آپ کے ارشادات سننے کے لیے حاضر ہوتا۔ آپ کے

شاگردوں میں میر غلام علی آزاد بلگرامی۔ مولانا فخرالہ آبادی بلکہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے نام لیے جاتے ہیں۔ آپ کی وفات شہرہ میں ہوئی۔

مولوی سلام اللہ محدث : شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا فیض ان کے بیٹے

شیخ نور الحق نے جاری رکھا۔ ان کے دو پوتوں شیخ سیف اللہ اور شیخ محب اللہ نے تصنیف و تالیف اور علم حدیث سے وابستگی کا سلسلہ برقرار رکھا اور بالترتیب شمالی ترمذی اور صحیح مسلم کی شرحیں لکھیں۔ شیخ محب اللہ کے صاحبزادے حافظ فخر الدین نے صحیح مسلم کی فارسی شرح لکھی تھی۔ ان کے بیٹے مولوی شیخ الاسلام صدر الصدور دہلی بھی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں صحیح بخاری کی مبسوط فارسی شرح مشہور ہے۔ مولوی سلام اللہ نے بھی حدیث کی اشاعت کے لیے بڑی کوشش کی۔ صحیح بخاری اور شمالی ترمذی کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اصول حدیث پر عربی میں ایک کتاب اور موطا کی شرح لکھی، جو شاہ ولی اللہ کی شرح موطا سے زیادہ جامع سمجھی جاتی ہے۔ شیخ سلام اللہ کی وفات ۱۲۸۹ھ میں ہوئی۔

شیخ سلام اللہ کے بیٹے شیخ نور الاسلام نے حقیقت زمان و مکان پر دور رسالے لکھے تھے۔

خیر آبادی خاندان: خیر آباد کے علمی خاندان کا آغاز اسی زمانے میں ہوا۔ پہلے قابل ذکر بزرگ مولوی فضل امام خیر آبادی تھے جو دہلی میں صدر الصدور ہوئے۔ ان کا آمدنامہ اب بھی فارسی کے طلباء استعمال کرتے ہیں۔ ان کے صاحبزادے مولوی فضل حق خیر آبادی تھے جو غالب کے عزیز دوست اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ جنگ آزادی کے بعد آپ رنگون جلاوطن ہوئے اور وہیں ۱۸۵۹ء میں فوت ہو گئے۔ آپ نے علم طبیعیات پر کئی کتابیں لکھیں اور عربی میں ایک کتاب جنگ آزادی ہند پر بھی مرتب کی تھی۔ آپ کا سلسلہ فیض مولوی عبدالحق خیر آبادی نے جاری رکھا، جو رامپور میں تھے۔ وہ علامہ شبلی کے استاد اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

شیعہ فرقہ کا فروغ

اٹھارھویں صدی میں | اٹھارھویں صدی میں شمالی ہندوستان میں شیعہ مذہب نے بڑا فروغ حاصل کیا۔ مغربی مستشرقین (مثلاً ہالٹر) کا شیعیت کا فروغ

اندازہ ہے کہ اورنگ زیب کے امرار کی اکثریت اس فرقہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اگرچہ اپنے عقاید پر بعضوں نے احتیاط و مصلحت کو نشی کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ جب عالمگیر کی آنکھیں بند ہوئیں تو اس احتیاط کی بھی ضرورت نہ رہی۔ نئی روش میں پہلا وزیرنگزب کے بیٹے اور جانشین نے کی۔ جس نے حکم دیا کہ خطبہ جمعہ میں علی ولی اللہ وصی رسول اللہ کے الفاظ اضافہ کیے جائیں۔ اگرہ۔ احمد آباد اور بعض دوسرے شہروں میں اہل سنت والجماعت نے اس حکم کی مخالفت کی۔ احمد آباد میں خطیب نے اس پر عملدرآمد کیا تو ہجوم نے برا فروختہ ہو کر اسے تہ تیغ کر ڈالا۔ لیکن بادشاہ اپنے فیصلے پر اڑا رہا تھی کہ لاہور میں صورت حالات بہت نازک ہو گئی۔ یہاں بادشاہ نے سستی علما کو بحث مباحثہ کے لیے بلایا اور زور سے اپنے فیصلے کی تائید کی۔ ان علماء کے سرگروہ حاجی یار محمد تھے جو اس زمانے میں فضلاء نے لاہور میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ انھوں نے بہادر شاہ کو کھری کھری سنائیں۔ جب بادشاہ نے کہا کہ کیا تم میرے غضب سے نہیں ڈرتے تو انھوں نے جواب دیا کہ میری چار آرزوئیں تھیں۔ حصول علم۔ حفظ قرآن۔ حج اور شہادت۔ خدا کے فضل سے پہلی تین تو پوری ہو گئیں۔ اب رہے قسمت اگرچہ تھی بھی حاصل ہو جائے۔ یہ بحث کئی روز جاری رہی اور بالآخر بادشاہ نے تو بیخاندہ کے افسر کو حکم دیا کہ وہ بروز جمعہ (دوم اکتوبر ۱۷۰۷ء) بادشاہ کا مسجد کے منبر سے نئے احکام کے مطابق خطبہ پڑھے، لیکن لاہور کے عوام (اور پٹھان سپاہیوں نے طے کیا کہ اس اقدام کا وہ پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کریں گے اور قریباً ایک لاکھ کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ جب جمعہ کے روز بادشاہ نے دیکھا کہ لاہور کے بازاروں میں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہیں تو اس نے اپنا حکم منسوخ کر دیا۔ اور سلطنت میں خطبہ کے لیے وہی طرز اختیار کی گئی جو عہد عالمگیری میں رائج تھی۔ اہل لاہور کے اس کامیاب مظاہرے کے بعد کسی مغل بادشاہ نے شیعہ عقائد کی

لے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ثانی ظفر کی نسبت ایک زمانے میں لکھنؤ میں مشہور ہو گیا تھا۔ کہ اس نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا ہے، لیکن جب سنی علماء و اکابر نے اس پر مواخذہ کیا تو [باقی اگلے صفحہ پر]

پشت پناہی نہیں کی۔ لیکن اٹھارھویں صدی میں جونہی ریاستیں اور حکومتیں قائم ہوئیں، ان میں بھاری اکثریت شیعہ حکام کی تھی۔ ان میں پہلی ریاست مرشد آباد کی تھی جس کی بنیاد عالمگیر کے معتمد اور محبوب دیوان بنگالہ مرشد قلی خاں نے رکھی۔ اس وسیع حکومت کے بڑے تہذیبی مرکز مرشد آباد، عظیم آباد اور جہانگیر نگر (ڈھاکہ) تھے۔ تہاں اودھ کے مورث اعلیٰ (بڑہان الملک سعادت خاں میر محمد امین نیشاپوری) کے خاندان کی پشت پناہی نظامت مرشد آباد نے کی۔ بڑہان الملک کے بھائی میر محمد باقر نظامت سے وظیفہ ملتا تھا۔ اس بھائی اور اپنے والد سے ملنے کے لیے میر محمد امین نیشاپور سے بنگالہ میں آئے اور پھر محمد شاہی دربار سے بڑا مرتبہ حاصل کر کے حکومت لکھنؤ کے بانی ہوئے۔ بالآخر لکھنؤ شیعہ حکومت اور خیالات کا بڑا مرکز ہو گیا۔ نوابان رامپور میں بھی اکثریت اہل تشیع کی تھی۔ سندھ میں ریاست خیرپور کے بانی اور رؤسا بھی خیالات کے تھے۔ ان حکومتوں کے علاوہ عام عہدوں اور جاگیروں میں بھی شیعہ حضرات کا بڑا اثر اور رسوخ تھا۔ آخری مغل بادشاہوں کے کئی وزیر انھی عقائد کے تھے۔ مثلاً بہادر شاہ کا وزیر عظیم منعم خاں جس کے مشورے پر بادشاہ نے خطبہ کے الفاظ بدلنے چاہے۔ خود اورنگ زیب کے وزیر اعظم اسد خاں اور سپہ سالار ذوالفقار خاں کے عقائد کے متعلق شبہ ہے۔ سادات بارہہ جن میں ”بادشاہ گر“ سید برادران (قطب الملک سید عبداللہ خاں اور امیر الامرا سید حسین علی خاں) نے ایک زمانے میں بڑا اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ وزیر الممالک صفدر جنگ۔ امیر الامرا نجف خاں تو یقیناً شیعہ خیالات کے تھے۔ عام عہدہ داروں کا تو کوئی شمار نہیں۔ علمی اور ادبی معاملات میں حضرات شیعہ کا مرتبہ اس سے بھی بلند تھا۔ خود اورنگ زیب نے اپنی بیٹی زیب النساء کی تعلیم ایک ممتاز شیعہ فاضل ملا محمد سعید اشرف ماٹنڈرانی کے

[بقیہ صفحہ ۶۱۷]

بادشاہ نے اس اقواہ کی تردید کی اور مرزا غالب سے ایک فارسی مثنوی لکھوا کر عوام و خواص کو اپنے سستی ہونے کا یقین دلایا۔

سپر و کر رکھی تھی۔ وہ مشہور شیعہ عالم، مولانا محمد تقی مجلسی اصفہانی کے نواسے تھے شیعہ علماء کی مستند تاریخ نجوم السما میں ان کا اپنا علاحدہ تذکرہ ہے۔ شہزادی کی بارگاہ میں انھیں جو خصوصیت حاصل تھی اس کا کچھ اندازہ اس قصیدے سے ہو سکتا ہے جو ایران واپس جانے کے وقت پر انھوں نے شہزادی سے رخصت لینے کے لیے پیش کیا ہے

یکبار از وطن نتوان برگرفت دل در غم اگر چه فزون است اعتبار
پیش تو قرب و بعد تفاوت نمی کند گو خدمت حضور نباشد مرا شعار
نسبت بہ باطن است چہ در پی چہ صفاں دل پیش تست تن چہ بہ کابل چہ در قندھار

وطن میں قیام کے بعد وہ پھر سندوستان واپس آئے۔ اس وقت عالمگیری کی وفات ہو چکی تھی، لیکن اس کے پوتے شہزادہ عظیم الشان حاکم عظیم آباد نے ان کی بڑی قدر کی اور وہ بالآخر مونگیری میں فوت ہوئے۔ اورنگ زیب کے دربار کا سب کا میاب نثر نگار اور شاعر نعمت خاں عالی شیعہ تھا اور اس زمانے کے متحد و ممتاز شعراء کا یہی مندرجہ تھا۔ فارسی شعر و ادب میں ایک ایسے فرقے کا امتیاز جس میں کثرت سے ایرانی الاصل اہل قلم شامل ہوں عجیب نہیں۔ لیکن مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں علم تاریخ کے میدان میں بھی یہ فرقہ پیش پیش تھا۔ علامہ شبلی نے مضامین عالمگیری میں بڑے شکایت آمیز لہجے میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ عہد عالمگیری کے سب سے برگزیدہ مؤرخ شیعہ تھے اور انھوں نے اس زمانے کے واقعات جس انداز سے لکھے ہیں ان کی بنا پر عالمگیری سے انصاف نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ مرحوم کا یہ اظہار کئی لحاظ سے افسوسناک ہے۔ ایک تو یہ خیال کہ مستثنیات کو چھوڑ کر (عہد عالمگیری کے ذمہ دار شیعہ مؤرخین نے واقعات جانبداری سے اور اصول فن کو نظر انداز کر کے لکھے ہیں، غلط ہے۔ دوسرے اہل سنت اہل علم کے لیے بھی کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تاریخ کے فن میں عالمگیری کے طویل عہد میں ان کا ایک نامور تاریخ نگار نہ ہوا۔ اردو ادب کی ابتدا اور ترقی میں بھی شیعہ اہل قلم کا بڑا ہاتھ تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہماری علمی اور ادبی زندگی میں شیعہ حضرات کا حصہ ان کی تناسب تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اس فرقے میں کثرت سے ایسے (سادات یا ایرانی النسل) اہل

خاندانوں کی شمولیت ہے، جنہوں نے ہر میدان میں ایک بلند معیار پیش نظر رکھا ہے۔ دوسرے چونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے شیعہ حضرات کی عقیدت و محبت کی ایک اہم بنیاد ان کا ”باب مدینۃ العلم“ ہونا ہے۔ اس لیے اس فرقے میں علم کی محبت ایک مذہبی فریضہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اہل علم کا خاص احترام ہوتا ہے اور اٹھارھویں صدی میں (مثلاً میر غلام علی آزاد اور دوسرے سادات بلگرام کی کوششوں میں) اس خصوصیت کے بڑے کامیاب مظاہرے نظر آتے ہیں۔

سیاسی اقتدار اور علمی اور ادبی امتیاز کے علاوہ اٹھارھویں صدی میں شیعہ حضرات کا تجارتی کاروبار میں بھی بڑا عمل دخل تھا۔ بالخصوص (سورت اور مگلی کی بحری تجارت میں ان کا حصہ بہت تھا۔ سورت میں دوسرے اور خوجے تجارت میں پیش پیش تھے اور بنگالہ کے شیرازی اور اصفہانی تاجر خاندانوں کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا۔

اٹھارھویں صدی کے شیعہ اکابر میں ایک نہایت مبارک نام حاجی محمد محسن کا ہے جو ایک ایرانی تاجر خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

لیکن جن کی اپنی عمر دوسرے مشاغل میں گزری اور جن کی مخیرانہ کوششیں مسلمانان بنگالہ کی تاریخ کا سب سے روشن باب ہیں۔ ان کے دادا آغا فضل اللہ بہ شغل تجارت ایران سے آئے۔ پہلے مرشد آباد میں کچھ عرصہ ٹھہرے اور پھر مگلی میں اقامت اختیار کی جو کلکتے کی آبادی سے پہلے مشرقی ہندوستان کی سب سے بڑی بندرگاہ تھا۔ یہاں ان دنوں ایک اور ایرانی اہل ثروت آغا مظہر مقیم تھے جنہیں مشرقی پاکستان کے موجودہ ضلع جھور اور بعض دوسرے علاقوں کی زمینداری اور نگ زیب کی طرف سے ملی تھی۔ آغا مظہر نے اپنے حسن انتظام سے اپنی جائیداد میں بڑا اضافہ کیا، لیکن ان کی اولاد زینہ کوئی نہ تھی۔ عمر کے آخری حصے میں ان کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام انھوں نے منو جہاں خانم رکھا۔ لڑکی کی عمر سات برس کی تھی جب آغا مظہر نے وفات پائی۔ لیکن مرنے سے پہلے انھوں نے اپنی تمام جائیداد بیٹی کے نام منتقل کر دی۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بیوہ نے آغا فضل اللہ کے بیٹے حاجی فیض اللہ سے شادی کر لی۔ ان کی واحد اولاد

(حاجی) محمد محسن سلمہ میں پیدا ہوئے۔ محمد محسن اور منوجان خانم سوتیلی بھائی بہن تھے، لیکن بہن نے جو عمر میں آٹھ سال بڑی تھیں، انھیں سگے بھائیوں سے زیادہ عزیز رکھا۔ اور تعلیم و تربیت میں بھی ان کی نگرانی کی۔ ان دونوں کے استاد ہنگی کے آغا خیرازی تھے، جو نہ صرف ایک زبردست فاضل، بلکہ جہاندیدہ سیاح تھے۔ اور انھوں نے اپنے سفر کی کہانیوں سے خرد سال محسن کے دل میں بھی سیر و سیاحت کی لگن پیدا کر دی۔ ہنگی میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ مرشد آباد گئے اور وہاں کے مشہور مدرسے میں تکمیل تعلیم کی۔ اس کے بعد وہ ہنگی واپس آگئے اور اپنی ہمیشہ کے کاموں میں اس کی مدد کی۔ اس کے بعد وہ تین بتیس کی عمر میں حج کے لیے روانہ ہوئے۔ واپسی پر سخت تکلیف اٹھائی۔ راستے میں ڈاکوؤں نے قید کر لیا۔ ان سے گلو خلاصی ہوئی تو عراق کا رخ کیا۔ اور تحصیل علم اور عراق اور ایران کی سیر و سیاحت میں ساہما سال صرف کیے اور ساٹھ سال کی عمر میں اصفہانیوں کے ایک قافلہ کے ساتھ ہندوستان واپس آئے۔ وہاں لکھنؤ۔ بنارس۔ عظیم آباد۔ مرشد آباد ہوتے ہوئے ہنگی پہنچے۔ کبھی قیام ڈھاکہ میں رہتا۔ کبھی مرشد آباد۔ کبھی ہنگی۔ بڑی سادہ زندگی تھی اور آزادانہ بسر کرتے تھے۔ کبھی شادی نہیں کی تھی اور ایک سوتیلی بہن کے علاوہ دنیا میں کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ منوجان خانم کے شوہر مرزا صلاح الدین لا ولد فوت ہوئے تھے۔ انھوں نے حاجی محمد محسن کو اپنی تمام جائداد کا مختار بنایا۔ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انتظام کیا اور بہن نے مرتے وقت اپنی تمام جائداد ان کے نام منتقل کر دی۔

منوجان خانم کی وفات اکیاسی سال کی عمر میں سلمہ میں ہوئی اور ان کی وصیہ جائداد کے وارث حاجی محمد محسن ہوئے، لیکن ان کی سادہ زندگی میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ تین سال بعد انھوں نے وہ تمام جائداد جس کی سالانہ آمدنی اُس زمانے میں پچیس ہزار تھی، امور خیر کے لیے وقف کر دی۔ ذاتی مصارف کے لیے اتنی جائداد رکھی جس کی ماہوار آمدنی سو روپے سے زیادہ نہ تھی۔

حاجی محمد محسن نے ۲۰ اپریل سلمہ کو وقت کی باقاعدہ رخصتی کرائی اس کے

بچھ سال بعد تک وہ زندہ رہے اور یہ زمانہ انھوں نے وقف کے معاملات کو خوش اسلوبی سے سلجھانے میں گزارا۔ ان کی وفات بیاسی برس کی عمر میں نومبر ۱۸۱۲ء میں ہوئی۔ قاضی القضاۃ مولوی سراج الدین علی خاں نے تاریخ لکھی۔ ع

عارف کامل زمانہ برقت

حاجی محمد حسن نے جائداد وقف کرتے وقت اس کی سالانہ آمدنی کے نو حصے رکھے تھے۔ تین حصے تو امام بارگاہی کی نگہداشت، مجالس محرم اور دوسرے مراسم کے اخراجات اور فاتحہ خوانی کے لیے تھے۔ دو حصے متولیوں کے گزارہ کے لیے اور چار حصے ادارے اور وظائف کے لیے۔ لیکن واقف کی وفات کے بعد جانشین متولیوں نے جو یہ عنوانات کیں اور جس طرح جعل سازی سے جائداد اپنے نام و وامی پٹہ پر لینے کی کوشش کی، اس نے بورڈ آف ریونیو کو مجبور کر دیا کہ جائداد کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے اور بالآخر ریونیو کونسل کے فیصلے کے بعد ۱۸۳۵ء میں گورنمنٹ نے طے کیا کہ وہ وقف کی بجا آوری کی ذمہ داری لے۔ گورنمنٹ نے صرف ایک متولی مقرر کیا اور آمدنی کا ۱/۴ حصہ بچالیا۔ وظائف وغیرہ کے لیے چھ چار حصے مقرر ہوئے تھے (اور جنہیں واقف کے مقرر کردہ متولیوں نے دستاویز کے مطابق صرف نہیں کیا تھا) انھیں حکومت نے عام تعلیمی اخراجات کے لیے منتقل کر لیا اور محسن فنڈ کی مدد سے ۱۸۳۶ء میں سہلی کالج قائم کیا اور سینتیس سال تک اسے محسن فنڈ کی مدد سے چلایا، لیکن مسلمان اس پر اعتراض تھے کہ ایک اسلامی وقف کو ایک ایسے کالج کے لیے کیوں استعمال کیا جائے جس سے فائدہ اٹھانے والے بیشتر غیر مسلم تھے۔ ڈاکٹر ہنٹر نے ”دی انڈین مسلمانز“ میں با اثر طریقے سے اس استدلال کی حمایت کی۔ نواب عبداللطیف نے بھی کوشش کی ۱۸۶۳ء میں فیصلہ ہوا کہ سہلی کالج کے اخراجات کا گورنمنٹ انتظام کرے۔ محسن فنڈ کی آمدنی ڈھاکہ چٹاگانگ۔ راجشاہی اور سہلی میں مدرسے قائم کرنے پر خرچ ہو اور کچھ حصہ مسلمان طلباء کے لیے وقف ہو۔ تاکہ جو مسلمان بنگال کے کسی انگریزی سکول یا کالج میں تعلیم پائے، اس کی فیس کا دو تہائی حصہ اس فنڈ سے دیا جائے۔

حاجی محمد محسن کے مذہبی عقائد کی نسبت طبقاتِ محسنیہ میں لکھا ہے۔ "در عقائد مذہبی طبعش بسوئے مذہب جعفری خیلے متوجہ بود۔ اکثرے سُنیاں کہ ملازم او بودند حسب ہدایت و فرمائش مذہب امامیہ اختیار کردند۔ ازل گروہ رجب علی خاں و شاکر علی خاں متولیان سابق بودند کہ شیعہ شدند۔"

دکن کے شیعہ علما | شمالی ہندوستان میں شیعہ اقتدار کے مرکز قائم ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں نامور شیعہ علما ایران سے آنے شروع ہوئے یا مقامی باشندوں میں ہی فروغ پانے لگے۔ اس سے پہلے رقا صنی نور اللہ شورتی اور ملا محمد زیدی کو چھوڑ کر شیعہ علما کے نام دکن کی شیعہ سلطنتوں کے ضمن میں آتے ہیں۔ مثلاً میر محمد مومن استر آبادی جو شاہ طہماسپ صفوی کے دربار میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے اور ایک شہزادہ اقتدار کی کشمکش میں ناکام رہا تو انھیں بھی اس سے قریبی تعلقات کی بنا پر ایران چھوڑنا پڑا۔ وہ شمالی ہندوستان کے رستے دکن چلے گئے اور سلطان محمد قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ کی ملازمت اختیار کی اور رفتہ رفتہ وکیل السلطنت ہو گئے اور کوئی پچیس سال اس عہدے پر فائز رہے۔ نجوم السما کے مطابق ۲۵۰ھ میں وہ زندہ تھے۔ اسی طرح میر نظام الدین احمد بن محمد معصوم الحسینی شیرازی تھے۔ ان کے والد شاہ عباس ثانی صفوی کے ہاں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ جب بادشاہ کی ہمیشہ جج کھجے گئیں تو انھیں مناسک حج کی تعلیم کے لیے ساتھ بھیجا گیا۔ کچھ اتفاقات ایسے پیش آئے کہ اس سفر میں ہی ان کی شادی اپنی شاکر وہ سے ہو گئی۔ اب بادشاہ کے در سے دونوں ایران تو واپس نہ جاسکتے تھے۔ اس لیے مکہ معظمہ میں اقامت اختیار کی۔ وہیں میر نظام الدین احمد پیدا ہوئے اور تعلیم پائی۔ جب ان کے کمالات کا شہرہ ہوا تو میر جملہ نے جو ان دنوں والی حیدر آباد عبداللہ قطب شاہ کا وزیر تھا، انھیں اور نجف اشرف کے سید سلطان کو بلا بھیجا تاکہ ان عالی خاندان سیدوں سے اپنی دو بیٹیاں بیاہ دے۔ اتفاق سے عبداللہ قطب شاہ کی دو بیٹیاں تھیں۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ ان عالی النسب سیدوں سے ان کی شادی ہو۔ اس پر میر جملہ برا فروختہ ہو کر حیدر آباد سے چلا گیا اور

اورنگ زیب سے جو ان دنوں دکن میں گورنر تھا جا ملا۔ عبداللہ شاہ کی ایک بیٹی کی شادی میر نظام الدین سے ہوئی۔ لیکن انھوں نے اپنی سالی کی سید سلطان سے شادی کی مخالفت کی اور بالآخر اس لڑکی کی شادی ابوالحسن تانا شاہ سے ہوئی جو گوکنڈہ کا آخری بادشاہ تھا۔ میر نظام الدین ایک شاعر اور عالم اور شاعروں کے قدردان تھے۔ ان کی وفات ۱۶۶۷ء یا ۱۶۶۸ء میں بمقام حیدر آباد ہوئی۔ دکن میں آنے سے پہلے ان کی حجاز میں شادی ہو چکی تھی اور اس سے ان کے ہاں ایک بیٹا مولانا صدر الدین علی المعروف سید علی خاں مدنی مدینے میں پیدا ہوا تھا جو علم و فضل میں اپنے باپ سے بھی بڑی لے گیا۔ وہ ۱۷۵۲ء میں پیدا ہوئے اور حصول تعلیم کے بعد والد سے ملنے حیدر آباد چلے گئے، لیکن اس کے جلد بعد عبداللہ قطب شاہ چل بسا اور اس کے ایک سال بعد ان کے والد بھی وفات پا گئے۔ اب ابوالحسن تانا شاہ تخت نشین تھا۔ اس نے میر نظام الدین کے متعلقین کو روق کرنا شروع کیا۔ سید علی حیدر آباد چھوڑ کر برہان پور میں اورنگ زیب کے جا ملے جو اب بادشاہ تھا اور معاملات دکن کو سلجھانے کے لیے یہاں پہنچا تھا۔ انھیں ایک اعلیٰ منصب ملا۔ اور ایک زمانے میں یہ برہان پور کے دیوان بھی مقرر ہوئے۔ لیکن بالآخر انھوں نے اورنگ زیب سے اجازت لی اور وطن کا رخ کیا۔ پہلے اصفہان میں سلطان حسین صفوی کے پاس پہنچے لیکن جب اس نے کماحقہ قدر نہ کی تو اپنے وطن شیراز کا رخ کیا۔ اور وہاں مدرسہ منصور یہ میں تعلیم و تدریس میں زندگی کے باقی دن گزار دیے اور وہیں اپنے بزرگوں یعنی امیر عبداللہ محمد اور امیر غیاث الدین منصور کے پہلو میں دفن ہوئے۔ مشہور شاعر خربس جس نے ان سے اصفہان میں ملاقات کی۔ ان کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ وہ عربی اور فارسی کے بڑے شاعر تھے۔ اور نثر میں دوسری تصانیف کے علاوہ انھوں نے اپنے زمانے کے ادیبوں کا ایک بیش قیمت تذکرہ سلافتہ العصر فی محاسن اعیان العصر کے نام سے عربی میں لکھا۔

مرشد آباد | شمالی ہندوستان میں پہلا اہم شیعہ ثقافتی مرکز مرشد آباد

تھا۔ شروع میں اس کا نام مخصوص آباد تھا، لیکن جب مُرشد قلی خاں دیوان بنگالہ نے
 سلطنت کے میں شہزادہ عظیم الشان ناظم بنگالہ سے حقیقت کی بنا پر صوبائی دار الحکومت ڈھاکہ
 کو خیر باد کہا اور نئے مقام میں نکال اور دفاتر قائم کر کے اسے دیوانی کا صدر مقام بنایا تو
 اس کا نام بھی اپنے نام پر مُرشد آباد رکھا۔ بعد میں وہ ناظم بنگالہ بھی ہو گیا اور بہار و اتر
 بھی اس کے تحت دے دیا گیا اور اس طرح یہ شہر بنگال، بہار، اتریسہ کی نیم مختار حکومت
 کا دار السلطنت ہو گیا۔ ڈھاکہ عظیم آباد اور بنگالی اس کے تابع تھے۔ افسوس کہ مُرشد آباد
 کی ثقافتی تاریخ نہیں لکھی گئی۔ اس موضوع کی اپنی دلچسپی بھی بہت ہے۔ اس کے علاوہ
 مُرشد آباد شمالی ہندوستان اور مشرقی بنگال (ڈھاکہ) کے درمیان ایک ثقافتی سنگم
 تھا اور مشرقی پاکستان کی ثقافتی تاریخ اس کے مطالعہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ پھر
 لکھنؤ کے فروغ سے پہلے جب دہلی، نادر علی اور درانی حملوں میں برباد ہوئی تو اہل علم
 کے لیے بڑی جگہ پناہ مُرشد آباد تھا۔ مثلاً مشہور شاعر سوز، میر درد کے صاحبزادے
 ائم، فدوی دہلوی، شاہ رکن الدین عشق، اشرف علی خاں خاں، شاہ قدرت اللہ خاں
 قدرت اس سلسلے میں دہلی سے مُرشد آباد پہنچے۔ ان میں سے کچھ تو حالات سدھرنے پر
 دہلی واپس چلے گئے۔ بعض نے عظیم آباد کو ترجیح دی، لیکن شاہ قدرت اللہ کی وفات
 مُرشد آباد میں ہوئی۔ (۱۹۱۷ء) مشہور شاعر انشا کا خاندان بھی نروال دہلی کے زمانے
 میں وراں گیا اور انشا خود مُرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ بعد ازاں دہلی واپس چلے گئے۔
 لیکن ان کی شاعری اور شخصیت میں کئی عناصر ایسے ہیں، جن میں مُرشد آباد کا اثر صاف
 نظر آتا ہے۔

ہماری تہذیبی تاریخ میں مُرشد آباد کا ایک خاص مقام ہے، لیکن شیعیت کی تاریخ
 میں مُرشد آباد (اور اس کے ثقافتی جانشین عظیم آباد کی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہے۔
 بد قسمتی سے اب نظامت بنگالہ کی مذہبی تاریخ کے متعلق مواد دستیاب نہیں ہوتا۔
 فقط سیر المتاخرین میں غلام حسین خاں طباطبائی نے علی ویری خاں کی وفات کے سلسلے
 میں چند شیعہ علماء و مشائخ کے نام گناے ہیں اور تذکرہ گلشن ہند میں اس علاقے کے

اُردو شعرا کے نام ملتے ہیں۔ سیر المتاخرین میں بعض اہم نام مصنف کے اپنے خاندان کے ہیں۔ مثلاً اس کے دادا سید علیم اللہ طباطبائی جو ۱۲۳۷ھ میں غنیم آباد آئے اور ۱۲۴۲ھ میں وہاں وفات پا گئے۔ ان کے حالات اور کرامات پر غلام حسین خاں نے ایک علیحدہ مثنوی بشارت الامت کے نام سے لکھی ہے۔ شاہ حیدری اس کی حقیقی دادی کے چچا تھے۔ ”در تشیع نہایت مجاہد و بے باک“۔ وہ بھاگلپور میں مقیم تھے۔ جب یہاں پر ایک رئیس محمد غوث خاں سخت بیمار پڑے۔ شاہ حیدری ان کے پاس پہنچے اور کہا کہ تم شیعہ ہونے کا وعدہ کرو۔ میں تمہاری شفا کا دمہ لیتا ہوں۔ انھوں نے قبول کیا۔ اتفاق سے وہ اچھے ہو گئے اور تمام عمر شاہ حیدری کے حلقہ بگوش رہے۔ بعض علما باہر سے آئے تھے اور بعض نے یہاں سے ایران جا کر تعلیم حاصل کی۔ مثلاً شیخ محمد حسن جو مشہور شاعر حزبی کی طرح (ایران پر افغانوں کے غلبے کے بعد ہندوستان آئے۔ میر قاسم ناظم بنگالہ نے انھیں عظیم آباد میں زمین عطا کی۔ جہاں ان کا مزار ہے۔ سب بزرگ و با اثر علماء سید محمد علی تھے۔ جن کی پیدائش دکن میں ہوئی، لیکن تعلیم ایران کے علماء سے کیا۔ حاصل کی۔ حج کے لیے مکہ معظمہ جا رہے تھے کہ ہمارے طوفان میں تباہ ہو گیا اور یہ سندھ کے کنارے پہنچے۔ وہاں سے احمد آباد۔ سورت۔ اورنگ آباد۔ ہنگلی۔ لکھنؤ۔ عظیم آباد ہوتے ہوئے پھر حج کو گئے اور حج اور زیارتوں کے بعد مرشد آباد پہنچے۔ سراج الدولہ نے ان کی قدر نہ کی بلکہ مکان سے نکال دیا۔ لیکن علی ویردی خان ان کا بڑا مداح و محقق تھا۔ اس کے چچا حاجی احمد کا ایک بیٹا سراج الدولہ کی مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے برہمنہ یا ان کی خدمت میں پہنچا اور دریا کے کنارے ایک مکان ان کی اقامت کے لیے نذر کیا۔ سید محمد علی نے یہاں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ انھوں نے عربی اور فارسی میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ مقفے عربی میں قدیم محققین و عرفا کے طریقے پر حضرت شیخ بن پاک کے حالات لکھے اور ملا محسن کاشانی کی علم فقہ کی دو کتابوں کی عربی اور فارسی شرح لکھی۔ علم نجوم میں بھی ایک نامکمل فارسی رسالہ لکھا اور انھوں نے الصفا کے کئی نسخے جمع کر کے تحقیق و مقابلہ کے بعد ایک

صحیح نسخہ مرتب کیا۔ سیر المتاخرین کا مصنف سنہ ۸۷۰ھ میں عظیم آباد سے کلکتے جاتے ہوئے مرشد آباد ٹھہرا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ مرشد آباد کے بیشتر اکابر سید محمد علی کی خدمت میں حاضر ہو کر مستفید ہوتے تھے۔

جن مقامی علمائے ایران میں تعلیم حاصل کر کے امتیاز حاصل کیا۔ ان میں شیخ یورہ (بہار) کے مولوی نصیر اور ان کے صاحبزادے تھے۔ جس زمانے میں امیر الامرا شاہ خاں حاکم بنگالہ تھے، اس وقت یہاں ایران سے اخوند ملا شاہ محمد شیرازی تشریف لائے، لیکن جلد واپس چلے گئے۔ مولوی نصیر تحصیل علم کے لیے ان کے ساتھ ایران روانہ ہوئے۔ اور ان کی سواری کے ساتھ پاپادہ چل کر ہر روز سبق حاصل کرتے۔ ایران میں وہ چوٹی کے علما کی خدمت میں پہنچے اور فقہ و احادیث اور علوم دینیہ، بالخصوص ہدیت ہندوہ اور حساب میں امتیاز حاصل کیا۔ ایران میں ان کی بڑی عزت تھی، لیکن وہ ہندوستان واپس آئے اور عظیم آباد میں مقیم ہو گئے۔ ان کے بیٹے داؤد علی خاں ان سے تعلیم حاصل کر کے ان کے جانشین ہوئے۔ کچھ دیر بعد زیارتوں کے لیے گئے اور اس میں اتنا شغف حاصل کیا کہ ان کا لقب ہی زائر حسین خاں ہو گیا۔ ان کے صاحبزادے محمد حسن خاں ہوئے۔ مرشد آباد میں ایک قابل ذکر ہستی قاضی غلام مظفر کی تھی، جنھیں علی ویردی خاں نے اپنا داروغہ عدالت مقرر کیا تھا۔ ”مرد خوش تقریر، باکس فتویٰ علمی ماہر و در نظم و نثر سلیقہ لائق داشت۔“

شاہان اسلام کا عام دستور یہاں ہے کہ خواہ دلی لگاؤ کی خاطر، خواہ عوام میں اپنی علم نوازی کا سکہ بٹھانے کے لیے علما سے خاص امتیاز کرتے۔ بلین، بایں ہمہ طنطنہ و تکبر پورے کو کبیہ شاہی کے ساتھ برگزیدہ علما کے گھر جاتا۔ علما کو تمام شاہی دعوتوں میں بلانے اور ان سے علمی اختلاط کے لیے وقت نکالنے کا رواج تو عام تھا۔ مرشد آباد میں بھی اس پر عمل درآمد تھا۔ علی ویردی خاں کے مصروف نظام اوقات میں علمی مجالس کے لیے بھی وقت تھا۔ جب وہ عصر کی نماز سے فارغ ہوتا تو علمی اور دینی مجلس برپا ہوتی۔ افاضل و ارباب مثل سید الافاضل میر محمد علی فاضل اداام الشریعہ، ونقی قلی خاں و حکیم ہادی خاں و

مرزا محمد حسین صفوی وفا ضلع دیگر ملتان (جس کا نام مولف سیر المتاخرین کو یاد نہیں رہا) دیوان خانے میں تشریف لاتے سید محمد علی کا اس محل میں جو احترام ہوتا وہ دیکھنے کی چیز ہے۔ دیوان خانے میں ناظم کی مسند کے بالمقابل ان کے لیے مستقل مسند رکھی تھی جس پر ایک بڑا تکیہ پڑا رہتا۔ جب وہ باہر کے دروازے میں داخل ہوتے اور چوڑے پر قدم رکھتے۔ علی ویردی خاں اپنی مسند پر کھڑا ہو جاتا اور جب چوڑے اور صحن کا فاصلہ طے کر کے وسیع ایوان عمارت میں داخل ہوتے تو بعد وفا صلہ کے باوجود علی ویردی خاں مسند سے اتر کر ان کو باادب سلام کرتا۔ وہ جواب دیتے اور اپنی مسند معینہ پر جا بیٹھتے۔ اس وقت علی ویردی خاں اپنے پہلو سے ایک تکیہ کوچک ان کی خدمت میں پیش کرتا۔ پھر علما کے لیے حقے لائے جاتے اور قہوے کا دور شروع ہوتا۔ علی ویردی خاں حقہ نہیں پیتا تھا، لیکن قہوے میں شریک ہوتا۔ ابتدائی مراسم ختم ہو جاتے تو فاضل ملتان کے سامنے تکیہ دھرا جاتا۔ جس پر امامیہ مذہب کی ایک نہایت اہم کتاب رکھی جاتی۔ وہ اس میں سے چند اجزا پڑھتے، جن کی تشریح و تفہیم سید محمد علی کرتے۔ پھر علمی اور دینی مسائل پر گفتگو ہوتی۔ دو گھنٹے تک یہ مجلس قائم رہتی۔ پھر سید محمد علی رخصت ہوتے اور اسی احترام و مراسم کے ساتھ جن سے ان کا خیر مقدم ہوا تھا، علی ویردی خاں انہیں خیر باد کہتا۔ آہستہ آہستہ دوسرے علما تشریف لے جاتے اور یہ مجلس ختم ہوتی۔

مرشد آباد کے تمدن میں فقط خوبیاں اور نیکیاں ہی نہ تھیں۔ جو باتیں دور زوال میں قائم شدہ اکثر شخصی ریاستوں میں عام تھیں، مرشد آباد ان سے مستثنیٰ نہ تھا، لیکن مرشد قلی خاں جو ۱۷۶۷ء تک برسر اقتدار رہا اور علی ویردی خاں جو ۱۷۶۷ء سے ۱۷۷۷ء تک ناظم تھا، دو بڑے قابل اور منظم حاکم تھے اور انھوں نے مرشد آباد کو ایک اہم سیاسی اور ثقافتی مرکز بنادیا تھا۔

مرشد آباد کے ساتھ ساتھ عظیم آباد کا ذکر بھی واجب ہے جو ۱۷۷۷ء میں مرشد آباد کے تابع آگیا۔ لیکن اپنے محل وقوع اور مرشد آباد

عظیم آباد

کے تیز سیاسی زوال کی وجہ سے زیادہ اہم اور پائدار ثقافتی مرکز ثابت ہوا۔ اس کی اہمیت اس وقت شروع ہوئی جب ۱۸۵۷ء میں شہزادہ عظیم الشان حاکم بنگالہ نے دھاکہ کی جگہ پٹنہ کو اپنا صدر مقام چنا۔ کئی عمارتوں اور محلوں کا اضافہ کیا اور شہر کا نام اپنے نام پر عظیم آباد رکھا۔ بعد میں ناظم بنگالہ کا دار الحکومت مرشد آباد ہوا، لیکن بہار کا ناظم یا نائب ناظم عظیم آباد میں رہتا تھا اور شہر کا ثقافتی تسلسل برقرار رہا۔ مرشد آباد کے اثر سے یہاں کئی اہم شیعہ خاندان آباد ہوئے اور اب بھی موجود ہیں۔ لیکن اس معاملے میں یہاں کیفیت مرشد آباد سے کسی قدر مختلف رہی اور یہ محض اتفاق نہیں کہ نادر علی حملہ کے بعد جب دہلی کے شاعر اور ادیب منتشر ہوئے تو مظہر جانجاناں کے اکثر نامور تلامذہ و مرید جن میں سے بعض مثلاً ہدایت قلی خاں حسرت۔ میر محمد باقر حریری۔ محمد فقیہ دردمند ساآئندہ فن میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ مرشد آباد نہیں گئے۔ عظیم آباد آئے۔

عظیم آباد کی ثقافتی تاریخ لکھنا یہاں ممکن نہیں۔ صرف چند اہم ناموں کو گنایا جاسکتا ہے۔ شاید ان میں سرفہرست سیر المتاخرین کے مصنف غلام حسین خاں طباطبائی کا نام ہے۔ ان کے والد علی دیر دی خاں کے قرائت دار تھے اور کچھ دنوں عظیم آباد میں صوبیدار رہے، لیکن بیٹے کا اسل ظرہ افتخار سیر المتاخرین کی تصنیف ہے۔ اس میں کئی فنی نقص ہیں مصنف کا تعصب مذہبی تو صاف ظاہر ہے۔ لیکن مخلوق کے عہد و آل کی اس سے زیادہ مکمل تاریخ کوئی نہیں مصنف کی معلومات وسیع تھیں اور نگہ غائر اور نئی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاموں اور اصولوں پر انھوں نے تین برأت اور معاملہ فہمی سے تبصرہ کیا ہے، وہ اسلامی ہندوستان کے سیاسی ادب میں اسرید کے اسباب علی کی طرح ایک محرک کی چیز ہے۔ انھوں نے اپنے دادا شاہ عظیم اللہ دہلوی کے حالات میں ایک مثنوی بشارت الامت اور مثنوی مولنا روم کی ایک شرح بھی لکھی۔

جو مرتبہ طباطبائی کا سیاسی تاریخ نگاری میں ہے، قریب قریب وہی رتبہ نواب علی ابراہیم خاں کا ادبی تاریخ میں ہے۔ ان کے ادبی اور سیاسی کارناموں کا بھی صحیح

جائزہ نہیں لیا گیا، لیکن وہ ایک غیر معمولی شخصیت اور مستعدی کے انسان تھے۔ وہ عظیم آباد کے قریب شیخ پورہ میں پیدا ہوئے۔ مرشد آباد میں نشوونما پائی۔ وہ ایک زمانے میں عظیم آباد کے نائب ناظم ہو گئے اور میر قاسم کے وزیر باقیہ سیراس زمانے میں تھے، جب وہ انگریزوں سے برسرِ پر خاش تھا۔ اس کے باوجود انگریزوں کی قابلیت کے معترف تھے۔ آخر میں وہ مرشد آباد میں خانہ نشین ہو گئے تھے (مذکورہ مشرت افزا) لیکن ۱۸۸۱ء میں جب وارن ہسٹنگز کلکتہ سے مغرب کی طرف تسخیر ممالک کے لیے چلا تو راستے میں مرشد آباد سے نواب علی ابراہیم خاں کو "بصدا عزاز و اکرام" اپنے ساتھ لیا اور جب راجا جیت سنگھ والی بنارس کو برطرف کیا تو نواب ابراہیم کو عدالت دیوانی ضلع بنارس کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا۔ لارڈ کارنوالس کے عہد میں وہ وہاں کے گورنر بھی رہے۔ قیام بنارس کے دوران میں انھوں نے ادبی اور سیاسی تاریخ نگاری کی طرف توجہ کی۔ ان کی مشہور ترین تصنیف اردو شعرا کا تذکرہ گلزارِ ابراہیم ہے جس کا اردو ترجمہ گلشنِ ہند انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے۔ اس کا زیادہ حصہ مرشد آباد میں لکھا گیا۔ مرشد آباد اور عظیم آباد کی ادبی تاریخ جاننے کے لیے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ فارسی شعرا کا تذکرہ صفحہ ابراہیم انھی خوبوں کا مخزن ہے جو اردو تذکرے کا ماہر الامتیاز ہیں۔ لیکن یہ زیورِ طبع سے محروم ہے۔ خلاصۃ الکلام منظوم نگار فارسی شعرا کا تذکرہ ہے۔ ان کے علاوہ کئی تاریخی کتب اور "خطوط" ان سے یادگار ہیں ۱۸۹۳ء میں بمقام بنارس وفات پائی۔ نواب کی ڈیوڑھی کے نام سے ایک محلہ اب تک ان کے نام سے وہاں آباد ہے۔

اٹھارھویں صدی میں عظیم آباد کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت یہاں کے بعض ہندو کائستھ روسا کا فروغ ہے جنھوں نے اردو ادب کی سرپرستی کی۔ مثلاً مہاراجا شاستری جو عظیم آباد کے نائب صوبہ دار مرشد آباد کے نائب دیوان تھے۔ ان کے دربار سے اشرف علی خاں خاں جیسے شاعر وابستہ تھے۔ بڑے انقلابوں کے بعد ۱۸۵۷ء میں وفات پائی۔ ان کے بیٹے مہاراجا کلیان رائے عاشق بھی صاحبِ دیوان شاعر تھے۔

ان سے پہلے میر جعفر کے زمانے میں مہاراجا رام نرائن موزوں عظیم آباد میں ناظم تھے۔ وہ فارسی میں سزئی کے شاگرد تھے اور اردو میں بھی صاف خوشگوار شعر کہتے تھے۔ میر قاسم نے انھیں معزول کر کے ۱۷۳۸ء میں گنگا میں غرق کر دیا۔

عظیم آباد کی دوسری ادبی ہستیوں میں راسخ تھے، جنھیں بہار کا میر کہا جاتا ہے۔ ۱۸۲۵ء میں وفات پائی۔ ان کے ہم عصر بلکہ پیشرو شاہ رکن تھے۔ انیسویں صدی کی قابل فکر ہستیوں میں شاہ اُلفت حسین فریاد تھے، جو ۱۸۰۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۱ء میں وفات پا گئے۔ ۱۸۳۸ء میں وہ مرشد آباد چلے گئے۔ اور مرشد زاروں کے تابع مقرر ہوئے۔ چار سال بعد وہ ناظم مرشد آباد کی طرف سے سفیر ہو کر کلکتے گئے اور ۱۸۶۲ء تک وہیں رہے۔ ان بتیس سالوں میں وہ سولہ برس تک عمدہ سفارت پر مامور رہے۔ بعد میں استعفیٰ دے دیا، لیکن کلکتے میں علمی اور ادبی زندگی میں ان کا بڑا مقام تھا۔ انھوں نے فارسی زبان میں کئی اخبارات مثلاً آئینہ گیتی نمائنگالے۔ اکابر کلکتہ ان کا بڑا ادب کرتے تھے، بلکہ اکثر (مثلاً خان بہادر عبداللطیف بانی محطن لٹریٹری ایسوسی ایشن۔ عبیدی سہروردی۔ مولانا عبدالرؤف وحید) آپ کے شاگرد تھے۔ آپ کی مفصل سوانح عمری (حیات فریاد) آپ کے فخر استاد شاگرد جناب شاد عظیم آبادی نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے ۱۹۲۶ء میں مکمل کی۔ فی الحقیقت یہ کتاب عظیم آباد۔ مرشد آباد۔ کلکتہ کی علمی اور ادبی زندگی کا مرقع ہے۔ شاد خود متعدد تاریخی اور ادبی کتب کے مصنف اور ایک قادر الکلام شاعر تھے۔

انیسویں صدی میں بہار کے جن بزرگوں نے نام پایا، ان میں صفیر بلگرامی تھے، جو آگرے میں بس گئے تھے اور دوسری کتب کے علاوہ جلوہ خضر کے مولف تھے۔ ان کے علاوہ فرو۔ میر وزیر علی خیرتی۔ شاہ فرزند علی صوفی۔ سیّد شاہ امین احمد فروزی شوق۔ آغا حسین قلی عاشقی مولف تذکرہ فشر عشق بھی قابل یاد ہیں، لیکن شاید بہار کا اس صدی کا سب سے اہم ثقافتی کارنامہ بانکے پور لائبریری کا قیام ہے۔ جس کا آغاز خان بہادر مولوی خدا بخش کے والد نے کیا تھا، لیکن جسے انھوں نے بے انتہا

وسعت دے کر اسلامی دنیا کا ایک اہم کتب خانہ قائم کر دیا اور ۱۸۹۰ء میں اسے وقف کیا۔ اسی صدی میں عظیم آباد کے محلہ صادق پورہ نے شہرت پائی جو مولانا سید احمد شہید بریلویؒ کے سفر عظیم آباد (۱۸۶۱ء) کے بعد دیتی اور علمی سرگرمیوں کا بڑا مرکز ہو گیا تھا۔ ان دیتی سرگرمیوں کا ذکر ہم سوچ کوثر میں کریں گے۔ علمی حیثیت سے اس مرکز کے نمائندے حکیم مولانا عبدالحمید پریشان تھے جن کے والد ماجد مولانا احمد اللہ صاحب کو ۱۸۶۵ء میں جس دوام عبور دریائے شور کی سزا ملی تھی۔ حکیم صاحب کا علمی فیض ان کے نواسہ ڈاکٹر عظیم الدین عظیم نے جانی رکھا جن کے بیٹے ڈاکٹر کلیم الدین احمد اردو تنقیدی حلقوں میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔

لکھنؤ کے اکابر شیعہ علما

شمالی ہندوستان میں شیعیت کا سب سے اہم مرکز لکھنؤ ہے۔ وہاں کی ادبی اور ثقافتی تاریخ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ شیعہ علما پر بھی مستقل کتابیں ممتاز لکھنؤی اہل قلم نے لکھی ہیں، لیکن ان کی زیادہ شہرت نہیں ہوئی۔ اور شیعہ علما کے حالات سے عام طور پر بے خبری ہے۔

شیعہ علما میں سب سے اہم مولانا سید ولد علی صاحب تھے۔ وہ ہندوستان کے پہلے مجتہد تسلیم کیے

مجتہد العصر مولانا ولد علی صاحب

جاتے ہیں اور نجوم السما میں لکھا ہے کہ ان علاقوں میں جو کوئی شیعہ مذہب کا پرچار ہے۔ وہ ان کی بدولت ہے (وآنچه دریں دیار قدرے از دین و اسلام است۔ ہمہ از برکات آنجناب غفران مآب است) انھوں نے پہلی مرتبہ شمالی ہند میں شیعہ جماعت کی مذہبی تنظیم کی۔ ان کی علیحدہ نماز جمعہ اور باجماعت نماز کا سلسلہ شروع کیا اور اشاعت و ترویج شیعیت پر لوری توڑ دی۔ وہ نصیر آباد میں ۱۲۵۳ء پیدا ہوئے۔ ہندوستان کے فضلاء سے علوم عقلیہ حاصل کرنے کے بعد وہ عراق تشریف لے گئے اور تکمیل تعلیم کا کوئی دقیقہ فروگذا نہ کیا۔ کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف میں جو مشہور ائمہ تھے

ان کی خدمت میں پہنچے اور فقہ وحدیث واصول کی تعلیم حاصل کی۔ پھر مشہد گئے اور وہاں کے بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ ہندوستان واپس آکر اہل وعیال کو لکھنؤ بلالیا اور یہیں اپنے آپ کو تصنیف وتالیف اور اشاعت وتظیم شیعیت کے لیے وقف کر دیا۔

اس زمانے میں فیض آباد میں (جو لکھنؤ کے فروغ سے پہلے کچھ عرصہ تک اودھ کا دارالحکومت رہا) ملا محمد علی کشمیری کا بڑا شہرہ تھا۔ وہ ملا عبدالحکیم کشمیری کے شاگرد تھے اور کشمیر سے آکر فیض آباد میں مقیم ہو گئے تھے۔ ان کی زیادہ توجہ علم فقہ پر تھی۔ انھوں نے فصیلت نماز جماعت پر ایک رسالہ لکھا جس میں نواب آصف الدولہ کی توجہ اس طرف دلائی کہ اس کے ملک میں مولانا سید ولد دار علی حبیب الدین دار اور مجتہدین کربلا و مشہد کا مانا ہوا عالم موجود ہے جو پیش نماز ہونے کے ہر طرح لائق ہے۔ اگر نواب نماز بیچکاتہ اس کے پیچھے پڑھیں تو ہر جگہ نماز باجماعت کا رواج ہو جائے گا۔ نواب نے ملا محمد علی کشمیری کا یہ مشورہ قبول کیا اور مولانا ولد دار علی کو نماز جماعت میں پیش امام بننے پر آمادہ کر لیا اور اودھ میں ایک نئی مذہبی زندگی کا آغاز ہوا۔

مولانا ولد دار علی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مثلاً مرآۃ الحقول (ملقب بہما داسلام) جو پانچ ضخیم جلدوں میں لکھی گئی۔ پہلی جلد مباحث توحید کے متعلق دوسری مباحث عقل اور متعلقہ مسائل کے بیان میں تیسری نبوت۔ چوتھی امامت اور پانچویں معاد جسمانی و روحانی کے متعلق تھی۔ نجوم السماء میں لکھا ہے ”الحق کتابیت کہ گوش فلک نظمیں نشیدہ و چشم روز کا عدیش ندیدہ“ اساس الاصول بھی اسی طرح کی ایک ٹھوس کتاب ہے۔ ان دو کے علاوہ آپ نے کچھ کتابیں اور رسالے شاہ عبد العزیز دہلوی کی تحفہ اشاعرہ کے مختلف ابواب و بیانات کی تردید میں لکھیں۔ تصوف کے مخالف تھے۔ خراب ثاقب میں آپ نے مذاہب مبتدعہ صوفیہ پر نکتہ چینی کی ہے اور ان مشہور صوفیہ کی تردید کی جو وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اس مستقل کتاب کے علاوہ آپ نے مولوی محمد سمیع صوفی کے جواب میں ایک رسالہ لکھا۔

جس میں تصوف کا بطلان کیا ہے اور شیعہ علما کو اس سے پاک ثابت کیا ہے۔ ان کے علاوہ کسی رسالے فقہی مسائل کے متعلق تھے۔ مثلاً رسالہ ذہبیہ جو ظروف ذہبی کے احکام کے متعلق ہے۔ رسالہ ارضین جس میں املاک و اراضی اور ان معاملات کے جو کفار ہندو وغیرہ سے پیش آتے ہیں مسائل بیان ہوئے ہیں وغیرہ۔ مولنا ولد ار علی نے ۴ مئی ۱۸۲۷ء میں وفات پائی۔ مزار لکھنؤ میں ہے۔

سلطان العلماء سید محمد صاحب مجتہد العصر۔ مولنا ولد ار علی صاحب کے کام کی اہمیت صرف ان کی تصانیف اور ذاتی تنظیمی کوششوں میں نہیں، بلکہ ان کے تلامذہ اور فرزندوں نے ان کا کام جاری رکھا اور اس کی بنیادیں گہری اور پختہ کر دیں۔ ان کے مشہور تلامذہ میں سے مفتی سید محمد قلی خاں کنٹوری۔ مرزا محمد خلیل زائر۔ سید احمد علی الحمد آبادی اور میر مرتضیٰ کے نام لیے جاتے ہیں۔ مولوی یاد علی نے جو آپ کے چچے بھائی اور شاگرد تھے، کلام مجید کی فارسی تفسیر شیعہ نقطہ نظر سے لکھی، لیکن آپ کا اصل فیض آپ کے فرزندوں نے جاری رکھا۔ ان میں سب سے بڑے اور والد کے جانشین اور وصی سلطان العلماء مولنا سید محمد تھے۔ ”مرجع خلائق در ریاست دینی و دنیوی بود“ شاہان اودھ کے عہد میں ان کا وہی مرتبہ تھا جو بعض سنی ممالک میں شیخ الاسلام کا ہوتا ہے۔ شاہان اودھ کی رسم تاج پوشی کے وقت سلطان العلماء ہی ان کے سر پر تاج رکھتے۔ مملکت کے تمام شرعی اور مذہبی امور آپ کی رائے سے طے پاتے۔ محکمہ افتا آپ کے سپرد تھا اور آپ کی سفارش پہی مفتی اور اس محکمہ کے دوسرے ملازم مقرر ہوتے۔ آپ کے مشورے سے ایک مدرسہ شاہی قائم کیا گیا۔ بادشاہ آپ کی رائے کا بڑا پاس کرتے اور وہ اپنا اثر و رسوخ شیعہ ضرورت مندوں کی حاجت پوری کرنے اور شیعہ مذہب کی اشاعت و تقویت کے لیے استعمال کرتے۔ غالب کے فارسی خطوط پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اسے شاہان اودھ سے عطیہ اس وقت وصول ہوا، جب اس نے سلطان العلماء کو اپنا فریہ واسطہ بنایا۔ اور جب بہادر شاہ نے غالب سے ایک فارسی مثنوی لکھو کر اپنی شیعیت کی تردید کرائی تو غالب کو مجتہد العصر سلطان العلماء سید محمد صاحب کے سامنے اس کے لیے

جواب دہ ہونا پڑا۔ اس خاندان کے ساتھ غالب کے خاص مراسم تھے۔ جب سلطان العلماء کے بھائی سید العلماء سید حسین نے وفات پائی تو غالب نے ایک بڑا پیر درویش لکھا۔

گشت داغ غم حسین علی
تازہ در ماتم حسین علی

جس دبدبے اور اخلاقی جرأت کے انسان سلطان العلماء تھے، اس کا اندازہ اس کے ہو سکتا ہے کہ جب چند روز کی رہت روی کے بعد واجد علی شاہ عیش و عشرت میں نہمک ہو گیا تو مجتہد العصر نے اپنے عہدے سے استعفیٰ پیش کیا، لیکن واجد علی شاہ نے اصرار کیا کہ یا تو خود یہ فرائض بجالائیں یا اپنے خاندان سے کسی دوسرے کو نامزد کریں اور فرقہ امامیہ کی ضروریات کی طرف توجہ دلائی تو مجتہد العصر کو استعفیٰ واپس لینا پڑا۔ (۱۸۶۸ء) ہنومان گڑھی کے واقعہ پر بھی آپ نے مولوی فضل حق خیر آبادی اور مولوی سعد اللہ سے زیادہ جرأت ایمانی کا ثبوت دیا اور لکھا "قصاص مسلمانان از کافراں و قصاص کلام اللہ و بنا نہادن مسجد بر حکام وقت بہ تجویز حاکم شرع واجب است" (تاریخ اودھ حصہ پنجم ص ۲۲۲ و ص ۲۳۶) شاہان اودھ (بالخصوص امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ) کے زمانے میں سلطان العلماء جو اقتدار حاصل تھا۔ وہ ان کے والد بزرگوار کے حصے میں بھی نہ آیا، لیکن ان کے حصے میں تلخ لمحے بھی زیادہ تھے۔ اودھ کی حکومت کا خاتمہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوا اور جنگ آزادی کے بعد جب لکھنؤ پر دوبارہ انگریزی قبضہ ہوا۔ تو آپ کو لکھنؤ سے ہجرت کر کے قریب کے ایک قصبہ میں پناہ لینی پڑی اور اپنے خاندان اور عیال و اطفال کے ساتھ تشویش اور پریشانی کا ایک پر آشوب زمانہ دیکھنا پڑا۔

آپ کی وفات ۲۴ جولائی ۱۸۶۸ء کو ہوئی اور اپنے خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

آپ کی کتابوں کے مصنف تھے۔ تحفہ ثنائی عشریہ کے ایک حصہ (باب امامت) کا بھی آپ نے جواب لکھا جو نظر ثانی نہ ہو سکنے کے باعث شائع نہ ہوا۔ لیکن ایک رسالہ اس

کتاب کے بعض اندراجات کی تردید میں عام طور پر ملتا ہے۔ ایک رسالہ فوائد نصیریہ کے نام سے آپ نے احکام زکوٰۃ خمس کے متعلق لکھا اور غالباً آپ کے اثر سے ہی شاہان اودھ میں پہلی مرتبہ امجد علی شاہ نے باقاعدہ زکوٰۃ دینی شروع کی جو تین لاکھ سالانہ کے قریب تھی اور آپ کی نگرانی میں محتاجوں اور مستحقوں کو نصیب ہوتی۔

آپ کے جانشین آپ کے صاحبزادے سید ابوالحسن ہوئے جنہیں امجد علی شاہ نے مٹیابرج کے قیام کے دوران میں ملاذ العلماء اور حکومت انگلشیہ نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔

سید دلدار علی صاحب کے دوسرے بیٹے بھی علم و فضل میں ممتاز تھے۔ سید علی ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے اور عراق میں تعلیم پائی اور تصنیف و تالیف اور تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے کئی مباحثوں اور مناظروں میں حصہ لیا اور واقعہ فدرک متعہ۔ جواز تعزیر داری کے متعلق رسائل لکھے۔ لیکن ان کا اہم ترین کام کلام مجیدی اردو زبان میں تفسیر ہے جو دو جلدوں میں مکمل ہوئی اور امامیہ نقطہ نظر کی ترجمان ہے۔ تفسیر کی تکمیل کے بعد وہ اپنے بعض دوستوں کے ساتھ زیارتوں کے لیے عراق کی طرف روانہ ہوئے اور اس سفر کے دوران میں ۱۸۷۲ء میں کربلائے معلیٰ میں وفات پا گئے۔ ایک اور صاحبزادے سید حسن تھے۔ انھوں نے اصول دین پر دوسری کتب کے علاوہ اردو زبان میں ایک مبسوط کتاب لکھی۔ ان کی وفات ۱۸۷۲ء میں بمقام لکھنؤ ہوئی۔ پانچویں صاحبزادے سید عہدی تھے۔ وہ تیس برس کی عمر میں اپنے والد کی زندگی ہی میں وفات پا گئے۔ مولانا دلدار علی کو اس ہونہار بیٹے کی جوانمردی کا بڑا رنج ہوا جس کا اظہار انھوں نے ایک کتاب مسکن القلوب میں کیا ہے۔

مولانا سید دلدار علی اور ان کے خاندان کی
لکھنؤ کی شخصیت کی خصوصیات

شمالی ہندوستان میں اثنا عشری خیالات کی تنظیم و اشاعت میں قریب قریب وہی حیثیت ہے جو عام مسلمانوں میں شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کی ہے۔ لیکن تصوف کی جس طرح مولانا نے مخالفت کی۔ اس سے

کئی شیعہ اہل الرائے متفق نہیں۔ مثلاً حیات فریاد میں سید علی محمد شاد صفوی بادشاہوں کی ان کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے جو سیاسی اور دوسری مصلحتوں کی بنا پر انھوں نے تصوف کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کے لیے کیں لکھتے ہیں :-

”اس شیعہ گروہ علمائے ریاضت، متصوفین بادرین و دیانت کے مشاڈ اٹنے اور ان کی بڑ بنیاد کھود ڈالنے کے لیے ایک زمانہ میں جبکہ شاہ سلطان حسین صفوی بادشاہ ایران تھا اور جناب علامہ مجلسی قاضی القضاۃ تھے، بارہ سو فاضل صرف اس امر کی تحقیق میں سرگرم تھے کہ دریافت کریں کہ کون الہیات و ریاضیات میں مشغول ہے تاکہ اس کی تردید کریں۔ علمائے ظاہر و شریعت محض کا نہایت سختی سے برتاؤ تھا۔ طہارت جسمانی کے آگے طہارت باطن کا دھیان اور خیال تک نہ رہا تھا۔ ان باتوں کی طرف متوجہ تھے کہ یوں ہاتھ کو غوطہ دو اور یوں پاؤں کا مسح کرو۔ اور اس قسم کے بیانیوں میں بال کی کھال کھینچی جاتی، اصل بڑ طہارت باطن و صفائی قلب کے خیال کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ ہندوستان کی شیعہ جماعت تو تابع اور شاگرد علمائے عراق و ایران کے ہے۔ یہی حالت ہندوستان بھر کے شیعوں کی ہو گئی کہ باطنیت کا کہیں نام تک نہیں رہا۔ بقول جناب آقا احمد مجتہد بہانی کے شاخ کو پکڑ لیا۔ اور بڑ کھو ڈالی۔ جس زمانے میں جناب غفران مآب مولانا سید ولد علی مغفور تحصیل علوم دینی کے لیے عراق تشریف لے گئے تھے تو علمائے باطن میں سے ایک بھی عراق و ایران میں نہ تھا اور اگر کوئی ہو گا تو بالکل پوشیدہ پہاڑوں میں چھپا ہو گا۔ حضرت غفران مآب جو سبق وہاں سے پڑھ آئے تھے یہاں کے شیعوں نے طوطوں اور میناؤں کی طرح بٹنے شروع کیے۔ پھر انیس مروجہ کے اس مصرعہ کو ”جن پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے“ خلاف شریعت کیوں نہ سمجھا جاتا۔ راقم موجودہ شیعوں کے اعتقادات کو ہرگز برا نہیں جانتا، جو ظاہر شرع کے مطیع و معاند ہیں۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ تصوف ہر مذہب کی رُوح و جان ہے۔ اگر اس کو نکال دیا تو مذہب بے رُوح ہو کے رہ گیا۔“

سید علی محمد خود شیعہ تھے۔ اس لیے ہم نے ان کی رائے کو تفصیل سے نقل کر دیا لیکن تصوف کے متعلق یہ رائے ان تک محدود نہیں۔ ہندوستان میں تصوف کا رنگ عام طور پر

اں طرح چھایا ہوا ہے کہ شیعہ حضرات بھی اس سے پوری طرح آزاد نہیں مغربی پاکستان بالخصوص سندھ اور جنوب مغربی پنجاب میں کئی صوفی خانوادے ایسے ہیں جن کے بزرگ شیعہ خیالات کے ہیں۔ خود دہلی میں غالب شیعہ تھا اور مولانا دلدار علی کے خاندان سے اس کے خاص مراسم تھے، لیکن وہ وحدت الوجود کا قائل تھا اور چشتی خاندان کے ایک بزرگ کا مرید تھا۔ خاص طور پر متشرع اور ثقہ حلقوں اور مرکوزوں کے باہر شیعیت اور تصوف کے اس امتزاج نے فرقہ وارانہ اختلافات کم کر دیے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس بزرگ عظیم میں بالخصوص ان علاقوں میں جو اب پاکستان میں ہیں، شیعہ سنی تعلقات خوشگوار رہے ہیں۔

دوسرے علمائے شیعہ | مولانا سید دلدار علی کے خاندان کے علاوہ اس زمانے میں کئی اور نامور شیعہ علمائے تھے۔ ان میں ملا محمد علی کشمیری کا ہم ذکر کر چکے۔ ایک اور سرگرم شیعہ بزرگ مرزا محمد کمال بن عنایت احمد خاں کشمیری مقیم دہلی تھے۔ وہ ایک حاذق طبیب تھے، لیکن شیعہ سنی مباحث میں بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز سے ان کی تحفہ اثنا عشریہ سے پہلے ہی بحثیں ہوا کرتی تھیں اور جب یہ کتاب عام ہوئی تو مرزا نے اس کے جواب میں نزہت اثنا عشریہ لکھی۔ اس کا ذکر ہم تحفہ اثنا عشریہ کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مرزا نے متعدد کتب تصنیف کیں۔ مثلاً تاریخ العلماء، منتخب کنز العمال، ملا علی مرتضیٰ کہ دریاں احادیث و کتب تصنیف جناب امیر و دیگر ائمہ ہدی و مشالب و معائب خلفائے ثلاثہ و دیگر اصحاب، انتخاب فرمودہ۔ ایک اور کتاب علامہ ابن حجر عسقلانی کی ایک تالیف سے اخذ کی گئی تھی اور اس میں

لے خود واجد علی شاہ کی نسبت مولوی عبدالحمید شرکابیان پڑھنے کے قابل ہے۔ بادشاہ اگرچہ شیعہ تھے مگر مزاج میں مطلق تعصب نہ تھا۔ ان کا پیرانا مقولہ تھا۔ میری دوا نکھوں میں سے ایک شیعہ ہے اور ایک سنی ہے۔ اگرچہ لکھنؤ (میں) امیر اور جگہ کے قیام میں واجد علی شاہ کا سارا انتظامی کاروبار سنیوں کے ہاتھ میں تھا۔ وزیر اعظم (منصور الدولہ) منشی السلطان وغیرہ سنی تھے شیعہ مذہبی تقریبات کا انصرام بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔

صحاب سنیہ کی قابل اعتراض باتیں جمع کی تھیں۔ کتاب تبلیغ اہل الکمال والانصاف علی اختلاف رجال اہل الخلافہ درال اسماء رجال کذابین ووضاعین و مجہولین وضعفا و خوارج و نواصب قدریہ و مرجیہ را کہ ارباب صحاح سنیہ کہ بقول اصح عبارت از صحیح بخاری و مسلم و ترمذی و مالک و نسائی و ابودر است۔ در کتاب صحاح خود آورد و اند۔ اس کتاب را از تقریب ابن حجر عسقلانی استخراج فرمودہ "ایک اور کتاب میں اہل سنت کے تعصبات اور قابل اعتراض خیالات کو جمع کیا تھا۔

مرزا محمد کی وفات بڑے افسوسناک حالات میں ہوئی اور اس سے اُس زمانے کے مذہبی مناقشات پر روشنی پڑتی ہے۔ نجوم السما کے بیان کے مطابق اس زمانے میں بادشاہ وقت کا ایک رشتہ دار امیر نواح دہلی میں رہتا تھا۔ وہ بڑا متعصب مسی تھا اور مرزا کی تصانیف پڑھ کر خون کے گھونٹ پیا کرتا تھا۔ اس نے ایک دفعہ بیماری کا بہانہ کیا اور بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ اس کے شفا پانے کی واحد صورت یہ ہے کہ مرزا محمد کو اس کے علاج کے لیے بھیجا جائے۔ بادشاہ نے باصرار انھیں جانے کے لیے کہا۔ وہ نہیں جانا چاہتے تھے، لیکن بادشاہ کے حکم سے مجبور ہو گئے۔ روانگی کے وقت وہ کہتے تھے کہ میرے لیے یہ سفر موت کا بلاوا ہے اور سب کے حقوق بخشوا کر روانہ ہوئے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ انھیں زہر دے دیا گیا اور دہلی میں لاکر پنجہ شریف میں جہاں شیعہ اکابر کی قبریں ہیں، دفن کیا گیا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۸۲۷ء میں رو پڑا ہوا۔

علامہ فضل حسین کشمیری | مذکورہ بالا بزرگوں کے علاوہ اور کئی شیعہ علما نے اس زمانے میں شہرت پائی۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس زمانے میں جب فرقہ وارانہ اختلافات زوروں پر تھے، سب زبردست شیعہ عالم ایک ایسا بزرگ تھا، جس نے اختلافی مسائل پر کچھ نہیں لکھا۔ یعنی علامہ فضل حسین خاں کشمیری۔ وہ شیعہ خیالات کے تھے۔ نجوم السما میں ان کی نسبت لکھا ہے "در تشیع غالی و نور ولائے ائمہ اطہار صلوٰۃ اللہ علیہم از سیمائے اولامح" وہ کشمیری الاصل تھے۔ لاہور میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تربیت

پانی۔ فلسفہ و حکمت میں تکمیل تعلیم بنارس جا کر شیخ علی حزیں سے کی اور تصنیف مآلیف اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ وہ علوم ریاضی کے بڑے ماہر تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی، لاطینی اور یونانی خوب جانتے تھے۔ حکماء مغرب کی کئی کتابیں انھوں نے عربی میں ترجمہ کیں اور جبر و مقابلہ، مغربی علم ہیئت، ہندسہ اور طبیعیات کی کئی مستقل کتابیں خود لکھیں۔ نمازِ ظہر سے پہلے فقہ امامیہ اور اس کے بعد فقہ حنفی کا درس دیا کرتے تھے۔ آصف الدولہ نے انھیں لکھنؤ بلا کر اپنا نائب مقرر کر دیا، لیکن وہ اس کام سے خوش نہ تھے اور دنیا داروں کا طریقہ اختیار کرنے سے انھوں نے انکار کر دیا۔ انھوں نے نیابت کے زمانے میں بھی اپنی سادگی برقرار رکھی۔ اور دروازے پر دربان تک مقرر نہ کیا جو عسدار آنا سیدھا ان تک پہنچا اور ہر وقت حاجتمندوں کا ہجوم رہتا۔ آصف الدولہ کی مسند پر نواب سعادت علی خان بیٹھا تو اس نے بھی آپ کی نیابت کو برقرار رکھنا چاہا، لیکن آپ استعفیٰ دے کر کلکتہ چلے گئے اور گوشہ عزلت میں اپنے علمی مشاغل اور مطالعہ میں مصروف ہو گئے، لیکن اب دماغی محنت اور کثرتِ کار کی وجہ سے آپ کی صحت تباہ ہو چکی تھی۔ ۱۷۹۹ء میں آپ پر فالج کا حملہ ہوا اور دماغ بھی متاثر ہو گیا۔ جب کلکتہ میں علاج سے فائدہ نہ ہوا تو تبدیلی آب و ہوا کے لیے لکھنؤ کی طرف روانہ ہوئے، لیکن لکھنؤ پہنچنے سے پہلے موت کا پیغام آپ پہنچا اور یکم ماسح ۱۲۸۰ء کو وفات پا گئے۔

اسماعیلی فرقے | ہم نے شمالی ہند کے علمائے شیعہ کے حالات کسی قدر تفصیل سے بیان کر دیے، لیکن یہ سب اثنا عشری تھے شیعوں کا

ایک دوسرا اہم فرقہ اسماعیلی ہے جو ایک زمانے میں اثنا عشری فرقے سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا اور شاید آج بھی پاکستان کے شیعہ حضرات میں اس فرقے کی تعداد کافی ہے۔ افسوس ہے ان کے علما و زعماء کے حالات دستیاب نہیں ہوئے۔ تواریخ کی کتب سے اتنا پتا چلتا ہے کہ عہدِ عالمگیری میں جب ترویجِ شرع کی کوششیں ہوئیں تو گجرات کے اسماعیلیوں سے مواخذہ کیا گیا۔ بعض بوہرہ سرگروہوں کو گرفتار کر لیا گیا اور ایسے ہیروئیل جو قہیں وہ وصول کرتے تھے، انھیں بند کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اورنگ زیب نے

یہ پالیسی برقرار نہ رکھی گئی۔ بلکہ شاہ عالم اول نے بوہرہ داعی کو جس کا صدر مقام اس وقت اجین تھا، امتیازی خطابات دیے اور اجین شہر کا قاضی مقرر کر دیا! (ڈانلڈسن) لیکن شاید اسماعیلی تاریخ میں دورِ آخر کا سب سے اہم واقعہ یہ تھا کہ خوہوں کے سرگروہ ایران سے ترک وطن کر کے ہندوستان میں آ مقیم ہوئے۔ آغا خان اول ۱۸۴۸ء میں فتح علی شاہ قاجار سے بگڑ کر ہندوستان میں پناہ گزیں ہوئے اور اُس وقت سے آغا خانی خوہوں کی نئی تنظیم کا آغاز ہوا۔ بوہرہ جماعت کے داعی نے بھی ۱۸۵۰ء میں سورت کو اپنا صدر مقام بنایا، جو ان کی جماعت کے لیے زیادہ سازگار ثابت ہوا۔

اٹھارھویں صدی کے مشائخ

عہدِ عالمگیری میں کئی اہل اللہ ہوں گے اور رقعاتِ عالمگیری میں دو تین ایسے بزرگوں (مثلاً شیخ عبداللطیف برہانپوریؒ) کے نام آتے ہیں جن کا اورنگ زیب بڑا مداح تھا، لیکن شاید سید مرتضیٰ ملتانی کے سوا (جن کی عبرت آموز داستان خافی خاں نے تفصیل سے لکھی ہے اور جنھیں عہدِ عالمگیری کا شیخِ علائی سمجھنا چاہیے) کوئی بھی ایسا نہیں جس کا ذکر تاریخی کتب میں تفصیل سے آتا ہو۔

زوالِ حکومت کے زمانے میں البتہ تصوف کو بھپھر فروغ ہوا۔ اور خانقاہ نشین بزرگوں میں نہ صرف بعض سربراہانِ آورده ہستیاں پیدا ہوئیں، بلکہ کئی نقشبندی بزرگوں (مثلاً وحدت گلشن۔ مظہر نے فارسی ادب میں نام حاصل کرنے کے علاوہ مقامی زبان کی سرپرستی کی اور اس عمل کو تقویت دی جس کی بدولت ان کے شاگردوں (مثلاً ولی احمد آبادی۔ میر درد۔ یقین۔ تابان) نے دکنی اور بھاشا کی کاپی لپٹ کر جدید اردو کی بنیاد رکھی اور اس زبان کا آغاز کیا جو قومی خیالات اور احساسات کے اظہار کے لیے فارسی کی جگہ لینے والی تھی۔

جشنیہ سلسلے کا احیاء۔

اس زمانے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ جشنیہ سلسلے نے دو تین سو سال کے بعد بارگر

رونق پائی اور اس کا باعث اس طریقے کے دو تین بزرگ تھے جو یکے بعد دیگرے اس
 زمانے میں ظہور پذیر ہوئے۔ ایک شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی ہیں جو شاہجہاں آباد میں
 پیدا ہوئے اور سفر حج کے دوران میں شیخ یحییٰ مدنی سے بیعت ہوئے۔ انھوں نے
 واپس آکر وطن میں چشتیہ سلسلے کی اشاعت شروع کی۔ کہتے ہیں کہ اورنگ زیب کا
 بیٹا بہادر شاہ شیعہ عقائد سے تائب ہونے کے بعد آپ کا مرید ہوا تھا۔ آپ کی وفات
 ۱۰۲۹ھ میں ہوئی۔ آپ کے جانشین شیخ نظام الدین ولی اورنگ آبادی تھے، جو
 شمالی ہندوستان کے رہنے والے تھے، لیکن جنھیں آپ نے تعلیم دے کر اورنگ آباد
 دکن میں ارشاد و ہدایت کے لیے بھیجا۔ یہاں شیخ نظام الدین کو بڑا فروغ ہوا، بلکہ
 مشہور ہے کہ نظام الملک آصف جاہ آپ کے مرید ہو گئے تھے۔ سلسلے کی خدمت
 میں ان کے بیٹے مولانا فخر الدین فخر جہاں شاہجہاں آبادی ان سے بھی بڑھ گئے۔ وہ
 اورنگ آباد میں پیدا ہوئے تھے، لیکن ان کی کوششوں کا میدان شمالی ہندوستان تھا۔
 یہاں دہلی میں بیٹھ کر آپ نے اطراف ملک میں خلفا بھیجے، جنھیں اپنے کام میں بڑی
 کامیابی ہوئی۔ پنجاب میں آپ نے مولانا نور محمد مہاروی کو بھیجا تھا، جنھوں نے خٹواہ
 تونسہ (ضلع ڈیرہ غازی خان) کے بانی خواجہ سلیمان تونسوی اور گولڑہ (ضلع راولپنڈی)
 جلالپور (ضلع گجرات) اور چاچڑاں کے بزرگوں کو مرید کیا۔ روہیل کھنڈ میں ان کے مرید اور
 مشہور صوفی شاعر مولانا نیاز احمد صاحب نیاز بریلوی نے چشتیہ نظامیہ سلسلے کو چمکا دیا۔
 وقت اکبر شاہ ثانی بھی آپ کا مرید تھا اور آپ کے حالات نظام الملک کے پوتے، نواب
 غازی الدین خان وزیر سلطنت نے مناقب فخریہ کے نام سے جمع کیے ہیں۔ میاں
 کالے صاحب جن کا بہادر شاہ ظفر مرید تھا اور جو مشہور شاعر غالب کے مرید تھے،
 مولانا فخر الدین کے پوتے تھے۔ مولانا کی وفات ۱۱۹۹ھ میں ہوئی۔

نقشبندیہ سلسلہ | اس سلسلے کے کئی بزرگوں نے اردو زبان اور شاعری کی تشکیل
 اور نشوونما میں مدد دی۔ جب بندہ بیراکی نے سرمد کو تباہ و برباد کر دیا تو جو حضرات

یہاں سے ترک مکان کر کے دہلی چلے گئے، ان میں ایک بزرگ شیخ عبدالاحد سرہندی معروف بہ شاہ گل و وحدت حضرت مجدد الف ثانیؒ کے پوتے تھے۔ وہ دہلی میں علما و مشائخ کے اس حلقے میں داخل ہوئے، جس میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم اور چچا شیخ ابوالرضا محمدؒ کا آنا جانا تھا۔ انھیں العارفین میں کئی جگہ ان کا ذکر آتا ہے اور شاہ ولی اللہ نے ان کے بعض مکاتیب بھی درج کتاب کیے ہیں۔ ان کے ایک مرید حاجی محمد افضل تھے، جن سے حکیم الامت نے حدیث پڑھی۔

شاہ گلشن دہلوی :- ان کے دوسرے مرید شیخ سعد اللہ گلشن دہلوی تھے، جن کا وطن برہانپور تھا، لیکن دہلی اس طرح جا کر بسے کہ دہلی ہو گئے۔ وہ خود شاعر اور بہت سے شاعروں کے مرشد اور استاد تھے۔ کلمات الشعرا میں سرخوش نے انھیں اپنا شاگرد بتایا ہے۔ گو بعد میں ہنجالی کی کشتش سے انھوں نے تبدیل کی صحبت اختیار کر لی تھی یہ حضرت حقیرؒ میں ان کی نسبت لکھا ہے۔ ”آپ شیخ عبدالاحد کے خلیفہ ہیں۔ شعر بہت عمدہ کہتے ہیں۔ چنانچہ اکثر شعر آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ باطنی حالات بھی آپ کے اعلیٰ تھے۔“ آپ نے اپنے مرشد کے عرف شاہ گل کی مناسبت سے اپنا تخلص گلشن رکھا۔ شاہ صاحب ایک تارک الدنیا بزرگ تھے۔ جامع مسجد دہلی میں رہتے۔ کئی کئی دن کے بعد کھانا کھاتے اور اکثر ترکاریوں کے چھلکوں اور پتوں پر گزارہ کرتے۔ آپ شاہ ولی اللہ کے ہم عصر تھے اور شاہ صاحب نے انھیں العارفین میں آپ کی زبانی بعض روایتیں نقل کی ہیں آپ سیر و سیاحت کے سلسلے میں ایک عرصہ احمد آباد گجرات جا کر رہے تھے۔

سرو آزاد میں آپ کے ایک سیر ضخامت دیوان کا ذکر ہے اور میخانہ درد میں دو لاکھ اشعار کا اندازہ لگایا گیا ہے، لیکن ہمیں مختلف تذکروں سے فقط چند شعر و کتاب ہوئے ہیں۔ تذکرہ نشر عشق میں لکھا ہے کہ آپ نے علم موسیقی میں ایسی تحقیقات کی کہ

لہ سرخوش لکھتا ہے: طبعے درست دارو۔ مدتے پیش فقیر مشق کردہ جنون نے بہم رساندہ از دار الخلا برآمد۔ الحال در گجرات بسرے برد۔ ملاحظہ ہو طغیانات شاہ غلام علی (قلمی) لہ اندیا آفس لاہور (مجموعہ دہلی) کی غیر مطبوعہ فہرست دیکھنے سے پتا چلا کہ وہاں دیوان کے دو قلمی نسخے ہیں۔

آپ کو دوسرا امیر خسرو کہتے تھے۔ بائیس سال بلا دوکن کی سیر کی اور بیس برس دہلی میں مقیم رہے۔ تذکروں میں آپ کے جو اشعار ملے ہیں۔ وہ ملاحظہ ہوں۔

بدرش رفتہ سجدہ باکردم
سخت جاناں نیستند از چادر سازاں کامیاب
منت پائے ماست بر سر ما
مومیائی نفع کے بخت شکست سنگ را
کلب من صورت کش معدنی رنگیں و است
گر گند گلشن تخلص ببل طعم رواست

بہ چشم خویش نگر، سحر سامری این است
نظر بہ آئینہ کن شدیشہ پری این است

گشتم شہید تیغ تغافل کشیدن
سر دیوانگی سلامت یاد
جانم ز دوست برد غزالانہ دیدنت
راز مارا چہ پردہ پوشی کرد
حیرت بہار گلشن نظارہ خودیم
بر دقت مے توں فہمید معنی ہائے نازاں
کہ شرح حکمت العین است مژگان مرزاں

ز شوق ہر رخسار یکہ چشم گریہ پیرا شد
چو گوہر در گرہ ہر اشک من فار و سحر گاہے

مکن باور بحر فہ قطع الفت کرد شوخ من
ماہ و سالم بے تو در روزیہا مستور بود
کہ چون مقراض این ظالم زباں زیر زباں دارد
چوں نگاہ کور عمر من شب دید مجبور بود
آدم الشعرے اردو وکی دکنی شاہ گلشن کا شاگرد تھا اور شاید دہلی میں نہیں بلکہ
شاہ صاحب کے طویل قیام احمد آباد کے دوران میں ان سے فیضیاب ہوا۔ وکی نے
شاہ گلشن ہی کے ایما پر اپنا دیوان فارسی دواوین کے طرز پر مرتب کیا اور اس میں وہ
مضامین باندھے جو فارسی شاعری سے مخصوص تھے۔ اس سے پہلے زیادہ تر اردو میں
بھاشا کے مضامین ہوتے تھے (ملاحظہ ہو سرو آزاد کا تتمہ) یا ریختہ کی شتر گربگی اور غیر تعینی
خیالات۔ شاہ صاحب نے وکی کو مشورہ دیا۔ "شمار زبان دکنی را گزاشتہ ریختہ را موافق
اردوئے معلی شاہجاں آباد موزوں بکنید کہ تا موجب شہرت و رواج قبول خاطر صاحب
طبعان حالی مزاج گردد" (تذکرہ قدرت) اور اس ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار افادہ اندہ

در پختہ بکار رہا۔ از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت“ وکی نے آپ کے مشوروں پر عمل کیا۔ اس وقت سے اردو شاعری فارسی کے نقش قدم پر چلی اور آہستہ آہستہ یہ زبان فارسی کی جانشین ہوئی۔

شاہ صاحب کے ایک اور شاعر مرید خواجہ محمد ناصر عندلیب تھے، جن کے صاحبزادے خواجہ میر درد اردو کے بہترین صوفی شاعر ہونے کے علاوہ کئی ضخیم صوفیانہ کتابوں کے مصنف تھے۔ میر درد ایک شعر میں اپنے معنوی بزرگوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں :-

قدرا میں ناچیز را داند جناب عندلیب
گر چہ جز کا ہے نیم، اما گیارہ گلشنم

شاہ گلشن کی وفات ۱۰۲۶ھ میں ہوئی۔ مزار وہلی میں ہے۔

مرزا مظہر جانجاناں :- ایک اور نقشبندی شاعر اور اردو زبان کے محسن مرزا مظہر جانجاناں تھے، جو ۱۰۹۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۸۵ھ میں ایک شیعہ کی گولی سے ہلاک ہوئے۔ وہ طبقہ امرا کے رکن تھے۔ ان کی پیدائش پر اورنگ زیب عالمگیر نے ان کے والد مرزا جان کے نام پر ان کا نام جان جان رکھا، لیکن جانجاناں نے زیادہ شہرت پائی۔ انھوں نے ترک دنیا کر کے تصوف اور شعروادب کے لیے زندگی وقف کر دی اور شیخ عبدالاحد سرہندی المتخلص وحدت والمعروف شاہ گل کے کئی خلفا سے فیض حاصل کیا۔ آزاد نے مظہر جانجاناں اور خواجہ میر درد کے حالات میں کسی قدر جو طرح سے کام لیا ہے اور ان نقشبندی بزرگوں سے ان خیالات کا انتہا تم لیا ہے، جو اس سلسلے کے کئی قدیمی بزرگ حضرات شیعہ کی نسبت رکھتے تھے، لیکن معاصرانہ تذکروں سے پتا چلتا ہے کہ غیر معمولی نازک مزاجی اور دل گدازنگی کے باوجود مرزا صاحب، دقیقہ رسی، علمیت مذاق سلیم، انصاف پسندی اور تصوف میں یگانہ روزگار تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب ان کی نسبت لکھتے ہیں :-

”آچیز قدر ایشان مامروں میدانیم۔ شما چہ دانید۔ احوال مردم ہند بڑا مخفی نیست کہ خود

مولد و منشا فقیر است و بلاد عرب را نیز دیدہ ایم و سیر نموده۔ احوال مردم و ولایت از ثقات
آنجا شنیدہ ایم و تحقیق کردہ کہ عزیزے کہ بر جادہ شریعت و طریقت و آثار کتاب و سنت
ہمچنین استوار و مستقیم باشد و در ارشاد طالبانِ شانِ عظیم و نفسِ قوی دارد۔ دریں جزو زلزل
مثل ایشان در بلاد مذکور یافتہ نمیشود۔ مگر در گزشتگان بلکہ در ہر جزو زلزل و جودایں چنین
عزیزان کمتر بودہ است۔ چہ جائے ایں زماں کہ پُرفتنہ و فساد است۔“

مرزا صاحب کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان میں سے آپ کے مکتوبات خاص غور
و فکر کے مستحق ہیں۔ بعض مکتوبات میں حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق اعتراضات کا
جواب دیا ہے۔ بعض میں صوفیانہ اور شرعی مسائل کی توضیح ہے۔ بعض خطوں سے اس
زمانے کی بد نظمی اور بے تربیتی پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک طویل خط میں ہندوؤں کے آئین و
مذہب کی نسبت اپنی رائے لکھی ہے۔ اور چونکہ ایک مسلمہ بزرگ کے قلم سے اس مسئلے پر
اس قدر تفصیلی اظہارِ شاف و نادر ہی کہیں ہوا ہوگا۔ اس لیے ہم اس کا پورا ترجمہ درج
ذیل کرتے ہیں :-

”آپ نے پوچھا تھا کہ ہند کے کافر عرب کے مشرکوں کی طرح بے اصل دین رکھتے ہیں
یا اس دین کی کوئی اصل تھی اور اب منسوخ ہو گیا ہے؟ دیگر ان لوگوں کے بزرگوں کے
حق میں کیسا اعتقاد رکھنا چاہیے!

واضح رہے کہ اہل ہند کی قدیم کتابوں سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ نوع انسانی کے پیدائش کے
شروع میں رحمتِ الہیہ نے ان لوگوں کی معاد و معاش کی اصلاح کے لیے ایک کتاب سمی بہ
ویدہ جس میں چار دفتر ہیں اور امر و نہی کے احکام اور ماضی و مستقبل کے واقعات ہیں۔ ایک
فرشتے برہما نام کے وسیلے سے جو ایجادِ عالم کا واسطہ ہے نازل کی۔ اس زمانے کے بعد ان

۱۔ علامہ اقبال کا بھی ایک زمانے میں یہی خیال تھا۔ جب مخزن میں انھوں نے ہندوؤں کے مقدس ہجرت گیری
کا ترجمہ شائع کرایا (۱۹۰۲ء) تو اس میں ایک شعر تھا :-
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
”زائیدگانِ نور“ کی ترکیب کے متعلق اقبال نے ایک نوٹ دیا تھا۔ زائیدگانِ نور یعنی دیوتے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اس کتاب سے چھ مذہب استخراج کیے اور اصول و عقائد کی بنیاد پر قائم کی۔ اس کو فنِ دھرم شاستر کہتے ہیں یعنی فنِ ایمانیات جس سے علم مراد ہے۔ اسی طرح (مجتہدین) نے نوع کے چار فرقے بنائے اور ہر فرقے کے لیے الگ مسلک مقرر کیا اور فروغِ اعمال کی بنا اس پر قائم کی۔ اس فن کو ناد اکر م شاستر رکھا۔ یعنی فنِ عملیات جسے علم فقہ کہتے ہیں۔

یہ لوگ نسخِ احکام کے متکرمین، لیکن چونکہ وقت اور طبیعتوں کے مطابق مناسب تخریرِ اعمال ہی ضروری ہے اس لیے دنیا کی ساری مدت کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر ایک حصے کا نام جگ رکھا ہے۔ ہر ایک جگ کی علامتیں انھیں چار دفتروں سے اخذ کی ہیں۔ جو کچھ متاخرین نے ان میں اپنے تصرفات کیے ہیں وہ قابلِ اعتبار نہیں۔

ان کے تمام فرقے توحید الہی کے بارے میں متفق ہیں۔ عالم کو مخلوق جانتے ہیں۔ فناء عالم نیک و بد کی جزا و سزا، حشر و نشر، جہنم و حساب و کتاب کے قائل ہیں۔ علوم عقلی و نقلی۔ ریاضت، مجاہدات، تحقیقِ معارف اور مکاشفات میں عہدِ طوطے رکھتے ہیں۔ ان کی بت پرستی شرک کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس کے دوسرے اسباب ہیں۔

ان کے علمائے انسانی عمر کے چار حصے کیے ہیں۔ پہلا تحصیلِ علم کے لیے، دوسرا معاش اور اولاد کی غرض سے، تیسرا مدستی اعمال اور تہذیبِ نفس کے لیے، چوتھا تجرّد و تنہائی کی مشق کے لیے جو کمالِ انسانی کا انتہائی درجہ ہے اور نجاتِ کبر لے جسے مہاکلت کہتے ہیں اس پر موقوف ہے۔ ان کے دین کے قواعد و ضوابط میں نہایت اعلیٰ درجے کا نظم و نسق ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین باقاعدہ مرتب ہوا تھا، لیکن پھر مٹا دیا گیا۔ ہماری شرع میں یہود و نصاریٰ

بقیہ صفحہ ۶۲۶

سنتِ مکتبہ میں لفظ دیوتا کے معنی زائیدہ نور کے ہیں۔ یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح مخلوق تصور کرتے تھے۔ ازلی نہیں سمجھتے تھے، غالباً ان کا مفہوم وہی ہوگا، جن کو ہم لفظ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ فرشتوں کا وجود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا موجب گردانا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اقبال

کے دین کے نسخ کے سوا اور کسی دین کے نسخ کا ذکر نہیں۔ حالانکہ ان کے علاوہ بہت سے دین منسوخ ہوئے اور کئی دین صغیر اسی سے نابود ہو گئے۔ نیز واضح رہے کہ ان آیات کے مطابق ”وَانْ مِنْ اُمَّةٍ اَخْلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ“ (ہر ایک گروہ کا نبی گزرا ہے) ”وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ“ (اور ہر ایک اُمت کا رسول ہوتا ہے) سرزمین ہندوستان میں بھی نبی اور رسول بھیجے گئے جن کے احوال ان کی کتابوں میں مندرج ہیں۔ ان کے اخبار و آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صاحب کمال تھے۔ رحمتِ عامہ الہی نے مصلحتِ انسانی کو اس سرزمین میں فروگزاشت نہیں کیا۔ پیغمبرِ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بھرت سے پہلے ہر ایک قوم میں پیغمبر مبعوث ہوتا رہا ہے جس کی اطاعت اور فرمانبرداری اس قوم کے لیے لازم تھی اور دوسری قوم کے نبی سے ان کو غرض نہ ہوتی، لیکن جب پہلے پیغمبرِ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں تب سے لے کر جب تک دنیا باقی ہے کوئی اور نبی نہ ہوگا۔ شرق سے لے کر غرب تک تمام دنیا کو آنحضرت ہی کی تابعداری اور فرمانبرداری لازم ہے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے مقابل تمام باقی دین منسوخ ہیں۔ آغازِ بخت سے جس کو آج تک ایک ہزار ایک سو اسی سال ہوتے ہیں جو اس دین کی طرف مائل نہیں ہوا۔ وہ کافر ہے۔ نہ کہ وہ لوگ جو اس سے پہلے گزر چکے تھے۔

نیز حسبِ تصریحِ آیتِ کریمہ ”مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصِصْ عَلَيْكَ“ (ان میں سے بعض کا حال تمہارے روبرو بیان کیا اور بعض کا نہیں کیا) جب ہماری شریعت بہت سے انبیاء کے حال میں ساکت ہے تو ہم کو بھی ہندوستان کے انبیاء کے حق میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ نہ ہم کو ان کے مقلدین کے کفر والحاد پر ایمان واجب ہے اور نہ ان کی نجات کا اعتقاد لازم ہے، لیکن اگر تعصب نہ ہو۔ تو نیک گمان ضرور کرنا چاہیے۔ اہلِ فارس بلکہ تمام اہم ماضیہ کے حق میں جو خاتم النبیینؐ کے ظہور سے پہلے گزر چکی ہیں اور جن کی نسبت شرع میں کچھ بیان نہیں کیا گیا اور جن کے احکام و آثار راہِ اعتدال کے مناسب اور موافق اسی قسم کا عقیدہ رکھنا بہتر ہے کسی کو بغیر قطعی دلیل کے کافر نہ کہہ دینا چاہیے۔ ان (اہلِ ہند) کی نسبت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ بعض فرشتے جو

حکیم الہی سے عالم کون و فساد میں دخل رکھتے ہیں۔ یا بعض کاطین کی رُوحیں جنہیں جسم سے الگ ہو کر اس دُنیا میں کچھ تصرف حاصل ہے یا بعض زندہ آدمی جو ان کے زعم میں حضرت خضر علیہ السلام کی طرح تا ابد زندہ رہیں گے یہ لوگ اُن کی مورتیں یا تصویریں بنا کر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس توجہ کے سبب ایک مدت کے بعد صاحب صورت کے مناسبت پیدا کر لیتے ہیں اور اسی نسبت سے حوائج معاش و معاد کو پورا کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل ذکر رابطہ سے مشابہت رکھتا ہے جو اسلامی صوفیہ میں عام ہے، اور جس میں رت شیخ تصور کیا جاتا ہے اور فیض حاصل کیے جاتے ہیں۔ ہاں صرف اس قدر فرق ہے کہ صوفیہ شیخ کی ظاہری تصویر نہیں بناتے، لیکن یہ بات کفارِ عرب کے عقیدے سے مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ وہ بتوں کو متصرف اور موثر بالذات مانتے تھے نہ کہ تعریف الہی کا ذریعہ اور انھیں کو زمین کا خدا مانتے تھے اور اللہ تعالیٰ کو آسمان کا خدا۔ مگر یہ شرک ہے۔ ان (اہل ہند) کا سجدہ سجدہ عبودیت نہیں، بلکہ سجدہ تحیت ہے۔ جو کہ ان کے طریقے میں ماں۔ باپ۔ پیر اور استاد کے سلام کے لیے بھی عام ہے اور جسے دُندوت کہتے ہیں۔

تنازع کا اعتقاد رکھنے سے کفر لازم نہیں آتا۔ والسلام

مرزا جانجاناں کے خلفاء میں سے قاضی ثناء اللہ بانی پتی بہت مشہور ہیں۔ شاہ عبدالعزیز انھیں بقی وقت کہا کرتے تھے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان میں سے فقہ کے مسائل کی کتاب مالا بد منہ اب بھی مستعمل ہے۔ ان کے علاوہ انھوں نے سات جلدوں میں تفسیر مظہری لکھی۔ اس زمانے میں شاہانِ اودھ کی وجہ سے شیعہ متنی مسئلہ پھریا ہو گیا تھا۔ چنانچہ قاضی صاحب نے شیعہ عقائد کے خلاف بیف المسول کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ اس کے علاوہ ارشاد الطاہرین۔ حقوق الاسلام شہا ثنائی اور دوسرے رسائل آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کی وفات شیعہ میں ہوئی۔

خاکم لاویا شاہ غلام علی قدس سرہ | مرزا مظہر جانجاناں کے سب سے نامور مرید
شاہ عبداللہ المعروف شاہ غلام علی دہلوی

تھے، جن کا اپنے زمانے میں اتنا شہرہ تھا کہ انھیں عقیدہ مند تیرھویں صدی کا مجدد کہتے تھے۔ اور اگر اس روحانی انقلاب کا اندازہ کریں جو ان کے ایک مُريد کی بدولت بلادِ روم و عراق و کردستان میں ہوا تو یہ اظہارِ عقیدت عجیب نہیں معلوم ہوتا۔ ہندوستان میں بھی ان کا بڑا اثر و اقتدار تھا۔ اور دہلی میں ان کی خانقاہ شاہ عبدالعزیز کے مدرسے کا مد مقابل سمجھی جاتی تھی۔ ایک میں دلی الہی طریقے کی میانہ روی اور علم و عرفان تھا اور دوسرے میں مجددی مشرب کا اجمالی ذوق و شوق اور منتشر تصوف تھا۔ شاہ غلام علی کے ملفوظات اور حالات ان کے مریدوں مثلاً شاہ عبدالغنی صاحب نے مرتب کیے ہیں۔ مکتب مدراس سے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن شاید شاہ صاحب کے علم و مرتبہ کا سب سے بہتر آئینہ سرسید احمد خاں کا وہ مختصر مضمون ہے جو انھوں نے شاہ صاحب کے متعلق آثار الصنادید میں لکھا اور بزرگانِ دہلی کے تذکرہ میں فاتحہ الکتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ سید احمد خاں کے والد پر شاہ صاحب بڑی عنایت کرتے تھے۔ سید احمد خاں پیدا ہوئے تو خوش نصیب باپ نے انھیں ہی زحمت دی۔ موادِ مسعود کے کان میں اذان شاہ صاحب نے دی اور اپنے مجددیہ سلسلہ کے سردار حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کے نام پر اس کا نام احمد رکھا۔ اور جب یہ سید زادہ گھٹنوں چلنے کے قابل ہوا تو اس سے پوتوں سے زیادہ پیار کیا۔ سید احمد بھی شاہ صاحب کو داد و احضرت کہا کرتے تھے۔ انھوں نے ان کا تذکرہ بھی ایک خاص شیفتگی اور بڑے سلیقے سے لکھا ہے۔ اندازِ بیان میں وہ اشکال اور الجھنیں نہیں جو آثار الصنادید کے باقی بیانات اور اندراجات میں ہیں اور چونکہ شاہ صاحب کی شخصیت، طریقِ کار اور اہمیت کا بہترین اندازہ اسی مضمون سے ہو سکتا ہے۔ ہم اس کا بیشتر حصہ درج ذیل کرتے ہیں۔ سرسید لکھتے ہیں:-

لے دوسرا ایڈیشن حال ہی میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔

جناب حضرت شیخ الشیوخ مولانا شاہ غلام علی قدس سرہ

وطن اصلی دہلی ہے جو امرتسر (پنجاب) کے قریب واقع ہے۔ اور آپ سادات علوی سے ہیں۔ آپ کے والد ماجد بھی بڑے زاہد

اور عابد تھے اور جنگلوں میں جا کر ذکرِ حق کیا کرتے تھے اور عینوں بناس پتی پر قناعت فرماتے تھے۔ آپ کے عجم بزرگوار نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اشارت سرِ ابشارت سے عبد اللہ آپ کا نام رکھا۔ ۱۵۶ھ میں آپ نے اس عالم میں قدم فیضِ توام رکھا، اور اپنے جمالِ جہاں آرا سے عالم کو متور کیا۔

آپ نے سولہ برس کی عمر تک تو اسی نواحی میں بسر کی ۱۶۲ھ میں آپ کے والد ماجد نے اس ارادہ سے دہلی بلوایا کہ اپنے پیر شاہ ناصر الدین قادری سے جن کا مزار نئی عیگاہ کے پیچھے ہے، بیعت کرادی جائے۔ آپ کے پیچھے سے پہلے شاہ ناصر الدین صاحب نے انتقال کیا۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ کو پردہِ غیب سے اور ہی کچھ ظاہر کرنا تھا، یہ بات نقابِ وحین التوا میں رہی۔ تب آپ کے والد ماجد نے اجازت و اختیار دیا کہ جس سے چاہو بیعت کرو ۱۶۸ھ میں بائیس برس کی عمر میں آپ نے جناب مزارِ جانناں مظهر علیہ الرحمۃ سے بیعت کی اور یہ شعر پڑھا۔

از برائے سجدہ عشق آستانے یافتم
سرزمینے بود منظور آسمانے یافتم

بعد بیعت کے سالہا سال آپ نے اپنے پیرو مرشد کی خدمت میں اوقاتِ سحر کی اور وہ زہد و مجاہدہ اور ریاضت کی کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ دن دن عروجِ کمال اور مشاہدہ جمالِ شاہدِ بے زوال اور مکاشفہ اور ترقیاتِ فائقہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اپنے وقت کے شیخ الشیوخ اور صاحبِ ارشاد ہوئے اور تلقین و ارشادِ سلسلہ اپنے پیرو مرشد کے روبرو جاری فرمایا۔ اگرچہ آپ نے بیعت سلسلہ قادریہ میں کی تھی،

۱۷۰ھ ضمیمہ مقاماتِ مظہری میں قصیرِ بیابانہ ضلع پنجاب لکھا ہے۔ لیکن اصل مقام بٹالہ تھا جو مشرقی پنجاب کی پرانی مروجہ نسبت تھی۔ میدانِ فضلِ حسین کا خاندان بھی اسی قصیر سے تھا۔

لیکن ذکر و اذکار و شغل و اشتغال طریقہ علیہ نقشبندیہ مجددیہ میں جاری کیا اور ہر طریقہ کی اجازت حاصل کی اور اپنے پیرو مشد کے انتقال کے بعد سجادہ نشین ہوئے اور حقیقت میں میرے اعتقاد بموجب اپنے پیرو بھی فوقیت لے گئے۔ سبحان اللہ! کیا آزادی تھی کہ مطلق دنیا کا لگاؤ نہ تھا۔ اللہ اللہ! کیا اطاعت سنت تھی کہ سر مو بھی فرق نہ تھا۔ توکل تو اس درجہ پر تھا کہ کبھی کسی طرح کا خیال دل میں نہ آتا۔ اُمرا اور بادشاہ آرزو رکھتے تھے کہ ہم خانقاہ کے فقرا کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کریں۔ ہرگز آپ منظور نہ فرماتے۔ ایک دفعہ نواب امیر الدولہ امیر محمد خاں والی ٹونک نے بہت التجاسے درخواست تقرر وظیفہ کی اس کے جواب میں آپ نے صرف یہ شعر لکھ بھیجا۔

ما آبرو سے فقر و قناعت نے بریم
با میر خاں بگوئے کہ روزی مقرر است

آپ کی ذات فیض آیات سے تمام جہاں میں فیض پھیلا اور ملکوں ملکوں کے لوگوں نے اگر بیعت اختیار کی۔ میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے رُوم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدات خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھے اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح اُٹھتے تھے۔ سچ ہے۔

چو کعبہ قبلہ حاجت شد از دیار بعید
روند خلق بدیدارش از بسی فرسنگ

حضرت کی خانقاہ میں پان سو فقیر سے کم نہیں رہتا تھا اور سب کا روٹی پکڑا آپ کے ذمہ تھا اور باوجودیکہ کہیں سے ایک حیرت مقرر نہ تھا، اللہ تعالیٰ غیب سے کام چلاتا تھا۔ اس پر فیاضی اور سخاوت اس قدر تھی کہ کبھی سائل کو محروم نہیں پھیرا جو اس نے مانگا وہی دیا۔ جو چیز عمدہ اور تحفہ آپ کے پاس آتی اس کو بیچ کر فقرا پر صرف کرتے اور حبس گزی گاڑھا موطا تمام فقیروں کو میسر ہوتا ویسا ہی آپ بھی پہنتے اور جو کھا مناسب کو میسر ہوتا وہی آپ کھاتے۔ بھلا غور کرو کہ بشر کی طاقت ہے کہ ایسی بات کر سکے

کہ اگر کوئی عرض کرتا کہ حضرت آپ اپنے لیے تو یہ کپڑا لے لیجیے اور یہ آرام کی چیز بنا لیجیے
تو آپ یہ قطعہ پڑھا کرتے۔

خاک نشینی است سلیمانیم ننگ بود افسر سلطانیم
ہست بے سال کہ می پوش کہنتہ نہ شد جامہ عریانیم

اور اگر کبھی کچھ اسباب اور سامان دنیا کا ذکر آتا تو فرماتے۔

سرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں
ہر چہ ماواریم زان ہم اکثرے و کار نیست

آپ کی اوقات شریف نہایت منضبط تھی۔ کلام اللہ آپ کو حفظ تھا اور تحقیق قرأت
بھی بہت خوب تھی۔ نماز صبح اول وقت ادا فرما کر دس سید پارہ کلام اللہ کے ادا فرماتے
اور بعد اس کے حلقہ مریدین جمع ہوتا اور تا نماز اشراق سلسلہ توجہ اور استغراق جاری
رہتا۔ بعد ادا کرنے نماز اشراق کے تدریس حدیث اور تفسیر کی شروع ہوتی۔ جو لوگ
اس جلسہ کے بیٹھنے والے ہیں ان سے پوچھا جاسیے کہ اس میں کیا کیفیت ہوتی تھی
اور پڑھنے پڑھانے اور سننے والوں کا کیا حال ہوتا تھا۔ جہاں نام رسول خدا آتا آپ
بے تاب ہو جاتے اور اس بیتیابی میں حاضرین پر عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی۔ سبحان اللہ
کیا شیخ تھے۔ باقی باللہ اور عاشق رسول اللہ! علم حدیث اور تفسیر نہایت مستحضر تھا۔
اگر باعتبار علوم عقلی سرآمد فلسفیان متقدمین اور متاخرین لکھا جاوے تو بھی بجا ہے۔
اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیا مجمع علوم پیدا کیا تھا کہ ہر ایک علم ظاہری اور باطنی میں درجہ
کمال برانہما سے کمال حاصل تھا۔ بعد اس درس تدریس کے آپ کچھ تھوڑا سا کھانا
کہ عبادت محبوب کو کافی ہو، تناول فرما کر بہ اتباع سنت نبوی قیلولہ استراحت میں آرام
کرتے۔ تھوڑی دیر بعد اقل وقت نماز ظہر ادا فرما کر پھر درس و تدریس حدیث و تفسیر
فقہ اور کتب تصوف میں مشغول ہوتے اور نماز عصر تا نماز مغرب حلقہ مریدین جمع
ہوتا اور ہر ایک آپ کی توجہ سے علوم و مدارج حاصل کرتا۔ ہمیشہ تمام رات آپ شب بیداری
فرماتے تھے۔ شاید کہ گھڑی دو گھڑی بمقتضائے بشریت غفلت آجاتی ہو سو وہ بھی

جانماز پر۔ برسوں آپ نے چار پائی پر استراحت نہیں فرمائی۔ اگر نیند کا بہت غلبہ ہوا۔
یونہی اللہ اللہ کہتے پڑے۔ آپ کی خالقانہ عجب عالم ہوتا تھا۔ بویا کا فرش
رہتا تھا اور اسی کے سرے پر ایک مصلیٰ کبھی بویا کا اور کبھی اور کسی چیز کا پڑا رہتا تھا
اور وہیں ایک تکنیہ چڑے کا رکھا رہتا۔ آپ دن رات اسی مصلے پر بیٹھے رہتے اور
عبادت مجبوروں کیا کرتے اور سب طالبین گردِ آپ کے حلقہ باندھے بیٹھے رہتے اور
ہر ایک کو جِدِ جِدِ فیض حاصل ہوتا۔ اگر کبھی کچھ فرش کا ذکر آتا تو آپ ارشاد فرماتے کہ

لنگے زیر و لنگے بالا فے غم دزد و فے غم کالا

گز کے بویا و پوست کے دس کے پُر زرد و دس کے

ایں قدر بس بود جمالی را عاشق بند لا ابالی را

حق یہ ہے کہ ایسا برشتہ جان دیکھنے میں نہیں آیا اور میں تو اس بات پر عاشق
ہوں کہ باوجود اتنی آزادی اور خود زنگی کے سرِ مباحکام شریعت سے تجاوز نہ تھا۔ جو
کام تھا وہ باتباع سنت تھا۔ لقمہ مشتبہ سے نہایت پرہیز کرتے اور مالِ مشتبہ ہرگز نہ
لیتے۔ جو شخص خلافِ شرع اور سنت ہوتا اس سے نہایت خفا ہوتے اور اپنے
پاس اہل کا آنا گوارا نہ کرتے اور فرماتے ۛ

یا مرو با یارِ اُردق پیرِ ہن یا بہ کش بر خانماں انگشت نیل

یا مکن با پیلبانان دوستی یا بنا کن خانہ در خوردِ پیل

میرے تمام خاندان کو اور خصوصاً جناب والد ماجد کو آپ سے نہایت اعتقاد تھا
اور میرے جناب والد ماجد اور میرے بڑے بھائی احتشام الدولہ سید محمد خاں بہادر مرحوم
کو آپ ہی سے بیعت تھی اور آپ کی میرے خاندان پر اس قدر شفقت اور محبت تھی کہ
میرے والد ماجد کو اپنے فرزند سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ میرے والد ماجد بھی آپ کی
صحبت کی برکت سے آزادہ مزاج اور وارستہ طبع تھے۔ کبھی کبھی بموجب اس
مصرعہ کے ۛ

کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

کوئی بات گستاخانہ عرض کرنا یا کوئی حرکت آپ کے خلاف مرضی سرزد ہوتی تو آپ بارہا ارشاد فرماتے کہ اگرچہ میں نے اپنے تئیں غم زدن و فرزند سے دور رکھا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی نہ ہوئی کہ اس شخص کی محبت فرزندوں سے سوا دے دی۔ جو چاہو سو کہو اور جو چاہو کرو۔ میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور آپ اپنی شفقت اور محبت سے مجھ کو اپنے پاس مصطفیٰ پر بٹھا لیتے اور نہایت شفقت فرماتے۔ لڑکپن میں کچھ تمیز تو ہوتی تھیں۔ خصوصاً صخرین میں جو چاہا سو کیا جو چاہتا سو کرتا اور حرکات بے تمیز مجھ سے سرزد ہوتیں اعدا آپ ان سب کو گوارا فرماتے۔ میں نے اپنے واد کو تو نہیں دیکھا۔ آپ ہی کو واد حضرت کہا کرتا تھا۔ آپ کے کمالات اور خرق عادات اس سے زائد کیا بیان میں آویں۔ اس واسطے اس مختصر میں اس کی گنجائش نہیں دیکھتا اور میرے نزدیک ایسے شخص کی کرامت کا بیان کرنا اس کے رتبہ سے کم ہے۔ کیونکہ فقیری کا رتبہ اس سے آگے ہے۔ غرض کہ ساہا سال تک آپ کی ذات فیض آیات سے یہ عالم متور رہا۔ اور جبکہ ہر ایک کو اس دار الفنا سے دار البقا کو چلنا ہے، آپ نے بھی ہفتہ کے دن صفر کی بائیسویں شنبہ ۱۲۸۷ھ میں اس جہان سے انتقال کیا اور آپ کی خالقاہ میں آپ کے پیر کے پہلو میں دفن کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ”نور اللہ مضجعہ“ آپ کے انتقال کی تاریخ ہے۔“

سرسید کے مندرجہ بالا بیان سے شاہ صاحب کی شخصی خوبیوں اور ان کی مقامی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے واضح کر دیا ہے کہ انھوں نے شاہ صاحب کی خالقاہ میں روم شام اور دوسرے بلاد اسلامی کے باشندے دیکھے تھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ شاہ صاحب کو اپنے ملک میں بھی بڑا عروج حاصل تھا اور ہمسایہ ملکوں میں بھی آپ کے ماننے والے تھے، لیکن تاریخ دان کی نظروں میں شاید آپ کا سب سے بڑا فیض بلاد روم میں مجددیہ سلسلے کی وسیع اشاعت تھا۔ جس کے ذریعہ آپ کے مرید اور خلیفہ شیخ خالد کردی تھے، جنھوں نے دہلی میں آکر آپ سے فیض حاصل کیا۔ اور پھر مجددیہ طریقے کو دولت عثمانیہ میں عام کیا۔ [۱۰۱ صفحے پر ملاحظہ ہو]

نقشبندیہ طریقہ کی تنظیم خواجگان بخارا و سمرقند (ترکستان) نے کی اور فی الحقیقت یہ ایک ترک الاصل طریقہ ہے۔ لیکن شیخ خالد سے پہلے جو طریقہ سلطنت عثمانیہ میں چھایا ہوا تھا بیکتاشی تھا جو ہندوستان میں چشتی سلسلہ کی طرح؛ زیادہ تر ایک مقامی طریقہ تھا۔ نقشبندیہ سلسلے کی وسیع اشاعت پہلی مرتبہ شیخ خالد نے کی اور ان کی وجہ سے یہ سلسلہ وہاں جس شکل میں رائج ہوا وہ مجددی طریقہ تھا۔ قدیمی سلسلہ نہ تھا۔ اور اس کی اشاعت وہاں بھی احیائے علوم اور غلبہ شرع کا باعث ہوئی۔

شیخ خالد بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ ان کی کوششوں کی بدولت دولت عثمانیہ میں نقشبندیہ طریقہ دوسرے سب طریقوں پر غالب آگیا۔ جب مصطفیٰ کمال پاشا نے صوفیہ سلسلوں کا خاتمہ کیا تو اس وقت فقط استنبول میں اس سلسلے کے ۲۷ تکیے تھے۔ علاقہ کردستان میں اب بھی ان کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ ان کے مناقب میں علامہ شامی نے ”سل الحسام الہندی لنصرة مولانا خالد نقشبندی“ کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جو مصر میں چھپ چکا ہے۔ آپ عربی فارسی کے شاعر تھے۔ فارسی دیوان ۱۸۴۴ء میں استنبول میں شائع ہوا تھا۔ اب حال میں اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا ہے اور جدید ترکی کی ان محدود کتابوں میں سے ہے، جنہیں اصل (یعنی عربی) رسم الخط میں شائع کیا گیا ہے۔

کئی قصیدے شاہ غلام علی کی تعریف میں ہیں۔ ایک کا مطلع ہے ۵

خبر از من و سید آں شاہِ خواباں را بہ پنهانی

کہ عالم زندہ شد بار دیگر از ابر نیسانی

آگے چل کر کہتے ہیں ۵

[فٹ نوٹ ۵ متعلقہ صفحہ ۶۵۵]

شیخ خالد کردی کو ہندوستان آئے اور شاہ غلام علی کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ بہار کے ایک جہاں گرد درویش مزارحم الشہید نے دیا تھا جن سے شیخ کی اشاعت سفر میں ملاقات ہوئی تھی۔ ۵ اس کا ایک نسخہ ہم نے کتب خانہ سراجیہ کنڈیاں شریف کی تفر کیا ہے۔

امام اولیا، سیاح پیدائے خدا مینی ندیم کبریا، سیاح دریائے خدا دانی
 مہین راہنمایاں شمع جمع اولیائے دیں دلیل پیشوایاں، قبلہ اعیان روحانی
 چراغ آفرینش، مہر رُج دانش و بینش کلید گنج حکمت، محرم اسرار سبحانی
 امین قدس عبد اللہ شمس کز انقائے دہر سنگ سیاہ خاصیت لعل بدخشانی
 شاہ غلام علیؒ کے مطبوعہ مکاتیب میں چند خطوط شیخ خالد کے نام ہیں۔ ایک کے
 ساتھ علما و مشائخ حجاز و روم کے نام ایک پیغام منسلک ہے جس سے پتا چلتا ہے
 کہ شیخ کی شروع شروع میں مخالفت ہوئی، لیکن شاہ صاحب نے اس پیغام سے دولت
 عثمانی کے بزرگوں کی تشفی کی۔

شیخ خالدؒ نے جب حکومت عثمانیہ میں واپس جا کر شاہ غلام علیؒ کے مناقب بیان
 کیے اور طریقہ مجددیہ کی اشاعت کی تو وہاں سے دوسرے کئی بزرگ حصول فیض
 کے لیے شاہ صاحب کی خدمت میں دہلی پہنچے۔ مثلاً شاہ صاحب کے ایک خط میں
 حضرت سید احمد بخاری اور حضرت سید اسماعیل مدنی کا ذکر ہے جو بڑے پایہ کے بزرگ
 تھے (اور وصفِ ایں سیدان بہ ادراک فن مقدور بیان نیست) اور مدینہ منورہ میں
 مولانا خالد سے نسبت حاصل کرنے کے بعد یہ غرض استفادہ دہلی آئے۔

ان کے علاوہ مولانا محمد جان کا ذکر بھی یہاں بجا نہیں۔ وہ پیدا تو ہندوستان میں
 ہوئے۔ لیکن شاہ غلام علی صاحبؒ کی اجازت و خلافت حاصل کرنے کے بعد عازم مکہ معظمہ
 ہوئے۔ شروع میں آپ کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن بعد ازاں آپ کو بڑا فروغ
 ہوا۔ سچے اکبر والدہ سلطان بھی آپ کے معتقدین میں سے ہو گئیں۔ استنبول و دیگر اضلاع
 روم میں آپ کے خلفا منتشر ہو گئے۔ ایک خانقاہ تیار کی۔ جس سے بہتوں نے فائدہ
 اٹھایا۔ آپ کی وفات ۱۲۹۵ھ میں مکہ معظمہ میں ہوئی۔

سیاسی اعتبار سے یہ زمانہ اسلامی ہندوستان کے انتہائی زوال کا تھا، لیکن حضرت
 مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ نے جو شعبیں جلالی تھیں وہ اب ہندوستان کی سرحدوں
 سے گزر کر بیرون ہندوستان کو متور کر رہی تھیں۔ بقول خالدؒ

برہمنی ظلمت کفر است گفتند و بہ دل گفتہ
یہ ظلمت نہ اگر در جستجوئے آب حیوانی

سلسلہ مجددیہ کا دورِ جدید

مجددی حضرات شاہ غلام علی قدس سرہ کو تیرھویں صدی کا مجدد مانتے ہیں۔ ان کی عظیم دینی خدمات اور وسیع اثر کا ہم نے کسی قدر تفصیلی بیان کر دیا ہے۔ لیکن خاص مجددیہ سلسلے کے لیے انھوں نے جو کچھ کیا۔ اس کا پورا اندازہ اس بیان سے نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے کو حضرت مجددؒ کی زندگی ہی میں بڑا فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ اور ملک کے دور دراز حصوں میں ممتاز بزرگ اس سے وابستہ تھے۔ خواجہ محمد مصومؒ نے اس سلسلے کو بڑی وسعت دی۔ ان کے صاحبزادے خواجہ نقشبند کا زمانہ بھی، عہدِ عالمگیری کی فقہی روایات کے باوجود، سلسلے کے لیے بڑا سازگار تھا۔ اس وقت طریقہ مجددیہ کا بڑا مرکز سرہند تھا۔ گواہوں میں بھی اس سلسلے کی کئی اہم خالقاہیں تھیں۔ خواجہ نقشبند ثانیؒ کی وفات کے چند سال بعد سلسلے میں انتشار شروع ہوا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ عالمگیری کی وفات کے تین سال کے اندر مشرقی پنجاب میں ایک ایسا ہنگامہ برپا ہوا جس نے اس علاقے کا امن تہ و بالا کر دیا۔ مسیحیوں نے ہندو بھیراگی نے سرہند پر قبضہ کر لیا۔ اور وہ تباہی مچانی کہ الامان! چار روز تک لوٹ مار اور سفاکانہ قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ ہندو کا قلع قمع پانچ سال بعد نواب عبدالصمد خاں نے کیا۔ جن کی قبر بیگم پورہ لاہور میں ”زندہ دلاں“ لاہور کی غفلت و بے حس کا عبرتناک نقشہ پیش کرتی ہے، نواب عبدالصمد خاں اور ان کے بیٹے زکریا خاں کے عہدِ حکومت میں پھر سرہند کو عروج ہوا، لیکن اس کے بعد یہ شہر آکھا سنگھ بانی ریاست پٹیالہ کے قبضے میں آ گیا۔ جس نے اس شہر کو پھر لوٹ کر اجاڑ دیا۔ اس مسلسل بد امنی اور قتل و غارت سے شہر برباد ہو گیا اور حضرت مجدد و الع ثانی کے خاندان کے اکثر افراد منتشر ہو گئے اور ان میں سے بعض دہلی آ گئے اور بعض دوسری جگہ آباد ہوئے۔ خود خواجہ محمد زبیرؒ جنھیں قیوم چارم کہا جاتا ہے

عالمگیری کی وفات کے دوسرے یا تیسرے سال یعنی بندہ کے حملے سے پہلے ”مع توابع ولواتق“ سرہند سے دہلی چلے گئے تھے۔ اور اپنی وفات تک، جو حملہ نادری کے چند ماہ بعد ہوئی، وہیں مقیم رہے۔ شیخ عبدالاحد گل ان کے ساتھ یا اس سے بھی پہلے دہلی پہنچ گئے۔ سرہند میں سلسلہ کا جو نظام تھا، وہ بہت حد تک درہم برہم ہو گیا۔ اس کے علاوہ عہد عالمگیری کے اواخر سے ہی اکابر سرہند پر مشیخت غالب آگئی تھی۔ درویشی تھوڑی تھی۔ بعض بزرگوں کے حالات پڑھیں تو رطیانہ ٹھاٹھ کے مظاہرے کثرت سے ملتے ہیں۔ آپس میں اخلافتا بھی شروع ہو گئے تھے۔

دہلی میں بعض بزرگان سرہند (مثلاً شیخ عبدالاحد گل) نے دارالخلافہ کی علمی ادبی اور روحانی زندگی کی رونق بڑھائی۔ اور مرزا منظر جانانا جیسے بزرگ سلسلہ مجددیہ میں داخل ہوئے۔ لیکن سلسلے کوئی زندگی شاہ غلام علی سے ملی۔ اس وقت انگریزوں کا اقتدار بڑھ رہا تھا، جو انھیں ناگوار تھا، لیکن بہر کیف اس سے سکھوں اور مرہٹوں کی ترک تازیباں تو ختم ہوئیں۔ ملک میں امن و امان تھا۔ اس کے علاوہ ان کے مزاج میں بڑی درویشی شرع کا بڑا خیال تھا۔ روحانی مرتبہ بہت بلند تھا۔ عنایت الہی سے ان کا فیض روم و کردستان تک پہنچا، لیکن ہند اور پاکستان میں بھی ان کا کام اتنا ہی اہم تھا۔ ان کی بدولت سلسلے میں بارہ گرو درویشی کو فروغ ہوا۔ بلکہ سلسلے نے ایک نئی صورت اختیار کی، جس میں اصل کی ساری خوبیاں موجود تھیں۔

۱۔ سرہند سے سکھوں کو خاص طور پر خصوصیت تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ گورو گوبند سنگھ کے دو بیٹوں کو یہاں کے حاکم نے دہند و دیوان کی انگشت پر ازندہ چنوا دیا تھا۔ تواریخ خالصہ میں لکھا ہے کہ جب گورو گوبند سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو یہ خبر پہنچی، سب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور روئے گئے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت بیان کیا گیا ہے کہ گورو گوبند سنگھ صاحب اس عالم رنج و محن میں اپنے کار سے ایک چھوٹی سی گہاہی بڑے اکھیڑ دی۔ جس پر رائے کلا نے پوچھا کہ آپ ہمارا کیا کر رہے ہیں۔ گورو صاحب فرمایا: ظالم ترکوں کی بیچ کنی کر رہا ہوں۔ ہمارے سکھ ایسے طاقتور ہوں گے۔ جو اس سرہند کی اینٹوں تک اکھاڑ کر تلج میں ڈال دیں گے۔ سرہند کی بابت بھی تاریخوں سے ظاہر ہے کہ جب سکھوں نے زور پکڑا تو اس کی ایک ایک اینٹ جلا کر دی گئی۔ ”منہی غلام سرور تاریخ مخزن پنجاب میں لکھتے ہیں: ”سکھوں کو اس شہر کے ساتھ یہاں تک دشمنی ہے کہ جب کوئی سکھ اب بھی سرہند کے پاس سے گزرتا ہے۔ دو ایٹلیں وہاں کے کھڈرات سے اٹھا کر دریا میں ڈال دیتا ہے۔“ نواب شیر محمد خاں رئیس مالیر کوئلہ نے پتوں کی سزا دی کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ مالیر کوئلہ کی ریاست اٹھارویں صدی کے پُر آشوب زمانے میں بھی محفوظ رہی۔

لیکن جو تبدیل شدہ حالات کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے فیض کے جو چشمے لگائے ان سے نکلی ہوئی نہروں نے مغربی پاکستان کے ان علاقوں کو سیراب کیا۔ جن کی شادابی ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے سرحد و دہلی کے بھارت میں آجانے کے بعد بھی قائم رہی!

شاہ احمد سعید دہلوی رحمہ اللہ | مغربی پاکستان میں شاہ غلام علی قدس سرہ کا فیض ایک ایسے بزرگ سے پہنچا جو خود خاندانِ مجددیہ

کے چشم و چراغ تھے۔ شیخ ابن شیخ تھے، لیکن جنھوں نے پندرہ سال شاہ غلام علی سے فیض حاصل کیا اور جو شاہ صاحب کو اس قدر عزیز تھے کہ بقول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں شاہ صاحب نے انھیں اپنا متبنی قرار دیا تھا۔

یہ بزرگ حضرت شاہ احمد سعید تھے، جو پیدا تو رام پور میں ہوئے، لیکن جن کا جسدِ خاکی مدینہ منورہ کی مبارک سرزمین میں مدفون ہے۔ آپ کے والد ماجد شاہ ابوسعید بھی شاہ صاحب خلیفہ اور بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ بھائی شاہ عبدالغنی مجددی تھے جنھوں نے مکملہ مقاماتِ نظری میں شاہ غلام علی صاحب اور ان کے خلفاء کے حالات لکھے ہیں اور جن سے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے بزرگوں نے حدیث پڑھی تھی۔ شاہ احمد سعیدؒ ۱۸۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں شاہ غلام علیؒ کی خدمت میں پہنچے۔ اور ان کی وفات تک ان کی خدمت میں حاضر رہے۔ تصوف کی اکثر کتابیں مثلاً رسالہ قیصری عوارف المحارف احیاء العلوم۔ مکتوبات امام ربانی۔ مثنوی مولانا روم شاہ صاحب سے پڑھیں۔ اس وقت دہلی علما و صلحا سے بھری پڑی تھی۔ حدیث کی سند آپ نے شاہ عبدالعزیز سے لی۔ اور معقولات کی کتابیں مولوی فضل امام اور مولوی رشید الدین سے پڑھیں۔

ڈاکٹر صاحب تحفہ زواریہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔ ”تا مدت پانزدہ سال از حضرت شاہ غلام علی قدس سرہ فیض یاب شد۔ وہم متبئی ایشان گشتند۔“ شاہ غلام علی قدس سرہ اور خاندانِ سعیدیہ کے فیض یافتگان کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے (مطبوعہ کتابوں کے علاوہ) اور اس کے لیے کافی سے زیادہ مواد موجود ہے۔

اخذِ طریقت شاہ صاحب سے کیا۔ اور پھر اس فیض کو عالم میں عام کیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ یا آپ کے ساتھیوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں حصہ لیا۔ کیونکہ اس کے بعد آپ کے دہلی سے مختلف سمتوں میں (بظاہر کسی قدر پریشانی کے عالم میں) جانے کا ذکر ملتا ہے۔ اور دہلی سے آپ کا سلامتی سے نکل جانا (جو ایک مسلمان فوجی عہدہ دار کی سچی سے ہوا) آپ کے تصرفات میں شمار ہوتا ہے۔ بالآخر آپ مدینہ منورہ پہنچے۔ لیکن بزرگوں کا کوئی قدم فیض سے خالی نہیں ہوتا۔ آپ لاہور آئے اور وہاں سے ۲۸ نومبر ۱۸۵۷ء کو ڈیرہ اسماعیل خاں کے قریب مرسے زئی پہنچے۔ جہاں آپ کے محب اور جاں نثار خلیفہ حاجی دوست محمد قندھاری مقیم تھے۔ اور جس جگہ آپ کی چند روزہ اقامت کی وجہ سے خانقاہ احمدیہ سعیدیہ قائم ہوئی، جس کی بدولت مغربی پاکستان میں سلسلہ مجددیہ کے دوسرے کئی چشمہ ہائے فیض جاری ہوئے۔

شاہ احمد سعید قدس سرہ نے جو خطوط حاجی دوست محمد قندھاری کے نام لکھے، انھیں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے (مع چند دیگر خطوط کے) تحفہ زواریہ کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ کوئی ڈیرہ سو صفحے کا مختصر رسالہ ہے۔ اور مکاتیب بھی طویل نہیں۔ لیکن بعض بڑے دلچسپ ہیں۔ مدینہ منورہ میں بھی آپ کو خانقاہ (شاہ غلام علیؒ) کا خیال جس طرح بے قرار رکھتا تھا، اس کا اظہار کسی خطوں میں ہے۔ شیخ رجب شاہ کے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

مکرر آنکہ اگر چیزے از حال خانقاہ بدریافت رسیدہ باشد۔ ازاں نیز مطلع سازند کہ کدام درویش درانجا مقیم گردید۔ نیچے صورت آبادیش رسیدہ یا نہ ایک اور خط میں ہے:-

لازم کہ پیوستہ بہ نگارش حالات خویش مشتمل بر خیریت خود و احوال دہلی و احوال خانقاہ شریف نوشتہ باشد کہ ازاں اطمینان خاطر خواہد شد۔ فکر آبادی خانقاہ شریف از ہر چیز بد نظر باشد کہ سعادت دارین دران متصور است۔

غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ غدر کے بعد دہلی کی ساری دولت لٹ لٹا کر
 'احاطہ پنجاب' میں پہنچ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آزاد۔ حالی۔ نذیر احمد کے
 دہلی کی بربادی کے بعد پنجاب میں آجانے سے یہاں اردو کو فروغ ہوا۔ اور وہ عمل
 شروع ہوا جس کی بدولت لاہور اسلامی ہندوستان کا ایک اہم تہذیبی مرکز ہو گیا۔
 لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اردو ادب ہی تک محدود نہ تھا۔ روحانی امور میں
 بھی کچھ اسی طرح کا عمل کار فرما ہوا۔ بالخصوص مجددی سلسلے کو مغربی پنجاب میں
 ایک بالکل نئی زندگی ملی۔ دہلی کی بربادی کے بعد شاہ احمد سعیدؒ نے جس جگہ سے اپنی
 امیدیں وابستہ کیں، وہ ڈیرہ اسماعیل خاں کے قریب موسے زئی کا مقام تھا۔
 اور جس مخلص اور عقیدت مند بزرگ کو انھوں نے اپنا جانشین کیا، وہ اس علاقے
 کے حاجی دوست محمد قندھاری تھے۔ بلکہ انھوں نے تو دہلی کی خانقاہ محل ہرائے
 اور تسبیح خانے کو بھی ان کے سپرد کیا۔ اور یہ سند لکھ دی:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فقیر احمد سعید مجددی عنہ، واضح می نماید کہ فقیر بارادہ اللہ سبحانہ از دہلی شریف
 متوجہ حرمین شریفین گردیدم و خانقاہ و مکانات محسراتے خود تسبیح خانہ را حوالہ
 خلیفہ خود مقبول بارگاہ حاجی دوست محمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نمودہ ام و حاجی
 صاحب را اختیار و ادام کہ سند باشد۔ خواہ خود و را آنجا باشد یا خلیفہ خود را
 دارند۔ لہذا ایں چند کلمہ نوشتہ دادم کہ سند باشد و بوقت حاجت بکار آید و صلی اللہ
 علیٰ خیر خلقہ و محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین۔ محرمہ تباریخ شانزدہم جمادی الاولیٰ ۱۳۱۷ھ
 یہ سند ۲۸ جنوری ۱۸۵۸ء کی تحریر ہے۔ غالباً موسیٰ زئی میں لکھی گئی یہ وہ
 زمانہ تھا۔ جب دہلی ابھی مسلمانوں کے لیے قیامت زار بنی ہوئی تھی۔ سند میں
 دہلی شریف کا اندراج اس بیابان نورو کی حسرتوں اور محبتوں کا مرقع ہے۔
 اس زمانے کی تصانیف بلکہ خطوط سے بھی اس امر پر روشنی نہیں پڑتی، لیکن
 قیاس ہے کہ موسے زئی دہلی کے بعض دوسرے ارباب سلسلہ کے لیے بھی اس

زمانے میں جائے پناہ بن گئی تھی۔ حاجی دوست محمد صاحب کے ممتاز خلیفہ خواجہ محمد عثمان کے ملفوظات میر اکبر علی دہلوی نے جمع کیے تھے۔ ان کی نسبت فوائد عثمانیہ کے دیباچے میں جناب "طالوت" ملانی لکھتے ہیں:-

میر اکبر علی صاحب کے والد حاجی حافظ میر احمد علی صاحب دہلوی تھے۔ ان کے آبا و اجداد محمد شاہ کے زمانے میں خراسان سے آگرہ دہلی میں آباد ہوئے۔ اور سرحدی خواصان کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ان میں سے اکثر انگریزوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کے والد حاجی (دوست محمد) صاحب سے بیعت ہو کر اہل دعیال سمیت موسے زئی شریف میں آکر مقیم ہو گئے۔ شاہ احمد سعید موسے زئی سے (دریا کے رستے) ٹھٹھہ نگر (کذا) پہنچے۔ وہاں سے گھوڑا باری کچھ روز قیام کے بعد بمبئی کو روانہ ہو گئے۔ جہاں آپ کی تاریخ ورود ۲۳ مارچ ۱۸۵۸ء ہے۔ وہاں سے جہاز میں سوار ہو کر حجاز کا قصد کیا۔ چار ماہ کے قریب مکہ معظمہ میں قیام رہا۔ اس کے بعد مدینہ منورہ کی کشتی غالب آئی۔ اکتوبر نومبر میں وہاں پہنچے۔ اور مستقل قیام اختیار کیا۔ اگلے سال جولائی میں آپ کی کتابیں بھی (ڈیرہ اسماعیل خاں کے راستے) بمبئی سے پہنچ گئیں۔ حجاز میں آپ نے سلسلے کا کام باقاعدہ شروع کر دیا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کئی لوگ بیعت ہوئے، لیکن اب آپ کی صحت بگڑنی شروع ہوئی اور ۱۹ ستمبر ۱۸۶۰ء کو آپ کا وصال ہو گیا۔ جنت بقیع میں مدفون ہوئے۔ حجاز میں آپ کا کام آپ کے صاحبزادوں نے جاری رکھا۔ ان میں شاہ محمد مظهر اس لیے بھی یاد کے لائق ہیں کہ انھوں نے مسجد نبوی کے قریب باب جمعہ کی طرف ایک نہایت خوشنماؤں و منزلیہ خانقاہ

۱۸۶۰ء اب کسی قدر کٹہ ہو گئی ہے، لیکن پھر بھی بڑا ارفع و افرا مقام ہے۔ افسوس کہ مدینہ منورہ کے آخری سفر (نومبر ۱۹۶۱ء) میں تیار چلا کہ شاید ملک کی وسعت اور دوسرے منصوبوں کی وجہ سے یہ متبرک مقام باقی نہ رہے، لیکن کتب خانے کی حفاظت کا پورا انتظام ہو گا۔

رابطہ منظر یہ تعمیر کرائی۔ اس میں ایک بیش قیمت کتاب خانہ ہے جس میں علوم اسلامی اور بالخصوص سلسلے کی نادر کتب موجود ہیں۔

مغربی پاکستان میں مجددی سلسلہ | حاجی دوست محمد صاحب قندھاری کی اہمیت شاہ احمد سعید صاحب کے

مندرجہ بالا حالات سے ظاہر ہے۔ وہ ایک زمانے میں تین اہم خاندانوں (قندھاری، موسے زئی، دہلی) کے سربراہ تھے۔ افغانستان اور مغربی پاکستان میں آپ سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہوئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دورِ آخر میں آپ کی بدولت ہی مغربی پنجاب میں سلسلہ مجددیہ کو استحکام نصیب ہوا۔ وفات ۶ فروری ۱۸۶۷ء کو ہوئی۔ ان کے خلیفہ اعظم خواجہ محمد عثمانؒ تھے۔ جن کے ملفوظات، مکتوبات اور معمولات فوائد عثمانیہ میں چھپ چکے ہیں۔ ان کے جانشین ان کے صاحبزادے مولوی سراج الدینؒ تھے۔ خواجہ محمد عثمانؒ کی وفات ۲۷ جنوری ۱۸۹۷ء کو اور مولوی سراج الدینؒ کی ۱۱ فروری ۱۹۱۵ء کو واقع ہوئی۔ یہ دونوں بزرگ اور جناب حاجی دوست محمد صاحب قندھاری موسے زئیؒ میں آرام فرما ہیں۔ ان بزرگوں کی بدولت مغربی پاکستان میں سلسلہ مجددیہ نے بڑی وسعت پائی۔ اور کئی خاندانیں قائم ہوئیں۔ ان میں خاندانہ سراجیہ مجددیہ کنڈیاں شریف (ضلع میانوالی) جس کے موجودہ سربراہ، جامع علم و عرفان، مولانا ابو التحلیل خان محمد صاحب مدظلہ ہیں، اس لیے بھی قابل ذکر ہے کہ وہاں کتب صوفیہ بالخصوص نوادر سلسلہ کا ایک بیش بہا ذخیرہ ہے۔

حاجی صاحب کی طرح خواجہ محمد عثمان صاحب بھی خاندانہ دہلی کے سربراہ تھے، لیکن انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں شاہ احمد سعیدؒ کے پوتے شاہ ابوالخیر محی الدین صاحب جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے دیرھ سال پہلے خاندانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ حجاز سے آکر وہاں مقیم ہو گئے۔ انھوں نے پرانی روایات بچھڑانہ کر دیں۔ موجودہ سربراہ اور بزرگوں کی یادگار جناب ابوالحسن زید فاروقی صاحب مدظلہ ہیں۔

زبان اردو کی ارتقا

مرزا مظہر جانجانا جن کے جانشین شاہ غلام علی تھے۔ ادبی تاریخ میں بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ ان کا مختصر فارسی دیوان شائع ہوا ہے لیکن ایشیا نیک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں دیوان مظہر کا جو قلمی نسخہ ہے اسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ مطبوعہ دیوان میں بہت سی اچھی غزلیں شامل نہیں ہوئیں۔ مظہر جانجانا فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ انھوں نے کئی ریختہ گو شعرا کی تربیت کی۔ بلکہ مشہور شاعر مصطفیٰ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انھوں نے اردو زبان کو سہ قلوب میں سب سے پہلے ڈھالا۔ اس سے پہلے دکنی کی تعلیم میں شمالی ہندوستان میں بھی دکنی محاورے میں شعر گوئی شروع ہوئی اور ایہام گولی کا دور دورہ تھا۔ مرزا مظہر جانجانا نے روزمرہ کی زبان میں فارسی اجزائی آمیزش سے شریکے۔ اور اس رجحان کا آغاز ہوا جسے تاریخ نے بعد میں بڑی ترقی دی مصطفیٰ کا مظہر کے متعلق اندراج حسب ذیل ہے:-

”درا ابتداے شوق شعر کہ ہنوز از میر و مرزا کیسے در صمد نیامده بود و در ایہام گویاں بود اقل کے کہ شعر ریختہ بہ قشع فارسی گفتہ دوست فی الحقیقت نقاش اول زبان ریختہ باعتبار فقیر مرزا است۔ بعد از متبعش بہ دیگران رسید۔“

مظہر جانجانا کے علاوہ جس دوسرے نقشبندی بزرگ نے نئی زبان کو سناوارا۔ شاہ سعد اللہ گلشن تھے۔ ان کے بھی کئی ریختہ گو شاگرد تھے۔ لیکن ہماری ادبی زندگی میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جدید اردو شاعری کے آدمی الشعراؤلی کی رہنمائی کی۔ سراج الدین خان آندو جس کے دامن تربیت تلے میر اور ستودا جیسے استاد پہلے ان کے ہم عصر تھے۔ یہ سب بزرگ فارسی کے فاضل تھے اور اسی زبان پر فرما تھے۔ لیکن انھیں نظر آرہا تھا کہ اسلامی حکومت کے زوال کے ساتھ ایک ایسی زبان کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے جسے عوام کی گفتگو سے زیادہ تعلق ہو اور جو قومی روایات و خیالات کی ترجمانی میں فارسی کی قائم مقامی کر سکے۔ چنانچہ انھوں نے اردو زبان کے قواعد منضبط

کیے۔ اُردو اشعار کو فارسی اشعار کے طرز پر خود لکھا اور اپنے شاگردوں سے لکھوایا۔ اور مرزا سودا۔ میر تقی میر۔ خواجہ میر درد۔ میر حسن جیسے بزرگوں کی تربیت کی جنہوں نے اُردو شاعری کو مشرقی ادبیات میں سر اٹھانے کے قابل بنادیا۔ علمائے اس تحریک کا ساتھ دیا۔ شاہ ولی اللہ نے کلام مجید کا فارسی ترجمہ کیا تھا۔ ان کے بیٹوں نے اُردو میں ایک چھوڑ دو ترجمے کیے اور اُردو زبان کی حوصلہ افزائی کی۔ شاہ ولی اللہ کی تصانیف فارسی میں تھیں، لیکن ان کے نواسے شاہ اسماعیل شہید کی تقویت الایمان اُردو نثر کا شاہکار ہے۔ ان کی اور حضرت سید احمد شہید کی تحریک سے اُردو نثر کو بڑی مدد ملی۔ ان سب کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب کی وفات سے سو سو اٹھ سال کے اندر اُردو جسے پہلے علمی حلقوں میں کوئی مہم نہ لگاتا تھا ایک ایسی ادبی زبان ہو گئی جو ہندوستان میں فارسی کی جانشینی کر سکتی تھی۔

اہم تاریخیں

مذہبی۔ علمی اور ادبی

- ۱۵۰۴۔ مہدی جوہر پوری کی وفات
۱۵۲۵۔ میاں بابزید (پیر و خاں) کی ولادت
۱۵۴۹۔ بادشاہ کو حق اجتہاد دیے جانے کا محضر
۱۵۹۷۔ خواجہ باقی باللہ نقشبندیؒ کی لاہور میں وفات
۱۶۰۳۔ خواجہ باقی باللہ نقشبندیؒ کی وفات
۱۶۱۶۔ نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید کی وفات
۱۶۱۹۔ دربار بہانگیر میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی طلبی
۱۶۲۲۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی وفات
۱۶۳۸۔ ۳۹۔ اخوند درویش پشاور کی وفات
۱۶۴۲۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی وفات۔
۱۷۰۳۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ کی ولادت
۱۷۱۱۔ لاہور میں خطبہ جمعہ کا ہنگامہ
۱۷۳۸۔ ۸۳۔ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ از شاہ ولی اللہ
۱۷۴۸۔ نظام الدین بانی درس نظامی کی وفات
۱۷۵۳۔ مجدد اول مولانا ولد ار علیؒ کی ولادت
۱۷۶۲۔ شاہ ولی اللہؒ کی وفات
۱۷۹۱۔ قرآن مجید کا بامجاورہ اردو ترجمہ از
شاہ عبدالقادر ابن شاہ ولی اللہ۔

سیاسی

- ۱۲۹۸۔ کالی کٹ میں واسکو ڈے گاما کی آمد
۱۵۲۶۔ دہلی پر بابر کا قبضہ
۱۵۵۶۔ اکبر کی تخت نشینی
۱۵۵۶۔ ۱۶۰۰۔ مالوہ۔ گجرات۔ بنگال۔
کشمیر۔ سندھ۔ احمد نگر کی فتح
۱۶۰۵۔ اکبر کی وفات
۱۶۵۸۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی
۱۶۸۳۔ اورنگ زیب کی دکن کو روانگی
۱۶۸۷۔ بیجاپور کو لکنڈہ کی فتح
۱۷۰۷۔ اورنگ زیب کی دکن میں وفات
۱۷۳۹۔ دہلی پر نادر شاہ کا حملہ
۱۷۵۷۔ پلاسی کی لڑائی۔ بنگال پر کمپنی کا تسلط
۱۷۷۰۔ پانی پت کی تیسری لڑائی
۱۷۷۱۔ بکسر کی لڑائی
۱۷۷۷۔ چوتھی جنگ میسور۔ سلطان ٹیپو کی
شکست و شہادت
۱۷۹۹۔ لاہور پر پنجیت سنگھ کا قبضہ
۱۸۰۳۔ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ

منتخب فہرست کتب

اکبر سے پہلے

عہدہ شاہجہانی

۱۔ سکینۃ الاولیاء مرتبہ دارالشکوہ

۲۔ دبستان مذاہب

۳۔ رباعیات سرمد

۴۔ مجمع البحرین از دارالشکوہ

عہدہ عالمگیری

۱۔ آثار عالمگیری

۲۔ رقعات عالمگیری

۳۔ سفرنامہ برنیر

۴۔ منتخب اللباب از میر محمد ہاشم خوانی خان

حکیم الامت شاہ ولی اللہ

۱۔ نفاس العارفین از شاہ ولی اللہ

۲۔ کلمات طیبات

۳۔ سحر اللہ البالغہ

۴۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز

شیعہ فرقہ کا فروغ

۱۔ نجوم السہابی تراجم العلماء

۲۔ طبقات محسنہ

علمائے متاخرین

۱۔ سیر المتاخرین

۲۔ آثار اکرام (از علامہ آزاد بلگرامی)

۳۔ علمائے فرنگی محل (اردو)

۴۔ مناقب فخریہ

۵۔ ملفوظات و مکاتیب مرزا مظہر جانجاناں

۶۔ شاہ غلام علی مرتضیٰ مولانا احمد دؤن مجذبی

۷۔ خواہر علویہ۔ مرتبہ مولانا احمد دؤن مجذبی (قلمی)

۱۔ توذک بابری

۲۔ منتخب التواریخ از بدایونی

۳۔ اخبار الاخیار از شیخ عبدالحق محدث

۴۔ تذکرہ علمائے ہند از مولوی رحمان علی (نو کشور)

۵۔ لطائف قدوسی

عہد اکبری

۱۔ منتخب التواریخ

۲۔ اکبرنامہ

۳۔ آئین اکبری

۴۔ رقعات ابوالفضل

۵۔ دیوان فیضی

۶۔ زبدۃ المقامات

۷۔ کلیات باقی باللہ۔ مکتوبات محمد باقی

{Akbar and the Jesuits

{(ed) By Payne

حضرت مجدد الف ثانی

۱۔ مکتوبات امام ربانی (تین جلدیں)

۲۔ زبدۃ المقامات از مولانا ہاشم کشمیری

۳۔ حضرات القدس

۴۔ مکتوبات خواجہ محمد معصوم

۵۔ مکتوبات سعید

۶۔ حیات مجدد و پروفیسر محمد فرمان

شیخ عبدالحق محدث دہلوی

۱۔ اخبار الاخیار

۲۔ مجموعہ مکاتیب والرسائل

۳۔ حیات شیخ عبدالحق (خلیق احمد نظامی)



INSTITUTE OF ISLAMIC CULTURE
LAHORE, PAKISTAN

